فروری

ریہ دہلوی

عنوان کے

41/-

جدید ٹکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی بُوٹیوں کے استعمال میں ہے۔
ٹریٹ آملہ شکاکائی ہیئر آئل اور ٹریٹ ہربل ہیئر سوپ، آملہ، شکاکائی، مہندی اور
دیگر جڑی بوٹیوں سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور
کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں سے مشہور ہیں۔
جی وی انٹرنیشنل پوسٹ بکس ۷۱۸۶، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

افتتاحیہ

رجاء کے لغوی معنی اُمید اور خوف کے ہیں
ایک بزرگ نے کہا ہے کہ رجاء کی علامت حُسنِ اطاعت ہے۔
بعض بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ
رجاء جمال کی نگاہ سے جلال کو دیکھنا ہے۔ خوف اور رجاء پرندے کے دو بازوؤں کی طرح ہیں۔ جب دونوں بازو برابر ہوتے ہیں تو پرندہ اوپر اُڑتا ہے اور اس کی پرواز دُرست ہوتی ہے۔
دل میں بسی ہوئی آس اور خوف کا نام ہی رجاء ہے۔ رجاء ایمان کے لئے لازم ہے۔ یعنی اُمید کے ساتھ خوف اور خوف کے ساتھ اُمید کا ہونا ضروری ہے۔
رجاء میں شامل خوف کا ایک خاص مفہوم ہے۔ اصل خائف وہ نہیں جو محض ڈرتا ہے اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہے، بلکہ سچا خائف اس چیز کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیتا ہے جو عذاب کا باعث ہو۔
خوف مذکر ہے اور اُمید مؤنث۔ ان دونوں کے ملاپ سے حق کا عرفان پیدا ہوتا ہے۔
ہمیں اللہ کے عذاب سے بے خوف کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہمیں اس خوف سے زیادہ اللہ سے اُمید رکھنی چاہئے۔ یہی رجاء ہے۔
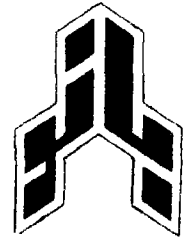
سعدیہ دہلوی

فروری ۱۹۸۷

بہ یادگار : یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی : زینت کوثر دہلوی
مدیرہ : سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر : شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اُنالیسواں سال، ۴۸۰ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت : چار روپے
سالانہ قیمت : اڑتالیس روپے

مقام اشاعت (صدر دفتر) : آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ : شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس : 031) 61601 SHMA IN)
ٹیلی فون : 732668 732667 732666
دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان : شمع میگزین
طابع و ناشر : محمد یونس دہلوی
ٹائیٹل : بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ : روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

محترمہ:

میں کئی ماہ سے بانو کا مطالعہ کر رہا ہوں جو قابلِ تعریف ہے خصوصاً آپ کی تحریر معلومات سے بھرپور اور پُر مغز ہونے کے ساتھ ادب کا شاہ کار ہوتی ہے۔ آپ نے بانو کو ایک خاص ادبی حسن دے کر ایک نیا انداز نکالا ہے جو صحافت کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

یاسین ابراہیم پاٹن (دیہان)

● قدردانی کا شکریہ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ!

جنوری کے بانو میں آپ کا مضمون پڑھنے کے بعد جہیز کے موضوع پر آپ کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔ واقعی جہیز کا مسئلہ روز بروز سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے ہر شخص اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عملی طور پر کوئی اقدام نہیں کرتا۔ اگر لڑکا، لڑکی اور دونوں کے والدین مل کر یہ عہد کرلیں کہ وہ نہ جہیز لیں گے اور نہ جہیز دیں گے تو سماج سے اس ناسور کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

اس شمارے میں گورنچن سنگھ اور ڈاکٹر حنیف کی کہانیاں پسند آئیں۔ نسرین اختر کا مضمون نہ صرف اچھا ہے، بلکہ قابلِ عمل بھی ہے۔ عظمت اعظمی نے 'بغیر عنوان کے' کہانی کے ذریعہ یہ پیغام دیا ہے کہ خوش گوار زندگی گزارنے کے لئے بیوی کو اعتماد میں لینا ضروری ہے، خواہ جھوٹ ہی بولنا پڑے۔ اسی صورت میں گرہستی سکون سے چلتی ہے۔ (منین صدیقی حیدر آباد)

● مصنفہ کا نام عظمت اعظمی ہے۔ کاتب کی غلطی کی وجہ سے ان کا نام اجمل اعظمی چھپ گیا تھا۔ (مدیرہ)

محترمہ:

جنوری کا بانو رنگارنگ خوب صورت گل دستے کی شکل میں باصرہ نواز ہوا اس میں تمام افسانے "تبسم" اور "قلمی دوستی" کا کالم بہت پسند آئے تمام فن کاروں کو میری طرف سے دلی مبارک باد دیجئے۔ (محمد الطاف الدین، نرمل)
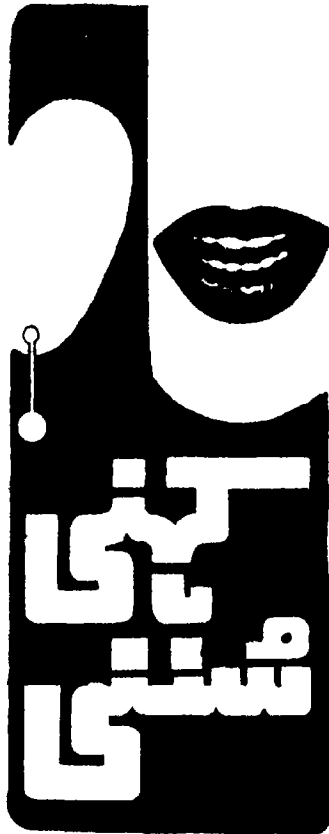
● لیجیئے، آپ کی مبارک باد ہم نے ان تک پہنچا دی ہے۔ (مدیرہ)

پیاری سعدیہ بہن:

بانو: جنوری آج ہی ملا۔ ابھی مکمل طور پر پڑھا بھی نہیں ہے، مگر چند باتیں بہت پسند آئیں۔ بھائی وسیم کی شادی خانہ آبادی کی تصاویر بہت اچھی لگیں۔ ہماری جانب سے آپ سب کو یہ شادی مبارک ہو۔ خدا خیر کرے عروس و نوشاہ ہمیشہ شاداں و فرحاں رہیں۔

"جہیز ـــ کیا عورتیں خود ذمہ دار ہیں؟" کے عنوان کے تحت آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، ہم ان سے سو فی صد اتفاق کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ جہیز دینے کو سب ہی والدین کا دل چاہتا ہے۔ سب ہی لڑکی کو کچھ نہ کچھ دے کر گھر سے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کی ہستی لاکھوں کا جہیز دینے کی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے پاس دولت ہے تو ضرور جہیز دیں گے مگر اس سے لڑکے والوں کی عادت خراب ہوجاتی ہے۔ ہر ماں باپ کو صرف اپنے بچوں کا ہی نہیں، دوسرے کے بچوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے، کیوں کہ ہمارا معاشرہ ایک ایک فرد سے ہی بنتا ہے اور ہر فرد کو ہر طرح کی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے اس سلسلے میں عورتوں کو زیادہ سخت بننا ہوگا۔ کیوں کہ گرہستی کی زیادہ ذمہ داری عورت پر ہوتی ہے۔ مرد (کچھ کو چھوڑ کر) عورت کی ضد پر ہتھیار ڈال دینے میں ہی عافیت سمجھنے لگے ہیں۔ آج عورت بہت آگے نکل گئی ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی بات والدین سے منوانے کا ہنر سیکھ رہے ہیں۔ تو پھر جہیز کی روک تھام کرنے میں وہ کیوں پیچھے ہیں؟ اس برائی کو دور کرنے کے لئے صرف لکھنے اور کہنے سے کچھ نہیں ہوگا، بلکہ ضرورت کارگر عمل کی ہے۔

افسانہ "آئینے کے ٹکڑے" آج کی ایک حقیقت ہے۔ اس افسانے میں کرونا کا کردار اچھا لگا۔

"نئے سال کے چند عہد" میں نسرین اختر نے کئی اچھی باتیں بتائی ہیں "دلگن" کی قسط بانو میں چار چاند لگا رہی ہے۔ اس مرتبہ لڑکیوں کے لئے اور بھی زیادہ نصیحت ہے۔

شاہانہ فہمی، روز تقی، رام پور

● آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ جہیز کی رسم کو ختم کرنا ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ (مدیرہ)

پیاری بہن سعدیہ دہلوی:

میں بانو، ۱۹۵۷ سے پڑھتی آئی ہوں جب میں نے ہوش سنبھالا ہی تھا، بانو عورتوں کے لئے ہی نہیں مردوں کے لئے بھی افادیت کا خزانہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ (مسز حاجی بشیر محمد آندھرا پردیش)

● ہمیں خوشی ہے کہ بانو مرد بھی پڑھتے ہیں کیوں کہ عورتوں کے مسائل مردوں کو

بھی سمجھنے چاہئیں۔ (مدیرہ)

ڈیر بہن سعدیہ :

جنوری کا شمارہ ' بانو' نظر سے گزرا. ہمیشہ کی طرح آن بان برقرار ہے۔ بھائی کی شادی مبارک ہو۔ افتتاحیہ' عصمت آپا کے جوابات' جواہر ریزے' جہیز کے تعلق سے آپ کا مضمون، عظمت اعظمی کا ' بغیر عنوان کے' (انداز بیان خوب ہے) ' ڈلگن' (ناول جیسی پوری شدت سے یکساں طور پر قائم ہے) ' ڈیس پرسیس کی خبریں' وغیرہ سب بے حد اچھے ہیں۔

(ڈاکٹر عطیہ سعید حیدرآباد)

● چھوٹے بھائی' کی شادی پر مبارک باد کا شکریہ۔ (مدیرہ)

محترمہ باجی صاحبہ :

میں بانو کا پرستار ہوں یہاں تک کہ اپنے دوستوں کو بھی میں بانو کے مطالعہ کی ترغیب دیتا ہوں۔ بہت سے دوستوں نے بانو پابندی سے پڑھنا شروع بھی کر دیا ہے لگ بھگ پانچ مہینے پہلے میں نے "کہنی سنی" کے تحت اشاعت کے لئے تین مرتبہ اپنی رائے پیش کی۔ اس کے علاوہ اپنے سوال بھی کئی مرتبہ بھیجے۔ پسندیدہ اشعار بھی ارسال کئے۔ مگر افسوس، آج تک کوئی تحریر نہیں چھپی۔ اس لئے میں نے دوبارہ کوشش کرنے کی ہمت بھی نہیں کی میری بھی تمنا تھی کہ میری بھی تحریر بانو میں شائع ہو جب میں نے دیکھا کہ خط لکھنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا تو میں نے کوشش کرنا ہی بند کر دی۔ آج بھی اُمید نہیں ہے کہ میری تحریر بانو کی زینت بن سکے گی' کیوں کہ آپ شاید پہلے بڑے بڑے شہروں سے آئے ہوئے خطوں پر ہی توجہ دیتی ہیں۔ چھوٹے شہر اور گاؤں آپ کی نظر میں سماتے ہی نہیں۔ بہرحال، دعا ہے کہ سارے جہاں کا سُکھ آپ کو حاصل ہو۔

(ڈاکٹر علی حسن، رائے پور)

● آپ کا خیال کسی غلط فہمی پر مبنی ہے جواب دیتے وقت ہم شہر کا نام پڑھتے تک نہیں کیوں کہ ہمارے قارئین ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمیشہ اچھی اُمید رکھئے۔ آپ کی باقی تحریریں بھی انشاء اللہ چھپ جائیں گی۔ (مدیرہ)

بہن سعدیہ صاحبہ :

بانو : دسمبر میں حسب معمول سب سے پہلے افتتاحیہ پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ آپ "اقوالِ زرّیں" بھی بہت اچھے شائع کرتی ہیں سب ہی افسانے معیاری ہیں۔ خصوصاً بشریٰ رحمٰن کے ناول "لگن" کی قسط بہت پسند آئی۔ ہر ماہ بانو جب بھی ہاتھ میں آتا ہے' میں "لگن" کی قسط پہلے پڑھتی ہوں۔ اگر "لگن" کی قسط کے صفحات اور بڑھا دیں تو مزہ آ جائے۔

(نسیم بانو پٹیل' اورنگ آباد)

● اگر ہم "لگن" کے صفحات اور بڑھا دیں تو دیگر افسانوں کے لئے جگہ کہاں بچے گی۔ (مدیرہ)

سعدیہ باجی :

بانو آپ کے ہاتھوں روز بروز نکھرتا ہی جا رہا ہے۔ مبارک باد قبول فرمایئے گا۔ آپ کا سفرنامہ پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم خود آپ کے ساتھ شریک سفر تھے۔ یہ رسالہ ہماری پیدائش سے بھی پہلے سے ہمارے گھر میں آ رہا ہے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بانو اپنی مثال آپ ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایسی چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں کے بارے میں معلوماتی مضامین شائع کریں جو خواتین کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں ؟

(رضوانہ عفیفہ' ویلور)

● آپ کی فرمائش قابلِ توجہ ہے۔ انشاء اللہ اس طرح کے مضامین ہم ضرور شاملِ اشاعت کریں گے۔ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ :

یوں تو میں ایک عرصے سے ماہنامہ بانو پڑھتا آ رہا ہوں، لیکن اظہارِ رائے کی جسارت آج کر رہا ہوں۔ مجھے آج تک بانو میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس پر انگشت نمائی کی جا سکے۔ میرا پسندیدہ ماہنامہ بلند معیار کی طرف رواں دواں ہے۔ ازواجِ مطہرات کی سوانح حیات، قسط وار ناول "لگن" اور دوسرے مضامین بہت خوب ہیں۔ حال ہی میں آپ نے قلمی دوستی کے کالم کا اضافہ کیا۔ یہ بھی بہت خوب ہے۔

(صادق' حیدرآباد)

● یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بانو میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے' آپ کو پسند آتا ہے۔ لیکن جب کبھی آپ کو کچھ ناگوار گزرے تو کبھی ہمیں ضرور لکھئے گا۔

(مدیرہ)

ڈیر سعدیہ بی بی :

دوستی کے اُفق پر اُبھرتے ستاروں میں آپ کو جگمگاتے دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ خدا اور خوش نصیبیاں آپ کے دامن میں بھر دے بانو کی روز افزوں ترقی مبارک ہو۔ "افتتاحیہ" خوب لکھتی ہو۔ چھوٹی سی عمر میں اتنے تجربے کی باتیں — اللہ عمر دراز کرے اور نظر بد سے بچائے۔

دینی معلومات میں "ازواجِ مطہرات" کا سلسلہ خوب ہے۔ ہماری معلومات میں آپ کی بدولت اضافہ ہوا ہے۔ افسانے، نظمیں وغیرہ بھی معیاری ہوتی ہیں۔ تعریف کے لئے الفاظ نہیں۔

"خیال اپنا اپنا" کیوں ترک کر دیا ؟ بھئی' یہ لوگوں کے خیالات جاننے کا ایک بہترین ذریعہ تھا۔ چھوٹی بھابی مبارک ہو۔ اب کی دفعہ دونوں بھابیوں کے ساتھ کہیں کے دورے کے فوٹو ضرور چھاپیں۔ زینت بھابی صاحبہ کو بھی ہماری طرف سے مبارک باد پہنچا دیں۔ اپنے مُنّے کو پیار۔ (سرورِ عالم، کھمم (آندھرا)

● بس اسی طرح دعائیں کرتی رہئے گا ہم آج جو کچھ بھی ہیں' وہ اپنے والدین اور آپ سب کی دعاؤں کی ہی بدولت ہیں۔ اور ہاں آپ کس مُنّے کی بات کر رہی ہیں ؟ ہمارا تو صرف ایک بہت پیارا بھتیجا ہے (مدیرہ)

مئی میں جلوہ نما ہو رہا ہے

بہار کی طرح رنگارنگ۔ کھلی سنہری دھوپ کی طرح حیات بخش۔ سمندر کی طرح ولولہ انگیز۔ بانو کا سال نامہ ذہن کو ایک نئے اُفق سے روشناس کرائے گا۔ شخصیت اور شعور کو نکھارنے سنوارنے میں مدد کرے گا۔ بچّوں کی بہتر تربیت اور گھر کو جنّت بنانے میں معاون ہوگا، مہینوں تک مطالعہ کے بے پناہ لُطف کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔ ہندوستان پاکستان اور دوسرے ملکوں کے بلند پایہ قلم کار اس جگمگاتی محفل میں یک جا ہو رہے ہیں۔

سال نامہ کی قیمت ۱۵ (Rs15/-) روپے ہوگی۔ لیکن سالانہ خریداروں کو یہ نادر تحفہ مفت پیش کیا جائے گا۔ سال نامہ رجسٹری سے منگوانے کے لئے سالانہ خریداری نمبر کے حوالے کے ساتھ چار روپے ۵۰ پیسے (Rs.4/50) منی آرڈر سے جلد بھیج دیں۔ نئے خریدار بھی یہ شان دار تحفہ مُفت حاصل کرنے کے لئے باون روپے ۵۰ پیسے (Rs52/50) سالانہ قیمت ارسال فرمائیں (جس میں سال نامہ کا رجسٹری خرچ شامل ہے)۔ پُرانے اور نئے خریدار منی آرڈر بھیج کر ڈاک خانے سے ملنے والی منی آرڈر رسید ہمیں بھیج دیں، تاکہ ان کے ارشاد کی تعمیل کی جا سکے

ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کشمیر میں اُمّیدوں کا نیا موسم

سعدیہ دہلوی

کشمیر کے جادو جگاتے جلوے ہم بہت سے بنگوں اور کئی رُتوں میں دیکھ چکے ہیں اس جنّت نما وادی کی شاہ راہوں پر چنار کی آتشیں لپک نے ہمیشہ دل و دماغ کو سرور بخشا ہے۔ ان خوابوں سے تراشی ہوئی وادیوں میں ہم نے کئی بہاریں بھی گزاری ہیں جب ہر طرف پھولوں کی مہک سے ماحول میں ایک افسوں سا چھایا رہتا تھا اور کئی خزائیں بھی، جب زمین پر بچھے ہوئے زرد پتوں کا فرش کسی سوگوار حسن کا سماں پیش کرتا تھا۔ لیکن کشمیر کو برفیلے لبادے میں ہم نے پہلی بار دیکھا۔ خوب زوروں سے برف باری ہو رہی تھی اور دُور دُور تک برف کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شہر میں جیسے سب کچھ رُک گیا ہو۔ بجلی کی کچھ خبر نہیں۔ شہر کے تقریباً تمام ٹیلی فون خراب۔ ساری دُکانیں بند۔ ہم اپنے گیسٹ ہاؤس میں کھڑکی سے لگے بے پایاں گرتی ہوئی برف کو دیکھ رہے تھے اور وہی سوچ رہے تھے جو شاید شہر کا ہر شخص سوچ رہا ہوگا۔ یعنی یہ کہ وزیرِ اعظم راجیو گاندھی سری نگر کیسے پہنچیں گے۔ اس موسم میں تو نہ جہاز اتر سکتا ہے اور نہ ہیلی کاپٹر۔ حد تو یہ کہ گاڑیاں بھی نہیں چل سکتیں۔ کشمیر کے رہنے والے انتہائی بے قراری اور اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ شہر میں ان کے استقبال کے لئے ہر طرح کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔

ایسے حالات میں ہمارے لئے باہر کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ریڈیو تھا اور ریڈیو پر ہی ہم نے سُنا کہ وزیرِ اعظم صبح کو جموں سے براہِ راست پہنچ گئے ہیں۔ وہاں انہوں نے سرحد پر تعینات ہمارے ملک کے جوانوں کو مخاطب کیا۔ اس کے بعد وہ واپس جموں چلے گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ سری نگر کیسے اور کب پہنچیں گے۔ پھر دوپہر کے دو بجے خبر ملی کہ وزیرِ اعظم اُدھم پور (جو جموں کے قریب ہے) سے ایک جیپ میں سری نگر کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی، کیوں کہ یہ راستہ تو عام دنوں میں بھی خطرے سے خالی نہیں اور برف باری ہو رہی ہو تو پھر اللہ ہی مالک ہے۔ یہ راستہ سات آٹھ گھنٹے کا ہے۔ واقعی وزیرِ اعظم کی لگن کی داد دینی پڑی۔ ہمیں خبریں ملتی گئیں کہ وہ کہاں کہاں سے گزر رہے ہیں۔ یہ دورہ وزیرِ اعظم اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے لئے سیاسی طور پر بے حد اہمیت رکھتا تھا، کیوں کہ کشمیر میں الیکشن سر پر ہیں۔ ہم اس دورے کا احاطہ کرنے کے لئے سری نگر پہنچے تھے۔ وزیرِ اعظم نہ آتے تو ہمیں بھی بہت مایوسی ہوتی۔

شام کے سات بجے ہمیں خبر ملی کہ وزیرِ اعظم سری نگر کی حدود تک پہنچ گئے ہیں اور سیدھے شیرِ کشمیر ایگری کلچرل یونیورسٹی کے پہلے کانووکیشن میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں۔ ویسے تو یہ جلسہ دوپہر کو ہی سری نگر کے پاس شوپور میں ہونا تھا، لیکن وزیرِ اعظم کی آمد میں تاخیر کے باعث اب یہ رات کے دس بجے سینٹور ہوٹل میں منعقد ہوا۔ جیسے ہی وزیرِ اعظم وہاں تشریف لائے، بار بار تالیوں سے ہال گونج اُٹھا۔

ڈاکٹر فاروق نے جموں سے سری نگر تک کے دشوار سفر کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بتایا: "موسم کو دیکھتے ہوئے راستے میں کئی بار ہم نے سوچا کہ جموں

واپس لوٹ چلیں، خاص طور پر بانہال کے قریب، جہاں برف کا پورا تودہ نیچے گر پڑا تھا۔ ہم سب نے وزیر اعظم کو آگے جانے سے بہت منع کیا، لیکن وزیر اعظم سفر کو ملتوی کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے اصرار پر پتھروں اور برف کو بارود سے پھاڑتے ہوئے راستہ صاف کیا گیا۔ اللہ کا کرم ہے کہ ہم خیریت سے یہاں پہنچ گئے۔ وزیر اعظم کو معلوم تھا کہ یہاں لوگ بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں یہاں کے عوام کی دل شکنی گوارا نہ ہوئی۔ وہ اس قدر تیزی سے گاڑی چلا رہے تھے کہ انہوں نے پائلٹ گاڑیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا"

سا کو دکمیشن میں ڈاکٹر فاروق نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور آپس میں بھائی چارہ اور اتحاد رکھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا "جو لوگ کہتے ہیں کہ یہاں مسلمان خطرے میں ہے، وہ مغالطہ کی دھند پھیلا رہے ہیں۔ صرف وہ لیڈر خطرے میں ہیں جو ایسی بے سر و پا باتیں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جس طرح سرحد پر فوجی ہر طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے ہندوستان کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح ہندوستانی سماج کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔

"تعلیم کا منشا صرف پودے اگانا نہیں، بلکہ تعلیم کا اصل مقصد دنیا کے ہر آثار چڑھاؤ کو سمجھنا ہے۔ آج ہمارے دشمن باہر سے ہم کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کہیں علیحدگی پسندی کے سبز باغ دکھا رہے ہیں اور کہیں دوسری ریاستوں میں اشتعال پھیلا رہے ہیں۔ آج کے دور میں ہندوستان کی ایکتا کو قائم رکھنا ہم سب کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ہمیں کشمیر میں وہی جذبہ لانا ہے جو ۱۹۴۷ کے دلوں میں تھا۔ جب حملہ آور فوجیں ہمارے سامنے تھیں تو ہم نے کہا تھا کہ پہلے غلام رسول، غلام محمد وطن پر قربان ہو جائے گا، پھر شمبھو ناتھ کی باری آئے گی۔ جو کرن مہاتما گاندھی کو یہاں سے ملی تھی وہ راجیو گاندھی کے دور میں سورج بن کر سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی۔ ہمارے دشمن بہت ہیں۔ یہ ہماری جماعتوں کے اندر بھی ہیں اور باہر بھی۔ یہ ہمیں توڑنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم نے ان کا مقابلہ نہیں کیا تو یہاں کتنی ہی ترقی آ جائے کتنے ہی اسکول بن جائیں، کتنے ہی بجلی کے کھمبے لگ جائیں، کتنے ہی اسپتال بن جائیں، ان سب کا کوئی فائدہ نہیں جب تک یہاں ہندو، مسلم، سکھ اتحاد نہ ہو۔ جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ ہمارے بچوں کو ان کے استاد کوئی نفرت کی پٹی تو نہیں پڑھا رہے ہیں۔ خدا کرے میرے والد کا خواب پورا ہو، اور کشمیر ہر لحاظ سے ایک پُرامن، ترقی یافتہ اور خوش حال ریاست بن سکے۔ شیخ صاحب کے لیے سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ اس ریاست میں اتحاد رہے، امن رہے اور ہمارا وطن مضبوط بن سکے۔"

وزیر اعظم نے اس موقع پر طلبا کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ انہوں نے کہا: "ملک کو قحط سے بچانا ہمارے کسانوں کی ذمہ داری ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری کھیتی باڑی کا ایک لگا بندھا ڈھانچا سا بن گیا ہے، جو پنجاب اور ہریانہ کے نمونے کا ہے۔ اسی لئے اب راجستھان میں بھی چاول ہی اگایا جا رہا ہے، چاہے اس فصل کو کتنا ہی پانی دینا پڑے۔ مٹی کی قسم آب و ہوا اور دوسری سہولتوں کا لحاظ رکھے بغیر ہر جگہ ایک ہی ڈگر اپنانے کے باعث کھیتی باڑی میں تیزی سے ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کون سی چیز کہاں بہتر رہے گی اور ہمارے کسانوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہم اگر پرانے ڈھانچوں میں پھنسے رہے تو نئی زمین کیسے توڑ پائیں گے؟ اس سلسلے میں آپ لوگوں کو نیا راستہ دکھانا ہے۔"

اگلی صبح ہماری آنکھ کھلی تو ہم موسم کا معائنہ کرنے کے لئے کھڑکی کی طرف لپکے۔ برف دگنی ہو چکی تھی، اور ابھی تک تیزی سے گر رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق وزیر اعظم کو اننت ناگ اور کئی اور جگہوں پر جانا تھا۔ لیکن اب پروگرام کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ ہم جیپ میں راج بھون پہنچے۔ وہاں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ سب وزیر اعظم کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔

ہم برف کے لئے زیادہ تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ رہا وزیر اعظم کی پارٹی کا سوال تو وہ بے چارے کپڑے بھی نہ بدل سکے۔ ہوا یہ کہ وزیر اعظم کی جیپ اور دوسری چند گاڑیوں کے بعد آدھے راستے پر برف کے تودے گر پڑے اور راستہ بالکل بند ہو گیا۔ بعد میں آنے والی جس جیپ میں سب کے کپڑے اور لوٹ تھے، وہ سب وہیں رہ گئے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ کوئی دکان کھلوا کر سب کو ایک ایک قمیص دی جائے۔ لیکن سب کو قمیص سے بھی زیادہ جوتوں کی فکر تھی، کیوں کہ عام جوتے تو برف میں جواب دے جاتے ہیں۔ چنانچہ فوج والوں سے جوتوں کی بھی فرمائش ہوئی۔ کچھ جوتے وقت پر پہنچ گئے اور جس کے ٹھیک آئے اس نے پہن لئے۔

تو صاحب، اس لٹ پھٹ بے سر و سامانی کے عالم میں ہماری پوری پارٹی روانہ ہوئی۔ جیپوں میں بیٹھ جانے کے بعد بھی کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وزیر اعظم کہاں جائیں گے۔ سب سے آگے کی جیپ کا اسٹیئرنگ وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھا اور جس طرف وہ جاتے، باقی جیپیں اسی طرف بڑھ جاتیں۔

پہلے تو ہم پمپوش گاؤں کی طرف گئے، جہاں زعفران کے کھیت ہیں۔ اتنی برف گر رہی تھی کہ جیپ بھی مشکل سے چل رہی تھی۔ ہر جیپ کے ٹائر پر لوہے کی زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔ راستے میں ہم نے ایسے حسین منظر دیکھے کہ یقین آ گیا کہ کشمیر ہر موسم میں جنت ہے۔ جگہ جگہ وزیر اعظم اپنی جیپ روک دیتے

اور لوگوں سے باتیں کرتے، اُن کی پریشانیاں سُنتے۔

جناب راجیو گاندھی نے جگہ جگہ اسی بات پر زور دیا کہ کشمیر میں تیزی سے ترقی لانا ہے۔ نیشنل کانفرنس اور مرکز کو مل کر کام کرنا ہے۔ انہوں نے کہا "بہت عرصے سے ہم دونوں ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے تھے۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ دونوں کے بنیادی خیالات میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ یعنی دونوں کشمیر میں ترقی چاہتے تھے۔ لیکن ہماری آپس کی کشمکش میں سب کام رُک جاتا تھا۔ جو کام ہم کرنا چاہتے تھے، نیشنل کانفرنس والے اس میں ٹانگ اڑا دیتے تھے اور جو نیشنل کانفرنس چاہتی تھی، اس میں ہم تعاون نہیں دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں جتنا کام ہونا چاہیے، وہ نہیں ہوا۔ اس لئے ہم نے آپس میں بات کی اور فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہم کشمیر کے لئے مل کر کام کریں"۔

مختلف تقریروں میں وزیراعظم نے بتایا کہ مرکز کی طرف سے جموں اور کشمیر کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے ایک ہزار کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ ان کی کوشش ہے کہ ایشیاڈ ۱۹۹۰ کے جاڑوں کے کھیل (WINTER SPORTS) کشمیر میں ہوں۔ سری نگر میں چودہ ملکوں کے لئے سیدھے ٹیلی فون ڈائلنگ کی سہولت فراہم کرنے کی بھی مرکز نے منظوری دی ہے۔ ایک ... ہم کلوواٹس کا کیبل بھی لگوایا جا رہا ہے۔ بجلی کا محصول کم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ تاکہ غریبوں کو راحت ملے

ان قریبی دیہات کے دورے کے بعد وزیراعظم نے اپنا رُخ واپس شہر کی طرف کیا۔ ہم سچ کہہ رہے ہیں کہ اتنے میں ہماری تو حالت خراب ہو چکی تھی۔ چائے کی پیالی کے لئے ترس رہے تھے۔ ایک تو ہمارے جوتے برف میں چلنے کے قابل نہ تھے اور ان ہی جوتوں میں اتر کر ہم جگہ جگہ تصویریں کھینچتے رہے تھے۔ سر پر تو برف گر ہی رہی تھی، جوتوں میں بھی برف بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی ہم خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ ہم تو پھر بھی کوٹ وغیرہ پہنے ہوئے تھے اور یہ تسلی بھی تھی کہ رات کو گرم پانی کی بوتل مل جائے گی اور کمرے میں بخاری (آتش دان) کی حرارت پھیلی ہوگی۔ آنے والی گھڑیوں میں اسی آرام کے خوش آئند تصور نے ہم کو زندہ رکھا۔ لیکن سڑکوں پر جو لوگ چل رہے تھے، ان میں سے بہت سے ننگے پاؤں تھے کچھ لوگ صرف چپل پہنے ہوئے تھے۔ واقعی غریبوں کے لئے تو اتنی سردی ایک عذاب بن جاتی ہے۔ ان کشمیریوں کا سہارا تو کانگڑی ہے، جسے یہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کانگڑی ہی انہیں گرمی فراہم کرتی ہے اور کڑاکے

کی سردی سے کسی حد تک بچاتی ہے۔

وزیراعظم نے شہر میں کئی آستانوں پر حاضری دی۔

ہم اکثر پیچھے رہ جاتے اور کبھی کبھی تو اپنی جیپ میں ہی بیٹھے رہتے، کیوں کہ برف کا پانی گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ دو ایک بار ہماری جیپ زنجیروں کے باوجود برف میں پھنس گئی۔ اور ایک جگہ تو اس طرح پھسلی کہ ہم نے سوچا کہ ہم گئے۔

شام ہوئی تو ہم نے سوچا کہ اب وزیراعظم راج بھون کا رُخ کریں گے۔ لیکن صاحب، وزیراعظم کو نہ تو سردی لگ رہی تھی اور نہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ سیدھے پہنچے ڈل جھیل اور وہاں شکارے میں بیٹھ گئے۔ ڈل پر ایک ڈیڑھ انچ برف جمی ہوئی تھی۔ آگے آگے پاور بوٹ چلی اور برف توڑ کر راستہ بناتی گئی۔ پر ٹیلی جھیل میں شکارے چلتے گئے۔ جھیل کے درمیان جو گاؤں ہے، وزیراعظم وہاں بھی گئے اور لوگوں کے گھروں میں گھُپ اندھیرے میں ان سے باتیں کیں۔ پورے گاؤں میں ان کی آمد سے ایک ہلچل سی مچ گئی کچھ گھروں میں جانے کے بعد وزیراعظم واپس شکارے میں آ گئے۔ ہم شکارے میں ان کی ایک تصویر کھینچنا چاہ رہے تھے۔ کچھ ہماری بے چینی، کچھ ارد گرد کی بھیڑ بھاڑ اور ہلچل، نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا پاؤں پھسلا اور ہم خود اپنے جھیل کے پانی کے اندر پہنچ گئے۔ ہم نے فوراً ہاتھ اونچے کر کے اپنے قیمتی کیمرے کو بچانے کی کوشش کی۔ بے اختیار چیخ بھی نکل گئی۔ ہم کو کس نے نکالا، یہ ہم کو خبر نہیں۔ بس بال بال بچ گئے۔ پوری پتلون برف سے جم گئی اور سردی لہر دماغ کی رگوں تک میں پیوست ہو گئی۔ ان ہی گیلے، برفیلے کپڑوں میں ہم بیٹھے رہے اور جب راج بھون پہنچے تو وہاں ہیٹر کے سامنے اپنے کپڑے سُکھائے۔

دوسرے دن بھی خوب برف پڑ رہی تھی۔ ہم حسب معمول راج بھون پہنچ گئے۔ اس روز بھی کسی کو کچھ نہ معلوم تھا کہ وزیراعظم کہاں کہاں جائیں گے۔ خیر سے دھوپ نکلی ہوئی تھی، جس کی کرنوں سے ساری وادی درخشاں تھی۔ واپسی کا اب بھی کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمیں لے جانے والا جہاز یہاں اتر سکتا ہے یا نہیں۔ وزیراعظم گلمرگ جانا چاہتے تھے اور انہوں نے وہیں کا رُخ کیا۔ اس بار ڈاکٹر فاروق اور وزیراعظم کے بچے بھی ساتھ تھے۔ کئی جگہ راستہ بالکل بند تھا، جسے جلدی کر کے صاف کرایا گیا۔ سیکورٹی والے الگ پریشان تھے، کیوں کہ ان کو اتنی ٹھنڈ اور برف کی عادت نہ تھی۔ ہم سب ٹنگ مرگ تک پہنچے، جو گلمرگ سے کچھ پہلے آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ٹنگ مرگ سے آگے جانا ناممکن ہے۔ چنانچہ ہم سب نے یہاں چائے پی اور پھر یہاں سے واپسی کی راہ پکڑی۔

راستے میں ہی یہ خوش خبری ملی کہ دلّی سے وزیراعظم کا خاص جہاز پہنچ گیا ہے اور ٹیک آف بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم نے سیدھے ہی ایرپورٹ کا رُخ کیا۔ اپنا سامان تو ہم صبح سے ساتھ ہی لئے پھر رہے تھے۔ اس طرح وزیراعظم کے ساتھ ہم آرام سے ان کے جہاز میں دلّی واپس آ گئے۔ انڈین ایرلائنز کا جہاز اس کے بعد بھی موسم کی خرابی کے باعث کئی دن تک سری نگر نہیں پہنچ سکا۔ اگر ہم انڈین ایرلائنز کے انتظار میں رہتے تو سری نگر میں مزید قیام کرنا پڑتا۔ ●●

بانو سی ملی

بغیر عنوان کے

سعید سہروردی

رحمت نے مجھ سے پوچھا۔ "بابوجی، آپ نے تاج محل دیکھا ہے؟"

"ہاں، دیکھا ہے۔ چاندنی رات میں گرمی کی تپتی دوپہر میں، دن کے پہلے پہر میں، اور رات کو صدر دروازہ بند ہونے سے پہلے۔ میں نے تاج کو ہر رنگ اور ہر حال میں دیکھا ہے"

"آپ خوش نصیب ہیں۔ میں جب اجمیر جاؤں گا تو پہلے دہلی آؤں گا۔ اور اجمیر سے لوٹتے وقت آگرہ بھی جاؤں گا۔"

"رحمت، آگرہ جاکر کیا دیکھے گا؟" یہ سوال میرے دماغ میں چبھنے لگا۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں کہا

لکھنؤ میں قیصر باغ میں ایک اخبار کی عمارت کے سامنے بیٹھا اندھا فقیر رحمت میرا دوست بن گیا تھا۔

"یہ میرا کارڈ ہے اسے اپنے پاس رکھ لو۔ کسی سے پڑھوا لینا اور دہلی آؤ تو اس پتے پر آجانا۔"

اُس نے کارڈ میرے ہاتھ سے اس طرح لیا جیسے اس کے حروف اُبھرے ہوئے ہوں اور وہ انہیں چھوکر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ سوچتے ہوئے اُس نے کہا۔ "میری جھولی میں ایک تصویر ہے آپ کا کارڈ اس کے پاس رہے گا"

"کس کی تصویر ہے؟"

"آج مت پوچھئے۔ دہلی میں دکھا دوں گا اور سب کچھ بتا دوں گا۔"

رحمت سے میری دوسری ملاقات آگرہ جانے والی گاڑی میں ہوئی۔ وہ فلمی بھکاریوں کے گیت گاکر آواز دے رہا تھا:

"دے دے دلا دے اللہ کے نام پر۔ خدا سب کا مددگار ہے"۔

"رحمت، تم نے لکھنؤ چھوڑ دیا؟"

وہ اپنا نام سُن کر چونک گیا۔

"بابوجی، آپ کی آواز جانی پہچانی لگتی ہے آپ شوکت صاحب تو نہیں؟"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"آپ نے اپنا کارڈ دیا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد میں نے پڑھوایا تھا۔ فٹ پاتھ پر مجھے اندھے بھکاری کو کون اپنا کارڈ دیتا ہے۔ میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟"

وہ میرے پاس کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی جھولی سے ٹٹول کر کچھ نکالا۔ اس نے میرا کارڈ ایک نیلے سے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ "پچھلی بار جب میں دہلی سے لکھنؤ گیا تو تم مجھے اپنی جگہ نہیں ملے۔"

"آپ وہاں گئے تھے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا۔ میں تمہارے لئے دُھوپ کی عینک بھی لے گیا تھا۔"

"اچھا!"

رحمت خاموش ہوگیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

"بابوجی، ایک بات کہوں؟"

"کہو!"

"میں دُھوپ کی عینک لے کر کیا کروں گا میرے لئے تیز دُھوپ اور اندھیری رات دونوں برابر ہیں۔"

رحمت، فرق تم نہیں سمجھوگے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اِسے میرا تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔"

میں یہ کہہ کر اس کا دِل نہیں دُکھانا چاہتا تھا کہ اُس کی دونوں آنکھوں کے ویران حلقوں کی وجہ سے اس کا چہرہ ڈراؤنا اور بدصورت لگتا تھا۔ بہت سے لوگ خصوصاً عورتیں اور لڑکیاں اُس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے میں نے سوچا کہ اگر وہ کالے شیشے کی عینک لگائے گا تو اس کا چہرہ پہلے سے بہتر لگے گا۔ شاید اُسے بھیک بھی زیادہ ملے۔

جو بات میں نے نہیں کہی اس نے محسوس کرلی۔

"بابوجی، میں کانوں سے سُنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں۔ آپ کی بات میں سمجھ گیا۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ آپ کی دی ہوئی عینک لگاکر میں یہ سمجھوں گا کہ آپ کی آنکھیں مجھے مل گئی ہیں۔"

وہ دھوپ کی عینک زیادہ مہنگی نہیں تھی کناٹ پلیس میں گھومتے وقت ایک چھوکرا دھوپ

کی عینکیں اور کنگھیاں لئے ہوئے میرے پیچھے پڑ گیا۔ اچانک رحمت کا چہرہ مجھے یاد آ گیا اور میں نے عینک خرید لی۔

جب میں نے اُس کی آنکھوں کی جگہ کالی عینک کا تصور کیا تو میرے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔

رحمت نے عینک ہاتھ میں لے کر اسی طرح اس پر بھی ہاتھ پھیرا جیسے اُس نے میرے کارڈ کو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی جب وہ اس پر اپنی انگلیاں چلا رہا تھا تو میں نے اُسے ٹوک دیا

"لگاؤ گے نہیں؟"

رحمت نے عینک سنبھال کر رکھ لی جب وہ جانے کے لئے آگے بڑھا تو میں نے پوچھا،

"تمہیں تو سورداس اور کبیر کے دوہے یاد تھے۔ تم یہ فلمی گانے کیوں گاتے ہو؟"

"پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس نے یہ سوال کیا ہے۔"

وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا اگلے اسٹیشن پر اُتر گیا

اس کے بعد رحمت سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا عرس ہونے والا تھا۔ عام طور پر لوگ دہلی میں نظام الدین اولیاؒ اور مہرولی میں قطب صاحب کے مزاروں پر حاضری دے کر اجمیر شریف جاتے ہیں اور آگرہ ہوتے ہوئے واپس ہوتے ہیں۔

صبح کے آٹھ بجے تھے۔ میرے نوکر نے اطلاع دی، ایک سورداس آپ سے ملنے آئے ہیں۔ آپ کا کارڈ ان کے پاس ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ رحمت کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ اُسے اپنے ساتھ میں اندر لے گیا۔ اُسے صوفے پر بٹھانا چاہا تو اُس نے انکار کر دیا۔ اور فرش پر بیٹھ گیا۔

"بابوجی، میں اپنی اوقات نہیں بھولتا میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

کچھ ہی دن میں رحمت کا حلیہ بدل گیا تھا۔ اب وہ مُڑا تُڑا بھکاری نہیں تھا جسے فٹ پاتھ پر دیکھ کر میں دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک چڑھائے، لمبا ہرا کُرتا پہنے وہ بزرگ فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے داڑھی بھی بڑھا لی تھی۔

"رحمت بابا۔ اب میں تمہیں اسی نام سے پکاروں گا۔ تم تو بالکل بدل گئے!"

"بابوجی، آپ مذاق کرتے ہیں۔"

"یہ ہرا کُرتا تو تم پر بہت جچ رہا ہے۔"

"جس طرح آپ نے دھوپ کی عینک دی اسی طرح یہ ہرا کُرتا بھی کسی کا دیا ہوا ہے۔ خدا کسی کو کب کیا دے گا؟ یہ کون جانتا ہے؟"

"تو یہ ہرا کُرتا خدا نے دیا ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

وہ خاموش ہو گیا پھر کہنے لگا۔ میں اٹاوہ میں کچہری کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک آدمی نے پچاس کا سکّہ میری ہتھیلی پر رکھ دیا اور بولا:

"آج میرے مقدمے کی تاریخ ہے۔ خدا سے دعا کرو میں جیت جاؤں، اگر میں جیت گیا تو تمہیں نیا کُرتا پہنا دوں گا۔ میری زبان سے بغیر سوچے سمجھے بغیر نکل گیا کہ تیرا کام ہو جائے تو ہرا کُرتا بنوا دینا۔"

"میں نے کہا۔" رحمت، بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"بابوجی، میں بُرا مان کر کیا کر لوں گا؟ آپ کی بات تو پھر دوسری ہے۔ آپ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟"

"تمہارے لئے تو سب رنگ برابر ہیں۔ تم نے ہرا رنگ کیوں مانگا؟"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے یادوں کی بھیڑ میں کھو گیا ہو۔

ذرا دیر رُک کر بولا۔" اپنے گاؤں کے ہرے بھرے کھیت میں کبھی نہیں بھول سکتا اب آپ سے کیا چھپانا۔ تاجو کو پہلی بار ہری اوڑھنی میں دیکھا تھا۔"

"تاجو، وہ کون تھی؟"

وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے بات بدلنی چاہی۔ "معاف کرنا میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔"

"بابوجی، کبھی میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا اس وقت اتنا سمجھ لیجئے کہ آپ نے تاج محل دیکھا ہے میں نے تاجو کو دیکھا تھا۔ ہاں تو میں آپ کو ہرے کُرتے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دو دن بعد وہی آدمی آیا۔ میں نے آواز سے اُسے پہچان لیا۔ اس نے کہا: "بابا، تمہاری بات سچی ہوئی۔ میرا کام بن گیا۔ میں ہرا کپڑا لایا ہوں، درزی بھی میرے ساتھ ہے۔ کھڑے ہو جاؤ اور ناپ دے دو۔ دیکھا آپ نے؟ خدا نے مجھے ہرے رنگ کا لباس اُس وقت پہنایا جب میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ عجب اس کی قدرت! عجب اُس کے کھیل!"

میں نے کہا۔" رحمت، اٹاوہ میں لوگ تمہاری بڑی قدر کرتے ہوں گے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اِسی لئے میں نے اٹاوہ چھوڑ دیا۔"

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجیے۔

۲۵ فروری ۱۹۰۷ء تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام، پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔

بغیر عنوان کے، ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"کیوں؟"

"خدا نے میری آنکھیں لے لیں۔ میرے سہارے چھین لئے تو میں نے اپنے اندھے پن کا سہارا لیا۔ لیکن اس کا بیوپار کرنے کو جی نہ چاہا۔ پہلے کوئی پانچ چھ پیسے میری جھولی میں ڈال دیتا تھا میں اُسے دل سے دعائیں دیتا تھا۔ لوگ روپے، دو روپے پانچ روپے کے نوٹ دے کر اپنے مطلب کی دُعائیں مانگنے کو کہتے تھے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔"

"کیوں؟"

"بابو جی، مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں دعائیں بیچ رہا ہوں۔ میں بھکاری ہی رہنا چاہتا تھا، بیوپاری نہیں بننا چاہتا تھا اس لئے میں نے اٹاوہ چھوڑ دیا۔"

"رحمت، تمہاری باتیں اکثر مجھے چکر میں ڈال دیتی ہیں۔"

اُس نے میری بات اَن سُنی کر دی۔ بولا۔

"شوکت صاحب، میں اجمیر جا رہا ہوں، لوٹ کر دہلی آؤں گا۔" آگرہ میں کیا رکھا ہے؟ جب بھیک کی ہی روٹی کھانی ہے تو کوئی بھی شہر ہو، کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا: "کیا تمہارا کوئی نہیں جو تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر دو وقت کی روٹی دے سکے۔"

"جو دو وقت کی روٹی دیتے ہیں وہ سب اپنے ہیں اُنہیں پرایا نہیں کہہ سکتا۔"

"تم میری بات نہیں سمجھے۔"

"آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ سب دیتے تھے۔ اور اب کوئی اپنا نہیں۔ میں جنم کا اندھا نہیں ہوں۔ میں نے اپنی دو آنکھوں سے دُنیا دیکھی ہے اور جو نہیں دیکھی تھی وہ اب دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے گھر آنے کو کہا تھا سو آج چلا آیا۔ بار بار ایک بھکاری کا آپ کے گھر آنا اچھا نہیں ہوگا۔"

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں چاہتا بھی تو اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا بڑی خود اعتمادی کے ساتھ چلا گیا۔ وہ اپنا راستہ تلاش کرنے میں ماہر ہو چکا تھا۔

دو ہفتے بعد کناٹ پلیس کے ایک ریسٹوراں کے سامنے رحمت کھڑا مل گیا۔ وہی ہرا کُرتا اور آنکھوں پر کالی عینک۔

"تم اجمیر سے واپس آ گئے؟"

"شوکت صاحب، آپ مجھے ڈھونڈھی لیتے ہیں! مجھے یہاں پانچ دن ہو گئے ہیں۔ آپ نے اپنا کارڈ اور کالا چشمہ دے کر مجھے اپنے شہر میں بُلا لیا۔ جانے خُدا کی کیا مرضی ہے۔"

"تم ہر بات خُدا پر ٹال دیتے ہو۔ تمہارا دہلی آنے کو جی چاہا تو تم آ گئے۔ تم نہ آتے تو خدا کیا کرلیتا"

"یہ نہ کہئے۔ بھروسہ چاہے خدا پر ہو یا آدمی پر، زندگی کی بنیاد وہی ہے۔"

میں نے بات بدل دی۔ "تمہارا سفر کیسا رہا؟"

"ٹھیک ہی رہا۔ ویسے میرے لئے سب ٹھکانے اور وقت ایک جیسے ہیں۔ اجمیر کی نیت تھی تو ہو آیا۔ پیسے بھی کافی مل گئے۔ سوچا، مرنا تو ایک دن ہے ہی، کیوں نہ شوکت صاحب کے شہر میں جا کر مروں۔"

یہ بات کہتے وقت رحمت کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی جو میں نے شاید پہلی بار دیکھی تھی۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھ سے جینے کی بات کرو۔ مرنا ہے تو کسی اور کی گلی ڈھونڈو۔"

وہ جھینپ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "اُس کی گلی کون سی ہے۔ یہ کون بتائے گا؟ وہ گلی اور بستی ضرور یاد آتی ہے جہاں وہ میری ہوتی تھی۔"

"میں نے پوچھا۔" وہ کہاں ہے؟"

"بابو جی، میں سوچتا ہوں، کیوں آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے؟ جب میں اکیلا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اب میں پڑھ نہیں سکتا۔ لیکن آپ نے کارڈ دیا تو میں نے رکھ لیا۔ دھوپ میری آنکھوں کو ستاتی نہیں، مگر آپ کی دی ہوئی عینک ہر وقت ناک پر چڑھائے رہتا ہوں۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟"

"تم نے کچھ دیر پہلے بھروسے کی بات کی تھی۔"

"ہاں بھروسے کا آدمی مل جائے تو سمجھ لیجئے خدا مل گیا۔ بابو جی، آپ کو یقین نہیں آئے گا، مگر اُس گھر اور اس گلی میں اُس کے نام پر اسکول چل رہا ہے۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "تاجو کے نام پر؟"

وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "تم سڑکوں پر ٹھوکریں کھا رہے ہو، در در کی خاک چھان رہے ہو اور اس کے نام پر اسکول چل رہا ہے۔ کون چلا رہا ہے اُسے؟"

وہ چُپ رہا۔ ذرا دیر بعد اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں چلا رہا ہوں۔"

میں نے ہرے کُرتے میں اس بدصورت بھکاری کو غور سے دیکھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں اسکول چلا رہا ہے۔"

میرا پارہ اُس وقت کچھ زیادہ چڑھ گیا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس سے ناراض ہونے کا مجھے کیا حق تھا؟

میں نے ترش لہجے میں کہا۔ تم اس کے نام پر اسکول چلا رہے ہو؟ جو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔"

وہ چُپ ہو گیا۔ پھر اپنی صفائی دینے لگا۔

"بابو جی، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اس کے ساتھ رہ کر میں نے پہلی بار جانا کہ سُکھ کیا ہوتا ہے، پیار کیا ہوتا ہے۔ میں اُس کی تصویر ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔"

پتہ نہیں کیوں مجھے رحمت سے ہمدردی نہیں ہو رہی تھی۔ میں اُسے کھری کھری سُنانا چاہتا تھا۔

اس نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی اور تم اُس کی تصویر لئے گھومتے ہو؟ سچے عاشقوں کے بارے میں سُنا اور پڑھا تھا، لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

"بابو جی، آپ ایک خوش نصیب اِنسان ہیں۔ آپ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ کاش، میں بھی آپ کو دیکھ سکتا۔ آپ میرے لئے کیوں اپنا دل دُکھاتے ہیں۔ تاجو میرے سہارے جینے کے لئے آئی تھی، جب وہ سہارا نہیں رہا تو میرے ساتھ رہ کر کیا کرتی؟"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"رحمت نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "بابوجی وہ پڑھی لکھی نہیں تھی جو کہیں نوکری کر کے اپنا اور میرا پیٹ پالتی۔ اور تو اور وہ خوب صورت تھی عورت کی خوب صورتی مصیبت ہے۔ جہاں گڑ ہوتا ہے وہاں چیونٹے بھی آتے ہیں۔ میں اُسے کیسے سنبھال سکتا تھا؟ چھوڑیئے ان باتوں کو آج میں آپ کو اس کی تصویر دکھاؤں گا۔"

اس نے جھولی سے ایک تصویر نکالی۔

"یہ رہی تاجو، کیسی ہے؟"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" بہت خوب صورت ہے مگر پڑھی لکھی نہیں تو کیا وہ محنت مزدوری بھی نہیں کر سکتی تھی؟"

" میری تاجو اگر محنت مزدوری کرتی تو مجھے کون سا سکھ مل جاتا؟ بابوجی' دُکھ کے نام بدل جاتے ہیں مگر دُکھ دُکھ ہی رہتا ہے۔"

رحمت سنجیدہ اور اُداس ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔" شوکت صاحب' آپ نے تاج محل دیکھا ہے۔ کاش' آپ وہ اسکول بھی آپ دیکھ لیتے جو میری تاجو کے نام پر چل رہا ہے۔ اگر آپ کا اُدھر جانا ہو تو میری یہ خواہش بھی پوری کر دیں۔ میں نے اب تک آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ جو آپ نے دے دیا وہ میں نے لے لیا۔ لیکن اس بات کے لئے میں آپ کے سامنے دامن پھیلا رہا ہوں۔"

واقعی اُس نے اپنے لمبے ہرے کُرتے کا دامن دونوں ہاتھوں سے پھیلا دیا۔

اس نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔ میں نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی، رحمت اس کے بارے میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گا۔"

لیکن وہ ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔

" بابوجی، اگر کسی وجہ سے آپ نہ جا سکیں تو کسی بھروسے کے آدمی کو بھیج دیں۔ میں اس کے آنے جانے کا خرچ دے دوں گا۔"

"کیا تمہیں بہت جلدی ہے؟"

"جلدی، دیر کی بات نہیں، میں اب تاجو کو نہیں دیکھ سکتا، نہ وہ اسکول دیکھ سکتا ہوں جو تاجو کے نام پر چل رہا ہے۔"

"کیوں؟ تم خود بھی تو وہاں جا سکتے ہو؟"

اس نے لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر کہا

" میں اس کے گاؤں جاؤں گا تو پرانے زخم ہرے ہو جائیں گے۔ لوگ طعنے دیں گے کہ یہ وہی اندھا ہے جس کی بیوی بھاگ گئی تھی۔ میں یہ سب نہیں سہہ سکوں گا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں بھی پچھتانے لگا، کیونکہ اس کا دل دُکھایا

"رحمت، رونے سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"بابوجی' آج بہت دن بعد رویا ہوں۔ اجمیر جانے سے پہلے میں نے خُدا سے دُعا مانگی تھی کہ وہ بھروسے کا آدمی بھیج دے۔ جس دن آپ ملے میں نے سمجھا میری دعا قبول ہو گئی۔"

میں اُسے چھوڑ کر چلا آیا لیکن اس شام کی ملاقات مجھے بار بار یاد آ کر ستاتی رہی۔

" بابوجی' آپ جلال پور جائیں گے۔ آپ فرشتہ ہیں۔ آپ کے تو پاؤں دھو دھو کر پینا چاہئیں"

رحمت کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا تھا اُس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے اسے ڈانٹا

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میرے اندر پاگل پن بڑھ رہا ہے۔"

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ کچھ دیر بعد بڑے نرم لہجے میں بولا " آپ راجدھانی کے رہنے والے ایک اندھے بھکاری کے لئے دیہات کی پگڈنڈی پر اپنے پاؤں تھکانے کے لئے تیار ہو گئے۔"

"بس بس، بہت سُن لیا تم مجھے صحیح پتہ بتاؤ تاکہ مجھے بھٹکنا نہ پڑے۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی اور دُنیا بدل جاتی ہے۔"

"بابوجی، وہ دُنیا بدلی نہیں، ختم ہو گئی لیکن میں نے اُسے اپنے من میں زندہ رکھا ہے۔ جانے سے پہلے آپ پوری بات سُن لیں تو آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اٹاوہ میں تھا اور وہاں لوگ مجھے ہرے بابا کہنے لگے تھے ایک دن ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں بچپن میں چلی گئی تھیں۔ اُس نے اندھوں کے اسکول میں کئی کام سیکھے تھے اور کہیں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے ایک کہانی سوچی میں نے اس سے کہا۔"میرا ایک دوست بہت امیر ہے اور وہ اپنی بہن کے نام پر ایک اندھوں کا ایک اسکول کھولنا چاہتا ہے اگر تم اسکول چلا سکو تو میں اُس سے بات کروں۔ وہ اندھا نوجوان فوراً تیار ہو گیا۔ میں نے اس سے اگلے دن آنے کو کہا۔ اگلے دن جب وہ آیا تو میں نے اُسے اپنے گھر جانے کو کہا۔" جاؤ، اس گھر میں اسکول کھول دو۔ تمہیں ہر مہینے روپے ملتے رہیں گے، گاؤں پہنچ کر اُس نے خط لکھا کہ اسکول کھل گیا ہے اور اُسے سامان خریدنے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے فرضی دوست کا نام اُسے گم نام بھارتی بتایا تھا اور اسی نام سے میں اُسے منی آرڈر بھیجتا ہوں اور رسید پوسٹ ماسٹر کے ذریعے منگا لیتا ہوں۔"

رحمت نے جھولی سے منی آرڈر کی رسیدوں کا ایک بنڈل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ منی آرڈر گم نام بھارتی نے کشن پانڈے کو بھیجے تھے۔ سب پر لینے والے اور گواہوں کے انگوٹھے کے نشان تھے

جلال پور پہنچنے پر تاج اسکول کا سراغ کہیں نہیں ملا۔ میں نے رحمت کا نام لے کر پوچھا تو چوپال کے قریب چارپائی پر پڑے ہوئے ایک بوڑھے کو یاد آیا۔" ارے وہ ماسٹر جس کے ٹرک نے ٹکر مار دی تھی۔ بے چارہ اندھا ہو گیا تھا بیوی بھاگ گئی تھی، پتہ نہیں کہاں چلا گیا؟"

پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ رحمت اسکول میں پڑھاتا تھا۔ شاید اسی لئے مجھے اس کی باتیں چونکا دیتی تھیں۔

میں نے بوڑھے سے پوچھا۔" اس کا گھر کہاں تھا؟"

" وہ اِملی کے پیڑ کے پاس جہاں پر دھان کی بھینسیں بندھی ہیں۔"

میں نے اس جھونپڑی کی طرف نظر دوڑائی

جہاں سات بھینسیں کھڑی یا بیٹھی جُگالی کر رہی تھیں۔

تو یہ تھا وہ تاج محل جو رحمت نے اپنی محبت کو زندہ رکھنے کے لئے بنوایا تھا۔

میں نے بوڑھے سے پوچھا۔ "کیا وہاں کبھی اندھوں کا اسکول تھا؟"

بوڑھے نے کچھ یاد کر کے کہا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ایک اندھا آیا ضرور تھا۔ کہتا تھا، گاؤں میں اِسکول کھولوں گا۔ مندر میں پڑا رہتا تھا۔ دس پندرہ دِن میں بھوکوں مرنے لگا تو کسی طرف نکل گیا۔"

اب پہیلی کی ایک کڑی باقی رہ گئی تھی، وہ بچن پانڈے کون تھا۔ جو گُم نام بھارتی کے منی آرڈر وصول کر رہا تھا؛

میں نے بوڑھے سے ڈاک خانے کا پتہ پوچھا اور وہاں جا کر پوسٹ ماسٹر سے ملا۔

"میں گُم نام بھارتی کا دوست ہوں۔ بچن پانڈے سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس سے پوچھنا ہے کہ اُسے منی آرڈر مل رہے ہیں یا نہیں؟"

پوسٹ ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔ "پوسٹ مین حلقے میں گیا ہے۔ اُسے لوٹ آنے دیجئے۔ اس کے ساتھ چلے جائیے گا۔ وہ آپ کو پتہ بتا دے گا۔"

بچن پانڈے کا نام سنتے ہی پوسٹ مین کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ منی آرڈر کی بات سُن کر وہ گھبرا گیا۔ پہلے تو وہ سکتے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور مجھے بچن پانڈے کا پتہ بتانے لگا:

"سامنے پگڈنڈی پر سیدھے چلے جائیے گا۔ آگے جا کر بائیں ہاتھ کو مُڑ جائیں۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد پیپل کا ایک پیڑ ملے گا۔ وہاں ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ بچن پانڈے وہیں رہتا ہے۔"

مندر کے پاس پہنچ کر میں نے ایک آدمی سے کہا۔ "مجھے بچن پانڈے سے ملنا ہے۔" اُس نے مندر کی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف اِشارہ کیا۔ "وہ رہا بچن پانڈے۔"

بچن پانڈے کالا، ناٹے قد کا، ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔ جس کا ایک سِرا گردن کے اُوپر گھما کر اُس نے پیٹ پر ڈال رکھا تھا۔

وہ اپنا نام سُن کر چونک پڑا۔

وہ اندھا نہیں تھا۔ اُس کی دونوں آنکھیں ٹھیک تھیں۔ اُن میں ایسی چمک تھی جسے دیکھ کر مجھے چالاک لومڑیوں کی کہانیاں یاد آ گئیں۔ اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔

"مجھے گُم نام بھارتی نے بھیجا ہے۔"

اچانک اُس کی آنکھوں کی چمک گُم ہو گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اُس نے دھیمے لہجے میں پوچھا: "کیسے کشٹ کیا آپ نے؟"

"میں اِدھر آ رہا تھا تو بھارتی جی نے کہا۔ کہ آپ سے مِل لوں۔"

"منی آرڈر تو آپ کو مل رہے ہیں نا؟"

اس نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا، لیکن وہ گراموفون کی طرح بجنے لگا۔ "بھارتی جی کی کرپا ہے۔ مہان پُرش ہیں۔ ایسے دھرماتما کہاں ملتے ہیں؟"

میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "بھارتی جی آپ کو کیسے جانتے ہیں؟"

ایک بار پھر اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ لیکن اُس نے فوراً نئی کہانی سُنا دی۔ "بھارتی جی ایک بار یہاں پدھارے تھے۔ اُن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے ان کی سیوا کی تھی، اسی کارن وہ تردھن برہمن کو دان دیتے ہیں۔"

میں نے بچن پانڈے کا آشیرواد لیا اور جلال پور سے لوٹ آیا۔

رحمت کے گھر پر گاؤں کے پردھان کا قبضہ تھا۔

وہ اندھا ماسٹر جسے اُس نے گاؤں میں اِسکول کھولنے کے لئے بھیجا تھا جلال پور میں رہا ہی نہیں۔ جو رقم وہ منی آرڈر کے ذریعے بھیجتا تھا وہ ایک غلط آدمی وصول کر رہا تھا۔

یہ تھا وہ تاج محل کا تصور جس کے سہارے اندھا بھکاری رحمت جی رہا تھا۔ اُسے سچائی بتا کر میں اُس کے دِل کا چراغ نہیں بجھانا چاہتا تھا کہ اُس کی بھیک کے پیسے کس نکمے دھوکے باز کی جیب میں جاتے ہیں۔

نئی دہلی کے جس ریسٹوران کے سامنے رحمت سے مِل کر میں جلال پور گیا تھا۔ وہاں اُسے نہ پا کر میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ میں نے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے پان والے سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک شام پولیس والوں نے رحمت کو پریشان کیا تو اس نے جگہ بدل دی، لیکن شام کو ساڑھے پانچ اور چھ کے درمیان وہ ضرور آتا ہے اور میرے بارے میں پوچھتا ہے۔

دوسرے دِن میری اس سے ملاقات ہو گئی میری آواز سُنتے ہی اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ آیا جس سے ظاہر تھا کہ وہ گھڑیاں گِن گِن کر میری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

"آپ واپس آ گئے۔ سب ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اسکول کیسا چل رہا ہے؟"

"اسکول تو بہت ترقی کر گیا ہے۔ دُور دُور تک اِس کا چرچا ہے۔"

"اچھا۔" رحمت نے حیرت سے کہا۔

"اسکول کو سرکار پیسہ دینے لگی ہے۔ اس کی اپنی عمارت ہے۔ میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ملا تھا اس نے کہا کہ گُم نام بھارتی جی اب اپنے پیسے کو کسی اور کام میں لگائیں۔ اسکول اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔"

کچھ دیر بعد رحمت نے ٹھنڈی سانس لے کر اُداس لہجے میں کہا۔ "اچھا ہوا آپ اسکول دیکھ آئے اب تاجو سے آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔"

میں اُس سے کچھ اور نہ کہہ سکا۔

اُس نے مجھ پر بھروسا کیا تھا اور میں نے پھر بھی اس سے جھوٹ بولا تھا۔ میرے اور اس کے رشتے کی بُنیاد بھروسے پر تھی اور وہ بُنیاد ختم ہو چکی تھی۔

اُس شام کے بعد میں نے اُس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ■■

ایک آدمی شہر سے اپنی سسرال گیا، جو ایک گاؤں میں تھی۔ وہاں اس نے اپنے سالے کو سوغات میں ایک عطر کی شیشی دی۔ سالے نے بے تابی سے عطر کی شیشی ہتھیلی پر انڈیلی اور سارا عطر چاٹ گیا۔ یہ دیکھ کر اس آدمی کو بڑا غصہ آیا اور اس نے اپنے سسر سے اس بدتمیزی کی شکایت کی: "میں نے اسے عطر لگانے کو دیا تھا، یہ ہتھیلی پر ڈال کر چاٹ گیا"

سسر فوراً بولے "بڑا بے وقوف ہے! جب گھر میں روٹی موجود تھی تو اسے لگا کر کھانا تھا۔"

●

ایک سینما ہال کے گیٹ کیپر کے دانت میں درد تھا۔ وہ تکلیف برداشت نہ کر سکا تو ڈاکٹر کے پاس پہنچ کر کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب میرے دانت میں تکلیف ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا "کون سے دانت میں؟"

گیٹ کیپر کہنے لگا "بالکنی میں دائیں طرف سے پانچویں نمبر پر۔"

سید ریاض اختر، حیدرآباد

●

گاؤں کی ایک عورت پہلی مرتبہ ٹیکسی میں بیٹھی۔ سگنل دینے کے لئے جب ٹیکسی ڈرائیور بار بار ہاتھ نکالنے لگا تو وہ بولی "ڈرائیور صاحب تمہیں بار بار ہاتھ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اگر بارش ہونے لگی تو میں خود تمہیں بتا دوں گی۔"

کے مطہرہ تبسم، آمبور

●

ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا "کیوں بھائی، تمہارے سر کے سارے بال سفید ہو گئے ہیں، مگر داڑھی ابھی تک اسی طرح کالی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

دوست نے جواب دیا "وجہ کیا ہوتی! داڑھی سر کے بالوں سے بیس سال چھوٹی بھی تو ہے۔"

شیخ جلیل احمد آتش، کھمم

●

ایک چھوٹی سی بچی دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آئی اور بولی "ممی! پاپا کیا چوہے ہیں؟"

ماں نے جھنجھلا کر کہا "کیوں؟ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟"

بیٹی نے معصومیت سے جواب دیا۔ "میں جب بھی ان کے پاس جاتی ہوں تو کہتے ہیں، چل بھاگ یہاں سے، دیکھتی نہیں بل بنا رہا ہوں۔"

●

اخلاقیات کا پیریڈ تھا۔ جھوٹ کے موضوع پر لیکچر دینے سے پہلے پروفیسر نے طلبا سے پوچھا "آپ میں سے کس کس نے اس کتاب کا دسواں باب پڑھا ہے؟" پوری کلاس نے ہاتھ کھڑے کر دئے۔ یہ دیکھ کر استاد نے کہا "میرے مخاطب بالکل صحیح لوگ ہیں، کیوں کہ اس کتاب کے کل آٹھ باب ہیں۔" (نیلوفر دہلوی)

●

دماغی بیماریوں کے ہسپتال کا ڈاکٹر اپنے ایک مریض کے ساتھ اکثر کھیل کیا کرتا تھا۔ وہ اسے دس پیسے کا سکہ اور ایک روپے کا نوٹ دکھا کر پوچھتا: "بولو، تم کیا لوگے؟" اور وہ مریض ہر بار دس پیسے کا سکہ ہی مانگ لیتا تھا۔

جب بیس دن تک لگاتار مریض دس پیسے کا سکہ مانگتا رہا تو نرس سے نہ رہا گیا اور اس نے مریض سے پوچھا "تم روزانہ صرف دس پیسے کا سکہ کیوں مانگتے ہو؟ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ نوٹ سکے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے؟"

مریض نے جواب دیا "جانتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جس دن میں نے روپیہ لے لیا اس دن سے ڈاکٹر یہ کھیل بند کر دے گا۔"

عطاء اللہ خاں، برہانپور

●

ایک مشہور اخبار کے دفتر میں ایک شخص نے شعبۂ اشتہارات کے نگراں سے پوچھا "موت سے متعلق اشتہار دینے پر کیا خرچ آئے گا؟"

اشتہارات کے نگراں نے جواب دیا۔ "پندرہ روپے فی انچ۔"

"اوہ! پھر تو بہت خرچ آئے گا۔ مرنے والا تو پانچ فٹ دس انچ لمبا تھا۔" اس شخص نے کہا۔ (رعنا آمبوری، آمبور)

●

بیوی نے شوہر سے کہا "میں شروع سے ہی کہہ رہی تھی کہ ہمارا نوکر اچھا نہیں ہے۔ اسے چوری کی عادت ہے۔"

شوہر نے پوچھا "کیا چرایا اس نے؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "اس نے دو بڑے تولیے چرا لئے۔ جب ہم کلکتہ کی سیر کو گئے تھے تو یہ تولیے میں ہوٹل سے اٹھا لائی تھی۔"

رحیم النساء بخشی، بلگام (کرناٹک)

○○

اپنے لطیفے اس پتے پر بھیجیے: "تبسم"، ماہ نامہ "بانو" آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

البم

میں تو اتنی سی اِک نور کی بوند تھی
دِل کی گہرائیوں سے پکارا مجھے
"یہ" میری ماں ہے جس نے ستم جھیل کر
آسماں سے زمیں پر اُتارا مجھے

یہ جو لڑکی ہے سُندر ٹھمکتی ہوئی
میرے معصوم بچپن کی تصویر ہے
اِس کا دامن، کہ جس میں کھلونے نہیں
اُس کے آگے کے خوابوں کی تعبیر ہے

"یہ" ہے میری بہن جس کی تقدیر میں
لکھنے والے نے لکھی تھیں تاریکیاں
مرتے مرتے بھی پیاری نے تھاما مجھے
اور کہا، میں ہوں اُس کے بچے کی ماں

میں کلی ایک نادان سہمی ہوئی
تیاگ کے پاک جذبات سے آشنا
اپنے بارے میں کچھ میں نے سوچا نہیں
اور "یہ" مجھ کو کہتا رہا بے وفا

یہ وہی بُت ہے جس کی محبت میں میں
ہر گھڑی بت سے خواب سی رہی
ریت پر حسرتوں کے بنا کر محل
سیپیاں دل کے ساحل پہ چُنتی رہی

نا سمجھ تھا یہ، اس کو پتہ ہی نہ تھا
برہ کی آگ، چاہت کا انجام ہے
ہر زمانے میں، ہر رُت میں، ہر موڑ پر
ضبط ہی پیار کا دوسرا نام ہے

"یہ" میرا لال ہے۔ "یہ" بہو ہے میری
طنز کرتی ہے مجھ پر کہ میں ماں نہیں
یہ نہیں جانتی میرے ایثار کو
کیا میری کوکھ کا کوئی ارماں نہیں؟

میرے آنچل میں کچھ پھول کھلتے اگر
اُن کی خوشبو میں حد سے گزر جاتی میں
اندھی ممتا کی ضد توڑ دیتی مجھے
ٹھوکریں کھا کے گرتی بکھر جاتی میں

درد کی آہٹیں، تہمتیں، چاہتیں
پاس جو کچھ بھی تھا سب فنا ہو گیا
اب تو میں ایسے ہوں جیسے سایہ چلے
میرا احساس مجھ سے جُدا ہو گیا

روح کے فرش پر ٹمٹماتے ہوئے
بھولے بسرے چراغوں کا البم ہے یہ
گُم شدہ چند یادوں کا اِک مقبرہ
دِل کے ویران داغوں کا البم ہے یہ

کرن کلیانی

ان کہی

ہر سہیلی سے ــــ ہمیشہ
موسموں کی بات کرتے کرتے
تم خاموش ہو جاتی ہو
جیسے کھو گئی ہو
اپنے ماضی کے گلستاں میں
جہاں میں بھی تمہارا ہم نفس ہوں

تمہاری خامشی سب کہہ رہی ہے
ان کہی باتیں
جنہیں تم بھول جانا چاہتی ہو
اور یہی باتیں
تمہاری اِک متاعِ زندگی ہیں
اب جنہیں تم ہر گھڑی ہر لمحہ
سینے سے لگائے پھر رہی ہو
اِک امانت کو چھپائے پھر رہی ہو

رحمٰن جامی

ماں

ماں!
میرا ایمان ہے
تیرے تلووں کے نیچے
میری جنت ہے
لیکن
اپنے پلائے دودھ کی قسم
بتلا ماں!!
جب سے میری شریکِ زندگی نے
اس گھر کی دہلیز پر
قدم رکھا ہے
میری زندگی
جہنم کیوں ہے؟

تنویر اختر

مدرسہ: بچوں کی آزمائش گاہ ہے

محمد رضی الدین معظم

جب بچہ مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو اُسے سماجی زندگی کی نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی نشو و نما اور پرورش میں غلطیاں کی گئی ہوں تو وہ اس آزمائش سے خائف ہو جاتی ہیں۔ مدرسے میں داخل ہو جانے کے بعد بچے کو بڑے پیمانے پر تعاون کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ گھر میں لاڈ سے بگاڑ دیا گیا ہو تو وہ اس تعاون کو پسند نہیں کرتا اور دوسرے بچوں کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھتا۔ اس طرح پہلے ہی دن ایسے لاڈلے بچے میں سماجی جذبات کی کمی کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بچہ مدرسے میں رونے لگے اور گھر واپس آ جانا چاہے۔ وہ نہ تو مدرسے کے مشاغل میں دل چسپی لے گا اور نہ مدرّس سے مانوس ہوگا۔ وہ چونکہ ہر وقت اپنے آپ میں ڈوبا رہے گا اس لئے مدرسے میں ٹیچر کی باتوں پر کان نہ دھرے گا اور جب اپنے آپ میں محو رہے گا تو ظاہر ہے کہ تعلیم میں پیچھے رہ جائے گا۔ بچوں کے والدین کو اکثر یہ کہتے ہوئے سُنا گیا ہے کہ ان کے بچے جب گھر میں رہتے ہیں تو کچھ تکلیف نہیں دیتے، لیکن جب مدرسے جاتے ہیں تو باعثِ زحمت بن جاتے ہیں، ہوتا یہ ہے کہ بچہ جب تک گھر میں رہتا ہے وہ خود کو اپنی مرضی کے موافق ماحول میں پاتا ہے؛ جہاں نہ اس کو کوئی آزمائش کی جاتی ہے اور نہ اس کے عیوب اور نقائص نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مدرسے میں کوئی اس کے ناز نہیں اٹھاتا، وہ خود کو شکست خوردہ حالت میں پاتا ہے۔

ایک بچہ تھا، جو اسکول میں ٹیچر کی ہر بات پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہ کرتا تھا۔ اسکول کے کسی کام سے کبھی اس نے کوئی دل چسپی ظاہر نہیں کی۔ اس کے متعلق اسکول میں عام خیال تھا کہ یہ کمزور دماغ والا ہے ایک ماہرِ نفسیات نے جب اسے دیکھا تو اس سے کہا کہ ہر شخص تعجب میں ہے کہ تم مدرسے میں تمام وقت ہنستے کیوں رہتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اسکول ایک مذاق کی چیز ہے' جس کو والدین نے اپنے بچاؤ کے لئے قائم کر رکھا ہے اور بچوں کو بے وقوف بنانے کے لئے وہاں بھیجتے ہیں اس بچے کے بارے میں پتہ چلا کہ گھر والے ہمیشہ اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے' جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اسکول کو بھی اپنے خلاف مذاق ہی سمجھتا رہا۔ ماہرِ نفسیات نے یہ بات اس کے ذہن نشین کی کہ وہ اپنی شان قائم رکھنے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کر رہا ہے اور یہ کہ ہر شخص اس کو بے وقوف نہیں بناتا۔ جب یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تو وہ اسکول کے مشاغل میں دل چسپی لے کر تعلیم میں ترقی کرنے لگا۔

ٹیچر کا کام ہے کہ وہ بچوں کی مشکلات معلوم کرے اور والدین کی غلطیوں کی اصلاح کرے۔ ٹیچر کو بعض ایسے بچوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو اسکول کی وسیع سماجی زندگی میں آسانی سے داخل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بچوں کو گھروں میں دوسروں سے دل چسپی رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے، جب کہ بعض بچوں کو گھروں میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی۔

جب کوئی شخص کسی مسئلہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگتا ہے یا اس مسئلے سے دُوری اختیار کرتا ہے۔ ہر وہ بچہ جو کسی قدر غبی ہو لیکن کم عقل نہ ہو' سماجی زندگی میں داخل ہونے سے ہچکچاتا اور گھبراتا ہے۔ لیکن ٹیچر اگر چاہے تو اس بچے کی اس طرح مدد کر سکتا ہے کہ وہ اپنا ماحول یعنی آس پاس کی سماجی زندگی میں اپنی جگہ نکال لے۔ اب سوال یہ ہے کہ ٹیچر بچے کی مدد کس طرح کرے؟ اس کے لئے ٹیچر کو وہی کرنا چاہیے جو ماں کرتی ہے، یعنی یہ کہ بچے کو اپنے سے مانوس کر لے اور اس میں اپنے لئے دل چسپی پیدا کر دے۔ اس اُنسیت اور دل چسپی سے بچے کی اسکولی زندگی کی بنیاد مضبوط ہوگی۔ اس کے برخلاف سختی اور مار پیٹ سے بچے میں دل چسپی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی بچہ اسکول میں داخل ہونے کے بعد ٹیچر اور اپنے ہم جماعت بچوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے عمل کو مشکل پائے تو بچے پر اعتراضات کی بارش کرنے اور اس کو سخت وسُست کہنے سے بدتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو بچے کے عمل کی تائید ہی ہوگی اور اس کا اسکول سے نفرت کرنا حق بجانب ہوگا۔

جب ٹیچر بچے کی دل چسپی اور اپنے سے اُنسیت حاصل کرنا ضروری سمجھے گا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کرے گا کہ بچے کی پہلی دل چسپیاں کیا ہیں۔ اور پھر یہ بات بچے کی ذہن نشین کرے گا کہ جس طرح سے وہ دوسری چیزوں سے دل چسپی لیتا رہا ہے، ویسے ہی اسکول اور ٹیچر سے بھی دل چسپی پیدا کر سکتا ہے۔ جب بچے کو کسی ایک معاملے میں اعتماد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر دوسرے معاملات کے متعلق اس میں اعتماد پیدا کرنا آسان ہو جاتا ہے تب بچہ خود تعلیم کے مقصد کو جان کر تعلیم سے عملی فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ●●

سراب

رفعت جاوید

ثوبیہ اطمینان کے ساتھ ٹیکسی میں آ بیٹھی۔ آج وہ کس قدر پُرسکون تھی ٹیکسی سڑک پر آ نکلی، ثوبیہ نے اشارے سے ڈرائیور کو نرسری اسکول کا راستہ بتایا۔ وہاں پارک میں بچے کھیل رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کا اپنا بچپن کھیل میں شامل ہے پھر وہ اپنے اسکول کی جانب بڑھ گئی۔ وہاں لڑکپن کی شرارتیں اور بچپن کی الوداعی نظروں نے استقبال کیا۔ وہ اس منظر سے لطف اندوز ہوتی ہوئی اپنے کالج پہنچ گئی، جہاں جوانی بھرپور امنگوں کے ساتھ براجمان تھی۔ وہ جھوم اٹھی۔ ایک ایک لمحہ خوبصورت اور پُرمسرت لگا۔ ان ہی حسین یادوں کو دامن میں بھرے وہ اپنے آپ کے قریب ہوتی ہوئی یونی ورسٹی پہنچی۔ دل و دماغ میں زندہ رہنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے جذبے اُبھر رہے تھے اور جب وہ واپس گھر پہنچی تو کس قدر خوش تھی۔ اسی لمحے عرفان کی گاڑی پورچ میں آ رکی۔ ثوبیہ نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ عرفان کے چہرے پر ندامت و پشیمانی کے سوا اور کچھ نہ تھا، ثوبیہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ دُور بہت دُور ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گئی۔

ماضی کی جلن اور چبھن ایسی تھی کہ اس کے لاتعداد آنسو بھی اس تپش کو کم نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تڑپ اٹھتی اور اپنی تمام یادوں سے دُور، بہت دُور نکل جانے کی کوشش کرتی۔ اس پر طرّہ یہ کہ اگر اس کی اندرونی کیفیت کا چہرے پر ہلکا سا شائبہ بھی پڑ جاتا تو گھر میں ایک قیامت کا سماں برپا ہو جاتا۔ مارے خوف کے وہ عرفان کے لوٹنے سے پہلے ہی خود کو نارمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی چنانچہ کسی کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس کی صبح، اس کی شامیں کتنی اُجڑی سی ہیں۔ یہاں نہ کسی نے ماں بن کر اس کے احساسات کو جانا، نہ کسی نے بہن بن کر ساتھ دیا۔ وہ اس ظالم معاشرہ میں بالکل تنہا تھی۔ یہ اکیلا پن اور پہاڑ جیسی محرومیاں اسے ہر وقت سوگوار رکھتیں۔ وہ خوب صورت تھی، تعلیم یافتہ تھی، ذہین تھی، خوش مزاج اور ملنسار ایسی کہ اس نے ہر ایک کا دل موہ رکھا تھا۔ اسٹیج پر ڈراما ہے یا گانا، تقریر ہے یا قرأت، کبھی وہ پیچھے نہیں رہی۔ گراؤنڈ میں ہمیشہ نمایاں، اسٹڈی میں نام سرِفہرست۔ لبوں پر کلیوں کی سی مسکان سجائے، آنکھوں میں تجسس آمیز چمک لئے، دل و دماغ میں آگے بڑھنے کی لگن سموئے آسمان کی وسعتوں کو چھو لینے کا جذبہ لئے وہ منزل بہ منزل گامزن تھی کہ ایک دم اس کی تقدیر کے فیصلے کا وقت آ گیا۔

ثوبیہ کے والدین نے اس کا رشتہ عرفان سے طے کر دیا۔ عرفان کا رشتہ تھا بھی تو اتنا اچھا۔ لڑکا برسرِ روزگار، آفیسر۔ کھاتا پیتا گھرانہ۔ باعزت خاندان۔ اچھے رشتوں والی سب ہی خوبیاں موجود تھیں۔ باقی رہا بیٹی کا رجحان۔ اس کا کیا ہے؟ تھوڑا بہت تو لڑکیوں کو اپنے آپ کو نئے ماحول کے سانچے میں ڈھالنا ہی ہوتا ہے کیا ہوا اگر بیٹی کی ساری اُمنگیں، مول چپیاں اور تمنائیں ذرا دب جائیں گی۔ کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ آخر اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی کہ بیٹی کا ماتھا جھومر سے سج جائے گا۔

ثوبیہ نے بھی فرماں برداری کا ثبوت دیا۔ اور نئی، لیکن ان دیکھی زندگی کے لئے کمربستہ ہو گئی۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب اسے اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ گھر جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی، کلکاریاں کی تھیں، اپنے دو پاؤں پر چلنا سیکھا تھا نئی نئی شرارتیں کی تھیں، راتوں کو چوری چھپے بہن بھائیوں کے بستر میں گھس کر کہانیاں سنائی تھیں، نئی نئی شرارتوں کے منصوبے بنائے تھے، وہ گھر جہاں اس نے جوانی کی حدوں کو چھوا تھا، بچپن کی شرارتوں کو جوانی کی رنگین شوخیوں میں سمویا تھا، جہاں بہن بھائیوں کا پیار

تھا، ساتھ تھا اور ماں باپ کی بے لوث محبت اور شفقت تھی، لاڈ پیار تھا اس نے وہ جنت، وہ گلزار چھوڑ دیا وہ رونقیں، وہ خوشیاں سب کو خدا حافظ کہہ دیا اور ایک نئے گھر میں، نئے ماحول میں نئے لوگوں کے ساتھ، نئی زندگی گزارنے کی کبھی نہ ختم ہونے والی آزمائش میں پڑ گئی

اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں سدا بہار پھولوں کی سیج نہیں ہوتی سسرال والے چار سو پھول ہی پھول نچھاور کر کے سیج کو آراستہ کر کے اس بات کا نئی دلہن کو یقین دلا دیتے ہیں، لیکن فریب کی عمر دراز نہیں ہوتی جلد ہی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سجے ہوئے لاتعداد پھولوں کی نرمی سے ان نوکیلے کانٹوں کو چھپایا جاتا ہے جو کل تک نمودار ہونے والے ہوتے ہیں۔ سیج پر جتنے زیادہ پھول ہوں گے، کانٹے اسی حساب سے زیادہ ہوں گے۔ ادھر پھول مرجھائے، ادھر کانٹوں نے سر نکالا۔ کتنا حسین مذاق ہے! نئی نویلی معصوم دلہن نہیں جانتی کہ وہ کتنی بڑی آزمائش سے دوچار ہو گئی ہے، کتنے کٹھن امتحان میں پھنس گئی ہے، جہاں کامیابی صرف قسمت سے حاصل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو عقل مندی، ہنرمندی اور قربانی بھی کچھ کام نہیں کرتی اور کبھی بے وقوفی، نادانی اور ناسمجھی بھی فاتح بنا دیتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شوہر بیوی کا مجازی خدا ہوتا ہے، بھگوان ہوتا ہے۔ لیکن جب بھگوان کا نزول طوفان کی صورت میں ہو تو وہ تباہیاں مچا دیتا ہے۔ عورت کی معصوم شوخیوں اور خوشیوں کی جھنکار کو اپنی ہٹ دھرمی، ظلمت اور زور کے بل بوتے پر نیست و نابود کر دیتا ہے۔ نوبیہ نے شوہر کو بھگوان کے روپ میں تسلیم کیا تھا، طوفان کی صورت میں نہیں۔ اس نے بڑے حسین سپنے دیکھے تھے۔ اس نے عرفان کو اپنا آئیڈیل تصور کرتے ہوئے تمام واہیات روایات اور بے ہودہ رسوم کو جھوم کر گلے لگا لیا تھا، ہنس کر اپنے پیاروں کی دوریاں برداشت کر لی تھیں۔ اس کے لئے یہ سب کچھ وقتی اور عارضی تھا۔ اس کے سامنے تو بڑی شاندار زندگی تھی۔ عرفان کی قربت کی چاشنی تھی، اس کی توجہ اور پیار کی روشنی تھی۔ ایک نیا گھر بسانے کی شادمانی تھی۔ اس کے لئے آزمائش کا تصور کرنا بھی گناہ تھا۔ مگر چند دنوں میں ہی حقیقت پوری طرح اس پر واضح ہو گئی کہ وہ بڑی نادان تھی، بڑی ناسمجھ تھی۔ اس کے سپنوں کی تعبیر تو بہت بھیانک روپ لئے سامنے کھڑی تھی۔ عرفان وہ ہرگز نہ تھا جیسا اس کے ذہن نے تراشا تھا۔ اس کے لئے بیوی کا گھر میں آجانا ایک عام سا عمل تھا۔ اس کی طبیعت میں اس کے لئے بڑا ٹھہراؤ اور جان لیوا سنجیدگی تھی، جب کہ وہ دوسرے گھر والوں کے ساتھ بالکل مختلف تھا۔ اسے ہر وقت دوسروں کو خوش رکھنے کی فکر لگی رہتی کیوں کہ ایک بیٹا اور ایک بھائی ہونے کے ناطے سے وہ ہر ایک کو پوری توجہ دینے کا ذمہ دار تھا۔ وہ اپنی عقل مندی سے بہت جلد جان گیا تھا کہ بیوی کو نظر انداز کرنے میں دوسروں کی بے شمار خوشیاں پوشیدہ ہیں۔ اگر ایک کو دکھی کر کے اتنے سارے لوگوں کے گھاؤ بھر سکتے ہیں یا ایک کو پیاسا رکھنے سے اتنے سارے لوگوں کی پیاس بجھ سکتی ہے تو ایک کو ہی قربان کر دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ سوچ عرفان کو نوبیہ سے دور کرتی چلی گئی۔ وہ ہر وقت اس سے اکھڑا اکھڑا رہتا۔ کوئی عرفان کو یہ سمجھانے کی ضرورت محسوس نہ کرتا کہ بیوی کے کیا حقوق ہوتے ہیں اور ایک گھر آباد کرنے اور اسے صحیح معنوں میں جنت بنانے کے لئے خاوند کا کیا رول ہوتا ہے بلکہ عرفان کی خوب حوصلہ افزائی ہو رہی تھی، کیوں کہ وہ سب کی نظر میں بڑا ثابت قدم تھا اور بیوی کے آنے سے رتی بھر بھی نہیں بدلا تھا۔

نوبیہ سپنوں کے حسین مرغزاروں سے باہر نکل آئی تھی وہ حقیقی جہاں میں کھڑی ہر ایک کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے لئے یہ بڑے دکھ کی بات تھی کہ عرفان کا اس سے شادی کر لینا گویا خاندان کے ہر بچے، بوڑھے، جوان پر احسانِ عظیم تھا۔ اسے مطلب تھا تو صرف اور صرف خود سے وابستہ تمام رشتوں ناطوں سے اور ہر حال میں اپنی خودداری اور انا برقرار رکھنے سے، چاہے نوبیہ کی تمام زندگی، اس کی تمام امنگیں اور اس کی نئی بنائی جنت ان جھوٹی شان و شوکت کے ٹھیکے داروں کی خوشامد کرتے کرتے بھینٹ ہی کیوں نہ چڑھ جائے۔ اسے تو صرف ایک فرماں بردار، گونگی دل و دماغ سے بے بہرہ اور خدمت گار بیوی کی ضرورت تھی۔ عرفان کے رویہ کی وجہ سے وہ اس گھر میں کسی کے لئے بھی اہم نہ تھی۔ ہر فرد اپنی اہمیت، اپنا رعب دکھانے میں اپنی مثال آپ تھا۔ ماں اپنی جگہ غرور و تکبر کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر۔ بہنیں اپنی جگہ لاتعداد خواہشوں اور حاکمانہ ذہنیت کے ساتھ براجمان۔ عزیز و اقارب، نوکر چاکر سب کے سب اس پر حکمران تھے اور نوبیہ تھی کہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی عرفان اور دوسرے گھر والوں کی ذہنیت بدل دینا چاہتی تھی جس گھر میں تمام رشتوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، وہاں وہ اپنے رشتے، اپنی موجودگی کی اہمیت کا لوہا منوانا چاہتی تھی۔ اس لئے تمام حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ ساس کی خوشی کے لئے اس نے اپنے والدین سے ملنا کم کر دیا۔ نندوں کو اپنانے کے لئے اپنی بہنوں سے منہ موڑ لیا۔ عرفان کے دل میں جگہ بنانے کے لئے وہ اس کی ہستی میں گھل مل گئی۔ اس کی اپنی کوئی سوچ نہ رہی، اپنی کوئی زندگی نہ رہی۔ وہ دوبارہ زندہ ہو جانا چاہتی تھی، مگر ان تمام ہستیوں کو جیت کر۔

نوبیہ میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، مگر اس گھر میں اسے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ اس میں کوئی خوبی نہیں۔ وہ بالکل نامکمل، پھوہڑ اور بے ہنری ہے۔ وہ ایک مثال بن کر انہیں یہ سبق سکھانا چاہتی تھی کہ وہ کسی سے کم نہیں ہے۔ اس دھن میں پس پس کر وہ مہرہ بن گئی۔ لیکن پھر بھی کسی نے

اُٹھاکر اسے آنکھوں کی ٹھنڈک نہ بنایا۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ اتنا پسنے کے باوجود کسی اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ وہ جیسا چاہتی ہے' ہزار ہا قربانیوں کے باوجود نہیں بن سکتی۔ اس نے اپنی ہستی مٹالی اور ایسی مٹی کہ مٹی ہوگئی۔ باقی کیا بچا؟ بے شمار قدموں کے نشان۔ جنہوں نے اس کو پامال کر دیا۔ اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ تعلیم چاہے کتنی ہی عام کیوں نہ ہو سسرال کی ذہنیت نہیں بدل سکتی اور مرد چاہے کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اس کے اپنے اصول ازل سے ابد تک ایک سے رہیں گے۔ ایک طرف ان پڑھ اور گنوار شوہر اور دوسری طرف پڑھے لکھے سلجھے ہوئے شوہر کے خیالات سنیں تو اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ ان پڑھ اپنی کم عقلی اور نا سمجھی کی وجہ سے اپنے خیالات کا اظہار کھلم کھلا اور دو ٹوک الفاظ میں کرے گا' جب کہ دوسری طرف باشعور شوہر بات بڑی گھما پھرا کے کرے گا اظہارِ خیال میں صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہوگا' مقصد ایک ہی ہوگا۔ حالانکہ وہی مرد جب عورت کو بیوی کے سوا کسی اور روپ میں دیکھتا ہے تو بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کے سامنے عورت ایک ماں کے روپ میں بڑی مقدس اور پاکیزہ ہستی ہے۔ بہن کے روپ میں بے حد فرماں بردار اور بے پناہ پیار کرنے والی' بیٹی کے روپ میں عطیۂ خداوندی اور رحمتِ جہاں ہے۔ داشتہ کے روپ میں سکونِ قلب اور راحتِ جاں ہے۔ پھر وہی عورت جب چند بولوں سے ایک نئے بندھن میں بندھ جاتی ہے' ایک نئے رشتے میں جڑ جاتی ہے تو اتنی حقیر کیوں سمجھی جاتی ہے ثوبیہ بھی اس گھر کے لئے بہار بن کر اپنی اہمیت کو منوانا چاہتی تھی۔ مگر اس کی ساری کوششیں بے سود نکلیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبے میں چڑھ تو گئی ہے' لیکن بیٹھنے کی جگہ اسے نہیں مل رہی ہے۔ کوئی ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے۔ ہر نگاہ اسے گھور رہی ہے۔ وہ صبر کا دامن پکڑے انتظار میں ہے۔ لیکن کبھی کبھی دامن چھوٹ جاتا ہے اور غصہ سر اُبھارنے لگتا ہے۔ وہ اس چلتی گاڑی سے کود نا چاہتی ہے مگر انجام سے خوف زدہ ہو کر چپ ہے کہ وہ بالکل تنہا ہو جائے گی۔ زمانہ اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ لوگ اس پر انگلیاں اُٹھائیں گے۔ والدین دُکھی ہو جائیں گے۔ بہن کو اس کے سسرال والے طعنے دیں گے جو بہن کنواری بیٹھی ہے' وہ عمر بھر کے لئے کنواری رہ جائے گی۔ کوئی اس کا ہاتھ تھامنے نہیں آئے گا۔ بس معاشرہ کے اصولوں کی زنجیروں نے اس کے پاؤں کو مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ انتظار تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ منزل کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کوئی دُکھ درد سننے والا نہ تھا۔ کتنی مجبور اور بے بس تھی وہ۔

وقت گزرتا گیا۔ باقی مسائل کے ساتھ ماں بننے کا مسئلہ بھی سنگین صورت اختیار کر گیا۔ اسی بے بسی کے عالم میں خوش جمال اور خوش رو ثوبیہ بدلتی چلی گئی۔ اسے ہر کسی سے ڈر لگنے لگا حتیٰ کہ وہ اپنے آپ سے بھی خوف زدہ رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ تلاطم خیز شباب پر سکوت چھانے لگا۔ تمام شوق اور ولولے دم توڑ گئے۔ ساری شوخیاں لُٹ گئیں۔ عرفان کی وہ بھگوان سمجھ کر پوجا کر رہی تھی۔ مگر اس نے کبھی تسلی نہ دی' کبھی حوصلہ نہ بڑھایا۔ اتنے برسوں میں وہ گھڑی کبھی نہ آئی تھی جب کہ بھگوان نے اپنی داسی کی پوجا کو قبول کیا ہو۔ پھر بھی اسے شدت سے انتظار تھا۔ بے معنی سا انتظار اور بے مقصد سی بے قراری تھی۔ گھر کی کشیدگی اور کدورت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ثوبیہ کو کھلے لفظوں میں بنجر زمین کہا جانے لگا۔

ہسپتالوں اور طرح طرح کے ڈاکٹروں کے چکروں نے اس کی صحت برباد کر دی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ حسن رُخصت ہو گیا۔ وہ سوتے میں چیخیں مارتے ہوئے عرفان سے لپٹ جاتی۔ ہلکی سی آہٹ پر اس طرح چونک اُٹھتی جیسے بہت بڑا طوفان آگیا ہو۔ ادھر ثوبیہ کی خاموشی اور صبر سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے گھر میں عرفان کے لئے نئی دلہن لانے کے پروگرام بننے لگے۔ نندیں خوشی سے جھوم اُٹھیں' ساس پُرسکون اور مطمئن ہو گئی۔ والدین اپنی جگہ ساکت و جامد نانندوں سے بیٹی کے حقوق پامال ہوتے دیکھ رہے تھے' مگر مُونہہ کھولنے کی جسارت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ ان کے مُونہہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بیٹی کا سہاگ چھین کر ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا سکتا تھا۔ جانے کیسی آزمائش تھی جو ختم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بس یوں کہنا چاہئے والدین بیٹی پیدا کرنے کا خمیازہ بھگت رہے تھے اور بیٹی اس معاشرے سے تعاون کرنے کا مزہ چکھ رہی تھی۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب عرفان طلاق دینے پر رضامند ہو گیا۔ ثوبیہ نے سُنا تو وہ چکرا گئی

اَقوالِ زرّیں

عقل مند اس وقت تک نہیں بولتا جب تک خاموشی نہیں ہو جاتی۔ (شیخ سعدی)

●

وقت کا ہر لمحہ سونے کے ہر ذرّے کی طرح قیمتی ہے۔ (میسن)

●

وقت ضائع کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔

●

ہمدردی وہ عالمگیر زبان ہے جسے جانور بھی سمجھ لیتے ہیں۔
(جیمس ایلن)

●

محبت کے بعد ہمدردی انسانی دل کا مقدس ترین مظہر ہے
(برک)

اسے عرفان سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ وہ اس سے پیار کرتی تھی۔ اس نے اس کی زیادتیوں پر کبھی احتجاج نہ کیا تھا۔ اس کی خوشیوں کی خاطر اس نے اپنی آواز کو گلے کے اندر دبا رکھا تھا اور اکیلے پہاڑ جیسے دُکھ برداشت کر لئے تھے۔ تمام حالات کو اپنے مقدّر کا کھیل سمجھ کر اس نے عرفان کو کبھی سرزنش نہ دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی مگر شکایت کبھی زبان پر نہ لائی۔ چار سال میں ایک دفعہ بھی اس نے شوہر کے ساتھ بدکلامی یا بدتمیزی نہیں کی تھی، اس کے عزیز و اقارب کے سلوک کا گلہ نہ کیا تھا، اپنے کسی مسئلے میں اس کو اُلجھایا نہ تھا۔ پھر کیوں اس کو دھتکارا جا رہا تھا؟ صرف اس لئے کہ وہ ابھی تک ماں نہیں بن سکی تھی؟ اسے ایسا لگا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ اب وہ اُلٹی سیدھی باتیں بکنے جا رہی تھی، کبھی قہقہے لگا رہی تھی کبھی آنسو بہا رہی تھی۔

عرفان چونک اُٹھا۔ "امی یہ سب کیا ہو گیا؟"

"عرفان، حوصلہ رکھو، تم نہیں جانتے عورتیں بڑے بڑے ڈھونگ رچا لیتی ہیں۔ اسے کچھ نہیں ہوا، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اس کے باپ کو ٹیلی فون کرتی ہوں کہ اس کو آکر لے جائے" ماں بڑے اطمینان سے بولی۔

"امی! یہ اپنے باپ کے گھر اس حالت میں نہیں جائے گی۔" عرفان کے لہجے میں بے پناہ ترس تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ تم نارمل نہیں ہو۔ جاؤ، جاکر آرام کرو۔" ماں پیار سے بولی۔

"ہاں، شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں، شاید میں نارمل نہیں ہوں۔" عرفان ذرا شرمندگی سے بولا۔

"بیٹے، تم عورت کو نہیں سمجھتے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے۔ کم بخت تمہیں جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ سمجھتی ہوں تو دل میں ہول اُٹھنے لگتے ہیں۔ میرا اتنا خوب صورت تعلیم یافتہ بیٹا، دولت جس کی لونڈی ہے، شہرت جس کا مقدّر ہے، یوں بے نام رہ جائے صرف اس کی وجہ سے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہارے لئے چاند سی دُلہن لاؤں گی تم دیکھو گے تو عش عش کر اُٹھو گے مگر پہلے اس کا یہاں سے جانا ضروری ہے۔"

"اس کا کیا قصور ہے امی۔ خدا کو یہی منظور ہے۔" عرفان کے دل میں ہمدردی کی لہر دوڑ گئی۔

"اس کا قصور ہے یا نہیں، میں اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ تمہارا گھر بسانے کے لئے اس کو یہاں سے جانا پڑے گا ہر صورت اور ہر حال میں۔"

"مگر کیسے؟" عرفان آہستہ سے بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دیکھنا، یہ اپنے باپ کے گھر جائے گی۔ اس گھر میں نئی دلہن آئے گی۔ پھر اس گلزار میں ننھے منے پھول کھلیں گے۔ دیکھنا سب کچھ ہوگا صرف تم ہمت کئے رکھو۔ اسے آج ہی اس کے باپ کے گھر چھوڑ آؤ۔ میں تو اس وقت کو کوستی ہوں جب اس کی گوری رنگت پر مر مٹی تھی۔ سوچا تھا، نسل خوب صورت ہوگی۔ مگر کیا معلوم تھا — خیر ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ دیکھنا، سانپ بھی مر جائے گا، لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ تم آج ہی اسے اس کے میکے میں پہنچا دو۔ کہہ دینا کہ آپ کے پاس کچھ عرصے کے لئے آرام کرنے آئی ہے۔ جب ٹھیک ہوگی تو ہم خود آکر لے جائیں گے۔ بیٹے، عورت بڑی عقل مند اور دُور اندیش واقع ہوئی ہے، مگر یاد رکھنا، صرف ماں بہن کے رُوپ میں۔ تمہارے باپ کو اللہ جنت نصیب کرے، میری سمجھ پر، میری عقل پر کبھی یقین نہ کیا۔" ماں نے لمبی آہ بھری۔

"ہاں، تو اُٹھو، میں اس کے والدین کو تفصیل بتا دیتی ہوں کہ یہ پاگل ہو گئی ہے۔ اسے ماں باپ کی ضرورت ہے۔ وہاں زیادہ آرام کر سکے گی اور زیادہ توجہ اور پیار لے سکے گی۔ جب ٹھیک ہو جائے تو ہمیں اطلاع کر دیں۔ ہم پھر لے آئیں گے اور اگر مناسب سمجھیں تو عرفان سے دُور ہی رکھیں۔ دیکھو نا، اس میں اس لڑکی کی بہتری بھی تو ہے۔ اگر عقل مند ہوئے تو سمجھ جائیں گے۔"

"ایسی باتیں چھوڑیں امی۔ میرا دل تو سخت پریشان ہے۔ ثوبیہ کے ساتھ یہ سلوک ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے کیا غلط ہے، اس کا فیصلہ میں خود کرنے والی زندہ ہوں ابھی!" وہ غصے سے بولی۔ "تم مرد ہو۔ مردانگی سے کام لو۔ مردوں کو یہ بُزدلی اور کم ہمتی زیب نہیں دیتی۔" وہ اور بھی جانے کیا کیا بولتی چلی گئی۔ اور یوں ماں کے بے حد اصرار پر عرفان ثوبیہ کو اس کے والدین کے پاس چھوڑ آیا۔

والدین بھلا کیسے نہ جان جاتے کہ دال میں کالا ہے۔ انہوں نے بال دُھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر سکتے میں آگئے تھے۔ آج بیٹی کے صبر اور ان کی برداشت کا یہ اجر ملا تھا کہ بیٹی پاگلوں کی سی حالت بنائے یہاں پہنچ گئی تھی۔ اور فون پر عرفان کی ماں کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں میں سیسہ اُنڈیل رہا تھا۔ بڑی کوشش سے انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور ثوبیہ کا ایک ماہر نفسیات سے علاج کرانے لگے۔ اسی علاج کے دوران یہ حقیقت خوشی بن کر ہر طرف پھیل گئی کہ ثوبیہ ماں بننے والی ہے۔ ثوبیہ نے سُنا تو جیسے اس کا علاج مکمل ہو گیا۔ اب اس نے خلاؤں میں گھورنا چھوڑ دیا تھا۔ اکیلے میں باتیں کرنا اور کبھی ہنسنا، کبھی رونا بھلا دیا تھا۔ نہ اب وہ بدحواس ہوتی، نہ خوف زدہ اور نہ پشیمانی اس کا پیچھا کرتی۔ ذہن پر بڑے معمولی سے اثرات باقی رہ گئے تھے، جن کا علاج ابھی تک جاری تھا۔ والدین کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پہلی دفعہ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ثوبیہ سسرال نہیں جائے گی۔ اس کو زندگی گزارنے کے لئے خدا تعالیٰ نے ساتھی دے دیا تھا، جو اس کے وجود میں پل رہا تھا۔ والدین نے اس کی تمام توجہ کتابوں کی طرف مبذول کر دی، تاکہ وہ

ذہنی طور پر نارمل ہو جائے۔ اپنی بہنوں اور سہیلیوں کی توجہ اور پیار کی مثال ملنا مشکل تھی۔ سارے سارے دن اس کے پاس ہنسی مذاق کرتیں۔ چھوٹے بچوں کی طرح بہلاتیں۔ نئے نئے منصوبے اس کے سامنے پیش کرتیں۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔ ثوبیہ میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ ماں باپ کا سمجھانا کام آ رہا تھا۔ بہنوں، سہیلیوں اور بھائیوں کی نصیحتیں رنگ لا رہی تھیں۔ مجروح ہونے والی انا پر مرہم رکھے جا رہے تھے۔ خاموشی کو زبان مل رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ اپنے وجود سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی زندگی اسے بے کار نہیں، بڑی کارآمد لگ رہی تھی۔ یہ بڑی خوش گوار تبدیلی تھی۔ مگر عرفان کی طرف سے بالکل خاموشی اور لاتعلقی تھی۔ شاید اسے اپنے کئے کی شرمندگی تھی یا اکڑ بدستور قائم تھی۔ کوئی وجہ تو تھی۔ ثوبیہ نے ٹیسٹ کی تیاری شروع کر دی تاکہ وہ اپنی تعلیم پھر جاری کر سکے۔ اب اس میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ وہ ایسا کوئی بھی فیصلہ خود کر سکے۔ وہ ماضی کو دماغ سے کھرچ دینا چاہتی تھی۔ وہ حال ہی میں رہ کر آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ پہلے والی ثوبیہ پھر زندہ ہو رہی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ ثوبیہ ایک خوب صورت صحت مند اور توانا بچے کی ماں بن گئی۔ عرفان کو فوراً اطلاع دے دی گئی۔ مگر کوئی جواب نہ پا کر ثوبیہ اداس ہو گئی، کیوں کہ اسے امید تھی کہ بچے کے آنے سے شوہر کا رویہ فوراً بدلے گا۔ اب یہ امید بھی ٹوٹ گئی تو انتقام کا جذبہ اس کے دل میں سر ابھارنے لگا۔ وہ بڑے دکھ سے سوچتی: کیا میں آج بھی عرفان کے لئے اہم نہیں؟ کیا آج بھی میں حقیر ہوں؟ کیا ہمیشہ میں دکھوں کی چکی میں پستی رہوں گی؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، مجھے آ کر لے جانے میں عار سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں خود اس گھر میں نہیں جاؤں گی، جہاں ثوبیہ مر گئی تھی، جہاں اگر میں چلی گئی تو میرے ساتھ یہ بچہ بھی دب کر رہ جائے گا۔ اب میرا اپنا گھر ہوگا، جہاں مجھے آزادی ہوگی، میرے بچے کو آزادی ملے گی۔ اگر اس آزاد گھر میں عرفان تم آنا چاہتے ہو تو بصد شوق آ جاؤ۔ مگر اب یہ ثوبیہ جھک کر غلامی نہیں کرے گی۔ تم نے عورت کی بغاوت کو کبھی دیکھا نہیں۔ اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ عورت کیا ہے۔ تم اس عورت سے نفرت کرتے ہو جس کی کوکھ سے بڑے بڑے اولیا و بزرگوں نے جنم لیا، جس کی آغوش ان کے لئے سہارا اور تحفظ بنی، جس کا دودھ ان کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوا! تم اس عورت کو کم تر کہتے ہو جس کے پاؤں کے نیچے جنت کے خزانے پوشیدہ ہیں، جو سراپا بہار اور خوشیوں کا پھلتا پھولتا گلزار ہے؟ تم عورت سے اس کی یہ بڑائی چھین نہیں سکتے۔ تم نے مجھے دھتکارا تھا، مجھے بے سہارا اور لاوارث بنانے پر تلے ہوئے تھے، میرے ماتھے سے سہاگ کا جھومر اتار کر کسی اور ماتھے پر سجانا چاہتے تھے۔ عرفان! تم ایسا نہیں کر سکے۔ تسلیم کر لو اس حقیقت کو کہ خدا تعالیٰ نے میرا ساتھ دیا ہے، مجھے اس مقام پر سہارا دیا ہے جب میں خود سے بہت دور جا چکی تھی۔ تم نے اور تمہارے گھر کے ایک ایک فرد نے مجھ سے تمام امیدیں اور تمام آسرے چھین لئے تھے۔ مجھے اکیلے بوڑھے والدین کی ذمہ داری بنا دیا اور پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ کیسے بسر ہو رہی ہے۔ منے کے آنے کی خبر نے بھی تمہارے دل کو موم نہیں کیا۔ تم بہت گھٹیا مرد ہو۔ تمہاری اپنی نہ کوئی سوچ ہے، نہ کوئی زندگی ہے۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ دوسروں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ تم نے مجھے بھی اپنا رنگ دے ڈالا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں رہا۔ میرا اپنا ایک رنگ ہے، میری اپنی طرز کی زندگی ہے جس میں سراسر آزادی ہے اور آئندہ ایسا ہی رہے گا۔

اب ثوبیہ کی تمام سوچیں منے کی بہتر زندگی بنانے کے ارد گرد گھومتی رہتیں۔ خود کو ہشاش بشاش رکھنے کی کوشش نے اسے اتنا مصروف کر دیا تھا کہ ماضی کے دکھ درد غم اور پچھتاوے اس کو زخمی نہ کرتے۔ بے شمار خواہشوں نے دھیرے دھیرے سانس لینا سیکھ لیا تھا۔ زندگی اپنے مزاج اور اپنے معمول کے ساتھ گزرنے لگی تھی مگر پھر بھی جب کبھی تاریک راتوں میں عرفان کی بے وفائی کا خیال آ جاتا تو سینے میں کچھ ٹوٹ سا جاتا، آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے اور منے پر بے پناہ ترس آ جاتا، جس نے ابھی تک باپ کے شفقت بھرے ہاتھ کا لمس محسوس نہ کیا تھا۔ وہ پھر بھی امید رکھتی کہ سب کچھ ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔ صرف اس کی ہمت اور کوشش کی ضرورت ہے۔ منا ماں باپ دونوں کے بے لوث پیار میں پروان چڑھے گا۔ مگر جلد ہی وہ پھر غصے پر اتر آتی۔ عرفان نے بھی تو حد کر دی تھی۔ کم از کم فون ہی کر دیا ہوتا۔

دن گزرتے گئے۔ ثوبیہ کو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اب وہ بچے کو وقت بہت کم دے سکتی تھی، لیکن پھر بھی مطمئن تھی۔ کیوں کہ وہ یہ سب اس کی بہتری کے لئے کر رہی تھی۔ سسرال

اقوالِ زریں

- اطمینان قدرتی دولت ہے، بے اطمینانی جعلی سکے۔ (ملٹن)
- امن کی فتح جنگی فتوحات سے کم اہم نہیں۔ (ملٹن)
- دشمن کو معاف کر دینا اس سے انتقام لینے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔
- برتاؤ ایک آئینہ ہے، جس میں ہر شخص اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ (گوئٹے)
- برداشت زندگی کا اصول ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔ (ہیوگو)
- جب ہمارے اندر دولت اور شہرت کی ہوس ختم ہو جائے گی تو اس وقت ہم یقیناً بہتر انسان بن جائیں گے۔
- دکھ کی یاد موجودہ مسرت کو مزید شیریں بنا دیتی ہے۔ (سپوتک)

میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ثوبیہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ یہ ثوبیہ کے نارمل ہو جانے کا کھلا ثبوت تھا۔ عرفان سے لاتعلق ہونے کا سند لیا تھا۔ اور مُنہ بولتی بغاوت تھی۔ عرفان کیا سب ہی پریشان تھے وہ تو اس کے خود لوٹ آنے کے انتظار میں تھے۔ مگر آج معاملہ بالکل اُلٹا ہو رہا تھا۔ انہیں ثوبیہ پہاڑ کی طرح مضبوط دکھائی دے رہی تھی اور سمندر کی طرح گہری لگ رہی تھی۔ ماں کو ممتا پاش پاش ہوتا گہرائی میں گم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو اُٹھی اور اس نے فوراً ثوبیہ کو واپس لانے کا فیصلہ کر لیا

ثوبیہ اس روز جب گھر پہنچی تو عرفان ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ثوبیہ سیدھی اپنے کمرے میں آگئی۔ منّا سویا ہوا تھا۔ آیا قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ثوبیہ نے مُنّے کو پیار کیا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ کمزوری اور نقاہت سے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر آنکھوں میں اُمید کے چراغ روشن تھے۔

امّی دُودھ کا گرم گرم گلاس لے کر آگئیں۔ ثوبیہ نے دُودھ پیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ تب امّی نے آہستہ سے کہا "بیٹی عرفان آیا ہے تمہیں اور بچے کو لینے۔"

"ہیں" وہ چونک کر بیٹھ گئی۔ پل بھر کو خوف اس کے چہرے پر نظر آیا۔ مگر اگلے لمحے وہ بے حد مطمئن تھی۔

"ان کو تمہارا یونیورسٹی میں داخلہ لینا بُرا لگا ہے۔ کافی غصے میں ہیں۔"

"غصے میں ہیں؟ بہت خوب! میں ان کے ٹکڑوں کی محتاج ہی رہوں تو یہ خوش رہتے ہیں ـــ ہے نا امّی؟"

"نہیں بیٹے، ایسا نہیں۔" ماں بے پروائی سے بولی تو ثوبیہ غصے میں آگئی

"امّی، آج پھر آپ بہت نرم پڑ گئی ہیں۔ لیکن میں ـــ جو فیصلہ کیا ہے، بالکل اٹل ہے۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ یہ کیا کہ جب دل کیا دھتکار دیا۔ جب چاہا گلے لگا لیا۔ شادی نہ ہوئی مذاق ہو گیا۔ اتنا عرصہ یہ لوگ کہاں رہے؟ میں نے پڑھائی شروع کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ میری بہتری اسی میں ہے۔ یہ مرد جس کی تربیت مجھے تحفظ نہ دے سکی، اپنے بیٹے کے لئے کیا مثال بنے گا؟ میں ان کے قدموں میں گر کر نہیں جیوں گی۔ اگر آپ میرا ساتھ نہ دیں گی تو میں خود اکیلے مقابلہ کروں گی اور باعزت زندگی گزار کر دکھاؤں گی۔"

عرفان دروازے کے پاس چپ چاپ کھڑا سُن رہا تھا۔

"امّی آپ انہیں واپس بھیج دیجئے۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو بحال کیا ہے اور یہ لوگ مجھے پھر توڑنا پھوڑنا چاہتے ہیں۔ اب یہ نہیں ہوگا۔ میری اچھی امّی، میری بات ماننا ہوگی۔"

"ثوبیہ! میری بچی! تمہاری اگر کوئی شرط ہو تو عرفان کو بتاؤ، کیوں کہ ہم نہیں چاہتے کہ ایک گھر برباد ہو جائے۔"

"میری کوئی شرط نہیں۔ میری زندگی شرطوں کی غلام نہیں ہے۔ عرفان خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو یہ ان کی بدقسمتی ہے۔ اپنی صحیح اور خوش گوار زندگی کے لئے کسی راستے کا تعین نہیں کر سکتے تو یہ ان کی بزدلی ہے۔ بس اور میں کیا کہوں؟ مجھے نہ چھیڑئیے۔ جو چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، انہیں ہوا نہ دیں تو بہتر ہے۔ امّی، آپ حوصلہ رکھیں۔ فکرمند مت ہوں۔ آپ کی بیٹی مقدر والی ہے۔ وہ راج کرے گی، مگر اپنے بازوؤں کے زور پر اور اپنے بَل بوتے پر۔ دیکھتی جائیں۔ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ سب ٹھیک رہے گا۔"

"یہ پہاڑ سی جوانی کیسے گزرے گی بیٹی؟"

"گزرے گی امّی۔ یہ منّا کیا کم سہارا ہے میرا۔ اسی نے تو مجھے ہمت بخشی ہے۔ دیکھئے، سوتے میں بھی ہنس رہا ہے۔ میرے فیصلے پر خوش ہے۔ میری ہمت اور بڑھا رہا ہے۔" وہ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگی۔ عرفان چپکے سے واپس ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ حیرت اور غم سے اس کی زبان گنگ تھی۔ ذہن کو ایسی چوٹ لگی تھی کہ وہ سنبھل نہیں رہا تھا۔ ثوبیہ، جس کو اس نے ہمیشہ بے جان سمجھا تھا آج کتنی جان دار لگ رہی تھی۔ آج اس کے ایک ایک لفظ میں ہمت تھی، عزم تھا۔ کسی پچھتاوے کا شائبہ تک نہ تھا۔ اب تو خود عرفان کسی اور دنیا میں پہنچ گیا تھا، جہاں بے پناہ فکریں تھیں، جان لیوا خلش تھی اور لاتعداد پچھتاوے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس بھری دنیا میں تنہا ہے۔ کوئی اس کا غم گسار نہیں۔ سب ہی اس کے دشمن ہیں، اس کی خوشیوں کے دشمن اور اس کی راحتوں کے دشمن ہیں۔ تو پھر ان سب میں اس کا غم گسار اور ہمدرد کون ہو سکتا ہے؟ وہ سوچ کی گہری وادیوں میں گم تھا۔ آج اسے فیصلہ خود کرنا تھا۔ اکیلے کرنا تھا۔

ثوبیہ اپنی جگہ بے حد مطمئن تھی۔ زندگی کا مشکل ترین فیصلہ اس نے بڑی آسانی سے کر لیا تھا۔ اس کے سامنے بڑی شان دار زندگی تھی، جس میں منّا تھا، اس کے قہقہے اور شرارتیں تھیں۔ اور عرفان کے تعاون کرنے کی موہوم سی اُمید تھی۔ پھر وہ اُٹھی اور اس نے ٹیکسی منگوائی اپنے ذہن کو تمام خیالوں سے دُور رکھنے کے لئے وہ بچپن اور جوانی کی حسین یادوں کی طرف چل پڑی۔

عرفان نے بھی گاڑی نکالی اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ آج وہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا لیکن وہ زمانے کی آندھی اور طوفان کا شکار ہرگز نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بکھری ہوئی زیست کا ایک ایک لمحہ سمیٹ کر خوشیوں اور کامیابیوں سے ہم کنار ہونے کا خواہش مند تھا، جس میں اس کی شریکِ حیات کی موجودگی اور معصوم بچے کی معصوم اور بھولی بھالی اٹھکھیلیوں کی ضرورت تھی۔ باقی سراب تھا۔ سراسر دھوکا اور جھوٹ تھا۔

میرا پسندیدہ شعر

شبنم سلطانہ تبسم، نرمل

دل اس سے گفتگو کے لئے بے قرار ہے
یارب تو جان ڈال دے تصویرِ یار میں

نامعلوم

عرب سیح ابراہیم، کرناٹک

تری رحمتوں کے بادل ابھی ٹوٹ کر برستے
جو سیاہ کار یارب کوئی اشکبار ہوتا

جلال لکھنوی

محمد محمود علی جاوید

ہمارے ڈوب جانے پر آپ کیوں حیران ہوتے ہیں
لبِ ساحل بھی پوشیدہ کئی طوفان ہوتے ہیں

حفیظ فضا

ایم۔ یونس خان، راوڑ کیلا

پرورش خوف کے ماحول میں ہوگی جس کی
اپنی پرچھائیں بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

نامعلوم

شفق نار، علی گڑھ

میرے سوا نہیں ہے کوئی میری کائنات
میں خود ہی اپنی دھوپ ہوں خود سائبان ہوں

نامعلوم

ان پڑھ مونگیری (حیدر آباد)

کچھ مجھے حرارت ہوئی، کچھ ان کی آنکھیں جھک گئیں
ہوتے ہوتے یوں ہی اظہارِ تمنا ہو گیا

حفیظ ہوشیار پوری

ایم اے۔ وحید ربانی۔ نظام آباد

وہ خلش رہی وہ مجھ میں وہ کشش رہی وہ تجھ میں
جسے زخمِ عاشقی ہو وہی اب تجھے پکارے

شکیل، بدایونی

غزل یاسمین، علی گڑھ

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

نامعلوم

محمد مطیع الرحمن پہلوان، رتناگری

تیری راہ کا یہ اصول ہے کہ شکست مانے تو فتح ہو
جو چلا اکڑ کے وہ گر پڑا، جو جھکا لرز کے ابھر گیا

جوش

جاں نثار رحمن، کاماریڈی

گیسوؤں کے سایہ میں ایک شب گزاری تھی
آپ سے جدا ہو کر آج تک اکیلے ہیں

نامعلوم

مس تبسم ناز، کھسادل

ہم سایہ دار پیڑ زمانے کے کام آئے
جب سوکھنے لگے تو جلانے کے کام آئے

منور رانا، کلکتہ

سعد اعظمی، الزلفی، سعودی عربیہ

تک تک کے آنکھ تھک گئی شاید نہ اب آئے کوئی
لو ہم نے آنکھیں موند لیں آئے کوئی جائے کوئی

نامعلوم

مطیع الرحمن، حلالین، کلکتہ

یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

حسرت جے پوری

خورشید زہرا عامری

یاسِ مقامات سباہی نہیں ہوتی
ہیں کتنے ہی ایسے جو خزاؤں میں لٹے ہیں

عادل

ملیکہ بانو، تندرباد (دھولیا)

باقی نہیں وہ قدریں دنیا تری محفل میں
اب صرف شرافت کا چرچا نظر آتا ہے

اکرم

الیس شاداب احمد، آمبور

بات وہ کہیئے کہ جس بات کے سو پہلو ہیں
کوئی پہلو تو رہے بات بدلنے کے لئے

نامعلوم

ممتاز نکہت، علی گڑھ

لگتا ہے اس کے جسم کو چھو آئی ہے ہوا
کل ساخ پر تو کوئی بھی پتہ ہرا نہ تھا

خاور خان سرحدی

منظہر جاوید حبیبہ، الخبر، سعودی عربیہ

مجھے کوئی غم نہیں ہے جو بدل گیا زمانہ
مری زندگی ہے تم سے کہیں تم بدل نہ جانا

شکیل بدایونی

فریدہ بانو، بلڈانہ

داغِ دل کا بھی اجالا شبِ غم کافی ہے
کیا ضروری ہے چراغوں کو جلائے رکھنا

نامعلوم

کنیز فاطمہ، حیدر آباد

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

علامہ اقبال

محمد ظہیر الدین ساحر، نرمل

برق کہتے ہیں جسے وہ ہے تبسم تیرا
جس کو کہتے ہیں قیامت تری انگڑائی ہے

نامعلوم

الیس۔ ایم۔ قمر عالم، علی گڑھ

رہیئے گلوں کے حلقۂ رنگیں میں چار دن
پھر ایک عمر پاؤں سے کانٹے نکالئے

نامعلوم ○○

نوٹ: اشعار کے ساتھ شاعر کا نام لکھئے

اپنے اشعار اس پتے پر بھیجئے: "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بچوں کی پیدائشی جسمانی خرابیاں کس طرح دُور کی جاسکتی ہیں؟

اب تو ان بڑی بوڑھیوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں جن کو سلام کے لئے اگر ہاتھ اُٹھا دیا تو ان کے مُونہہ سے دُعاؤں کے پھول جھڑنے لگتے تھے۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو خالہ بی یا ان کی ہم پایہ بزرگ خواتین کو تسلیمات عرض کرنے کے بعد کانوں میں ان کی نیک خواہشات کا سنگیت دیر تک گونجتا رہتا تھا۔

بیٹی! اللہ سلامت رکھے!
نصیبہ بلند ہو!
اچھا گھر اور اچھا بر ملے!
جس گھر جاؤ راج کرو۔
اللہ نظر بد سے بچائے۔ آمین!

یہ دعائیں رنگین تتلیوں کی طرح دیر تک ذہن میں اُڑتی رہتی تھیں گھر تو اس وقت اپنا ہی اچھا لگتا تھا۔ خدا جانے شادی ہو جانے پر ایسا گھر ملے نہ ملے یہ سوچ کر دل ڈُوب جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال آتے ہی ذہن میں ایک البم سا کھل جاتا تھا۔ بہت سے چہرے ایک ایک کرکے ذہن میں آتے تصویر کی دنیا میں نوجوانوں کی پریڈ سامنے سے گزرتی، جیسے وہ سلام کرتے ہوئے سامنے سے آگے بڑھ جائیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان میں ایسے چہرے بھی ہوتے تھے جو زبردستی ذہن میں آجاتے تھے اور تصور میں بھی انہیں دیکھ کر تیوریاں اُتار نے کو جی چاہتا تھا زبان سے دو چار گالیاں چھلک جاتی تھیں۔

"ہونہہ! اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ ہونق! بے شرم! اُٹھائی گیرا!"

یہ بھی سچ ہے کہ ان میں ایک دو چہرے ایسے بھی ہوتے تھے جن کا تصور کرتے ہی کان کی لویں تک سُرخ ہو جاتی تھیں۔

جب بَر ملا تو گھر بدل گیا۔ صرف گھر نہیں بدلا، دنیا بدل گئی۔ اس کے ساتھ دُعاؤں کی ایک نئی قطار کانوں میں رس گھولنے لگی۔ نصیبہ بلند ہونے کی دُعا اب بھی دی جاتی تھی، لیکن اب اس کے آگے پیچھے کچھ اور باتیں جوڑ دی جاتی تھیں۔

بیٹی! سدا سُہاگن رہو!
"عزت ایمان کے ساتھ رہو"
"دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو"
اور پھر وہی ——— اللہ اپنی امان میں رکھے۔ نظر بد سے بچائے۔ آمین!

خاندان کو وارث دینا، ہندوستان کے سماجی ماحول میں سائنس اور ٹیکنولوجی کی تمام تر ترقی کے باوجود ہندوستانی عورت کا اہم ترین فریضہ اور اس کی حیثیت کی سب سے بڑی کسوٹی سمجھا جاتا ہے۔ شادی کے بعد سے ہی کُنبہ کے بعض افراد دن گننے لگتے ہیں۔ اگر اس معاملے میں ذرا دیر ہو گئی تو دوا علاج تو الگ پیر سیانوں کے چکر لگتے ہیں، مزاروں پر منتیں مانی جاتی ہیں۔ اگر خدا نے اُمید کا چراغ روشن کیا تو سب آس لگائے رہتے ہیں۔ نصیحتوں اور مشوروں کے گھیرے میں نو بیاہتا کو پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔

"یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ"، "بوجھ نہ اُٹھاؤ" "سنبھل کر چلو"، "چاند سورج کو گرہن لگے تو باہر قدم نہ نکالو"، "پھلوں کا رس پیئے سے بچہ گورا اور خوب صورت ہوگا" ہر تجربہ کار خاتون جس نے بچے پیدا کئے ہیں، حاتم طائی کی طرح اپنے مشورے کو تقسیم کرتی ہے۔

خدا خدا کرکے جب دن پورے ہوتے ہیں اور سہاگن زچہ گھر (میٹرنٹی ہوم) کی ولادت گاہ (لیبر روم) میں داخل ہوتی ہے تو یہ اس کے لئے ہی نہیں، اس سے وابستہ مائیکے، سسرال یا کُنبہ کے تمام افراد کے لئے سخت آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ بچہ صحیح سلامت پیدا ہوا تو سوال ہوتا ہے کہ بیٹا ہوا یا بیٹی؟ اگر بیٹا ہوا ہوا تو بہو کا مان کچھ بڑھ جاتا ہے خوشی منائی جاتی ہے لڈو بانٹے جاتے ہیں۔ اگر بیٹی ہوئی تو خاندان بڑے دل کا ہوا تو دل کو سمجھاتا ہے "نصیبوں والی بیٹی آئی ہے"۔ کوئی کہتا ہے "لکشمی آئی ہے"۔ لیکن سب اندر ہی اندر کڑھتے ہیں اور ایک بوجھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے بچہ کوئی پیدائشی نقص لے کر پیدا ہو تو ماں باپ، دادا، دادی، سارے خاندان کے لئے اس کا جنم المیہ بن جاتا ہے، جیسے ان کے سر پر کوئی پہاڑ ٹوٹ کر آگرا ہو۔

بچہ اگر کوئی اندرونی نقص لے کر پیدا ہوتا ہے تو اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ بڑا ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگر اس کی شکل و صورت میں کوئی ظاہری نقص ہے تو ماں باپ کے لئے زبردست اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

سائنس کی ترقی نے بہت سے مسئلے حل کئے ہیں۔ فنِ جراحی کی ترقی نے جسمانی نقص

رکھنے والے بچوں کے لئے بھی علاج اور اصلاح کے دروازے کھول دئے ہیں۔ خاص طور پر اگر بچے کے چہرے کی ہڈیوں کی بناوٹ میں خرابی ہے، پلکوں، ناک کان، ہونٹوں یا جنسی اعضا کی ساخت میں کوئی نقص ہے تو آپریشن کے ذریعہ بچہ نارمل بن سکتا ہے۔ مغربی طب کئی شاخوں میں تقسیم ہے۔ ناک، کان، اور حلق کے ماہرین الگ ہوتے ہیں، ہڈیوں کے معالج اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں، بچوں کے امراض اور ان کے علاج کا شعبہ الگ ہے۔ پیشاب اور گردے کے امراض کا علم اپنی جگہ الگانہ اہمیت رکھتا ہے بچے کے پیدائشی نقائص کو دُور کرنے کے لئے اکثر تمام شعبوں کے ماہروں کی تشخیص ان کی مہارت اور ان کے اشتراک کی ضرورت ہوتی ہے۔

دادی اماں، نانی اماں کے زمانے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر حاملہ عورت چاند یا سورج کے گرہن کے وقت باہر نکل آئے تو بچے میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جدید سائنس اس طرح کے وہم، جادو ٹونے یا بد دُعا کے مضر اثرات کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہم پرستی کی وجہ سے بعض خاندان بچے کے آپریشن کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بچے کا آپریشن نہ کرا کے وہ ساری زندگی اسے گھٹن اور احساسِ کم تری میں مبتلا رکھتے ہیں۔

بچہ کوئی پیدائشی نقص لے کر کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس کا کوئی ایک سبب بتانا مشکل ہے۔ یہ نقص موروثی بھی ہو سکتا ہے اور کسی دوسری وجہ سے بھی خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ حمل کے دوران اگر خون کی شدید کمی (انیمیا) ہو حمل کے شروع کے مہینوں میں اگر زچہ کو خسرہ یا میعادی بخار کی تکلیف ہو تو ان کی وجہ سے بھی بچے میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔

اگر حاملہ عورت کوئی نشیلی شے استعمال کرتی ہے، یا زیادہ سگریٹ پیتی ہے تو اس کا بھی بچے کی جسم کی ساخت پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔ حاملہ عورت کو جراثیم کش دواؤں (اینٹی بائیوٹکس)، سے بھی بچنا چاہئے۔ خواب آور دواؤں یا ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر دواؤں کا زیادہ استعمال بھی بچے میں نقص پیدا کر سکتا ہے۔ جہاں تک موروثی نقص کا تعلق ہے، یہ ضروری نہیں کہ ماں یا باپ میں کوئی خرابی ہو تو بچہ بھی وہی نقص لے کر پیدا ہو۔ تاہم والدین میں اگر کوئی نقص ہے تو بچے کے اندر ویسی خرابی پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

بچے میں اگر کوئی پیدائشی خرابی ہو تو سب سے زیادہ مضر اثر اس کی شخصیت کی نشو و نما پر پڑتا ہے۔ اس کے مزاج اور طبیعت پر ایک بوجھ سا رہتا ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر بھی خود کو کم زور محسوس کرنے لگتا ہے، حالانکہ اگر بچے کے سُننے، دیکھنے اور بولنے میں کوئی نقص نہیں ہے تو اس کے ذہن کی نشو و نما پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہئے اس کے باوجود وہ اندر ہی اندر گھٹتا ہے۔ اسے یہ احساس کھائے جاتا ہے کہ وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے۔ ایسے بچے اکثر اپنی ذاتی زندگی میں گھٹے یا چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔

بچہ اگر کسی نقص کے ساتھ پیدا ہو تو کیا کرنا چاہئے؟ اس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری ماں باپ کی ہے، اس کے بعد اُستاد اور خاندان کے معالج کی۔ اگر شروع سے معالج سے مشورہ لیا جائے اور اس کی رائے پر عمل کیا جائے تو بڑی حد تک مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ اگر طبّی مشورہ اور علاج میں دیر کی گئی تو اندیشہ ہے کہ شاید آپریشن اور علاج کے بعد بھی بچہ نارمل زندگی نہ گزار سکے۔

یہ ضروری نہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد فوری طور پر علاج اور آپریشن کی نوبت آ جائے۔ یہ فیصلہ ڈاکٹروں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ بچے کی صحت اور مجموعی حالات کو دیکھ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ اسے کب اور کس طرح کے علاج کی ضرورت ہے۔ بر وقت علاج اور آپریشن کرانے سے بچہ اور اس کے ماں باپ سب آئندہ زندگی میں اُلجھن اور پریشانی سے بچ سکتے ہیں۔

یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ تمام پیدائشی نقائص آپریشن سے دُور ہو سکتے ہیں۔ بعض خرابیوں کے لئے کسی طرح کی مصنوعی مدد بھی کافی ہوگی۔ بعض بچے اپنے پیدائشی نقص کو سمجھ کر اس کے عادی ہو جاتے ہیں، معذوری کا احساس انہیں نہیں ستاتا اور وہ اپنے سماجی ماحول میں گزر بسر کر لیتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچے میں کوئی پیدائشی نقص ہے تو اس کے علاج اور اگر آپریشن ضروری ہو تو اس کے لئے مناسب عمر کیا ہے؟ بہتر یہ ہوگا کہ یہ کام بچے کے اسکول جانے سے پہلے کر لیا جائے، تاکہ جب بچہ اسکول جائے تو اسے یہ احساس نہ ستائے کہ وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے۔ بعض خرابیاں ایک ہی مرحلے میں درست ہو جاتی ہیں اور بعض کی اصلاح کے لئے کئی مرحلے درکار ہوتے ہیں۔ بہر حال کٹے پھٹے یا بے ہیئت کان، ناک، ہاتھ اور پیر آپریشن کے ذریعہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ بعض پیدائشی نقص ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج بڑے ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔

ماں باپ اولاد کو اپنے لئے بڑی نعمت تصور کرتے ہیں۔ اگر اولاد میں کوئی پیدائشی خرابی ہے تو اسے قسمت کا کھیل سمجھ کر بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا بہت بڑی غیر ذمہ داری اور ناانصافی کی بات ہوگی۔ اگر بر وقت طبّی مدد حاصل کر لی جائے تو بچے کے مستقبل کو تاریکی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ عقل مندی کی بات تو یہ ہے کہ حاملہ عورتوں کی صحت کی حمل کے دوران ہر مرحلے پر مناسب دیکھ بھال کی جائے اور ان کو ان تمام خطروں سے محفوظ رکھا جائے تاکہ آنے والے مہمان کی ساخت اور نشو و نما پر بُرا اثر نہ پڑ سکے۔ اس کے باوجود اگر بچہ کسی نقص کے ساتھ پیدا ہو تو اسے بہتر زندگی کے لائق بنانے کے لئے ہر ممکن مدد ملنی چاہئے تاکہ نہ وہ معذور رہے، نہ کسی کا محتاج۔ یہی سچی محبت ہے یہی سچی ممتا۔

ازواجِ مطہرات

مریم قبطیہ رضؓ

مختار احمد

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ؐ نے ایک بڑی ضیافت کا انتظام کیا اور اس میں شرکت کے لئے دور دراز کے ملکوں کے بادشاہوں کو دعوت نامے بھیجے۔ عرب کے بیش تر سردار اس ضیافت میں شریک ہوئے اور اس موقع پر مشرف بہ اسلام بھی ہوئے۔ مصر میں عیسائیوں کی ایک شاخ آباد ہے۔ اسے قبطی کہتے ہیں۔ یہ لوگ آج بھی مصر میں آباد ہیں۔ رسول اللہ ؐ کا دعوت نامہ مصر پہنچا تو قبطیوں کے سردار مقوقس نے رسول اللہ ؐ کو گھوڑے، اونٹ اور بہت سا ساز و سامان تحفے میں بھیجا، ساتھ میں دو کنیزیں بھی بھیجیں۔ یہ دونوں بہنیں تھیں۔ ایک کنیز کا نام ماریا بنتِ شمعون تھا، دوسری کا نام سیرین تھا۔ دونوں بہنیں مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی مسلمان ہو گئیں۔ ماریا مریم کہلائیں اور رسول اللہ ؐ کے حرم میں داخل ہو گئیں۔ دوسری بہن کی شادی حسن بن صلات رضؓ سے کر دی گئی۔

مسجدِ نبویؐ کے قریب تمام ازواجِ مطہرات کے حجرے تھے۔ مریم قبطی رضؓ نے مسجدِ نبویؐ کی بجائے مدینہ کے شمال میں ایک نخلستان میں قیام کیا۔ بعد میں اس گھر کا نام "مشربہ اُمِ ابراہیم" پڑ گیا۔ مریم رضؓ کے رسول اللہ ؐ کے حرم میں داخل ہونے کے بعد ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس سے دنیائے اسلام میں غلغلہ مچ گیا۔ مریم رضؓ کے بطن سے رسول اللہ ؐ کے بیٹا پیدا ہوا۔ ان کا نام ابراہیم رکھا گیا۔

ملک کے گوشے گوشے سے مبارک باد اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ رسول اللہ ؐ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ ابراہیم کی پیدائش کے موقع پر رسول اللہ ؐ کے حرم میں بھی فیاضی کا مظاہرہ کیا گیا۔ رسول اللہ ؐ بہت خوش تھے۔ جس طرح حضرت ابراہیم ؑ کو بڑھاپے میں حضرت اسماعیل ؑ عطا کئے گئے تھے اسی طرح رسول اللہ ؐ کو بھی آخر عمر میں بیٹے سے نوازا گیا تھا۔ رسول اللہ ؐ اپنے لے پالک بیٹے زید سے بے تحاشا محبت کرتے تھے۔ اس سے اپنے بیٹے ابراہیم کی پیدائش پر ان کی خوشی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مریم رضؓ ابراہیم کی پیدائش کے بعد ازواجِ مطہرات اور دوسرے لوگوں میں ہر دل عزیز ہو گئیں۔ کیوں نہ ہوتیں آخر وہ رسول اللہ ؐ کے بیٹے کی ماں تھیں۔ ابراہیم کی پیدائش کے بعد رسول اللہ ؐ اپنا زیادہ وقت مریم رضؓ کے ساتھ گزارتے اور ابراہیم کو پیار سے گلے لگاتے۔ لیکن خدا کے راز وہی جانتا ہے۔ چند مہینے کی خوشی عارضی ثابت ہوئی اور ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ جہاں چند مہینے پہلے خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، وہاں ماتم برپا ہو گیا۔ رسول اللہ ؐ نے سب کو صبر کی تلقین کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم سب کو خدا کی طرف ہی لوٹنا ہے جب خدا کی یہی مرضی تھی تو ہم اسے کیسے بچا سکتے تھے۔ ابراہیم کو قبر میں اُتارتے وقت انہوں نے فرمایا: "آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور دل غم سے بھرا ہے لیکن میں خدا کی مرضی کے سامنے مجبور ہوں۔ اے ابراہیم، ہم سب تمہاری جدائی سے غمگین ہیں۔ لیکن ہم خدا کی مرضی کے سامنے بے بس ہیں۔ وہی ہمارا آقا اور مالک ہے۔" پھر انہوں نے مریم رضؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "جنت میں اس کے لئے ایک دایہ ہے۔ اس کی رضاعت کے باقی دن وہاں پورے ہوں گے۔"

ابراہیم کی موت کے بعد کچھ لوگوں نے بیان کیا کہ آسمان میں چاند اور سورج کو گرہن لگا تھا۔ گویا چاند اور سورج بھی ابراہیم کی وفات کا ماتم کر رہے تھے لیکن رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ چاند اور سورج فنا اور بقا کی پروا نہیں کرتے۔ انسان فانی ہے۔ اسے ایک دن مرنا ہے۔

ابراہیم کی وفات کے پانچ سال بعد مریم رضؓ کا انتقال ہو گیا۔ انہیں ابراہیم کی قبر کے پاس جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ رسول اللہ ؐ نے ابراہیم کی وفات کے بعد آخری حج کیا۔ اس کے بعد ازواجِ مطہرات کو قرآن کی وہ آیات سنائیں جن میں انہیں رسول اللہ ؐ کی وفات کے بعد نکاح کی ممانعت کی گئی تھی۔ ان کی بیویاں اُمت کی مائیں ہیں — یہ قرآن کا ارشاد ہے۔

قرآن میں ایک جگہ رسول اللہ ؐ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد ہے: "اے رسول، اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم کو اس دنیا کی آسائش مطلوب ہیں تو آؤ میں تمہیں وہ سب عطا کر دوں گا اور تمہیں احسان کے ساتھ آزاد کر دوں گا۔" لیکن ازواجِ مطہرات نے بالاتفاق اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔ انہیں رسول اللہ ؐ کے ساتھ عسرت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرنا منظور تھا۔

مریم رضؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمر رضؓ نے ان کا وظیفہ جاری رکھا۔ وہ مریم کے رشتہ داروں کو ان کا وظیفہ بھجواتے رہے۔ ●

نتیجہ

"بغیر عنوان کے"

بانو: جنوری ۱۹۸۷ میں عفت اعظمی کا افسانہ "بغیر عنوان کے" شائع ہوا تھا جس کا عنوان بانو بہنوں، بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔ تمام عنوانات کو غور سے پڑھنے کے بعد مس حبیبی (دہلی گراؤنڈ) کے بھیجے ہوئے عنوان "جھوٹی عیدی" کو پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

مرزا عبدالکریم حسین (بودھن نظام آباد) کے بھیجے ہوئے عنوان "ماضی کا تیر مکا" کو دوسرے انعام کا اور مسز ماجدہ علی خان (رام پور) کے بھیجے ہوئے عنوان "کرائے کا سپاہی" کو تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ ان کو بالترتیب تیس روپے اور بیس روپے کی کتابیں ارسال کی جائیں گی۔ پسند آنے والے کچھ اور عنوانات یہ ہیں: "تھوڑی سی بے وفائی" (نکہت فاطمہ، حیدرآباد)، "نذرِ وفا" (ایم۔ مختار احمد، کلکتہ)، "شطرنج کی چال" (معید معاریہ، حیدرآباد)۔

خود مصنفہ نے اس افسانے کا عنوان "جرمِ وفا" تجویز کیا تھا۔

تازہ ترین
بشریٰ رحمٰن
ایک آوارہ کی خاطر...
قیمت: چالیس روپے
پاکستان کی مایۂ ناز ادیبہ
بُشریٰ رحمٰن
کی نئی کتاب میں اُن کے
چار نئے ناولٹ
۱۔ ایک آوارہ کی خاطر....
۲۔ خشک پتّوں کا الاؤ
۳۔ .... کہ باز آید پشیمانی!
اور ۴۔ شکستِ عہدِ وفا!

بدگمان

عبدالرب

آرڈو کے پیڑ پر سے طوطوں نے ایک دم ایسا شور بلند کیا کہ نیند کے تسلسل میں اس کا ذہن پرند کی طرح اسی گھنے اور پھل دار درخت پر جا بیٹھا۔ دیر تک اس کی آنکھیں درخت کی شاخوں سے اُلجھتی رہیں۔ پھر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ہلکی سی چاپ کے ساتھ عطیہ ٹرے میں چائے کا کپ اور مونہہ پر مسکراہٹ دونوں نسوانیت سے سجائے آموجود ہوئی۔

"چائے حاضر ہے!" کا نعرہ اسے تمام نعروں سے بلند لگا۔ اسی لمحہ عالیہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ چائے کی خوشبودار سطح پر اُتر آئی۔ وہ کوئی گلابی یا ہلکا سا آسمانی گاؤن پہنے ہوئے لان میں پھولوں کے قطعوں پر تتلی کے مانند رقصاں تھی۔

"چائے کی گہرائیوں میں کس کی تلاش ہے؟" نصیر ابھی خیالوں کی بھول بھلیاں میں اور گم رہتا کہ عطیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ جیسے دلی کے گل مہر پارک سے پل بھر میں گاؤں واپس آگیا۔

کشمکش اور اُلجھن سے بھرپور آج یہ تیسرا دن تھا۔ ایک اہم فیصلہ اسے کرنا تھا جس سے دو مزید زندگیاں وابستہ ہوگئی تھیں۔ عطیہ، اس کی پھوپی زاد تھی پیدائشی طور پر جس کے ایک پاؤں میں نقص تھا، لیکن جو اس کی ہی نہیں، پورے خاندان کی توجہ کا مرکز تھی۔ بے پناہ حسن، خوش اخلاق اور بلا کی ذہین اس عیب کے باوجود اس کی ماں نے اپنی نند سے عطیہ کا ہاتھ نصیر کے لئے مانگ لیا تھا۔

عطیہ کے والد اسے بچپن میں ہی داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ کافی بڑی زمین اور چند باغات اس کی والدہ کے حصے میں آئے تھے۔ جو گزر اوقات کے لئے کافی تھے۔

خوب سے خوب تر کی تلاش کس کو نہیں ہوتی؟ نصیر خیر سے مرد تھا اور وہ مرد ہی کیا کہ عالیہ جیسی مغرب زدہ خوب صورت اور امیر باپ کی اکلوتی لڑکی جس کے آگے پیچھے پھرے اور وہ پارسائی کا لبادہ اوڑھے پھرے یوں بھی اسے کیریر بنانے کے لئے ایسے ہی کسی شارٹ کٹ کی ضرورت تھی۔ رفیق صاحب نہ صرف خاندانی رئیس تھے، بلکہ بینک منیجر بھی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ آل انڈیا بینک آفیسرز یونین کے جوائنٹ سکریٹری بھی تھے۔ اس پر نظر التفات بھی رکھتے تھے نصیر پر اس امر کا فخریہ احساس بھی تھا۔ شاید رفیق صاحب نے اس میں آگے بڑھنے کے جراثیم اپنی خوردبین آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔

عالیہ معاشیات میں ڈاکٹریٹ کرکے لیکچرر ہوگئی تھی، نصیر اکثر رفیق صاحب کی کوٹھی جاتا رہتا۔ عالیہ روز کی معمولی ملاقاتوں کے روزن سے ہوتی ہوئی اس کے دل کے خالی خالی کمروں پر قابض ہوگئی تھی۔ پھر یہ قبضہ روشن دان کے راستے دُھواں بن کر بیرونی مناظر میں قوس قزح کی شکل میں چھاتا گیا۔ دوسرے راہی اسے ایک نظر دلچسپی سے دیکھتے اور نظروں ہی نظروں میں داد دیتے نکل جاتے۔

رفیق صاحب فرصت کے اوقات میں ایک فریم کے مانند کوٹھی کے پائیں باغ میں سرمئی شاموں میں ایزی چیئر ڈالے نظر آتے۔ اس فریم میں کبھی کبھی کچھ شوخ رنگوں کا اضافہ ہوجاتا جب وہ دونوں بھی ان کی شام کی چائے میں شریک ہوجاتے۔ ایسی ہی ایک شام کو چائے کی میز پر ٹرنک کال نے اس کی ماں کی علالت کا تار دیا تھا نتیجے میں اسے گاؤں آئے یہ تیسرا روز ہو چکا تھا۔

کشمکش سے بھرپور تین دن ـــ اور آج رات کا عجیب پُراسرار خواب۔ وہ جیسے ایک چھوٹا بچہ ـــ اور ایک بہت بڑی خوب صورت پینٹنگ ہے۔ منظر نہایت دل کش ہے۔ اچانک وہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے، جس میں ایک گلاس کسی سیال سے لبریز ہے۔ وہ بے ساختہ گلاس اس تصویر پر اُلٹ دیتا ہے۔ وہ خوب صورت منظر، وہ چمکتی سورج اور فلک بوس کہسار اور اس کے دامن میں بہتا جھرنا کسی کثیف اور بدرنگ سیال سے ڈھک جاتے ہیں اور وہ افسردہ ہوگیا ہے۔ پھر منظر بدل جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو موجودہ عمر میں پاتا ہے اور اپنے سینے پر ایک داغ ـــ لال داغ شعلوں کی مانند دہکتا ہوا دیکھ رہا ہے کہ یکایک طوطوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ عطیہ اس کے سامنے ایک سوگوار حسن کے مانند نظریں نیچی کئے اس کو سوچتا ہوا دیکھ کر خود بھی کسی سوچ میں غرق ہوگئی۔ نصیر اپنی سوچوں کی دنیا سے نکل آیا اور اسے لگاتار دیکھنے لگا۔ شاید اس کی نظروں کی شعاعیں عطیہ کے

اعصاب میں تیزی کر رہی تھیں۔ وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی اور اس کے گلاب سے چہرے پر سُرخی کی پرت گہری ہوگئی۔

"اب سوچتے ہی رہیں گے یا چائے۔۔۔"

اس نے شرم پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

نصیر نے چونک کر پیالی پر نظر ڈالی تو ہوا کی کڑی نے اس کی سطح پر اپنا جال بُن ڈالا تھا اور مطرب چلتی ہوئی ٹھنڈی ہواؤں نے اسے یخ کر دیا تھا

"اور بنا لاتی ہے" وہ جیسے سنبھل کر بولا۔

"اب میں یہیں بنا کر لاؤں گی۔ دلن نکل آیا ہے۔ شوہر کے ہاتھ بھیج دوں گی" اس نے شاخ گل کی طرح لچکتے ہوئے کہا اور شرم سے اٹھا کر چلی گئی۔

وہ مسکرا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ شادی کے امکان کی وجہ سے محتاط ہوگئی تھی اور بظاہر سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔

سن شعور میں دونوں نے ایک ساتھ قدم رکھا تھا۔ بتلیوں کے پیچھے بھاگنے، گڑیا گڑیا کا کھیل کھیلنے اور بڑوں کی نقل میں ننھے ننھے ہاتھوں میں مہندی کی ٹکیاں سجانے سے لے کر لڑنے اور پڑھنے تک کے تمام مراحل ایک ساتھ طے کئے تھے۔ لیکن اب اس شرابِ کہن میں انجانے ہاتھوں نے اجنبیت کی سریع الاثر بوندیں گھول دی تھیں، جس کی وجہ سے اب ذرا تکلفاً سبھی کچھ گفتگو ہوجاتی تو پھر دل تن بدن میں پھلجھڑیاں سی اُکستی رہتیں اور دل نہ جانے کون کون سے راگ راگنیوں میں ڈوب جاتا۔

عطیہ کی والدہ، یعنی نصیر کی پھوپی نے عطیہ کی تعلیم میٹرک کے بعد موقوف کر دی تھی کیوں کہ گاؤں کے آس پاس مزید تعلیم کے لئے کوئی انتظام نہ تھا۔ لوں یوں بھی اسی زمیندار بڑی حویلی میں یہی دو بچے تھے جس سے بقول ان ہی کے خلفاً رزق کی آبرو قائم تھی۔ نصیر کو اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ پانچ برس تک وہ مہمان کی طرح گاؤں آتا رہا۔ پھر امتیازی حیثیت سے ایم کام کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ دہلی میں ایک بینک میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ اس کی ذہانت اور دل کش شخصیت سے اس

کے تمام ساتھی مرعوب تھے خصوصاً بینک منیجر رفیق صاحب اس کے گرویدہ ہوگئے تھے۔

عالیہ سے ملاقات کے بعد نصیر خود کو دو کشتی کا سوار محسوس کرتا تھا۔ سمندر میں طغیانی ہو، ناموافق ہوائیں ہوں، سمت کا تعین نہ ہو تو ساحل جا لگنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ اور دو کشتی کے سوار کا تو منزل پا لینے کا تصور ہی محال ہے۔ ان حقائق سے بہرہ ور ہونے کے باوجود نصیر اُلجھ رہا تھا اور تین روز میں بھی کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ نصیر کے والد شبیر حان صاحب نے اس کی والدہ کی علالت اور خواہش کا واسطہ دے کر اسے شادی کے لئے مجبور کیا تو وہ عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ ایک طرف رومان پرور شہری ماحول جوانی کا جوار بھاٹا اور خواہشوں کے سمندر تھے تو دوسری جانب ایک زمین دار کی زمیندار بڑی حویلی کے آنگن کی کلی، جو اپنی بامثال خوشبو سے فضا کو معطر کر دینے کے لئے بے تاب تھی۔

ویسے بھی عالیہ اور نصیر کے مابین عہد و پیمان جیسی کوئی روایت نہیں دُہرائی گئی تھی اور نہ یہ دل کی چنگاری زبان تک رسائی حاصل کر سکی تھی۔ نصیر کا شمار چونکہ ایسے لوگوں میں تھا جو دل کے معاملات میں دماغ کی سُن گُن بھی رکھتے ہیں، اس لئے وہ والدہ کو ضعیفی میں ذہنی تکلیف بھی نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی رضامندی کا پیام والد تک پہنچا دیا۔

شادی کے ہنگامے ذرا کچھ سرد پڑے تو عالیہ کے تئیں احساسِ جرم کو ہلکا کرنے کی خاطر نصیر نے رفیق صاحب کو خط تحریر کیا:

"یہاں پہنچتے ہی پہلی پریشانی والدہ کی علالت اور دوسری پریشانی اپنی شادی کا سامنا ہوا۔ والدہ کی خواہش اور بگڑتی صحت نے مہلت نہ دی، چنانچہ شادی کا پروگرام ملتوی نہ کیا جا سکا۔ اور اس افراتفری میں آپ کو تار بھی نہ دیا جا سکا۔ اُمید ہے آپ اور عالیہ بے مزہ نہ ہوں گے۔ میری جانب سے بینک کے تمام ساتھیوں سے بھی معذرت کر دیں۔ مجھ پر زوردار پارٹی واجب ہے۔

یہ قرض آنے پر اُتار دوں گا۔ اس خط کے ساتھ ہی ایک ماہ کی مزید چھٹی کی درخواست بھیج رہا ہوں۔ ملاقات پر تفصیل سے گفتگو رہے گی۔"

تین روز بعد ہی رفیق صاحب کا جواب میں خط موصول ہوگیا:

"۔۔۔شادی مبارک ۔۔۔ عالیہ اور تمام "اہلِ بینک" بھی ایسا ہی کچھ کہلا بھیج رہے ہیں۔

فرزند، ہم صرف تحریری مبارک باد پر اکتفا کرنے والوں میں سے نہیں، چنانچہ میں اور عالیہ کار کے ذریعہ اتوار کی صبح کو یہاں سے روانہ ہوکر غالباً پانچ سے قبل تم تک پہنچ رہے ہیں۔ ہماری رہبری کے لئے تمہیں شاہ راہ پر موجود رہنا ہوگا۔ ساتھ ہی تاکیداً اطلاع دے رہا ہوں کہ تمہاری ایک ماہ کی چھٹی نامنظور کی جاتی ہے۔ ایک ہفتے میں کام چلاؤ، کیوں کہ ہم اپنے ہمراہ عالیہ کی شادی کا دعوت نامہ لا رہے ہیں۔ ان کے منگیتر شکیل، جو امریکہ اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے ہوئے تھے، آ چکے ہیں، لہٰذا ان کے والدین کی خواہش کے مطابق شادی کی تاریخ ۱۹ اپریل طے کر دی گئی ہے۔ یہاں بھی مسئلہ کچھ اسی قسم کا ہے۔ شکیل کے بزرگ اس فرض سے جلد ہی سبک دوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

آگے نصیر سے پڑھا ہی نہ گیا۔ آوارہ بادل کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ قطروں نے خط کے الفاظ دھندلا دئے۔ ہر چند کہ اس کے ضمیر پر سے ایک وزنی بوجھ ہٹ گیا تھا، لیکن جانے کیوں اندر ہی اندر کیا کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

جرمین گیریئر

سعدیہ دہلوی

حال ہی میں ہماری ملاقات ایک بہت ہی مشہور و معروف خاتون جرمین گریئر سے ہوئی۔ جرمین امریکہ سے شروع ہونے والی آزادیٔ نسواں کی تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے موضوع پر جرمین نے ۱۹۷۰ میں ایک کتاب لکھی تھی، جس نے دنیا بھر میں تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ عورت کے ذہن، جسم اور روح سے متعلق یہ معرکہ آرا تصنیف پڑھ کر لاتعداد آوازوں کا ہجوم آزادیٔ نسواں کی تحریک میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۷۰ میں یہ تحریک زور شور سے آگے بڑھی، لیکن کہیں نہ کہیں اس تحریک کی منزل دھندلی ہوگئی اور اس تحریک کا مدعا عریانیت اور جنسی آزادی سے زیادہ کچھ نہ رہا۔ عورت کی آزادی کے نام پر مرد عورت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہے۔ یہ بات نہیں کہ اس تحریک سے عورت کو کچھ بھی نہ حاصل ہوا ہو۔ اس کے ذریعہ عورت کو کافی حقوق ملے، لیکن ساتھ ہی طرح طرح کے نئے مسئلے سامنے آگئے۔ ان ہی نئے مسئلوں پر جرمین گریئر کی نئی کتاب روشنی ڈالتی ہے۔

آج جرمین خود اپنے سماج کی بے راہ روی کے سخت خلاف ہیں — اس حد تک کہ عورتوں نے ان پر اس تحریک سے الگ ہونے کا الزام لگایا ہے۔ ہمیں جرمین نے بتایا کہ اُنہیں اس الزام پر بے حد غصہ آتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالات بدل چکے ہیں اور ان ہی کے مطابق نظریہ بھی بدلنا چاہئے۔

جرمین نے اپنی نئی کتاب "جنس اور مقدر" میں اپنے سماج سے واضح اور چبھتے ہوئے سوال پوچھے ہیں "کیا مغرب میں اپنے بچوں سے نفرت کی جاتی ہے؟ بچے پیدا کرنے کی خواہش کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے؟ عمر دراز کرنے کے طریقے کیوں ایجاد ہو رہے ہیں؟ جب کہ مغرب میں کسی کے پاس بوڑھوں کے لئے وقت نہیں ہے؟ پُرسکون گھریلو زندگی گزارنے والی شادی شدہ عورتوں کی خواب گاہ میں جھانکنے والے کون ہیں؟ ایسے سوالات کرکے جرمین نے مغربی تہذیب کو آئینہ دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ گھریلو زندگی کے خاتمے پر وہ افسوس کا اظہار کرتی ہیں۔ لوگ ایک گھر میں رہ کر بھی ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے۔ عورتیں مُٹاپے کے ڈر سے بچے پیدا نہیں کرتیں۔ بچے کی پیدائش سماجی اور ذاتی خوشی نہ رہ کر ایک طبّی واقعہ بن کر رہ گیا ہے۔ جرمین ہماری طرف حسرت سے دیکھتی ہیں، کیوں کہ ہندوستان میں آج بھی بچے کی پیدائش کے وقت عورت اکیلی نہیں رہتی۔ اس کی خوشی میں گھر والے، رشتہ دار

اقوالِ زریں

- نیکی علم ہے اور بدی جہالت (سقراط)
- نفرت مجرم سے کرو جرم سے نہیں (مہاتما گاندھی)
- نفرت، نفرت سے کم نہیں ہوتی محبت سے کم ہوتی ہے (مہاتما بدھ)
- نظریات تجربوں کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔ (نا معلوم)
- معاف کر دینا دشمن پر فتح حاصل کر لینا ہے۔ (حضرت علیؓ)
- بہترین مطالعہ، انسان کا مطالعہ کرنا ہے۔ (ڈیا سوریتھ)

اور پڑوسی، سب ہی شامل ہوتے ہیں۔

جرمین کو ہمارے یہاں مشترکہ خاندان کا چلن بھی پسند آیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ دقیانوسی روایت نہیں ہے، جیسا کہ مغرب میں سمجھا جاتا ہے" بچوں کے لئے مشترکہ خاندان زیادہ اچھا ثابت ہوتا ہے۔ پھر عورتوں کے لئے بھی یہ بات بہتر ہے۔ اس طرح عورت تنہائی کے عذاب سے بچ جاتی ہے اور صرف شوہر کی توجہ کی محتاج نہیں رہتی۔ عمر کے ساتھ ہندوستانی عورت کا مقام بڑھتا جاتا ہے۔ اور ہمارے یہاں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بوڑھی عورت کو خبطی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جب عورت ماں بن جاتی ہے تو اس کی حیثیت بلند ہو جاتی ہے اور چونکہ خاندان یہاں ایک اہم سماجی مرکز ہے، اس لئے عورت یہاں زیادہ طاقت ور بن سکتی ہے۔ ہندوستانی عورت کے پاس ایک بہت بڑی نعمت ماں کی قربت ہوتی ہے۔ لیکن ہم اس نعمت سے محروم ہیں۔ ہمارے سماج میں ماں کو غیر اہم سمجھا جاتا ہے جس دن ہندوستان میں ایسا ہو گیا، وہ دن ہندوستانی عورت کے لئے بہت برا دن ہوگا "

جرمین نے کچھ سال پہلے شادی کی تھی، لیکن یہ تین ہفتے سے زیادہ نہ چلی۔ ان کے شوہر نے ان کو کام کرنے سے روکنا چاہا۔ وہ کچھ جھگڑالو مزاج بھی تھا۔ جرمین کے اپنے بچے نہیں ہیں، لیکن وہ عورتوں کو بہت سارے بچے پیدا کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔

" میری نظر میں کیریر اور شادی کرنے یا ماں بننے میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ مرد خواہ مخواہ عورت کو کیریر یا گھریلو زندگی میں سے ایک کو چننے پر مجبور کرتے ہیں "

جرمین کا خیال ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ عورت مرد کو اتنا دکھ نہیں دے سکتی، جب کہ مرد عورت کو بہت زیادہ دکھ دے سکتا ہے۔ مرد عورت سے محبت کرکے اس کو آسانی سے چھوڑ سکتا ہے لیکن عورت، اپنے جسم، جان اور روح سے عشق کرتی ہے اور مرد کے چھوڑنے سے بالکل ٹوٹ جاتی ہے۔ عورت کا ذہن مرد سے کہیں زیادہ حساس ہے "

نوجوان لڑکیوں کے لئے جرمین کا مشورہ یہ ہے: " مردوں کے معاملے میں آپ کو تھوڑا سخت ہو جانا چاہئے۔ اور خود کو قابو میں رکھنا چاہئے۔ مرد اگر عورت کو اتنا ہی چاہے جتنا وہ مرد کو چاہتی ہے تب تو کچھ بات بنتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو بہتر یہی ہے کہ عورت مرد کو بھول جائے "

جرمین اپنی نئی کتاب میں اپنے باپ کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے باپ کی محبت سے محروم رہیں کیوں کہ ان کی چھوٹی عمر میں باپ گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور بعد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں اور اب معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ جرمین آسٹریلیا میں پیدا ہوئی تھیں اور ان کی ماں اب بھی وہیں رہتی ہیں۔ اپنی ماں سے جرمین کی بالکل نہیں بنتی۔ اور جرمین کا خیال ہے کہ ان کی ماں بھی اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔

ہم نے جرمین سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے آپ کو ایک آزاد عورت سمجھتی ہیں؟ اور ان کے جواب سے ہم کو کافی حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ وہ بالکل آزاد عورت نہیں ہیں۔ " میں صرف فرار ہو گئی ہوں جیل کی دیواریں پھلانگ تو لی ہیں، لیکن اس کی سلاخیں اپنی جگہ موجود ہیں۔ میں تو اپنے آپ سے بھاگتی رہتی ہوں "

ہم نے ان سے ' آزاد عورت ' کا مفہوم پوچھا تو انہوں نے کہا " میں نے آج تک اپنی زندگی میں ایک بھی آزاد عورت نہیں دیکھی۔ میں کیسے بتاؤں؟ " ہمارے اصرار کرنے پر انہوں نے کہا " اگر میں اس اصطلاح کا مفہوم بتاتی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عورت پہلے سے ہی اس مفہوم کی قیدی بن کر رہ جائے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ' آزاد عورت ' کچھ مسز گاندھی کی طرح ہوگی۔ ایک آزاد عورت، صحیح معنوں میں ایماندار، فراخ دل، وضع دار، فیض رساں اور حقیقت پسند ہوگی۔ وہ نہ خوب صورت ہوگی اور نہ بدشکل، کیوں کہ اس بات سے اس کے لئے کوئی فرق ہی نہیں پڑے گا۔ وہ اپنی ہی نظر میں بلند ہوگی۔

جرمین گریئر سے ملاقات کے بعد یہ تاثر ہمارے ذہن میں ابھرا کہ ہم مشرقی لوگ خواہ مخواہ اپنے معاشرہ اور سماجی ماحول کے بارے میں احساسِ کم تری میں مبتلا رہتے ہیں اور مغرب کی ہر چیز ہمیں زیادہ روشن اور زیادہ حسین دکھائی دیتی ہے، جب کہ وہاں لوگ خود اپنے سماجی ماحول سے اکتا گئے ہیں۔ ہمیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہمارے سماجی رشتے آج بھی زندہ اور مستحکم ہیں۔ ماں بیٹے، باپ بیٹی اور خاندان کے تمام رشتے ہمارے سروں پر سایہ دار درخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سہارا دینے والے بھی مل جاتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہمارے معاشرہ میں بھی بعض خرابیاں ہیں، لیکن پھر بھی وہ اتنا گیا گزرا نہیں کہ اس کو ختم کرکے مغربی سماجی ماحول کو اپنایا جائے ہمیں اپنے سماجی حالات کے دائرے کے اندر ہی اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہئے ○

رنگِ مسیحائی

بانو آر کے۔

دل میں تو رومانہ کے کئی مرتبہ یہ بات آئی کہ وہ اپنے منہ زور جذبوں کا کہا مانے، حیا اور شرم کے کاغذی نقابوں کو اتار پھینکے اور کسی کے محفوظ آغوش میں پناہ ڈھونڈ لے۔ لیکن بزرگوں کی عزّت کا پاس اور ذلّت کا اندیشہ اس کے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئے اور وہ ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہ بھٹک پائی۔ والدین کا خوف، شرافت کا لحاظ اور اونچ نیچ کا فرق اسے بندھی ٹکی راہوں پر چلنے پر مجبور کرتے رہے۔ اس لئے زمانے کی رنگینیوں سے چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی بے رنگ زندگی کو نیرنگیاں نہ دے سکی۔ وہ جب کبھی آئینے کے قریب سے گزرتی، اس کا دلکش سراپا اس سے گلہ کرتا، لیکن وہ اپنی ان تمام کیفیات کو اپنے ابّو جی ریٹائرڈ پولیس آفیسر خان تراب کی قدامت پسندی کے پُل صراط کا جواز دکھا دیتی۔ آہستہ آہستہ اس کے کنوارے جذبوں کی زبان گنگ ہونے لگی۔ ابّو کی جابر شخصیت کا عصا اس کی جوان اُمنگوں کے پھنکارتے اژدہوں کو نگل گیا۔

ویسے رومانہ کے لئے رشتے والوں کا تانتا تو اس وقت سے بندھ گیا تھا جب وہ لڑکپن کی تمام سیڑھیاں پوری طرح چڑھ بھی نہ پائی تھی۔ لیکن خان تراب رشتوں کے معاملے میں چھان پھٹک کو انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ اگر انہیں کوئی لڑکا پسند آجاتا تو پھر اس کے خاندان کا حسب نسب ناپتے اور اس کے باپ دادا کے شجرے میں اس وقت تک گھسے چلے جاتے جب تک ایک آدھ قابلِ گرفت نکتہ ان کے ہاتھ نہ آجاتا۔ پھر وہ "مخمل میں ٹاٹ کا پیوند" کا راگ الاپ کر خاموش ہو رہتے۔ اس طرح رشتہ داروں اور پاس پڑوس کی رومانہ کی سہیلیاں تین تین، چار چار بچّوں کی مائیں ہو گزریں، لیکن خان تراب کی ٹھونک بجا کر دیکھ لینے کی عادت کے باعث رومانہ اپنے مجازی خدا کو پانے کے انتظار میں ہی رہی۔

خان تراب کے اس رویّے سے گھر کے سب ہی لوگ نالاں تھے۔ ان کی بیگم اکثر ان سے جھگڑتی رہتیں۔ رشتہ دار، دوست احباب انہیں سمجھاتے۔ لیکن ان کی شخصیت پولیس آفیسر کی ہٹ دھرمی تلے ہمیشہ دبی رہی۔ رومانہ کی امّی اکثر کہتیں: "کبھی تو ریٹائرڈ پولیس آفیسر کے کرخت پیکر سے نکل کر جوان بیٹیوں کے باپ کی طرح سوچیے۔ ذرا ان کی عمروں کی رفتار کو تو خاطر میں لائیے۔ گھر میں دو دو جوان کنواری بیٹیاں بیٹھی ہیں اور آپ کے دماغ پر برف کی سلیں سی دھری ہیں۔ رومانہ تیس سے اوپر ہونے کو ہے۔ اس کے پیچھے نغمہ بھی نیر لگائے ڈولی کی منتظر کھڑی ہے۔ میں کہتی ہوں اسی دنیا کے کسی نہ کسی لڑکے کو تو ہمیں آخر پسند کرنا ہی ہوگا کوئی آسمان کا فرشتہ، یا الف لیلوی شہزادہ تو ملنے سے رہا۔ پھر کیا وجہ ہے جو آپ ہر رشتہ کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ مگر بیگم کی ان تمام دلیلوں کے بعد خان تراب بس یہی بات کہتے: "بھئی بیگم، ہم کہاں اور یہ رشتے کے خواہاں لوگ کہاں؟" بیگم بے چاری دو نوجوان بچیوں کی شادی کے متعلق سوچ سوچ کر کڑھتیں اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو رو دھو کر چپ ہو بیٹھتیں۔

رومانہ سے نغمہ عمر میں بہت زیادہ چھوٹی تھی، لیکن رومانہ کی طرح شرافت کے کھونٹے سے بندھی رہ کر صوفیانہ زندگی بسر کرنے کو وہ زندگی کے عظیم مقصد کی پامالی تصوّر کرتی تھی۔ یوں تو گھر والوں نے رومانہ کی طرح نغمہ سے بھی نیک اور اچھی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، لیکن نغمہ کے حسن و شباب کی سرکش ندی کے تند بہاؤ میں خان تراب کے قدیم آدرش اور فرسودہ چیچلے تنکے کی طرح بہہ گئے۔ ایک رات نغمہ چپکے سے اپنے جسم کے تقاضوں کی اُنگلی تھام کر بزرگوں کی نصیحت کی دیوار کو پھلانگ گئی۔ جاتے جاتے وہ ایک تحریر چھوڑ گئی۔

پیارے ابّو:
میں اپنے مستقبل کے پیشِ نظر
یہ غلط قدم اُٹھا رہی ہوں۔
یہ قدم اس قدر رازداری سے
اور محتاط ہو کر اُٹھا رہی ہوں
کہ کسی کو اس وقت تک اس
کی بھنک نہ ملے گی جب تک
آپ لوگ خود نہ بتا دیں۔
انشاء اللہ مہینہ پندرہ دن کے
بعد میں ان حالات کے ساتھ
واپس لوٹوں گی کہ آپ کو مجھے
قبول کرنا ہی ہوگا۔ ندیم میرے
کالج کا ساتھی، جس کے ساتھ

میں نے جینے مرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے، وہ اس قدر لائق اور شریف نوجوان ہے کہ آپ یقیناً خوش ہوں گے۔ مگر مجھے اچھی طرح معلوم ہے ابو! کہ بجیا بجیا ہے اور میں، میں ہوں۔ ہر عمارت تاج محل تو نہیں ہوتی نا ابو۔ ہر بوند سے موتی کی توقع کیا درست ہے؟ ابو! آپ ان سوالات پر دھیان دیجئے اور پھر میری اس حرکت پر غور کیجئے۔ یقیناً یہ لائقِ درگزر ہوگی۔ اچھا ابو! اب اجازت دیجئے۔ بے چارہ ندیم میرے انتظار میں پاگل ہو رہا ہوگا۔

آپ کی
نغمہ

نغمہ کی یہ حرکت گھر بھر میں سب سے زیادہ رومانہ کو کھلی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے نغمہ نے تمام خاندان کو بامِ ثریا سے پاتال میں گاڑ دیا ہو۔ اس کی دانست میں نغمہ نے اپنی بجیا کے ہاتھوں میں مہندی رچنے کی موہوم سی امید کو یکسر ختم کر کے رکھ دیا تھا۔

نغمہ کی اس حرکت کے بعد خان تراب کی گالیوں اور ان کی بیگم کے ہونٹوں سے تمام گھر کی فضا مکدر ہو گئی۔ ہر چہرہ مضمحل، بجھا بجھا، ڈرا ہوا، سہما ہوا۔ گھر کے ہر فرد کا جینا محال ہو گیا گھر سے باہر نکلنے کی کسی میں سکت نہ تھی۔ گھر کی چار دیواری میں ہر بات نغمہ کی بے حیائی سے شروع ہو کر رومانہ کی شرافت پر ختم ہوتی نغمہ کے نام سے ہی بڑی بوڑھیاں انگلیاں چٹخاتیں اور رومانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتیں۔

اس سانحے کو ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ رومانہ کے رشتے کے لئے عنایت حسین تشریف لائے۔ خلافِ توقع خان تراب نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا۔ ویسے تو گھر کا ماحول ایسے معاملات کے لئے تیار نہیں تھا، لیکن نغمہ کے حادثے نے جیسے ہر کسی کو چوکس کر دیا۔ خان تراب کو ان لوگوں کی ہر بات پسند آ گئی اور انہوں نے حامی بھر لی۔ شادی کی تاریخ تک طے پا گئی۔

رات کو جب سب گھر جڑ بیٹھا تو رومانہ اپنی ساری ہمت کو یک جا کر کے زندگی میں پہلی مرتبہ زبان کھولنے کی جسارت کی "کیوں ابو، یہ لڑکا آپ کے معیار پر پورا اترنے والا دکھائی تو نہیں دیتا۔ سنا ہے، اس کا کاروبار آٹھ، دس لاکھ میں ہی سمٹا ہوا ہے۔ زمین جائداد بھی ایسی کچھ زیادہ نہیں۔ کیا یہ سب آپ کی بیٹی کے لئے کافی ہوگا؟ اور ہاں ابو! آپ کی پسند کے مطابق اس کی جلد کا رنگ سرخی مائل نہ ہو کر تھوڑا سفیدی لئے ہوئے ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ابو، آپ نے اپنے معیار کی کسوٹی کیوں بیچ دی؟" رومانہ جیسے اپنے بیس سے تیس برس کے درمیان کے بارہ برسوں کے ایک ایک لمحے کا حساب لینے پر تل گئی۔

خان تراب کو رومانہ کا ہر لفظ سو سو بچھوؤں کے ڈنک سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوا۔ وہ نیچی نظریں کئے دھیمے لہجے میں بولے "بیٹی، میرے زخموں کا اندازہ کرو۔ اس قدر انگارے نہ انڈیلو۔ میں نے جو کچھ آج کیا، وہ مجھے بہت پہلے کر گزرنا تھا۔"

رومانہ کی شادی کی تیاریاں اسی کشاکش کے درمیان ہوتی رہیں۔ ابھی نغمہ کو اس گھر سے گئے دس دن ہی ہوئے تھے کہ رومانہ کے ماموں دلی سے آئے۔ گھر کا ہر فرد نغمہ کی حرکت کے باعث ان سے نظریں چرانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے رومانہ کے ماموں نغمہ کے پرسے کے لئے آئے ہوں۔ کچھ دیر کے سکوت کے بعد انہوں نے خان تراب کو مخاطب کیا "کیوں بھائی صاحب، کیا نغمہ کے بغیر ہی رومانہ کی ڈولی اٹھ جائے گی؟ کیا اس بے چاری کی شرکت تک غیر ضروری ٹھیری؟"

خان تراب پر شدید کرب کا عالم طاری ہوا۔ وہ آنکھوں میں خون لا کر کہنے لگے "یہ مرنے والے کو صرف رویا جاتا ہے۔ اس کم بخت نے جس دن اس گھر کی دہلیز چھوڑی، سمجھو دنیا چھوڑی۔ کنواری لڑکی کی زندگی گھر کی دہلیز کے اس پار اور موت اس پار!" وہ غصے میں جیسے بھن رہے تھے۔ "آئندہ اس کا میرے روبرو نام بھی نہ لینا۔ سمجھے! مرنے والے کو بھلایا جاتا ہے، بلایا نہیں جاتا۔"

تھوڑی دیر بعد جب خان تراب آپے میں لوٹے تو رومانہ کے ماموں نے اطمینان کے ساتھ کہا "بھائی صاحب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟"

خان تراب خاموش ہی رہے تو رومانہ کے ماموں نے جذباتی ہو کر کہا "نغمہ پچھلے ایک ہفتے سے میرے یہاں ہے۔ وہ تمہارے گھر سے میرے گھر آئی تھی، بھاگی نہیں تھی۔"

گھر کا ہر فرد چونک اٹھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ رومانہ کے ماموں کہنے گئے: "نغمہ کی سہیلی کے چچا عنایت حسین اپنے لڑکے کا رشتہ رومانہ کے لئے لے کر آنے والے تھے اور نغمہ اس رشتے کے حق میں تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس مرتبہ پھر آپ حسبِ معمول مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کہہ کر انکار کر دیتے۔ اس لئے اس رشتے کے تعلق سے آپ کے رویے میں درستی لانے کے لئے اور آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا بروقت احساس دلانے کی خاطر نغمہ نے یہ ڈرامائی قدم اٹھایا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو کیا آج رومانہ کا رشتہ عنایت حسین کے یہاں طے پاتا؟"

انہوں نے جیب سے ایک خط نکالا اور کہنے لگے "یہ لیجئے، یہ دیکھئے وہ خط جو نغمہ نے میری آگاہی کے لئے ارسال کیا تھا۔"

خیالات کی اتھل پتھل رومانہ کے لئے طوفان بن گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ نغمہ کے باہر نکلے ہوئے ہر قدم پر سجدے کر کے اپنی پیشانی کو لہولہان کر لیتی!

○○

غریبی

عظیہ اقبال

غریبی کا وجود دنیا میں انسانی تہذیب کی ابتدا سے ہی ہے۔ افلاس کے مسائل پر مختلف زبانوں میں فلسفیوں، سماجی رہنماؤں، مدبروں اور دانش وروں نے روشنی ڈالی ہے اور ان کو نہایت لگن اور سنجیدگی سے حل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ مسئلہ ہمارے سماج کا ایک عجیب و غریب المیہ ہے۔ اس کو جس قدر حل کرنے یا سلجھانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں، اسی قدر یہ مسئلہ اور الجھ جاتا ہے۔

غریبی کے اثرات انسان اور سماج دونوں پر نہایت زہریلے اور تباہ کن ثابت ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ غریبی انسان کے چین اور آرام کو چھین لیتی ہے۔ اس کی زندگی سلگتی ہوئی چتا کے مانند ہو جاتی ہے۔ غریبی کے اثرات تنہا غریب آدمی ہی پر نہیں پڑتے بلکہ اس کے مہلک اثرات پورے معاشرہ پر پڑتے ہیں اور معاشرہ انسانی معاشرہ نہ رہ کر وحشیوں کا معاشرہ بن جاتا ہے۔ اخلاقی قدریں ماند پڑ جاتی ہیں، نفرت، جلن، حسد، بغض اور کدورت کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور پورا معاشرہ گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں زیادہ تر انقلابات غریبی اور معاشی بدحالی کی وجہ سے برپا ہوئے ہیں۔

عام اصطلاح میں ہم اس شخص کو غریب تصور کرتے ہیں جو اپنے ملک کی اوسط معاشرتی سطح سے گری ہوئی سطح پر زندگی گزارتا ہے۔

افلاس ان اشیاء سے محرومی کا نام ہے جو ایک انسان کو زندہ، تن درست اور توانا رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غریبی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو مہیا کرنے کے ذرائع کے فقدان کو کہتے ہیں۔ اب یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی وہ بنیادی ضرورتیں کیا ہیں جن کو ہر حالت میں پورا ہونا چاہئے۔ ایسی ضرورتوں میں سرفہرست انسان کی زندگی اور اس کی حفاظت اور بقا ہے زندگی کی حفاظت اور بقا کے لئے مناسب کھانے کے علاوہ کپڑے اور مکان کی بھی ضرورت ہے۔ انسان کے پاس چاہے کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو، اگر اس کے پاس صاف ستھرا مکان نہیں ہے تو وہ کبھی چین اور آرام سے نہیں رہ سکتا اور نہ اپنی صحت کی حفاظت کر سکتا ہے۔ انسان کے لئے اپنی بیوی بچوں کی پرورش کرنا بھی اس کی بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے۔ اولاد کی زندگی اور صحت کی حفاظت کا بوجھ والدین پر ہی ہوتا ہے۔ یہ ان ہی کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کی پرورش مناسب طور پر کریں۔ جن لوگوں کی یہ بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، انہیں ہم غریب نہیں کہہ سکتے لیکن جو لوگ اپنی آمدنی کم ہونے کے باعث یہ ضرورتیں پوری نہیں کر پاتے وہ غریب ہی کہلائیں گے۔

جب دنیا عالم وجود میں آئی تھی تو غریبی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، کیوں کہ اس وقت انسان چھوٹے چھوٹے گروہ کے روپ میں رہتے تھے اور ایک دوسرے سے خونی تعلق ہوتا تھا، جس کی بنیاد پر اس وقت لوگ "ہم" کے جذبہ کا احساس رکھتے تھے۔ اگر گروہ کا کوئی فرد مصیبت یا پریشانی میں پڑ جاتا تو اس کی مصیبت یا پریشانی کو گروہ کے باقی تمام افراد اپنی مصیبت یا پریشانی پر محمول کرتے تھے جس کی وجہ سے کسی بھی فرد کو زندگی گزارنے کی بنیادی ضرورتوں کی کمی نہیں رہتی تھی۔ ایسی صورت میں افلاس کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

جیسے جیسے یہ چھوٹے گروہ بڑے بڑے گروہوں میں تبدیل ہوتے گئے، قریبی یا ذاتی تعلقات کم یا ختم ہوتے چلے گئے۔ آج کل کے زمانے میں بھی جن فرقوں میں بنیادی یا ذاتی تعلقات قائم ہیں یا پائے جاتے ہیں، ان میں آج بھی غریبی نام کی کوئی چیز دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کی زندہ مثال قبیلے ہیں۔

اب دنیا میں معاشرہ میں تہذیب و تمدن کے میدان میں ترقی کے ساتھ غریبی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک طرف مختلف ذرائع بڑھتے جا رہے ہیں اور دنیا ترقی کی راہ پر گامزن ہے تو دوسری طرف غریبی بھی اتنی ہی شدت اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس غریبی کے اسباب کیا ہیں؟ قدرتی آفات مثلاً سوکھا پڑ جانا، سیلاب آ جانا، آگ لگ جانا، کوئی سنگین حادثہ پیش آ جانا، بڑھاپا، روزی کمانے والے فرد کی اچانک موت واقع ہو جانا۔ ان تمام آفات سے بلاشبہ غریبی پھیل جاتی ہے۔ مگر اس وقت ہمارا موضوع گفتگو وہ غریبی ہے جس کے لئے انسان اور انسانی معاشرہ ذمہ دار ہیں۔

بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ جب پیدائش کی شرح بڑھ جاتی ہے تو غریبی بھی بڑھ جاتی ہے ان کا کہنا ہے کہ آبادی جس تناسب سے بڑھتی ہے اسی تناسب سے ضروریاتِ زندگی کے لئے اشیاء کی پیداوار نہیں بڑھتی۔ اس طرح غریبی کا بڑھ جانا ایک قدرتی امر ہے۔

سرمایہ دارانہ طرزِ حکومت بھی غریبی کو بڑھاوا دیتا ہے۔ مزدور سرمایہ دار پر ہی انحصار کرتا ہے۔ مزدور چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ کام کرے جس سے اس کی تیار کردہ چیز کی قیمت بھی بڑھ جائے اور اس کی مزدوری میں بھی اضافہ ہو جائے۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ سرمایہ دار اس زائد رقم کو جو چیز کے بہتر بننے سے حاصل ہوتی ہے، خود ہڑپ کر لیتا ہے اور مزدور بھوکا کا بھوکا رہ جاتا ہے۔ ایک مزدور اپنی محنت سے جو کچھ پیدا کرتا ہے، عموماً اس کا چھٹا حصہ بھی اس کو نہیں مل پاتا۔ اس طرح مزدور زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت کر کے بھی اپنی تنگ دستی کو رفع نہیں کر پاتا۔ کچھ مخصوص لوگ ہی اپنے آپ کو مالدار بنا سکتے ہیں۔ زیادہ تعداد میں لوگ غریب رہ جاتے ہیں۔ جب زمیں داری کا نظام رائج تھا تو زیادہ تر دیہات میں یہ دیکھا گیا کہ زمیں دار کسانوں سے بہت زیادہ لگان وصول کرتے تھے اور ان کو اتنا لاچار کر کے چھوڑتے تھے جس سے ان کے پاس بمشکل اتنا رہ جائے جس سے وہ تنگ دستی کی حالت میں زندگی گزار سکیں۔

بعض لوگ یہ کہتے سُنے گئے ہیں کہ جو نادار ہے اور مفلسی کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے، وہ اپنی برائیوں اور خامیوں کی وجہ سے ہی غریب ہے اور جو دولت مند ہے وہ اپنی دولت اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے مالدار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو کام کرنے کے قابل نہیں ہیں، یا کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یا کام کرنے میں کسی کمی وجہ سے کمزور نہیں ہیں، وہ اپنی زندگی میں کافی ترقی کر لیتے ہیں، یہ قیاس کر لینا انتہائی غلط ہے کہ آدمی کو کام نہ کرنے میں تساہل کا میلان اپنے ماحول یا وراثت میں ملا ہے، جس کے باعث اسے غریبی کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

انسان کو غریب اور نااہل بنانے میں بیماری کو اہم مقام حاصل ہے، کیوں کہ بیماری پر ایک طرف تو کافی روپیہ صرف ہو جاتا ہے اور دوسری طرف بیماری انسان کی کارکردگی پر بُری طرح اثرانداز ہوتی ہے، جس کا اثر اس کی آمدنی پر پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو بیماری اتنی شدید اور مہلک ہوتی ہے کہ انسان کام کرنے کے لائق ہی نہیں رہتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آمدنی صفر ہو جاتی ہے اور ایک کثیر رقم ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتی ہے اس طرح بیماری غربت کو جنم دیتی ہے۔

سُستی اور کاہلی بھی غریبی کا ایک سبب ہے۔ غریبی کو دُور کرنے کے لئے دولت اور محنت دونوں ہی کی یکساں طور پر ضرورت ہوتی ہے لیکن اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بیشتر غریب لوگ یا تو کام کرنے سے جی چُراتے ہیں یا وہ محنت نہیں کرتے۔

روپے کو غیر مناسب طریقے سے غیر ضروری چیزوں پر خرچ کرنا بھی غریبی کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ آدمی کے پاس کافی روپیہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو اچھی طرح پورا کر سکتا ہے، لیکن جب وہ فضول کے کاموں میں یا محض وقتی تفریح کی خواہش میں اپنا روپیہ خرچ یا ضائع کرنے لگتا ہے تو وہ اپنی جسمانی اور دماغی طاقت کو بھی آہستہ آہستہ کم کرتا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی آمدنی ۱۲۰ روپے ماہوار ہے اور گھر میں چار افراد ہیں جن کی اس کو کفالت کرنا پڑتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو سلیقہ اور کفایت شعاری سے اپنی آمدنی کو استعمال کر کے اپنے رہن سہن کو ٹھیک رکھ سکتا ہے لیکن اگر اسے شراب پینے، سنیما دیکھنے یا ہوٹل وغیرہ میں جانے کی عادت ہے تو وہ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ان فضول کاموں پر صرف کرنے لگے گا۔ اگر کسی شخص کو نشے یا جُوئے کی لت پڑ جاتی ہے تو وہ اپنے گھر کا مال و اسباب فروخت کر کے بھی اپنی اس بُری لت کو قائم رکھتا ہے چاہے اس کی صحت پر کتنا ہی بُرا اثر کیوں نہ پڑے اور چاہے اس کی تنگ دستی میں اور زیادہ اضافہ کیوں نہ ہو جائے۔ اکثر لوگ محض نام و نمود کے لئے یا اپنی جھوٹی عزت قائم رکھنے کے لئے بیاہ شادی کے موقع پر قرض اُدھار لے لیتے ہیں اور ان کے ذرائع ایسے نہیں ہوتے کہ وقت پر قرض ادا کر سکیں۔ پھر وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے ذہنی سکون کو تو برباد کرتے ہی ہیں، اپنی اس بے جا فضول خرچی کی وجہ سے وہ غریب بھی ہو جاتے ہیں یا کم از کم غریبی کی سمت بڑھنے لگتے ہیں۔

کثرتِ اولاد بھی غریبی کا ایک سبب ہے۔ اکثر یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ اولاد زیادہ ہوتی ہے اور اس زیادتی کی نسبت سے آمدنی بہت کم۔ ایسی صورت میں غریبی کا مسلط ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

غریبی کی ایک وجہ کم پیداوار بھی ہے۔ جس ملک میں کم پیداوار ہوتی ہے وہ ملک فارغ البال کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں تو غریبی اور تنگ دستی کا جال پھیلا ہی رہے گا۔ اس کے علاوہ جہاں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے، وہاں بھی غریبی چھائی رہتی ہے جہاں ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دولت مندوں پر بہت زیادہ آمدنی کے باوجود زیادہ ٹیکس نہیں لگایا جاتا تو وہاں دوسری طرف ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگوں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ آج کل جمہوریت کا زمانہ ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت کے ساتھ سرمایہ داری جُڑی رہتی ہے۔ زیادہ طاقت یہاں سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ دولت مند لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی معاشی طاقت سمٹ جانے سے مالدار لوگ اور مالدار ہوتے چلے جاتے ہیں اور غریب اور زیادہ غریب۔

ہمارے ملک میں بے کاری بھی ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، جو تنگ دستی اور افلاس کو دعوت دیتی ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ ہے۔ ۸ فی صد غریبی کا سبب

بے کاری یا بے روزگاری ہی ہے۔ ناقص تعلیمی نظام بھی غریبی کو بڑھاوا دیتا ہے۔ لاکھوں طالب علم کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں، لیکن جب ان کو ملازمت نہیں ملتی تو وہ بیچ میں اٹکتے ہیں۔ آج کل کالجوں، اسکولوں اور یونی ورسٹیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور اسی طرح بے روزگار تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا جارہا ہے، جس کا آخر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نوجوان اپنی زندگی کے شروع سے ہی پست حوصلہ بن جاتے ہیں، جس سے ان کی کارکردگی کی طاقت سلب ہوجاتی ہے۔

غریبی کو بڑھاوا دینے کے اسباب میں جنگ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جنگ شروع ہوجانے سے بھی سیکڑوں گھر تباہ و برباد ہوجاتے ہیں، سیکڑوں بچے یتیم ہوجاتے ہیں، سیکڑوں عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں۔ جنگ میں جو افراد کام کرنے کے اہل اور لائق ہوتے ہیں، نیست و نابود ہوجاتے ہیں یا زخمی ہوکر دوسروں پر بوجھ بن جاتے ہیں اور جو نکمے لوگ ہیں وہ سماج پر بوجھ بن کر رہ جاتے ہیں، کیوں کہ پیداوار بڑھانے کے کاموں کو وہ مناسب طور سے نہیں کرسکتے۔ جنگ کے دوران میں تجارت وغیرہ بالکل ہی ختم ہوجاتی ہے۔ ملک کی بیشتر دولت جنگ پر ہی صرف ہوجاتی ہے اور ملک کی سماجی، اقتصادی اور معاشی حالت بگڑ جاتی ہے۔ جنگ کے دوران میں جو دولت صرف ہوتی ہے اس کی کمی کو پورا کرنے میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس کے لئے عوام پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دئے جاتے ہیں اور اس طرح ملک میں غریبی پھیلنے لگتی ہے۔

زمین کا بٹوارا بھی غریبی کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص جو مشترکہ خاندان میں رہتے ہیں، ان کا گھر کی زمین جائداد پر پورا اختیار ہوتا ہے۔ جب زمین کا بٹوارا ہوجاتا ہے تو مختلف قسم کے جھگڑے سامنے آتے ہیں۔ اگر ایک مشترکہ گھر میں تین بھائی ہیں تو تینوں بھائی اپنی دور دور اور تھوڑی تھوڑی زمین کا بٹوارا ہوجانے سے اس پر ٹھیک طرح سے کاشت کاری نہیں کرسکتے۔ تھوڑی بہت زمین حدبندی (مینڈھ) کرانے میں ضائع ہوجاتی ہے اور جو باقی زمین رہ جاتی ہے، اس پر جدید مشینیں یا آلات (مثلاً ٹریکٹر) چلانے میں دقت اور پریشانی ہوتی ہے۔ اس طرح زیادہ پیداوار نہیں ہوپاتی۔ لیکن اگر یہ تینوں بھائی شرکت میں کام کرتے تو کم وقت اور کم سرمائے سے زیادہ سے زیادہ دولت کما سکتے تھے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کسان اور مزدور قرض میں پیدا ہوتا ہے، قرض میں زندگی بسر کرتا ہے اور قرض ہی میں مرجاتا ہے۔

سماج کے غلط ڈھانچے کا بھی غریبی کو بڑھاوا دینے یا غریبی کو پھیلانے میں بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، چوری چکاری کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ یا ایسے کام کرنے لگتا ہے جن سے جرائم پیشہ لوگوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ بچپن میں جو بچے جرائم کرنے لگتے ہیں، حقیقتاً غریبی کے باعث کرتے ہیں، ایک ایسا بچہ جس کی ضرورتوں یا خواہشات کی تکمیل نہیں ہوپاتی، آہستہ آہستہ گھر سے پیسے چرا کر یا غیر سماجی یا غیر اخلاقی کام کرکے اپنی خواہشات کی کسی نہ کسی طرح تکمیل کرلیتا ہے۔ ایسے بچے آگے بڑھ کر بڑے جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔ روپیہ پیسے کی کمی کی وجہ سے ایسا بچہ تو آوارہ ہو ہی جاتا ہے، اس کی بری صحبت میں پڑکر دوسرے اچھے بچے بھی اپنا چال چلن بگاڑ لیتے ہیں۔

غریبی کی وجہ سے معاشرتی اصولوں پر پوری طرح کاربند نہیں رہا جاسکتا۔ اور اسی طرح مذہب کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اکثر غریب لوگ اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے برے اور ناجائز کاموں میں پھنسے رہتے ہیں۔ اپنی تنگ دستی کے باعث وہ ایثار اور قربانی کی جگہ خود غرضی اور مطلب پرستی کے جال میں جکڑے رہتے ہیں۔ یہ غریبی ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کو سماج میں وہ درجہ نہیں مل پاتا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ غریب کی کوئی قیمت سماج میں نہیں ہوتی ہے چاہے وہ کتنا ہی دانش مند، عالم، متقی اور پرہیزگار کیوں نہ ہو۔

ملک میں جو بدعنوانیاں، بے ایمانی اور اخلاقی گراوٹیں پھیلی ہوئی ہیں، یہ سب کی سب اسی غریبی کی وجہ سے ہیں جو انسانیت کے نام پر ایک بدنما دھبا ہے۔

غریبی کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں، لیکن درحقیقت غریبی کا سب سے بڑا سبب بذاتِ خود غریبی ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے ایک مرتبہ جو شخص غریبی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے وہ زندگی بھر اسی میں پھنسا رہتا ہے۔ غریبی ایک لعنت ہے اس سے ملک اور معاشرہ کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ غریبی کسی بھی ملک کے لئے ایک کلنک ہے ایک غریب ملک دنیا کے ملکوں کے سامنے اپنا سر اونچا نہیں کرسکتا۔

●

اس روز پونم کو دیکھ کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ سوچنے لگی، کیا یہ وہی پونم ہے جسے دو سال پہلے دیکھا تھا؟ اس پونم اور آج کی پونم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ تب وہ بیل باٹم، مڈی یا ایسی ہی کوئی اور فیشن ایبل پوشاک پہنتی تھی۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں۔ آنکھوں میں دھوپ کا چشمہ چڑھائے فرّاٹے دار انگریزی بولتی ہوئی۔ لیکن اب وہ نیلے رنگ کی پھول دار ساڑی اور پوری آستین کا گلابی بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ ماتھے پر بڑی سی گلابی بندی آنکھوں میں کاجل اور مانگ میں سیندور تھا۔ اس پوشاک میں وہ ٹھیٹ بہاری عورت لگ رہی تھی اس کی گود میں چھ سات مہینے کی ایک گوری سی بچی تھی، اور ہاتھ کی ٹوکری میں بچی کا ڈھیر سارا سامان تھا

”کیا دیکھ رہی ہو؟ پہچانا نہیں کیا؟“ پونم نے ہی ٹوکا۔

”دیکھ رہی ہوں، تم پوری عورت ہو گئی ہو اور وہ بھی بچی بہاری؟“

”یہ تم جیسی بہاری کی دوستی کا پھل ہے۔“ کہہ کر وہ مسکرا پڑی۔

”کسی ہندو لڑکے سے شادی کی ہے کیا؟“ میں نے اس کی مانگ کے سیندور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ! یہ سیندور دیکھ کر پوچھ رہی ہو نا؟“ وہ مسکرا کر بولی ”ہے تو ہندو، مگر ہندی نہیں جانتا۔ مدراس سے نیا نیا آیا تھا یہاں نوکری کرنے۔“

”اور تمہارے چکر میں پھنس گیا۔ کیوں؟“ وہ مسکرا دی۔ واقعی اس کی مسکراہٹ بڑی پیاری تھی۔ اس کے بات کرنے کا انداز بھی دل کش تھا۔ پونم سانولی ضرور تھی، مگر ناک نقشہ بہت اچھا تھا۔

درد

نجم السحر صدیقی

پونم سے میری پہلی ملاقات کانونیٹ میں ہوئی تھی، جہاں وہ پڑھاتی تھی اور جہاں آنٹی کی چھوٹی لڑکی مونا پڑھتی تھی۔ اس دن اسکول میں فنکشن تھا۔ آنٹی کے ساتھ میں بھی گئی تھی۔ دیکھا، پونم اسٹال لگاکر فرّاٹے سے انگریزی بول رہی تھی اور اس کے سامنے لڑکوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ خوب روپیہ آرہا تھا۔

"خوب بے وقوف بنا رہی ہو!" میں نے کہا۔

"جب یہ خود ہی بننا چاہتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ سوچا، چلو بنا ہی لیں، کیوں، ٹھیک ہے نا"؟

میں اس کی معصومیت پر مسکرا دی تھی اس کے بعد بھی اس سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن اس سے دوستی تو اسی وقت پروان چڑھی جب وہ آنٹی کے یہاں رہنے کو آگئی۔ ہوا یہ کہ یکایک اسکول کے منتظموں نے اسے ہوسٹل سے نکال دیا۔ میں نے پہلی بار اس دن آنٹی کے گھر میں پونم کو روتے دیکھا۔ میرے بہت پوچھنے پر اس نے بس یہی بتایا کہ اسے ہوسٹل سے نکال دیا گیا ہے۔ وجہ کچھ نہیں بتائی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "کون سا گھر، نمرتا؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں، بے حد اکیلی۔" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ میں نے آگے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

پونم کچھ دن تک آنٹی کے گھر میں ہی رہی۔ آنٹی کے کئی بچے تھے۔ مگر ان سب لوگوں کے درمیان میں نے پونم کو گم صم ہی دیکھا۔ اس کی پہلے والی مسکراہٹ کہیں گم ہو گئی تھی۔

ایک دن میں نے اسے ٹوکا "پونم تمہاری وہ مسکراہٹ کہاں گئی؟"

"بھیڑ میں کھو گئی نمرتا۔ اب آگے کچھ نہ پوچھنا۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ شاید کبھی تمہیں ساری باتیں بتا سکوں، لیکن ابھی میرا دماغ قابو میں نہیں ہے!"

اس کے بعد میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ میں چھٹیوں میں گھر چلی گئی۔ لوٹ کر آئی تو پونم کو وہاں نہیں دیکھا۔ آنٹی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اس کا شاید کسی لڑکے سے عشق چل رہا تھا، اسی لئے انہوں نے اسے یہاں سے چلتا کر دیا۔ ہوسٹل سے بھی وہ اسی وجہ سے نکالی گئی تھی۔

مجھے نہ جانے کیوں پونم کی بابت ایسی باتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آنٹی سے پوچھا " آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

"نہیں، مجھے اسی لڑکے نے بتایا تھا۔ جانے دو، نمرتا۔ اچھا ہی ہوا۔ لڑکی کا معاملہ تھا۔ کل کو کچھ ہو جاتا تو ساری بدنامی میرے سر آتی۔"

شاید آنٹی ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں، یہ سوچ کر میں چپ ہو گئی۔ لیکن یہ جاننے کی کوشش میں رہی کہ وہ گئی کہاں۔ اس کا چہرہ رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔

میں پوچھنے ہی والی تھی کہ آنٹی خود ہی بتانے لگیں: "وہ دھنباد گئی ہے۔ ساتھ میں کوئی اور کرسچین لڑکی تھی۔ شاید وہیں ٹیچر ہو گئی ہے۔"

میں نے چین کی سانس لی۔ کم سے کم اس کا روزگار تو ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد پونم کی کوئی خبر نہیں ملی اور آج اسے دیکھ رہی تھی تو اس شکل میں۔

بچی کو کندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے پونم نے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگیں نمرتا؟"

"تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ چپ چاپ شادی کر لی اور خبر تک نہ دی۔"

"میری شادی ہو گئی، یہی کیا کم ہے؟" پونم کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"جانے دو، پونم میرا ارادہ تمہیں دکھی کرنے کا نہیں تھا۔"

"نہیں نمرتا، اب دکھی کہاں ہوں۔ اب تو خوش ہوں۔ دکھ کے دن تو حقیقت میں وہ تھے شاید تمہیں یقین نہ ہو۔"

"کیا؟"

"ہاں، میں سچ کہتی ہوں۔ سنو، میں پانچ بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہوں۔ ایک چھوٹی بہن اور ہے اور دو بھائی ہیں۔ پاپا کیا کرتے تھے مجھے کبھی پتہ نہیں چلا۔ اب وہ چھٹی لے چکے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں شروع سے ہی ماں باپ دونوں کا برتاؤ میرے لئے خراب رہا۔ ماں گھر کا سارا کام کاج مجھ ہی سے کراتی تھی۔ اور بھائی بہنوں کو دوسرے اسکول میں پڑھایا لیکن میں مشن اسکول میں پڑھتی تھی۔ بی ایس سی کر کے میں کانونیٹ میں ٹیچر ہو گئی۔ اپنی آمدنی کا تین چوتھائی حصّہ میں گھر بھیج کر بھائی بہنوں کی پڑھائی میں مدد کرتی رہی۔ چھوٹی بہن میڈیکل میں پڑھتی تھی اور میں اس کی مدد کے لئے دن رات اسکول میں لگی رہتی تھی۔ پھر بھی میں جب گھر جاتی تو ماں کا برتاؤ بہت خراب رہتا۔ اس دن مجھے بہت دکھ ہوا جب چھوٹی بہن ڈاکٹر ہو گئی اور ماں نے اس کی شادی ایک ڈاکٹر سے کر دی، لیکن میرے بارے میں ایک بار بھی نہیں سوچا۔ پاس پڑوس کے لوگوں کے پوچھنے پر میرے بارے میں جھوٹ کہہ دیا گیا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جب میں نے اس سلسلے میں ماں سے پوچھا تو وہ بولیں: نہیں، تیرے لئے گھر بسانا پاپ ہے ایسا کرنے سے بھگوان تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں ماں سے پوچھنا چاہتی تھی کہ پھر خود اس نے یہ پاپ کیوں کیا؟ چھوٹی بہن سے یہ پاپ کیوں کرایا؟ مگر ماں کی جلّادی صورت دیکھ کر کچھ پوچھنے میں بھی ڈر لگتا تھا۔ میں اسکول میں واپس آگئی۔ پھر خبر ملی کہ بھائی کی بھی شادی ہو گئی ہے۔"

"ایک بات بتاؤ گی، پونم؟" میں نے بیچ میں ہی ٹوکا۔ "جس لڑکے کی بات اڑی تھی تمہارے ساتھ، اس سے شادی کیوں نہیں کر لی؟"

پونم اداس ہو کر بولی "میں تجھے وہی بتانے جا رہی تھی۔ لڑکی جب اکیلی ہوتی ہے تو گلی کے کتّے بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکا

ہمیشہ میرے پیچھے پڑا رہتا تھا اور ستانے ہوسٹل پہنچ جاتا تھا۔ میرے ڈانٹنے اور دھمکانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا اس نے پرنسپل سے شکایت کر کے مجھے ہوسٹل سے نکلوا دیا۔ پھر میں آنٹی کے یہاں رہنے لگی تو اس نے آنٹی سے بھی میرے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں کیں۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ آنٹی بھی مجھے نہیں سمجھ سکیں خیر یہ سب بیتی باتیں ہیں۔ پچھتاوا کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں — آنٹی کے یہاں سے نکل کر میں اسی وقت رتیا کے ساتھ سنگاپور چلی گئی۔ پھر وہاں سے ناٹا نگر پہنچی اور ایک کالج میں پرنسپل ہو گئی۔ میرے شوہر وہاں ایک آفس میں پہلے سے کام کرتے تھے۔ کچھ ہی دن بعد ہماری شادی ہو گئی۔ میرے پاپا کو جب میرا پتہ چلا تو انہوں نے تار دیا کہ ماں کی طبیعت بہت خراب ہے، گھر چلی آؤ۔

جب میں نہیں گئی تو پاپا خود مجھے لینے آئے۔ انہوں نے کالج کی نوکری سے میرا استعفیٰ دلا دیا۔"

"اور تو نے ان کے کہنے سے ایسا کر دیا؟"

"کیا کرتی؟ پاپا رونے لگے۔ ماں کو کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس لئے میں گھر چلی گئی۔ اس وقت پریتی میری کوکھ میں تھی۔ ماں کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ لیکن میرے خود شادی کرنے پر وہ لوگ بہت بگڑے اور مجھے مارا پیٹا بھی"

"تو اسی لئے گئی تھی!" میں نے طنزیہ کہا۔

"اب جو بھی کہو۔ لیکن اصلی دکھ تو انہیں اس بات کا تھا کہ روپیہ کما کر دینے والی ہاتھ سے نکل گئی۔ خیر، ماں اس حالت میں بھی گھر کا سارا کام مجھ سے کراتی تھی۔ بھابھیوں سے اکثر کہتی: تم تو گھر کی بہو ہو۔ پونم کو ہی سارا کام کرنے دو۔ ایک بار پریتی کے پاپا دیکھنے کو گئے تو میرے پاپا نے انہیں بھی اُلٹا سیدھا سمجھا کر ان کی ٹاٹا نگر کی نوکری ختم کرا دی اور وہیں کام دلا دیا۔ پاپا نے سوچا کہ میرے شوہر جو کچھ کمائیں گے وہ ان ہی کے ہاتھ میں آئے گا لیکن میں ضد پر اتر آئی اور میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ جس طرح بھی ہو مجھے وہاں سے فوراً لے چلیں میرے شوہر کچھ ہچکچائے۔ کہنے لگے ٹیلی فون آپریٹر کی نوکری نئی نئی لگی ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہے۔ وہاں جانے پر دوبارہ سرے سے نوکری تلاش کرنا پڑے گی۔ لیکن نمرتا! میں بہت خوش ہوں کہ میرے شوہر میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے میرے خیالوں کی قدر کی اور میں اس جہنم سے نکل بھاگی۔ میرے شوہر آج بھی چاہتے ہیں کہ میں اسمارٹ رہوں، مگر میرا اب دل نہیں چاہتا، کیونکہ مالی حالت بھی تنگ چل رہی ہے۔ اب تو پھر نوکری کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے آنٹی سے کہنے آئی تھی کہ کسی سے کہہ کر وہ کہیں نوکری دلا دیں۔"

پونم کی آپ بیتی سن کر میں بہت تعجب میں تھی۔ سوچ رہی تھی کیسے ہیں اس کے ماں باپ! میں نے پوچھا "پونم، تمہارے ماں باپ اپنے نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں، اپنے ہی ہیں!"

"پھر تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں؟"

"میں کالی ہوں، شاید اسی لئے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی مرضی کے مطابق انہیں کما کر نہیں دے رہی ہوں!"

شاید پونم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس روز پونم کے جانے کے بعد کافی دن تک اس سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ آنٹی نے سفارش کر کے اسے اسکول میں نوکری دلا دی۔ تنخواہ تو زیادہ نہ تھی لیکن ٹیوشن کافی مل گئے تھے۔

میں خود اس کے بعد ایک دن پونم کے گھر گئی۔ دیکھا، پریتی کے پاپا بالٹیوں میں پانی بھر رہے تھے اور پونم کھانا بنا رہی تھی دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

"پونم، کیا حال ہے تمہارے ماں باپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"پاپا کی طبیعت خراب ہے!"

"تو اس بار میاں کو چھوڑ کر جا رہی ہو نا؟ اس بار تو نوکری چھوڑ کر گئی تھیں۔"

پونم کے شوہر کنکھیوں سے پونم کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"نہیں، انہیں چھوڑ کر تو نہیں جاؤں گی۔ لیکن ایک بار پاپا کو جا کر دیکھ آنے کا ارادہ ضرور ہے!"

میں کچھ سوچ کر بولی "پونم کیا کہہ رہی ہو! وہ لوگ اپنی غرض سے تمہیں یاد کرتے ہیں اور تم ہو کہ ان کے پیچھے بھاگ رہی ہو"

"بات تو ٹھیک ہے، نمرتا۔ لیکن کیا کروں؟ ہیں تو وہ میرے ماں باپ۔ ایک بات جانتی ہو؟ لڑکیاں درد میں ہی جیتی ہیں!"

لوٹتے وقت راستے بھر میں یہی سوچتی رہی۔ پونم ٹھیک ہی کہتی ہے، لڑکیاں درد میں ہی جیتی ہیں۔

○○

جواہر پارے

- انسانیت کا سنگیت صرف آزادی کے ساز سے پھوٹتا ہے۔
(سبھاش چندر بوس)
- آزادی ملک و قوم کی دائمی جوانی کا نام ہے۔ (فالٹے)
- احتیاط دانش مندی کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔ (وکٹر ہیوگو)
- عقل مند آدمی اپنے سارے انڈے کبھی ایک ٹوکری میں نہیں رکھے گا
(سروینٹس)
- دوسروں کی بدقسمتی سے احتیاط کا درس لو۔ (سائرس)
- دیکھے بغیر کوئی چیز مُونہہ میں نہ ڈالو اور پڑھے بغیر کبھی دستخط نہ کرو۔
(اسپینی کہاوت)
- شکستہ کشتیوں کو ساحل کے قریب ہی رہنا چاہئے۔ (فرینکلن)

قلمی دوستی

نام : محمد عبدالقدیر عمر : ۱۲سال
پتہ : محمد لیسین شریف، مکان نمبر ۱۲۱، گنج کالونی، گلبرگہ (کرناٹک)
شوق : کامکس پڑھنا، فلم دیکھنا۔ کتابیں (مذہبی) پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

نام : ضیاء القمر انصاری عمر : ۱۹سال
پتہ : لائبریرین "اردو لائبریری" خیر آباد، ضلع اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۴۰۳
شوق : ادبی مطالعہ، ادبی نشستوں میں شرکت، سیر و تفریح۔

نام : سید عمر فاروق عمر : ۲۵سال
پتہ : نیسکو ٹیلکم (انجینئر) پوسٹ بکس ۱۴۱۶ ۔ ریاض ۱۱۴۷۱
شوق : کتابوں کا مطالعہ۔ ہر وہ جو جائز شوق جو بیزاری کو دور کر دے۔

نام : محمد خلیل عمر : ۱۸سال
پتہ : مکان نمبر ۱/۳۲۵-۲-۱۲ مراد نگر قریب پوسٹ آفس حیدر آباد ۵۰۰۰۲۸
شوق : قلمی دوستی، کرکٹ، گھوڑسواری، مشاعروں میں حصہ لینا، ٹیبل ٹینس۔
قرآن شریف کا ترجمہ پڑھنا، خطوں کا پابندی سے جواب دینا۔

نام : محمد سمیع اللہ خاں باز عمر : ۲۵سال
پتہ : گھر نمبر ۴-۱۲ ۔ راہ تعلیم، بیدر (کرناٹک) ۵۸۵۴۰۱
شوق : قلمی دوستی، خدمت خلق، سیر و تفریح، اردو رسائل کا مطالعہ
فوٹو گرافی، درد بھرے گیت سننا

نام : قمر الزماں خاں عمر : ۱۶سال
پتہ : آر ایل ۔ ٹی کالج آف سائنس، آکولہ۔ ۴۴۴۰۰۱
شوق : نماز پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ مضمون لکھنا۔

نام : مس نجمہ عبدالحق عمر : ۲۰سال
پتہ : ۱۴/A-۶۴۶-۸-۱۸، محمد نگر کالونی، عیدی بازار حیدر آباد ۵۰۰۰۲۳
شوق : ناول پڑھنا، قلمی دوستی (صرف بہنوں سے) سیر و سیاحت

نام : رشید احمد فرحان عمر : ۲۹سال
پتہ : پوسٹ بکس ۲۵۳۶، اللیث ۲۱۹۶۱ (سعودی عرب)
شوق : شعر و شاعری، مطالعہ کتب

نام : حاجی شیخ محمد انور عمر : ۲۷سال
پتہ : ص۔ب ۸۶۶۱۸۷، الریاض ۔ ۱۱۶۳۲ ۔ (سعودی عرب)
شوق : قلمی دوستی، خوب صورت ویو کارڈ جمع کرنا۔

نام : معیز احمد زاہدی عمر : ۱۹سال
پتہ : معرفت خواجہ خلیل احمد ٹیچر، مکان نمبر ۶-۴۲/۲ گوتم نگر، پوسٹ،
بوڑن پلی، سکندر آباد، حیدر آباد، ۵۰۰۰۱۱
شوق : فٹ بال، والی بال، دینی کتابیں پڑھنا، تیرنا۔

نام : محمد قمر الزماں قاسمی عمر : ۲۸سال
پتہ : شارع مکۃ المکرمۃ القطیف ۳۱۹۱۱ (سعودی عرب)
شوق : شمع اور بانو کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

نام : محمد سرور عمر : ۲۶سال
پتہ : کھرباء الجمعہ ص۔ب ۱۰، الجمعہ (السعودیہ العربیہ)
شوق : قلمی دوستی سے ایک بہن کی تلاش، بانو شوق سے پڑھنا

نام : ایم۔ الیاس امروہوی عمر : ۳۰سال
پتہ : ماہنامہ افسانہ چمن ہیڈ آفس نواب گنج، امروہہ
شوق : کہانی لکھنا، سچ صرف سچ بولنا

نام : س۔ ح۔ قادری شاہین عمر : ۲۳سال
پتہ : مکان نمبر ۷۴۶، علمی محلہ مومن پورہ، گلبرگہ (کرناٹک)
شوق : شعر و شاعری، ادبی اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ، گیت اور موسیقی سننا۔
افسانے لکھنا۔

نام : ثمینہ جبیں عمر : ۱۷سال
پتہ : ہاؤس نمبر ۱۱۷ B/C، سی کیمپ کرنول ۵۱۸۰۰۲
شوق : مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا، (صرف بہنوں سے) جاسوسی ناول
پڑھنا، مصوری سیکھنے کا بے پناہ شوق۔

نام : قاضی محمد محسن عمر : ۲۵سال
پتہ : پولن سعودیہ لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷، دمام، ۳۱۴۲۱ (سعودی عرب)
شوق : قلمی دوستی، فوٹوگرافی، تیرنا، اسٹامپ جمع کرنا، فلم دیکھنا

نام : عبدالرشید خانی عمر : ۲۵سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۱۱۷، طائف (سعودی عربیہ)
شوق : قلمی دوستی۔

نام : اے واحد، سی۔ ای۔ او عمر : ۲۹سال
پتہ : امور بلاک پوسٹ امور، ضلع پورنیہ (بہار)
شوق : رسالے پڑھنا، کہانیاں لکھنا۔ تفریح کرنا۔

نام : محمد اقبال صدیقی عمر : ۲۲سال
پتہ : ایس سی سین۔ روڈ، (قریب ایم ایس اے اسٹیڈیم) پوسٹ، ضلع
پرولیا (مغربی بنگال) ۷۲۳۱۰۱
شوق : ٹیبل ٹینس، کرکٹ، کمنٹری سننا، کتابیں پڑھنا، پرانی فلموں کے
گیت سننا۔ قلمی دوستی۔

نام : عبدالحمید مستری عمر : ۴۸سال
پتہ : ولئے ۳۱۸۳ سورت ٹیکسٹائل مارکیٹ سورت ۳۹۵۰۰۲
شوق : اچھا کمانا، اچھا پہننا، اچھا کھانا، وقت پر نماز ادا کرنا، رسالے پڑھنا۔

نام : مس این این خان عمر : ۲۴ سال
پتہ : ۱۱ - آنند سدرک جال، مکتی وستو مارگ امبولی۔ اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۸
شوق : قلمی دوستی، فوٹو گرافی، مطالعہ، ڈرائیونگ۔

نام : محمد صالح عمر : ۲۳ سال
پتہ : معرفت ملک نور خان۔ P.B.N. ۴۹، تبوک (کے ایس اے)
شوق : قلمی دوستی کا بے حد شوق۔

نام : محمد حسین فریدی عمر : ۲۲ سال
پتہ : پوسٹ بکس ۶۵۶۹ مکۃ المکرمہ (سعودی عرب)
شوق : تعلیم حاصل کرنا، شاعری کرنا فوٹو گرافی

نام : حسنین ایم دمعہ لے عمر : ۲۳ سال
پتہ : ۳۷۸ - ۸۵ .۷ چوتھا نظام پورہ، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ (مہاراشٹر)
شوق : تیز رفتار موٹر سائیکل چلانا۔ جاسوسی کتابوں کا مطالعہ کرنا (برائے مہربانی خط و کتابت انگریزی میں کیجیے)

نام : شیخ انور نشاط عمر : ۱۶ سال
پتہ : ۱۵۸/ٹاٹا کالونی، باندرہ ایسٹ بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۱
شوق : قلمی دوستی، جاسوسی ناول پڑھنا سماجی خدمت کرنا

نام : عرفان رشید عمر : ۲۲ سال
پتہ : بومبل بازار ہاؤس نمبر ۶/۴۴۴، پوسٹ کلیان ضلع تھانہ (مہاراشٹر)
شوق : غزل سننا قلمی دوستی کرنا، نماز پڑھنا، کرکٹ کھیلنا

نام : ایم۔ انور شیخ عمر : ۲۸ سال
پتہ : ص۔ب۔ ۸۶۶۱۸، الریاض ۱۱۶۳۲ (سعودی عرب)
شوق : خوبصورت ویو کارڈ جمع کرنا

نام : نفیس شیراز عمر : ۲۵ سال
پتہ : ۱۰۷، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
شوق : کرکٹ کمنٹری سننا، اشعار جمع کرنا، اچھی کتابیں پڑھنا خدمت خلق۔

نام : محمد فہیم قریشی عمر : ۲۲ سال
پتہ : پوسٹ سوار، ضلع رام پور (یوپی) ۲۴۴۹۲۴
شوق : قلمی دوستی، شعر و شاعری۔ اچھی کتابیں پڑھنا

نام : سید پرویز اختر عمر : ۲۴ سال
پتہ : رٹیڈ۔ ایم۔ سید، محلہ قاضی پورہ، مقام شہادہ ضلع دھولیہ (مہاراشٹر)

شوق : ناول پڑھنا، کرکٹ، قلمی دوستی۔

نام : محمد رحمت اللہ عمر : ۳۲ سال
پتہ : انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز، ٹرانسمیشن ٹول روم ڈیپارٹمنٹ ۶۱۱ بنگلور ۱۶
شوق : بانو پڑھنا، خطوں کا جواب دینا

نام : میاں سراج المنیر بدر عمر : ۲۲ سال
پتہ : پوسٹ بکس ۷۴۴، بیشہ (سعودی عرب)
شوق : قرآن و حدیث پڑھنا، بے سہارا انسانوں کی مدد کرنا۔

نام : شرف الدین عمر : ۲۴ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۴، الخبر ۳۱۹۵۲ (سعودی عرب)
شوق : قلمی دوستی، ٹی۔ وی۔ دیکھنا، آثار و رسائل کا مطالعہ کرنا۔

نام : فرید احمد عمر : ۱۸ سال
شوق : کرکٹ دیکھنا، اچھے اشعار یاد کرنا، اچھی کتابیں پڑھنا

نام : محمد شاہد عمر : ۲۵ سال
پتہ : اینفیکیچول انڈسٹری، گرودھ سینٹر۔ آلم رام چوک پنیا ۸۴۵۴۲۸
شوق : صنعتیں قائم کرانا، پرانی فلمیں دیکھنا اور گانے سننا۔

نام : طاہر عمر : ۲۴ سال
پتہ : مکان نمبر ۹۰/۶۰-۴-۱۲، ایودھیانگر، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۸
شوق : فوٹو گرافی، ویڈیو گرافی، سیر و تفریح۔ قلمی دوستی۔

نام : محمد نجیب خان عمر : ۱۵ سال
پتہ : محمد حسیب خان، جامعہ مڈل اسکول پوسٹ آفس جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
شوق : کامکس پڑھنا، قرآن شریف پڑھنا، پانچوں وقت کی نماز پڑھنا کرکٹ کھیلنا۔ دوستی کرنا

نام : سیدہ رحمانی عمر : ۱۶ سال
پتہ : ۶۵۶ گلی نال بندان کشمیری گیٹ چھوٹا بازار، دہلی
شوق : خط لکھنا، بچوں کے ساتھ کھیلنا، ناول اور ڈائجسٹ پڑھنا

نام : داد خان بلوچ عمر : ۲۵ سال
پتہ : ص۔ب، رقم ۲۵۴۶، مکہ مکرمہ (سعودی عربیہ)
شوق : رسالے پڑھنا، فلمیں دیکھنا، میوزک سننا۔

نام : عمر :
پتہ :
شوق :

بارھویں قسط

لگن

اب تک کی کہانی
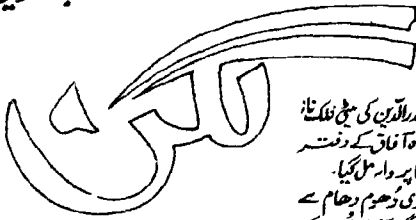
آفاق ایک خوب رو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس شیخ صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے ایک روز آفاق کو دیکھا تو اس سجیلے نوجوان کو اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے وہ آفاق کے دفتر میں ملازم ہوگئی۔ مگر آفاق پر اس کے حسن اور اداؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ الٹا اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا۔

کچھ دن بعد آفاق نے جب شادی کا پیغام اس کے گھر بھیجا تو اس کا دل کھل اٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر شب عروس رات سے ہی فلک ناز کو آفاق کے رویہ میں بے نیازی، سرد مہری اور درشتی نظر آنے لگی۔ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اڑانے پر تلا ہوا تھا۔

فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصے اور نفرت کی آگ بھڑکنے لگی۔ ایک دن اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ مگر آفاق نے یہ شرط رکھی کہ پہلے اسے ایک اچھی، سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اسے آزادی مل سکے گی۔ چار و ناچار فلک ناز نے یہ شرط بھی منظور کرلی۔ ملازموں کو آفاق نے پہلے ہی رخصت کردیا تھا۔ فلک ناز اکیلے سارے گھر اور لان کو صاف ستھرا بنانے میں منہمک ہوگئی۔ سب سے زیادہ محنت اسے باورچی خانے میں کرنا پڑی۔ کیوں کہ کھانا پکانا اسے بالکل نہیں آتا تھا۔ اس کے کہنے پر آفاق نے اس کے لئے کھانا پکانے کی کتابیں لادیں۔ اس روز بھی اس نے کوئی سالن نما چیز بنا چھوڑی تھی ڈرتے ڈرتے اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔

بشریٰ رحمٰن (لاہور، پاکستان)

"یہ سزا ہمیں کب تک ملے گی محترمہ!" آفاق نے کالا سیاہ شوربہ پلیٹ میں ڈال کر کہا۔

فلکی چپ بیٹھی رہی۔

"اب دیکھیں یہ کتابیں ہماری سزا میں تخفیف کراتی ہیں یا عمر قید عطا کرتی ہیں۔"

فلکی نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ ان باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جانتی تھی آفاق کچھ کہے لگانے سے باز نہیں آئے گا۔

فلکی اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے روٹی توڑ کر بدمزہ شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھاتی رہی۔

"آہا۔ اپنے ہاتھ کا پکا کتنا لذیذ لگتا ہے ہے نا؟"

فلکی نے اس کی طرف ذرا کی ذرا دیکھا پھر نظریں جھکالیں۔

"ہم نے یہ سالن پکایا ہوتا تو ہم بھی مزے مزے سے کھا رہے ہوتے۔"

فلکی نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔

"اور یہ آپ نے ناخن کس خوشی میں بڑھا رکھے ہیں؟"

اچانک اس نے فلکی کا بایاں ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پچھلے ایک ہفتے سے فلکی کو کیوٹیکس لگانے کی فرصت نہ ملی تھی۔ اس نے اسپرٹ سے صاف تو کرلئے تھے مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے سارے ناخن بالکل سفید پڑ چکے تھے۔

مگر اس کے ہاتھ بہت خوب صورت تھے اور لمبے لمبے ناخن جب وہ رنگ لیتی تو گوری گوری انگلیاں گنبد و نا بھی مخروطی شکل اختیار کرلیتیں۔ پھر اس کے ہاتھ بڑے فنکارانہ لگتے۔

اب بھی کچھ برے تو نہیں لگتے تھے صرف سفید سفید ناخن گدھے کے پھول کی طرح نظر آرہے تھے۔

آفاق کے گرم ہاتھ میں فلکی کا سرد ہاتھ کانپ رہا تھا

"میں پوچھ رہا ہوں۔ ان چھپکلیوں اور خنجروں کا آخر کیا مصرف ہے؟" اس نے فلکی کا ہاتھ چھوڑ دیا جو کٹی ہوئی ڈالی کی طرح میز پر گر گیا "قتل تو آپ اپنے روبیے سے بھی کر سکتی ہیں" وہ بولا۔
"میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا یہ خواتین آخر ناخن کیوں بڑھا لیتی ہیں۔ اگر ان ناخنوں سے ان کا مقصد بدنصیب مردوں کے خونِ جگر سے رنگنا ہوتا ہے تو اور بات ہے ورنہ اس سے بدصورت فیشن میں نے کوئی اور نہیں دیکھا"
فلکی نے اب بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔
"سنا آپ نے مجھے گدھ کے پنجے پسند نہیں ہیں"
"اوہ نہ" فلکی جل کر کباب ہو گئی۔
"اور ان لمبے ناخنوں سے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہو سکتا۔ برتن مانجھیں گی تو سارا میل ان کے اندر چلا جائے گا آٹا گوندھیں گی تو پھر بھی سارا دن ان میں سے آٹا نکالیں گی اور اگر جھاڑو دینے کے بعد ہاتھ دھونا بھول گئیں تو پھر وہ سارا گند یہیں کھلائیں گی ہاں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن کام کرتے ہوئے خدانخواستہ کوئی ناخن ٹوٹ جائے، وہ سارا دن ناخن کے ماتم میں بسر ہو گا بس۔ پھر کیا خیال ہے؟"
فلکی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لئے تھے
"آپ یوں کریں کہ ان ناخنوں کا صدقہ اتار دیں۔ لائیے صبح میں ہی بسم اللہ کرتا ہوں"
فلکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ اپنی مرضی سے زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔
جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ناخن بڑھائے ہوئے تھے دنیا بھر کی رنگ برنگی کیوٹیکس اس کے پاس تھیں۔ ہر کپڑے کے ساتھ میاچنگ استعمال کرتی تھی۔ ان ناخنوں کو اس نے جگر گوشوں کی طرح پالا تھا اور آج اس نے ایک نیا ہی شوشہ چھوڑ دیا تھا۔
"میں خود کاٹ لوں گی" فلکی نے آہستہ سے کہا۔
"مجھے معلوم ہے آپ میں انہیں خود قلم کرنے کا کبھی حوصلہ نہ پیدا ہو گا۔"
"مگر میرے ناخن آپ کو کیا کہتے ہیں۔ میں تو ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک کام کر لیتی ہوں"
"ابھی تک آپ سے کوئی کام ٹھیک ٹھاک نہیں ہوا۔ اس غلط فہمی میں مت رہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں کو بچا بچا کر کام کرتی ہیں۔ کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ میرا غسل خانہ صاف نہیں ہوتا۔ بیسن میلا ہوتا ہے۔ شیو کا سامان ویسے ہی رکھا ہوتا ہے۔ بستر کی چادر کی شکنیں درست نہیں ہوتیں۔ کیا اسی کو صفائی کہتے ہیں؟"
"تو کیا شیو کا سامان بھی مجھے صاف کرنا ہو گا؟"
"ظاہر ہے یہ کام بھی آپ کو کرنا ہو گا"
"کیا میں تمہاری نوکرانی ہوں ..؟"
کہتے کہتے فلکی رک گئی۔ شیو کا سامان دھونے سے اسے بہت گھن آتی تھی اور ہر روز بستر کی شکنیں درست کر کے چادر لگانا بھی کس قدر مشکل امر تھا۔ جانے آفاق گدھوں کی طرح سوتا تھا۔ ایسے جیسے ساری رات بستر پر کشتی کھیلتا رہا ہو۔ صبح کو ہمیشہ اس کا بستر شکن در شکن ہوتا۔
زندگی عذاب بنتی جا رہی تھی۔
"آپ کے برتن صاف نہیں ہوتے پھلکا تک پکانا نہیں آیا۔ جو عورتیں صرف اپنے ہاتھوں کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتیں"
"میں کوشش کروں گی کہ آئندہ یہ کام اس سے بہتر طریقے پر ہو سکیں" فلکی نے روہانسی آواز میں کہا
"ہاں، کوشش تو ضرور کیجئے گا مگر ناخن اتارنے میں آپ کو بتا دوں کہ مجھے مردار کھانے والے جانوروں کے پنجے پسند نہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ خوبصورت ہیں تو ناخن بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ہاتھوں پر اعتماد کیجئے۔ صبح جب آپ میز پر ناشتہ کے لئے آئیں تو آپ کے ہاتھ بالکل صاف ہونے چاہئیں" یہ کہہ کر آفاق میز سے اٹھ گیا۔
فلکی تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر برتن اٹھائے میز صاف کی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب آفاق اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔
وہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں پیارے پیارے ہاتھ گود میں رکھ لئے۔
"تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے"
فلکی کے کانوں میں جیسے کوئی آواز گونجنے لگی۔ اف کیا زمانہ تھا وہ طلوع جب بھی اس کے دلکش ہاتھوں کو تھام لیتا، فوراً گانے لگتا۔
مجھے سہل ہو گئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ایک صرف اسے طلوع کی آواز ہی تو پسند تھی گہری... گمبھیر... اداس اداس ...
وہ اکثر اس کا ہاتھ پکڑ کر یہی گیت گایا کرتا تھا اور پھر کہتا تھا۔
"فلکی تمہارے ہاتھ ریشم کے لچھے ہیں۔ میں صرف ان ہاتھوں پر اپنی جان دے سکتا ہوں۔ مجھے انہیں چومنے کی اجازت دو"
اور فلکی جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا کرتی تھی۔
"نان سنس میرے ہاتھ خراب کر دو گے"
اور طلوع جب بھی کہیں سفر پر جاتا اس کے لئے اسٹائلش قسم کی کیوٹیکس کی شیشیاں اور ہینڈ لوشن لایا کرتا
ایک اور گانا بھی طلوع بہت گاتا تھا
جلتے ہیں جس کے لئے تیری آنکھوں کے دیئے
ڈھونڈ لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لئے
طلوع فلکی کی آنکھوں کا بھی دیوانہ تھا
فلکی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اس نے خود ایک ناقدرے کا ہاتھ تھاما جسے اس کے ہاتھ بدصورت لگتے تھے۔ اور جو اسے رلا کر خوش ہوتا تھا۔ ان حسین آنکھوں کا مقدر ہی رونا بن گیا تھا۔
تھوڑی دیر رو کر فلکی کو صبر سا آ گیا۔ پھر وہ اٹھی۔ اپنا نیل کٹر تلاش کیا اور بڑے حوصلے سے اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ پرسوں اس کا ایک ناخن واقعی ذرا سا ٹوٹ گیا تھا انگلی میں درد بیٹھ گیا تھا مگر اس نے ناخن کو جدا کرنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔
آج اس نے ابتدا اسی ٹوٹے ہوئے ناخن سے کی۔ رفتہ رفتہ بے دلی کے ساتھ اس نے اپنے دسوں ناخن اتار دیئے۔ اس کی انگلیاں یوں نظر آنے لگیں جیسے پھل دار درختوں کی شاخیں کاٹ دیں تو وہ ٹنڈ منڈ نظر آنے لگتے ہیں۔
نیل کٹر ایک طرف رکھ کے اس نے کٹے ناخن کے تراشے اکٹھے کر کے اپنی ہتھیلی پر رکھ لئے۔ ہلال کی شکل کے ٹکڑے کس طرح کے تھے۔ ہتھیلی پر پڑے چبھ رہے تھے۔ نہ جانے کتنے عرصے سے پالے ہوئے تھے۔ اب تو اسے یاد بھی نہ تھا
اس نے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھولی اور اپنی بہت سی حسرتوں کی طرح یہ ٹکڑے بھی دراز میں بند کر کے سو گئی۔

صبح سے اب اس کا ایک کام اور بڑھ گیا تھا۔
جب بھی کام سے فارغ ہوتی۔ خانہ داری کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔ پڑھ پڑھ کے جب کچھ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تو اس نے سوچا تجربہ کرنا چاہئے روز دو ایک چیزیں بنائی جائیں، تب سمجھ آئے گی۔
گھر میں سب ہی کچھ تھا مگر یہ کیا مصیبت تھی کہ ان کتابوں میں وزن لکھے ہوئے تھے۔ اب اگر وہ آفاق سے ترازو لانے کو کہتی تو وہ اس کا کتنا مذاق اڑاتا۔ اب باورچی خانے میں ہر غائب ترازو رکھ کر تو نہیں کھڑی ہو سکتی۔ اصولاً تو لکھنے والوں کو چھوٹے چمچ اور بڑے چمچ کا اندازہ لکھنا چاہیے تھا اب کیا کیا جائے؟
پھر بھی اللہ کا نام لے کر اس نے شروع کر دیا۔ کتاب پڑھ کر روز ایک سالن بناتی مگر روز ہی کوئی نئی سی چیز بن جاتی۔ وہ بڑی حیران ہوتی کہ آخر کون سی شے رہ جاتی ہے جو اس میں استعمال ہوتی ہے۔
ایک دن آفاق نے اسے بتایا کہ ان نسخوں میں عقل بھی استعمال ہوتی ہے۔ چوں کہ خواتین کے پاس کم ہوتی ہے اس لئے انہوں نے کتاب میں اس کا ذکر نہیں کیا۔"
فلکی جل ہی تو گئی۔ پھر اردو میں لکھی ہوئی کتابیں اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے انگریزی کی کتابوں کا سہارا لیا۔ وہ قدرے آسان معلوم ہوتیں۔ اور انگلش کھانے بھی زیادہ مشکل نہ لگے۔ زیادہ تر سبزیوں اور گوشت کو ابالنے اور فرائی کرنے کے تھے۔ اس واسطے اس کی سمجھ میں آ گئے۔ پھر انگلش سویٹ ڈش بنانے جس قدر آسان تھے۔ کھانے میں اتنے ہی لذیذ تھے۔
اس نے اللہ کا نام لے کر سارے انگلش کھانے بنانے شروع کر دئے۔
پہلے سوپ آتا تھا پھر سلاد اور باقی تمام لوازمات۔
آٹھ دن تک آفاق چپ چاپ کھاتا رہا اور ایک ہفتے کے بعد بولا۔
"میری میعاد پوری ہو گئی ہے یا نہیں؟"
"کیا مطلب؟" فلکی تو دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس نے میدان مار لیا ہے
"بھئی اگر کسی ڈاکٹر نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے ہفتہ بھر بدمزہ یا پھیکا کھانا کھلانا ہے تو ہفتہ بیت گیا ہے۔ اب میرے منہ کا ذائقہ یوں ہو رہا ہے جیسے واقعی میں ہسپتال میں ہوں اور میرا وزن بھی ٹھکانے پر آ گیا ہے۔ ویسے تو فالتو چربی سے میں خود بھی خوف کھاتا ہوں۔ لیکن آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے رہی سہی چربی اتارنے میں میری مدد کی۔ لیکن مجھے ہسپتال کے اس کھانے سے چھٹی کب ملے گی؟"
فلکی کا دل ٹوٹ گیا۔
وہ اس آدمی کا دل کبھی نہیں جیت سکتی۔ اب تو مشکل سے کچھ آئی تھی ان کھانوں کی کہ اس نے ٹوک دیا۔
"آپ خود بتا دیا کریں کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟" فلکی نے ٹوٹے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا۔ "میں آپ کی پسند کی چیز پکا دیا کروں گی۔"
"بھئی مجھے تو دال بہت پسند ہے۔ خصوصاً ماش کی دال۔ اور جب سے آپ آئی ہیں، دال کا منہ نہیں دیکھا۔ ورنہ ہفتے میں ایک

دں ماش کی دال پکوا تا تھا۔"

آپ کو دال تو پکانا آتی ہوگی ؟" اس نے ملکی سے پوچھا۔

"نہیں"۔ فلکی نے صاف جواب دے دیا

"کیوں ..."

"کیوں کہ ہمارے گھر میں دال نہیں پکا کرتی تھی"

"ہیں ... یہ کیا کہہ دیا آپ نے ..."

"سچ کہہ رہی ہوں۔"

"پاکستان کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں دال نہ پکی ہو۔"

"ہمارے ہاں کوئی پسند نہیں کرتا تھا کبھی کبھی نوکروں کے لئے پکتی تھی۔"

"اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ امراء دال کو پسند نہیں کرتے۔ مگر ہم نے تو سنا تھا جن گھروں میں حرام کی کمائی ہو، وہاں دال نہیں پکتی ..."

یہ سنتے ہی غصے سے ملکی کا چہرہ سرخ ہو گیا اب اس کا ہاتھ سر سے باپ کے گریبان تک پہنچ رہا ہے۔

اس نے غصے کو دبایا اور پھر بولی

"ڈیڈی کو لعق کی تکلیف تھی اور حق کو کڑوے میں ذرہ رہا کرتا تھا۔"

"ویسے آپ کو معلوم ہے ہمارے ملک میں کتنی قسم کی دالیں ہوتی ہیں ؟"

"جی۔ چار پانچ تو ہوتی ہیں۔"

"نام سنایئے ذرا ؟"

"نام سے آپ کو کیا غرض ہے۔ ہمانے میں پکاروں گی۔"

"جب آپ اسے نام سے نہ پہچانتی ہوں گی وہ پکائیں گی کیا ... بتایئے ..."

"چنا۔ ماش اور مونگ"

"ایک اور دال بھی ہوتی ہے جسے مسور کی دال کہتے ہیں اور اس کی نسبت سے ایک محاورہ بھی ایجاد ہوا ہے یہ منہ اور مسور کی دال۔ سنا ہے کبھی آپ نے ؟"

ملکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شکر ہے آپ نے سن رکھا ہے۔ ورنہ مجھے بھی آپ سے یہی کہنا تھا۔ اپنا منہ دیکھو مسور کی دال مانگ رہے ہو۔ ویسے سبز رنگ کی مونگ اور سبز ماش آپ نے کبھی دیکھے ہیں ؟"

"نہیں۔"

فلکی نے سر ہلا دیا۔

"سب دالیں پکانا آتی ہیں ؟"

"دال پکانا کون سا مشکل کام ہے۔" فلکی نے جل کر کہا

"کل دیکھ لیں گے۔"

"پہلے چلیئے میں دالوں سے آپ کا تعارف کرا دوں۔" آفاق کھڑا ہو گیا تو فلکی بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ سیدھا پینٹری میں گیا۔ ایک الماری کھولی۔ وہاں شیشے کے مرتبانوں میں دالیں پڑی ہوئی تھیں۔ ماہر جیٹ پیان کے نام لکھے ہوئے تھے۔

"یہ چنے کی دال ہے موٹی موٹی۔ اسے ماش کہتے ہیں۔ یہ مونگ ہے اور یہ مسور ... اور پھر اس طرف سبز مونگ ہے اور یہ سبز ماش یہ دالیں بھی پکانے کے کام آتی ہیں۔ یہ ثابت مسور ہے جو یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ کھانا ہے۔ اس مرتبان میں ثابت چنے ہیں جنہیں گلانے اور پکانے کے لئے بڑی مہارت اور مشاقی کی ضرورت ہے۔ کل کیا پکے گا پھر ؟"

"ماش کی دال۔" فلکی نے آہستہ سے کہا

"شاباش !"

آفاق وہاں سے چلا گیا۔

ملکی نے دوسرے دن ماش کی دال پکائی۔ پانی الگ اور دال الگ تیر رہی تھی۔

"اچھا تو آپ کے ہاں کبھی کبھار اس قسم کی دال پکا کرتی تھی۔"

"مجھے یاد نہیں۔" ملکی نے آہستہ سے کہا

"ہاں، تو کل کیا پکائیں گی آپ ؟"

"جو آپ کھائیں گے"

"میں کیا کھاؤں گا ! میں تو صرف پھوہڑ پن سے بنے ہوئے کھانے ... حالات نے مجبور کیا تو چکھ لوں گا۔ کیوں کہ ایک مہینے سے ایسا مزے دار کھانا پک رہا ہے کہ میں صرف چکھنے پر اکتفا کر رہا ہوں آپ دیکھ نہیں رہیں۔ میرا پیٹ کیسا لا جواب ہو گیا ہے۔"

وہ کھڑا ہو گیا

ملکی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا سر سے پاؤں تک دیکھا۔

کیسا شاندار آدمی تھا کسا کسایا۔ کسرتی جسم جس طرح چیتا ہوتا ہے۔ کہیں بھی فالتو گوشت نہ تھا۔ سفید پینٹ اور سفید قمیض میں وہ بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ بال بکھر کے ماتھے پر آ گئے تھے۔

چہرے سے تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

ملکی اسے بے اختیار دیکھتی رہ گئی۔ بالکل اس طرح جس طرح ماں بچے کی بلائیں آنکھوں ہی آنکھوں میں لیتی ہے۔

"ہوں" آفاق نے گلا صاف کیا۔

"تو کچھ آپ کا ارادہ بدل رہا ہے۔ میرے بارے میں بدلی ؟"

ملکی چونک گئی۔

کینہ تھا۔ نظروں کی چوری پکڑتا تھا۔ اب اس نے زبان پر قابو پا لیا تھا تاکہ وہ زبان کی غلطیاں نہ پکڑے لیکن اب اس نے نظر کی چوریاں پکڑنی شروع کر دی تھیں۔

خداوندا ! وہ کیا کرے ؟ کیا نظروں پر تالے لگا لے یا اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں موند لیا کرے۔ منہ بند کر کے تو گزارہ ہو رہا تھا آنکھیں بند کر کے کیوں کر جی سکے گی۔

ایک عذاب سا اس کے چہرے پر ابھرا۔ وہ جلدی جلدی میز پر سے برتن سمیٹنے لگی۔

آج آفاق ذرا جلدی سونے کے لئے آ گیا تھا ورنہ وہ تو ہمیشہ رات کے کسی پہر آتا تھا جب ملکی سو چکی ہوتی۔ اب وہ آ کر اپنے بستر پر بیٹھا تو ملکی کا دل دھڑکنے لگا

ملکی کو اپنے دل پر غصہ آیا۔ بھلا اس میں یوں دھڑ دھڑ کرنے کی کیا وجہ تھی ؟

جوتے اتار کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے سر اٹھا کر ملکی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کل آپ کوفتے پکائیں گی ؟"

شکر ہے فلکی نے سب کتابوں کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ بولی

"نرگسی کوفتے یا کچے قیمے کے ؟"

"حساب میں اتنا بد ذوق نہیں ہوں کہ نرگسی کوفتے کھانے لگوں اور اگر کھانے ہی پڑے تو نرگسی آنکھوں والی محترمہ کے ہاتھوں سے کھانا پسند کروں گا۔"

"جی، دوسرے کوفتے میں بنا لوں گی۔" ملکی نے دبی دبی آواز میں کہا

"سوچ لیجئے۔ کام ذرا مشکل ہے۔ پہلے گوشت کا قیمہ بنانا، پھر قیمے کو گوشت کی شکل دینا کھاتے وقت پھر قیمہ بنانا۔ بے ہودہ حرکت ہے نا ؟"

ملکی چپ رہی۔

"اگر آپ پکا لیں تو میں یہ بے ہودہ حرکت کر لوں گا۔"

اس نے کمبل اوڑھا اور لیٹ گیا۔

چند منٹوں میں اس کی خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کس قدر خوش قسمت آدمی ہے۔ جھٹ سو جاتا ہے۔ ملکی نے دل میں سوچا۔ ایک وہ ہے کہ کتنے گھنٹے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ تب کہیں جا کر نیند آتی ہے۔

ملکی نے دو تین امور خانہ داری کی کتابیں اٹھائیں اور بڑے غور سے کوفتوں کی ساری ترکیبیں نکال کر پڑھ لیں۔

"یہ کوفتے ہیں، قیمہ ہے یا قیمے کا حلوا ہے ؟" آفاق نے ڈش کا ڈھکنا اٹھایا اور ملکی سے پوچھا۔

فلکی نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ بھی نہیں بولی۔

"بھئی بتایئے نا ؟ اسے کھانے کا کیا طریقہ ہے ؟"

"میں نے ... میں نے بہت کوشش کی مگر یہ جڑتے ہی نہیں تھے۔ ہر بار بکھر جاتے تھے۔

تو آپ نے گوند استعمال کی ہوتی ؟"

"گوند ... ؟" فلکی حیرت سے چیخی۔ "گوند سے کوفتے جڑ جاتے ہیں ؟"

"جی ہاں۔" آفاق سنجیدگی سے بولا۔

"مگر کسی کتاب میں گوند کا حوالہ نہیں تھا۔ میں کس طرح لگا لیتی ؟"

"آفرین ہے تمہاری اماں پر۔" یہ کہہ کر آفاق اس قدر زور سے ہنسا کہ فلکی کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں نے سن رکھا تھا کہ اکثر عورتیں احمق ہوتی ہیں۔ مگر اس حد تک، یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔"

فلکی کے چہرے پر ناگوار سی شکنیں نمودار ہوئیں۔

ہنس ہنس کر جب وہ بے حال ہو گیا تو پھر اس نے تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

"یہ آپ نے کوفتوں کا جلوس نکالا ہوا ..." یہ کہہ کر اس نے نوالہ منہ میں رکھا۔

فلکی کا دل خوف کے مارے دھڑک رہا تھا کہ ابھی وہ نوالہ تھوک دے گا۔ مگر اسے حیرت ہوئی۔ آفاق وہ نوالہ کھا گیا۔ اس نے ایک اور نوالہ کھایا ... پھر ایک اور ...

فلکی کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آفاق نے دیکھتے دیکھتے ایک پھلکا ختم کر لیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے سالن کے ساتھ اس نے ایک پھلکا کھا لیا تھا۔

فلکی کو یوں حیرت سے اپنی طرف تکتا دیکھ کر آفاق رک گیا۔

"آپ مجھے نظر لگا رہی ہیں !"

"نہیں !" فلکی نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"کیا کریں پیٹ بڑا پاپی ہے سب کچھ کھانے پر مجبور کرتا ہے۔ کب تک بھوکا رہا جائے ؟"

فلکی سوچنے لگی آفاق کھانے کے لئے کبھی مجبور نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

پھر وہ خود ہی بولا۔

"سچ بات بتاؤں۔ سالن کا ذائقہ بہت اچھا ہے میں نے کھا کر دیکھا۔ مجھے پسند آیا۔ اس کا مطلب ہے آپ نے خلوص سے کوشش کی تھی، لیکن واقعی کوفتہ بنانا اور اسے سالم رکھنا آپ کو نہیں آیا۔ آپ کا قصور نہیں۔ اکثر لوگ کوفتے بنانا نہیں جانتے۔ اس کے لئے بڑی مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے اور پریکٹس کی بھی۔ آپ پریکٹس کریں گی تو ایک دن بنا لیں گی۔ کیوں کہ اب آپ کا ہاتھ رفتہ رفتہ ذائقے کی طرف آ رہا ہے۔ گو سالن کی شکل خراب ہے۔ مگر

ذائقہ اچھا ہے۔ آنکھیں بند کرکے کھایا جاسکتا ہے۔"

فلکی نے پھر ٹھنڈی سانس چھوڑ کر نظریں جھکا لیں۔

"میں سوچ رہا ہوں۔ ویسے یہ کتنا خوب صورت لطیفہ ہے۔"

"کون سا...؟" فلکی چونکی

"آپ کی شکل خوب صورت ہے مگر ذائقہ بدمزہ ہے۔ سالن کی شکل اچھی نہیں مگر ذائقہ..."

"اونہہ..."

فلکی کا جی جل گیا اس کا جی چاہا کہہ دے تمہیں مجھے چکھا ہی کب ہے؟ مگر چپ رہنا مناسب تھا پھر اندر آیا تھا اپنی جانتوں ہے۔ ذلیل انسان ہے۔ کچھ کہے گا نہ سے باز نہیں آئے گا۔

آفاق کھڑا ہو گیا۔

"چھٹی کے روز میں آپ کو کوفتے بنانے کی ترکیب سمجھاؤں گا۔"

"آپ...؟"

"جی ہیں۔ آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے میری امی نے مجھے امور خانہ داری میں طاق کر دیا ہے۔"

"کیوں...؟"

"انہوں نے کہا تھا۔ آج کل زمانہ نازک ہے پھوہڑ اور بدسلیقہ لڑکیوں کو پڑھی لکھی خوب صورت اور امیر لڑکیاں نہیں ملتیں اب تو اسی لڑکے کی قسمت جاگتی ہے جو امور خانہ داری، سلائی پرونی، صفائی اور کڑھائی میں ماہر ہو۔"

اس بات پر غصہ کرنے کی بجائے فلکی کی ہنسی نکل گئی۔

آفاق نے اسے مڑ کر دیکھا۔

"جب میں آپ کے کام آؤں گا تب آپ کو یقین آئے گا کہ میری امی ٹھیک کہتی تھیں"

"آپ کو اور کیا کیا پکانا آتا ہے؟" فلکی نے پوچھا

"سبھی کچھ آتا ہے۔ فرمائیں آپ کو کیا پکا کر کھلائیں؟"

فلکی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا

"بدمزہ کھانے کھا کھا کر میں تھک گیا ہوں اور میں جانتا ہوں آپ کو ایک اچھے استاد کی ضرورت ہے۔ یہ کتابیں اگر مددگار ہوتیں تو آج ساری دنیا کی عورتیں ماہر ہوتیں۔ اسے زیادہ ہوشیار۔ سیکھے ہوتے۔ خانہ داری میں سب سے اچھا استاد صرف اپنی ماں ہوتی ہے۔ ہر گھر کا ایک علیحدہ طریقہ ہوتا ہے۔ ہر ماں اپنے ساتھ صدیوں کا تجربہ لاتی ہے جو ماں سے ہی سینہ بہ سینہ چل رہا ہوتا ہے۔ ہر عورت کے ہاتھ کا ذائقہ الگ ہوتا ہے۔ ذائقے میں اس کی خلوص نیت اور طہارت نفس شامل ہوتی ہے۔ محنتی اور دیانت دار عورت کے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی شے خراب نہیں ہوتی۔ سمجھیں...؟"

فلکی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آج تک ایسی باتیں نہیں سنی تھیں

جو خواتین یہ کہتی ہیں کہ انہیں امور خانہ داری سے نفرت ہے وہ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ کام نہیں کرسکتیں۔ وہ صرف دفتر کی رونق بڑھا سکتی ہیں۔ یا میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرسکتی ہیں۔ میں انہیں نقلی عورتیں کہتا ہوں۔ وہ ایک مصنوعی کام سے رغبت پیدا کرتی ہیں اور اپنے اصل مقام سے ہٹ جاتی ہیں۔ عورت بنیادی طور پر ماں ہوتی ہے اور ماں باورچی خانہ کی روح ہوتی ہے جس گھر کے باورچی خانے سے مختلف قسم کی خوشبوئیں نہ اٹھیں۔ اس گھر کے بچے اور مرد کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ وہ گھسا پٹا محاورہ تو تم نے بھی سنا ہوگا

A WAY TO MANS HEART IS
THROUGH HIS STOMACH

فلکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

حقیقت میں اس کی سمجھ میں بھی یہ محاورہ آج ہی آیا تھا۔ ورنہ اس نے کئی بار سنا تھا اور سو بار پڑھا تھا مگر وہ اکثر سوچتی بھلا مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے ہو کر کیوں کر جاتا ہے پیٹ سے کیا مراد ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی مرد کو جوان مسخر کر لیتی ہے اسے اچھی شکل بھاتی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکی سے دبتا ہے۔ دولت مرعوب کر لیتی ہے اور حسن عورت کے پاس یہ سب کچھ ہو۔ وہ مرد کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ مرد کو مسخر کرنے کا اصل گر کیا ہے اور یہ گر ممی نے تو اسے نہیں بتایا تھا خود ممی کو بھی یہ گر نہیں آتا تھا۔

پھر پتہ نہیں ممی ڈیڈی کو انگلیوں پر نچا رہی تھیں۔ آخر ممی نے مجھے وہ منتر کیوں نہ بتایا

ہوسکتا ہے۔ ڈیڈی بنیادی طور پر کمزور مرد ہوں اور ممی نے ویسے ہی انہیں دبا لیا ہو۔

مگر یہ آفاق؟ یہ تو پتہ نہیں کس قسم کا مرد ہے اور کیسی پرانی زنگ آلود باتیں کرتا ہے۔

بہرحال یہ باتیں فلکی کے دل کو لگ رہی تھیں

آفاق اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور اپنی نئی سوچوں سے الجھتے کم کھتے اس نے سالنے برتن اٹھائے۔ میز صاف کی اور اپنے کمرے میں آگئی۔

صبح ناشتے کی میز پر اس نے آفاق سے پوچھا۔

"آج آپ کیا کھائیں گے؟"

"آپ گوبھی گوشت پکا لیں گی؟"

"جی کوشش کروں گی۔"

چائے پیتے پیتے آفاق نے نظر اٹھا کر بڑے غور سے فلکی کی آنکھوں میں جھانکا۔

فلکی کپکپا گئی۔

جیسے پوچھ رہی ہو، "کیا بات ہے؟"

"آج آپ نے انتہائی مناسب فقرہ کہا ہے۔"

آفاق پھر چائے پینے لگا۔

"میں نے سوچا ہے میں آپ کو سب کچھ سکھا دوں گا۔ جو لوگ سیکھتے ہیں وہ کوشش کریں گے، ان کے اندر جذبہ ہوتا ہے۔ جھوٹی اکڑ نہیں ہوتی۔"

آفاق نے اسے کاغذ پر ایک ہفتے کا مینو سا کر دیا اور بولا۔

"آپ پورا ہفتہ ان چیزوں کی ترائی کریں۔ اس سے مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کو کیا کچھ سمجھ میں آگیا ہے اور کیا کچھ سمجھانا ہے۔"

فلکی نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

آفاق دفتر چلا گیا۔

اگلا ہفتہ کافی سنسنی خیز اور تجرباتی تھا۔

صبح صبح دفتر جا کر آفاق گیارہ بجے آجاتا۔ پہلے دن تو فلکی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی سمجھی کہ شاید کوئی چیز بھول گیا ہے۔ لینے آیا ہے۔

وہ جھاڑو اٹھائے برآمدے میں نکل آئی اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" وہ اس کا ہونق چہرہ دیکھ کر بولا۔

"کچھ نہیں، میں تو آپ کو دیکھنے آئی تھی۔"

"میں نے سمجھا جھاڑو سے میری مرمت کرنے آئی ہیں۔ ویسے استقبال کا یہ طریقہ بھی اچھا ہے۔"

فلکی نے شرمندہ ہو کر جھاڑو پیچھے چھپا لیا

آفاق اندر چلا گیا۔ فلکی باورچی خانے میں چلی گئی۔ ابھی وہ صفائی کر رہی تھی کہ آفاق بازو چڑھاتا ہوا آ گیا۔

"آج آپ کو پہلا سبق ملے گا۔"

فلکی نے جلدی سے جھاڑو چھوڑ دی

"پہلے کام ختم کرو۔" آفاق نے جھاڑو کی طرف اشارہ کیا۔ "جھاڑو کبھی راستے میں نہیں چھوڑنی چاہئے۔ صفائی کرکے اسے الماری میں چھپا دینا چاہئے۔ یہ نظروں کو اچھی نہیں لگتی۔ پھر ہاتھ دھو کر یہاں آجاؤ۔"

فلکی نے جیسے سب کچھ ایک تابعدار شاگرد کی طرح کیا اور باورچی خانے میں آگئی۔

"آج میں آپ کو ماش کی دال کے بارے میں بتاؤں گا کہ یہ کس طرح اور کتنے طریقوں سے بن سکتی ہے۔ دنیا میں چونکہ نئے نئے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس لئے کھانوں کی ترکیبیں بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ میری امی جن طریقوں سے پکاتی ہیں، وہ یہ ہیں: بھنی ہوئی ماش کی دال، بگھاری ہوئی ماش کی دال، ماش کی دال اور گوشت، ماش کی دال اور قیمہ، ماش اور چنے کی دال ملا کر بھی پکائی جاتی ہے۔ ماش کی دال کی کھچڑی بھی پکتی ہے مگر کھچڑی میں عام طور پر سبز دال ہی اچھی لگتی ہے۔ ماش کی دال کو جس طرح بھی پکانا مقصود ہو، پہلے اسے صاف کر کے بھگو دینا چاہئے۔ پکانے میں آسانی ہو جاتی ہے۔"

پھر اس نے اتنی اچھی طرح سے دو تین مختلف طریقوں سے دال پکانا سکھایا کہ دل ہی دل میں فلکی عش عش کرتی رہ گئی۔

سارا کام دو گھنٹے میں ہو گیا۔

دوپہر کا کھانا بہت اچھا تھا۔ آفاق نے سلاد بھی بنایا اور اسے سکھایا کس طرح مختلف قسم کا سلاد بناتے ہیں۔

فلکی کی حیرت دور نہیں ہو رہی تھی۔

آفاق ہنس پڑا۔

"کیوں؟ اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟"

"میں حیران ہو رہی ہوں۔ اتنی مصروف زندگی میں بھلا آپ نے یہ سب کب اور کیسے سیکھا۔"

"آپ کو معلوم ہے نا؟ میں کافی عرصہ امریکہ میں رہا ہوں۔ جب میرے اباجی زندہ تھے وہ پاکستان میں رہتے تھے اور میری امی چھ مہینے اباجی کے ساتھ رہتی تھیں اور چھ مہینے امریکہ میں میرے پاس رہتی تھیں۔ وہ اتنے اچھے اچھے کھانے بناتی تھیں کہ ان کے آنے کے بعد میں وہاں بھوکا رہا کرتا تھا پھر میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ جب وہ وہاں ہوں اور کھانا پکایا کریں تو میں ان کی مدد کیا کروں۔ اس طرح میں سیکھتا گیا۔ ان کے آنے کے بعد پکایا کرتا تھا بلکہ خود امی جب میرا پکا ہوا کھانا کھاتی تھیں تو بے حد حیران ہوتی کہ میں نے یہ سب کیسے سیکھ لیا۔"

"آپ کی بہن بھی ہے؟"

"ہاں ہے۔ توبہ میری بہن بہت پھوہڑ لڑکی ہے۔ اب وہ سولہ سال کی ہے سینیئر کیمبرج میں پڑھتی ہے۔ اگلے سال میں اسے پاکستان لے آؤں گا پیار سے یہاں لڑکیوں

کی شادی جلد کر دیتے ہیں۔ میری بہن ابھی سے بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔ وہاں رہنے کے باوجود امی نے اسے ایک صحیح اور مسلمان عورت کی سی تربیت دی ہے۔"

"وہ لوگ وہاں کیوں رہتے ہیں؟"

فلکی نے پوچھا۔

"اسحٰق کو میں نے وہاں بلا لیا تھا اس نے تعلیم وہیں مکمل کی۔ پھر ثوبیہ کو بھی بلا لیا تو ابا جی نے امی کو بھی بھیج دیا۔ ان کا خیال تھا ماں کو بچوں کے ساتھ رہنا چاہئے۔ سال میں ایک آدھ بار وہ بھی آجاتے تھے ابا جی کے انتقال کے بعد مجھے یہاں کا کاروبار سنبھالنے کے لئے آنا پڑا۔ اسحٰق وہاں پڑھتا بھی ہے اور میرا کاروبار بھی سنبھالتا ہے اس واسطے میں نے امی کو وہیں رہنے دیا ویسے وہ لوگ سال میں ایک بار یہاں آتے ہیں۔ آپ کی قسمت میں اگر ثوبیہ سے ملنا ہوا تو آپ اس سے بہت کچھ سیکھ سکیں گی"

فلکی کو اگرچہ آفاق کے فقرے کا مطلب سمجھ نہیں آیا مگر اسے اس فقرے سے بہت غصہ آیا اور دل ہی دل میں اس کی بہن سے حسد محسوس ہوا۔ ہر بھائی کو اپنی بہن ساری دنیا سے اچھی لگتی ہے۔ کاش اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا!

جلتی کڑھتی وہ سو گئی۔

پھر ایسا ہونے لگا کہ آفاق ہر روز دفتر سے جلدی آجاتا اور اسے کچھ نہ کچھ بنا کر بتاتا کبھی دوپہر کو آجاتا اور کبھی شام کو۔ دوپہر کا کھانا وہ برائے نام کھاتا تھا۔ ناشتہ خوب اچھی طرح کر کے جاتا تھا شام کو دو چار کھانے پکانے سے فلکی کتراتی تھی۔

آفاق نے پوچھا تو بولی۔

"ہمارے ہاں تو دوپہر کے کھانے پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ ڈیڈی بھی اور ممی کی سہیلیاں بھی اکثر دوپہر کے کھانے پر آجاتی تھیں۔ رات کا کھانا تو سب برائے نام کھاتے تھے۔"

"ایسے کہئے کہ ان گھروں میں رات کا کھانا پُرتکلف نہیں پکایا جاتا جہاں ممی اور پاپا کلب میں ڈنر لیتے ہیں اور بچے پڈنگ یا چیونگم چبا کر سو جاتے ہیں۔ باقی خانساماں لوگ اور آیا لوگ رہ جاتے ہیں۔ ہیں نا؟"

فلکی نے سوچا۔ ناحق بھڑوں کے چھتے کو چھیڑا۔ اب اس کے ماں باپ کے بخیئے ادھیڑنا شروع کر دے گا۔

وہ پھر بولا ...

"مگر جن گھروں میں محنتی اور تھکے ہوئے شوہر یہ سوچ کر آتے ہیں کہ اطمینان سے اپنے بال بچوں کے پاس بیٹھیں گے اور گھر کا رزقِ حلال کھا کر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ وہاں اچھی بیویاں رات کے کھانے کا اہتمام کرتی ہیں۔"

فلکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک دن آفاق نے اس سے پوچھا

"آپ کوئی سویٹ ڈش بھی بنانا جانتی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ مجھے تو کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی بہت عادت ہے۔"

"آپ کے لبوں سے میٹھا بول تو نکلتا نہیں۔ یہ خوب صورت ہاتھ میٹھا بنانا کیا جانتے ہوں گے؟"

"مجھے کسٹرڈ اور جیلی وغیرہ بنانی آتی ہے۔"

"یہ وغیرہ کس ڈش کا نام ہے؟"

فلکی چپ ہو گئی۔

"ویسے ہم پاکستانی لوگ کسٹرڈ اور جیلی کو میٹھا نہیں کہتے۔ نخرہ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو بہت خوب صورت اور روایتی میٹھے موجود ہیں۔"

اس پر فلکی چپ ہو گئی۔

"کبھی کھیر پکائی ہے آپ نے؟"

"جی۔ شادیوں پر اکثر ..."

"اسے کھیر نہیں کہتے۔ فرنی کہتے ہیں کھیر دودھ اور چاول سے بنتی ہے۔ اور بڑی نفیس چیز ہوتی ہے اس کے علاوہ شاہی ٹکڑے ہیں۔ پیٹھے کا حلوا ہے سوجی کا حلوا ہے۔ بیسن کا حلوا ہے انڈوں کا حلوا ہے چاولوں کا زردہ۔ سویوں کا زردہ۔ سوجی کی کھیر۔ گاجر کا حلوا ہے۔ گجریلا ہے۔ واہ میری امی بہت لذیذ گجریلا بناتی ہیں سوچ کر ہی منہ میں پانی آرہا ہے۔"

"بس اور نام نہ گنوائیے پہلے تو یہ پکانا سکھائیے۔"

"اچھا تو آپ نے مجھے باقاعدہ خانساماں تصور کر لیا ہے۔"

"خانساماں تو نہیں، استاد ضرور مان لیا ہے۔"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

آفاق نے فلکی کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

اتنا ذرا سا چھونے سے فلکی کے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا اور چہرے پر خون آگیا۔

رفتہ رفتہ آفاق نے اسے موسمی سبزیوں کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کون سی سبزی کس طرح پکانی چاہئے اور دن میں کون سی سبزی پکائی جائے اور رات میں کون سی۔ اکثر لوگوں کو شعور نہیں ہوتا کہ رات کو کون سی سبزی بنائی جائے اور دن میں کون سی بنائی جائے۔

میٹھے بنانے کے طریقے بھی اس نے بتائے۔ تب فلکی کی سمجھ میں آیا کہ کتابوں میں پڑھ کر کھانا پکانا اور بات ہے اور کسی سے سیکھ کر تجربہ کر کے بنانا اور بات ہے

ان آٹھ دنوں میں اس نے اتنا کچھ سیکھا تھا کہ خود اپنے اوپر حیران ہوتی تھی اور سوچتی تھی۔ وہ خاصی ذہین لڑکی ہے کاش کسی نے اس پر توجہ دی ہوتی۔ کون سی بات ہے جو اسے سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر آفاق بھی مرد ہی تھا۔ اس کا سمجھانے کا طریقہ بھی مردانہ تھا بہت سی تفصیل وہ بھی نہیں سمجھا سکتا تھا اس وقت وہ اپنے ذہن سے کام لیتی تھی اور جلدی سیکھ جاتی تھی اسے بات بات میں ڈانٹ کھانا پسند نہیں تھا۔

ایک ہفتے میں آفاق نے کوئی سو بار اپنی امی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے سلیقے اور پکوان کی لذت کو سراہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ زمین پر اپنی ماں کو اپنا خدا سمجھتا تھا۔

"اگر کوئی عورت مرد کو جیتنا چاہتی ہے تو ماں کی طرح اسے کھانا کھلائے۔ طوائف کی طرح اس پر نثار ہو اور دوست کی طرح اس کا دکھ درد بٹائے۔"

تو فلکی کے تن من میں آگ لگ جاتی۔

ایک واہیات سے مرد کے لئے عورت اتنے روپ دھارتی پھرے اور یہ کم بخت کچھ بھی نہ کرے۔ آخر عورت کو جیتنا بھی تو ایک کام ہے۔ اگر عورتیں صرف نکاح کے دو بولوں سے مطیع ہو جاتیں تو اب تک فلکی آفاق کی غلام بن چکی ہوتی۔

مگر وہ تو اس سے نجات حاصل کرنے والے راستے پر اندھا دھند دوڑی چلی جا رہی تھی۔

کوئی کہتا نجات کا راستہ اُدھر ہے تو وہ اُدھر مُڑ جاتی۔

کوئی کہتا نجات کا راستہ اِدھر ہے تو وہ اِدھر ہو جاتی۔

نجات ...

نجات ...

دن رات اس کا دل اسی ایک تال پر دھڑک رہا تھا۔

وہ تپتی ہوئی آگ تھی مگر اپنے وجود پر ضبط کے چھینٹے مار مار کر اُسے بجھا رہی تھی اس کی زبان پاگل کی تلوار تھی۔

تلوار کو اس نے میان میں بند کر دیا تھا۔

اس کی آنکھیں نفرت سے جلتے ہوئے دو شعلے تھے مگر اس نے اپنی آنکھوں پر متانت کی پٹی باندھ لی تھی۔ وہ اس آفاق کے ساتھ اس کے اپنے انداز کے مطابق پورا اترنا چاہتی تھی۔ آفاق کے اپنے بنائے ہوئے تیر دل سے اسے چھلنی کرنا چاہتی تھی۔

شیر کی طرح اس کے سکھائے ہوئے حربے استعمال کر کے اس پر وار کرنا چاہتی تھی اور چاہتی تھی کہ جو پہرہ آفاق نے اس کے گرد تعمیر کر رکھا ہے ایک دن اٹھانے میں خود ہی اس کا دروازہ کھول دے۔

اور فلکی پھر کر کے اڑ جائے۔

آہ کس قدر خوب صورت اور چمکدار ہوگا وہ دن۔

وہ اس دنیا کا پہلا خوب صورت ترین دن ہوگا ...!

فلکی ایک گھنٹے سے برابر گھاس کاٹ رہی تھی اور اب پسینے میں شرابور ہو گئی تھی۔ گھاس کی کٹی ہوئی ڈھیریاں دور دور پڑی ہوئی تھیں اور گھاس کی مخصوص باس سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فلکی نے ہانپتے کانپتے ہوئے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور مشین ایک طرف رکھ دی اور خود بھی سائے میں بیٹھ گئی اور چاروں طرف لان کا جائزہ لینے لگی۔

جاتی بہاروں کی یہ آخری آنچ تھی۔

ہر طرف ہریالی تھی۔ وہ لان جو کچھ دن پہلے جنگل بن رہا تھا۔ اب سنور رہا تھا۔

پندرہ دن سے فلکی ادھر ہی ادھر متوجہ تھی۔ پہلے تین مہینے اس نے کھانا پکانے اور گھر کی صفائی پر لگائے تھے اب وہ کھانے پکانے میں مشاق ہو گئی تھی اور صفائیوں کی اسے عادت پڑ گئی تھی۔

لان کا مسئلہ باقی تھا جسے ہاتھ لگاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا مگر یہ سب کچھ اس کی شرائط میں شامل تھا۔

ایک دن خدا کا نام لے کر شروع ہو گئی۔ پہلے دو چار دن تو وہ لان کو جھاڑو سے صاف کرتی رہی۔ مگر بڑھی ہوئی گھاس اور سرکنڈے بار بار اس کے ہاتھوں کو زخمی کر دیتے تھے۔ اس لئے اس نے آفاق سے کہہ کر گھاس کاٹنے کی مشین منگوالی۔

ہر روز دو گھنٹے لگا کر وہ گھاس کاٹتی تھی پہلے پہل تو مشقت اسے بہت مہنگی پڑی ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ پاؤں سے خون بہنے لگا۔ مگر جب اس نے تہیہ کر لیا تو سب کام آسان ہو گئے۔

اس نے گملے صاف کئے خشک پتوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ پھر انہیں آگ لگا دی ان کے ہاں بابا مالی ایسے ہی کیا کرتا تھا فوارہ اٹھا کر سب گملوں کو پانی دیا جو پودے مُرجھا چکے تھے، ان کو گملوں سے نکال دیا درختوں کے نیچے جتنا کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا تھا وہ سارا سمیٹ کر ایک جگہ ڈھیر کر دیا۔

دن بدن گراؤنڈ کی صورت بہتر ہو رہی تھی اب صرف گھاس کا مسئلہ رہ گیا تھا۔
آج وہ اس پر آخری بار مشین لگا رہی تھی کیونکہ اب باہر سے بیج آ گئے تھے اور اسے اپنے کام کی آفاق سے داد بھی لینا تھی۔
وہ آم کے درخت کے سائے میں بیٹھ گئی اور گھاس کا تنکا توڑ کر دانتوں میں دبا لیا۔ تنکے کا مزہ ویسا ہی تھا جو اسکول کے زمانے میں کبھی ہوا کرتا تھا۔ ہلکا میٹھا... یا بے ذائقہ سا...
وہاں بیٹھ کر وہ سوچنے لگی۔
آج کل اسے سوچنے کی بیماری ہو گئی تھی
واہ فلکی، تو کیا سے کیا ہو گئی ہے۔
اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا یہ نازک اور خوبصورت ہاتھ جو ریشم کے لچھے تھے کس قدر کھردرے ہو گئے تھے۔ پشت پر تو جا بجا جلنے کے نشانات تھے کھانا پکاتے وقت اس نے کئی بار اپنے ہاتھ جلائے تھے۔ سبزی کاٹتے وقت انگلیوں کی پوریں کاٹی تھیں کبھی اُف کیا تھا، کبھی ہائے۔ کچھ نشان ہتھیلی کی طرف تھے۔ کچھ پشت کی طرف۔ ویسے بھی برتن مانجھ مانجھ کر اس کے ہاتھ مٹیالے ہو گئے تھے جیسے خانہ دار عورتوں کے ہوتے ہیں اور تو اور بازوؤں پر بھی نشانات تھے
ایک دن جب وہ سبز مرچیں مصالحے بھر کر تل رہی تھی تو اس نے انجانے میں ایک مرچ کو زور سے دبا دیا تھا وہ گھی سے بھری ہوئی تھی۔ سارا گھی اُچھل کر بازو پر آ گرا۔ کتنی دیر تک وہ بازو پکڑے روتی رہی رات کو آفاق نے اس کا بازو دیکھا تو پوچھ لیا اس نے صاف بتا دیا کہ جل گیا ہے۔
"اس پر کیا لگایا ہے؟" اس نے تردد کے بعد پوچھا۔
اس نے کریم کا نام بتا دیا۔
"اس کریم سے نشان پڑ جاتا ہے۔ ایک دوائی میرے پاس ہے میں وہ لگاتا ہوں۔"
وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہاں سے ایک ٹیوب اٹھا لایا خود اپنی پوروں پر لگا کر اس نے بڑی آہستگی سے فلکی کے بازو پر لگا دی اور بولا
"دو تین دن لگانے سے آرام بھی آ جائے گا اور جلد پر نشان بھی نہیں پڑے گا۔"
بازو ہی کیا۔ اس کے تو چہرے پر بھی کتنے نشان تھے تلتے وقت کوئی نہ کوئی چھینٹا اس کے منہ پر ضرور جا لگتا تھا۔ لیکن اب تو اسے اپنا داغ داغ چہرہ اور داغ داغ ہاتھ کبھی دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ نہ جانے زندگی کی کس منزل پر وہ آ پہنچی تھی۔
جیسے قوتِ مدافعت اس میں ختم ہوتی جا رہی تھی
کیا عجیب چیز ہے یہ انسان بھی کیسی جلدی ہر قسم کے ماحول میں رچ بس جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے کتنی لچک رکھی ہے انسان میں
تنہائی ایک نعمت ہے جب میسر آ جاتی ہے تو انسان پر اپنے نفس کا ادراک ہونے لگتا ہے خود شناسی کے در وا ہوتے ہیں۔ آگہی و عرفان کے چراغ جلنے لگتے ہیں۔
تنہائی کے فائدے ہیں کہ اسے عبادت کا درجہ دیا جاتا۔
تنہائی کی پہلی منزل خود شناسی ہی ہے خود آگہی۔
دوسری منزل زمانے کا عرفان ہے
اور تیسری منزل خدا شناسی۔
فلکی ابھی پہلی منزل سے گزر رہی تھی
اپنے بارے میں کیسے کیسے انکشافات ہو رہے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ جو سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہے اور ناز و نعم میں پلی ہے، اس قدر مشقت بھی کر سکتی ہے۔ اپنے ذہن کی مہار تھام کر خود اپنی تابع ہو سکتی ہے اور اپنے دل و دماغ پر اتنا جبر کر سکتی ہے۔ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا مگر وہ ان سب باتوں میں ڈھل گئی تھی۔ یہ کوئی مجبوری تھی یا جادو کا کرشمہ....
اب یہی دیکھ لو۔ اس نے اتنا بڑا لان صاف کر دیا تھا۔ کون مان سکتا ہے کہ یہ کام ایک اکیلی لڑکی نے کیا ہے.. اور بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ اکھڑی گھاس کی ڈھیریاں اٹھا کر دور کونے میں رکھ دی تھیں تاکہ پورا گراؤنڈ ایک دم صاف نظر آئے۔
وہ تھوڑا سا سستانے کو بیٹھ گئی۔
اس کے کپڑے کس قدر گندے ہو رہے تھے پائنچے تو بالکل چکٹ ہو گئے تھے۔ بال بھی گلے میں جھول رہے تھے مگر اب اسے کپڑے بدلنے اور سنگھار کرنے کا کہاں ہوش تھا۔
اس کے پاس تو گھر میں پہننے کے عامیانہ کپڑے ہی نہیں تھے۔ جہیز میں اس نے تمام تر جدید فیشن کے قیمتی ملبوسات سلوائے تھے۔ اس کا خیال تھا شادی کے بعد ہر روز وہ ایک سے ایک بڑھ کر لباس فاخرہ پہنا کرے گی۔ گھوما کرے گی بس فیشن کرنے کے سوا اسے کیا کام ہوگا!
کچھ تھوڑے سے ہی سادہ سوٹ تھے مگر وہ بھی ریشمی تھے۔ انہیں پہن کر کام ہرگز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کبھی بازو کو آگ پکڑ لیتی کبھی دوپٹہ جل جاتا اور مصیبت یہ تھی کہ ان کپڑوں کو دھونا بھی خود ہی تھا۔ گھر میں دھونے سے اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ وہ تو اپنا معمولی سے معمولی کپڑا بھی ڈرائی کلین کرواتی تھی اب اس نے دھونے اور استری کرنے کا ڈھنگ بھی سیکھ لیا تھا اور تو اور اسے آفاق کی بنیانیں اور قمیصیں بھی دھونی پڑتی تھیں کس قدر کراہیت انگیز کام تھا مگر اس نے کیا۔
جب وہ آفاق کی قمیصیں دھوتی تو ان میں سے قسم قسم کی خوشبوئیں نکلا کرتی تھیں وہ بہت حیران ہوتی کہ یہ آدمی اتنی خوشبوئیں استعمال کرتا ہے۔ اس کی کوئی چیز گندی اور غلیظ نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ موزے بھی بدبودار نہیں ہوتے تھے۔ روز ایک موزہ بدل کر جاتا تھا۔ اور موزہ پہننے سے پہلے بوٹ کے اندر اور پاؤں پر ایک خوشبودار لوشن چھڑک لیا کرتا تھا۔ وہ اتنا صاف ستھرا اور چمکدار ہوتا کہ فلکی کو اس پر رشک آتا
بس صرف بستر پر شکنیں بہت زیادہ ہوتی تھیں کھانا کھاتے ہوئے پلیٹ بالکل صاف کر دیتا۔ ذرا سا بھی سالن نہیں بچاتا تھا۔ اٹھ کر اپنی کرسی ٹھیک کر دیتا کوئی چیز زمین پر گری ہوتی تو اسے اٹھا کر اوپر رکھ دیتا۔ وہ گھر میں ترتیب اور سلیقے کو بہت پسند کرتا تھا۔ اور یہ سارا سلیقہ فلکی نے اسی سے سیکھا تھا۔
فلکی کو اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ پھولوں کی سجاوٹ تھی۔ وہ اپنے گھر بھی کبھی کبھار پھول سجایا کرتی تھی۔ یہاں جب اس نے سارے گھر کو سنوارنا شروع کیا تو پھر پھول سجانے کا خیال بھی آیا مگر پھول تو بالکل جنگل کا سماں پیش کر رہے تھے حالانکہ اس گھر میں بے شمار ملکی و غیر ملکی پھول اور پودے تھے
وہ قینچی اٹھا کر لان میں نکل گئی۔
جب اس نے پہلے دن ہر کمرے میں خوبصورت پھول اور لمبی لمبی شاخیں سجا دیں اور رات کو آفاق نے آ کر ان پھولوں کی تعریف کی تو اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔
"کیا یہ پھول خود بخود اندر آ گئے یا آپ انہیں لائی ہیں؟"
"میں نے سجائے ہیں۔" فلکی نے فخر سے کہا۔
"آپ کی اس خوبی کو سراہا جائے یا پھولوں کی ادا کو؟"
"جی!" فلکی نے حیرانی سے کہا۔
"میں نے عرض کیا کہ کم از کم ایک کام آپ کو ضرور آتا ہے۔"
پھر وہ چپ ہو گیا اور فلکی منتظر رہی کہ وہ اپنا فقرہ پورا کرے۔ حالانکہ وہ جان گئی تھی کہ اس نے کیا کہا ہے مگر تحسین بھرے فقرے پورے کرنے کے معاملے میں وہ پکا بخیل تھا۔
صبح جب فلکی نے باہر نکل کر اس کا بریف کیس اسے پکڑایا اور خدا حافظ کہا تو اس نے ایک نظر لان پر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بولا۔
"اندر والی خوبصورتی باہر بھی پیدا کیجئے نا؟"
تب فلکی کو خیال آیا کہ اس نے خود ہی ایک اور بکھیڑا گلے میں ڈال لیا ہے۔ وہ وہاں سے چلتی ہوئی گراؤنڈ میں آ گئی اور چار بیگھے کے گراؤنڈ کا جو حشر ہو چکا تھا دیکھنے لگی۔ کیا کرے گی اور کس طرح کرے گی مگر پھر اسے اپنے چیلنج کا خیال آ گیا۔
سو وہ کمر کس گئی اور پھاوڑا لے کر میدان میں کود گئی۔ جان جوکھوں کا کام تھا مگر بڑا دلچسپ تھا۔
گراؤنڈ میں کام کرتے کرتے وہ ایک دم چونک جاتی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی فلم کی ہیروئن ہے اور اسکرین پر کام کر رہی ہے۔ حقیقت میں کبھی ایسی سچویشن نہیں ہو سکتی مگر یہ کتنی بڑی حقیقت تھی کہ یہ سچویشن بالکل اصلی تھی اور فلکی سارا دن کدال لے کر کیاریوں کو ٹھیک کرتی پرانی جڑیں کاٹتی ... پتوں کے ڈھیر الگ کرتی اور پھر گھاس پر مشین چلایا کرتی اس نے انگریزی ناولوں اور رسالوں میں دیکھا تھا کہ گوریاں یہ کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ رنگین تصویروں میں وہ ہرے بھرے لان میں کھڑی ہوئی بہت خوبصورت لگا کرتی تھیں۔ مگر اب فلکی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خوبصورتیاں صرف تصویروں تک ہی محدود تھیں۔ اصل کام بڑا جان لیوا ہے اور کون اپنی خوشی سے کرتا ہے؟
رفتہ رفتہ وہ کچھ اذیت پسند سی ہو گئی۔ اپنے آپ کو تکلیف دے کر اسے خوشی محسوس ہوتی۔ پھر یوں تھا کہ اسے مصروف رہنے کی عادت ہو گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ قیدیوں سے مشقت کیوں لی جاتی ہے۔ قید تنہائی میں اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب سوچیں بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ مشقت اچھی چیز ہے جسم کا ایک ایک عضو مصروف رہتا ہے۔ بھوک بھی لگتی ہے اور پھر نیند۔
واہ کیا مزے کی نیند آتی ہے۔
دنیا جہان کا ہوش نہیں رہتا۔ آدمی ہر شے سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ پہلے تو وہ رات گئے تک کروٹیں لیا کرتی تھی۔ رشک سے دور پڑے آفاق کو دیکھا کرتی تھی کیسے تکیے سے سر لگتے ہی سو جاتا تھا اور اسے احساس

بھی نہیں ہوتا تھا کہ کمرے میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی سوئی ہوئی ہے جو اس کی منکوحہ بیوی ہے۔

کمال کا آدمی ہے وہ دل میں سوچتی۔

اس صورت حال سے تو اس کی راتوں کی نیند اُڑ جانی چاہئے تھی مگر افسوس وہ گہری نیند سو جاتا تھا اور فلکی جلنے کڑھنے کے لئے جاگتی رہتی تھی کبھی کوئی کتاب پڑھتی رہتی اور کبھی یوں ہی کروٹیں بدلتی رہتی اور جب تک جلتی رہتی فلکی کو نیند بھی نہ آتی تھی اور آفاق چکاچوند روشنیوں میں بھی سو جاتا تھا۔

اب فلکی کو احساس ہوا کہ آفاق اس قدر تھک کر آتا ہے کہ کھانا کھانے کے بعد بے سُدھ ہو کر سو جاتا ہے جیسے وہ خود سو جاتی تھی اور صبح یوں آنکھ کھلتی جیسے ابھی تو پلک لگی تھی صبح اُٹھ کر وہ کام میں جُت جاتی۔

واقعی وہ جیسے جیل میں اپنی میعاد کے دن پورے کر رہی تھی اور اچھی رپورٹ کی منتظر تھی۔

آج اس نے ہرے بھرے لان کو بالکل درست کر دیا تھا پھول پودے ہر جگہ بڑے خوب صورت لگ رہے تھے اور وہ آم کے درخت کے تلے بیٹھی جائزہ لے رہی تھی۔ آم پر ننھا ننھا سا بور آیا تھا اور اس بور کی خوشبو اسے بہت پسند تھی۔ وہ آم کے پتوں کو توڑ کر ہتھیلی پر مسلتی اور پھر اس کی مہک سونگھ سونگھ کر لطف لیتی۔ بہت بڑا معرکہ مار لیا تھا اس نے ..... اور اس کے بعد تو کام کم ہو گیا تھا بس اب شام کو روزانہ گملوں کو پانی دیا کرے گی اور ہفتے میں ایک دن مشین چلانا ہوگی۔ ہر کام کا اس نے وقت مقرر کر لیا تھا۔

وہ وقت جو اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

آج اس کی طبیعت سُست ہوئی تھی اتنا تھک چکی تھی کہ درخت کی چھاؤں تلے سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہا۔

دل تو یہ چاہ رہا تھا یہیں سو جائے اس درخت تلے اس آسمان تلے۔ آنکھیں مُوند کے۔ کوئی نہ اس کو جگائے نہ کوئی اسے بُلائے کبھی کبھی کہیں کھو جانے کو دل چاہتا تھا۔

ہواؤں کی طرح بکھر جانے کو ...

اور زندگی چھوٹی سی لگنے لگتی تھی۔

یہ سوچتے سوچتے وہ گھاس پر لیٹ گئی گھاس کا بستر کتنا اچھا لگتا ہے یہ جو غریب لوگ گھاس پھونس پر سو جاتے ہیں تو کچھ بُرا نہیں کرتے۔ واقعی یہ سب فرق ہماری سوچ کے ہیں جب انسان کی انا نہ رہے تو کچھ بھی نہیں رہتا یہ سخت زمین اور یہ نرم نرم گھاس کتنی اچھی لگ رہی ہے۔

اس نے کروٹ لی ... اور مُونہہ کے بل اُلٹی ہو گئی۔ سر کے نیچے بازو رکھ لیا۔ بچپن کی سوچیں جانے کون سا جھروکہ کھول کر اندر آ گئیں ... یا پھر کنھوری زمین میں روشن دان کھلتے چلے گئے ...

کتنی پرانی ... کتنی عجیب باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے گرنے لگے ... اور پھر وہ اس کے سامنے ہی زمین میں جذب ہونے رہے۔

انسان جب اپنے آپ سے رُوٹھ جاتا ہے تو اسے کسی شے کی پرواہ نہیں رہتی۔

اس کو بھی کسی شے کی پرواہ نہ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ جانے کب سو گئی۔ نیند کو کیا، کوئی سیج پر سے یا مخملیں گدے پر ... یا کھُردرے فرش پر جب آ جاتی ہے، پَر پھیلاتی ہوئی آ جاتی ہے اور بازوؤں میں چھپا لیتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اس وقت اُٹھی جب کوئی قریب کھڑا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف دیکھا وہ لان میں تھی۔ دھیمی دھیمی شام اُتر آئی تھی۔ گھاس کی ڈھیری اس کے سامنے پڑی تھی اس کے ساتھ مشین پڑی تھی۔

اور آفاق اس کے سرہانے کھڑا اُسے جگا رہا تھا۔

آنکھیں مل کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے اس نے دوپٹہ کہاں اُتار کے رکھ دیا تھا۔ دیکھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ خیال آیا پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے۔ جانے وہ کس درخت کے پیچھے رکھ بیٹھی تھی۔

کبھی اِدھر جاتی کبھی اُدھر جاتی۔ کبھی جوتا ڈھونڈتی۔ کبھی دوپٹہ۔ اور آفاق کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اِدھر آؤ۔"

وہ قریب آ گئی۔

لٹیں کھلی ہوئی۔ بالوں میں گھاس پھنسی ہوئی چہرے پر اپنے ہی بازو کا نشان مُونہہ کے ایک طرف مٹی لگی ہوئی ...

پلکوں میں چھوٹے چھوٹے تنکے پھنسے ہوئے میلے چکٹ کپڑے۔ ایک پائنچہ اُدھڑا ہوا۔ پاؤں پر مٹی ... گورے گورے ہاتھوں پر داغ ہی داغ ... سُرخ سُرخ سُوجی سوئی سوئی آنکھیں ... بھرے بھرے ہونٹ نیند کی کھماوٹ سے ایک دوسرے میں بھنچے ہوئے۔ چہرہ پُرسوز۔ آدھ کھلی نیند کا چڑچڑا پن ..... تھوڑا تھوڑا غصہ۔ تھوڑی تھوڑی بوکھلاہٹ۔ آفاق اس کو دیکھتا رہا۔

وہ اس وقت گاؤں کی ایک انتہائی معمولی لڑکی لگ رہی تھی۔

اس نے اپنی سُرخ آنکھوں سے آفاق کی طرف دیکھا۔ آفاق کی آنکھوں میں شرارت تھی یا کچھ اور بھی تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر دوبارہ دیکھنا چاہا۔

کہ آفاق نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دئے ایک ہاتھ میں اس کا دوپٹہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں اس کے جُوتے۔

اس نے جلدی سے پہلے اپنے جُوتے پکڑ لئے جیسے آفاق سے جُوتے اُٹھوانا بے ادبی ہو۔ پھر اپنا دوپٹہ لیا۔ زمین پر رکھ کر جُوتے پہن لئے ..... اور دوپٹہ کندھوں پر ڈال لیا۔

"اندر چلنے کے ارادے ہیں؟" آفاق نے اس بے وقوف لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"جی ہاں!" اس نے سر ہلایا۔

"چلئے۔"

وہ آگے آگے اور آفاق پیچھے پیچھے ..... اندر کو چلے۔ برآمدے کے قریب آ کر آفاق اپنی موٹر کی طرف مڑ گیا اور وہ اندر آ گئی۔

فلکی پہلے باورچی خانے میں گئی اور جلدی سے چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ آج ہر کام کو دیر ہو گئی تھی کیوں کہ وہ سو گئی تھی۔ کیسی بے وقوفی ہو گئی۔ جب وہ ٹرالی پر چائے کے برتن لگا رہی تھی تو آفاق باورچی خانے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ لفافے تھے اور دوسرے میں ٹرانسسٹر ریڈیو۔ فلکی نے ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار پھر غور سے دیکھا۔ واقعی وہ ریڈیو تھا۔ مگر ریڈیو اس کے گھر میں کیسے آ گیا؟

ممکن ہے آفاق اپنے کمرے میں رکھنے کے لئے لایا ہو۔

آفاق ریڈیو اور لفافے وہیں چھوڑ کر چلا گیا فلکی نے حسب معمول شام کی چائے اس کے کمرے میں پہنچا دی۔

"آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہیے؟" اس نے جانے سے پہلے پوچھا۔

"چاہیے۔" آفاق نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا۔

وہ سراپا انتظار بن گئی۔

"پہلے چائے بنائیے۔"

فلکی نے ہمیشہ کی طرح اس کی پیالی میں چائے بنا کر پیش کی۔

"ایک پیالی اور بنائیے۔"

فلکی نے چائے بنا دی۔

"وہاں کرسی پر بیٹھ کر یہ چائے پی لیں۔"

کرسی پر بیٹھ کر وہ چائے پینے لگی۔

فلکی کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کے سامنے چوں چرا نہیں کرنی چاہئے۔ بس عافیت اسی میں ہے کہ "روبوٹ" کی طرح اس کا ہر حکم مانا جائے۔

سو وہ چائے پیتی رہی اور آفاق ایک رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا۔ چائے ختم کر کے وہ اُٹھی اور اس نے اپنی پیالی ٹرالی کے نچلے خانے میں رکھ دی اور پھر کھڑی ہو گئی۔

آفاق نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر پوچھا "اپنے حلیے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

فلکی نے خوف زدہ نظروں سے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ ابھی تک اس کے کپڑوں پر گھاس کے ذرّے لٹک رہے تھے۔ سامنے شیشے پر نظر گئی تو بالوں پر گھونسلے کا گماں ہو رہا تھا

فلکی نے سر جھکا لیا۔

"اور یہ آپ کے کپڑے کیوں پھٹے ہوئے ہیں؟"

"میں ابھی جا کر کپڑے بدل لیتی ہوں۔"

وہ جانے کو مڑی۔

"ٹھہریے موسم بدل گیا ہے کیا آپ کے پاس نئے موسم کے کپڑے ہیں؟"

"جی۔ ہیں تو ... مگر میرے پاس ایسے کپڑے ہیں جنہیں پہن کر کام کیا جائے۔ کام کرتے وقت یہ لیٹ جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں۔ میں کیا کروں؟"

"پھر آپ نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟"

"ڈر لگتا تھا!"

"کہ میں کھا جاؤں گا؟"

"نہیں۔ آپ طعنے بہت زیادہ دیتے ہیں۔"

آفاق تھوڑی دیر کے لئے چپ رہا پھر بولا۔

"کل آپ میرے ساتھ بازار چلئے گا اور اپنی پسند کے کپڑے لے آئیے گا۔"

فلکی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ آنکھیں پھاڑ کر آفاق کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر میرے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو پھر ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیے گا۔"

فلکی کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔

وہ دم سادھے کھڑی رہی۔

"کیا تحریری دستاویز دوں؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں جا رہی ہوں۔" وہ جلدی سے باہر نکل گئی کہیں آفاق اپنی بات سے مُکر نہ جائے۔ (اس سے آگے کے حالات جاننے کے لئے اگلے ماہ کا بانو ملاحظہ فرمایئے)

تین سال بعد میرا تبادلہ دوبارہ ہیڈ آفس میں کر دیا گیا اور اس طرح ایک بار پھر میں تالابوں کے حسین شہر بھوپال میں آپہنچا۔ ان تین برسوں میں ہیڈ آفس میں کئی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ کچھ لوگوں کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ جو لوگ ابھی تک اپنی جگہ جمے ہوئے تھے، ان میں فہیم مرزا بھی شامل تھے، جن سے میری اتنی دوستی تھی کہ ہم دونوں کو ایک جان دو قالب کہا جاتا تھا۔

تبادلے کی تصدیق ہوتے ہی میں نے فہیم مرزا کو تفصیلی خط لکھ بھیجا تھا اور پھر چند روز بعد اپنی فیملی کے ساتھ بھوپال کے لئے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے مرزا کو تار بھی دے دیا تھا کہ ہم لوگ کل شام کو پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ دوسری شام کو فہیم اپنے اہل و عیال سمیت ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ خواتین، بچے، میں اور مرزا، ہم سب ٹوٹ کر ملے۔ طے پایا کہ کوارٹر الاٹ ہو جانے تک ہم لوگ مرزا کے ہاں رہیں گے۔

فہیم منزل پہنچ کر غسل اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ میری اور فہیم کی بیگم باتوں میں منہمک ہو گئیں۔ بچے اپنے اپنے کھلونے وصول کر کے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

مرزا بہت اچھے موڈ میں تھے۔ جب مجھے وہ اپنی دو تین تازہ غزلیں سنا چکے تو میں نے چڑانے کے لئے کہا "بس بس یار، اب کان نہ کھاؤ۔"

وہ بولے "میں کان کیسے کھا سکتا ہوں۔ میں تو خالص ویجیٹیرین ہوں۔"

میں نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا "ارے ہاں، آپ تو سبزی خور ہیں۔ تو پھر ایسا کیجیے، لال پری پی جائیے۔ میں تو چلا سونے کے لئے۔"

دوسری صبح یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کچن میں فہیم اپنی بیگم کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور رات کا ان کا اچھا موڈ اس وقت کچھ اور بھی اچھا ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ مرزا اور بیگم مرزا ہمارے آنے سے بہت خوش ہیں۔ دس بجے میں فہیم کے ساتھ آفس چلا گیا۔ لیکن وہاں یہ دیکھ کر کچھ تعجب ہوا کہ آفس میں مرزا پہلے کے برعکس بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہیں۔ بہر حال، اس بات کو میں نے کام کی زیادتی اور ڈسپلن کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

شام کو گھر پہنچ کر مرزا پھر زندہ دل اور خوش مزاج بن گئے۔ تین سال پہلے ان کے مزاج کی یہ کیفیت نہ تھی۔ اب تو فہیم اپنی بیگم سے پہلے کی طرح بار بار الجھ ہی نہیں رہے تھے۔ بحث و تکرار کی عادت بھی مرزا کے مزاج سے یک سر غائب ہو چکی تھی۔ وہ اب اپنی بیگم کی ہر بات کو نہایت خوش دلی سے سنتے اور اس پر عمل بھی کرتے۔ اگر وہ خود کچھ کہتے تو بہت اچھے ڈھنگ سے کہتے۔ ساتھ ہی مسکراتے، بلکہ ہنستے بھی جاتے۔

اسی طرح دن آرام سے گزرتے رہے۔ میں اپنے لئے کوارٹر الاٹ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس درمیان مرزا اور ان کی بیگم کے درمیان کوئی ہلکی سی جھڑپ بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ تین برس پہلے جب ہم لوگ یہاں تھے تو وہ دونوں ہمارے سامنے ہی بے جھجک ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مرزا اپنی بیگم پر ہمیشہ حاوی رہنے کی دُھن میں رہتے تھے۔ میں اس وقت مرزا کو سمجھایا بھی کرتا تھا کہ اپنی بیوی سے ذرا ذرا سی بات پر اُلجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہنس کر جواب دیتے "یار، میں ایسا یا تو تفریحاً کرتا ہوں یا مصلحتاً۔ حقیقتاً تو ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔"

ایک روز میں نے موقع پا کر اپنی بیوی سے مرزا صاحب کے مزاج کی اس تبدیلی کا ذکر کیا: "دیکھنا زاہدہ، مرزا کتنے بدل گئے ہیں۔ اب تو دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے ہیں۔ پہلے تو مرزا اپنی بیگم سے بات بات پر جھگڑا کرتے تھے۔"

زاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا "تو کیا آپ ان کو لڑتے جھگڑتے ہی دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے صفائی پیش کی "ارے نہیں میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔"

"ہاں میرا بھی یہی اندازہ ہے — چلئے صاحب، خدا کا شکر ہے۔" زاہدہ نے طمانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ایک چھٹی کے دن میری اور مرزا

غزل

رات دن سرگوشیوں میں بولتا رہتا ہے کون
میرے احساسات میں رس گھولتا رہتا ہے کون

شور کے میزان میں رکھ کر میری خاموشیاں
میرے اندر بیٹھا بیٹھا تولتا رہتا ہے کون

کچھ بتا اے میری لاعلمی مجھے کچھ تو بتا
خواہشوں کی بند گرہیں کھولتا رہتا ہے کون

روح و دل کو یوں نوید اپنی ہتھیلی میں لئے
اتنی بے رحمی سے آخر رولتا رہتا ہے کون

کہکشاں نوید

کی بیگم فنا پلنگ کو چل دیں۔ بچوں کی نگرانی ہم دونوں کے گلے پڑی۔ لیکن مرزا ٹھہرے چالاک، انہوں نے ہر بچے کے ہاتھ میں ایک ایک خالی ڈبا تھما دیا اور اعلان کیا کہ جو باغ میں سے دو بجے تک سب سے زیادہ تتلیاں پکڑ کر لا دے گا، اسے انعام میں چاکلیٹ کا ایک پیکٹ دیا جائے گا چنانچہ بچے خوشی خوشی اپنے مشن پر روانہ ہو گئے اور ہم دونوں بے فکری سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

میں نے مرزا سے پوچھا "یار مرزا! ایک بات بتاؤ، یہ تمہیں اپنی بیگم سے عشق کب اور کیسے ہو گیا؟"

مرزا بولے "اماں، یہ کیا پہیلی بجھا رہے ہو! جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کہو۔"

میں نے وضاحت کی: "بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ اب تم اپنی مسز کا بہت خیال رکھتے ہو۔ کسی بات سے اختلاف بھی نہیں کرتے۔ اب نہ تو وہ نوک جھونک ہے اور نہ ان بن — ورنہ پہلے تو ماجرا ہی دوسرا تھا۔ آخر یہ خوش گوار انقلاب کیسے آیا؟"

میری بات سن کر مرزا ہنسنے لگے پھر ہنستے ہنستے وہ سنجیدہ ہو گئے اور میری پشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "دیکھنا گدھے کو چلا آ رہا ہے۔ مسکراتا ہوا۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مرزا کا ملازم اکبر خان مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ دراصل اس کا قصور یہ تھا کہ مرزا کے حکم کے باوجود وہ ان کے لئے حقہ لئے بغیر آ رہا تھا۔ اب اس میں اس کا کیا گدھا پن تھا، اس بات کو یوں سمجھئے کہ مرزا جھینگی کے دن حقہ پئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں نے پوچھا "یار، یہ کیا تماشا ہے کہ ٹائی لگائے سوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور حقہ گڑگڑایا جا رہا ہے!"

مرزا نے کہا "کیا تمہارے خیال میں حقہ پینے کے لئے لنگی کرتا پہننا ضروری ہے؟"

میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا "خیر صاحب، آپ نہیں مانتے تو ضرور پیجئے، مگر خدارا مجھ سے اصرار نہ کرنا کہ اپنا منہ کڑوا کروں — ہاں تو میرے سوال کا جواب نہیں دیا آپ نے؟"

وہ بولے "تمہارے سوال کا جواب بھی دیں گے، پہلے منہ تو کڑوا کر لیں۔"

اتنے میں نوکر حقہ لے کر آ گیا جس کو مرزا سرور کے عالم میں پینے لگے۔

بڑی دیر کے بعد مرزا کی خاموشی ٹوٹی۔

"ہاں، تو تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ ہم دونوں میں اب جھگڑا کیوں نہیں ہوتا؟ اچھا تو سنو۔ والد صاحب مرحوم کے زمانے سے ہمارے خاندان کے ایک پیر و مرشد بھی ہوا کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں تو ان جھمیلوں سے دور ہی رہتا ہوں لیکن گھرانے کے دوسرے لوگ پیر صاحب کے بہت معتقد ہیں۔ ہمارے وہ پیر صاحب یہاں سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتے ہیں اور سال دو سال میں کبھی ادھر آ کر نذرانے وغیرہ قبول کر کے پھر واپس اپنے گاؤں کو چلے جاتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر مرزا چپ ہو گئے۔ میں سمجھا کہ آگے کی بات سوچ رہے ہیں، مگر وہ تو باقاعدہ مراقبے میں چلے گئے۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے انہیں شانے پر سے پکڑ کر ہلایا اور ڈپٹ کر کہا "بندۂ خدا، بعد میں سو جانا۔ پہلے واقعہ پورا سنا دیجئے۔"

مرزا چونک پڑے اور پھر جماہی لیتے ہوئے گویا ہوئے "تو جناب پچھلے سال تشریف لائے تھے ہمارے پیر صاحب۔ ظاہر ہے کہ میری تو ان سے ملاقات صبح اور شام کو ہی ہوتی تھی۔ دن بھر وہ خاندان کے دیگر افراد سے گھرے رہتے تھے جو کہ دوپہر ہوتے ہوتے اپنے گھروں سے یہاں آ جاتے تھے۔ شاہدہ، یعنی میری بیگم تو دن کا بیشتر حصہ ان کی خدمت میں صرف کرتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ شاہدہ نے ایک دن پیر صاحب سے فریاد کی کہ ان کا شوہر، یعنی آپ کا یہ ناچیز خادم ان سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا اور ناراض رہتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز مغرب کی نماز پڑھ کر اور مرغ و ماہی وغیرہ سے شغل کرنے کے بعد مولانا نے مجھے اور شاہدہ کو اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا: "آج میں آپ دونوں کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔" بیگم احترام کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو گئیں اور مجھے بھی متوجہ ہونا پڑا۔ اب پیر و مرشد نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

"شوہر یا زوجہ میں سے جو بھی دوسرے پر حاوی رہتا ہے، پہلے وہ جاتا ہے۔" بیگم نے ہڑبڑا کر پوچھا "جی؟" مولانا نے مزید تبسم فرماتے ہوئے وضاحت کی "اللہ تبارک و تعالیٰ سب پر رحم فرمائے — میاں یا بی بی میں سے یہ اس پر یا وہ اس پر، جو بھی غالب رہے گا پہلے وہ اس عالم فانی سے کوچ کرے گا۔" یہ سن کر بیگم آنسو بہانے لگیں اور پیر و مرشد میری جانب ہمدردی سے دیکھنے لگے۔ نشست برخاست ہوتے ہی بیگم نے مجھے قسم دی کہ آئندہ میں ان پر حاوی نہیں رہوں گا۔"

○○

یومِ خواتین

بھول تو شاید نہ پائے سرزمیں بنگال کی
جب برہمن خانداں میں کھِل اٹھی تھی اِک کلی
"نائیڈو" سب نے جسے "کوکیلا" بھارت کی کہا
شاعری کا شوق بھی جس کو لڑکپن ہی سے تھا
تھا ہمارے دیش پر اُس وقت انگریزوں کا راج
دَور دورہ تھا غلامی کا، سبھی بے چین تھے
اعلیٰ تعلیمات سے آراستہ خود کو کیا
جنگِ آزادی کی تحریکوں میں تھی وہ پیش پیش
تھی تو عورت، جوشش مردوں سے مگر کچھ کم نہ تھا
وہ ہمارے دیش کی خاتونِ اوّل تھی کہ جو
سن بیالیس ۴۲ میں رہی وہ گاندھی جی کے ساتھ ساتھ
وہ بہت سے کارناموں کے لئے مشہور ہے

سن اٹھارہ سو اٹھتر ۱۸۷۸ کی وہ تیرہ ۱۳ فروری
وہ "سروجنی نائیڈو" ہستی جو مایہ ناز تھی
جس نے ماں کی گود ہی سے پائی تھی دانشوری
خوب کرتی تھی جو انگریزی زباں میں شاعری
دیش میں چاروں طرف تھی دُھند سی چھائی ہوئی
اُس سے یہ حالت نہ اپنے دیش کی دیکھی گئی
پھر سیاست میں بھی سرگرمِ عمل رہنے لگی
وہ نڈر تھی، جیل جانے سے نہ گھبرائی کبھی
شمعِ آزادی کے وہ جانباز پروانوں میں تھی
کانگرس کی صدر سن اُنیس سو پندرہ ۱۹۱۵ میں بنی
گاندھی جی نے جب کہ "بھارت چھوڑو" کی تحریک دی
ذات اُس کی اِس لئے بھی فخرِ ہندوستاں بنی

چونکہ تیرہ ۱۳ فروری ہے اُس کی پیدائش کا دن
اس لئے "یومِ خواتین" اُس کو کہتے ہیں سبھی

وقارؔ مالوی

مُسکرا لے سکھی

مانگ تاروں سے اپنی سجا لے سکھی
دو گھڑی کے لئے مُسکرا لے سکھی

زندگی کی ہر اِک شے ہے تیرے لئے ... دل کے نغمات کی لے ہے تیرے لئے
تجھ کو آواز دیتی ہے بادِ صبا ... رنگ اور نور کی مے ہے تیرے لئے
پیار کے ساز پر گیت تُو گا لے سکھی
دو گھڑی کے لئے مُسکرا لے سکھی

زندگی جھوم اُٹھی ہے تیرے نام سے ... لوگ تکتے ہیں تجھ کو در و بام سے
تیری مخمور آنکھوں کی کھا کر قسم ... پی رہی ہے شفق پیار کے جام سے
تُو بھی خوشیوں کا ساغر اُٹھا لے سکھی
دو گھڑی کے لئے مُسکرا لے سکھی

وقت ظالم ہے تجھ کو یہ معلوم ہے ... کتنی بھولی ہے تو کتنی معصوم ہے
سچ بتا بے سبب یہ اداسی ہے کیوں ... سچ بتا کس لئے اتنی مغموم ہے
کر نہ خود کو غموں کے حوالے سکھی
دو گھڑی کے لئے مُسکرا لے سکھی

پھر کہاں یہ تِرا بانکپن پھر کہاں ... یہ بہاریں یہ رنگیں چمن پھر کہاں
پھر کہاں یہ جوانی کی رعنائیاں ... یہ مہکتی ہوئی انجمن پھر کہاں
بانٹ دے زندگی کے اُجالے سکھی
دو گھڑی کے لئے مُسکرا لے سکھی

جبیںؔ حکیم

بیوٹی کالج

بالوں کی رنگائی
(ہیئر ڈائنگ)

شہناز حسین

جلد کا ڈھیلا پڑ جانا اور بالوں کا سفید ہوجانا۔ دونوں باتیں بڑھاپے کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ہر عورت فکرمند رہنے لگتی ہے۔ جب اُس کے چہرے پر جھرّیاں نمودار ہونے لگیں اور بالوں میں سفیدی جھلک اُٹھے۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن حُسن کاری کے جدید طریقوں سے اَب اِس مسئلے کا حل بھی نکل آیا ہے اور آج کی عورتیں اپنی ڈھلتی عمر کو اگر مکمل طور سے نہیں تو کافی حد تک سنبھال سکتی ہیں۔

بال کیوں سفید ہوتے ہیں ؟ اِس سوال کا جواب جاننے کے لئے بالوں کے بنیادی ڈھانچے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ دراصل بال کی جڑ کھال کی کئی پرتوں میں پیوست ہوتی ہے۔ جو کھال کی بالکل باہری پرت ہے اُسے ناخن کھال یعنی کیوٹیکل (CUTICAL) کہتے ہیں۔ یہ بہت باریک جھلیوں سے بنی ہوتی ہے اور یہ بہت باریک جھلیاں ایک دوسرے کو مکمل طور سے ڈھک لیتی ہیں۔ دوسری پرت چھال یعنی کورٹیکس (CORTEX) کہلاتی ہے جو سر کی اوپری کھال کے بالکل نیچے ہوتی ہے۔ یہ بالوں کو رنگ مہیا کرتی ہے۔

عمر کے ساتھ ساتھ یہ کھال بالوں کو رنگ عطا کرنے کی صلاحیت کھونا شروع کردیتی ہے اِس طرح بال کالے (یا سُنہرے یا بھورے) نہیں رہتے بلکہ سفید ہوجاتے ہیں

بالوں کا رنگ بدلنے کی دوسری وجہیں بھی ہوسکتی ہیں لیکن بڑھتی عمر اس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ کالی لیٹیں جب سفید رنگ کی ہونے لگتی ہیں تو شروع میں سُرمئی رنگ کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ اِن پر اُسی وقت دھیان دینا بہتر رہتا ہے۔ جو لیٹیں پہلے ہی سفید ہوچکی ہوں اُن کے لئے تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اَب وہ خود بخود تو کالی ہو نہیں سکتیں اُن کے لئے رنگائی کی ضرورت ہوگی لیکن جو لیٹیں ابھی سُرمئی اثر لئے ہوئے ہیں وہ فوری توجہ کی طلب گار ہوتی ہیں۔

بالوں کی سفیدی دُور کرنے کا سب سے اچھا اور آسان علاج بالوں کو رنگنا ہے۔ بالوں کی رنگائی کا چلن آج کل بہت عام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ عورتیں صحیح طریقہ جانے بغیر ہی یہ عمل شروع کردیتی ہیں جب کہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کریں تاکہ آگے چل کر ان کو کسی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بالوں کو ڈائی کرنا موجودہ دَور کی دریافت نہیں، بلکہ یہ طریقہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ رومی اور دوسری تہذیبوں کی عورتیں بھی اِس طریقے کو اپنا کر اپنی خوب صورتی میں اضافہ کیا کرتی تھیں۔ لیکن اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ان کو بعد میں کافی نقصان اُٹھانا پڑتا تھا اور اُن کے بال گرنے شروع ہوجاتے تھے۔

آج کل کی کیمیائی ڈائی اور بالوں کو مختلف رنگ دینے کے طریقے صحت کے لئے بھی بہت نقصان دہ ثابت ہورہے ہیں۔ اِن مصنوعی اشیاء کے استعمال سے سر کی کھال بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بال خشک، بھربھرے اور روکھے ہوجاتے ہیں

بالوں کو رنگنے سے پہلے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کرلیں تو بعد کے بڑے نقصان سے آپ بچ سکتی ہیں۔ احتیاط اپنے آپ میں ایک کارگر علاج ہے۔ احتیاط کرنے سے سفید بال کالے تو نہیں ہوتے لیکن بالوں کو مزید سفید ہونے کی روک تھام ضرور ہوسکتی ہے۔

کچھ قدرتی اشیاء ایسی ہیں جن کے استعمال سے بال سیاہ ہوجاتے ہیں اور بالوں کا مزید سفید ہونا رُک جاتا ہے۔ یہی نہیں، یہ اشیاء بالوں کی صحت اور افزائش کے لئے بھی مفید ہیں۔ ہمیشہ ایسے شیمپو، ٹانک اور کنڈیشنگ پاؤڈر استعمال کریں جن میں حنا، آملہ، شکاکائی اور ریٹھوں کی زیادہ مقدار ہو۔ یہ چیزیں نہ صرف بالوں کو کالا کرتی ہیں بلکہ بالوں میں چمک بھی پیدا کرتی ہیں اور اُس کے ساتھ بالوں کی عمر بھی بڑھاتی ہیں۔

اگر آپ کیمیائی ڈائی استعمال کرنا چاہتی ہیں تو آپ کے لئے اوپر بیان کی ہوئی چیزوں کا استعمال اور بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ یہ چیزیں کیمیائی مادّوں کے مضر اثرات کی تلافی کریں گی اور بالوں کو زیادہ نقصان سے بچائے رکھیں گی۔

قدرتی رنگائی سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف بالوں کے لئے محفوظ ترین طریقہ ہے بلکہ یہ سر کی کھال میں مضر اثرات بھی پیدا نہیں کرتا۔

ظاہر ہے یہ طریقہ صرف مہندی ہے۔ یہ نہ صرف آسان علاج ہے، بلکہ سستا بھی ہے۔ مہندی بالوں کی جڑوں کو بھی مضبوط رکھتی ہے۔ اگر آپ کے بالوں میں چند لیٹ سفید ہوں تو بہتر ہے کہ حنا کے ذریعہ آپ اِس سفیدی سے چھٹکارا پا لیں اور ان پر ہیر ڈرائی استعمال کرنے کا جوکھم نہ لیں۔

مہندی میں کافی (COFEE) یا کتھا ملاکر استعمال کرنے سے بالوں کا رنگ گہرا براؤن ہوجاتا ہے جب کہ خالی مہندی کے استعمال سے ہلکا رنگ آتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ گہرے سیاہ رنگ لئے ہوئے بالوں میں مہندی کے رنگ کا اثر کم ہوتا ہے جب کہ ہلکے رنگ کے بالوں میں مہندی اچھی طرح رچ جاتی ہے۔

ایک خاص طرح کی مہندی کے پاؤڈر میں کچھ اور اشیاء بھی ملی ہوتی ہیں جیسے آملہ اور کوہل (KOHL) یہ نہ صرف محفوظ طریقہ ہے بلکہ بالوں کی دوسری کمیوں کو بھی دور کرتا ہے۔ پابندی سے اگر مہندی استعمال کی جائے تو بالوں کو کئی پہلوؤں سے فائدہ دیتی ہے اور ان کی صحت اور خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

کیمیائی ڈائی استعمال کرنے سے عام طور پر کئی طرح کی تکلیفیں اور ایلرجی پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر آپ کو کیمیائی ڈائی سے بال رنگنے ہیں تو ڈائی کو پورے سر میں لگانے سے پہلے اُسے کان کے پاس تھوڑی سی جگہ پر لگاکر دیکھ لیں۔ اگر ۲۴ گھنٹے میں کوئی ناگوار ردّ عمل محسوس ہو مثلاً جیسے کھال میں تکلیف ہونے لگے یا ایلرجی ہوجائے تو اِس ڈائی کو ہرگز استعمال نہ کریں۔ اگر کوئی ناگوار ردّ عمل نہ ہو تو پورے سر میں ڈائی استعمال کریں۔ بہتر ہوگا کہ کسی ماہر سے آپ کیمیائی ڈائی سے اپنے بالوں کو رنگوائیں کیوں کہ ان لوگوں کو اِس مقدار وغیرہ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ بھنوؤں اور پلکوں پر ہیر ڈائی استعمال نہ کریں۔

عام بالوں میں تو ہیر ڈائی آسانی سے جذب ہوجاتی ہے۔ لیکن موٹے اور سخت بالوں میں ذرا دیر لگتی ہے۔ ایسے بالوں میں ڈائی کے بار بار استعمال سے ہی بالوں کا رنگ تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے۔

جہاں تک بالوں کی روزمرّہ دیکھ بھال کا تعلق ہے ایسا شیمپو استعمال کریں جس سے بالوں کو نقصان نہ پہنچے۔ آملہ شیمپو روزمرّہ کے استعمال کے لئے بہترین شیمپو ہے۔ یہ بالوں میں چکنائی پیدا کرتا ہے اور بالوں کو اچھی طرح صاف کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ آملہ کے استعمال سے نہ صرف بالوں میں چمک پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ بالوں کو مزید سفید ہونے سے بھی روکتا ہے۔

اِس سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ ہر کوشش کے اچھے نتائج نکلنے کے لئے عموماً کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ اِس لئے گھبراہٹ میں بالوں کے لئے ایسی تیز اثر مگر نقصان دہ چیزیں استعمال نہ کریں جو پریشانی کو کم کرنے کی بجائے اور بھی بڑھادے بلکہ ایسی چیزیں استعمال کریں جو بالوں کی خوب صورتی میں اضافہ کریں اور مستقل طور سے کریں ■■

گھریلو نسخے

اگر آپ کے کپڑوں پر سے پھلوں کے داغ نہ چھوٹیں تو ان داغوں کو بورکس پاؤڈر سے رگڑ دیں اور پھر کپڑے کو گرم پانی میں ڈبو دیں۔ اس کے بعد کپڑے کو دھولیں۔ کپڑا بالکل صاف ہوجائے گا۔

اگر براؤن چمڑے کے جوتوں پر داغ پڑجائیں تو ان کو کیلے کے چھلکے سے رگڑ دیں۔ اس کے بعد صاف کپڑے سے رگڑیں اور پھر پالش کرلیں۔ جوتے چمک جائیں گے۔

اگر آپ کو کسی ایسی جگہ جانا ہو جہاں مچھر بہت ہوں تو وہاں آپ سفید یا پیلے کپڑے پہن کر جائیں۔ ان رنگوں کی وجہ سے مچھر پاس نہیں آتے۔

❖ اگر دال یا سوپ میں نمک تیز ہوجائے تو کچے آلو کے چند ٹکڑے اس میں ڈال دیں۔ یہ ٹکڑے نہ صرف نمک کو جذب کرلیں گے، بلکہ دال یا سوپ کو ذائقہ دار بھی بنائیں گے۔

❖ چھلنی پر زنگ لگ جائے اور چھلنی آسانی سے نہ کھلے تو اس پر سرسوں کا تیل لگائیں چھلنی خود بخود ڈھیلی پڑجائے گی۔

❖ اگر قمیص میں لگی ہوئی زپ سخت پڑ جائے اور آسانی سے نہ کھلے یا بند نہ ہو تو پینسل کی نوک سے زپ کو رگڑیں۔ پھر زپ ٹھیک کام کرے گی۔

❖ المونیم کے برتن میں اگر کوئی چیز پکاتے ہوئے جل کر چپک جائے تو اس برتن میں ایک پیاز کاٹ کر اور پانی ڈال کر ابالیے ایسا کرنے سے تھوڑی دیر بعد برتن سے جلا ہوا کھانا چھوٹ جائے گا اور برتن بالکل صاف ہوجائے گا۔

❖ اگر آپ کی آواز بیٹھ جائے تو چراغ کا گل پان میں رکھ کر کھائیے آواز ٹھیک ہوجائے گی۔

❖ تھوڑی سی ادرک چبانے سے بھی آواز ٹھیک ہوجائے گی۔

دیس بدیس کا خبریا

انسان اور بندر، یادداشت کے ٹیسٹ میں برابر

بندر کی یادداشت اتنی ہی تیز ہوتی ہے جتنی انسان کی یہ بات ہوسٹن کے دو مشہور ماہرین نفسیات اسٹیفن سینڈز اور انیتھونی رائٹ نے تجربے سے ثابت کی ہے۔

ان ماہرین نے ایک پانچ سالہ بندر اور ایک ۱۲ سالہ گر بجویٹ لڑکی پر تجربہ کیا۔ انہوں نے پہلے بندر کو پھول پھل اور گھریلو استعمال کی چیزیں دکھائیں۔ پھر ماہرین نے اسے ان ہی چیزوں کی تصویریں سلائیڈوں کے ذریعہ گڈمڈ کر کے دکھائیں۔ جو چیز بندر پہلے دیکھ چکا تھا، اس کی تصویر دیکھ کر وہ اثبات میں گردن ہلا دیتا اور جو چیزیں اس نے نہیں دیکھی تھیں، ان کی تصویریں دیکھنے پر وہ نفی میں گردن ہلا دیتا۔ ٹیسٹ میں کل ۱۰ چیزیں رکھی گئی تھیں بندر نے کل مقررہ وقت میں سے ۸۶ فی صد وقت پہلے ٹیسٹ میں لیا اور دوسرے ٹیسٹ میں ۸۱ فی صد وقت لیا۔ اتنا ہی وقت لڑکی نے بھی لیا۔ اس تجربے سے ان ماہرین نے ثابت کر دیا کہ بندر کی یادداشت انسانی یادداشت سے کم تیز نہیں ہوتی۔ بڑی عمر کا بندر یادداشت کے معاملے میں تقریباً نوجوانی کی عمر میں قدم رکھتے ہوئے انسان کے برابر ہوتا ہے۔

آنکھوں سے پتھر جھڑتے ہیں

بنگلہ دیش میں ۹ سالہ حسنہ تارا کی بائیں آنکھ سے چھوٹے چھوٹے پتھر نکل رہے ہیں۔

۲ جنوری کو اس لڑکی کو ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے روزانہ ۷۰ چھوٹے چھوٹے، چاول کے دانے کی شکل کے پتھر نکل رہے تھے۔ اس کو آنکھوں میں درد ہونے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔

حسنہ تارا نے ڈاکٹروں کو بتایا کہ جب وہ اپنی آنکھیں مسلتی ہے تو ان میں سے سخت اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نکلتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد طالب نے بتایا کہ دنیا میں اپنی طرح کی یہ انوکھا واقعہ ہے۔

جڑواں بہنوں نے ۱۰۳واں جنم دن منایا

امریکہ کی سب سے بڑی عمر کی جڑواں بہنوں نے اس برس جنوری میں اپنا ۱۰۳واں جنم دن منایا۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک ایک دوسرے کو تحفظ اور پیار دینے والی ان دونوں بہنوں کی سلامتی کے لئے صدر ریگن نے بھی نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔

گینیز کے عالمی ریکارڈ والی کتاب کے مطابق ۵۰ کروڑ جڑواں اولاد میں صرف ایک جوڑے کے ۱۰۳ سال کی عمر تک پہنچنے کا امکان ہے۔ ان ۱۰۳ سالہ جڑواں بہنوں کے بیٹوں بیٹیوں، پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کی تعداد ۱۰۸ ہے۔ ان دونوں کی صحت اس عمر میں بھی اچھی ہے۔

جا کو رکھے سائیاں ......

دُبئی کے قریب بحرِ عرب میں ایک ہندوستانی مچھیرا ایک حادثے سے دوچار ہونے کے بعد ۱۰ دن تک لکڑی کے تختے پر تیرتا رہا۔ اس دوران اس نے صرف سمندر کا کھاری پانی پیا۔ آخر ایک جاپانی مال بردار جہاز نے اسے بچا لیا اور آج کل وہ دُبئی میں آرام کر رہا ہے۔

۲۷ سالہ مچھیرے پر بھاکرن نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اس کے چھ ساتھی سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ان مچھیروں کی کشتی ایک جہاز سے ٹکرا کر اُلٹ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک لکڑی کا تختہ پربھاکرن کی پکڑ میں آ گیا اور وہ اس لکڑی کے تختے پر کچھ کھائے بغیر دس دن تک سمندر کی لہروں کے درمیان تھپیڑے کھاتا رہا۔

پلکیں جھپکا جھپکا کر کتاب لکھ ڈالی

با نا یلا با نا نام کی یہ عورت نہ تو بول سکتی ہے اور نہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی ہے اس کی فرمائش پر اسے ایک مشین دی گئی جو کمپیوٹر سے مشابہ تھی۔ مشین کے اسکرین پر آنے والے حروف میں سے کسی بھی حرف کو وہ پلک جھپکا کر انفرا ریڈ کرن کے ذریعہ چن لیتی تھی اور فوراً یہ حرف کمپیوٹر میں چلا جاتا تھا۔ اسی طرح دو سال کے عرصہ میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔

بائیس منزلہ عمارت والا کیک

پچھلے دنوں بائیس منزلہ بلڈنگ کی شکل کا ایک کیک عوام کے لئے کشش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ کیک "نیل گری کیک نمائش" میں رکھا گیا تھا۔

نیل گری بیکری کے سربراہ رام چندر نے بتایا کہ بنگلور کی ایک مشہور بلڈنگ سے مشابہت رکھنے والے اس کیک کی تیاری میں ۲۰۰ کلو گرام چینی کی ضرورت پڑی تھی اور اسے تیار کرنے میں ۲۴۰ گھنٹے لگے تھے۔ چار آدمیوں نے اسے مل کر بنایا تھا۔ کیک کی لمبائی ساڑھے چھ فٹ سے بھی زیادہ ہے۔

اس "عمارتی کیک" کی کھڑکیاں ہری اور بنگنی رنگ کی ہیں اس کے کل تین حصے ہیں جنہیں جوڑ کر عمارت کی شکل بنائی گئی ہے۔

کیک میں ایک اسٹیڈیم بھی بنایا گیا ہے، جس میں دوڑتی ہوئی تین لڑکیاں دکھائی گئی ہیں۔ پی۔ ٹی۔ اوشا کو سب سے آگے دکھایا گیا ہے۔

نیلے رنگ کی جیپ، ہیلی کاپٹر، دکشا کر اڑنے والا سانپ گھڑی اور گل دستے بھی اس کیک میں بنائے گئے ہیں۔

کاش کتا آدمی ہوتا!

امریکہ کی ایک عدالت میں کتے کی طرف سے دائر کیا ہوا ایک مقدمہ یہ کہہ کر خارج کر دیا گیا کہ کتا آدمی نہیں ہے، اس لئے اسے کسی کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق نہیں ہے

ایری نام کا یہ ۱۵ سالہ کتا اندھا اور بہرا ہے۔ امریکی ایر لائن نے اسے بورڈنگ ٹکٹ دینے کے بعد بھی اسے کنویئر بیلٹ پر گھومتا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ جب کہ اس کے مالک جہاز سے روانہ ہو گئے تھے۔ اس بھٹکتے کی طرف سے اس کے مالک فبین اشاک نے مقدمہ دائر کر کے ۵ ہزار ڈالر جرمانے کا دعویٰ کیا۔ لیکن قانون میں صرف انسان مسافروں کو انصاف دلانے کی گنجائش تھی، حیوان مسافروں کو نہیں۔

کمپیوٹر ایجاد کرے گا ایک نئی زبان

احمد آباد میں ایک سائنس داں پر ایک ایسی نئی زبان ایجاد کرنے کی دھن سوار ہے جو آسان ہو۔ اس سے پہلے وہ کمپیوٹر کے ذریعہ انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کرنے کا طریقہ ایجاد کر چکے ہیں۔

نرکس لیبارٹری کے صدر ہمانشو مجمدار نے بتایا کہ کمپیوٹر کے ذریعہ ۹۵ فی صد صحیح ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ طریقہ ابھی کافی مہنگا ہے۔ ہیمانشو مجمدار نے اپنے کمپیوٹر کے کئی انوکھے کرتب دکھائے۔ تماشائیوں کے سامنے انہوں نے کمپیوٹر میں ایک کارڈ ڈالا جس پر کمپیوٹر کی زبان میں ایک جملہ نقش تھا۔ فوراً ہی اس کا بالکل صحیح ترجمہ پردے پر ظاہر ہو گیا مگر کسی شعری نثر پارہ یا گہرے مفہوم والے جملوں کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ کمپیوٹر نہیں کر سکتا۔ اس طریقے سے صرف عام جملوں کا مطلب ہی پردے پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

مجمدار نے بتایا کہ زبان سکھانے کے لئے کمپیوٹری ترجمہ بہت مددگار ثابت ہوگا۔ ابھی کمپیوٹری زبان کی بجائے عام بول چال کی زبان کا استعمال بہت بڑے کمپیوٹروں میں ہی ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف تجربے کے طور پر۔ تاہم: آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

دنیا کی سب سے لمبی ٹائی

اٹلی میں ایک طرف کو جھکی ہونے کی وجہ سے عالمی شہرت یافتہ اور عجیب و غریب "پیسا" مینار کو حال ہی میں ٹائی پہنائی گئی۔ اٹلی کے ایک کپڑے کے صنعت کار نے یہ ٹائی بنوائی ہے اور یہ دنیا کی سب سے لمبی ٹائی ہے۔ اس کی لمبائی ۹ر۲۴ میٹر ہے اور یہ اٹلی کے ترنگے جھنڈے کے تینوں رنگوں (لال، سفید اور ہرے) سے آراستہ ہے

گونگے بولیں گے

اندھے پڑھیں گے!

ایک ایسا الیکٹرونک آلہ ایجاد کیا گیا ہے جس کی مدد سے گونگے آدمی بات چیت کر سکیں گے اور اندھے آدمی پڑھ سکیں گے۔ یہ آلہ میسور کے "شری جے چاما راجیندر کالج آف انجینیئرنگ" کے الیکٹرونکس ڈیپارٹمنٹ کے طالب علموں نے بنایا ہے اور اس میں دوسری سہولتوں کے علاوہ ایک لاؤڈ اسپیکر اور ایک ٹائپ رائٹر بھی شامل ہے۔ اس ٹائپ رائٹر پر جو کچھ بھی گونگا آدمی ٹائپ کرے گا، وہ سب لاؤڈ اسپیکر بول دے گا۔

اس آلے کے ساتھ ایک اور آلہ جوڑ کر نابینا آدمی ابھرے ہوئے لفظوں (بریل) کے علاوہ عام تحریر بھی پڑھ سکتا ہے۔

۷۳ سال بعد

کھوئی ہوئی

بہن ملی!

فرانس میں ۸۰ سالہ فورڈ ڈیکو ۷۳ سال بعد آخر اپنی کھوئی ہوئی بہن مل ہی گئی۔

فورڈ کی بہن لوئی کینارڈ، جس کی عمر اب ۷۵ سال ہے، پہلی جنگِ عظیم سے قبل اپنے خاندان سے بچھڑ گئی تھی۔ برسوں گزر گئے، لیکن فورڈ اپنی ننھی بہن کو نہیں بھولا اور اسے تلاش کرنے کی دھن میں لگا رہا۔ اب آکر بچھڑی ہوئی بہن اسے ملی ہے۔

بزمِ بانو

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دل چسپ جوابات دیتی ہیں۔
ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں، صرف نام لکھنا کافی ہے۔
مدیرہ

بزمِ بانو
ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

شریندر ایس کمل، دھنباد

س : دوسروں کی بُرائی کرنے والے اپنی خود کی بُرائیوں پر نظر کیوں نہیں ڈالتے؟

ج : دوسروں کی بُرائیاں کرنے سے بیچاروں کو فرصت نہ ملتی ہوگی۔

ناہید شیلی، زینت شمسی، نگینہ

س : زندگی کو کام یاب بنانا ہو تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج : جانکاری، علم، دستکاری، سوجھ بوجھ یہی کام یابی کے سیدھے راستے ہیں۔ مگر بازار میں جُل، سٹّہ بازی اور سکہ چلتا ہے۔ مگر جو کام یابی ضمیر فروشی سے ملے اُسے سات سلام۔

بیرا احمد گدی، چکردھرپور

س : محبت کرنے سے انسان کیوں شاعر بن جاتا ہے؟

ج : ناچنے گانے بھی لگتا ہے اپنے شعر نہ کہہ پائے تو لاکھوں فلمی گیت موجود ہیں۔ پرندے چہچہاتے ہیں۔ مور ناچتے ہیں۔ قدرت کا یہی تقاضہ ہے کہ محبت زندگی میں ہل چل کا نام ہے۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س : تعلیمِ نسواں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : وہی جو مردوں کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ کہ جاہل لڑکیاں مردوں کے سر کا بوجھ ثابت ہوتی ہیں۔

ایس۔ کے۔ برہان الدین، ورنگل

س : محبت کی آخری حد کیا ہوگی؟

ج : زندگی کی آخری حد کہ محبت زندگی ہے۔ پتہ نہیں موت کے بعد محبت بھی مرتی ہے یا صرف صورت بدل جاتی ہے۔ اصل محبت وہ ہے جو نہ رشتے کی پابند ہے نہ کسی انعام کی جو بے لوث کی جائے

صدر الدین اکّاتا و اظہار عالم، سہسرام

س : کیا زندگی ایک نغمہ ہے؟

ج : نغمہ بھی ہے اور آہ و فغاں بھی۔

نجمہ ایوب، علی گڑھ

س : اگر پڑوس میں صرف بہن بھائی یا بہنیں بہنیں ہی بن کر رہیں تو صرف پڑوسی ہی بن کر کیوں رہ جاتی ہیں؟

ج : آپ انہیں کیا بنانا چاہتی ہیں۔ کھُل کے بے جھجک سوال کیجئے۔ "بانو" لڑکیوں کا رسالہ ہے۔ سوالات بڑی محتاط اور تکلف سے کئے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ہے تو فرضی نام لکھ دیجئے۔ سوال کھُل کے کیجئے۔ آپ کی ایڈیٹر روشن خیال ہیں۔ "بانو" مالی منافع کے لیئے نہیں اپنے شوق کے لئے نکالتی ہیں۔

محمد الیاس عروج، امروہہ

س : کیا پیار انسان کو پاگل کر دیتا ہے؟

ج : نہیں بھئی، پیار ہی تو اصل انسانیت ہے۔ عاشق و معشوق، آج تک ساری دُنیا کے دلوں میں جگمگا رہے ہیں۔ اگر وہ پاگل تھے تو خدا سب کو وہی لگن دے۔ جو جینے کے حق کے خاطر مر کر امر ہوئے۔

س : حقیقت اور کڑواہٹ میں کیا فرق ہے؟

ج : حقیقتیں کڑوی ہیں۔ دراصل ہر حقیقت زندگی کا اہم جز ہے۔

امتیاز علی نصرت، پدا پلی (کریم نگر)

س : زندگی کی وہ کون سی منزل ہے جہاں سانسوں میں پھولوں کی مہک اور آنکھوں میں سپنوں کی چمک ہوتی ہے؟

ج : جب تک جان میں جان ہے۔ صحت اچھی ہے جس کے لئے عمر کی قید زیادہ سخت نہیں۔ پھولوں کی مہک زندہ رہتی ہے۔ آنکھوں روشنی کم ہو تب بھی ذہنی چمک ماند نہیں پڑتی۔ زندگی کو ایک مہمان کی نظر سے دیکھئے۔ بڑی خوش رنگ ہے۔ اپنا تو یہ اصول ہے کہ آنے کی خوشی نہیں منائی تھی، جانے کا غم نہیں کریں گے۔

ارشد محمود، حیدرآباد

س : خوب صورتی پر کب نظر نہیں جاتی؟

ج : اپنی فکر میں ڈوبا ہوا انسان ایسا کھو جاتا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ دیکھتا ہے مگر سطحی طور پر۔ متاثر ہونے کی فرصت نہیں ملتی۔

آرزو بازید پوری، دھنباد (بہار)

س : ساس کو بہو کب اچھی لگتی ہے؟

ج : جب وہ ساس کو ماں سمجھتی ہے۔ عام طور پر لڑکیاں اپنی ماؤں سے نفرت کرتی ہیں۔ کہ وہ انہیں بیٹیوں سے کم تر سمجھتی ہیں۔ ایسی بیٹیاں ساس سے بھی نفرت کرتی ہوں گی۔ ساس خود چکر میں ہوتی ہے۔ پہلے میاں کے سہارے

پھر بیٹے کے سہارے جیتی ہے، ڈرتی ہے وہ بیٹے کو قبضے میں کرکے ساس کو نکلوا نہ دے۔ اس لئے اکثر خود حفاظتی میں بیٹے کو بہو سے بدظن کرنے لگتی ہے۔

رقیہ صمد، حیدرآباد ۲۴

س : سوشل سروس کا ذکر تو بہت ہوتا ہے۔ اصل میں یہ ہے کیا چیز؟

ج : حقیقت میں تو یہ خدمتِ خلق ہے۔ لیکن آج کل بڑے بڑے افسروں کی بیویاں تھوڑی شہرت کے لئے جھاڑو لے کر سڑک صاف کرتی ہوئی تصویر کھنچوا دیں۔ غریبوں کو اناج بانٹتی پھریں۔ یہ تصویریں جب وہ خود یا ان کے رشتے دار الیکشن میں کھڑے ہوں تو بہت کام آ سکتی ہیں۔ یہ سوشل سروس سب سرمایہ دار ملکوں میں ہوتی ہے۔

س : زندگی کیا ہر شکل میں پیاری ہوتی ہے؟

ج : ہونی تو چاہئے۔ جو جھیل نہیں پاتے ہیں خودکشی کر لیتے ہیں۔ کون روک سکتا ہے!

شبیر احمد گدی، چکر دھرپور (بہار)

س : کیا یہ سچ ہے کہ جس نے کسی کو مٹانے کی کوشش کی وہ خود مٹ گیا؟

ج : ہونا چاہئے۔ مگر آج کی دنیا میں تو زبردست کی ہر بات سچ ہے کب تک؟ کہ فرعون کی توڑ کے لئے قدرت موسیٰ بھی پیدا کرتی ہے۔ سانپ کے زہر ہی سے سانپ کے کاٹے کا علاج بھی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے سورما ختم ہو گئے مگر عام انسان موجود ہے۔ آخر میں اسی کی جیت ہوگی۔

ضیاء الدین ریاض۔ کریم نگر (اے۔پی)

س : عورت کا رتبہ بلند ہوتا ہے یا مرد کا؟

ج : جو بھی دونوں سے زیادہ تعلیم یافتہ عقلمند اور ذمہ دار ہو۔

س : کسی مفکر کا خیال ہے کہ عورت زہر کی پڑیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : مفکر کی ماں، بہن، بیوی، بیٹیاں اور رشتہ کی عورتیں ضرور زہر کی پڑیاں ہوں گی۔ اپنے مشاہدے کی بات کہہ رہا ہوگا۔ اُس نے آپ کے میرے اور دوسرے کروڑوں گھروں کی عورتوں کو کہاں دیکھا ہوگا؟ ضرور ٹھیک کہہ رہا ہوگا اپنے خاندان کی عورتوں کے بارے میں۔

س : اگر دشمن، دوستی کے لئے ترسنے لگے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج : کون کس کی دوستی کے لئے ترس رہا ہے، اگر آپ کا دشمن آپ کی دوستی کے لئے ترس رہا ہے تو اُس پر رحم فرمایئے۔

س : یہاں بھلائی کا صلہ برائی سے کیوں ملتا ہے؟

ج : بھلائی صلے کی خاطر ہو تو برائی اچھی! بھلائی کا سودا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن جو بھلائی کا جواب برائی سے دے اس سے دُوری بھلی۔

محمد شفیع، میسور

س : وہم کا کیا علاج ہے؟

ج : وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ ایک ذہنی بیماری ہے جس کا علاج نفسیات کے ماہرین ہی بخوبی کر سکتے ہیں۔

نسرین فاطمہ، الہ آباد

س : کیا انسان اپنی ساری خواہشات پوری کر سکتا ہے؟

ج : کوشش تو کروڑوں سال سے جاری ہے صرف مُردہ انسان کی خواہشات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ خواہشات نے ایجاد کی طرف مائل کیا۔ اور دنیا سنواری۔ ابھی تو اور دور جانا ہے۔ اگر ایٹمی جنگ کا خطرہ مٹ جائے تو دنیا کتنی حسین بن جائے۔ بڑے بڑے منصوبے دلوں میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

شوکت علی، ہزاری باغ

س : آج کل کے دور میں بیوی کی پوجا جائز ہے یا خدا کی؟

ج : بیوی بھی تو خدا کی دین ہوتی ہے۔ گھوم پھر کر ہر پوجا، وہ خواہ مولوی کی ہو، پنڈت یا پرست کی، اسی وحدہٗ لاشریک تک پہنچتی ہے۔ لوگ کتنے ہی مذہب اور فرقے بنائیں خدا تو ایک ہی ہے۔ اُس کی نظر میں سب اُس کے بندے ہیں۔ چاہے اُسے کسی نام سے پکاریں وہ سنتا ہے۔ اُس کے سب ہی پیغمبر مساوات اور اشتراک کا درس لے کر آئے۔

آفاق مضطر عمادی، بیگوسرائے (بہار)

س : دورِ حاضر کی عورتیں اپنی غیرت کھونے پر کیوں تُلی ہوئی ہیں؟

ج : سُنی سُنائی پر یا اوروں کے خاندان کی عورتوں کی فکر میں آپ کیوں گھلتے ہیں۔ پورے دورِ حاضر کی عورتوں کی نہیں اپنے خاندان کی عورتوں کو آپ ہی سمجھا سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت غلط طریقے پر ہوئی ہوگی۔

نعمت خوابکار، پراس ٹولہ، رانچی ۲

س : لوگ پیار چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ پیار کس سے ملتا ہے؟ ماں سے، بہن سے یا بیوی سے؟

ج : تینوں سے مختلف قسم کا پیار ملتا ہے۔ تینوں قسم کی محبت اپنی جگہ لازم ہے۔ اسے بڑے سوچ بچار اور جوابی پیار سے نبھانا چاہئے۔ اپنے خاندان کی عزت کیجئے تاکہ دنیا بھی اُس کی عزت کرے۔

س : عورت غلامی کی زنجیر سے کب آزاد ہوگی؟

ج : عورت جب تک مرد کی محتاج رہے گی اُسے غلامی سہنی پڑے گی۔

محمد مقصود ٹیلر، رحمت گنج، دھنباد

س : لوگ کہتے ہیں کہ زندگی چار دن کی ہے تو پھر سامان سینکڑوں دن کا کیوں؟

ج : دنیا تو کروڑوں برس سے ہے اور رہے گی سامان صرف اپنی ذات کے لئے ہی نہیں دنیا کے لئے کئے جاتے ہیں۔ وہ سائنس داں فنکار شاعر ادیب اپنے لئے نہیں دنیا کے لئے لکھتے ہیں۔ چاہے اس فن کی عمر چند لمحے ہو یا جاودانی۔ یہ دنیا ہی فیصلہ کرتی ہے۔ اگر اچھے اور اہم کام میں صرف ہو تو ایک گھڑی صدیوں پر بھاری ہوتی ہے کھانے پہننے، سونے اور کمانے میں عمر گزر جاتی ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

●●

باورچی خانہ

کابلی چنوں کی بریانی

کابلی چنے : ۲۵۰ گرام
چاول : ایک کلو
گوشت : آدھا کلو
کالا زیرہ : ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچیں : آدھا چائے کا چمچہ
بڑی الائچی : ۴ عدد
لونگیں : ۷ یا ۸ عدد
لہسن : ۱۰ جوے
پیاز : ۲۵۰ گرام
کھانے کا سوڈا : پاؤ سے کم چائے کا چمچہ
گھی : ۱۷۵ گرام
نمک : حسب ضرورت
رنگ (کھانے کا) : سرخ، سبز، پیلا (ایک ایک چٹکی)
دہی : ۲۵۰ گرام

کابلی چنوں کو دھو کر رات بھر بھگوئے رکھیں۔ صبح کو ایک چٹکی کھانے کا سوڈا، ایک لیٹر پانی اور ضرورت کے مطابق نمک ڈال کر چولھے پر ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب چنے گل جائیں تو انہیں اتار لیں۔

پاؤ بھر پیاز کو دو حصوں (آدھا آدھا پاؤ) میں برابر تقسیم کر لیں۔ آدھی پیاز کے باریک لچھے کر لیں اور آدھی پیاز کے موٹے موٹے ٹکڑے کر لیں۔

ایک پتیلی میں آدھا گھی ڈالیں اور چولھے پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہونے پر باریک کٹی ہوئی پیاز کو اس میں تل کر سنہرا کر کے نکال لیں۔ اب اسی گھی میں گوشت ڈال کر بھون لیں۔ حسب ضرورت نمک ڈال دیں، اور گوشت میں چار پیالی پانی ڈال دیں۔ اب اسی گوشت میں موٹی کٹی ہوئی پیاز، لہسن کے جوے، آدھا گرم مسالہ (ثابت) اور دو ہری مرچیں (ثابت) ململ کے کپڑے میں باندھ کر پتیلی میں ڈال دیں۔ اس گوشت کو ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب گوشت اچھی طرح گل جائے تو یخنی سے گوشت علیحدہ کر لیں اور
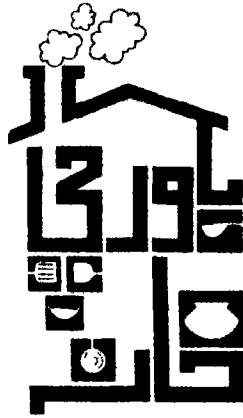
پوٹلی پھینک دیں۔

چاولوں کو چن کر دھو لیں اور ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ اب دوسری پتیلی میں باقی گھی ڈال دیں۔ اس میں بھنی ہوئی پیاز، گوشت اور دہی ڈالیں اور تینوں چیزوں کو بھون لیں۔ جب دہی کا پانی خشک ہو جائے تو بچا ہوا گرم مسالہ ڈال کر بھونیں۔ اب چاول پانی سے نکال کر اس میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی چنے بھی ڈال دیں اور تھوڑی دیر چمچہ چلائیں خیال رہے کہ چاول ٹوٹیں نہیں۔ اب اس میں تیار شدہ یخنی ڈال دیں، جو چائے کی تین پیالی کے قریب ہو۔ جب چاول گلنے کو ہو جائیں تو اس میں تھوڑے سے پانی کا چھینٹا دے کر ہلکی آنچ پر دم پر چھوڑ دیں۔ جب چاول تقریباً گل جائیں تو تین الگ الگ پیالیوں میں کھانے کے رنگ گھول کر چمچے سے تینوں رنگ چاولوں پر چھڑک دیں۔ تھوڑی دیر اور چاولوں کو دم دیں۔ اب بریانی بالکل تیار ہے۔

پنیر کے ٹوسٹ

ڈبل روٹی : ۵ سلائس
انڈے : ۲ عدد
پنیر : ۷۵ گرام
میدہ : ۲ میز کے چمچے
ہرا دھنیا : ایک گچھا (باریک کٹا ہوا)
ہری مرچ : دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
نمک، کالی مرچ : ذائقے کے مطابق
گھی یا تیل : تلنے کے لائق

ہر سلائس کے کنارے الگ کر لیں اور لمبائی میں بیچ میں سے کاٹ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر لیں۔

پنیر کو کدوکش میں کس لیں۔ انڈے ایک پیالے میں پھینٹ لیں۔ پھر اس میں میدہ چھان کر ملا دیں اور پھینٹتی رہیں، تاکہ گٹھلیاں نہ پڑیں۔ ساتھ میں کسا ہوا پنیر، ہرا دھنیا، ہری مرچ، نمک اور کالی مرچیں ملا دیں۔

اب اس گھول کو سلائس کے ایک طرف چمچے سے لگا دیں اور فرائنگ پان میں گھی گرم کر کے اس میں تل لیں۔ سنہرا ہونے پر رخ پلٹ دیں اور اس گھول کو اسی رخ پر لگا دیں۔ جب دوسرا رخ سنہرا ہو جائے تو سلائس کو گھی سے نکال لیں۔

گرم گرم سلائس ٹماٹر سوس کے ساتھ کھائیں۔ بہت مزہ دار لگیں گے۔

سبزی کے کٹلیٹ

آلو : ۲۵۰ گرام (الگ برتن میں ابال لیں)
ٹماٹر، گاجر، فریچ بین: (تھوڑی تھوڑی)
پیاز : ایک عدد (بڑا سائز)
ادرک : ایک انچ موٹا ٹکڑا
کھٹائی : ایک چائے کا چمچہ (پسی ہوئی)
کالی مرچ : آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالہ : ایک چائے کا چمچہ (پسا ہوا)
ہری مرچ : ۲ عدد چھوٹے سائز کی (باریک کاٹ لیں)

ہرا دھنیا : ایک گچھا (باریک کٹا ہوا)
سلائس : ۲ عدد
نمک : ذائقے کے مطابق

گاجر اور فرینچ بین کو چھیل کر پتلی پتلی کاٹ لیں۔ مٹر کو چھیل لیں اور اس میں نمک اور آدھا چمچہ (چائے کا) چینی ڈال کر ابال لیں۔ کم پانی میں ابالیں اور گل جانے پر باقی پانی الگ کر لیں۔ پیاز بالکل باریک کتر لیں۔ ادرک کو کدوکش میں کس لیں۔ ہری مرچ بھی باریک باریک کاٹ لیں۔

فرائی پان میں ایک میز کا چمچہ گھی ڈالیں۔ گرم ہونے پر کٹی ہوئی ادرک اور ہری مرچ ڈال دیں۔ ادرک بھربھری ہونے پر پیاز ڈال دیں۔ دو تین بار چمچہ چلائیں۔ اب باقی کٹی ہوئی سبزی ڈال دیں۔ کھٹائی ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔ پھر نمک اور گرم مسالہ ڈال کر چولھے سے فرائی پان اتار لیں۔

ڈبل روٹی کو الگ برتن میں بھگو دیں۔ آلوؤں کو چھیل کر اچھی طرح مسل لیں۔ پھر بھیگی ہوئی ڈبل روٹی کو پانی سے الگ کر کے آلوؤں میں ڈال کر اچھی طرح مسل لیں۔ کٹا ہوا ہرا دھنیا اور ہری مرچ ملا دیں۔

آلو کا مکسچر اور سبزی کا مکسچر برابر حصوں میں بانٹ لیں۔ ایک حصہ آلو کا مسالہ لیں اور اس کی ٹکیا بنا کر اس کے اندر سبزی والا مسالہ بھر دیں اور پھر اس کو آلو کے مسالے سے ڈھک دیں۔ اب ان ٹکیوں کو ایک فرائی پان میں گھی گرم کر کے اس میں تلیں۔ ہلکی براؤن ہونے پر پلٹ لیں۔ ساری ٹکیاں اسی طریقے سے بھر کر تلیں اور ٹماٹر سوس کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

میٹھے چاول

امرود : چار پانچ عدد (تازہ پکے ہوئے)
چینی : ۱۵۰ گرام
کشمش : ۲۵ گرام
بادام یا اخروٹ : ۸ یا ۱۰ گری
گلاب : چند بوندیں۔
نیبو : آدھا
باسمتی چاول : ۲۵۰ گرام
گھی : ایک ہنڈیا کا چمچہ
ورق چاندی کے : مرضی کے مطابق
تازہ ملائی : ایک کپ

چاول کو چن کر آدھے گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ پھر دھو کر ابال لیں جب ایک کنی رہ جائے تو چولھے سے اتار لیں اور فاضل پانی چاولوں سے الگ کر لیں۔ امرودوں کو کاٹ کر ایک پریشر کوکر میں ڈال دیں چینی اور دو کپ پانی ڈال کر پریشر کوکر کو بند کر کے آنچ پر رکھ دیں۔ پریشر آنے پر آنچ ہلکی کر دیں اور امرود بالکل گل جانے تک پکائیں۔ پھر چولھے سے اتار کر ٹھنڈا ہونے پر امرودوں کو اچھی طرح مسل لیں اور اس مکسچر کو باریک چھلنی میں چھان لیں۔

ایک چوڑے مونہہ کی پتیلی میں گھی گرم کریں۔ اس میں بادام اور کشمش ڈال کر ہلکا لال کریں۔ پھر اس میں ابلے ہوئے چاول ڈال دیں امرود کا رس چاولوں میں ملا دیں اور چمچہ خوب اچھی طرح چلائیں۔ اب نیبو کے رس کی چند بوندیں ان چاولوں میں ٹپکا دیں۔ پھر چاولوں کو بالکل دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ جب چاول بالکل نرم ہو جائیں تو چولھے سے اتار کر ان پر ملائی چھڑک دیں۔ اوپر سے گلاب کی چند بوندیں چھڑک دیں اور چاندی کا ورق لگا دیں۔ مرضی کے مطابق ٹھنڈا یا گرم کھائیں۔ بہت لذیذ لگیں گے۔

مکھانے کی پیسٹری

(اشیاء و وزن)

مکھانے : ۲۵۰ گرام
ڈبل روٹی کا پاؤڈر : ۱۰۰ گرام
کاجو : ۵۰ گرام
کھانے والا ہرا رنگ : ایک چٹکی
کھانے والا پیلا رنگ : ایک چٹکی
بڑھیا والا دہی : ۱۰۰ گرام
کھانے کا سوڈا : پاؤ چائے کا چمچہ
چینی : ۱۵۰ گرام
ملائی : ۵۰ گرام (فریج میں رکھ کر ٹھنڈی کر لیں)
مکھن : ۵۰ گرام (فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔
دیسی گھی یا مکھن : چار میز کے چمچے

مکھانوں کو صاف کر لیں۔ سخت مکھانے چھانٹ کر نکال دیں۔ چوڑے مونہہ کی پتیلی میں ڈال کر چند منٹ تک مکھانوں کو بھون لیں۔ دھیان رہے، مکھانے اس حد تک نہ بھونیں کہ وہ لال ہو جائیں۔ مکھانے جب کرارے ہو جائیں تو نکال لیں۔ اب مکھانوں کو سل پر (مرچوں والی نہ ہو) یا مکسی میں پیس لیں۔ پھر اس کو آٹے کی چھلنی سے چھان لیں۔

کاجوؤں کو بیچ میں سے چھیل کر لمبے ٹکڑے بنا لیں۔ دہی کی پوٹلی باندھ کر لٹکا دیں۔ ایک بھاری پیندے اور چوڑے مونہہ کی پتیلی میں دو میز کے چمچے دیسی گھی ڈال کر مکھانے کا پاؤڈر ڈال کر ہلکا گلابی بھون لیں۔ آنچ دھیمی رہے۔ اب الگ فرائی پان میں ایک میز کا چمچہ بھر گھی میں سوکھے گوسٹ کا چورا بھون لیں۔

چینی کو مہین پیس لیں۔ گوسٹ اور مکھانے کے پاؤڈر کو ٹھنڈا ہونے دیں اور پھر ملا دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر دونوں چیزوں میں ۱۰۰ گرام پسی ہوئی چینی، دہی، کھانے والا سوڈا، ایک چمچہ دیسی گھی ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ اب اس مکسچر میں دودھ کا چھینٹا دے کر اچھی طرح پھینٹ لیں تاکہ بالکل ملائی جیسا ہو جائے۔ یہ دھیان رہے کہ زیادہ نرم نہ ہونے پائے۔ اس تیار مکسچر کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ ایک حصے میں ہرا رنگ ملا دیں اور دوسرے میں پیلا۔ ہرے والے حصے کو گول پھیلا دیں۔ اس کے اوپر پیلے والے حصے کو پھیلا دیں اور اس کو بیک کر لیں۔

الگ پیالے میں مکھن اور ملائی ڈال کر اس میں ۵۰ گرام پسی ہوئی چینی ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب تیار مکسچر کو کچھ دیر ٹھنڈا کرنے کے بعد اس کے اوپر مکھن اور ملائی کو پھیلا دیں اور تین گھنٹے کے لئے فریج میں رکھ دیں۔ تین گھنٹے بعد فریج سے نکال کر مرضی کے مطابق ٹکڑے کر لیں اور ان پر سوکھا میوہ کاجو وغیرہ سجا دیں۔

"بانو" نئی دہلی

بستر کی دل کش بیل

یہ بیل بستر کی چادر کے چاروں کونوں پر بنائیں۔

پھول کے اندر سبز دائرہ، باہر سرخ اور پھر پیلا دائرہ بنائیں۔

ننھے ننھے دانے فرینچ ناٹ سے پیلے بنائیں۔ پھر ایک لائن سرخ اور دوسری لائن جامنی رنگ سے بنے گی پتیاں سبز رنگ کی ہوں گی۔

لیکن ان کے اندر زرد رنگ لگے گا۔

باہر فرینچ ناٹ سے دانے نسواری رنگ کے بنیں گے۔
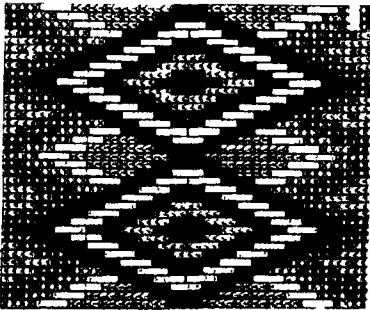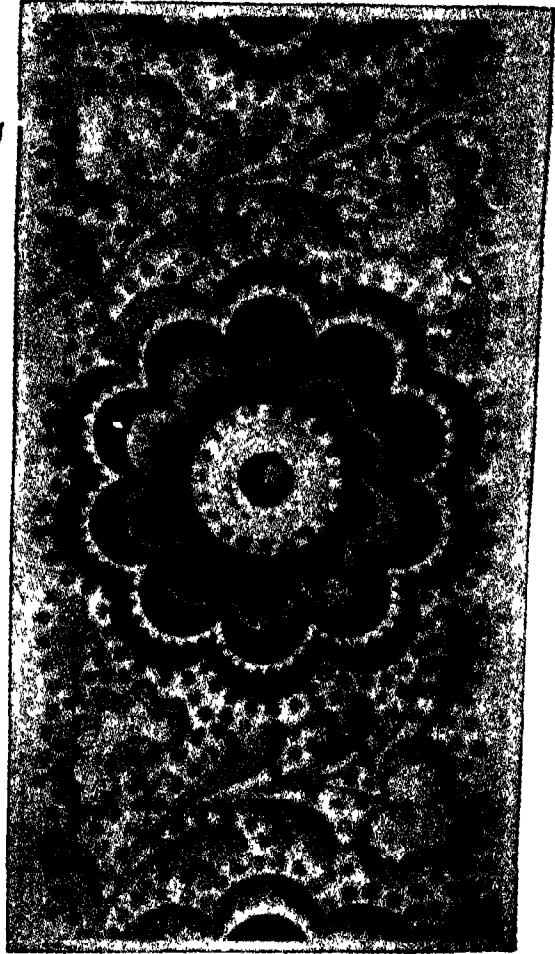
کراسٹچ میں بیل

یہ بیل مندرجہ ذیل رنگوں سے بستر کی چادر کے چاروں طرف بنائیں۔

پہلا انعام : درست حل پر : (۲۲ کیرٹ، زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر ۔ **آٹھ ہزار روپے**

Rs 20,000.00

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر، یا شمع ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعے ادا کی جاسکتی ہے۔ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہوسکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مِنی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ۔ ہفتہ ۲۱۔ مارچ ۱۹۸۷، آٹھ بجے رات تک پیر ۲۳۔ مارچ ۱۹۸۷ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کرلئے جائیں گے۔

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۳۶

ے	ن	ا		ڑ		■
ی	ت	س			■	م
س	ت		ب	■		
	ل	م	■	س		
	ل	■	ط		ا	م
■	■		س		ن	و
■	■	س		ی	ا	ن

اشارے :

دائیں سے بائیں :

۱۔ کشیدگی کے ماحول میں جلوس جلسے اختلافات کو —— کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اگر ہم

۲۔ ہر مذہب نے —— اور صلح جوئی کا سبق دیا ہے۔ اس کے باوجود

۳۔ بیوقوف نہ بنو۔ اپنے سے —— لوگوں کی نقل کرتے وقت یہ بھی سوچو کہ

۴۔ یہ —— کی خوش نصیبی تھی کہ آزادی کی جدوجہد کو بیغرض رہنما ملے اور

۵۔ دل دو یں نقد —— ، ساقی سے گر سودا کیا چاہے

اوپر سے نیچے :

۶۔ کہ —— بازار میں، ساغر متاعِ دست گرداں ہے

۷۔ عجائب گھروں میں بھی ہر —— کے لباس زیور ہتھیار وغیرہ جمع رہتے ہیں

۸۔ دوسری طرف وہ —— ہری لڑکی تھی۔ بھوکی اور بیمار

۹۔ روپیہ —— تو کوئی مارواڑی بنیوں سے سیکھے۔ ہم اور آپ

۱۰۔ جدھر دیکھو عدالتوں میں —— گواہوں وکیلوں اور پولیس والوں کی بھیڑ ہے

●●

شمع ادبی معمے (شمع مِنی معمہ نمبر ۱۳۶) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۳۶ کا صحیح حل بدھ : ۲۵۔ مارچ ۱۹۸۷ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہنامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع (نئی دہلی) میں بھی شائع کی جاسکتی ہیں

- ★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!
- ★ جتنے حل بھی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقدناموں سے بھیج سکتے ہیں۔
- ★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں — فیس داخلہ فی حل صرف —
- ★ ایک روپیہ۔
- ★ صرف دس اشارے انعام پانا کس قدر آسان!
- ★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کئے جاسکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔
- ★ صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہ ماہنامہ بانو یا ماہنامہ شمع میں دیکھئے
- ★ شمع مِنی معمہ نمبر ۱۳۶ کا نتیجہ ماہنامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

BANO New Delhi 40th Year of Publication ISSUE NO. 480 Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 741/57 Regd. No. D-(C) 120

حسد کا جذبہ انسان کو ہروقت غمگین رکھتا ہے کیوں کہ حسد نفس کا خطرناک ہتھیار ہے۔ حاسد کو نفس ہروقت اپنے تابع رکھتا ہے۔ حسد کرنے والے کے کان بہرے ہوجاتے ہیں اور عقل دیوانی ہوجاتی ہے۔

حاسد غیر شعوری طور پر اللہ کے فیصلے کی مخالفت کرتا ہے اور خود کو حقیقت کے خلاف جدّوجہد میں ہروقت مبتلا رکھتا ہے۔ اس کی یہ عادت اس کو قلبی سکون سے محروم کر دیتی ہے اور وہ بے چینی میں مبتلا رہتا ہے۔ ایسے انسان کی نیکیاں بھی حسد کی آگ میں جل کر راکھ ہوجاتی ہیں۔

ابلیس نے حضرت آدمؑ سے حسد کیا اور اپنی نعمت گنوا بیٹھا۔ انسان جب حسد کا شکار ہوتا ہے تو وہ دوسروں کی اچھائیاں دیکھ کر کُڑھتا رہتا ہے، اپنی کمزوریاں دُور کر کے اپنی شخصیت کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتا، اس طرح اس کی نظر اچھائیوں کے بجائے صرف بُرائیوں کی طرف رہتی ہے۔ انسان اگر ترقی، بہتری اور فلاح چاہتا ہے تو اُسے اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی اچھائیوں کی طرف دیکھنا چاہئے۔

اگر انسان اپنے حسد کے جذبہ کو رشک کے جذبہ میں تبدیل کرے تو یہ اس کے لئے ایک اچھا قدم ہوگا۔

سعدیہ دہلوی

مارچ ۱۹۸۷

بہ یادگار : یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی : زینت کوثر دہلوی
مدیرہ : سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر : شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اکتالیسواں سال، ۴۸۱واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت : چار روپے
سالانہ قیمت : اڑتالیس روپے

مقام اشاعت و صدر دفاتر : آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ : شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس : (031) 61601 SHMA IN
ٹیلی فون : 732668 732667 732666
دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان : شمع میگزین
طابع و ناشر : محمد یونس دہلوی

مطبوعہ : شمع پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲

محترمہ باجی صاحبہ :

سب سے پہلے تو آپ میری دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ "بانو" کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کی تعریف کروں یا 'بانو' کی۔ خیر! ویسے تو 'بانو' خواتین کے لئے مخصوص نہیں ہے مگر پھر بھی میں اسے چوری چوری پڑھنے پر مجبور رہتا ہوں میری بڑی بہن مجھے ڈانٹنے لگتی ہیں کہ بانو عورتوں کا رسالہ ہے، اس میں مردوں کو کوئی دل چسپی نہیں ہونا چاہئے۔ کیا یہ سچ ہے؟

اس بار پھر بانو بہت ہی عمدہ مضامین کے ساتھ وارد ہوا۔ تمام قلم کاروں کو میری طرف سے مبارک باد۔

الطاف احمد سہیل ویلور

● "بانو" تو مردوں میں بھی بہت مقبول ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ 'بانو' کا مطالعہ کرتے ہیں، کیوں کہ ہم جن مسائل کا ذکر کرتے ہیں، وہ مردوں کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔
آپ اپنی باجی کا پتہ ہمیں لکھ بھیجیں ہم ان کو سمجھا دیں گے۔ (مدیرہ)

سعدیہ باجی :

فروری کا بانو نظر نواز ہوا۔ مجھے بانو کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ویسے انتظار کسی کا بھی ہو، خاصا جان لیوا ہوتا ہے۔ لیکن 'بانو' کے دست یاب ہونے ہی تمام شکایتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ رسالے کی کم قیمت پر تعجب ہے۔ ان دنوں جب ہر چیز کے دام اونچے ہو گئے ہیں، کسی رسالے کو اتنے سلیقے سے ترتیب دینا اتنے اچھے کاغذ پر چھپوانا اور خوب صورت سرورق کے ساتھ اردو ادب کے بازار میں لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

آپ ہر شمارے میں "افتتاحیہ" اور اکثر شماروں میں "سفرنامہ" خوب لکھتی ہیں۔ "افتتاحیہ" کے ذریعہ آپ سمندر کو کوزے میں بند کرتی ہیں اور "سفرنامے" کے ذریعہ
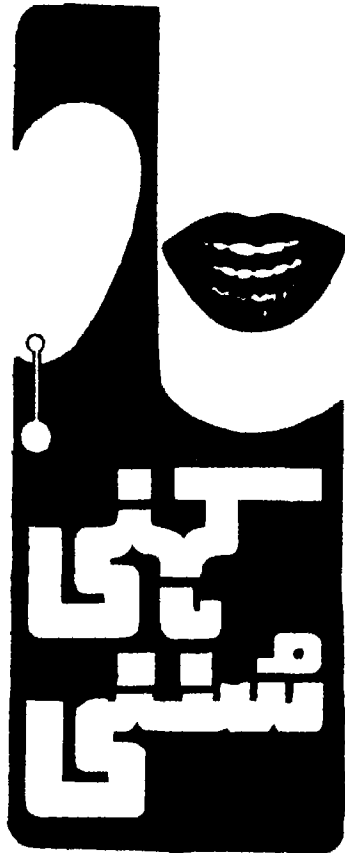
قارئین کو ہم سفر بنا کر اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ یہ صلاحیت کہاں سے پائی آپ نے؟

اس بار رفاقت جاوید کی کہانی "سراب" دل پر ایک نقش چھوڑ گئی۔ ثوبیہ کی طرح اگر ہر لڑکی عزم کے ساتھ آنے والی مشکل کو حل کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائے تو وہ یہ ثابت کر سکتی ہے کہ

زمانہ ہم سے ہے ماحول ہم بناتے ہیں

فرلیس ترنم، سرپور کاغذ نگر،

● لیجئے، آپ کے لئے ایک اور سفرنامہ پیش ہے۔ امید ہے اورنگ آباد کی سیر پسند کریں گی۔ (مدیرہ)

بہن سعدیہ :

آج پہلی بار میں نے بانو کو اس وقت ہاتھ میں لیا جب ہوڑہ اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ میں کٹر مذہبی آدمی ہوں، اس لئے ادبی رسالے کم ہی پڑھا کرتا ہوں۔ مگر میری خاصیت یہ بھی ہے کہ جس کتاب یا رسالے کو اٹھاتا ہوں ختم کئے بغیر نہیں رہتا۔ ہوڑہ سے درگاپور تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ اس درمیان بانو کی ایک ایک سطر پڑھ گیا۔ رسالہ مجھے بہت پسند آیا۔ فحش تصویروں سے خالی کچھ ادبی، کچھ معلوماتی، کچھ دینی پہلو لئے ہوئے بانو وقت کا معیاری اور منفرد رسالہ نظر آیا۔ گاڑی چونکہ لیٹ تھی، اس لئے قلم اٹھایا اور چلتی ٹرین سے خط لکھ رہا ہوں۔

بشریٰ رحمٰن کا افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں اسے کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ویسے تمام مضامین اچھے ہیں اور مضمون نگار قابلِ مبارک باد۔ (الیس۔ احمد مظفر پوری درگاپور، بردوان)

● اللہ کرے ہر سفر میں اسی طرح آپ کی ٹرین لیٹ ہوتی رہے، تاکہ آپ 'بانو' کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں اور اپنی رائے ہمیں لکھیں۔

(مدیرہ)

عزیزی سعدیہ :

فروری کا بانو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ تمام مضامین پڑھنے کے بعد ذہن کی کسوٹی پر پرکھا تو ہمیں آپ کا مضمون "کشمیر میں امیدوں کا نیا موسم" بہت پسند آیا۔ اس اندازِ تحریر پر میری جانب سے مبارک باد قبول کریں۔ پھر دوسری مبارک باد اپنے برادرِ عزیز کی شادی پر قبول فرمائیں۔ خدا دولہا اور دلہن کو ازدواجی زندگی کو ہمیشہ خوش گوار مراحل سے ہم کنار کرے۔

دائم مختار احمد کلکتہ

● مبارک باد کا شکریہ۔ (مدیرہ)

سعدیہ صاحبہ :

فروری کا بانو ہاتھ میں ہے۔ سب سے

پہلے ہم نے آپ کا افتتاحیہ پڑھا، جو واقعی بہت پُراثر ہے۔ کیا ہم آپ سے پُوچھ سکتے ہیں کہ آپ نے اتنی کم عمر میں اتنی اچھی اچھی باتیں کہاں سے سیکھیں؟

ہم آپ کو ٹی۔ وی سیریل "زندگی زندگی" میں آنے پر بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ پہلے تو آپ کو صرف چھپی ہوئی تصویروں میں دیکھتے تھے، اب آپ کو اسکرین پر بھی دیکھ رہے ہیں۔ کیا کہنے آپ کی ایکٹنگ کے! آپ نے نرس کا رول بہت عمدہ کیا ہے۔ ہمیں تو سب سے جان دار ایکٹنگ آپ ہی کی لگی۔ ہم سب آپ کا پروگرام بہت اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔

(سلمیٰ ناز، حیدرآباد)

● اداکاری کے میدان میں یہ ہماری پہلی کاوش تھی۔ اپنے خیال میں تو ہم نے بس واجبی سا کام کیا ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو پسند آیا ہے تو اس سے ہماری یقیناً حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔
(مدیرہ)

باجی سعدیہ صاحبہ:

'بانو' کے ایک ایک لفظ کا مطالعہ اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ بانو آپ کی سرپرستی میں خوب نکھر رہا ہے۔ آپ کے خیالات، جذبات اور احساسات کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔

اس بار "کہنی سننی" میں سروری عالم نے "منے کو پیار" لکھا اور جواباً آپ نے لکھا "اور ہاں، آپ کس منے کی بات کر رہی ہیں؟ ہمارا تو صرف ایک بہت پیارا بھتیجا ہے" (مدیرہ)۔ لفظ 'صرف' پر میں چونک سی گئی اور رہ رہ کر دل میں ایک سوال جنم لینے لگا۔ پھر وہ سوال نوکِ قلم پر آگیا۔

پیاری باجی آپ بُرا نہ مانیں تو مزید دریافت کروں کہ آپ نے ازدواجی زندگی میں قدم رکھا ہے کہ نہیں؟

(نازعسکری، بودھن)

● بانو نوازی کا شکریہ۔ فی الحال ہم غیرازدواجی زندگی میں ہی مگن ہیں۔ مصروفیات اتنی ہیں کہ شادی کا خیال ہی نہیں آتا۔ (مدیرہ)

سعدیہ صاحبہ:

بانو کے صفحات پر آپ کی تحریریں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں، جن کے ذریعہ قارئین کو ایک درس بھی ملتا ہے۔ خاص طور سے افتتاحیہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کے اندازِ تحریر سے متاثر ہونے کے بعد ٹی وی کے اسکرین پر سیریل "زندگی زندگی" کے ذریعہ سسٹر طاہرہ کے کردار میں آپ کو دیکھنے کے بعد آپ کی اداکارانہ صلاحیتوں کا انکشاف ہوا۔ خوب صورت "ڈائیلاگس" کو پُراثر انداز میں جس بہتر ڈھنگ سے آپ "زندگی زندگی" میں ادا کر رہی ہیں اس کے لئے مبارک باد۔

فروری کے بانو میں آپ کا کشمیر کا سفرنامہ پسند آیا۔ نعیم صبا کی کہانی "پہلے وہ" دل چسپ رہی۔ نجم السحر صدیقی اور رباب وآر کی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ "خیال اپنا اپنا" اور "ذہنی ورزش" کے بغیر بانو کے صفحات کچھ سُونے سُونے سے لگتے ہیں۔

متین صدیقی، حیدرآباد

● آپ کو ہمارا کام پسند آتا ہے تو بس اس سے ہماری محنت وصول ہو جاتی ہے
(مدیرہ)

محترمہ:

واہ! آپ کا سفرنامہ بہت دل چسپ رہا۔ "کشمیر میں اُمیدوں کا نیا موسم" دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ فروری کے بانو میں تمام مضامین پسند آئے۔ مگر آپ کا سفرنامہ سب سے زیادہ اچھا لگا۔

(محمد الطاف الدین، نرمل اے پی)

● اللہ کرے ہمارا اور آپ کا دل اسی طرح باغ باغ ہوتا رہے۔ (مدیرہ)

عزیزی سعدیہ دہلوی:

ڈھیروں دعائیں۔ اس طرزِ تخاطب پر چونکئے نہیں۔ میں عزیزی بشریٰ رحمٰن (لاہور پاکستان) کا مُونہہ بولا بڑا بھائی ہوں۔ یونس بھائی، ادریس بھائی اور بہن زینت کوثر سے میں مل چکا ہوں۔ یونس "زندگی زندگی" میں سسٹر کے رول میں آپ کی اداکاری پر مبارک باد بھی دے چکا ہوں اب آپ کو بھی مبارک باد دے رہا ہوں۔

یونس بھائی نے مجھے بانو کا پچھلا سالنامہ اور بانو کی ایک کاپی بھی دی تھی، جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور پر آپ کا لکھا ہوا افتتاحیہ بہت پسند آیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ میرے پاس تو سوا دعاؤں کے اور کچھ نہیں ہے وہی پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر او۔ پی۔ کپور، ریواڑی)

● آپ نے تو ہمیں سب سے بیش بہا سوغات دی ہے۔ دعاؤں سے بڑھ کر دنیا میں کچھ نہیں۔
(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

فروری کا بانو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس میں سب ہی افسانے نظمیں اور دیگر مضامین بہت پسند آئے۔ خاص طور سے "تبسم" اور بشریٰ رحمٰن کی قسط وار کہانی "لگن" بہت اچھی لگی۔ میری جانب سے سب قلم کاروں کو دلی مبارک باد پیش کر دیں۔

(محمد ظہیر الدین ساحر، نرمل)

● آپ کی مبارک باد ہمارے قلم کار خود ہی پڑھ لیں گے۔ (مدیرہ)

بہن سعدیہ:

فروری کا بانو ملا۔ تمام مضامین پسند کئے افتتاحیہ تو بانو کی جان ہوتا ہے۔ اس بار تو افسانے پڑھنے کو کچھ زیادہ ہی مل گئے اور سب ہی پسند آئے۔

(یاسمین سلیم، رامپور)

● فروری کا شمارہ آپ کو پسند آیا شکریہ!
(مدیرہ)

●●

مئی میں جلوہ نما ہو رہا ہے

بہار کی طرح رنگا رنگ ۔ کھلی ، سنہری دھوپ کی طرح حیات بخش ۔ سمندر کی طرح ولولہ انگیز ۔ بانو کا سال نامہ ذہن کو ایک نئے اُفق سے روشناس کرائے گا ۔ شخصیت اور شعور کو نکھارنے سنوارنے میں مدد کرے گا ۔ بچّوں کی بہتر تربیت اور گھر کو جنّت بنانے میں معاون ہوگا ، مہینوں تک مطالعہ کے بے پناہ لُطف کا سرچشمہ ثابت ہوگا ۔ ہندوستان پاکستان اور دوسرے ملکوں کے بلند پایہ قلم کار اس جگمگاتی محفل میں یک جا ہو رہے ہیں ۔

سال نامہ کی قیمت ۱۵ (Rs.15/-) روپے ہوگی ۔ لیکن سالانہ خریداروں کو یہ نادر تحفہ مفت پیش کیا جائے گا ۔ سال نامہ رجسٹری سے منگوانے کے لئے سالانہ خریداری نمبر کے حوالے کے ساتھ چار روپے (Rs. 5/=) منی آرڈر سے جلد بھیج دیں ۔ نئے خریدار بھی یہ شان دار تحفہ مُفت حاصل کرنے کے لئے ترپن روپے (Rs. 53/=) سالانہ قیمت ارسال فرمائیں (جس میں سال نامہ کا رجسٹری خرچ شامل ہے) ۔ پُرانے اور نئے خریدار منی آرڈر بھیج کر ڈاک خانے سے ملنے والی منی آرڈر رسید ہمیں بھیج دیں ، تاکہ ان کے ارشاد کی تعمیل کی جا سکے

ماہ نامہ بانو ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سفر صدیوں کی راہوں کا

سعدیہ دہلوی
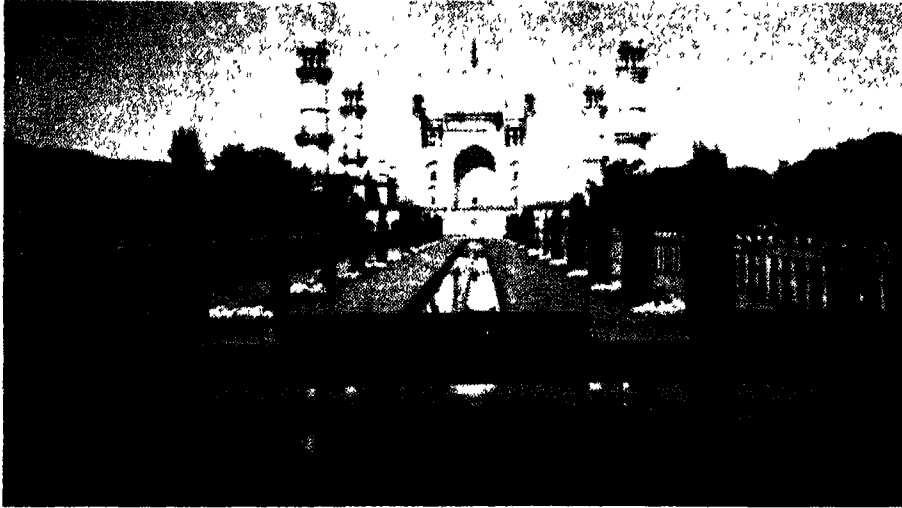
▲ اورنگ آباد میں بی بی کا مقبرہ

غالب نے کہا تھا:

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

ہم پر یہ مصرع کچھ ترمیم کے ساتھ اس طرح چسپاں ہوتا ہے،

تقریب کچھ تو بہرِ سفر ہم کو چاہئے

اَب کی بار (دسمبر میں) وزیراعظم راجیو گاندھی اور شرد پوار یعنی کانگریس آئی اور کانگریس ایس کے ملاپ کی تقریب ہمیں اورنگ آباد لے گئی۔ سیاست کے جراثیم ہم کو پہلے ہی کاٹ چکے ہیں اور اس میدان کی خاک چھاننے میں بھی ہمیں بہت مزہ آرہا ہے۔ ویسے تو ہمارا ذاتی خیال ہے کہ سیاسی سوجھ بوجھ اپنے اندر پیدا کرنا ہر عورت کی ذمہ داری ہے اور ہم عورتوں کی ترقی کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم سیاسی سرگرمیوں میں شریک رہیں۔ اورنگ آباد کی یہ تقریب کسی شادی سے کم نہ تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی رونق تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس ملاپ کی گواہی دینے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ بینڈ باجا گانا بجانا سب کچھ چل رہا تھا۔ اسی پنڈال میں لوگ ڈھولک کی تال پر ناچ بھی

▼ اورنگ زیب کے مزار کا ایک منظر

▲ ایلورا کے غار کا ایک گوشہ

رہے تھے۔ وزیر اعظم کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان کے آنے کا وقت قریب آنے پر ایک جہاز اوپر سے گزرا تو ہر طرف تالیاں گونج اٹھیں۔ یہ وزیر اعظم کا ہی جہاز تھا کیونکہ اُن کے آنے کے وقت کوئی اور جہاز فضا میں نہیں منڈلا سکتا۔ وزیر اعظم کو ہوا میں ہی نہیں زمین پر بھی کوئی مسئلہ پریشان نہیں کرتا، کیونکہ ان سڑکوں پر ساری سرگرمیاں روک دی جاتی ہیں، جہاں سے وزیر اعظم کی سواری گزرتی ہے

تھوڑی دیر میں وزیر اعظم پوری پارٹی کے ساتھ پنڈال میں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور خصوصی مہمان ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی تھے۔ جناب شرد پوار بھی ساتھ تھے۔ یہاں آئے ہوئے مہمانوں کو ریڈ کارپیٹ ویلکم۔ (سرخ قالین کے ساتھ استقبال) دیا گیا۔ تینوں لیڈروں کی دستار پوشی ہوئی۔ ہلکے جوگیا رنگ کی پگڑی باندھے جناب راجیو گاندھی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ بہت پچ رہے تھے۔ پھر یہ

▼ غار کی فنکارانہ سنگ تراشی کا ایک نمونہ

تینوں ایک اونچے پنڈال میں بیٹھے اور یہیں سے عوام سے مخاطب ہوئے۔ ملک کے مختلف مسئلوں کا ذکر ہوا۔ تقریب ہر لحاظ سے کامیاب رہی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کی پارٹی بمبئی کے لئے روانہ ہو گئی اور ہم اِس تاریخی شہر کو دیکھنے چل نکلے۔

اورنگ آباد مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ ان کی عمر کا بڑا حصہ دکن کی لڑائیوں میں گزرا تھا۔ اس شہر کا نام پہلے کھڑکی تھا۔ دولت آباد کا راستہ یہیں سے تھا۔ اسی شہر میں مشہور زمانہ سنگ تراشی کے غار اجنتا ایلورا ہیں۔ اورنگ آباد میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ تاج محل کی نقل تک موجود ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ باقی سب کچھ پہلے ہی دیکھ لینا چاہئے، اور یہ غار آخر میں دیکھنے چاہئیں کیونکہ سنگ تراشی کے ایسے دل کش اور نادر نمونے دیکھنے کے بعد آنکھوں میں اور کچھ نہیں جچتا۔ ہم بھی پہلے آپ کو دوسری عمارتیں دکھائیں گے۔

باباشاہ مظفر اس شہر کے مشہور بزرگ تھے۔ اُن کی یاد میں پن چکی تعمیر کی گئی۔ یہ پن چکی کی عمارت ان ہی بزرگ کی درگاہ کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

یہاں سے ہم 'بی بی' کا مقبرہ دیکھنے گئے۔ اورنگ زیب نے یہ مقبرہ اپنی اہلیہ رابعہ درّانی کی یاد میں بنوایا تھا۔ پتہ نہیں اورنگ زیب کو اپنی بیوی سے کچھ زیادہ محبت نہ تھی یا اُن کے ماہر تعمیر اچھے نہ تھے۔ بہر حال یہ مقبرہ اورنگ زیب کے والد شاہ جہاں کے بنوائے ہوئے تاج محل کی ایک نہایت بُری نقل ہے۔ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ یہ تاج محل کی بے حرمتی ہے۔ اس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے۔

A POOR MAN'S TAJ MAHAL

(ایک غریب کا تاج محل)

ہم اورنگ زیب کے مزار پر فاتحہ بھی پڑھنے گئے۔

شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ،
چو آہنگ رفتن کند جان پاک
چہ برتخت مردن چہ بروئے خاک
یہ مزار اورنگ زیب کے سادگی پسند مزاج کا اظہار کرتا ہے ۔ یہ سنگ مرمر کا مزار اورنگ زیب کی خواہش کے مطابق آج تک گنبد کی آرائش سے خالی ہے ۔ مزار کے بیچوں بیچ چھوٹا سا تلسی کا پیڑ لگا ہوا ہے ۔ یہ بھی بادشاہ کی خواہش کے مطابق لگایا گیا تھا ۔ اورنگ زیب کی وفات جمعہ کے دن ۲ فروری ۱۷۰۷ کو اسی شہر میں ہوئی تھی ۔ ان کا مزار ان کے پیرو مرشد حضرت زین الدینؒ کی درگاہ سے ملا ہوا ہے کسی بادشاہ کے مزار پر جا کر کچھ عبرت ہی حاصل ہوتی ہے ۔ اس مقام پر آکر جب انسانی وجود ختم ہو جاتا ہے ، سب فرق مٹ جاتے ہیں ، سب گھمنڈ ٹوٹ جاتے ہیں ۔

اورنگ زیب کو ناروا حد تک بدنام کیا گیا ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہایت پرہیزگار انسان تھا ۔ بیت المال کی دولت وہ ذاتی خرچ کے لئے نہیں استعمال کرتا تھا ۔ وہ ٹوپیاں سی کر اس کی آمدنی سے اپنا خرچ پورا کرتا تھا اور غریب عوام کی مدد بھی کرتا تھا ۔ اپنے ورثے میں اس نے ۳۰۵ روپے کا ذکر بھی کیا ہے جو اس کو اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن شریف کے ہدیہ کے طور پر ملے تھے ۔ ان کے ساتھ ساڑھے چار روپے جو ٹوپیوں کی آمدنی بچی تھی اُس نے اسے بھی عوام کی نذر کر دیا تھا ۔

اورنگ زیب پر کٹر مذہبی ہونے کا الزام بھی کافی حد تک غلط ہے ۔ آج بھی اس کے فرمان نیشنل آرکائیوز میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے مندروں اور گردواروں کو بھی بڑی رقمیں اور جاگیریں دی تھیں ۔ اورنگ زیب نے پہلے سے پیشن گوئی کر دی تھی کہ اس کے بعد ہندوستان میں فسادات ہی فسادات ہوں گے ۔ ہمیں تو یہ بھی خیال آتا ہے کہ نیکی کی طرف اتنا مائل ہونے

▲ ایلورا کے غار کا ایک ہال

والا شخص اپنے باپ کو قید میں کیسے رکھ سکتا تھا ؟ لیکن بہرحال یہ بھی حقیقت ہے اور اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اس نے اپنے بڑے بھائیوں پر بڑے ظلم کئے تھے ۔ انگریزی میں کہاوت ہے KINGSHIP KNOWS NO KINSHIP (بادشاہت رشتوں کو نہیں مانتی) یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے ۔ باقی اللہ جانے ۔

دوسرے دن ہم ایلورا گئے ، جو اورنگ آباد سے ۱۸ میل دور ہے ۔ ان گپھاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ان کا منظر حقیقت نہیں لگتا ۔ ہم کچھ حیرت میں پڑ گئے اور جب اندر داخل ہوئے تو یہ حیرت اور بھی بڑھتی گئی ۔ یہ گپھائیں ، بدھ ، جین اور ہندو ثقافتوں کا ایک حسین سنگم ہیں ۔ ہر مذہب کا اپنا ہی رنگ تھا ۔ اسی لئے یہاں ہمیں طرح طرح کے نمونے ایک ساتھ ملتے ہیں ۔

▼ ایلورا کے غار کا ایک اور منظر

▲ ایلورا کی ایک بلند دیوار

اِن گپھاؤں کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ ان کا ۷۰۰ قبل مسیح سے آغاز ہوا اور ۸۰۰ء تک مختلف ادوار میں ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں سب سے اونچا غار ۱۷ فٹ اونچا ہے۔ اس کی چوڑائی ۵۶ فٹ ہے۔ کہیں ہال کی شکل نظر آتی ہے اور کہیں مندر کی۔ ایک پتھر سے بنے ہوئے یہ ستون، خوب صورت چھتیں اور دیواریں کمالِ فن سے انسان کو دنگ کردیتی ہیں۔

ہم ایک گپھا سے دوسری گپھا میں اترتے گئے اور سوچتے رہے کہ ہم پہلے کیوں نہ آئے۔ آج کے دَور میں بہترین دماغ نیوکلیائی بم بنانے میں لگے ہوئے ہیں جو ساری دُنیا کی تباہی کا خطرہ بنے ہوئے ہیں اور ایک یہ لوگ تھے جنہوں نے عقیدت اور تخیل سے اس عبادت گاہ میں پتھروں میں شاعری کی۔

کچھ گپھائیں ہندو راجاؤں کی سرپرستی میں بنیں، اس کے باوجود یہاں بدھ مجسمے موجود ہیں۔ ہر گپھا کا الگ الگ تفصیلی ذکر کرنا تو مشکل ہے۔ سب ہی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ تاہم شیو کی گپھا، کیلاش ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دُنیا میں سب سے خوب صورت، ایک ہی پتھر سے تراشی ہوئی عمارت مانی جاتی ہے۔

مؤرخوں کا خیال ہے کہ اِس پتھر کو تراشنے میں کم از کم ۱۰۰ برس لگے تھے۔ یہ کیلاش مندر راشٹر کوٹ خاندان کے راجہ کرشن نے ۷۶۰ء میں بنوایا تھا۔

اورنگ آباد سے کچھ دور اجنتا کی گپھائیں بھی ہیں لیکن ہم یہاں نہیں جاسکے۔ اللہ بخشے ہماری نانی اماں کو وہ کبھی کرایہ پورا وصول نہیں کیا کرتی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس طرح اپنے کرایہ دار سے ایک اور ملاقات کا بہانہ رہتا ہے۔ ہم بھی جب کسی شہر جاتے ہیں تو تبرکاً ایک آدھ مقام چھوڑ دیتے ہیں اب اِس بہانے ہم اورنگ آباد دوبارہ دیکھنے جائیں گے۔ انشاء اللہ۔ ■■

جہیز کے لئے مقتول دُلہنیں انصاف مانگتی ہیں!

سعید سہروردی

دو سال پہلے اکیس برس کی وسودھا لانبا کی موت اس کی سسرال میں پُراسرار حالات میں ہوگئی تھی۔ اس کی لاش خان مارکیٹ دہلی میں اس کی سسرال کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔

۲۱ جولائی ۱۹۸۵ کو شادی کے صرف پچاس دنوں کے بعد اس کی زندگی کا چراغ بجھ گیا دو برس گزر گئے اس کی موت کی پہیلی حل نہیں ہوسکی۔

وسودھا ایک سرکاری افسر مسٹر آر۔ پی۔ دھیر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے سر میں ریوالور کی گولی قریب سے لگی اور پیوست ہوئی تھی

وسودھا کے ماں باپ کو شبہ ہے کہ اس کے شوہر یا اس سسر نے ناکافی جہیز لانے کی پاداش میں بہو کو قتل کر دیا۔ دوسری طرف وسودھا کے ساس سسر یہ کہتے ہیں کہ ان کی بہو نے خودکشی کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ کوئی وسودھا کو بلیک میل کر رہا تھا۔

دو برس کی مدت میں کوئی شہادت یا ثبوت ایسا نہیں مل سکا جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ یہ معاملہ خودکشی کا ہے یا قتل کا ؟

یہ اندیشہ تھا کہ مقامی پولیس سسرال والوں سے ملی ہوئی ہے، اس لئے مرکزی حکومت کی سرکاری تفتیشی تنظیم سی بی آئی کو معاملے کی جانچ سپرد کی گئی۔ وہ بھی اسے خودکشی کا معاملہ مان کر کیس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے لئے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ وسودھا کے شوہر یا اس کے سسرال والوں نے جہیز کا مطالبہ کیا تھا۔

وسودھا نے دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کا شوہر راکیش لانبا ایک عالیشان ہوٹل میں اچھے عہدے پر تھا۔ وسودھا اور راکیش کی شادی محبت کی شادی تھی۔ دونوں کے ماں باپ شروع شروع میں اس شادی کے خلاف تھے۔ وسودھا

کے ماں باپ کی نظر میں راکیش امیر تھا اور اس کے مزاج میں تصنع، بناوٹ اور دکھاوا بہت زیادہ تھا۔ وسودھا کے والدین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نظر میں راکیش اور وسودھا کا جوڑ توڑ نہیں تھا۔

جب وسودھا راکیش سے شادی کرنے کے لئے بضد رہی تو وسودھا کے والدین نے یہ واضح کر دیا کہ وہ زیادہ جہیز دینے کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود راکیش کے والدین نے طرح طرح کے مطالبے کئے۔ ادھر راکیش کے والدین کو کسی بڑے امیر گھر کی بہو لانے کی آس لگائے بیٹھے تھے اور ان کی امیدوں پر راکیش کے فیصلے سے اوس پڑ گئی تھی۔

بہرحال دونوں خاندانوں نے لڑکے اور لڑکی کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا اور یہ شادی بخیر وخوبی انجام پاگئی۔

وسودھا کی موت ہربنس لال لانبا کے فلیٹ پر ہوئی تھی جو پہلی منزل پر واقع تھا سسرال والوں کے بیان کے مطابق وسودھا نے اپنے سسر کے ۳۲ ریوالور سے اپنے آپ کو ختم کیا تھا۔ ریوالور تالے کنجی کے اندر الماری میں رکھا تھا۔ خودکشی کے بارے میں وسودھا نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا کہ اس نے پہلے چابی غائب کی جس کا اس کے گھر والوں کو پتہ نہیں چلا۔

وسودھا کے والدین کو ان کی بیٹی کی موت کی خبر کافی دیر بعد دی گئی فطری طور پر انہیں یہ شبہ ہوا کہ وسودھا کے سسرال والوں نے پولیس والوں کو اپنے ساتھ ملاکر بہو کو قتل کیا ہے۔ ان کا شبہ بے بنیاد نہیں تھا کیوں کہ جرم کو چھپانے کے لئے تمام کڑیاں بڑی سوجھ بوجھ اور پیش بندی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملائی گئی تھیں۔

مجسٹریٹ نے پولیس کی یہ رائے نہیں مانی کہ یہ معاملہ خودکشی کا ہے۔ تمام احتیاطی اقدامات کے باوجود حالات کے کئی پہلو ایسے تھے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ معاملہ خودکشی کا نہیں قتل کا ہے۔

پہلی بات تو یہ خود طلب تھی کہ ریوالور پر وسودھا کی انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ کہا یہ گیا تھا کہ وسودھا نے خودکشی کے بارے میں نوٹ ہری روشنائی والے بال پوائنٹ پین سے لکھے تھے لیکن اس کی انگلیوں کے نشان نہ ڈائری پر تھے نہ قلم پر۔

یہ ظاہر تھا کہ لڑکی کے ماں باپ اور پولیس کی آمد سے قبل جرم کے سارے نشانات مٹا دئے تھے لیکن یہ جاننے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ایسا کس نے کیا تھا؟

وسودھا کا پوسٹ مارٹم لیڈی ڈاکٹر نے کیا تھا جس کی اس وقت ڈیوٹی نہیں تھی۔ مجسٹریٹ کی رائے بھی یہ تھی کہ پولیس کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ یہ کیس عام خودکشی کا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جس جگہ وسودھا کی موت ہوئی وہاں انگلیوں کے نشانات مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کی موت کے بعد جو تصویریں لی گئی تھیں ان میں سے ایک تصویر سے ظاہر تھا کہ وسودھا داہنی کروٹ لئے ہوئے تھی۔ اس کا داہنا ہاتھ اسی طرف تھا بائیں ہاتھ سے وہ اس چادر کا سرا پکڑے ہوئے تھی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ اس کے دوپٹے کا آدھا حصہ اسے ڈھکے ہوئے تھا اور آدھا ایک طرف اٹھا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں الجھ گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گولی چلنے کے وقت کمرے میں کوئی اور موجود تھا اور کشمکش بھی ہوئی تھی مجسٹریٹ کو یہ شبہ تھا کہ پولیس نے معاملے پر پردہ ڈالنے اور مجرم کو چھپانے کی کوشش کی ہے اس کی رپورٹ کی بنیاد پر کیس سی۔ بی۔ آئی کے سپرد کیا گیا تھا۔

اگر مقامی پولیس نے وسودھا کے قتل کو خودکشی ثابت کرنے کی کوشش کی تو سی۔ بی۔ آئی نے بھی اصل مجرموں کے چہرے سے نقاب ہٹانے میں کوئی خاص کارگزاری نہیں دکھائی۔ ان کا خیال ہے کہ مقامی پولیس نے تفتیش میں گھوٹالا کیا۔ وہ متعلقہ عملہ کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ لیکن کیا قانون کا ہاتھ اصل قاتلوں تک پہنچ سکے گا؟ تفتیش کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بہت سے سراغ ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وسودھا کے قتل کی سازش میں کئی ہاتھ ہیں لیکن ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں جس کی بنیاد پر کسی کو گرفتار کرکے مقدمہ چلایا جاسکے۔ خودکشی کے نوٹ میں سسرال والوں کی تعریف کی گئی ہے اس لئے اس کی بنیاد پر وسودھا کے شوہر اور اس کے ساس سسر بچ نکلے۔ تعزیراتِ ہند کے تحت واقعات کی شہادت کی بنیاد پر بھی قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے لیکن سی بی آئی کے شعبۂ قانون کی رائے میں اس کیس کی واقعاتی شہادت قانونی کارروائی کے لئے ناکافی ہے۔ انہوں نے بھی عدالت سے مقدمہ واپس لینے کی سفارش کی ہے۔

اس طرح ایک اور تعلیم یافتہ حسین لڑکی اپنی جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دن میں جہیز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی اور قاتل کی انگلیوں کا نشان بھی نہ مل سکا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں جب نچلی عدالتوں نے جہیز کے معاملے میں ملزموں کو سزا سنائی اور اپیل کرنے پر ہائی کورٹ نے ملزموں کو بری کر دیا۔

سدھا گوئل کا مقدمہ

ایسا ہی ایک مقدمہ سدھا گوئل کا تھا جس کے بارے میں یہ الزام تھا کہ اسے جہیز کے لالچ میں قتل کیا گیا ہے۔ ۲۷ مئی ۱۹۸۳ کو ایڈیشنل سشن جج شری ایس ایم اگروال نے سدھا گوئل کے شوہر، دیور اور ساس کو موت کی سزا سنائی کہ انہوں نے سدھا کو جلاکر مار ڈالا۔

ملزمان نے ہائی کورٹ میں اپیل پیش کی جہاں جسٹس آر این اگروال اور جسٹس ملک شریف الدین نے سزائیں منسوخ کر دیں اور تینوں ملزمان کو بری کر دیا۔ انہوں نے فیصلہ

کیا کہ یہ بات باوثوق طریقے سے نہیں ثابت ہوتی کہ سدھا گوئل کو جلا کر قتل کیا گیا ہے۔ جسٹس آر۔ این اگروال نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پولیس نے ڈاکٹر کے ساتھ مل کر موت کے وقت کا فرضی بیان تیار کیا ہے جس سے ملزمان کو بچنے میں مدد مل گئی۔

اس بات سے قانون میں ایسی ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے تحت پولیس کو بیان بدلنے کا موقع نہ مل سکے۔ سدھا گوئل کے مقدمہ کو اخبارات میں بڑی شہرت ملی کیوں کہ پہلے سیشن جج ایس۔ ایم۔ اگروال نے اپنے فیصلے کے بارے میں اخباری نمائندوں سے بات کی اور ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیا۔ ہائی کورٹ نے اسے عدلیہ کی ہتک قرار دیا کیوں کہ اس طرح رائے عامہ سزا استغاثہ کے حق میں ہموار ہوتی تھی جب کہ نہ تو ہائی کورٹ نے سزائے موت کی توثیق کی تھی اور نہ ملزمان کی زیر سماعت اپیل پر ہائی کورٹ میں شنوائی ہوئی تھی۔

اگرچہ دہلی ہائی کورٹ نے ملزمان کو بری کر دیا لیکن بعض اخباروں نے اس فیصلے اور عورتوں کی بعض تنظیموں نے خلاف آواز اٹھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ سدھا گوئل اپنی جان سے گئی، جل مر گئی لیکن قانون اور انصاف اس کی موت کے بارے میں گونگے اور بہرے بنے رہے، عدل کی میزان کو اس کی لاش حرکت دینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

چند اور مثالیں

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملزم ماتحت عدالت اور ہائی کورٹ سے سزا پانے کے بعد سپریم کورٹ سے چھوٹ جاتے ہیں۔ منجوشری شاردا کا معاملہ ایسا ہی تھا جب اس کا حمل آخری مراحل میں تھا تو اس کے شوہر نے اسے پوٹاشیم سائنائڈ جیسے مہلک زہر کی مدد سے ختم کر دیا اس قتل کو بھی خودکشی کا معاملہ کہہ کر چھپانے اور دبانے کی کوشش کی گئی۔ جو لوگ حالات سے باخبر تھے، انہوں نے ایک بے گناہ کے قتل کو انصاف کا کفن پہنانے کی مخالفت کی اور ماتحت عدالت اور بمبئی ہائی کورٹ دونوں سطحوں پر منجوشری شاردا کے شوہر کو قتل کا مجرم مانا گیا لیکن جب ملزم نے سپریم کورٹ میں اپیل کی تو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے اسے بری کر دیا۔

ایک اور معاملہ وبھا شکلا کا ہے۔ وبھا کی شادی چھوٹے لال شکلا ایڈیشنل پولیس کمشنر کے لڑکے اشوک سے مئی ۱۹۸۱ کو ملنڈ بمبئی میں ہوئی تھی۔ وبھا کو جہیز میں ایک لاکھ روپے کی رقم ملی تھی جس کا کچھ حصہ چیک کی شکل میں تھا۔ شادی کے بعد بھی وبھا کے سسرال والے مزید رقموں کا مطالبہ کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۸۲ میں وبھا نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ ایڈیشنل پولیس کمشنر نے وبھا کے باپ کو ٹیلی فون کیا کہ وبھا کے سسرال واپس آنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس نے لڑکی کو جنم دیا ہے۔ وبھا کے والدین بیٹی اور اس کی ننھی سی بچی کو سسرال پہنچانے گئے لیکن انہوں نے بچی کو رکھنا منظور نہیں کیا۔ روایتی ہندوستانی بہو کی طرح وبھا نے سینے پر پتھر رکھ کر سسرال میں رہنا منظور کر لیا لیکن ۲۰ جون ۱۹۸۴ کو وہ جلا کر ختم کر دی گئی۔ وبھا کی ماں اور بہن نے اس کے جسم کو شعلوں کی لپیٹ میں دیکھا۔ وبھا کا شوہر مدد لانے کا بہانہ کر کے بھاگ گیا اور پڑوس کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہو گیا۔

مرنے سے پہلے وبھا نے اپنے بیان میں کہا کہ اس کے شوہر نے اسے جلایا ہے مرنال گورے اور دیگر عورتوں کے حقوق کے لئے کام کرنے والوں نے مقدمہ کی پیروی کی اور ۳۰ مارچ ۱۹۸۶ کو سیشن کورٹ نے اشوک شکلا کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت موت کی سزا سنا دی لیکن اس نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ بمبئی کے مشہور وکیل رام جیٹھ ملانی، نریبی پونڈرا اور مہاراشٹر کے سابق وزیر قانون رام راؤ ایک ملزم کی طرف سے پیش ہوئے اور بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس پی۔ آر۔ ساونت اور جسٹس کھولسے پاٹل نے ماتحت عدالت کا فیصلہ منسوخ کر کے اشوک شکلا کو بری کر دیا۔

یہ ایک اور مثال ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ جہیز کے لئے مقتول دلہنوں کو انصاف دلانے کے لئے قانون محض کاغذ کے تیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی شہادت نہیں ملتی۔ کہیں پولیس جرم کی پردہ پوشی کرتی ہے، ان سب کے باوجود اگر کوئی ملزم قانون کی گرفت میں آ گیا تو مہنگے وکیلوں کی دلیلیں اور بحثیں جرم کو اپنے سیاہ لبادوں میں چھپا لیتی ہیں۔ ایسی صورت میں انصاف کے دامن پر خون کے دھبے کسی کو نظر نہیں آتے۔

یہ بات نہیں کہ ہر غیر فطری موت جہیز کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ کیروسین کے چولہے زیادہ تر نئی نویلی دلہنوں پر پھٹتے ہیں۔ مرد اور عمر رسیدہ عورتیں اس حادثے کا شکار کیوں نہیں ہوتیں۔

یہ حادثات اتنی تعداد میں ہوتے ہیں کہ اب ہم ان کو پڑھ کر اثر نہیں لیتے۔ اخبار میں یہ خبریں اندر کے صفحوں کے کسی گوشے میں شائع ہوتے ہیں۔ کیا ہم اپنا احساس کھو بیٹھے ہیں؟ کیا ہم ان مقتول دلہنوں کی قربانی رائیگاں جانے دیں گے؟ اس کے خلاف آواز اٹھانا اور قانون پر دباؤ ڈالنا ہر عورت کا فرض ہے۔ ایسی غیر فطری موتوں کا سبب قانون کو نہیں ملتا تو ظاہری شبہ کی بنیاد پر شوہر اور سسرال والوں کو سزا دینی چاہئے۔ قانون کا ہاتھ لمبا نہ ہونے کی وجہ سے یہ بے حساب موتیں دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ اگر عورت خودکشی بھی کرے تو خودکشی پر مجبور کرنے کے سبب بھی قانون ظلم کرنے والوں کو اپنی گرفت میں لے آئے۔

ہم عہد کرتے ہیں اور ان مقتول دلہنوں کی بھٹکتی روحوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کی قربانی یقیناً رائیگاں نہیں جائے گی۔

■■

وہ ہم جیسا تھا

صالحہ باسط صدف
(کراچی، پاکستان)

زندگی کا ہر لمحہ رضیہ بھابھی کے لئے جاں فزا ہے۔ زندگی کی گہما گہمی میں وہ ہر لمحہ بہت پُرسکون گزارتی ہیں۔ ان کے چہرے سے طمانیت جھلکتی ہے۔ ان کے گزرتے ہوئے لمحوں میں اُمید اور آنکھوں میں وہی سپنے خواب ہیں جو ایک ماں کی آنکھوں میں اس وقت ہوتے ہیں جب وہ لوری دیتے وقت اپنے بچے کو تھپک تھپک کر سُلاتی ہے، اس اُمید پر کہ جب وہ جاگے گا تو اس کے آنگن میں زندگی کی کرن اُترے گی۔

سال کے آخری دن کی سُہانی صبح کو رضیہ بھابھی اپنے گھر کے کام میں مصروف تھیں۔ دُبلی پتلی سی رضیہ بھابھی میں غضب کی پھرتی نظر آتی تھی۔ دس بجے کے قریب وہ سارا کام ختم کر چکی تھیں۔ لیکن باقی گھر والوں کی صبح ہو رہی تھی۔

اماں جان ناشتے کی میز پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم کی طرف سے سخت نااُمید اور پریشان تھیں۔ انہیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ انجینیرنگ کا آخری سال ہے اور کالج بند ہیں۔ نبر ورنے شاید ٹھیک ہی لکھا تھا: "اب وہاں کیا رکھا ہے۔"

"ارے اماں، اب ملک کے حالات ایسے بھی مایوس کن نہیں ہیں!" رضیہ بھابھی نے میز پر پیالی رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ دیکھئے گا کہ ایک دن فیروز بھائی بھی وطن واپس آجائیں گے۔"

اماں گہری سوچ کے بھنور سے اُبھرتے ہوئے بولیں "ارے میں تو کہتی ہوں کہ عامر کو بھی چلا جانا چاہیے۔" رضیہ بھابھی کے ہاتھ میں خالی پیالی تھر تھرا گئی۔ انہوں نے جلدی سے پیالی کو میز پر واپس رکھ دیا۔ اور حیرت سے اماں جان کی طرف دیکھا جو کس فراخ دل سے بیٹوں کو غیر ملکوں میں بھیجنے کا مشورہ دے رہی تھیں۔ رضیہ بھابھی نے اپنے اندر کی عورت کو ٹٹولا تو وہ بہت ہی کنجوس نظر آئی۔ وہ خود اپنے ملک اور وطن سے اپنے بچوں کو کبھی دور نہیں بھیج سکتی تھیں۔

"اماں جان، یہاں فرسٹریشن ضرور ہے لیکن مستقبل سے نااُمید نہ ہوا کیجئے!" رضیہ بھابھی نے اخبار کی سُرخی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھابھی جان، آپ کی تو دوپہر ہو رہی ہے لیکن فی الحال مجھے ناشتہ چاہیے۔" عامر بولا۔

"ابھی دیتی ہوں۔" اور پھر انہوں نے عامر کے لئے گرم گرم پراٹھا اور آملیٹ تیار کر دیا۔ اس دوران انہوں نے دو چار برتن بھی کھڑے کھڑے دھو ڈالے اور ساتھ ہی چولہے پر چڑھے ہوئے گوشت کو بھی بھونتی رہیں۔ ننھے سرمد کے رونے کی آواز پر وہ بیڈ روم میں گئیں تو اس کے کپڑے بدلنے کے بعد باہر نکلتے ہوئے اپنے کمرے کی حالت بھی درست کر دی۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ کسی بھی کام کو انبار لگا کر سر پہ سوار نہیں کرتی تھیں۔ ننھے

کم ظرف نہ بنئے

دنیا کا یہ عام دستور رہا ہے کہ ہر اہلِ کمال کے حاسد اور بدخواہ پیدا ہو جاتے ہیں — ایسے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی کم علمی اور کم فہمی کے باوجود لوگوں پر اپنی فضیلت اور برتری کا رعب جمانے کی دُھن میں رہتے ہیں اور اپنے آپ کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں ان کا ذہنی اُفق بہت محدود ہوتا ہے۔ یہ دوسروں کو ہمیشہ کوتاہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ صحیح راہ یہ ہے کہ کسی کی بھلائی اور اقبال مندی ناگوارِ خاطر نہ ہو ہم اگر امیر ہوں تو غریب کی تحقیر نہ کریں۔ ہم اگر نادار ہوں تو صاحبِ مال و ثروت سے حسد نہ کریں۔ اللہ نے جنہیں طرح طرح کی نعمتیں دی ہیں، ان کو دیکھ دیکھ کر نہ جلیں۔ بدی کی اعانت کرنے والا اپنا ہی زیاں کرتا ہے اور جو دوسروں کا بُرا چاہتا ہے، اس کا اپنا ہی بُرا ہوتا ہے۔
دوسروں کے لئے جو بُری تدبیر کرتے ہیں ان کے لئے آخرت میں بھی سخت عذاب ہے۔
(ڈاکٹر عطیہ سعید)

سسرال کو انہوں نے خیرباد کہہ دی اور اپنے جہیز کا بڑا ٹرنک کھول کر بیٹھ گئیں۔ کتنے دنوں سے وہ سوچ رہی تھیں کہ دو چار دن کے لئے اپنی اماں کے گھر رہنے کے لئے چلی جائیں، لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ کھڑی ہوتی۔ آج انہوں نے چلتے وقت اپنے شوہر سے کہہ دیا تھا کہ بچوں کی چھٹیاں ہو گئی ہیں اور وہ شام کو اپنی امی کے یہاں رہنے کے لئے چلی جائیں گی

کپڑے دھوپ میں پھیلائے

رضیہ بھابھی یہ جائزہ لے رہی تھیں کہ کون سے کپڑے ساتھ لے جانے ہیں اور کون کپڑوں کو دھوپ دکھا کر رکھ دینا ہے۔ یہ دیکھ کر اماں جان کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ وہ میکے جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔

"ارے بھابھی رضیہ، کہاں کی تیاری ہے۔" ثوبیہ نے پوچھا۔

"بتایا تو ہے کہ امی جان کی طرف دو چار دن کے لئے جاؤں گی۔ نعیم کی شادی بھی ہے۔ سوچا، وہیں رہ کر شامل ہو جاؤں گی۔"

اماں جان بھنّا کر کہنے لگیں "اور تمہارا کام ہو گیا؟"

"ارے کہاں! ابھی تو ہنڈیا بھی نہیں چڑھائی!" رضیہ بھابھی چونکیں اور لپک کر باورچی خانے میں پہنچ گئیں۔ ہنڈیا چڑھا کر وہ چلتے چلتے صافی اٹھا کر چولہے کو صاف کرتی آئیں۔

ثوبیہ نے رضیہ بھابھی سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا "سچ رضیہ بھابھی، آپ اتنے سارے کام کیسے کر لیتی ہیں؟ گھر بھی کتنا صاف رہتا ہے! آپ ہمیں بھی اپنے جیسا بنا دیجئے۔"

یہ سن کر رضیہ بھابھی مسکرا کر بولیں "یہ بھی کوئی خاص بات ہے؟ بھئی تم لوگ کام جمع کر کے رکھتی ہو میں اپنا کام ساتھ ساتھ نمٹاتی چلتی ہوں۔ مجھ سے کام جمع کر کے نہیں رکھا جاتا۔ جدھر سے بھی نکلی، اسی طرف کا کام کرتی چلتی ہوں، ورنہ گھر تو شام تک کباڑ خانہ بن جائے۔"

یہ چھوٹا سا گُر رضیہ بھابھی بتا کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔

رضیہ بھابھی کا یہ بھی وطیرہ دیکھا گیا کہ اگر کوئی پڑوسن گپیں لڑانے آ گئی تو وہ باتیں بھی کرتی جاتیں اور ساتھ میں کوئی نہ دوسرا کام بھی انہیں یاد آ جاتا، مثلاً کپڑوں کی ترپائی، سلائی وغیرہ کا کام، جسے وہ باتوں کے درمیان کرتی رہتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ رضیہ بھابھی کو ہر آن مصروف رہنے کی عادت ہے۔ وہ کام سے فارغ ہو کر مطالعہ کرتیں یا باغبانی۔ انہیں بے کار بیٹھنا اور کام کا ڈھیر لگا رہنا سخت ناپسند تھا۔ اماں جان اپنی آرام طلب بیٹیوں کو دیکھتیں تو کہتیں "رضیہ تو مشین ہے!" اور رضیہ مسکرا دیتیں۔ یہ ان کی عادت تھی کہ ہر حال میں خوش رہتیں۔ اپنی پریشانی دوسروں پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیتیں۔ وہ اپنے فرض سے کسی پل غافل نہیں رہتی تھیں، اگرچہ وہ ذہنی طور پر بہت متضاد لوگوں کے درمیان رہ رہی تھیں۔

ساس صاحبہ ہر وقت امریکہ کی باتیں کرتی رہتی تھیں، اس لئے بھی کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے وہاں کی اصول پسندی دیکھی تھی۔ جس تقریب میں جاتیں، بس وہیں کے قصے لے بیٹھتیں۔ اپنے کپڑوں پر لگائی ہوئی پرفیوم کی تعریف، اپنے بیٹے کے شاندار مکان کی تعریف، وہاں کی پارٹیوں کی روداد جو اُن کے استقبال میں دی جاتی تھیں، وہاں کے حُسن اور صفائی کا چرچا۔ لوگ مسکرا مسکرا کر سنتے اور رضیہ بھابھی دبے لفظوں میں اماں جان کو روکنے کی کوشش کرتی رہتیں۔

رضیہ بھابھی کے سرتاج ہر وقت اپنے ملک اور قوم کے لوگوں سے نااُمید رہتے تھے۔ وہ سماج میں پھیلے ہوئے جھوٹ اور بے ایمانی کے قصے سناتے اور بتاتے کہ عوام کس طرح فرسٹریشن کا شکار ہیں۔ رضیہ بھابھی بعض اوقات تو اس بات پر بحث پر آمادہ ہو جاتیں۔ وہ کہتیں کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ حصہ بُرائی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساری قوم بُری ہے۔ نئی نسل سے ہمیں بہت اُمیدیں ہیں۔ مگر اماں جان کا کہنا تھا کہ یہ نسل تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ یہ اپنی پہچان کھو چکی ہے۔

"عامر ہی کو دیکھو۔ کالج بند ہیں۔ بس اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو بسنت فیسٹیول ہی منانے اسلام آباد چلا گیا۔ اور صاحب زادے کو بڑا فخر ہے کہ یہ سال ہمارا تھا۔ آئے دن کی سیر تفریح مجھے پسند نہیں۔"

اماں جان کا یہ خیال ایک حد تک درست بھی تھا۔ نوجوان قوم کے معمار اور ملک کی بقا کی علامت ہوتے ہیں، جن کی صلاحیتوں پر ملک کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے اور نوجوان بہتر معمار کی صورت میں اس وقت سامنے آسکتے ہیں جب وہ درس گاہوں میں

ذہنی سکون کی فضا میں تعلیم حاصل کریں۔

ابھی رضیہ بھابھی نے اٹیچی اور ہینڈ بیگ کو بند ہی کیا تھا کہ پوسٹ مین کی آواز کے ساتھ کال بیل بج اٹھی۔

"ارے! فیروز بھائی کا خط!" انہوں نے عامر کے ہاتھ میں خط دیکھتے ہی کہا۔ پھر سارے گھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ اگلے ہفتے فیروز بھائی واپس آ رہے ہیں۔

اماں جان اس اچانک فیصلے پر بوکھلا گئیں ابھی ان کے کئی ادھورے کام باقی تھے جو فیروز کے بھیجے ہوئے پیسوں سے پورے ہو سکتے تھے۔

فیروز بھائی نے اپنے خط میں لکھا تھا:

"ابا جان، میں ہمیشہ کے لئے واپس آنا چاہتا ہوں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر ثمینہ۔ ویسے بھی زیادہ عرصہ تک کوئی اپنے وطن سے دور کیسے رہ سکتا ہے؟ میں بھی تھک گیا ہوں۔ زندگی کے تمام خواب پورے ہو گئے ہیں تو سوچتا ہوں کہ مزید یہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ علم اور تجربہ جو یہاں پر حاصل ہوا ہے، آخر اس پر میرے ملک کا بھی تو حق ہے۔ میں چاہتا ہوں وہاں آکر قوم کی خدمت کروں۔ میرے ٹیلی فون کا انتظار کیجئے۔"

اماں جان پریشان تھیں کہ اتنا بڑا فیصلہ فیروز نے ان سے مشورہ کئے بغیر کر ڈالا۔ حالانکہ فیروز امریکہ میں پندرہ سال سے رہ رہے تھے پھر بھی اماں جان کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی گئے ہوں۔ ان کے کئی خواب ادھورے رہ گئے تھے۔ رضیہ کا مسکراتا ہوا چہرہ انہیں زہر لگ رہا تھا، جو اپنی فتح پر مسکرا رہی تھیں۔

اور پھر سارا عتاب رضیہ پر ٹوٹ پڑا۔

میں نے کہہ جو دیا کہ تم آج نہیں جاؤ گی۔ ہزاروں کام کرنے ہیں۔ دن کتنے رہ گئے ہیں فیروز کے آنے میں؟ گھر کی صفائی ہونا ہے اوپر کی منزل میں کچھ سامان شفٹ کرنا ہے۔"

رضیہ نے اپنی اٹیچی کھینچ کر باہر نکال لی۔

"میں تو جا رہی ہوں۔ گھر میں چھوٹی آپا ہیں۔ اور ابھی یونیورسٹی بند ہے۔"

پھر یہ بات شام تک طاہر تک پہنچ گئی۔

انہوں نے بھی ماں کی حمایت میں رضیہ سے کہا "ٹھیک ہی تو کہتی ہیں اماں جان۔ تم دو چار دن بعد چلی جانا۔"

"یہ دو چار دن میری زندگی میں پھر نہیں آئیں گے۔ میں آج ہی جاؤں گی۔ اماں کو تو بس یوں ہی میرے ہر کام میں کچھ نہ کچھ کہنے کی عادت ہے۔"

طاہر نے کہا "کیا قیامت آ جائے گی جو آج نہ گئیں؟"

"میں بھی یہی آپ سے کہنا چاہتی ہوں کہ اگر میں آج چلی گئی تو کیا قیامت آ جائے گی؟"

اماں جان خاموش ہو کر چلی تو گئیں، لیکن چلتے چلتے طاہر کے کان میں ڈال گئیں:

"دیکھو! میں کہتی ہوں یہ آج نہیں جائے گی۔"

مگر رضیہ کو ضد تھی کہ وہ آج ضرور جائیں گی۔ پھر انہوں نے صاف صاف طاہر کو بتا دیا کہ اماں کو تو سارا غصہ فیروز بھائی کے فیصلے پر ہے۔ کتنے دن بعد تو

انہوں نے اپنی امی جان کے ہاں ہو آنے کا ارادہ باندھا تھا۔ پچھلے ہفتے بھی انہوں نے جانے کا سوچا تھا، مگر اماں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ذرا اسردی کم ہو جائے تو جانا۔ اور اب کچھ دن بعد اسکول کھل جائیں گے اور وہ پھر نہ جا سکیں گی۔ یہ سوچ کر رضیہ بھابھی اپنی ضد پر اڑ گئیں۔ اور پھر اچھی خاصی شام طاہر بھائی اور رضیہ بھابھی کے درمیان جھڑپ کی نذر ہو گئی۔ اگلے پچھلے سارے گڑے مردے طاہر بھائی نے اکھاڑ ڈالے اور رضیہ بھابھی کا کچھ بس نہ چلا تو رونے بیٹھ گئیں۔

آخر ابا جان نے فیصلہ صادر کر دیا۔

"ٹھیک ہے۔ رضیہ جائے گی۔"

رضیہ بھابھی کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور وہ مسکرا اٹھیں۔

"ارے ایسے ہی فیصلے دینے کا حق رکھتے ہو تو فیروز کو روکا ہوتا!" اماں جان نے کہا۔

"وہ گیا بھی اپنی مرضی سے تھا اور آ بھی

کچھوا بازی لے گیا

جو لوگ اپنی تیز روی کے بے جا زعم میں آ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس منزل مقصود کو جا لیں گے وہ اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ میدانِ عمل میں غفلت والا پردا ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہے سستی و کاہلی ان کی ذہنی قوتوں کو بے کار کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں ناکامی اور شکست ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

جدوجہد کی راہ میں دم لینے کی اگرچہ گنجائش ہے۔ مگر بس اتنی کہ غفلت اس کا عنوان نہ بن جائے!

کامیابی و کامرانی ایک متوازن طریقۂ عمل، لگاتار محنت اور پیہم کوشش چاہتی ہے۔ اس پر حوصلہ کی بلندی اور ارادے کی مضبوطی بالآخر فتح و نصرت کی ضمانت بن جاتی ہے۔ کوئی انسان بھی دنیا میں ناکامی و شکست کا خواہاں نہیں ہوتا، چنانچہ کامیابی و سرخروئی کے حصول کے لئے اپنا کام — چاہے کچھوے کی رفتار سے انجام دیجئے، مگر خرگوش کی غفلت سے اپنے وجود کو بچائے رکھئے!!

(احمد کلیم فیض پوری)

اپنی مرضی سے رہا ہے۔ رہا رضیہ کے جانے کا مسئلہ تو وہ ٹھیک کہتی ہے کہ پھر بچّوں کے اسکول کھل جائیں گے اور وہ نہ جا سکے گی" آبا جان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بچّوں کو شدید نزلہ زکام ہے۔ وہاں کون دیکھ بھال کرے گا؟"

"وہی جو یہاں کرتی ہے۔"

اور ہر سوال کا جواب ملنے پر امّاں جان خاموش ہو گئیں۔ یوں بھی وہ شوہر کے سامنے خاموش رہتی تھیں۔

عامر نے رضیہ کو تیار دیکھا تو بولا

"ارے بھابی جان، آج تو کمال ہو گیا! آج آپ امّاں جان سے جیت گئیں!"

"چپ یہ گھر کے مسائل ہیں۔ ہار جیت کیسی؟ بس امّاں جان ہی ہمارے مسائل نہیں جانتی ہیں وہ ہر کام اپنی رائے اور سہولت کے مطابق کرنا چاہتی ہیں۔"

"ارے چھوڑیئے، وہ تو آبا جان نے کہہ دیا، ورنہ بیٹھی رو رہی ہوتیں۔"

"جی نہیں۔ جانا ضروری ہے، دیکھو نا عامر، میرے کزن نعیم کی شادی ہے، روز یہاں سے جانا اتنا آسان نہیں۔ کراچی کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر رہنے والے رشتہ دار، مہندی، مایوں اور میلاد کی تقریبوں میں شرکت نہ کرنے کی شکایت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کے مسائل کیا ہیں۔ گاڑیوں میں پٹرول کی جگہ شاید پانی بھرا جاتا ہے۔ ہر کوئی یہی شکایت کرے گا کہ گھر کی گاڑی ہے، تو پھر کیوں نہیں آئیں؟ اب طرح طرح کے بہانے کرو، پھر بھی ان کا موڈ آف رہے گا۔ گاڑی چلانے کے لئے تمہارے بھیا کی الگ خوشامد کرتے رہو۔ سوچا، چلو آخری مہینہ ہے۔ بجٹ بھی ٹھیک رہے گا۔ امّی جان کے گھر سے ہی ان کے ساتھ چلی جایا کروں گی لیکن امّاں جان کا اصرار ہے کہ نہ جاؤ۔ اور ہاں دیکھو، تمہارے بھیا کو سب پتہ ہے کہ کس لئے وہاں جا رہی ہوں، مگر پھر بھی اڑے ہوئے ہیں کہ جانا کوئی ضروری نہیں۔ اتنے قریب کے رشتہ دار نہیں ہیں وغیرہ۔"

ذرا سی دیر میں رضیہ بھابی نے بچّوں کو تیار کیا اور خود بھی تیار ہونے چلی گئیں۔

"عامر، ذرا ٹیکسی لے آنا" رضیہ بھابی نے اپنے کمرے کے پھیلے ہوئے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھ بھال کر لانا" امّاں جان آخر بول ہی پڑیں۔ آنے جانے کے معاملے میں امّاں جان خاصا تجربہ رکھتی تھیں۔

"جی اچھا امّاں، دیکھ بھال کر سند یافتہ ٹیکسی ڈرائیور لاؤں گا۔"

ٹیکسی آ گئی تو ننھے سرمد کو امّاں نے ٹیکسی میں پیار سے رضیہ کی گود میں دیتے وقت ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی۔ اس کے سر کے بال بہت بڑے تھے اور وہ ریڈیو پر مائیکل جیکسن کی آواز میں کھویا ہوا تھا۔ امّاں جان ایک نظر ڈالتے ہی بتا سکتی تھیں کہ فلاں شخص کس خطّہ یا قومیت کا ہے۔ لیکن اس نوجوان کے بارے میں امّاں جان کے تجربات کی پرکھ کچھ ڈول سی گئی۔ آخر انہوں نے پوچھ ہی لیا: "کہاں کے ہو؟"

"پاکستانی"

"وہ تو میں بھی جانتی ہوں ......"

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتیں، ٹیکسی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

"عامر، نمبر ہی نوٹ کر لیا ہوتا۔ شکل سے اچکّا دکھائی دیتا تھا۔" امّاں جان نے مڑ کر عامر کو دیکھا۔

عامر ان کی بات پر ہنس پڑا۔ "امّاں جان کو تو خواہ مخواہ وہم رہتا ہے شکل سے آپ کسی کے باطن کا اندازہ کس طرح کر سکتی ہیں؟"

"دیکھا نہیں، کس شان سے ٹیکسی چلا رہا تھا جیسے ڈرائیور نہیں، گورنر ہو!"

"مجھے تو شکل سے پڑھا لکھا لگا، اسی لئے لے آیا۔" عامر نے کہا۔

"پڑھ لکھ کر کوئی ٹیکسی کیوں چلائے گا؟"

"کیوں؟ اس میں کیا حرج ہے؟ یہ بھی ایک کام ہے۔"

گھر جا کر رضیہ بھابی نے ٹیلی فون کیا اور عامر سے بات کی ــــ

عامر تھوڑی دیر تک پریشان رہا۔

اور کچھ دیر بعد رضیہ بھابی بچّوں کو لئے واپس آ گئیں۔

امّاں جان کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔ "ارے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ دیکھ بھال کر بٹھا کر۔۔"

"قصور اس کا نہیں، میرا ہے امّاں جان۔ میں آج گھر سے بہت پریشان گئی تھی۔"

"پھر بھی وہ بتا تو سکتا تھا۔ ضرور نیّت میں کھوٹ ہو گا۔ باہر کے ملکوں میں دیکھو، دودھ کی بوتلیں دروازے پر رکھی رہتی ہیں مجال ہے کہ کوئی اٹھا لے۔ بچّے گھر کے باہر اپنی سائیکلیں چھوڑ آتے ہیں۔ ہفتوں یوں ہی پڑی رہتی ہیں اور یہاں کے لوگ کسی کی کھوئی ہوئی چیز کبھی واپس نہیں کر سکتے۔"

امّاں جان کے تجربات کو کوئی شخص چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ضروری بھی تو نہیں کہ وہ ہر بار مات کھا جاتیں اور رضیہ بھابی ہر بار جیت جاتیں۔ یہ بات الگ تھی کہ رضیہ بھابی فیروز بھائی کے معاملے میں ان سے جیت گئی تھیں۔ اور امّاں جان کی یہ پیش گوئی غلط نکلی تھی کہ فیروز اب واپس آ کر کیا کرے گا؟ اتنے آرام اور آسائش کو چھوڑ کر کون آتا ہے؟ رضیہ بھابی نے دلیل دی تھی: "نہیں امّاں، آخر آپ لوگ بھی تو آرام اور آسائش چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔" امّاں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا: "ارے، ہمارا جیسا جذبہ اس نسل میں کہاں؟" رضیہ بھابی ایک اور دلیل دے بیٹھی تھیں: "امّاں جان، جذبوں

حاصلِ مطالعہ:- یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ کام کرنے والے تو بہت ہیں مگر کامیاب ہونے والے بہت کم۔ استقلال کا ثبوت دینے والے کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور جن میں استقلال کی کمی ہے انہیں زندگی پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ لوگوں میں طاقت اور صلاحیت کی کمی نہیں مگر وہ بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑی کامیابی مستقل ارادہ مانگتی ہے۔ اکثر لوگ کوئی نیا کام شروع کر دیتے ہیں مگر اسے مستقل جاری نہیں رکھتے۔ زندگی ایک مقابلہ ہے جس میں ٹھہرنا گویا پیچھے ہٹنا ہے۔ جو ایک بار پیچھے ہٹ گیا اس کا آگے آنا مشکل ہے کیوں کہ جب تک وہ آگے آئے گا تو دوسرے بہت آگے جا چکے ہوں گے۔ اس دنیا میں نتیجہ صرف اسی کے حصّے میں آتا ہے جو نتیجہ سے بے نیاز ہو کر اپنا عمل جاری رکھے۔

(کے۔ ایس۔ عائشہ، عمرآباد)

کی پہچان کے لئے ایک وقت درکار ہوتا ہے۔" اور بات یہیں ختم ہو گئی تھی۔

اب رضیہ بھابھی کو اپنی حماقت پر بے تحاشا غصّہ آ رہا تھا۔ "یہ میٹھے بٹھائے جلنے کی کیا ضرورت تھی؟" اور اگر ایسا ہی جانا تھا تو زیور پرس میں ہی رکھ لیتیں۔

اس درمیان ابّا جان کئی بار کہہ چکے تھے: "دیکھو، افسوس اور فکر کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ملنے ہیں تو وہ خود آکر دے جائے گا۔"

امّاں جان کو سب سے زیادہ غصّہ عامر پر تھا کہ وہ نوجوان ڈرائیور کیوں پکڑ کر لایا تھا جو شکل سے ہی عجیب نظر آ رہا تھا۔

"امّاں شکل سے تو وہ پڑھا لکھا لگتا"

عامر نے دبی زبان سے کہا۔ "خاک! مجھے تو بہروپیا لگتا تھا۔" امّاں جان نے عامر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"امّاں، آپ اس کو کچھ نہ کہیں۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ بوڑھا ہو یا نوجوان، ایمان تو دونوں کی میراث ہے۔ اللہ نے چاہا تو دے جائے گا۔ مجھے تو نوجوانوں سے زیادہ امیدیں ہیں۔" رضیہ بھابھی بولیں۔

"ارے بس رہنے دو۔ ہزاروں کا مال ہاتھ آیا ہے اور وہ چھوکرا واپس لائے گا؟" امّاں جان نے اپنی آخری رائے دے ڈالی۔

سال کا آخری پہر نئے سال کے پہلے پہر سے گلے ملنے والا تھا۔ ہر آہٹ پر رضیہ بھابھی سوچ رہی تھیں کہ گھنٹی بجے گی اور کوئی فرشتہ ان کی اٹیچی لئے کمرۂ الفت آئے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور رات یوں ہی بیت گئی۔

نئے سال کی پہلی کرن رضیہ بھابھی کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ وہی خوب صورت اور جان دار لمحے جو ہمیشہ ان کے تابع رہتے تھے۔ آج ان کے کام میں فرق تو نہیں آیا تھا، البتہ رفتار میں اتنی تیزی نہ تھی۔ امّاں جان نے صبح ہوتے ہی کہہ دیا تھا: "خدا خیر کرے! یہ سال بھاری لگتا ہے۔"

یہ سن کر رضیہ بھابھی نے دل میں چپکے سے کہا تھا "دن اور سال، سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ جو قسمت میں تھا وہ ہو گیا۔"

رضیہ بھابھی باورچی خانے میں کام میں مصروف تھیں، لیکن ہر کال بیل پر چونک اٹھتی تھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ آ جائے۔

طاہر کا موڈ آف تھا۔ رضیہ اور وہ کئی بار اسی بات پر بحث کر چکے تھے کہ اگر امّاں کا کہا مان لیا جاتا تو ہم اتنے بڑے نقصان سے بچ جاتے۔

لیکن آس کی ڈور ابھی بندھی تھی۔

ہر پل اور ہر آن چوکس رہنے والی رضیہ بھابھی حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف تھیں۔ صبح کے نو بجنے والے تھے لیکن سورج ابھی تک روپوش تھا۔ کہیں کہیں پر ہلکی روشنی نظر آتی اور پھر چھپ جاتی۔ ہلکی ہلکی بارش کی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے سردی کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ عروس البلاد کراچی پر دھوپ کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔

رضیہ بھابھی گھر کے سارے کام اس طرح جلدی جلدی کر رہی تھیں گویا دن کے بارہ بجے ہوں کہ ایک بار کال بیل پھر بج اٹھی۔ رضیہ بھابھی کے ہاتھ روٹی ڈالتے ہوئے رک گئے۔ "اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"

عامر کو امّاں جان نے آواز دی۔

"دیکھنا!" اتنی دیر رضیہ بھابھی اپنا کام چھوڑ کر رکی رہیں۔

"رات کو دیر ہو گئی تھی، اس لئے نہ آ سکا۔ یہ اٹیچی شاید آپ ہی کے گھر کی ہے۔" نوجوان ڈرائیور نے اٹیچی ڈگی سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں!" عامر کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"دراصل میں نائٹ شفٹ میں پڑھتا ہوں، اسی لئے نہ آ سکا، ورنہ رات ہی کو پہنچا دیتا۔"

اور پھر وہ شکریہ کا ایک لفظ سنے بغیر چلا گیا۔

"کون تھا؟" عامر کے ہاتھ میں اٹیچی دیکھتے ہوئے امّاں نے پوچھا۔

"نئی نسل کا وہی فرشتہ جسے آپ اچکا سمجھ رہی تھیں۔" عامر نے فخر سے کہا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

رضیہ بھابھی کو ایسا لگا جیسے چاروں طرف سے نئے سال کی نئی نئی کرنیں پھوٹ رہی ہوں اور انہیں مبارک باد دے رہی ہوں — آنے والے لمحوں کو مزید خوب صورتی اور زندگی دینے کے لئے۔

پکنک پوائنٹ پہ ایک خاتون نے دوسری خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"بہن جی، دیکھئے، آپ کا لڑکا میرے پھلوں کی ٹوکری کو کھول رہا ہے۔"
دوسری خاتون نے جواب دیا "یہ میرا لڑکا نہیں، میری بہن کا لڑکا ہے۔ میرا لڑکا تو آپ کا ناشتہ دان کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔"
(ایم۔ یونس خان، راور کسیلا)

●

مالک نے ملازم سے پوچھا "جلد بتاؤ، وہ کون سی چیز ہے جو کڑی محنت کے بعد بھی نہیں ملتی۔"
ملازم نے جواب دیا "حضور، میری تنخواہ۔"
(محمد احسن، حیدرآباد)

●

میڈیکل کالج کے ایک پروفیسر نے زیر تعلیم طلبا کو بتلایا کسی کو موت کا سرٹیفکٹ دینے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اگر مرد ہے تو اسے موت کا سرٹیفکٹ اس وقت دیا جائے گا جب اس کا دل رک چکا ہو اور عورت کی موت کا سرٹیفکٹ اس وقت دیا جائے جب اس کی زبان رک چکی ہو۔
(محمد اظہر الدین، محبوب نگر)

●

ایک افسر نے اپنے تین ماتحتوں سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو تینوں نے یہی بتایا کہ ان کی سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا!
افسر نے بگڑ کر کہا "ایک ہی وقت میں تین سائیکلیں کیسے پنکچر ہو سکتی ہیں؟"
تینوں بولے "سر، ہم تینوں ایک ہی سائیکل پر سوار تھے۔"
(رحیم النسا بخشی، بلگام (کرناٹک))

تین دوست اپنی اپنی بہادری کے قصے لے بیٹھے۔
پہلے دوست نے بتایا کہ اس نے افریقہ کے صحرا میں پانچ سال گزارے ہیں۔
تو دوسرے نے کہا "یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں نے افریقہ کے گھنے جنگلوں میں دس سال گزارے ہیں۔"
تیسرا بولا "تم لوگ بھی کیا فخر کرنے بیٹھے۔ میں تو اپنی بیوی کے ساتھ بیس سال سے رہ رہا ہوں۔"
(شکیل احمد صدیقی)

●

چار دوست تھے۔ ایک انگریز تھا، دوسرا آئرش، تیسرا ویلز کا باشندہ، اور چوتھا اسکاٹ لینڈ کا۔ چاروں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور انہوں نے آپس میں عہد کر رکھا تھا اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو باقی ہر دوست محبت کی نشانی کے طور پر پانچ پونڈ کا نوٹ اس کے تابوت میں رکھے گا۔
انگریز مر گیا۔ آئرش نے پانچ پونڈ کا نوٹ تابوت میں رکھ دیا۔ ویلز والے نے بھی پانچ پونڈ کا نوٹ رکھ دیا۔ اب آئی اسکاٹ کی باری۔
اس نے پندرہ پونڈ کا چیک لکھ کر تابوت میں رکھ دیا اور دونوں نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لئے۔
(محمد امتیاز احمد شاہین، حیدرآباد)

●

شوہر: (بیوی سے) اجی پچھلی مرتبہ بمبئی میں کس ہوٹل میں قیام کیا تھا؟
بیوی: (شوہر سے) ٹھہرو مجھے دیکھ کر بتاتی ہوں۔
ٹبنی، آمبور

●

اتفاق سے ایک شاعر کی شادی ایک شاعرہ سے ہو گئی۔ شادی کے کچھ دن کے بعد ان دونوں میں کسی بات پر لڑائی ہو گئی اور یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ دونوں کو عدالت جانا پڑا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے دونوں نے اس طرح فریاد کی۔
بیوی: حضور! اس نے مجھے جھنجھوڑا۔
میاں: حضور! اس نے مجھے رسی کی طرح مروڑا۔
بیوی: حضور! اس نے میرا سر توڑا۔
میاں: حضور! اس نے میرا شیشہ توڑا۔
بیوی: اگر میں نے توڑا تو کس نے جوڑا؟
میاں: توبہ...توبہ! یہ عورت ہے کہ زہر میں بجھا ہوا کوڑا۔
بیوی: حضور! دیکھئے اب نہیں رکتا یہ نگوڑا۔
مجسٹریٹ گھبرا کر: جاؤ بابا... میں نے تم دونوں کو چھوڑا۔
نسرین فاطمہ، بڑا بازار

●

حتمی: (دلہنے پتی سے) ڈیر چند سالوں پہلے تم نے کہا تھا کہ تم میرے بغیر تو جنت میں بھی رہنا پسند نہ کرو گے اگرچہ میرے ساتھ تو بھلے ہی دوزخ ملے مگر دوزخ گوارہ کر لو گے۔
پتی: بدقسمتی سے میری کہی ہوئی بات قبول ہو گئی۔
عطار اللہ خان، برہانپور

●

اپنے لطیفے اس پتے پر بھیجیے۔ "تبسم"، ماہ نامہ "بانو" آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ننھی سی گڑیا

اے مری ننھی سی گڑیا اے مری نورِ نظر
اے مری شامِ تمنا کی درخشندہ سحر
ساتھ تو اپنے اُجالوں کی رُتیں لائی ہے
زندگی بن کے نگاہوں پہ مری چھائی ہے

تیرے دَم سے ہے مرے گھر میں بہاروں کا سماں
میری نظروں میں ہے رنگین نظاروں کا سماں
در و دیوار پہ کچھ ایسا نکھار آیا ہے
چاند جیسے مرے آنگن میں کوئی چمکا ہے

گود میں پیار سے جب تجھ کو اٹھا لیتا ہوں
مسکرا کر غمِ دنیا کو بھلا لیتا ہوں
زندگانی ہے سراپا ترا ننھا سا وجود
مجھ کو ہے جاں سے پیارا ترا ننھا سا وجود

تیرا اندازِ شرارت بھی بہت خوب لگے
تیری ہنستی ہوئی صورت بھی بہت خوب لگے
زندگی پیار کی ارمانوں کی دنیا تو ہے
آنکھ کی روشنی اور دل کی تمنا تو ہے

انور کمال انور فیروزآبادی

غزل

رُک پاؤ گے نہ ہرگز آندھیوں کے وار بابا
گر ہی جائے گی کسی دن ریت کی دیوار بابا
تپتے ریگستان میں ہوں دھوپ سے بیزار بابا
ایک بھی ملتا نہیں ہے پیڑ سایہ دار بابا
دونوں ہاتھوں کی لکیریں غور سے دیکھو ذرا تم
کیوں مرا سپنا کوئی ہوتا نہیں ساکار بابا
اِس طرح بندے ہوس کے دل کے سودے کر رہے ہیں
جیسے ہیرے کے نگر میں کانچ کا بیوپار بابا
تتلیاں ماضی کی تم پکڑو گے یہ ممکن نہیں ہے
بھاگتے لمحوں کی بڑھتی جائے گی رفتار بابا
اپنے جیون کی سفلتا کا کوئی درمان بھول
خون سے میرے کسی کا ہو اگر اُپکار بابا
اُس خزانے کا پتہ ملتا نہیں جس کی طلب ہے
ڈھونڈ کر ہم آ چکے ساتوں سمندر پار بابا
پیرہن کانٹوں کا بھی کامل گلوں سے کم نہیں ہے
سوچنا مجھ کو پڑا یہ پھول ہے یا خار بابا

کامل شیخوپوروی

اے بہن

"اے بہن" اے مری دنیائے محبت کی اساس
تیری تقدیس پہ تقدیسِ بہاراں بھی نثار
اے بہن اے مرے گلشن کی مہکتی ہوئی شاخ
تیرے قدموں کے لیے پیش ہے رنگیں بہار
رخصتی پر یہ مرا درسِ حقیقت سُن لے
تجھ کو جس گھر کی ضیا بن کے چلا جانا ہے
تجھ کو جس گھر میں جلانے ہیں محبت کے چراغ
بس وہی گھر ترے احساس میں اٹھانا ہے
جس کو انجانی منازل کا سفر آتا ہے!
بس وہی عزمِ مصمم کا امیں ٹھیرے گا،
جس کی سیرت میں ہو خورشیدِ حقائق کی کرن
محفلِ حسن میں وہ حسنِ حسیں ٹھیرے گا
"اے بہن" لاکھ مصائب ہوں رہِ ہستی میں
اپنے افکار کو پابندِ حمیت رکھنا
اپنے دن رات کو عظمت کی شعاعیں دینا
اپنے اطوار کو پابندِ شریعت رکھنا
تیرے چہرے پہ رہے غازۂ تزئینِ جمال
تیرے ماں باپ بہن بھائی دعا دیتے ہیں
تیرے دامن میں چمکتے رہیں مریخ و زحل
جو بھی دیتے ہیں تجھے حد سے سوا دیتے ہیں
تیری تشبیہ کو الفاظ نہیں مل سکتے!
کلکِ دبستان کا ہر لفظ تجھے دیتا ہوں
تیرے قدموں پہ چڑھاتا ہوں محبت کے گلاب
اپنے دیوان کا ہر لفظ تجھے دیتا ہوں
تیرے لمحے پھولوں کی ضمانت ہو جائیں
تیرے افکار ترے علم کی امانت ہو جائیں

گوہر امروہوی

اپنا گریباں

محمد طارق

پوسٹ مین نے سیٹھ کرم چند کو، جو دالان میں آرام کرسی پر تشریف فرما تھے، ٹیلی گرام دیا۔

سیٹھ کرم چند نے جیسے ہی ٹیلی گرام پڑھا بین کر کے زار و قطار رونے لگے "راجو کیا کیا یہ تو نے! میری برسوں کی کمائی مٹی میں ملا دی! ہائے! اسی لئے میں نے تجھے پڑھایا لکھایا تھا۔ راجو — آں — آں"

میں نے سوچا کہیں راجو نے خودکشی تو نہیں کر لی۔ مگر راجو ایسا لڑکا ہے تو نہیں۔ ان کا ہونہار ذہین بیٹا راجو ایم۔ بی بی ایس ڈاکٹر، بمبئی میں سروس کرتا ہے۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی رہ آیا تھا۔ ہنسی خوشی دس بارہ روز رہ کر گیا تھا۔

کہیں اس کا ایکسیڈنیٹ تو نہیں ہو گیا؟ میرے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

'خدا نہ کرے' میرے دل کی آواز لبوں تک آئی اور راجو کا خوب صورت چہرہ، تن درست، توانا، سجیلا بدن میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ میرے کانوں میں سیٹھ کرم چند کے رونے کی آواز ٹکرا رہی تھی، جو بتدریج بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

بے چارے سیٹھ کرم چند، شہر کے سب سے نیک آدمی، سب کی بھلائی چاہنے والے — کون سی ٹریجڈی ہو گئی ان کے ساتھ؟

ابھی پرسوں ہی انہوں نے ایک زندگی کے اہم مسئلہ کو، جو المیہ میں بدلنے والا تھا، اپنے اثر سے منٹوں میں حل کر دیا تھا۔

ہوا یہ کہ محلے کے ایک شخص دھرم داس کی لڑکی مالتی کی شادی تھی۔ دھرم داس معمولی دکان دار تھا۔ مالی حیثیت بری نہیں تو زیادہ اچھی بھی نہ تھی۔ عین شادی کے وقت دولہا کے

ملتی ہے

برہان حفیظ

جب کبھی میں لائبریری میں جاتا ہوں میری نظریں سب سے پہلے میز پر بیٹھی اس خوب صورت اور نیک سیرت کو ڈھونڈتی ہیں جو مجھے پابندی سے اسی مقام پر ملتی ہے۔ میں اس کے پاس جاکر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے ملاقات کرتی ہے اور ہر بار نت نئے قصے کہانیاں افسانے وغیرہ چھیڑتی ہے۔ میں اس سے گفتگو میں گم ہو جاتا ہوں۔ جب کوئی افسانہ ختم ہو جائے تو وہ دوسرا افسانہ یا پھر کوئی دل چسپ قصہ یا کہانی سننے پر مجبور کرتی ہے۔ ویسے میں اس سے بور کبھی نہیں ہوتا۔ جب بھی ملاقات کرتی ہے، ہر بار نیا انداز، نیا روپ اور نیا ڈھنگ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے پاس سے اٹھوں ہی نہیں، مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے خاموشی اختیار کئے لائبریری سے باہر نکل جاتا ہوں۔

کچھ دیر کی ملاقات میں ہی وہ کبھی مجھے اپنے بہنوں اور بھائیوں کے افسانے سناتی ہے، کبھی لطیفے سنا کر ہنساتی ہے۔ خاموشی شاید اس کے بس کی بات نہیں شعر گوئی سے بھی دل چسپی رکھتی ہے۔ کبھی کسی شاعر کی غزل تو کبھی کسی شاعر کی نظم یا کوئی دل چسپ اور پسندیدہ شعر۔ اور ہاں، اس کی زبانی پکوان کی ترکیبیں سن کر تو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

بیوی کو اس سے ملاقات کی روداد سنا کر جب اس کی ترقی کے لئے دعائیں دیتا ہوں تو اور بھی لطف آتا ہے، کیوں کہ یہ میری بیوی کو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کبھی کبھی تو وہ جھگڑ ا بھی کر بیٹھتی ہے۔ شاید یہ فطری بھی ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کی تعریف سن کر شک میں پڑ ہی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود میری بیوی کے دل میں اس سے ملاقات کی خواہش بھی کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ وہ پوچھتی ہے کہ آخر وہ کیسی ہے جو آپ اس پر اتنے لٹو ہیں۔ جب میں لائبریری جانے کے لئے تیار ہوتا ہوں تو کہتی ہے "ہاں، اب تو اس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ ساری بے چینی اسی کے لئے تو ہے۔ اب اس کے سنائے ہوئے لطیفے اور افسانے سن کر آئیں گے اور پھر سامنے دھر ادھر اکر میرے غصے کو اور بھڑکاؤ گے۔ مجھے یوں جلانے سے کیا فائدہ؟"

ایک دن میں نے کہہ ہی دیا: "بیگم یوں غصہ میں آنے سے کیا حاصل؟ وہ خوب صورت اور نیک سیرت دہلی سے آنے والی 'بانو' کے سوا کوئی اور نہیں جو ہر ماہ پابندی سے لائبریری میں آتی ہے۔ موقع ملنے پر آپ سے بھی ملاقات کراؤں گا، فکر نہ کیجیے۔"

○○

گھر والے اڑ گئے: "ہمیں پانچ ہزار روپیہ چاہئے، کیوں کہ تم نے شادی کا انتظام ٹھیک نہیں کیا۔ جتنا جہیز یا جے پر صرف کرنے کا وعدہ کیا تھا پورا نہیں کیا۔ شامیانے بھی ڈھنگ سے نہیں سجائے۔ ہمیں پانچ ہزار روپیہ نقد چاہئے، نہیں تو... نہیں تو...."

"نہیں نہیں، ایسا نہ کیجیے!" دھرم داس سر تا پا کانپ گیا۔ فوراً ہی اس کے کانپتے ہوئے بدن کو کرم چند نے سہارا دیا اور دولہا والوں کو ڈانٹا: "تم شادی کر رہے یا سودے بازی؟ میں اپنے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ پانچ ہزار تو کیا، تمہیں پانچ پیسے بھی نہیں ملیں گے۔ جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ تم سمجھتے ہو کہ ٹھیک شادی کے وقت پر انکار کرنے سے لڑکی کی زندگی برباد ہو جائے گی، مگر انسانیت ابھی مری نہیں ہے۔ ساری دنیا بازار نہیں بنی ابھی۔ میں اسی وقت اس لڑکی کی شادی کروں گا۔"

انہوں نے طائرانہ نظر سامنے دم بخود کھڑے لوگوں پر ڈالی۔ ایک اسمارٹ نوجوان پہ ان کی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ ان کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ آنکھوں میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سی روشنی جھلکنے لگی۔

وہ نوجوان اسی محلے کا رہنے والا تھا اور کلکٹر آفس میں کلرک تھا۔ اس کے والد کرم چند کے ہاں عرصہ ہوا ملازم رہ چکے تھے۔

"آؤ موہن، تم دولہا بنو۔"

موہن حیرت سے کرم چند کو دیکھنے لگا۔

"آؤ، میں کہہ رہا ہوں آؤ۔"

موہن فرماں بردار بیٹے کی طرح ان کی طرف بڑھا، اور اس نے دھرم داس کی بیٹی کو اپنا لیا اور اس کی اجڑتی زندگی میں بہار لے آیا۔

دھرم داس کے چہرے پر ان گنت پھول کھل گئے، جیسے اسے دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔ وہ بے اختیار کرم چند کے قدموں پر جھک گیا۔ "سیٹھ جی تم انسان نہیں، فرشتہ ہو فرشتہ!"

ہاں، سیٹھ کرم چند فرشتہ ہی تو ہیں۔ خدا کرے ان کے بیٹے کو کچھ نہ ہو — میں سوچتے ہوئے آگے بڑھا۔

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔

"سیٹھ جی، کیا ہو گیا؟ کیا کیا راجو نے؟ کیا ہو گیا اسے؟"

"ارے بھائی، اس نے شادی کر لی، ایک غیر ذات کی لڑکی کے ساتھ۔ لو میرج۔ مجھے خبر تک نہیں دی نمک حرام نے۔ میں نے اس کے لئے اچھے گھرانے کی لڑکی دیکھ لی تھی۔ اسی ہزار دے رہے تھے وہ، اسی ہزار — میں کیا کروں؟ آں — آں —"

میرے کانوں میں جیسے کوئی پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا تھا۔

○

ان سے ملئے

پہلی حولدار انسٹرکٹر ہوم گارڈ

پاکیزہ حبیب

"ہیلو، میں پاکیزہ حبیب، حوالدار انسٹرکٹر ہوم گارڈز آپ سے ہم کلام ہوں۔ آج کل میں غازی آباد (اُتر پردیش) میں تعینات ہوں، جہاں بیس بائیس ہوم گارڈ لڑکیوں کو ٹریننگ دینا میری ڈیوٹی ہے۔"

پولیس فورس میں تو آپ نے عورتوں اور لڑکیوں کا نام سُنا ہوگا، مگر ہوم گارڈز میں ان کی آمد ایک نیا تجربہ ہے۔ خود مجھے ہوم گارڈز کے محکمے میں اس مقام تک پہنچنے کی ترغیب ہمارے ایک عزیز حفاظت علی صاحب پلاٹون کمانڈر ہوم گارڈز نے دی تھی۔ ان کی خواہش رہی ہے کہ مسلمان لڑکیاں بھی مُلک کی تعمیر میں آگے بڑھیں اور صرف چولھے چکی تک اپنی زندگی کو محدود نہ کریں۔ میری بھی یہی آرزو تھی جس کی تحریک مجھے 'بانو' سے ملی تھی۔ 'بانو' کا مطالعہ کرکے ہی میں نے ایک سپنا بُنا تھا۔

حفاظت علی صاحب نے میرے ابّوجی (اختر الاسلام) سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ میری ممّی کچھ ہچکچائیں۔ مگر ابّوجی نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ ان دنوں میں میرٹھ میں ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھاتی تھی، جہاں تنخواہ کی رسید پر جتنی رقم کے لئے دستخط کرائے جاتے تھے' اصل تنخواہ اُس سے آدھی دی جاتی تھی جب کہ اس اسکول کے بانی اور سرپرست کی پوری زندگی' ایک کالج میں تعلیم دیتے ہوئے گزری تھی۔ میں اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی مگر کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ ہوم گارڈز میں داخلے کی تجویز ایک غیبی امداد محسوس ہوئی اور میں نے اپنی منظوری دے دی۔ داخلے کی تیاری کے لئے حفاظت علی صاحب نے پہلے مجھے تھوڑی سی تربیت دی۔ پریشانی پریکٹیکل کے مرحلے پر نمودار ہوئی۔ ہمارا گھر اس قابل نہ تھا کہ وہاں اُچھل کود، بھاگ دوڑ، سائیکلنگ وغیرہ ہوسکے۔ یہ تمام امور فزیکل ٹریننگ سے متعلق تھے۔ جن کی اس محکمے میں ضرورت تھی لیکن جہاں چاہ وہاں راہ کے مصداق اس کا بھی حل نکل آیا۔ میں صبح شام اپنے چھوٹے بھائی 'پاشا' کے ساتھ فزیکل ٹریننگ کے لئے کبھی کمپنی باغ، کبھی لیڈیز پارک جانے لگی، وہاں حفاظت علی صاحب نے مجھے فزیکل ٹریننگ دی۔

فارم پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۸۵ کو ہوم گارڈز ہیڈ کوارٹرز (میل روڈ) میں امتحان ہوا' جو پانچ دن تک چلا۔ فزیکل ٹیسٹ بھی ہوا جس میں ریس اور رسّا کود خاص تھے۔

ہوم گارڈز میں داخلے کے امتحان کے لئے کم سے کم قابلیت جونیئر ہائی اسکول تھی۔ میں بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ عمر ۱۸ سال سے ۵۰ سال تک مطلوب ہے۔

(میری پیدائش علی گڈھ میں ۱۹۶۵ میں ہوئی تھی)

ایک ماہ بعد ہمارا نتیجہ آیا۔ میں پاس ہوگئی تھی اور ۲۱ دسمبر ۸۵ ۱۹ کو پولیس لائن شاہجہاں پور (اُتر پردیش) میں جانے اور ٹریننگ حاصل کرنے کے احکام ملے تھے۔ ۵۲ لڑکیوں میں اپنا نام دیکھ کر میں پھولی نہ سمائی۔ اسی گروپ میں ہمارے ساتھ ۲۷ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں بھی تھیں۔ اصل تردّد کا دور یہی تھا۔ میں نے کبھی اکیلے گھر سے قدم باہر نہیں نکالا تھا۔ ممّی بہت زیادہ پریشان تھیں۔ مگر لوگوں کے سمجھانے بُجھانے پر انہیں اطمینان ہوگیا۔

پولیس لائن شاہجہاں پور میں پہنچ کر دو تین دن تک مجھے اکیلے اکیلے نئے ماحول میں خود کو سمونے کے لئے بہت جدّوجہد کرنا پڑی۔ آخر وقت نے ہمّت اور حوصلہ دیا اور میں نے نئے ماحول کو قبول کرلیا۔ (اس کے سوا کوئی اور صورت بھی تو نہ تھی۔

ہوم گارڈ یونٹ ۱۹۶۲ میں ہند چین جنگ کے دنوں میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۶۳ میں اُتر پردیش ہوم گارڈز رولز بنائے گئے۔ ہوم گارڈز کو پولیس کے تابع کیا گیا اور ان کا دائرہ کار ہوائی حملوں، آتش زنی، سیلاب، بیماری پھیلنے اور دوسرے ہنگامی حالات میں عوام کی مدد کرنا

طے ہوا۔ یہ ایک رضاکارانہ فورس تھی۔ جتنے روز کے لئے ہوم گارڈز کی ضرورت پڑتی تھی، دس پندرہ روپے روزانہ کے حساب سے ان کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ انہیں خاکی وردی ملتی تھی۔ پہچان کے لئے ٹوپی پر ایک بیج لگا رہتا تھا۔ جس پر زیتون کی پتیوں کے درمیان دونوں پنکھ کھولے ہوئے فاختہ بنی ہوتی تھی۔ اس کے نیچے پٹی پر نشکام سیوا (بے غرض خدمت) کندہ تھا۔

خواتین کے سال کے آغاز میں شریمتی اندرا گاندھی کے ایما پر اس ڈیپارٹمنٹ میں خواتین کے داخلے کے بارے میں سوچا گیا تھا۔ پولیس میں حولدار کی پوسٹ خواتین کے لئے نہیں تھی، اس لئے ہوم گارڈز میں اس کی شروعات کی گئی تا کہ وقت ضرورت پولیس میں ان کو شامل کیا جاسکے۔ حولدار ٹریننگ دینے والا چھوٹا آفیسر ہوتا ہے۔ پہلے ہوم گارڈ ایک رضاکار عوامی خادم ہوتا تھا۔ مگر اب باتنخواہ ملازمت کا حق دار ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ نئی نسل میں اس محکمے میں شامل ہونے کی کشش بھی بڑھ گئی ہے۔

بات ٹریننگ کی ہو رہی تھی۔ شاہ جہاں پور میں بہت سخت ٹریننگ کورس ہوا۔ جاڑوں میں صبح سات بجے سے دس بجے تک اور گرمیوں میں صبح چھ بجے سے نو بجے تک آر ٹی۔ بی ہوتی تھی۔ صبح سیٹی بجتے ہی ہم سب اپنے کمروں سے وردی پہنے ہوئے نکل پڑتے تھے۔

اگر کسی کو اس وقت دیر ہو جاتی یا پریڈ میں کوئی غلطی ہو جاتی تو اُسے پورے گراؤنڈ کے دوڑ لگا کر چکر لگانے پڑتے تھے یا مینڈک کی چال کی سزا بھگتنی ہوتی تھی۔ مینڈک کی چال میں بیٹھ کر کمر یا کولہوں پر ہاتھ باندھ کر زمین پر کافی دور تک چلنا ہوتا تھا۔

ٹریننگ کا وقت شام کو تین بجے سے پانچ بجے تک بھی تھا۔ صبح کو ایک گھنٹہ پریڈ کرنے کے بعد ناشتے میں دلیا ملتا تھا۔ اس کے بعد پی۔ ٹی ڈرِل اور مارچنگ ہوا کرتی تھی۔ دوپہر کو کھانا ملتا تھا۔ تیسرے پہر کو چائے اور رات کو کھانا دیا جاتا تھا۔ گیارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک کلاسیں

ہوا کرتی تھیں۔ جن میں جنرل نولج، ہوم گارڈز ایکٹ اور لاء (قانون) پڑھائے جاتے تھے۔

آٹھ بجے رات کو رول کال ہوتا تھا اس کا مقصد یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ سب لڑکیاں اپنی اپنی جگہ حاضر ہیں۔

ہوم گارڈز میں سیکشن کمانڈر پلاٹون انچارج ہوتا ہے۔ ایک پلاٹون میں ۲۴ یا ۲۵ لڑکیاں ہوتی ہیں۔

یہاں ۴ ماہ کے ٹریننگ کورس میں، ہتھیاروں اور سوشل ٹریننگ دی گئی۔ ہتھیاروں کی ٹریننگ میں ۲۲، کی فائرنگ اور بعد میں ۳۰۳ کے ۶۵ راؤنڈ پورے کرنے پڑے۔ سوشل پروگرام میں، مٹی کھودنا، لپائی پتائی، کیاری بنانا، پیڑ لگانا وغیرہ شامل تھے۔

ٹریننگ کے دوران میں ہم دو تین بار آؤٹنگ کے لئے شاہ جہاں پور سے قریبی مقامات سیر و تفریح کے لئے سیکشن کمانڈر کے ساتھ گئے۔ ٹریننگ کے دوران میں چھٹی بالکل نہیں ملتی تھی۔ یہاں تک کہ پورے ۴ مہینے میں مجھے صرف ایک دن کی چھٹی موچ ٹھیک کرانے کے لئے ملی تھی۔ یہاں کردار سازی پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ کیا مجال جو اجازت کے بغیر کوئی آدمی باہر سے آکر لڑکیوں سے مل سکے۔ بھائی یا باپ سے بھی متعلقہ لڑکی کو پوری چیکنگ کے بعد الگ ملاقاتی کمرے میں بہت تھوڑے سے وقت کے لئے ملنے دیا جاتا تھا۔

یہاں ہمیں تین وردیاں ملیں۔ خاکی وردی تو سرکاری طور پر مفت ملی، لیکن سفید وردی کے لئے، ہمیں الگ پیسے دینے پڑے۔ کھانے کے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کٹتے تھے۔ مگر کھانا اچھا نہیں ہوتا تھا جمعرات کو ٹریننگ نہیں ہوتی تھی۔ اس دن صرف سوشل کام کرنے پڑتے تھے۔ کلاسیں دونوں وقت لگتی تھیں۔

جمعہ کا دن بڑی پریڈ کے لئے وقف ہوتا تھا۔ اس روز کوئی نہ کوئی آفیسر آتا تھا۔ اس لئے کھانا بھی نسبتاً بہتر ہوتا تھا۔ اس دن کھانا دیکھ کر ہی احساس ہو جاتا تھا کہ آج جمعہ ہے۔ بستر وغیرہ کا انتظام سرکار کی طرف سے ہوتا تھا۔ سونے کے لئے تخت ملے ہوئے تھے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۶ کو ہم لوگوں کو ایڈوانس ٹریننگ کے لئے سیتاپور بھیجا گیا۔ یہاں ہم نے ڈرل، ملٹری، انسٹرکٹر (ڈی۔ ایم۔ آئی) کا کورس پورا کیا۔ یہاں ہمیں اسلحہ (ایل۔ ایم۔ جی، پستول، ریوالور، اسٹین گن، وی۔ ایل۔ پی گرینیڈ وغیرہ) کی ٹریننگ دی گئی، مگر یہاں شاہ جہاں پور جیسی ہر وقت کی بھاگ دوڑ نہ تھی۔ سوشل کام بھی نہیں ملتا تھا البتہ کلاسیں ضرور ہوتی تھیں، کھانا بھی اچھا ملتا تھا۔

شروع شروع میں اسلحہ کی ٹریننگ میں جب ٹریگر دبایا جاتا تو زور کا جھٹکا لگتا۔ ہتھیار بھی کافی بھاری لگتے تھے۔ دھیرے دھیرے سب عادت پڑ گئی۔ یہاں اتوار کی چھٹی بھی ملتی تھی۔

۶ دسمبر کو لکھنؤ ہیڈ کوارٹرز میں ہوم گارڈز ڈے بھی منایا جاتا تھا اس لئے سیتاپور سے ساری پلاٹون وہاں گئی تو وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ نے خاص طور پر ہوم گارڈز لڑکیوں کا معائنہ کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

مجھے فخر ہے کہ اپنے ملک ہندوستان کی تعمیر ترقی میں میرا بھی تعاون شامل ہوا۔ میری خواہش ہے کہ میری ہم مذہب لڑکیاں بھی گھر کی چار دیواری سے باہر آئیں اور یہ دکھا سکیں کہ چوڑیوں والے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہے اور عورت مرد کی محکوم نہیں ہے ■

مہرن

ایس، ایم، یوسف

"بہت دیر ہوگئی چھوٹے سرکار"

اس نے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ کر کہا "اب مجھے جانے دیجئے ــــ کہیں بیگم صاحبہ ادھر آنکلیں تو . . . ." خوف سے اس کے چہرے کا کنول زرد پڑ گیا۔ "مہرن! تم ــــ تم ــــ" چھوٹے سرکار اُلجھ گئے۔ "ہم آج ہی امی حضور سے بات کریں گے۔"

"خدا کے لئے چھوٹے سرکار مجھے بیگم صاحبہ کے عتاب کا نشانہ نہ بنایئے۔ میں مرجاؤں گی۔" وہ کانپ کانپ اٹھی "کہاں آپ کا وقار خاندان اور کہاں میں . . ." پنکھڑی جیسے لب لرز رہے تھے ــــ چہرہ دُھواں دُھواں تھا۔

"ڈرپوک فاختہ!" چھوٹے سرکار پیار سے اس کے گلابی گالوں کو سہلاتے ہوئے بولے۔

اسی لمحہ جھاڑیوں کے پیچھے سرسراہٹ سی ہوئی اور مہرن چھوٹے سرکار کے سینے سے اس طرح لگ گئی جیسے طوفان آنے پر پرندے آشیانوں میں پناہ لے لیتے ہیں۔

حویلی کے پائیں باغ میں پھیلی ہوئی جھاڑیوں کے پیچھے سے دو گہری گہری آنکھیں چھوٹے سرکار اور مہرن پر مرکوز تھیں ــــ یہ شکورا تھا۔ حویلی کا چوکیدار۔

"آؤ ذی شان!" بیگم صاحبہ کچھ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"امی حضور، آپ نے ہمیں یاد کیا؟"

"ہوں ــــ" بیگم صاحبہ سنہری عینک آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر بولیں "ہم نے تمہارے لئے لڑکی پسند کرلی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس حویلی میں بہو آجائے۔"

"لیکن امی حضور . . . . . ."

"ہمارا فیصلہ تمہاری رائے کا محتاج نہیں ذی شان!" بیگم صاحبہ اس 'لیکن' کا مطلب خوب سمجھتی تھیں۔ انہوں نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی اُچک لی اور اپنے رعب کا سکہ جمایا۔ "ہم جو کریں گے تمہارے حق میں بہتر کریں گے۔"

"کون ہے وہ؟" چھوٹے سرکار اپنے تجسس کو نہ روک سکے۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہم اپنے خاندانی وقار کو نہیں بھولے ــــ ہم نے محل کے لئے محل ہی چنا ہے۔" بیگم صاحبہ نے طنز کیا۔

نتیجہ

"بغیر عنوان کے"

بانو: فروری ۱۹۸۰ میں سعید سرحدی کا افسانہ "بغیر عنوان کے" شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان بانو، بہنوں، بھائیوں کو تجویز کرنا تھا
تمام عنوانات کو غور سے پڑھنے کے بعد رشمی چندر کردم (دہلی) کے بھیجے ہوئے عنوان "جذبات کا تاج محل" کو پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔
قریشی محبوب خان (مہاراشٹر) کے بھیجے ہوئے عنوان "بے نور سورج" کو دوسرے انعام کا اور رشحال سلطانہ (یادگیر) کے بھیجے ہوئے عنوان "اندھے رشتے" کو تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ ان کو بالترتیب تیس روپے اور بیس روپے کی کتابیں ارسال کی جائیں گی۔ پسند آنے والے کچھ اور عنوانات یہ ہیں: "اندھی آنکھیں روشن خواب" (تسلیم النساء (مہاراشٹر)) "نابینا شاہ جہاں" (حسین بانو لاہور) "طوفان نخلستان" (نورالرحمٰن، حیدر آباد)
خود مصنف نے اس افسانے کا نام "اندھا تاج محل" تجویز کیا تھا

مگر خدا کی پناہ! ذی شان اس طنز کی پرواہ کئے بغیر کہہ گئے، "امی حضور، ایک لڑکی ہم نے بھی پسند کی ہے۔"

"بہت خوب!" بیگم صاحبہ بیٹے کی اس جرأت پر دل کھول کر ہنسیں "کیا نام ہے اس کا؟ کس کی بیٹی ہے؟"

"مہرو ---- مہرن"

"ذی شان!" بیگم صاحبہ غضب ناک ہو گئیں، "تم اس دو ٹکے کی چھوکری کے لئے اپنی حیثیت، اپنا خاندان اور اپنا وقار بھول رہے ہو ---- لیکن یہ یاد رکھنا" انہوں نے اپنا نے اپنا فیصلہ سنایا: "ہمارے جیتے جی وہ مردار اس حویلی کی بہو کبھی نہیں بن سکتی ---- ہم اپنے بزرگوں کی روحوں کو شرمندہ ہونے نہیں دیں گے۔"

"امی حضور، یہ سب پرانی باتیں ہیں میں انہیں نہیں مانتا۔"

"خاموش! اگر ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو ----" ان کے چہرے پر بے پناہ جلال، اور لہجہ میں تندی تھی ---- "ایک لونڈی کے لئے ہم سے بدکلامی! کان کھول کر سن لو، ہم تمہاری شادی کسی نواب زادی سے ہی کریں گے، اس حرام زادی سے نہیں، جس کے خون کا پتہ، نہ خاندان کا ---- ہماری مہربانیوں تلے، پلی وہ ناگن ایک دن ہمارے ہی خاندان پر پھن کاڑھ کر بیٹھ جائے گی ---- یہ معلوم ہوتا تو اسی وقت اس کا سر کچل دیتی۔"

برسوں پہلے بیگم صاحبہ میکے سے حویلی واپس آ رہی تھیں ---- راستے میں انہیں وہ بچی ملی تھی ---- ایک بھیڑیا اسے اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کے حکم پر کئی گولیاں چلیں اور اس احتیاط سے چلیں کہ بچی کا بال بیکا نہ ہوا، اور بھیڑیا لوٹ پوٹ ہو گیا۔

نہ جانے کس کی بچی تھی۔ بیگم صاحبہ کی سخاوت اسے حویلی لے آئی ---- دودھ جیسی رنگت والی یہ بچی خود انہیں بہت بھائی تھی۔ خاص طور سے اس کی چاند جیسی پیشانی پر پڑا ہوا وہ ہلکا سا سیاہ داغ جو اس کے بھولپن میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

بیگم صاحبہ نے اس بچی کو رحمتے کی گود میں ڈال دیا، جو اُن کی حویلی میں کھانا پکانے کا کام کیا کرتی تھی۔ رحمتے بیگم صاحبہ کی اس نوازش پر پھولی نہ سمائی ---- خوشی کی دھار اس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔

بچپن چھوڑ، مہرن جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوئی تو کچھ اس طرح نکھری کہ دیکھنے والوں کا آنکھیں سنبھالنا مشکل ہو گیا ---- ایسا بے پناہ حسن کہ داد دینے کو دل بے اختیار چاہ اٹھے ---- ایسی قیامت خیز جوانی کہ جس کے آگے ہزاروں جوانیاں سرنگوں ہو جائیں۔

چھوٹے سرکار کی اس پر نظر پڑی تو ٹکی کی ٹکی رہ گئی ---- انہوں نے اس بھولی سی کومل، چاند سی اجلی لڑکی کے نازک نازک تلوؤں کے تلے اپنا دل بچھا دیا۔

بیگم صاحبہ نے سوچا، جوانی کی آگ ہے، ایک دو برسات میں سرد پڑ جائے گی۔ مگر یہ تو بھڑکے ہی جا رہی تھی ---- شکورا کی بات سن کر اُن کے پیروں تلے زمین نکل گئی ---- بیٹے سے بات ہوئی تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ----

"مہرنیا! اری او مہرنیا!" کتنی ملامت بھری للکار تھی۔

"جی!" وہ ہانپتی کانپتی بیگم صاحبہ کے دربار میں حاضر ہوئی۔

"موئی نمک حرام! تری یہ مجال ---! زمین پر رہ کر آسمان کے خواب دیکھنے چلی ہے!"

وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ سر جھکائے بیگم صاحبہ کے عتاب کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہی۔

"نکل جا ابھی وقت یہاں سے! اور اگر پلٹ کر بھی حویلی کی طرف رخ کیا، تو یہ

تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا"
اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا
آنسوؤں سے لبریز، شکوہ بھری، بے بس
آنکھیں! چھوٹے سرکار — تڑپ اُٹھے۔
ہر سو طوفان آگیا — حویلی کی بنیادیں
تک لرز اٹھیں۔

چھوٹے سرکار آگے بڑھے، ایک
کپکپاتا ہوا ہاتھ ان کے ہاتھ میں آگیا۔
" مہرن یہاں سے اکیلی نہیں جائے گی
ساتھ میں ہم بھی جائیں گے —" وہ سرکشی
پر آمادہ تھے۔

بیگم صاحبہ نے نظر اٹھا کر بیٹے کا سخت
اور غصے سے سُرخ چہرہ دیکھا اور پھر اپنے
ترکش کا آخری تیر چلا دیا۔ "خبردار ذی شان!
دودھ نہ بخشوں گی اگر تم نے یہ قدم اٹھایا۔"

چھوٹے سرکار کا دل دھک سے
رہ گیا — نہ جانتے ہوئے بھی انہیں بیگم
صاحبہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور ان
کے دیکھتے دیکھتے مہرن ان کی دنیا سے دُور
چلی گئی —

رسوا!

بدنام!

بے سہارا!

کافی منت سماجت کے بعد چھوٹے
سرکار شادی کے لئے رضامند ہوئے تو جا نو
بیگم صاحبہ کے دل کے سارے کنول کھل اٹھے
انہوں نے جھٹ بیٹے کا پیغام نواب تاج دار
حسین کی صاحب زادی کے لئے بھجوا دیا۔

آن کی آن میں رشتہ طے ہوگیا اور
دلہن ستاروں کے پنڈولے میں جھولتی حویلی آگئی

مدیرانِ شمع کی رہائش گاہ پر

شامِ مجروح

پچھلے دنوں "بانو" کی مدیرہ
سعدیہ دہلوی کی دعوت پر،
مدیرانِ شمع کی رہائش گاہ پر
"شامِ مجروح" منائی گئی۔
مجروح سلطان پوری نے
حاضرین کو اپنے تازہ کلام
سے نوازا۔ دائیں طرف:
مرکزی وزیر توانائی
وسنت ساٹھے، سعدیہ دہلوی
اور یونس دہلوی

▲ اوپر کی تصویر (دائیں سے بائیں) عصمت چغتائی، زینت کرژد دہلوی، یونس دہلوی، سی این گینڈگل اور خورشید عالم خاں
▼ محفلِ شعر و سخن کا ایک منظر

لگتے ہی پُرخلوص ہاتھوں نے سہارا دے کر سے مرمریں ستونوں والی سہ دری میں اتارا۔ لڑکیاں بالیاں اس کے رُخ روشن کا دیدار کرنے کو ٹوٹ پڑیں۔

" اے ہٹو لڑکیوں ! دلہن نہ ہوئی ، عجوبہ ! ذرا سانس تو لینے دو غریب کو۔" بیگم صاحبہ کہہ تو گئیں ، مگر خود اپنی خواہش کو نہ روک سکیں۔ اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سُرخ گھونگھٹ اُلٹ دیا۔

دھماکا —— زبردست دھماکا —— ! جیسے ان کے چاروں طرف بم پھٹ پڑے ہوں ——

مہرن دلہن کے روپ میں ان کے سامنے جلوہ افروز تھیں۔ پاؤں کی جوتی سر کا تاج بن گئی۔

یہ سب کیسے ہوا ، ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا —— وہ اندر کی طرف لپکیں۔ دیوار پر ٹنگی نواب صاحب کی بندوق انہیں راستہ دکھا رہی تھی۔

دھائیں ! دھائیں ! دھائیں ! لگاتار تین گولیاں چلیں اور دلہن بنی مہرن خون میں لت پت ہو گئی۔

" یہ آپ نے کیا کیا بیگم صاحبہ۔ !" دلہن کے ساتھ آئی ہوئی وہ عورت خوف اور حیرت سے بولی : " یہ تو مر گئی !"

" جہنم میں جائے حرام زادی —— !" غصے سے تھر تھر کانپتی ہوئی بیگم صاحبہ بولیں " جانے کس کا پاپ ہے —— ہاتھ کیا پکڑا ، گلے ہی آ پڑی۔ ہم نے آج اس کا قصہ ہی ختم کر دیا۔"

آخر بیگم صاحبہ اپنے خاندان کی روایت کو ٹوٹتے بکھرتے کس طرح دیکھ سکتی تھیں۔ خون اور ہڈی کا سوال تھا۔

" یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ !" وہ عورت پھر بولی : " یہ لڑکی تو نواب تاج دار حسین کی بیٹی ہے ، جو برسوں بعد انہیں واپس ملی تھی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں۔ جب یہ بچی تھی تو کوئی بھیڑیا اسے حویلی کے پائیں باغ سے اٹھا لے گیا تھا — جانے کس مہربان کی مہربانیوں سے بچ نکلی —— آپ اس کی پیشانی پر یہ ہلکا سا سیاہ داغ۔ ۔ ۔"

وہ جانے کیا کیا کہتی رہی مگر بیگم صاحبہ مزید آگے اور کچھ نہ سُن سکیں —— ان کا ذہن مفلوج ہو گیا اور ساری حویلی ان کی آنکھوں میں گھومنے لگی —— ●●

مہندی کا رنگ گہرا کرنے کی ترکیب : کچھ املی لے کر تھوڑے سے پانی میں بھگو دیں۔ چند گھنٹے بعد املی کو پانی میں مسل لیں اور اس کے بعد باریک کپڑے میں چھان لیں۔ پھر چھنے ہوئے پانی میں مہندی کو گھول کر لگائیں تو مہندی بہت گہرا رنگ چھوڑے گی۔

پیتل کے برتن اور گل دان صاف کرنے کی ترکیب : پیتل کے برتن یا گل دان وغیرہ اگر کالے پڑ جائیں تو ایک کھٹا سنگترہ یا لیموں کاٹ کر ان پر خوب ملیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گل دان یا برتن صاف ہو جائے گا۔

میلا آئینہ صاف کرنے کی ترکیب : تھوڑی سی روئی میتھلیٹڈ اسپرٹ میں بھگو لیجئے اور اس سے آئینے کو جلدی جلدی صاف کیجئے اسپرٹ خود بخود خشک ہو جائے گا اور آئینہ بالکل صاف ہو جائے گا۔

تانبے کے برتن صاف کرنے کی ترکیب : تانبے کے برتنوں کو نمک کے پانی میں سرکہ ملا کر صاف کیجئے۔ برتن خوب چمکنے لگیں گے۔

فرش پر سے سفیدی کے دھبے دور کرنے کی ترکیب : گھر میں سفیدی کرانے سے فرش پر چھینٹیں پڑ جاتی ہیں ، جو نہایت بدنما معلوم ہوتی ہیں۔ کپڑے دھونے کا سوڈا اور تھوڑا سا سرسوں کا تیل لے کر دونوں کو تھوڑے سے پانی میں ملا لیں اور پھر کپڑے کو اس میں بھگو کر فرش پر رگڑیں۔ سفیدی کے داغ آسانی سے دور ہو جائیں گے۔

شیشے کو صاف اور چمک دار بنانے کی ترکیب : تیل کو پانی میں ملا کر ململ کے صاف ٹکڑے پر لگا کر شیشے پر خوب ملئے۔ ملنے کے بعد تقریباً دس منٹ تک رکھا رہنے دیجئے سوکھ جانے پر ململ کے صاف ٹکڑے سے اچھی طرح صاف کر لیجئے پھر دیکھئے کہ وہ کتنا صاف اور چمک دار ہو جاتا ہے۔

المونیم کے برتن کو صاف کرنے کی ترکیب : المونیم کے برتنوں کو صاف اور چمک دار بنانے کے لئے دھان کا کھردرا اور سوکھا بھوسا لے کر اس سے برتنوں کو اچھی طرح مانجیں۔ جب برتن صاف اور چمکیلے نظر آنے لگیں تو صاف پانی سے برتنوں کو دھو ڈالیں برتن نہایت چمک دار اور صاف ہو جائیں گے۔ ●

"میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم شادی سے انکار کیوں نہ کر سکیں — اور اب کیوں اتنا بڑا قدم اُٹھانے پر مجبور ہو؟ میں تو..."

"ندیم!" برق کی آواز کانپ کر اُبھری تو سلمان صاحب کمرے کے باہر ہی ٹھٹھک گئے — وہ شاید سسک رہی تھی۔ پھر انہوں نے سُنا: "ندیم، بخدا میں نے انکار کیا تھا — جم کر انکار کیا تھا۔ مگر آپی کی ناگہانی موت اور امی کی مسلسل علالت، اس پر ان کا معصوم بچوں کا واسطہ دینا — مجھے مجبور ہو جانا پڑا، ندیم اور انجینیر صاحب کے پیار کے قدموں میں مجھے اپنی ضد اور انا کے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مگر — مگر تم نے بھی تو ضرورت سے زیادہ دیر کر دی۔ آخر کیوں؟"

سلمان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"یہ — برق!" لیکن دوسرے ہی لمحہ انہیں خیال آیا کہ چھپ کر کسی کی گفتگو سننا اخلاقی جُرم ہے۔ مگر بات برق کی سسکیوں کی تھی۔

انہیں واپس جانا بھی گوارا نہ ہوا۔ برق کے خیال سے ان کے قدم جم سے گئے — انہوں نے خود کو پیڑوں کے پیچھے اور اندھیروں میں کر لیا — اندر کمرے میں ٹیوب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، جو برق کے نڈر ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ندیم کے اگلے الفاظ ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا گئے۔

وہ کہہ رہا تھا: "جب پیار کا ناٹک انجینیر صاحب کے ساتھ رچایا جا رہا تھا تو مجھے دھوکے میں رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"غلط نہ سمجھو ندیم، انجینیر صاحب نے مجھے ہمیشہ چھوٹی گڑیا سمجھ کر اپنے بچوں کے برابر سمجھ کر پیار کیا ہے — مجھے افسوس ہے کہ ان کی پیاری بیوی کی موت پر انہیں جو صدمہ ہوا ہے، وہ ناقابلِ برداشت ہے اور میں خود بھی اس کا مداوا نہ بن سکی۔ ندیم، اب تو میں سوچتی ہوں کہ ان کی بیوی بن کر بھی میں شوہر کے لئے اپنے فرائض ادا نہ کر سکی اور نہ کبھی کر سکوں گی۔ اور یہ بھی غضب ہے کہ انہیں مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔ میں اپنی ہی آگ میں جل کر مر جاؤں گی، ندیم۔ اور اگر میں مر گئی تو سلمان میرا غم برداشت نہ کر سکیں گے۔ شاید وہ بھی موت کو گلے لگا بیٹھیں گے۔ پھر ان معصوم بچوں کا کیا ہوگا، جن کے لئے قربانی مجھ سے لی گئی اور میں نے اپنے پیار کے زخموں کا انتقام —

صفیہ یوسفی

بغیرِ عنوان کے
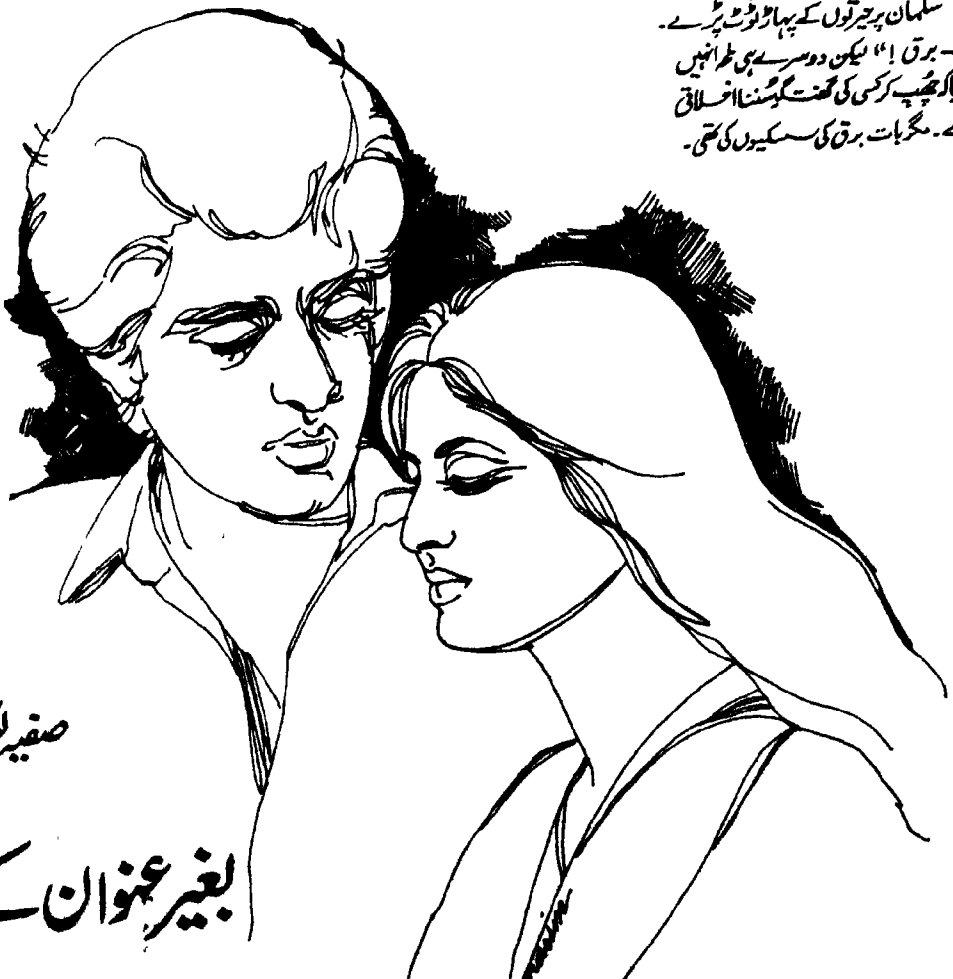
ناقابلِ برداشت انتقام سلمان سے لیا۔ اس طرح تو میری وجہ سے پورا گھر تباہ ہو جائے گا معصوم اور بے گناہ بچوں کو بے وجہ مار کر، رُلا کر، ان کی تڑپ سے میں اپنے دل کے ناسُور کا مرہم بناتی ہوں ــــ میری بے رُخی سے بھی بچّے مجھ سے نفرت نہیں کر پاتے سلمان کو میرے رویّے سے بے حد تکلیف ہوتی ہے سوچتی ہوں کہ اگر ان کی نظروں سے دُور ہو جاؤں تو ان کی مسلسل کوفت دُور ہو جائے گی اور معصوم بچّوں کے سروں پر باپ کا سایہ قائم رہے گا۔"

"لیکن برق، یہ ماننے کو دل نہیں چاہتا کہ تم ــــ تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ عورتیں تو ہمیشہ اپنی بے گناہی کا رونا روتی رہتی ہیں تم نے انجینیر دیکھا ــــ ایک معمولی سے لیکچرر کی اس کے مقابلے میں کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ تم نے دولت کے لئے اپنے پیار کا گلا گھونٹ دیا ــــ مجھے معلوم ہے کہ سلمان صاحب بہت بڑی پوسٹ پر ہونے کے علاوہ بہت بڑے جاگیردار بھی ہیں ــــ یقیناً ان کا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں ــــ اور اگر ہوتا بھی تو میں ان حالات میں تمہیں قبول کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں۔" ندیم شاید کھڑا ہو گیا تھا۔ دو قدم چلنے کی آہٹ ملی۔ پھر برق کی سسکی گونجی۔ لیکن دروازے تک آ کر ندیم پھر مڑا اور بڑے کرخت لہجے میں بولا " اور اگر گھر سے بھاگنے کا تمہارا ارمان اتنا ہی شدید ہو تو میرے سوا تم کسی اور کے ساتھ بھی جا سکتی ہو!"

"ندیم!" برق تڑپ اٹھی، لیکن ندیم تیزی سے چل دیا۔

سلمان ایک لمحہ کے لئے بُت بن گئے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے سُنا وہ سچ ہے۔ وہ حیرت زدہ سے ندیم کو جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ [illegible] سمجھاتیں لیکن دوسرے [illegible] میں ایک کوندا سا لپکا۔ [illegible]

سے ندیم کے پیچھے چلے۔ اب ندیم سلمان صاحب سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ ندیم سے ان کی جان پہچان تو تھی، لیکن اس راز سے وہ قطعی ناواقف تھے جو آج کھُل گیا۔ برق کی بچّوں سے بے رُخی خود ان سے برق کی انتہائی دُوری، ہر لمحہ برق کا غصّے میں بھرے رہنا، گھر سے بے زاری آج وہ گتھی سُلجھ گئی جو تقریباً چار ماہ سے ان کے دماغ میں اُلجھتی ہی جا رہی تھی۔

"مسٹر ندیم!"

ندیم اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اور اپنا نام سُن کر رُک گیا۔ مُڑ کر دیکھا تو سلمان صاحب پیار سے مسکرا رہے تھے۔ وہ سٹپٹا گیا، لیکن سلمان نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"کہو کیسی رہی تمہاری ٹریننگ؟"

"جی ــ ــ ٹھیک ہے" ندیم مُردہ سی آواز میں بولا۔

"کیا بات ہے؟ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟" سلمان نے نرمی سے پوچھا۔

"جی نہیں تو ــــ لیکن آپ ــ ــ"

"اوہ! میں نے تمہیں دیکھا تو روک لیا۔ کیا میں نے غلطی کی؟"

"جی نہیں تو ــــ میں تو ــــ!"

"کوئی بات نہیں ــــ دراصل میری تمہاری ملاقات غالباً دو ڈھائی سال کے بعد ہو رہی ہے۔ اور ــــ اور اتنے دنوں میں بہت کچھ بدل گیا" وہ دُکھ سے بولے۔

"جی، میں سمجھا نہیں۔"

"آؤ سامنے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں ــــ آؤ بھی ــــ!" پس و پیش کرتے ہوئے ندیم کا ہاتھ تھام کر سلمان ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ وہ پھر بھی گم صم تھا، لیکن سلمان مسکرا کر بولے " تم نے اپنی کامیابی پر مجھے مٹھائی نہیں کھلائی خیر کوئی بات [illegible] منہ میٹھا کر دو۔" [illegible] مٹھائی کے ساتھ کافی [illegible] کہ تم مجھ سے

عمر میں بھی چھوٹے ہو اور رشتے میں بھی۔"

"جی ــــ رشتہ؟" وہ پھر سٹپٹا گیا۔

"ہاں بھئی، شفق کے رشتے سے میں تمہارا بڑا بہنوئی ہوا اور عمر کے لحاظ سے بڑا بھائی۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ مسکرا دئے۔

"جی ہاں، لیکن ــــ انجینیر صاحب ــ ــ"

"نہیں!" سلمان ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"اگر بزرگوں میں شامل کر کے میری عزّت کرو تو مجھے سلمان بھائی کہہ لو ــــ میرا نام سلمان ہے نا۔"

اتنی گفتگو تک ندیم سنبھل چکا تھا۔

سلمان نے پہلے اس کی خیریت پوچھی، گھر والوں کی خیریت پوچھی، سروس وغیرہ کے متعلق معلوم کیا۔ اتنے میں بیرا میز پر مطلوبہ چیزیں رکھ کر چلا گیا۔ اور پھر سلمان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے متعلق بتانا شروع کیا۔

"ڈیڑھ سال پہلے میری پیاری بیوی شفق نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ بچّہ تو پہلے ہی شکم میں ضائع ہو چکا تھا اور ولادت کے وقت شفق نے بھی دم توڑ دیا۔ برق نے ہمیشہ میرے بچّوں کو بے حد پیار دیا تھا۔ اس کے پیار میں ڈوب کر بچّے جلد ہی ماں کا غم بھول گئے۔ لیکن امی صاحبہ کی صحت کو گھن سا لگ گیا۔ حالات، لوگوں کی رائے زنی، بچّوں کے مسئلے اور گھر کے سُونے پن کی وجہ سے تقریباً تمام رشتہ داروں اور خصوصاً امّی صاحبہ نے مجھے مجبور کیا کہ میں دوسری شادی کروں ــــ مجھے افسوس ہے کہ برق اس طوفان کی زد میں آ گئی۔ اتنی پیاری سی شوخ اور چنچل سی گڑیا اس حادثہ کا شکار ہو کر اپنی پیاری پیاری خصوصیات کھو بیٹھی ــــ جن بچّوں کو وہ اپنے کھلونے سمجھتی تھی، جن کے ساتھ بچّہ بن کر، کھیل کُود کر، شوخیاں کر کے وہ ڈانٹ کھاتی تھی، آج ان ہی بچّوں کی وہ صورت دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ان بچّوں کو رُلا کر، تڑپا کر شاید اسے سکون ملتا ہے۔ شاید ایسا میری وجہ سے ہے ــــ وہ نہ خود کبھی خوش رہتی ہے اور نہ ہی اور کو پُرسکون رہنے دیتی ہے اور مجھے تو اس کا بس نہیں چلتا کہ گھر سے نکال دے۔

مجھے تو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھوں۔ اس کے معصوم ارمان بکھر گئے۔ اس کا ذمہ دار میں ہی تو ہوں۔ بڑی کوفت ہوتی ہے ندیم — وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ مجھ سے نادانستگی میں اس پر ظلم ہو گیا کہ میں اس کی خوشیوں کی راہ میں دیوار بن گیا۔ — بخدا، میں اس پر یہ ظلم نہ ہونے دیتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ تمہاری امانت ہے۔"

"انجینیر صاحب!" ندیم کے کپ سے کافی چھلک گئی۔

"نہیں!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے "سلمان بھائی کہو۔ کیا تمہیں مجھ سے ذرا بھی لگاؤ نہیں، ندیم؟"

"لیکن آپ کو یہ سب بتایا کس نے؟ کیا برق نے؟"

"نہیں — بہرحال، مجھ سے ایک اخلاقی جرم ہو گیا، ندیم — امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے — لیکن میرے اس جرم نے اب مجھے ایک راستہ دکھا دیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں" - ندیم بوکھلا گیا۔

سلمان اطمینان سے بولے "تم اور برق جب کمرے میں گفتگو کر رہے تھے تو اتفاق سے میں آ گیا تھا اور میں نے چھپ کر وہ سب کچھ سنا جو مجھے نہیں سننا چاہیے تھا۔"

"لیکن اب — اب تو کچھ....."

"بہت کچھ ہو سکتا ہے — برق بالکل بے گناہ اور معصوم ہے، ندیم —" سلمان نے کپ واپس رکھتے ہوئے کہا "اور آج بھی وہ تمہاری امانت ہے۔ اسے قبول کر لو تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا — میں نے ہمیشہ اسے بہت پیار کیا ہے، ندیم۔ اپنے بچوں کی طرح چاہا ہے اسے — میرے دل کے خلاف امی نے بچوں کے خیال سے اچانک ایک فیصلہ کر ڈالا اور ان کی علالت، مجبوری اور محبت کے سامنے مجھے سر جھکانا پڑا، کیوں کہ میں نے انہیں ہمیشہ اپنی حقیقی ماں سمجھا تھا۔ برق نے کوئی ناٹک نہیں کھیلا۔ وہ بالکل بے قصور ہے — معلوم ہوتا ہے تمہیں اپنی برق پر بھروسا نہیں۔"

ندیم نے ندامت سے سر جھکا لیا، لیکن سلمان کہتے رہے: "مجھے جواب دو، ندیم — آخر تم نے اس کا معصوم دل پیروں تلے کیوں روند ڈالا؟"

"وہ اب میرے لئے اپنی نہیں پرائی ہے سلمان بھائی۔" ندیم بولا — "میں اسے جتنا غصہ دکھا کر آیا ہوں، بخدا وہ حقیقت نہیں سب دھوکا تھا — صرف اس لئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرے اور مجھے بھول سکے۔ حالانکہ مجھے اس کی امید کم ہے، پھر بھی میرا فرض تھا کہ میں کسی طرح اسے اس کے بچکانہ اور نادان ارادے سے روکوں — میں یہ شہر چھوڑ دوں گا، سلمان بھائی۔ میں برق کی زندگی کو شعلوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ شاید کچھ دن میں وہ سنبھل جائے۔ وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے، سلمان بھائی خدا کے لئے اس پر کسی قسم کا شک نہ کریں میں نے قصداً اس کے لئے غلط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔" ندیم کی آواز ڈوبنے لگی اور اس نے سر جھکا لیا۔

سلمان نے دیکھا کہ ندیم کی آنکھیں چھلک پڑنے کو ہیں۔ وہ ٹوٹی سی آواز میں بولے۔

"اچھا، ٹھیک ہے — لیکن اب تم مجھ سے وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں گا، تم ضرور مان لو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں، سلمان بھائی — برق کی خوش گوار ازدواجی زندگی کے لئے اگر آپ مجھ سے میری زندگی بھی مانگیں تو بخدا انکار نہیں کروں گا۔"

"مجھے بھی برق کی خوشیاں عزیز ہیں ندیم۔ اور اسی وجہ سے میں تمہیں حکم نہیں دے رہا ہوں بلکہ گزارش کر رہا ہوں کہ تم — تم برق کو اپنا لو۔"

"سلمان بھائی!" وہ لرز گیا۔

سلمان جلدی سے بولے "ہاں ندیم، میں یہ سچے دل سے کہہ رہا ہوں — میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں — اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔"

"لیکن — لیکن کیسے میں —"

"گھبراؤ نہیں" سلمان اطمینان سے بولے "دراصل میں اسے کبھی اپنا نہ سکوں گا اور نہ کبھی وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ وہ تمہارے ساتھ جانے کی خواہش مند ہے — اسے لے جاؤ بس، مجھے خاموشی سے اپنا پتہ دے جانا تاکہ میں طلاق نامہ رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج سکوں۔ اس کے علاوہ ایک گزارش اور ہے۔ وہ یہ کہ میرے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے جانا، ورنہ وہ برق کی جدائی برداشت نہ کر سکیں گے۔"

"مگر سلمان بھائی......"

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجیے۔

۲۵ر مارچ ۱۹۸۷ تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام، پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔

بغیر عنوان کے، ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"تم فکر نہ کرو — پورا انتظام میں کروں گا۔ بس تم تاریخ اور وقت سے مجھے آگاہ کر دینا— میں تمہیں رخصت کرنے آؤں گا— اور ہاں، ہماری ملاقات اور گفتگو کی خبر برق کو نہیں ہونا چاہئے— آؤ بس اب چلیں۔"

"اس قدر زبردست کام مجھ سے نہ لیجئے سلمان بھائی۔"

"ابھی ابھی تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔ مجھے بھائی کہہ کر کسی قسم کا خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔" اور سلمان کھڑے ہو گئے۔

ندیم کا دماغ سن سا ہو گیا— وہ بھی سلمان صاحب کے ساتھ چل دیا۔ سلمان نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور ندیم کو رخصت کر کے اپنی کوٹھی پر واپس آ گئے۔ لیکن ندیم کے لئے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ آئے۔

سلمان گھر آئے تو برق سامنے ہی نظر آ گئی— شوخ، چنچل، سرخ سرخ آنکھیں، خشک ہونٹ، بکھری لٹیں۔ وہ کھڑی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ منا دوڑتا ہوا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ سلمان وہیں ٹھٹھک گئے۔

"آنٹی! مجھے بھوک لگی ہے۔" منا مچل گیا۔ لیکن اس کا معصوم تخاطب اسے بہت مہنگا پڑا۔ برق نے تڑپ کر ایک تھپڑ اس کے دائیں گال پر مار دیا۔ وہ گر گیا۔ لیکن برق نے اسے اٹھایا نہیں، بلکہ اسے روتا تڑپتا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت منی اس کے سامنے پڑ گئی۔ برق بڑبڑائی: "تم ہی منحوسوں کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن گئی۔" اور منی کے گال پر بے خطا ہی تھپڑ پڑ گیا۔ دونوں بچے روتے رہے لیکن برق نے جا کر اندر سے کمرہ بند کر لیا۔

سلمان نے بڑھ کر منے کو اٹھایا، منی کو چمکارا اور دونوں کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے بچوں کو بہلایا اور خادمہ سے کہہ کر بچوں کا کھانا اپنے کمرے میں منگوایا۔ بچے پھر بھی آنٹی کی رٹ لگائے تھے۔ سلمان کو یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ مار کھانے کے باوجود بچے آنٹی سے دور رہنا پسند نہیں کرتے۔ پھر انہیں کچھ خیال آیا اور بچوں کے پاس خادمہ کو چھوڑ کر وہ خود برق کے کمرے کی طرف چلے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے بڑی ہمت کر کے دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ برق نے دروازہ کھولا، لیکن سلمان کو دیکھتے ہی پھنکار کر بولی: "آپ کو میرے کمرے میں آنے کے لئے کس نے کہا؟"

"کسی نے نہیں۔ میں تمہارے کمرے میں آ بھی نہیں رہا ہوں— ہاں، مجھے تم سے چند الفاظ کہنا ہیں۔ اگر سن لو تو....."

"میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی!" اور اس نے دھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔ سلمان واپس ہو گئے اور وہ اپنے بستر پر گر کر رو پڑی— اسے بچوں اور سلمان کو دھتکار کر بے حد تکلیف ہوتی تھی، لیکن اسی وقت اس کی یادیں اس کے تصورات میں اس کے ماضی کی فلم کا اسکرین بن جاتی تھیں۔ اور اس کی آنکھیں سمندر اگلنے لگی تھیں— وہ مجبور ہو جاتی تھی اور اپنے جذبات کے خلاف ظلم اور زیادتی پر اتر آتی تھی۔ اس کی بھیگی پلکوں میں ماضی کی تصویریں لرزنے لگیں۔

اچھلتی کودتی ریکٹ گھماتی وہ مجسم برق جب گھر میں داخل ہوئی اور شفق کو ماں کے پاس بیٹھے دیکھا تو مارے خوشی کے ایک ہی چھلانگ میں پہنچی اور شفق سے لپٹ گئی۔

"میری آپی! پیاری آپیا! آپ آج اچانک کیسے؟ آنے کی خبر دی ہوتی تو میں آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن جاتی— منا کیسا ہے؟ میری منی کہاں ہے؟ اور— اور وہ انجینیر صاحب— باپ رے! ان کا نام لیتے ہی تو میری سانس رکنے لگتی ہے۔ اوہ— مائی— گاڈ!" وہ جلدی سے شفق سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی اور چاروں طرف دیدے گھما کر بولی "کہیں آس پاس موجود تو نہیں— کہ— کہ میری گھگھی ہی بندھ جائے!"

اور پھر زور سے ہنس کر شفق کے برابر بیٹھ گئی۔ شفق کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں چھوٹی بہن کے لئے پیار کا سمندر موجزن تھا— ایک لمحے کے لئے برق چپ ہوئی تو آپی بولیں: "نہ دعا، نہ سلام— نہ خیریت پوچھی۔ بس تو نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ یہ کون سی تمیز ہوئی، برق؟"

"اوہ— سوری ممی۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ اچھا آپی، ایکسکیوز می پلیز— ہاں تو اب خیریت بتائیے—" اس نے غور سے بہن کا چہرہ دیکھا اور بولی— "ہاں چہرہ تو آپ کا سرخ سیب سے بدل کر پیلی موسمی بن گیا۔ گالوں پر پھوٹتی ہوئی شفق غائب ہو گئی۔ آنکھوں میں کمزوری جھلک رہی ہے۔" وہ بے چین ہو کر بولی "کیا ہوا آپی؟ آپ کی علالت کی کوئی تو خبر ہمیں نہیں ملی۔"

"اوف— وہ! تیری عادت بدلے گی نہیں؟" شفق نے مسکرا کر کہا—

"کیوں بدل جاؤں؟" وہ بناوٹی خفگی سے بولی "مجھے بسورتی ہوئی صورتیں پسند نہیں—"

"تو کیا میں بسورتی رہتی ہوں؟" شفق پھر مسکرا دی۔

"یوں نہیں، میری طرح ہنسئے کھل کر۔ زور سے— ہاہاہا!"

"چل شریر!" شفق نے پیار سے اس کے گال پر ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تو ماشاء اللہ بی۔ اے۔ فائنل کا رزلٹ آنے والا ہے۔ بسورو نہیں تو کم از کم کچھ سنجیدہ تو ہو جاؤ— میں تو تمہارے لئے لڑکا تلاش کر رہی ہوں۔"

"شکریہ— مگر میں خود تلاش کر لوں گی۔" برق بے دھڑک بولی— "ہاں، بس سنجیدہ ہونا میرے لئے موت کا پیغام ہے۔"

"خدا نہ کرے۔" شفق نے اسے لپٹا لیا۔

"تیری بلائیں لے کر میں مر جاؤں!"

"ہونہہ! تو آپ کے ننھے کون پالے گا؟"

"وہ تو مجھ سے زیادہ تمہیں چاہتے ہیں — ہر وقت آنٹی کے لئے مجھ سے لڑتے رہتے ہیں۔ مجال نہیں کہ تمہارے خلاف وہ کوئی لفظ سُن تو لیں۔"

"ارے ہاں آپی — آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کس قسم کی علیل ہیں؟"

وہ پھر اُچھل کر بولی تو شفق نے سر جھکا لیا لیکن امّی بولیں "اب تیرے بالوں میں جھولا جھولنے کے لئے تیرا مُنّا آنے والا ہے۔"

"اوہ آپی! لیکن وہ — انجینیئر صاحب — ارے باپ رے رے! ان کا تو نام لے کر ہی میں ڈر جاتی ہوں — ہاں، تو انہوں نے آپ کو یہاں کیسے بھیج دیا؟"

"وہ دورے کے سلسلے میں کچھ دن کے لئے باہر جانے والے ہیں۔ اپنے اطمینان کے لئے انہوں نے میرا یہیں رہنا پسند کیا۔ بس وہ ایک ہفتے کے لئے آئے ہیں۔"

"اوہو! تو کیا ایک ہفتے کے لئے میں کہیں چلی جاؤں؟"

"چل پگلی! وہ تو تجھے گُڈّو یا گُڈّو کہہ کر کتنا پیار کرتے ہیں اور تو......"

"اور میں اپنے مُنّا اور مُنّی سے پیار کرتی ہوں۔" اس نے دُور سے آتے ہوئے بچّوں کو دیکھا اور ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی دوڑ گئی تو شفق مسکرا کر بولی۔ "سچ مچ برق اسم با مسمّٰی ہے، امّی — دیکھئے بچّوں سے کتنا پیار کرتی ہے!"

"ان میں مل کر تو یہ بھی وہ بھی تو ہو جاتی ہے —" امّی بھی مسکرا دیں۔ "کیا کھیل بنتا ہے اس کا ان بچّوں میں — اس کا تو بچپن جاتا ہی نہیں۔"

چند منٹ کے بعد جب برق سامنے آئی تو مُنّا اس کی پیٹھ پر کاندھوں سے لٹکا ہوا تھا۔ اور مُنّی اس کی کمر پر مشک بنی ہوئی تھی۔ پھر تو بچّوں اور برق میں اس طرح کھیل ہونے لگا کہ دھما چوکڑی کی وجہ سے امّی اور آپی کا آپس میں گفتگو کرنا مشکل ہو گیا۔ امّی نے پریشان ہو کر ڈانٹ دیا تو برق بچّوں کو لے کر لان پر چلی گئی۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ شفق کی طبیعت خراب ہو گئی اور اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کی حالت سُدھرنے کی بجائے اور بگڑتی گئی۔ تیسرے دن اس نے ایک مُردہ بچّے کو جنم دیا اور چند منٹ کے بعد خود بھی دم توڑ دیا — انجینیئر صاحب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ان کے بچّے شفیق ماں کے سائے سے محروم ہو چکے تھے۔ امّی اور برق اس ناگہانی حادثہ پر بکھر کر رہ گئیں۔ لیکن غم کے باوجود برق نے بچّوں کو بڑے پیار سے بہلا لیا۔ بچّے یہ سمجھے کہ ان کی مّی انہیں آنٹی کے پاس چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی ہیں — بچّے آنٹی کے پاس مستقل رہنے کے خیال سے خوش ہو گئے۔ سلمان نے اپنا دورہ ملتوی تو کیا لیکن کچھ دن کے بعد انہیں جانا ہی پڑا — سرکاری کام جو تھا۔ بچّے برق کے پاس ہی رہے۔

اچانک ایک دوسرے حادثہ نے نمودار ہو کر گھر کے ہر فرد کو بوکھلا دیا۔ شفق کی موت نے امّی کی صحت کو گھن لگا دیا تھا اور اب تو سات آٹھ ماہ کے عرصے میں وہ بستر سے لگ گئی تھیں۔ ان کی مسلسل علالت نے سنگین شکل اختیار کر لی۔ ڈاکٹروں نے بلڈ کینسر بتایا۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ مشکل سے ڈھائی تین ماہ کی مہمان ہیں۔ یہ منحوس خبر سُن کر برق کے حواس گم ہو گئے۔ سلمان کو بیوی سے جُدائی کے غم کے ساتھ برق، بچّوں اور امّی کی علالت کی ذمّہ داری نے حد سے زیادہ فکر مند کر دیا۔ ایسے میں برق کو ندیم کا خیال آیا۔ اگر اس وقت ندیم ہوتا تو اس کا ہر دُکھ سُکھ اس کا اپنا ہوتا۔ حالانکہ سلمان نے بھی امّی کے لئے وہی سب کچھ کیا جو ندیم کرتا۔ لیکن سلمان اس کے اتنے اپنے تو نہ تھے جس قدر خود سے قریب وہ ندیم کو سمجھتی تھی۔ اسی دوران حالات سے مجبور ہو کر سلمان نے اپنا ٹرانسفر یہاں کرا لیا تھا اور اب مسلسل ساتھ نے سلمان سے برق کا خوف بھی کچھ کم کر دیا تھا۔ پھر بھی اسے ہر طرف اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔

انتقام

- اگر کوئی کُتا تمہیں کاٹے تو کیا تم بھی کتے کو کاٹو گے؟ (ہندوستانی کہاوت)
- انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔ (جرمن کہاوت)
- انتقام کی عمر سو برس کی ہو جائے تو بھی اس کے دانت دودھ کے ہی رہتے ہیں (اطالوی کہاوت)
- انتقام کی پلیٹ ٹھنڈی کر کے کھاؤ۔ (انگریزی کہاوت)
- انتقام لینے سے انسان اپنے دشمن جیسا ہو جاتا ہے اور نہ لینے سے اس سے بدرجہا بہتر۔ (بیکن)
- دشمن کو معاف کر دینا انتقام لینے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ (نامعلوم)

امّی کے کان میں بھی اپنے مرنے کی سُن گُن کسی طرح پہنچ گئی۔ وہ مسکرائیں، لیکن ان کی پلکیں بھیگ گئیں۔ انہیں اپنی یقینی موت کی فکر نہیں تھی، بلکہ برق کا خیال تھا، ان معصوم بچّوں کی فکر تھی جو کبھی سوتیلی ماں کی زد میں آ سکتے تھے۔ برق اور بچّوں میں انتہائی پیار نے انہیں ایک راستہ دکھایا، لیکن برق بپھر پڑی۔

"امّی، آپ میری فکر نہ کریں۔ میں آپی تو ہوں نہیں کہ بھیڑ بکریوں کی طرح باندھ دی جاؤں اور خاموش رہوں۔"

"لیکن سلمان میں بُرائی کیا ہے، بیٹی۔ لاکھوں میں ایک ہے — پھر یہ بچّے — سوتیلی ماں کو ان سے تمہاری جیسی ہمدردی تو نہیں ہو سکتی نا۔"

"بچّوں کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہ سکتے ہیں لیکن سلمان بھائی میں کوئی بُرائی نہ سہی، بہر حال شادی تو میں اپنی پسند سے ہی کروں گی۔"

"میں نے بھی ہمیشہ ایسا ہی سوچا، اسی

دیر سے اب تک تجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن اب میں چراغِ سحری ہوں۔" وہ گڑگڑا کر بولیں۔ "مشفق کی رُوح کو چین سے رہنے دے اور مجھے بھی سکون سے مرنے دے میری بچی، ورنہ مجھے مرنے کے بعد بھی سکون نہ ملے گا۔" وہ سسک پڑیں۔

برق کے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ "ندیم!" پھر اسے خیال آیا کہ اب تک اس نے ندیم کو ایک خط بھی نہیں لکھا ہے۔ ندیم کے آنے میں ابھی کم از کم تین ماہ ہیں۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے کیا کہے؟ کئی بار وہ یہی سب کچھ سوچ چکی تھی لیکن آج امی کی مایوسی اور ان کی گڑگڑاہٹ سے اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آج انہوں نے اپنے زوردار الفاظ کا استعمال تملق قسم کے لہجہ میں کیا تھا۔ اب وہ ماں سے کیسے کہے کہ وہ ندیم کا انتظار کر رہی ہے۔

اور پھر وہی ہوا جو اس کی تقدیر میں لکھا تھا۔ امی کی ٹوٹتی سانسوں کے درمیان اسے نکاح قبول کرنا پڑا۔۔۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اپنے غم و غصہ کو دل میں دبائے وہ ماں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"امی ـــــ اب تو آپ خوش ہیں؟"

اور اس نے دیکھا کہ ممی کی جن آنکھوں میں التجا، گزارش اور تشویش تھی، اب وہی آنکھیں تشکر بھرے انداز میں مُسکرا رہی تھیں اور کچھ ہی دیر کے بعد انہوں نے سب کو دعائیں دیتے ہوئے ہمیشہ کے لئے آنکھیں مُوند لیں۔ برق اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ گئی۔ کوئی اس کا اپنا نہ تھا۔ جو اس کا اپنا بنایا گیا، اس سے وہ خود بے گانہ تھی۔ اور جسے وہ اپنا سمجھتی تھی اس کے لئے وہ خود پرائی ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے غم و غصّہ نے نفرت کی شکل لے لی ـــ گھر سے نفرت، بچّوں سے نفرت، سلمان سے نفرت، ساری دنیا سے نفرت۔ بس خود پر اسے ترس آتا تھا لیکن آج ندیم کے الفاظ نے اسے خود سے بھی نفرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ تین چار دن تک وہ سوچتی رہی: "کیا سلمان انکار نہیں کر سکتے تھے؟ مجھ پر انہوں نے اتنا بڑا ظلم کیوں ہونے دیا؟" پھر خود ہی اسے خیال آیا کہ سلمان اس کے اور ندیم کے درمیان قلبی تعلقات سے بے خبر بھی تو تھے۔ اس کے علاوہ سلمان نے کبھی امی کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی۔ ان کی اپنی ماں نہیں تھیں، اس لئے انہوں نے ہمیشہ امی کو ہی ماں سمجھا تھا۔ پھر ایسے نازک وقت میں تو سرکش اور خودسر اولاد بھی ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ خود وہ کس قدر سرکش تھی، لیکن آخر کار اسے ماننا ہی پڑا۔ اگر سلمان نے بھی امی کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا تو کیا گناہ کیا اور یہ سب سوچتے ہوئے اسے سلمان پر ترس بھی آتا تھا، لیکن سلمان کو بے خطا سمجھنے کے باوجود اس کے دماغ میں لاوا سا پکنے لگتا تھا وہ پاگل سی ہو جاتی تھی اور سلمان اور بچّوں کے ساتھ ہر ظلم روا رکھتی تھی۔ سلمان نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ برق اور اس کے جا و بے جا ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کرتے رہیں گے، اس اُمید پر کہ کبھی تو برق کا غصّہ اُترے گا۔ اب تو ان پر برق کے غصّہ کا راز بھی کھُل گیا تھا۔

چوتھے دن خادمہ نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"بی بی جی، آپ سے کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔"

برق نے دروازہ کھولا اور بڑے تیکھے انداز میں طنز سے پوچھا۔ "تمہارے صاحب تو نہیں؟"

"جی نہیں، کوئی اور صاحب ہیں۔ یہ کارڈ دیا ہے ـــ"

"ندیم!" کارڈ دیکھ کر برق اُچھل پڑی "بٹھاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔"

اس نے اپنے بکھرے بال سمیٹے، لباس کی سلوٹوں پر ہاتھ پھیرا اور جلدی سے باہر کے کمرے میں پہنچ گئی

"ندیم، اب کیا میری بے بسی کا مذاق اُڑانے آئے ہو؟" وہ حسبِ عادت بپھر کر بولی۔

ندیم بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور جلدی سے بولا۔

"نہیں نہیں، برق ـــ مجھے غلط نہ سمجھو۔ اس دن میں غصّہ میں بہت کچھ کہہ گیا تھا، مگر بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ میں اور تم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہ سکیں گے۔ زندگی خدا کی عطا کردہ نعمت ہے، برق اسے یوں نہیں کھونا چاہئے۔ اب تو ہمارے زندگی شروع کرنے کے دن آئے ہیں نا ـــ برق! مجھے۔۔۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"مجھے تمہاری تجویز منظور ہے، مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" برق اُچھل پڑی۔

"مگر سلمان بھائی ـــ ان کے ساتھ تو بے انصافی ہو گی۔"

"اور میرے ساتھ کون سا انصاف ہوا ہے؟" وہ پھٹ پڑی "میرا دل نہ جلاؤ ندیم ـــ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تو رہنے دو اپنی بناوٹی باتیں اور چلے جاؤ یہاں سے"

"نہیں نہیں برق! ایسا نہیں ہے۔ اور چلاؤ بھی نہیں، کیوں کہ سلمان بھائی کے آنے کا وقت بھی ہو رہا ہوگا۔"

برق تڑپ کے بولی "تو انہیں جواب میں دوں گی۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔"

ندیم نے بہت سمجھایا کہ ہو سکے تو وہ حالات سے سمجھوتا کر لے۔ بچّوں کی معصومیت کا سوال رکھا تو وہ بعد میں انہیں لے جانے پر تیار تھی۔ طلاق کا سوال اُٹھا تو معلوم ہوا کہ وہ لکھ کر طلاق لے لے گی۔ بہر حال سب سے پہلے اس جہنم سے چھٹکارا پانا اس کا مقصد تھا ـــ یہ سب باہر کھڑے ہوئے سلمان نے بھی سُنا ان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دن تاریک ملے

کرکے ندیم بھی چلا گیا۔ اور برق کے دماغ میں پکتا ہوا لاوا دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہونے لگا —— اب اس نے بچوں کو مارنا چھوڑ دیا۔ انہیں خود نہلاتی، خود ان کے لباس بدلتی اور اپنے ہاتھوں سے انہیں کھانا کھلاتی۔ بچوں کو تو جیسے جنت مل گئی، لیکن سلمان کو آنے والے طوفان کا یقین ہو گیا۔

وہ دن بھی آ گیا جب برق کو جانا تھا ایک چھوٹے سے بیگ میں اس نے اپنے دو جوڑے کپڑے، ایک تولیہ، ایک کنگھا اور چھوٹا سا آئینہ رکھا۔ کچھ روپیے رکھے اور شام کا انتظار کرنے لگی —— سلمان اپنے کمرے میں بت بنے بیٹھے رہے۔ وہ کئی دن سے دیکھ رہے تھے کہ برق تنہائی میں بچوں کو لپٹا کر کئی بار روئی بھی تھی —— اور آج تو وہ بچوں کا سایہ بنی ہوئی تھی۔ بار بار چھپکے چھپکے آنچل سے اپنی پلکیں خشک کر رہی تھی اور سلمان اندر ہی اندر خشک ہوتے جا رہے تھے۔

شام ہوئی تو برق نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا —— پھر اسے سلمان کا خیال آیا —— نہ جانے کیوں بیگ اٹھاتے ہی اس کے قدم سلمان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے، اور اپنی محویت سے وہ اس وقت چونکی جب سلمان نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا —— وہ سلمان کی آنکھوں میں گھٹے گھٹے ناثر سے لرز گئی، لیکن دوسرے ہی لمحہ کڑک کر بولی۔

"میں جا رہی ہوں —— اور بس! اس کے آگے نہ مجھے کچھ کہنا ہے اور نہ کوئی جواب چاہئے مجھے ——" اور فوراً مڑ کر گیٹ کی طرف چلی۔

سلمان تھکے تھکے قدموں سے باہر آئے لیکن وہ کار میں بیٹھ چکی تھی —— ڈرائیور کے بیٹھنے پر بولی۔

"اسٹیشن!" اور پھر سلمان کو دیکھ کر رخ پھیر لیا۔

کار اسٹیشن کی طرف دوڑنے لگی۔ اور اسٹیشن پر اتر کر اس نے ڈرائیور کو واپس کر دیا۔

ندیم نے بڑھ کر اس کا بیگ تھام لیا اور دونوں ہنستے کھلکھلاتے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ٹرین میں انہوں نے اپنی سیٹیں ڈھونڈیں اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے —— یکایک کھڑکی کے فریم میں سلمان کا چہرہ ٹھہر گیا۔ ندیم اور برق دونوں سن ہو گئے۔ سلمان کی گود میں منّی کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور منّا منہ پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ دونوں بچوں کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اور سرخ آنکھیں، بکھرے بال، دن بھر کا الجھا لباس اور مسلسل ہچکیاں —— ندیم اور برق دونوں کا دل ان روتی تصویروں کو دیکھ کر کٹ گیا۔ برق نے خود کو ٹوٹ کر بکھرتا ہوا محسوس کیا۔ پھر وہ خود کو سنبھال کر مری سی آواز میں بولی

"آپ بچوں کو کیوں لے آئے؟"

"بچوں کو بخدا میں نہیں لایا برق! بلکہ بچے خود مجھے لائے ہیں —— میری تم سے صرف اتنی التجا ہے کہ اگر ہو سکے تو انہیں اپنے ساتھ لیتی جاؤ، ورنہ ان معصوموں کو دکھی کرنے کے بعد میں زندگی کو برداشت نہ کر سکوں گا۔" سلمان کی آواز بھرا گئی تو رو کر منّے نے آنٹی پکارا اور منّی بھی مچل گئی —— برق کے آنسو نکل پڑے اور سلمان ڈوبی آواز میں بولے۔ "خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے —— تمہیں سکھ اور سکون دے برق —— میری دعائیں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہیں گی۔"

سلمان نے منّی کو گود سے اتارا اور کمپارٹمنٹ میں چھوڑ دیا تو اس کے پیچھے منّا بھی دوڑا اور دونوں برق کے گھٹنوں سے لپٹ گئے —— ندیم خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"نہ جائیے آنٹی —— میری اچھی آنٹی —— آنٹی ——!" بچے روتے رہے اور برق ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اسی وقت گاڑی کی سیٹی برق کی سماعت کو پاش پاش کر گئی۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی اور دونوں بچوں کو باہوں میں سمیٹ کر سسک پڑی۔

سلمان شکست خوردہ سے بولے۔

"مبارک ہو، ندیم۔ خدا کرے تم دونوں ہمیشہ خوش رہو —— اچھا خدا حافظ ——" انہوں نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔

"نہیں!" برق چیخ پڑی۔ "نہیں نہیں! میں نہیں جا سکتی —— کہیں نہیں جا سکتی —— میرا گھر ہے —— میرے بچے ہیں —— میرے بچے —— میرے ——" اور اس نے باہوں میں سمیٹے ہوئے بچوں کو زور سے بھینچ لیا۔

گاڑی نے اب رینگنا شروع کر دیا تھا لیکن برق رینگتی ہوئی گاڑی سے بچوں کو دبوچ کر بڑی پھرتی سے کود پڑی۔ جلدی سے بچوں کو پلیٹ فارم پر چھوڑ کر وہ مڑی اور گاڑی کے ساتھ چلتے ہوئے بولی "خدا حافظ ندیم —— خدا حافظ —— دیکھو تم خوش رہنا تمہیں میری قسم —— اور ہاں، مجھے معاف کر دینا ندیم۔" وہ بے قرار ہو کر رو دی لیکن ندیم نے کھڑکی سے جھک کر اسے مسکرا کر رخصت کیا۔ گاڑی نکل گئی اور وہ سوچنے لگا "شاید سلمان بھائی نے فوراً طلاق اسی لئے نہیں دی تھی کہ ممکن ہے برق راہِ راست پر آ ہی جائے۔"

سلمان اور بچے برق کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سلمان نے روتی ہوئی برق کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر اسے بڑے پیار سے گھر لے آئے اور اپنے حسنِ سلوک سے انہوں نے برق کے دل سے اس کی شرمندگی کا احساس بھی مٹا دیا۔

●●

اُمید!

- اُمید باعمل انسان کی کنیز ہے (ٹیگور)
- جتنی زیادہ اُمید اتنی زیادہ مایوسی۔ (کہاوت)
- حافظہ پیچھے نظر ڈالتا ہے اُمید آگے (رام چندر شکلا)

ہیلتھ کلب

سیدہ فخر سلطانہ

اعصابی امراض اور اُن کا علاج

موجودہ دَور کے تقاضوں نے عورت کے رول کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ پہلے عورت کی دُنیا گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ بیرونی دُنیا کے اُتار چڑھاؤ سے اُسے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا۔ لیکن آج کے دَور میں اُس کے کندھوں پر گھر گرہستی کے علاوہ بیرونی کاروبار کا بھی کچھ نہ کچھ بوجھ آپڑا ہے۔ ایسے میں سماجی اور تہذیبی قدروں کا بدلنا لازمی تھا۔ چنانچہ ماضی میں جن عادات واطوار کو عورت کی فطری خوبیاں شمار کیا جاتا تھا۔ آج وہی بعض اوقات اُس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہونے لگی ہیں۔ مثلاً شرمانا، جھجکنا پچھلے زمانے میں کسی لڑکی یا عورت کا بہترین وصف مانا جاتا تھا۔ لیکن آج اگر یہی جھجک یا شرم کسی خاتون پر اُس وقت غالب آجائے جب وہ کسی عہدے کے لئے انٹرویو دے رہی ہو تو ذہانت، تعلیم اور لیاقت کے باوجود اُس کی کامیابی مشکوک ہوجائے گی۔ اِس سے یہ مطلب بھی نہیں نکالنا چاہئے کہ عورتیں اپنی فطری جھجک اور شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دیں۔ تاہم وہ ایسی جھجک اور شرم سے باز رہیں جو انہیں اعصابی انتشار میں مبتلا کردے۔ ذہن کی وہ کیفیت جسے اعصابی اِنتشار کہا جاتا ہے مرد اور عورت دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے یہ کسی ایک خاص صنف کی بیماری نہیں لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ صنفِ نازک میں اس کے جراثیم کچھ وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی کامیابی کے بہترین مواقع اور شخصیت کا بہترین تاثر کھو بیٹھتی ہیں۔ آیئے، دیکھیں کہ اعصابی انتشار (NERVOUSNESS) کیا ہے اور اُس کا تدارک کیسے کیا جائے؟

اعصابی اِنتشار یا عصبی مزاجی اس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان لوگوں سے ملنے جلنے، جلسوں میں شریک ہونے اور لوگوں سے گفتگو کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات، عصبی مزاج کی بہت سی وجہیں بتلاتے ہیں، جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اپنی ذات کا احساس جتنا زیادہ ہوگا، اتنا ہی وہ عصبی المزاج ہوگا۔ بعض لوگ محض اِس وجہ سے خوش نہیں رہتے کہ لوگ اُن کی تعریف نہیں کرتے، اُن کی ذات سے دل چسپی نہیں لیتے یا اُن کی سرگرمیوں پر توجہ نہیں دیتے۔ اُن کے دل کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ وہ کسی غیر معمولی شخصیت کے مالک نہیں۔ اِس قسم کے احساسات اس غلط خیال کا نتیجہ ہیں کہ تعریف و توصیف ہی معاشرہ میں کامیابی کا میزان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی ستائش مقبولیت کی دلیل ہے اور بہت خوش گوار اور خوش آئند پہلو رکھتی ہے، مگر اس کو انسانی خوشی کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے۔ اپنے لئے مدح سرائی کی خواہش رکھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے پہلے خود انہیں دوسروں کو پسند کرنا، دوسروں کی تعریف کرنا سیکھنا ہے لیکن انسان پر جب اپنی ہی تعریف کرانے کا خیال چھایا ہوا ہوتو وہ صرف یہی سوچتا ہے کہ فلاں بات کے سلسلے میں اُس نے لوگوں پر کیا تاثر قائم کیا؟ اُن کی رائے کا کیا ورد عمل رہا؟ بعض اوقات لوگ محض نکتہ چینی کے خوف سے اپنی رائے نہیں دیتے یا اُن ہی چیزوں کے لئے اپنی پسند کا اظہار کرتے ہیں جن کی طرف عوام کا میلان ہوتا ہے خواہ انہیں یہ باتیں کتنی ہی خلافِ طبیعت کیوں نہ لگتی ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطری طبیعت سے علیحدہ ہوکر شعوری بے اطمینانی اور تحت الشعوری انتشار میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ چیز ان کی عصبی المزاجی میں اور بھی اضافہ کرتی ہے۔

اپنی ذات کے احساس اور نکتہ چینی کے خوف کی وجہ سے ہماری ساری توجہ اپنی ذات کی طرف مرکوز ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے کردار

کا ہر نقص ہمیں بہت بڑا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہم خود کو دُنیا کی نسبت سے دیکھنے کی بجائے اپنی نسبت سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جب ساری توجہ اپنی ذات، اپنے خیالات اور اپنے معاملات کی جانب مائل رہتی ہے تو ہمارا نقطۂ نظر بھی بدل کر بگڑ جاتا ہے اور ہماری آنکھیں دُنیا اور دُنیا کے لوگوں کو دیکھنے کی بجائے صرف اپنی ذات اور انا کو دیکھتی ہیں۔ ہمیں یہ بات جان لینی چاہئے کہ دُنیا میں کوئی بھی انسان نقائص سے پاک نہیں۔ اس لئے اپنی ذات کو کرید کرید کر مطمئن ہو جانا چاہئے کہ نقائص کے ساتھ مالکِ حقیقی نے ہمیں فلاں فلاں خوبیوں سے بھی نوازا ہے۔ میں نے کئی ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جو لوگوں سے ملنے جلنے سے صرف اس لئے کتراتی ہیں کہ وہ کالی ہیں، بہت پستہ قد ہیں، بہت موٹی ہیں یا ان کی صورت شکل اور شخصیت میں ایسی کوئی خوبی نہیں کہ لوگ تعریف کریں۔ یہ رویہ درست نہیں۔

عصبی مزاج کا مرض عام طور سے بچپن ہی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب بچوں پر والدین کی نگاہ سخت رہتی ہے تو انہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ دوسرے بچوں کی نسبت کم تر ہیں اس لئے بزرگوں کی تعریف اور توجہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ وہ اِس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کوئی ایسا کام کریں کہ اُن کی تعریف ہو اور وہ بزرگوں کی شفقت اور محبت کا مرکز بن جائیں اس میں اگر ان کو ناکامی ہوتی ہے تو بیٹھے بیٹھے وہ خیالات کی ایسی دِل فریب دُنیا تعمیر کرتے ہیں جس میں لوگ ان کے خیالی کارناموں پر واہ واہ کریں۔ پھر وہ اس خیالی دُنیا میں مگن رہنا چاہتے ہیں۔ ہوتے ہوتے نوبت یہ آتی ہے کہ انہیں لوگوں سے ملنے جلنے اور کسی محفل میں بیٹھنے سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنی تصوراتی دُنیا میں کھوئے رہنا چاہتے ہیں۔ یہ کیفیت بعض اوقات عمر کی پختگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور بعض وقت اور پختہ ہو جاتی ہے۔

عصبی المزاجی سے بچنے کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ ہم کو اپنی ذات کا احساس زیادہ نہ ہو۔ ہر عمل میں برتری کی خواہش انسان کو مایوسی سے ہم کنار کرتی ہے اور مایوسی عصبی المزاجی کی جڑ ہے۔ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو معمولی کام یابی سے خوش اور مطمئن نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی کام یابی اور مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کاملیت کے درجے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ نفسیات کی انگریزی اصطلاح میں ان کو (PERFECTIONALIST) کہا جا سکتا ہے۔ جو بھی کام وہ کریں، اس میں دنیا کو چونکانے اور نیچا دکھانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اپنے اِسی خبط کی وجہ سے ان کو ذہنی انتشار اور مایوسی کا شکار ہونا پڑتا ہے جس کے ذمّہ دار وہ خود ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے مشغلوں اور الجھنوں میں اِس قدر پریشان خاطر رہتے ہیں کہ انہیں دوسروں سے کوئی غرض نہیں رہ جاتی۔ اِس لئے دوسرے بھی انہیں نظر انداز کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے مزید غیر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

ہر شخص کی نظروں میں مقبولیت حاصل کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں اور اگر ہم اسے ممکن بنانے کی کوشش کریں گے تو خود اپنی شخصیت کو مُفلس اور قلاش بنانا پڑے گا یعنی ہم کو صرف دوسروں کے لئے جینا پڑے گا۔ ایسے میں ہمارے لئے ایمان دار بننا مشکل ہو جائے گا کیونکہ ہمیں ہر حال میں دوسروں کی مرضی اور خوشی کو مقدم رکھنا ہوگا۔ ایمان داری کے ساتھ نہ تو ہم اپنی رائے دے سکیں گے اور نہ دوسروں کی شخصیت کے بارے میں ایمان داری سے تجزیہ کر پائیں گے۔ ایمان دار بننا بھی کسی حد تک اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ لیکن قلبی طمانیت اور ذہنی سکون ایمان داری سے حاصل ہو سکتا ہے۔

سلامت روی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہرگز یہ نہ سوچیں کہ ہم اپنے ہر کام میں دوسروں سے بازی لے جا کر برتر بن جائیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہماری گفتگو بہت زیادہ دِل چسپ اور ظریفانہ ہو، مقبولیت کے حصول کے لئے سنجیدگی سے شستہ ظریفانہ اور دِل چسپ گفتگو کرنے سے زیادہ اہم ہے۔

ہمارا سابقہ جن لوگوں سے ہے، ممکن ہے وہ بہت ہی قدامت پسند اور ہماری ہی طرح عصبی المزاج ہوں لیکن اگر ہم اپنے ذوق کے اظہار میں میانہ روی کو راہ دیں تو ضرور رفتہ رفتہ لوگ ہماری جانب متوجہ ہونے لگیں گے۔ اگر ہم میں لطف و کرم اور اخلاق کی صفات موجود ہیں تو ان کا میلان ہماری طرف تیزی سے ہو سکتا ہے۔

ہمیں چاہئے کہ لوگوں کی نکتہ چینی کی جانب دھیان دینے کی بجائے لوگوں کو پسند کرنا سیکھیں۔ یہ ناممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ہم پسند نہ کرتے ہوں لیکن ہمیں چاہئے کہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کریں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک خوش گوار لگاؤ پیدا کریں، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہم کسی سے ملیں تو اِس طرح کہ اُسے یہ احساس ہو کہ ہم اس سے مل کر واقعی خوش ہوئے ہیں۔

جو لوگ محض لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں ان کو وقتی کامیابی تو حاصل ہو سکتی ہے، مگر وہ ان کو زندگی کی راہ میں آگے نہیں لے جا سکتی۔ معاشرہ میں حقیقی کام یابی وہی حاصل کر سکتے ہیں جو دوسروں کو متاثر کرنے کی بجائے خود ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان کی اچھی باتوں کو اخذ کر کے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہوں۔ ہم جس قدر فطری ہوں گے اتنے ہی کم عصبی المزاج ہوں گے۔ اگر ہم اپنی سرگرمیوں اور دِل چسپیوں میں اپنی ذات کو بھلا دیں تو پھر معاشرہ میں کام یابی کوئی مشکل کام نہیں۔

مقبولیت کا بڑا راز دوسروں کی ذات میں دِل چسپی لینے میں ہے نہ کہ لوگوں کی تعریف و تنقید میں غلطاں و پیچاں رہنے میں۔ اگر لوگ ہماری ذات سے دِل چسپی نہیں لیتے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم افسردہ اور مغموم ہوں۔ معاشرہ میں کام یابی کا راز مواقع سے فائدہ اُٹھانے اور وقت کا انتظار کرنے میں ہے، جب آپ کو اِس بات کا یقین ہو جائے گا تو قطعی آپ معاشرہ میں شرمندہ نہیں رہیں گے بلکہ وقت اور مواقع کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔ یہی کیفیت آپ کو عصبی المزاجی سے دُور رکھے گی۔ ■■

تنہا تنہا

رفیق عادل

"بعض انگریز جوڑے اپنی مصروفیات میں حائل ہونے والے والدین کو پنشن ہاؤس (ناکارہ لوگوں کی سرائے) میں داخل کردیتے ہیں اور ہر ماہ پابندی سے ان لوگوں کے لئے گذارے کی رقم بھیج کر گویا ممتا اور شفقت کا قسط وار خراج ادا کرتے ہیں۔"

اخبار کے "عجائبات" کالم میں چھپا ہوا یہ آرٹیکل پڑھتے وقت جہاں مجھے حیرت اور افسوس کا احساس ہوا۔ وہاں مشرقی قدروں سے متعلق دِل میں فخر کا احساس بھی جاگ اُٹھا۔ تاہم رشتوں کی پامالی کا یہ بھیانک المیہ دِن بھر کسی آسیب کی طرح میرے ذہن پر مسلّط رہا۔ پڑھائی کے دوران بھی میں خاموش اور بُجھی بُجھی سی رہی۔ کالج سے گھر لوٹتے ہوئے بھی اِس افسوس ناک آرٹیکل کی بازگشت دِل میں کہیں چُبھ رہی تھی۔

جب میں گھر پہنچی تو امّی نے آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے جامن کے پیڑ کے گرد ابّو کی آرام کرسی اور بید کی تین کُرسیاں بچھادی تھیں۔ قریب ہی چوبی تپائی پر رکھی ہوئی کوری صراحی، خس کے گچھوں سے مہکتے ہوئے پانی سے بھری رکھی تھی۔ گرمیوں کی دوپہر ڈھل رہی تھی اور پختہ دیواروں سے گھرے آنگن کے کچے فرش پر ہلکی ہلکی چھاؤں بکھر رہی تھی، جلد ہی سُرمئی دُھندلکے میں تبدیل ہو جانے والا دھوپ کا آخری مستطیل ٹکڑا جامن کے پیڑ کی اونچی شاخوں سے لپٹا سسک رہا تھا۔ سارا آنگن جامن کے بور اور نم مٹی سے اُٹھتی ہوئی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بھیّا ابھی آفس سے نہیں لوٹے تھے۔ میں کتابیں الماری میں رکھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ غسل کے بعد میں خود کو کافی ہلکا پھلکا اور چُست محسوس کر رہی تھی۔ صبح کو اخبار میں پڑھے ہوئے آرٹیکل کا بوجھ ذہن سے اُتر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد باہر آنگن میں محفل جم چکی تھی بھیّا آفس سے لوٹ آئے تھے۔ اور ابّو، امّی کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھے اپنی دل چسپ باتوں کی پٹاری کھول چکے تھے۔ ابّو ہمیشہ کی طرح توجہ اور دل چسپی سے بھیّا کی باتیں سُن رہے تھے۔ امّی بظاہر گلوری لگانے میں منہمک تھیں، لیکن ان کا پورا دھیان بھیّا کی باتوں میں تھا۔ میں بھیّا کو سلام کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بھیّا نے ایک پل رُک کر سر کے خفیف اِشارے سے میرے سلام کا جواب دیا اور اپنے آفس کی رپورٹ اسی دِل چسپ انداز میں شروع کر دی۔

"... ہر دس سیکنڈ بعد بھٹناگر کی ناک سے نکلتی ہوئی شوں شوں کی آواز سے تنگ آ کر آج اسٹینو روزی صاحب کے کیبن میں جا دھمکی اور بھٹناگر کی شکایت داغ دی۔ صاحب نے فوراً بھٹناگر کو بُلا کر ایک لیکچر پلا یا کہ دائمی نزلہ زکام تنفس کے نظام پر بڑی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ بظاہر معمولی اور بے ضرر سا مرض سِل اور دِق کا سبب بن جاتا ہے اور پھر یہ کیا کم ہے کہ تم شوں شوں کی مکروہ آواز سے آفس کے سارے ساتھیوں کو بور کرتے ہو۔ بے چارہ بھٹناگر اپنی ناک رگڑتا ہوا کیبن سے برآمد ہوا تھا۔ غصّے کی شدّت سے اس کی آنکھیں سرچ لائٹ کے فوکس کی طرح تھرا رہی تھیں۔"

بھیّا اور ابّو کے بھاری قہقہے میں میری اور امّی کی آواز دب کر رہ گئی جیسے اسٹیم رولر کی فوں فوں میں دو ننھے مُنّے پرندوں کی کھٹ کھٹ دب کر رہ جاتی ہے۔ سارا آنگن ملے جُلے قہقہوں کے خوش رنگ شگوفوں سے بھر گیا۔

بھیّا کے آفس میں کام کرنے والے ساتھی کبھی ہمارے گھر نہیں آئے تھے۔ کبھی ان سے میری ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن بھیّا کے ذریعے اُن کی کارگذاری کی ایسی رپورٹ ملتی کہ اب ان سے گھر کے افراد کی طرح قُربت کا احساس ہونے لگا تھا۔ شام ہوتے ہی آنگن میں محفل جم جاتی اور رات گئے تک چٹ پٹے قہقہوں کا دَور چلتا رہتا۔ ابّو نے حال ہی میں محکمہ جنگلات کی ملازمت سے پنشن لی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ گھنے جنگلوں میں گزارا تھا۔ جب وہ اپنی سروس کے زمانے کے قصّے چھیڑ دیتے تو مجھے ایسا لگتا کہ میں اِس چھوٹے سے آنگن کی چہار دیواری پھاند کر کسی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی، دور دستِ بیابان

کی سرسبز وادیوں میں نکل آئی ہوں۔ اپنا چھوٹا سا ہنستا گاتا گھر، مجھے دنیا کے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا۔ بے حد وسیع، جس کے ان گنت گوشے اب تک میرے پیروں کے لمس سے محروم تھے۔

شام کا کھانا کھا کر ہم پھر آنگن میں جمع ہوگئے۔ شام کا دھواں آنچل گہرا سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر آسمان کی بسیط چادر پر ننھے منے لودیتے ستاروں کی ٹولیاں ابھر رہی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے فرحت بخش جھونکے جامن کی نازک ٹہنیوں میں سرسرا رہے تھے۔

امّی نے خوشبودار قوام میں لپی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا، "دلہن کے کپڑوں پر گوٹے کے پلّے کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔"

"اسی ہفتے آصف میاں کے کپڑے بھی آجانے چاہئیں۔" ابّو نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ڈھیر سارا چھوٹا موٹا سامان الگ خریدنا ہے۔ اب زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔ اِس ماہ کی آخری تاریخوں میں تمام تیاریاں مکمل ہو جانا چاہئیں۔"

بھیّا کی شادی کا تذکرہ کرتے وقت ابّو کی آنکھوں میں بے شمار ہمکتے ہوئے ارمانوں کی پرچھائیں اُبھر آتی تھی۔ اولاد کی شادی شاید والدین کا سب سے بڑا سکھ ہے۔ اس کی چاہ انہیں زندگی میں تھکنے نہیں دیتی، بلکہ ہر لمحہ، ہر پل رواں دواں اور جوان رکھتی ہے۔

بھیّا اپنی شادی کے تذکرے سے کچھ نروس ہوگئے تھے۔ خود کو نارمل رکھنے کے جتن میں اُن کی بوکھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ چہرے پر خاموشی طاری کیے، کسی خیالی مرکز کی جستجو میں دائیں بائیں گردن گھمارہے تھے۔ مجھ سے آنکھ ملتے ہی ان کے چہرے پر کانوں کی لوؤں تک سُرخ سُرخ چیونٹیاں رینگ گئیں۔

بھیّا کی شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو جیسے چہل پہل کے جگمگ کرتے ماحول نے ہمارے گھر سے رشتہ ہی توڑ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنستا کھیلتا گھر سناٹے کی بھیدلدل میں دھنس گیا۔ بھائیں بھائیں کرتے آنگن کی فضا ان خواب ناک محفلوں کو ترس گئی۔ جن کے باعث مجھے اِس پختہ چاردیواری کا دوسرا سِرا آکاش تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

بھیّا معمول کے مطابق آفس سے آتے، امّی ابّو کے پاس کچھ پل رُک کر دو چار رسمی باتیں کرتے مجھ سے اپنی پڑھائی سے متعلق اُلٹا سیدھا سوال پوچھتے پھر کھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوتے اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ جاتے، جیسے کوئی بے حد اہم کام یاد آگیا ہو۔

بھابی شوہر کی آہٹ پاتے ہی کچن میں برتنوں سے زور آزمائی شروع کر دیتیں۔ سالن کی پتیلی پر چمچے کی ضرب باہر آنگن تک سنائی دیتی۔ امّی فوراً اس شور کی دُہائی سن لیتیں اور کچن میں جا کر بہو کا کام سنبھال لیتیں، اِس طرح بھابی کو اِس بکھیڑے سے نجات مل جاتی۔

ابّو بڑے تحمّل کے ساتھ گھر کے بدلتے ہوئے ماحول کو دیکھ رہے تھے، مگر اِس عمر میں امّی کو کچن میں دیکھ کر، ہزار جتن کے باوجود اُن کے چہرے سے اندرونی تکلیف کا اظہار نہایت واضح طور سے ہو جاتا۔ پھر بھی وہ خاموش ہی رہتے۔ شاید خواب سے تعبیر کے متضاد رشتے کو وہ تسلیم کر چکے تھے۔

رفتہ رفتہ ابّو کے معمولات میں بھی فرق آتا گیا۔ صبح سے سہ پہر کا وقت وہ اخباروں اور رسالوں کے مطالعے میں صرف کرتے۔ پھر بھیّا کے آنے سے پہلے ہی مرزا صاحب کے دیوان خانے میں پہنچ جاتے۔ اُن کے پہنچتے ہی دیوان خانے میں لمبے لمبے ذہن کو تھکا دینے والے مباحثے چھڑ جاتے، حکومت کی موجودہ پالیسیوں پر دُھواں دھار تبصرے ہوتے۔ ادب اور شاعری کے بخیے اُدھیڑے جاتے۔ ابّو کے روپ میں مرزا صاحب کی باتونی فطرت کو چٹ پٹا مسالہ ہاتھ آیا تھا۔

اُس روز ابّو کچھ ہی دیر پہلے مرزا صاحب کے دیوان خانے سے لوٹے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دسمبر کے جاڑوں کی لہر ہڈیوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں سر سے پاؤں تک گرم لحاف اوڑھے بستر میں دبکی ہوئی تھی۔ ابّو انگیٹھی کے قریب بیٹھے کوئلے دہکا رہے تھے۔ امّی کشمیری چادر لپیٹے اُن کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔

"یوں تو مرزا صاحب پچھلے کئی مہینے سے اشارے کنائے اپنے منجھلے بیٹے کے لیے شاہدہ کا ہاتھ مانگ رہے تھے لیکن آج کھل کر انہوں نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔" ابّو نے امّی کی طرف جھکتے ہوئے نہایت رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔

اچانک لحاف کی گرم فضا میں مجھے یخ بستہ ہواؤں کے تیز جھکڑ چلتے ہوئے محسوس ہوئے اور جسم میں خون کا بہاؤ کسی مونہہ زور پہاڑی نالے کی طرح اُچھلنے لگا۔ اپنی شادی کے ذکر میری عجیب حالت ہو گئی تھی۔

"آپ نے کیا جواب دیا؟" شاید ان کا دل بھی بے تال دھڑک رہا تھا۔

"فی الحال میں نے گول مال سا جواب دے کر ٹال دیا ہے۔ لیکن رشتہ بُرا نہیں۔ لڑکا ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہے، اور اپنا دیکھا بھالا ہے۔ اب پہلے جیسا پُرسکون اور متوازن ماحول بھی نہیں رہا کہ زیادہ بہتر رشتے کا انتظار کیا جائے۔ آصف کی شادی نے مجھے ایک انوکھے تجربے سے دوچار کیا ہے۔ وہ یکسر بدل گیا ہے۔ پہلے معمولی سا کام بھی میرے مشورے کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب تو اس کا ہم سے رسمی سا تعلق رہ گیا ہے، جیسے وہ ہم سے محض وقت گزاری کے لیے جڑا ہوا تھا۔ ایک دن یہ لمحہ لمحہ مخالف سمتوں میں پھسلتا ہوا تعلق بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ حالات اِتنا بھیانک رُخ اختیار کرلیں، کیوں نہ اِس سے پہلے ہی شاہدہ کے بوجھ سے سُبک دوش ہو جائیں۔ میں یہاں خود کو بے حد تنہا اور دُکھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے گھر کے بدلے ہوئے ماحول پر اپنی تعیناتی کے جنگلات کا گمان ہونے لگا ہے۔" ابّو کی آواز بھرّا گئی۔ وہ سختی سے ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگئے۔

ابّو کے خاموش ہوتے ہی امّی کی سسکیاں اُبل پڑیں۔ ابّو کا کہا ہوا ایک ایک لفظ اور امّی کی سسکیوں کی رلی ملی آواز مجھے اپنے دماغ پر برستے ہوئے کوڑوں کی طرح محسوس ہو رہی تھی اور نہ جانے کیوں اس دِن اخبار کے "عجائبات" کے کالم میں پڑھا ہوا آرٹیکل، جسے پڑھنے کے بعد مشرقی قدروں سے متعلق میرے دِل میں فخر کا احساس جاگ اُٹھا تھا۔ کسی تیز رفتار کلوز اپ کی طرح میرے ذہن میں گھوم گیا۔ ■■

جہیز

جہیز اذنِ تباہی ہے بیٹیوں کے لئے
بڑا عذاب ہے ماں باپ، بھائیوں کے لئے
پریشاں خواب! دلہن کی سہیلیوں کے لئے
کھلا مذاق ہے عزت کا! شہریوں کے لئے
اور ہم خموش ہیں افسوس ناک غفلت ہے

اداس بیٹھی ہیں بننے کو دلہنیں کتنی
جہیز کے لئے ٹوٹی ہیں نسبتیں کتنی
اٹھانی پڑتی ہیں پیہم ہزیمتیں کتنی
غریب باپ پہ آتی ہیں آفتیں کتنی
کوئی بتائے شرافت کی کوئی قیمت ہے

گریجویٹ بھی ہو لڑکا، تو جیسے ہے ذہن بہرہ
مطالبات بڑھیں گے کہ گور تن ہے وہ
میری نظر میں ہلاکو ہے، اہرمن ہے وہ
دلہن کے باپ کی ناموس کا کفن ہے وہ
ہمارے ملک میں اب تک بڑی جہالت ہے

جہیز خور کئی داؤں آزماتے ہیں
کھلا کے نیند کی گولی گلا دباتے ہیں
یہ اپنے ہاتھوں ہی اپنی دلہن جلاتے ہیں
ہلاکتوں کا سبب خودکشی بتاتے ہیں
یہ کیا ظلم ہے یہ کیسی رریت ہے

جلی حروف میں چھپتی ہیں سرخیاں کہ نہیں
جلائی جاتی ہیں بے خوف بی بیاں کہ نہیں
جنازے اٹھتے ہیں اٹھتی ہیں ارتھیاں کہ نہیں
جلانے والوں نے پائی کبھی پھانسیاں کہ نہیں
نہیں! تو کیا یہی انصاف کی صداقت ہے

مجھی کو صرف نہیں سب کو اس سے نفرت ہے
کہیں سے دیکھئے یہ قابلِ مذمت ہے
جو کہہ رہا ہوں میں اس میں بڑی صداقت ہے
تو مل کے سب ہی کہو نا، جہیز لعنت ہے
جہیز لینا نہ دینا، جہیز لعنت ہے

سیف بھساولی

جہیز

اعلانِ بغاوت کرتا ہوں — اے اپنے سماج کے رکھوالو
والگ میں ستارہ بیاہ کے تم — جانوں کی ہلاکت بند کرو
یہ رسم و روایت ختم کرو — اے اپنے سماج کے رکھوالو
بازارِ تجارت بند کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو

اِس دیس میں ایسے کتنے ہیں — روٹی بھی میسر جن کو نہیں
بے گور یہ زندہ لاشوں کے — حصے میں کفن بھی ان کو نہیں
تم اُن سے حقارت ختم کرو — اے اپنے سماج کے رکھوالو
بازارِ تجارت بند کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو

وہ حاصلِ علم بھی ہے لیکن — قسمت کی اگر جو ہیٹی ہے
ہے اپنی اگر یہ بہو تو کیا — یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے
بیٹی سے عداوت ختم کرو — اے اپنے سماج کے رکھوالو
بازارِ تجارت بند کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو

خدمت کر کے نا اہلی کا — الزام بھی سر پہ لیتی ہے
سسرال کی عزت رکھنے کو — وہ اپنی جان بھی دیتی ہے
یہ ظلم و اذیت ختم کرو — اے اپنے سماج کے رکھوالو
بازارِ تجارت بند کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو
اب جہیز کی لعنت ختم کرو

خلش جگری

جہیز

اسی گھر میں
اسی آنگن میں
پھولوں کے حسیں منڈوے تلے
اک دل
کوئی آیا تھا
آنکھوں میں پیامِ زندگی لے کر
لبوں پہ
مسکانی جھومتی
رنگیں ہنسی لے کر
لباسِ آرزو میں
پیار کی رعنائیاں لے کر
خوشی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی
شہنائیاں لے کر
ادھر میں
سرخ جوڑوں میں
لجائی سی بیٹھی تھی
جدائی اور ملن کے
ساز پر اک گیت سنتی تھی
کہ اتنے میں
وہ خوشبو کا امڈتا کارواں لے کر
اسی منڈوے تلے
کچھ اور بھی میرے قریں آئے
مرے سرتاج بن کے
میرے خوابوں کے امیں آئے
ادا سے مسکرا کر
بھر گئے وہ مانگ میں صندل
سہاگن بن گئی میں
ہائے اُن کے پیار کا آنچل
مگر خوشیوں کے پیچھے
غم کا اک سایہ بھی لہرایا
جہیز اُن کی نظر میں
باعثِ تحقیر ہی ٹھہرا
بس اتنی بات پہ
ٹھکرا گئے وہ میری حسرت کو
وہ رسوا کر کے
رخصت ہو گئے عہدِ محبت کو

سیف سہرامی

تیرھویں قسط

اب تک کی کہانی

آفاق ایک خوب رو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے ایک روز اس کھیلے نوجوان کو دیکھا تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے وہ اس کے دفتر میں ملازم ہو گئی مگر آفاق پر اس کے حسن اور اداؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُلٹا اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا۔

کچھ دن بعد جب آفاق نے فلک ناز کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تو اس کا دل کھل اُٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر سہاگ رات سے ہی فلک ناز کو احساس ہوا کہ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اُڑانے پر تُلا ہوا ہے۔ دن گزرتے گئے اور فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصّہ اور نفرت کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ ایک دن اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ مگر آفاق نے یہ شرط رکھی کہ آزادی پانے کے لئے پہلے اسے ایک اچھی سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا۔ چاروناچار فلک ناز نے یہ شرط بھی منظور کر لی۔

ملازموں کو آفاق نے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا۔ فلک ناز اکیلے سارے گھر کو صاف ستھرا بنانے میں لگ گئی۔ کھانا پکانے میں اسے سب سے زیادہ دشواری پیش آتی تھی۔ آفاق اس کے سامنے اپنی سگھڑ ماں اور بہن کے گن اکثر گاتا رہتا تھا۔ اس سے اس کا جی اور جلتا تھا۔ مگر نجات پانے کی دھن میں وہ کڑی محنت کرتی رہی۔ ایک روز اس نے آفاق سے کہا کہ اس کے پاس گھر میں پہننے کے لئے سادہ کپڑے نہیں تو آفاق بولا "کل آپ میرے ساتھ بازار چلئے گا اور اپنی پسند کے کپڑے لے آئیے گا۔" ہمیشہ جلی کٹی سُنانے والے آفاق کی مہربان لہجے میں کہی ہوئی یہ بات سُن کر فلک ناز کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

فلکی

دوسری صبح جب آفاق ناشتہ کر کے جانے لگا تو فلکی نے کہا۔

"میں بازار نہیں جاؤں گی۔"

"میرے ساتھ جانا پسند نہیں یا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں میرے پاس بازار جانے کا وقت نہیں ہے۔ آپ اپنی پسند کے کپڑے خرید لائیں۔"

"میری پسند کو آپ قبول کر لیں گی؟"

"جی ہاں۔" فلکی نے نظریں جھکا لیں۔

آفاق تھوڑی دیر تک اسے گھور کر دیکھتا رہا۔ مگر فلکی نے نظریں نہیں اُٹھائیں اسے معلوم تھا کہ آفاق اسے گھور رہا ہے جب وہ نظریں اُٹھائے گی تو وہ آنکھیں ملا کر اس بات کی تصدیق کرنی چاہے گا۔

اس واسطے وہ زمین کی طرف دیکھتی رہی۔

"عجیب ناقابلِ یقین واقعات رونما ہو رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر آفاق باہر نکل گیا۔

فلکی کو بڑا مزہ آیا اور ہنسی بھی آئی۔

واقعی آفاق کو کہاں یقین آیا ہوگا اور وہ کیوں جائے اس کے ساتھ بازار۔

اب بازار میں اسے رُسوا کرے گا بات بات پر طعنے دے گا۔ دکان داروں کے سامنے کچھ کہنے لگے گا اور جو اگر راستے میں کوئی واقف کار مل گیا تو اس کے سامنے چل گئی

کھال اُتار سے گا۔ ایسا نہ ہو بازار جاکر وہ کوئی اور آفت مول لے بیٹھے۔ پُرسکون سے گزرنے والی بمشکل تمام زندگی کا ایک حصہ بنا تھا۔ اس آزمائشی راستے پر وہ اس طرح چل رہی تھی جس طرح کوئی شیشے کی کرچیوں پہ چلتا ہے۔

اب تو مسافت بھی کافی ہو گئی تھی۔

پھر وہ کوئی نئی مصیبت کیوں مول لے؟

اور یہ بھی ممکن ہے آفاق اسے آزما رہا ہو۔ ہے تو بڑا چالباز۔ اب کئی دنوں سے اسے کوئی بات نہیں مل رہی تھی۔ لان کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے تو چاہتا ہو گا کوئی نیا جھگڑا شروع کرے۔ یہ سب سوچ کر اس نے بازار جانے سے صاف انکار کر دیا وہ سوچ رہی تھی کم از کم اس نے ایک تو دانشمندانہ حرکت کی ہے۔

پھر وہ کھانا پکانے کے لئے باورچی خانہ میں چلی گئی۔

وہاں ابھی تک ٹرانسسٹر ریڈیو پڑا ہوا تھا۔

اس نے ریڈیو کو اس طرح دیکھا جیسے پھنکارتا سانپ ہو۔ چھیڑنے سے ڈس لے گا۔ کتنے ہی دنوں سے ریڈیو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کوئی لمحہ نہیں گزرتا تھا یہ گھر نغموں اور آوازوں کے بغیر کتنا سرد اور سُونا تھا۔ اس کے کان بھی تو موسیقی سے ناآشنا ہو گئے تھے۔

جانے ریڈیو سننا کیسا لگتا ہو گا۔

ڈرتے ڈرتے اس نے ریڈیو کی ناب کو ہاتھ لگایا۔ پھر جرأت کر کے اسے گھما دیا ایک دم سے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک جگہ بلند آواز سے نغمہ گونج رہا تھا۔ اس کی موسیقی اتنی تیز تھی کہ فلکی نے ڈر کر ریڈیو بند کر دیا اسے یوں احساس ہوا جیسے در و دیوار چیخ رہے ہوں ہر طرف طبلے اور سارنگیاں بج رہے ہوں۔

توبہ ...

موسیقی بھی اتنی خوفناک ہو سکتی ہے

وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ کام میں لگ گئی بارہ بجے کے قریب جب وہ فارغ ہوئی تو اسے خیال آیا ریڈیو لگانا چاہئے۔ ممکن ہے آفاق آج اسے یہاں بھول گیا ہو۔ کل اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جائے یا واپس دفتر ہی لے جائے۔ تھوڑے سے گیت سننے میں کیا حرج ہے!

سو اس نے آواز کو آہستہ کر کے دھیمے دھیمے سُروں والا کوئی اسٹیشن لگا لیا۔

ساز بجنے لگے۔ وہی اناؤنسر کی آواز تھی۔ وہی گیت تھے۔ تقریباً سب کے سنے ہوئے۔ وہی پیش کش کا انداز تھا سب ویسا ہی تھا۔ لیکن اس کی زندگی بدل گئی تھی چھ مہینے ہو گئے تھے اس کی شادی کو اور ان چھ مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

فلکی وہ فلکی نہ رہی تھی۔ دن رات وہ دن رات نہ تھے۔ آسمان وہ آسمان نہ تھا اور زمین وہ زمین نہ تھی۔

کوئی شے کہیں بدلتی۔ کچھ نہیں بدلتا مگر انسان بدلتا رہتا ہے۔ گرتا رہتا ہے بنتا رہتا ہے۔ مٹتا رہتا ہے۔

اور پھر بھی جیتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پوری کائنات میں سخت ترین چیز انسان ہے۔

انسان جو دنیا کی ہر شے سے زیادہ ناپائیدار ہے۔ دنیا کی ہر چیز کی ایک میعاد ہے۔ گھاس پودے۔ درخت۔ دریا سمندر عمارات اور بھی بہت کچھ۔

مگر ان سب میں سب سے کم میعاد انسان کی ہے۔ انسان جس کے تصرف قدرت میں ان چیزوں کو بنانا ہے جس کی عقل نے دنیا کو محو بنا چھوڑا ہے نت نئی ایجادات ہوتی ہیں۔ نت نئی راہیں نکلتی ہیں۔ انسان اپنی عقل کی بے شمار کرشمہ سازیاں دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔

مگر خود فانی ہے۔ زوال پذیر ہے۔ مٹ جانے والی شے ہے۔ حباب ہے بلبلہ ہے۔ قطرہ ہے۔ خاک ہے!

وہی انسان جب زندگی کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے تو کتنا سخت جان بن جاتا ہے۔ جنگیں لڑتا ہے۔ بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ دریاؤں کے رُخ موڑ دیتا ہے۔ دنیا کو فنا کرنے کے منصوبے بناتا ہے ایک دن تخت پر ہوتا ہے تو دوسرے دن تختے پر۔ اطلس و کمخواب میں بھی سوتا ہے اور جیل کی کال کوٹھڑی کا بھی مقابلہ کرتا ہے شہنشاہ بھی ہوتا ہے اور گلیوں گلیوں گداگر بن کر بھی پھرتا ہے۔ ہر حال میں، ہر موسم میں، ہر بھیس میں اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔

واہ کیا چیز ہے انسان۔

یہی خود آگہی ہے۔

اس کا دل کہتا۔ کم از کم تمہیں اتنا تو پتہ چل گیا ہو گا۔ ورنہ کوئی تمہیں شادی سے پہلے کہتا کہ تمہیں ایسے ماحول میں رکھا جائے گا تو تم صاف کہہ دیتیں میں تو مر جاؤں گی۔ ایک دن بھی زندہ نہ رہوں گی اور اب نہ صرف یہ کہ تم زندہ ہو، بلکہ تم نے حالات سے سمجھوتہ بھی کر رکھا ہے۔ جی رہی ہو۔ کھاتی پیتی ہو۔ اپنی مرضی کے خلاف بات کرتی ہو۔ پھر بھی یوں ظاہر کرتی ہو جیسے تم بہت خوش ہو۔

اور اگر حالات اس سے بھی زیادہ سنگین ہو جائیں تو پھر بھی تم زندہ رہو گی۔

کیوں کہ نہ مرنا اپنے اختیار میں ہے نہ جینا۔

چلو فلکی بیگم اٹھو۔ چپاتیاں پکاؤ۔ کس خیال میں پڑ گئی ہو۔ اب تم فلسفی بنتی جا رہی ہو

... اللہ کی دین ہے۔

شام کو جب آفاق آیا تو اس نے بہت سے لفافے اٹھا رکھے تھے۔ آتے ہی اس نے وہ لفافے پلنگ پر ڈال دئے۔ پھر فلکی کو آواز دی اور بولا "اپنے کپڑے اٹھا لو"

فلکی نے پہلے آفاق کی طرف دیکھا اور پھر پلنگ پر بکھرے ہوئے لفافوں کو۔ کچھ کپڑے باہر جھانک رہے تھے اور کچھ ابھی لفافے کے اندر تھے۔ اس نے لفافوں میں سے سب کچھ نکال لیا۔ آٹھ دس سُوٹ پیس تھے۔ انتہائی خوب صورت پرنٹ میں انتہائی نفیس کپڑے۔ ملائم کپڑا تھا جو کہ گرمیوں کے موسم کے لئے بہترین کپڑا ہو سکتا تھا۔

فلکی جب کپڑے کو چھو کر دیکھ رہی تھی تو آفاق نے پوچھا۔

"دیکھئے، کیا یہ کپڑا پسند آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کو سُوتی کپڑا پہننا تو اچھا نہیں لگے گا لیکن میں کیا کروں۔ مجھے کسی چیز میں بھی ملاوٹ پسند نہیں ہے۔ نہ محبت میں، نہ شکل و صورت میں، نہ دوستی میں، نہ تعلقات میں اور نہ خوراک میں۔ میں یا تو پیور کاٹن (PURE COTTON) پسند کرتا ہوں یا پیور سلک (PURE SILK) یا پیور وولن (PURE WOOLEN) مجھے (SYNTHETIC) چیزیں پسند نہیں۔ اس لئے میں مصنوعی چیزوں سے متاثر نہیں ہوتا۔"

"باقی سب تو میری سمجھ میں آ گیا مگر یہ شکل و صورت میں ملاوٹ کیسی ہوتی ہے؟" فلکی نے جرأت کر کے پوچھا۔

"غیر ضروری میک اپ، مصنوعی پلکیں، مصنوعی بال، مصنوعی ناخن، وغیرہ وغیرہ --- اب کہاں تک تفصیل گنواؤں۔ ..... آپ تو عورت ہیں اور جانتی ہیں کہاں تک عورتیں اپنے حسن میں ملاوٹ کرتی ہیں... اسی لئے تو آج کل کی لڑکیاں مجھے مرعوب نہیں کر سکتیں۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔

کہنا یہ چاہتی تھی کہ ضروری نہیں آج کل کی سب لڑکیاں ملاوٹ کرتی ہوں۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ممکن ہے اس سے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اپنی مدافعت کر رہی ہے۔

"کہئے، میں نے کچھ غلط کہا؟"

"میری یہ جرأت کہ میں ایسا سوچوں!"

اس جواب پر آفاق قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"کم از کم میں نے آپ کو سچ بولنا تو سکھا دیا۔"

"آپ نے مجھے اور بھی بہت کچھ سکھایا ہے۔" فلکی خوش دلی سے بولی۔

"لاؤ اسی بات پر ہاتھ ملالیں۔"

آفاق نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو فلکی نے اپنا سرد ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

جلد ہی آفاق کو احساس ہو گیا کہ اس نے غلط حرکت کی ہے۔

فلکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا اور اس نے دبائے بغیر فلکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

فلکی اپنے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے سارے کپڑے تہہ کر کے اٹھانے لگی۔ کپڑوں کا بنڈل اٹھا کر اس نے آفاق کی طرف دیکھا اور بولی۔

"مگر انہیں سلواؤں گی کہاں سے؟"

"آپ خود سئیں گی۔"

"میں... مجھے تو سینا نہیں آتا۔"

"آپ جب یہاں آئی تھیں تو آپ کو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ مگر اب یہ نہیں کہہ سکتیں کہ مجھے کچھ نہیں آتا۔ کم از کم اب آپ عورت ہونے کا دعویٰ تو کر سکتی ہیں۔"

"مگر سلائی میں اصل بات کٹائی کی ہوتی ہے۔ نہ مجھے شلوار کاٹنی آتی ہے نہ قمیض۔"

"مشین تو چلانی آتی ہے؟"

"جی ہاں۔ میں مشین چلا لیا کرتی ہوں۔ کبھی کبھی اپنی قمیض تنگ کر لیا کرتی تھی۔"

"قمیص تنگ کرتے کرتے آپ ہمیں تنگ کرنے آ گئیں..."

وہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

فلکی کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔

"آپ ایسا کریں" آفاق پھر بولا "اپنی ایک پرانی قمیض اور شلوار اُدھیڑ لیں پھر اس کے اوپر رکھ کر ایک کاغذ کاٹ لیں۔ اس کاغذ کی مدد سے ایک نیا سُوٹ کاٹ کر سی کر پھر پہن کر دیکھ لیں۔ اگر وہ ٹھیک بنا تو اللہ کا نام لے کر سارے کپڑے سی لیں۔"

تجویز تو خوب تھی۔ فلکی کو حیرت ہوئی کہ یہ آفاق کے ذہن میں کیوں کر آ گئی حالانکہ فلکی کے ذہن میں آ جانی چاہئے تھی۔

"لیکن میں مشین کہاں سے لوں گی؟"

"اگر میں مشین مہیا کر دوں۔ تو کیا انعام ملے گا؟"

"آپ کہیے؟"

"اگر اسی وقت مہیا کر دی تو کیا دیجیے گا؟"

"دینے کو میرے پاس کیا ہے؟"

فلکی کا دل چاہا کہہ دے مگر وہ بیوقوفوں کی طرح اس کی شکل دیکھتی رہی۔

"آئیے میرے پیچھے پیچھے۔"

آفاق اسے ایک اسٹور میں لے گیا۔ وہاں الماری میں بند ایک سنگر مشین پڑی

ہوئی تھی۔
وہ اسے باہر نکال لایا۔ وہ کھول کر بھاری اور پھر میز پر رکھ دی۔

"یہ بجلی سے بھی چلتی ہے اور ہاتھ سے بھی جس طرح آپ چلانا پسند کریں۔"

"یہ کس کی مشین ہے؟" فلکی کی حیرت ابھی دور نہیں ہو رہی تھی۔

"ہے تو آپ ہی کی۔" آفاق نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میری امی پچھلے سال جب آئی تھیں تو اپنی سلیقہ شعار بہو کے لئے یہ تحفہ لائی تھیں۔"

"اور بہو کے لئے۔"

"ہاں۔ ان کا خیال تھا سلائی مشین لاکر رکھ دینی چاہئے۔ ممکن ہے وہ کپڑوں کی سلائی میں ماہر ہو اور اسے آتے ہی ضرورت پڑے۔ اور بھی بے شمار چیزیں لا چکی ہیں۔ میری امی۔ مگر اس بہو کے لئے جو اس گھر میں رہنا پسند کرے۔ اگر آپ چاہیں تو مشین استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کے اندر قینچی، دھاگے، شوقی، فیتہ اور ضرورت کی سب چیزیں ہیں۔"

فلکی نے مشین اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ لی۔

دوسرے دن صبح کام سے فارغ ہو کر اس نے آفاق والی ترکیب پر عمل کیا۔ واقعی کارگر ثابت ہوئی۔ جب اس نے اپنا سوٹ کاٹ لیا تو پھر سینے کا شوق پیدا ہوا۔ سارا دن لگا کے اس نے سوٹ سی لیا۔ اور شام کو جب پہنا تو حیران رہ گئی۔ سوٹ اسے فٹ آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ گلا گول ہونے کے بجائے ذرا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور ترپائی موٹی موٹی نظر آ رہی تھی۔ خیر یہ باتیں تو پریکٹس سے آ سکتی ہیں۔ کم از کم اس کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کپڑے سی سکتی ہے۔ آفاق کے آگے شرمندگی تو نہ اٹھانی پڑی۔

پھر اس کا دل نہ چاہا کہ سوٹ اتارے۔ وہی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بھاگ بھاگ کے کام کرتی رہی۔ جان بوجھ کے آفاق کے آگے پیچھے پھرتی رہی مگر آفاق نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا تب اس کا دل بہت برا ہوا۔ کل خود ہی کپڑا لاکر دیا تھا اور آج اسے یاد بھی نہ تھا۔

رات تک وہ اس کے اردگرد چکر لگاتی رہی مگر بے سود....

پھر وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج کی کارکردگی کی وہ داد لینا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب آفاق کمرے میں آیا تو فلکی آئینے کے آگے کھڑی تھی۔ اپنے سراپا کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کیسا ہے؟"

"جسم یا سوٹ؟"

(اب مزہ لے۔ فلکی نے اپنے آپ سے کہا)

"میں نے سوٹ کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ یہ میں نے آج سی کر پہنا ہے۔"

"اچھا۔" آفاق نے اچھا کو بہت لمبا کر کے کہا۔ "اب سمجھا۔ میں نے سمجھا کہ آپ اپنے جسم کی داد لینا چاہتی ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی کہ آپ ایک خوبصورت جسم کی مالک ہیں۔ مگر اس جسم کا کیا فائدہ جس کی کھوپڑی میں عقل نہ ہو۔"

فلکی کا دل جل گیا۔

آخر عورت تھی نا؟ ہر بار اس کو سمجھنے میں غلطی کر جاتی تھی۔ سوچ رہی تھی اس نے آفاق کا دل جیت لیا ہے۔ توبہ۔ آفاق کے پہلو میں تو دل تھا ہی نہیں۔ پھر جیتنا نہ جیتنا کیا معنی؟

وہ ایک پتھر تھا اور اس کو ایک پتھر سے سر پھوڑ رہا تھا۔

وہ چپ چاپ جاکر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔

آفاق لیٹ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر فلکی کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

"اگر یہ سوٹ آپ نے سیا ہے تو حیرت انگیز بات ہے۔ واقعی کمال کر دیا ہے آپ نے اور بہت بچ رہا ہے آپ پر۔ کچھ میرے رنگوں کے انتخاب کی بھی داد دیں۔"

اب کیا فائدہ تھا تعریف کا۔

فلکی آنکھوں میں آنسو لئے لیٹ گئی۔

پہلے دل جلایا۔ اب چھینٹے مار رہا ہے۔ دل جلانا اسے خوب آتا ہے۔ شاید یہ دنیا میں دل توڑنے اور تکلیف پہنچانے کے لئے ہی آیا ہے۔

فلکی نے بتی بجھا دی۔

پھر وہ دنوں کا حساب کرنے لگی نہ جانے اس کا امتحان کب ختم ہوگا۔ چھ مہینے ہو گئے تھے اور چھ مہینے میں اس نے ہر وہ کام کیا تھا جس سے اس کو نفرت تھی۔ غسل خانے صاف کئے تھے۔ شیو کا سامان دھویا تھا۔ آفاق کی بنیانیں اور انڈر ویئر دھوئے تھے۔ آفاق کے جوتے پالش کئے تھے۔ بل چلایا تھا۔

کیا نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کا دل نہیں پسیجا تھا۔ پتہ نہیں اور کتنی آزمائشیں باقی تھیں۔ اب اگر اس کی جان چھوٹ جاتی تو اچھا تھا۔

ایسا نہ ہو آفاق اپنے وعدے سے مکر جائے۔۔۔ اس کا کیا ہے؟ اپنی مرضی کا خود مالک ہے۔ وہ خود بھی خاموش تھی

اس لئے کہ ابھی ممی اور ڈیڈی نہیں آ سکے تھے۔ ممی سے وہ ویسے بھی خفا تھی۔ اس لئے کہ انہوں نے اس کو کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ پتہ نہیں ممی سے وہ کیوں ناراض تھی۔ اگر ممی کے خط اس کو نہیں ملے تھے تو یہ ممی کا قصور نہیں تھا۔ سراسر آفاق کی چال تھی۔ مگر وہ اپنا غصہ ممی پر ہی نکال رہی تھی۔ ایک دن آفاق دفتر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ لفافے اور کچھ گریٹنگ کارڈ تھے۔ اس نے یہ سارے فلکی کے آگے ڈال دئے۔

"یہ کیا ہیں؟"

"یہ آپ کی ممی کے محبت نامے ہیں!"

"آپ کے نام آئے ہیں؟"

"کچھ آپ کے نام ہیں کچھ میرے نام"

"لیکن ممی نے مجھے دفتر کے پتے پر کیوں خط لکھے؟"

"یہ دفتر کے پتے پر نہیں گھر کے پتے پر ہیں۔"

"پھر مجھے پہلے کیوں نہیں ملے؟"

"یہ اپنے چوکیدار سے پوچھیں کہ وہ آپ کو روز کی ڈاک کیوں نہیں دیتا رہا۔"

"چوکیدار آپ کا ملازم ہے۔ وہ آپ کی ہدایت پر عمل کرتا ہے۔۔۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" آفاق بولا

"اور اگر ہاں کے خط بھی اس گھر میں سنسر کئے جاتے ہیں تو مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

فلکی نے خطوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہیں پڑے رہے۔

"اور پھر اتنے دنوں کے جمع شدہ خطوط مجھے آج دئے جا رہے ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"کبھی میری گاڑی میں پڑے رہے۔ مجھے آپ کو دینا یاد ہی نہ رہا۔"

"تو اب بھی رکھ لیجئے گاڑی میں۔ میرا ان کے بغیر بھی گزارہ ہو رہا ہے۔"

"واقعی، ان کے بغیر آپ کا گزارہ ہو رہا ہے؟" آفاق نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ جسے گزارہ کہتے ہیں وہ ہو رہا ہے۔"

"پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہی دو لفظ آپ اپنی ممی کو لکھ دیں۔"

"میری ممی مجھے جانتی ہیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہرحال انہیں خطوں کی رسید تو دینا ہے۔"

"جس کو یہ خط ملتے رہے ہیں۔ وہ اس کی رسید دیتا رہا ہے۔"

"جی ہاں میں نے تو ہر خط کا باقاعدہ جواب لکھا ہے۔"

"اور یہ بھی لکھا ہوگا کہ میں اور فلکی بہت خوش ہیں۔"

"واہ! میری صحبت میں آپ خاصی عقلمند ہو گئی ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کی صحبت سے بچائے۔"

فلکی کا دل چاہا بے اختیار کہہ دے مگر اس نے اپنی زبان کو روک لیا۔

اب وہ پہلے کی طرح بے اختیار زبان نہیں چلایا کرتی تھی۔ جب محسوس کرتی کہ بات بڑھ رہی ہے تو خاموش ہو جاتی۔

"آپ یہ خط اٹھا لیں اور پتہ نوٹ کر لیں شاید ضرورت پڑ جائے۔ ویسے میں انہیں ہر ہفتے ایک خط لکھتا ہوں۔۔۔ اور۔۔۔"

"اور مجھے معلوم ہے کیا لکھتے ہیں۔"

فلکی نے غصے سے وہ سب خط اٹھائے اور دراز میں بند کر دئے۔ سارا دن وہ کھولتی رہی۔ اس کا دل چاہتا ممی سامنے ہوں اور وہ سارے خط ان کے منہ پر دے مارے۔

شام کو جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس میں ممی کا کیا قصور تھا۔ وہ تو بے چاری معمول کے مطابق لکھ رہی ہوں گی۔ یہ سب کمینگی آفاق کی ہے۔ جس نے اسے اتنا عرصہ ماں کے خط کے لئے ترسایا۔

رفتہ رفتہ جب اس کا غصہ زائل ہو گیا تو اس نے ممی کے خط نکال کر پڑھنا شروع کر دئے۔ چھ کارڈ تھے اور چار مفصل خط تھے۔ جس ملک میں چند روزہ قیام تھا وہاں سے ممی نے مفصل خط لکھا تھا اور جہاں سے صرف گزر رہے تھے وہاں سے کارڈ لکھے تھے۔

ہر خط آفاق اور فلکی کے نام تھا۔ سو آفاق کا بھی اتنا ہی حق جتانا ٹھیک تھا۔ مگر پھر بھی وہ اسے معاف کرنے پر راضی نہ تھی۔

ممی نے بہت سی محبتیں بھیجی تھیں اور لکھا تھا کہ عنقریب وہ آفاق کی امی کی مہمان بننے والی ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر نیویارک میں بلایا تھا۔ ممی کا خیال تھا کہ وہ ایک مہینہ وہاں رہیں گی۔

ادھر دونوں مائیں آپس میں گہرے تعلقات کی بنیاد ڈال رہی ہیں اور ان کو نہیں معلوم کہ فلکی کے جی میں کیا ہے؟

فلکی آفاق کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے مشقت کر رہی ہے کیسے کیسے پاپڑ بیل رہی ہے اور کیا کیا نہیں کر رہی ہے۔ کاش یہ بزرگ اس بات سے بے خبر ہوتے۔

پھر بھی اس نے ممی کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ نہ اس کا جواب دینے کا ارادہ ہی تھا۔ ٹھیک ہے۔ جھوٹی ہی سہی باتیں آفاق

یہی مناسب ہے تو بہتر ہے۔

کل کو جب وہ گھر واپس جائے گی تو اپنے ماں باپ کے سامنے شرمندہ نہ ہوگی۔ نہ اس نے کوئی جھوٹ بولا ہوگا۔ نہ اس سے اگریمنٹ ہوگی۔

فلکی نے چادر منہ پر تان کر سوچا۔ ممی آج کل امریکہ میں ہوں گی اور آفاق کی ممی کی بہاریں بھی جھیل گی۔

آج کل آفاق کو اپنا وعدہ یاد دلانا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دن ٹھہر کے جب ممی نیویارک سے چلی جائیں گی تو وہ اسے یاد دلائے گی۔ اس سے پہلے نہ کوئی غلطی کرنی ہے نہ کوئی جھگڑا کرنا ہے اور نہ منہ بسورنا ہے۔

یہ فیصلہ کر کے فلکی سو گئی۔

صبح صبح فلکی نے باورچی خانے میں ہلکی آواز سے ریڈیو لگالیا تھا ریڈیو کئی دنوں سے وہاں پڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کو یہاں رکھنے کا مقصد کیا ہے کبھی کبھی وہ ریڈیو لگا لیتی۔ مگر اس نے ریڈیو کو اپنی جگہ سے ہلایا نہیں تھا۔

آفاق اندر تیار ہو رہا تھا اور وہ ناشتہ بنا رہی تھی۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ آفاق کے کمرے میں نہیں جا رہی تھی۔ اور وہ انڈا تل رہی تھی۔ نہ جانے کس وقت، قمیض ہاتھ میں پکڑے آفاق باورچی خانے میں آگیا تھا۔ اس کی آہٹ پا کر فلکی نے مڑ کر دیکھا تو اس کی جان نکل گئی۔ کفگیر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی بات نہیں سنی بلکہ بڑھ کر ریڈیو بند کر دیا۔

آفاق کے ایک ہاتھ میں نیلی دھاری دار قمیض تھی اور دوسرے ہاتھ میں بٹن۔

"یہ آپ نے ریڈیو کیوں بند کر دیا؟"

آفاق نے پوچھا۔

"مجھے ریڈیو لگا کر کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ آج ویسے ہی لگا دیا تھا" فلکی نے لرزتے ہوئے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے، ریڈیو میں آپ ہی کے لئے لایا تھا کمال ہے آپ نے ابھی تک باورچی خانے میں رکھا ہوا ہے؟"

"جی، میرے لئے۔۔۔۔" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں آپ کے لئے تاکہ آپ اپنے من پسند گیت سن سکیں۔"

"مگر میں نے تو نہیں کہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ آپ نے نہیں کہا تھا لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہر محکمے میں ترقی دینے کے کچھ رواج ہیں۔"

"ترقی دینے کے؟"

"ہاں ہاں، جب کارکن دیانت داری سے اپنا کام کرتے ہیں تو انہیں ترقی دی جاتی ہے یا کچھ رعایتیں دی جاتی ہیں۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی؟"

"تو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ریڈیو سے دل بہلا لیا کریں۔"

"اب تو مجھے عادت نہیں رہی۔"

"پھر سے پڑ جائے گی۔ چلئے میرے سامنے ہی ریڈیو آن کر دیجئے۔"

جب فلکی بے یقینی انداز میں کھڑی رہی تو آفاق نے آگے بڑھ کر خود ہی ریڈیو آن کر دیا۔ مغنی اپنی پُرسوز آواز میں گا رہا تھا ؎

تیرا ستم بھی گوارا تیری جفا بھی قبول
یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں

فلکی نے چونک کر آفاق کی طرف دیکھا۔۔۔ آفاق نے فلکی کی طرف۔۔۔ دونوں کی نظریں لمحہ بھر کو ملیں۔

فلکی کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں ؎

یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں!
۔۔۔۔۔۔ میں تیرے اختیار میں ہوں!

یکایک آفاق اپنے حواس میں آگیا۔۔

اور بولا۔

"اگر تکلیف نہ ہو تو میری قمیض کا بٹن ٹانک دیجئے۔"

"لائیے" فلکی بھی ہوش میں آگئی تھی۔

اپنے صحت مند ہاتھوں کی پوروں میں پکڑا ہوا بٹن جب آفاق نے فلکی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑایا تو دونوں کی انگلیاں ٹکرائیں۔

یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں

جیسے فلکی کی پور پور کہہ رہی تھی۔

فلکی بٹن لگانے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ناشتے کی میز پر جب آفاق آیا تو بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ سفید شرٹ کے اندر اس نے نیلی دھاری دار قمیض پہن رکھی تھی اور سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی آکر بیٹھتا اس کے پاس خوشبوؤں کے بادل چھا جاتے۔

کبھی کبھی فلکی سوچا کرتی۔ کاش وہ خوشبو ہوتی، جو آفاق سے لپٹ جاتی۔

فلکی جب ناشتے کی ٹرے اٹھائے میز پر آئی تو اس نے سنا۔ آفاق اپنی گمبھیر اور پُرسوز آواز میں گنگنا رہا تھا ؎

تیرا ستم بھی گوارا، تیری جفا بھی قبول
یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں!

فلکی کا دل دھڑکنے لگا۔

کتنا اچھا گا رہا تھا وہ ۔۔ یہ تو فلکی پر ٹھیک بیٹھتا تھا۔

لیکن وہ کافی دیر تک اس مصرعے کی تکرار کرتا گیا۔

جانے آفاق کی آواز میں کیا تھا۔

فلکی کے رات والے سارے گلے آپ ہی آپ دور ہو گئے۔

وہ چلا گیا تو فلکی اس کے فقروں پر غور کرنے لگی۔

ہر محکمے میں ترقی دینے کے کچھ رواج ہیں۔ جب کارکن اپنا کام دیانت داری سے کرتے ہیں تو انہیں کچھ رعایتیں دی جاتی ہیں۔

گویا، تو اس کا مطلب ہے فلکی دیانت داری سے اپنا کام کر رہی ہے اور بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اس واسطے آفاق نے اسے ریڈیو کی سہولت فراہم کی ہے تاکہ اس قیدِ تنہائی میں کوئی موسیقی بھرا جھونکا آئے۔

فلکی کا دل خوش ہو گیا۔

رات والی ساری قنوطیت کہیں غائب ہو گئی۔

واہ، دل بھی عجیب چیز ہے۔ رات کو آفاق کی نفرت سے بھرا ہوا تھا اور اب اس کی ذرا سی مہربانی سے اس کی محبت کا طلب گار بن بیٹھا ہے۔۔۔ اس سے اپنا آپ منوانا کتنا کٹھن ہے۔

پتہ نہیں اس کے پاس دل ہے بھی یا نہیں۔

لیکن کیوں؟ آج فلکی کے اندر گھوگرو سے بجنے لگے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

عورت کی جیت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا من موہ لے نہ کہ اس سے نجات حاصل کر کے بھاگ جائے۔

مگر آفاق کا من موہنے کا اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کی دکھتی رگ کہاں تھی؟ کہاں پہ اسے چوٹ لگی تھی؟ اور کہاں سے درد اٹھتا تھا؟

وہ تو اسے ایک فولادی قسم کا انسان معلوم ہوتا تھا جس سے جو چیز ٹکراتی ہے واپس لوٹ آتی ہے۔

لیکن وہ دوسرے آدمیوں سے کتنا مختلف تھا۔ ایک دم مختلف۔۔۔ یہی بات اگر قابلِ نفرت تھی تو قابلِ توجہ بھی تھی۔ اس کی زندگی میں جتنے آدمی بھی آئے، سب کے سب ایک جیسے تھے۔ عورت اور دولت ان کی کمزوری تھی۔ مگر آفاق ایسا نہ تھا۔۔۔ عورت اور دولت دونوں کو پاؤں تلے مسل رہا تھا۔

واقعی کتنا عجیب آدمی تھا۔

ایسے آدمی کو مسخر کرنا دنیا کی سب سے بڑی فتح تھی۔

۔۔۔ اور بعض اوقات لڑکیاں ایسے آدمی کو مسخر کرنے کے لئے جان کی بازی بھی لگا دیتی ہیں۔

"ہے نا۔۔۔؟"

اس نے دل میں سوچا۔

پتہ نہیں، اس کے دل کو گدگدی کیوں لگ گئی تھی حالانکہ آفاق کی مہربانیوں پر اعتماد کرنا بے وقوفی تھی۔ اس کے مزاج کو بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔

ابھی تو دیکھنا تھا کہ وہ فلکی کے ساتھ اور کتنی مہربانیاں کرتا ہے اور کتنی ترقیاں دیتا ہے!

ایک ہفتے بعد پھر عجیب و غریب بات ہوئی۔

شام کو جب آفاق گھر آیا تو اس کے پیچھے پیچھے نوکر نے ایک ٹی۔ وی اٹھا کر رکھا تھا۔ آفاق نے اسے ٹی۔ وی لاؤنج میں رکھوا دیا۔

نوکر چلا گیا تو آفاق نے ڈبا کھولا۔ تاریں نکالیں اور اس کو اپنی جگہ پر فکس کرنے لگا۔

فلکی ہکا بکا سی دور صوفے پر بیٹھی دیکھتی رہی۔

اسٹینا ٹھیک کرنے کے بعد جب آفاق نے ٹی۔ وی چلایا تو اس پر رنگین تصویریں آنے لگیں۔ یہاں پہلے جو ٹی۔ وی پڑا تھا وہ بلیک اینڈ وائٹ تھا اور اب رنگین فلم چلنی شروع ہوئی تو آفاق بھی دور جا کر صوفے پر بیٹھ گیا مگر فلکی حیران تھی۔۔ مگر کوئی سوال نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے آفاق سے کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔ وہ زیادہ تر اس موقع کی تلاش میں رہتی تھی کہ خود آفاق بات کا آغاز کرے تاکہ اسے علم ہو جائے کہ وہ کس موڈ میں ہے۔

جب پروگرام ختم ہوا تو آفاق نے گھوم کر گم صم بیٹھی فلکی کو دیکھا اور پوچھا۔

"کہئے آپ کو ٹی۔ وی پسند آیا؟"

"یہ ٹی۔ وی کس کا ہے؟" وہ بلا اختیار پوچھ بیٹھی۔

"یہ بھی سرکار! آپ ہی کا ہے!"

"میرا مطلب تھا، کرائے کا ہے یا مانگ کر لائے ہیں؟"

اس بات پر آفاق اس قدر زور سے ہنسا کہ دیر تک ہنستا چلا گیا۔

"ویسے آپ کافی ذہین ہیں اور بات بھی یاد رکھتی ہیں۔ اتنا بتا دوں مجھے تو کرایہ کا۔۔ مگر اب یہاں سے نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟"

"آپ اور میں شام کو دیکھا کریں گے۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

"آپ دیکھا کیجئے مجھے تو اور بہت کام ہوتے ہیں۔"

"ارے واہ۔ اب ایسی بھی کیا نا راضگی یوں تو آپ میرے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی روادار نہیں ہیں۔ اسی بہانے سے ساتھ بیٹھ جایا کریں گے اور شام بیت جایا کرے گی۔"

فلکی کو بڑی ہنسی آئی۔ روادار کیوں نہیں؟

...میں یا آپ... مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔
"یہ دوسری ترقی ہے؟" فلکی نے آفاق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
آفاق کو ہنسی آگئی۔ اسے فلکی سے اس قسم کے سوال کی اُمید نہیں تھی۔
"خاصی ذہین ہوتی جا رہی ہیں آپ!"
وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔
"یہ بھی آپ کی عنایت ہے۔" فلکی نے برجستہ کہا۔
"خوب۔۔ بہت خوب...
آپ نے تو آج مجھے خوش کر دیا۔ اسی بات پر میں آپ کو ساری رعایتیں دے دوں گا۔"
دوسرے دن واقعی ایسا ہی ہوا آفاق جب دفتر چلا گیا تو آدمی آئے۔ انہوں نے ہٹیلی فون لگا دیا۔ کیسٹ ریکارڈر، ٹیپ ریکارڈر، ہر شے اپنی جگہ پر سج گئی۔ چاروں کونوں میں اسپیکر لگ گئے۔ گھر پھر بھرا بھرا اور بارونق نظر آنے لگا
سارا کام ختم کر چکنے کے بعد اُن آدمیوں نے فلکی کو بلایا اور بڑے ادب سے جھک کر کہا۔
"بیگم صاحبہ! آپ کام چیک کر لیں۔ اگر آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو ہم جائیں۔"
کسی عزت دار آدمی کی بیگم ہونا کتنا سکون بخش ہے۔ فلکی نے دل میں سوچا۔
پھر اس نے جا کر برائے نام ہی ساری چیزوں کو چیک کیا اور بولی
"آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"
وہ سلیوٹ مار کر چلے گئے۔
فلکی نے نئے سرے سے سارے گھر کو سنوارا۔ خاص طور پر ٹی وی لاؤنج کی ترتیب بدلی۔ وہاں پھول سجائے۔ اسے معلوم تھا آج رات آفاق یہاں بیٹھ کر ٹی۔ وی دیکھے گا اور پھر سب چیزوں کا جائزہ لے گا۔
ابھی وہ آفاق کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔
وہ ڈر گئی اور اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔
کتنی نامانوس اور ڈراؤنی لگی تھی یہ آواز عرصہ دراز سے گھر میں کوئی گھنٹی نہیں بجی تھی۔
اب شور نے گھر میں جیسے تاریں چھیڑ اُٹھی تھیں۔
پہلے تو وہ کتنی دیر تک سہمی کھڑی رہی۔
پھر بڑھ کر اس نے ریسیور اُٹھا لیا مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔
"ہیلو... ہیلو!"
ادھر سے ایک مردانہ آواز اُبل رہی تھی وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ آواز کو پہچان نہیں رہی تھی۔
پتہ نہیں کون بول رہا ہے۔

اس کا دل دھڑ دھڑ بج رہا تھا جو اخواہ یہ فون لگ گیا۔ ایک اور دھڑکا لگ گیا۔ ہزار نئے خوف جاگ اُٹھے۔ کتنے لوگ اس کے واقف تھے اور جانے کون کون اسے جانتا تھا۔ کہیں وہ کم بخت بولی ہی نہ ہو؟
"ہیلو۔ ہیلو... ! بھئی کچھ تو بولو۔ میں آفاق بول رہا ہوں!"
"آفاق..."
فلکی نے ایک طویل سانس لی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی: "جی..."
"بھئی جی کون ہے؟"
"جی، میں ہوں۔"
"حضور! میں آپ کا خادم آفاق بول رہا ہوں۔ آپ اپنا نام لیتے ہوئے شرما کیوں رہی ہیں؟ کیا میں آپ کا منگیتر ہوں؟"
"جی میں فلکی ہوں، فلک..."
اسے فوراً خیال آیا کہ آفاق اسے کبھی فلکی نہیں کہتا۔ بہت فلک کہتا ہے اور طنز کرنا مقصود ہو تو پھر فلک ناز کہتا ہے۔
"اچھا تو فلک صاحبہ! عجیب اتفاق ہے اس طرح فون پر آپ کی آواز سننے کا پہلا موقع ہے۔ بڑی شریلی اور سہمی ہوئی آواز ہے آپ کی اگر بہت عرصہ پہلے سُن لی ہوتی تو آپ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا۔"
فلکی کا دل پہلو میں دھڑکنے لگا۔
اس سے کچھ بولا ابھی نہیں گیا۔ شاید یہ چوکے لگانے کا نیا انداز ہے۔
"ارے کچھ بولیے نا؟ میں نے دفتر کا فون انگیج کر رکھا ہے۔"
"آپ۔ آپ عشق میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔" فلکی نے رُک رُک کر کہا۔
"چلیے، ایک بات تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ سب معلوم ہو جائے گا۔"
"جی..." اس نے اتنا ہی کہا۔
"ویسے آپ بہت اچھا بول لیتی ہیں۔"
فلکی نے کچھ نہیں کہا۔
"یہ تو پوچھیے، میں نے فون کیوں کیا ہے؟"
"آپ خود ہی بتا دیں۔"
"آپ کے لئے دل اُداس ہو رہا تھا سوچا بات ہی کر لوں۔"
"جھوٹ!" ایک دم فلکی کے مُنہ سے نکل گیا۔ پھر جلدی سے بولی "جب فون نہیں تھا، تب کیا دل اُداس نہیں ہوتا تھا؟"
"ہوتا تھا۔"
"تب کیا کرتے تھے؟"
"آپ کا پکایا ہوا بدمزہ کھانا یاد کر کے صبر کر لیتا تھا۔"
کمینہ، فلکی دانت پیس کر رہ گئی
"آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں!" پھر جلدی سے بولی۔ "یہ آپ نے فون کیوں لگوالیا ہے؟"
"بار بار میرے زخم نہ کریدیے۔" آفاق بولا "آپ نہیں جانتیں دفتر میں میرا دل آپ کے بغیر نہیں لگتا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد آپ سے گفتگو کر کے دن گزارا کروں گا۔"
"یا یہ کہ..." فلکی بولی "فون کر کے اندازہ کرتے رہیں گے کہ میں گھر میں ہوں یا بھاگ گئی ہوں!"
آفاق قہقہہ لگا کر بولا "اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ کے بھاگنے کے بھی ارادے ہیں۔"
فلکی خاموش ہو گئی۔
پھر غلط بات کہہ دی تھی اس نے۔
"سنایئے نا کب بھاگنے کا ارادہ ہے؟ اس دن میں فون نہیں کروں گا۔"
"اب بھاگنے کی کیا ضرورت ہے" فلکی بولی
"کیوں؟" آفاق کا دل دھڑک اُٹھا۔
"اب تو ویسے بھی میری میعاد پوری ہونے والی ہے۔ آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"
"کون سا وعدہ۔ ہاں، ہاں... یاد ہے۔۔ جناب یاد ہے!"
آفاق کا دل ایک دم سے بجھ گیا۔
لیکن پیشتر اس کے کہ آفاق کچھ کہتا فلکی نے فون بند کر دیا۔
فون بند کرنے کے بعد فلکی سکون سے کام نہ کر سکی۔ جانے اس نے اسے بے سکون کیوں کر دیا تھا۔ وہ تو پُرسکون ندی کی طرح رواں دواں تھی۔ اب آس نے پھر کنکر پھینکنے شروع کر دیئے تھے۔ حواسوں میں جیسے گرداب بنتے تو اس کا سر چکرانے لگتا

ایک دن آفاق اور فلکی بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ آفاق نے اچانک ٹی وی بند کر دیا اور بولا
"بیگم فلک ناز! آپ کا امتحان نہ ہو جائے؟"
"کس بات کا امتحان؟"
"جو ایک مکمل کورس پڑھنے کے بعد امتحان ہوتے ہیں نا؟"
"جی ہاں۔"
"پھر رزلٹ بھی آؤٹ ہوتے ہیں اور اگلا پروگرام رزلٹ پر منحصر ہوتا ہے!"
"جی ہاں!"
"پھر ہو جائے آپ کا امتحان؟"
"کس طرح کا؟"
"یعنی آپ کی خانہ داری وغیرہ کا"،
"آپ صاف کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں!"
"میں چاہتا ہوں اپنے سارے دوستوں کی دعوت کروں اور سارا کھانا آپ خود پکائیں!"
"میں... اکیلی؟"
"جی ہاں۔"
"کتنے لوگ ہوں گے؟"
"اندازاً پچاس آدمی ہوں گے۔"
"پچاس آدمی... اور میں تنہا ان کے لئے کھانا پکاؤں؟"
"اب آپ کو سب کچھ پکانا آگیا ہے کیوں گھبراتی ہیں!"
"مگر میں نے کبھی اتنے لوگوں کا کھانا نہیں پکایا!"
"کوشش کریں شاید پکا ہی لیں!"
"اگر نہ پکا سکی تو...؟"
"امتحان کی بات ہے۔ امتحان نہ دیا تو سال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"
ہاں۔ فلکی نے دل میں سوچا... ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ جہاں اتنے پاپڑ بیلے ہیں وہاں ایک اور سہی...
چلئے، جان کی بازی لگا لیتے ہیں۔ ہار جیت اللہ کے اختیار میں ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولی "جس طرح آپ کی مرضی"
"شاباش تو پھر کاغذ پنسل لے آؤ۔ دن مقرر کریں۔ لوگوں کی فہرست بنائیں اور مینو بھی بنا لیں!"
"سب کچھ ایک دن میں پک جائے گا؟" مینو بن جانے کے بعد فلکی نے پوچھا۔
"ہم ایسے کرنا، کچھ چیزیں بنا کر ایک دن پہلے فریزر میں رکھ لینا۔ ٹھیک ہے نا؟"
"جی ہاں!" لعنت ہے اس کی عقل پر بھلا ایسی باتیں اس کے ذہن میں کیوں نہیں آتیں جو ہر بار آفاق سے نوالے بنوانے پڑتے ہیں۔
انہوں نے بیٹھ کر اپنے قریبی دوستوں کی فہرست بنائی اور آفاق نے کہا کہ وہ دفتر سے دعوت نامے چھپوا کر ان کے گھر بھیج دے گا۔ پھر وہ فلکی سے بولا۔
"شادی کے بعد میرے گھر میں یہ پہلی دعوت ہوگی اس سے پہلے دعوتوں کا انتظام میری امی کرتی رہی ہیں۔ ہمارے گھر کی روایت ہے کہ دعوت بہت شاندار ہوتی ہے اب اس روایت کو برقرار رکھنا آپ کا کام ہے۔"
"اللہ مالک ہے" فلکی نے آہستہ سے کہا۔
"ابھی درمیان میں ایک ہفتہ ہے آپ مجھے سب چیزوں کی فہرستیں بنا دیں میں سودا سلف منگوا دوں گا۔"
فلکی دل میں بہت گھبرائی ہوئی تھی اتنے آدمیوں کا کھانا پکانا اتنا ظلم تھا۔ پہلی چال

... کیا کیا کرے گی؟ اور کس طرح کرے گی۔ اس نے عادی ہو کر کہیں غلطی تو نہیں کی سوچ سوچ کر پاگل ہوتی جا رہی تھی۔

دعوت سے دو دن پہلے اس نے سب چیزوں کی فہرستیں بنا کر آفاق کو دے دی تھیں۔

اگلے دن آفاق تمام سودا سلف لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک باورچی آدمی بھی سبزی اور گوشت کی ٹوکریاں اُٹھائے ہوئے باورچی خانے تک آ گیا۔

فلکی جب اِدھر اُدھر کا کام کر کے باورچی خانے میں آئی تو وہاں پر باورچی ملازم ابھی تک کھڑا تھا۔ فلکی کا خیال تھا سودا سلف رکھ کر وہ چلا جائے گا جس طرح کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

"کیا بات ہے؟" فلکی نے اندر آتے ہی پوچھا۔

"صاحب نے بولا تھا اِدھر ٹھہرے گا۔"

"اچھا!" فلکی نے سوچا کہ شاید کوئی کام ہوگا اس سے آفاق کو۔ وہ پھر کام میں مگن ہو گئی۔

جب دونوں ... دیکھ رہے تھے تو فلکی کو ایک دم وہ آدمی یاد آ گیا

"وہ آدمی آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

"کون سا آدمی؟" آفاق حیرت سے بولا

"وہی جو سودا لے کر اندر آیا تھا۔"

"ہاں!" آفاق نے ہنستے ہوئے کہا "وہ آپ کے ساتھ دعوت کا کام کروانے آیا ہے۔"

"سچ مچ؟" فلکی نے حیرت سے کہا

"جی ہاں۔ میں نے سوچا لوگ زیادہ ہوں گے کام بھی زیادہ ہوگا برتن بھی زیادہ ہوں گے۔ اب آپ نے شرافت سے ساری ذمہ داری اُٹھائی ہے تو مجھے بھی شرافت کا ثبوت دینا چاہئے۔"

"اچھا ... اسے شرافت کہتے ہیں؟" فلکی ہنس کر بولی۔ "آپ کی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ آپ ہی بتا دیں؟"

"میری زبان میں تو اسے ترس کہتے ہیں؟"

"چلئے ترس ہی کہہ لیجئے۔" فلکی کو تسلی ہو گئی۔ واقعی دوسرے آدمی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے کھانوں کے لئے مصالحہ بنانا..... ہزاروں کام ... اور پھر برتنوں کا جو ڈھیر نکالا جائے گا، اس کا کیا ہوگا۔

فلکی نے دعوت سے ایک دن پہلے دعوت کا کام کرنا شروع کر دیا۔ عبدالکریم کو ساتھ لگا لیا۔ عبدالکریم اتنا سمجھدار نوکر تھا کہ فلکی اشارہ کرتی تو وہ کام مکمل کر دیتا۔ مصالحے اور سلاد بنانے میں، چمچ چلانے میں، آنچ کم اور تیز کرنے میں اسے کچھ بھی سمجھانا نہ پڑتا تو فلکی بولی۔

"عبدالکریم! کیا تم کھانا پکانا جانتے ہو؟"

"جی سر!"

"کہاں کام کرتے ہو؟"

"کام تو میں دفتر میں ہی کرتا ہوں مگر صاحب لوگ کا اکثر کھانا پکاتا رہا ہوں۔ کبھی صاحب جی دفتر میں بلا لیتے ہیں کبھی گھر پے۔"

"اچھا، میں تو تمہیں بیرا ہی سمجھ رہی تھی"

"بیرا ہی سمجھو سر جی! میں سب کام جانتا ہوں۔"

"اچھا، روسٹ بنا لیتے ہو؟"

"جی سر، بکرے کا خواہ ثابت، ران کا ... یا مرغ کا"

"چاپیں بنا لیتے ہو؟"

"جی سر! آپ کس قسم کی پسند کرتے ہیں؟"

"اچھا تم ایسا کرو، جو کچھ میں کہتی جاؤں تم کرتے جاؤ۔ تم صرف میری مدد کرو۔ کھانا میں پکاؤں گی۔ تم جانتے ہو نا تمہارے صاحب کسی اور کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتے۔"

"جی سر۔" وہ ادب سے بولا۔

اور پھر فلکی اسے اپنے طریقے کے مطابق مصالحے لگانے اور پکانے کے طریقے بتاتی رہی کتنی آنچ پر کیا پکے گا اور کس صورت میں اُتارا جائے گا۔ مختلف قسم کے سلادوں کے بارے میں بتایا اور یہ سب بتا کر فلکی کو بہت خوشی ہوئی۔ آج اس نے زندگی میں پہلی بار روحانی خوشی محسوس کی۔ اسے اتنا کچھ پکانا آتا تھا کہ وہ ایک معمولی قسم کے خانساماں کے آگے شرمندہ نہیں تھی اگر وہ کچھ بھی نہ جانتی ہوتی تو آج بے وقوفوں کی طرح اس کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوتی اور اس کا جو دل چاہتا پکا کر دے دیتا۔ بے شمار چیزیں ضائع کرتا۔ بہت سے پیسے خرچ کروا دیتا۔ چیزوں کی شکلیں بگاڑ دیتا اور پھر مصر رہتا کہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔ اب کم از کم وہ جان رہا تھا کہ بیگم صاحب کو علم ہے کہ کوفتوں کی شکل کیسی ہونی چاہئے مرغی میں کتنا شوربہ رکھنا مناسب ہے۔ ساگ کو کتنا بھوننا چاہئے۔ روسٹ کی رنگت کیسی ہو۔ چاپیں کتنی قسم کی ہوتی ہیں۔ روسٹ کے ساتھ کون سا سلاد رکھتے ہیں اور چاپوں کے ساتھ کس قسم کا۔ سوپ کیسا ہونا چاہئے۔ پلاؤ کی رنگت کیسی ہونی چاہئے اور میٹھا...!

میٹھے اس نے دو قسم کے بنائے تھے اور عبدالکریم سے صاف کہہ دیا تھا کہ صاحب اس کے ہاتھ کا میٹھا پسند کرتے ہیں کیوں کہ اس نے سب میٹھے صاحب ہی سے تو سیکھے تھے۔

اس نے خانساماں کے سامنے گجریلا بنایا تھا۔ اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ گاجریں کش کر دے۔ باقی کام خود کرکے دوسرا املائی میٹھا بنایا تھا۔ پڈنگ کسٹرڈ اور کیک ملا کر۔ عبدالکریم حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی جان اتنے زیادہ کام جانتی ہے اور اسی اس حیثیت پر فلکی کو بے حد مسرت ہو رہی تھی۔ بھاگ بھاگ کام کر رہی تھی۔ کبھی باورچی خانے میں ہوتی، کبھی ڈرائینگ روم میں۔

"دیکھو جل نہ جائے۔"

"کبابوں کا قیمہ بنا لیا ... دکھاؤ تو .. ہاں ٹھیک ہے۔"

اسے ایک ایک بات کا پتہ تھا کہ یہ کس طرح ہوگی۔

تب گجریلے کے اوپر چاندی کے ورق لگاتے ہوئے اس نے سوچا۔ آفاق ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جس عورت کو خانہ داری نہیں آتی وہ عورت ہی نہیں ہوتی۔ جو عورتیں گھرداری نہیں کر سکتیں وہ صرف کٹھ پتلیاں ہوتی ہیں۔ گھر، گھر کا ادراک، گھر کا باورچی خانہ ... یہی سب تو عورت کی جنت ہے اور جنت کسے کہتے ہیں؟ کیا بننے سنورنے اور کلبوں میں جانے کو؟

جن عورتوں کو اپنے گھر کا شعور نہیں ہوتا، وہ گھر کیوں بساتی ہیں! اللہ تعالیٰ نے دنیا بسانے کے لئے مرد کو بھیجا اور گھر بسانے کے لئے عورت کو۔ عورت کو تعلیم بھی حاصل کر لینی چاہئے ... فیشن بھی کرنا چاہئے ..... لیکن عورت رہ کر...

اب..... یہ سب کام کر کے اسے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے آپ میں اضافے کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی عظمت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اور نہ گھر کا کام گھٹیا کام ہی لگ رہا تھا۔

اگر آج وہ یہ سب نہ کر رہی ہوتی تو کتنی ہلکی اور گھٹیا لگ رہی ہوتی۔

کچھ جاننا... اور پھر جان کر اوروں کو بتانا کتنا تسکین دہ امر ہے۔

کیا اس ادراک کے لئے اسے آفاق کا شکرگزار ہونا چاہئے؟

دعوت کا دن بھی آ گیا۔ فلکی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سے کپڑے پہنے۔ ایک عرصے سے اس نے گوٹے کناری والے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ اپنی بھاری بھاری ساڑھیاں صندوقوں میں بند کر دی تھیں۔ زیوروں کو ہوا نہیں لگائی تھی۔ آج ان کے گھر میں دعوت تھی اور ظاہر ہے آج اچھے کپڑے پہننے تھے۔ پہنتے ہوئے ڈرتی بھی تھی۔ اگر آفاق نے کوئی اعتراض کر دیا۔ عین وقت پر کوئی کچوکا لگا دیا تو کیا ہوگا۔ سب کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ پھر اس کا اپنا دل جو اتنا بُرا ہوگا۔ آج کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس سے اس کا دل بُرا ہو۔ آفاق باہر انتظامات میں اتنا مصروف تھا کہ ڈھنگ سے اندر آ کر بیٹھتا نہیں تھا جو وہ کسی بہانے اس سے پوچھ ہی لیتی۔ بہرحال وقت گزرا چلا جا رہا تھا اس لئے وہ اپنے کمرے میں آئی۔ سارے کپڑے دیکھے۔ پھر اس نے ایک کالی ساڑی کا انتخاب کیا۔ اس پر سنہری ہلکا سا بارڈر لگا ہوا تھا۔ یہ ساڑی اسے بالکل ٹھیک معلوم ہوئی۔ بھری رات کے فنکشن کے لئے رنگ بھی مناسب تھا۔ اس نے سوچا وہ اس کے ساتھ کالے نگینوں والا چھوٹا سا لاکٹ اور ٹاپس پہن لے گی۔ کلائی میں ایک طرف گھڑی ہوگی اور دوسری طرف کالی چوڑیاں پہن لے گی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر آئینے کے سامنے کھڑی کولڈ کریم لگا رہی تھی کہ آفاق آ گیا۔ اس نے آتے ہی پلنگ پر پھیلی ہوئی سیاہ ساڑی دیکھی۔ پھر فلکی کی طرف دیکھا۔

فلکی ڈر گئی۔

بولا "آپ آج یہ ساڑی پہن رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔" فلکی آہستہ سے بولی۔

"آپ کے پاس کوئی اور مناسب کپڑے نہیں ہیں؟"

"جی ... وہ چھینٹ کا پھول دار سوٹ پہن لوں۔" فلکی نے جلدی سے اُن کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جو آفاق اس کے لئے لایا تھا۔ اسے ان سے زیادہ مناسب کوئی کپڑا نہیں لگ رہا تھا۔

"کچھ اور ...؟" آفاق نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

"باقی سب ...؟" وہ رُک گئی "میری شادی کے کپڑے ہیں۔"

"ذرا اپنی وارڈروب کھولئے۔"

آفاق آگے بڑھ گیا۔

اس نے فلکی کی وارڈروب کھول دی۔ جلدی جلدی سارے کپڑے دیکھ لئے اور ایک بہت بھاری سرخ ساڑی نکال کر پلنگ پر رکھ دی۔

"آج کے فنکشن کے لئے یہ موزوں ہے اور اس کے ساتھ سرخ نگینوں کے زیور پہنئے۔ خوشی کے موقع پر سرخ رنگ پہنتے ہیں۔"

یہ کہہ کر آفاق باہر نکل گیا۔

فلکی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یہ سُرخ ساڑی فلکی نے ابھی تک نہیں پہنی تھی۔ بہت شوق سے بنوائی تھی۔ فلکی کو ہمیشہ سے سُرخ رنگ بہت پسند تھا۔ لیکن پہلی رات سُرخ کپڑوں کا جو حشر ہوا تھا، اس کے بعد اسے سُرخ رنگ سے نفرت ہو گئی تھی اس لئے اس نے سارے سُرخ کپڑے اُٹھا کر رکھ دئیے تھے۔

اور آج پھر وہی آفاق اسے سُرخ کپڑے پہننے کا حکم دے گیا تھا۔

سُرخ کپڑے تو سہاگ رات کی علامت ہوتے ہیں۔ جذبات کو جگاتے ہیں۔ آگ لگاتے ہیں جس آگ کو اس نے پھونکیں مار مار کر بُجھا دیا تھا اس کا تو ہیولٰی سرد ہو چکا تھا۔

اور آج یہ ستمگر اسے کس خوشی کی نوید دے رہا ہے

خوشی کیا ہوتی ہے؟

اور یہ تقریب کس خوشی میں منائی جا رہی ہے؟

یہ تو میرا امتحان ہے۔

امتحان کا آخری پرچہ۔

اس امتحان اور آزادی کے درمیان سُرخ رنگ کیوں حائل ہو رہا ہے؟

فلکی گم صُم بیٹھی رہی۔

پھر اُٹھ کر تیار ہونے لگی۔

اس نے بھی آج عرصۂ دراز کے بعد جی کھول کر میک اپ کیا تھا۔ بہت خوبصورت بال بنائے۔ اپنی خوبصورت آنکھوں کو سنوارا۔ ہائی ہیل کے سینڈل پہنے۔ سُرخ ساڑی کے ساتھ سُرخ نگینے والا بھاری جڑاؤ سیٹ نکال کر پہنا تو واقعی فلکی چوتھی کی دُلہن معلوم ہونے لگی۔

دُلہن ہی تو تھی وہ۔

مگر ایسی دُلہن جسے سنگھار راس نہ آیا ہو۔

وہ کلی جو کھل نہ سکی ہو۔

مگر کلی کا ایک اپنا حُسن ہوتا ہے۔

فلکی باہر آتے ہوئے شرما رہی تھی۔ گھبرا رہی تھی... آفاق کیا کہے گا اسے اتنے بھاری سنگھار میں دیکھ کر... ایسے تو آفاق کے ساتھ رہتے ہوئے لپ اسٹک تک لگانا چھوڑ دی تھی۔

وہ اندر کھڑی سوچ رہی تھی کہ اسے آفاق کی آواز آئی۔ شاید وہ نوکر سے کہہ رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔"

فلکی نوکر کے اندر آنے سے پہلے باہر نکلی اور لپک کر آفاق کے پاس پہنچ گئی۔ واقعی کچھ مہمان موٹر سے اُتر رہے تھے اور آفاق ان کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ جا کر آفاق کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

" آخاہ! دُولہا دُلہن تو آج چاند سورج کی جوڑی معلوم ہو رہے ہیں۔" آغا صاحب نے موٹر سے اُترتے ہی کہا۔

آفاق نے بڑھ کر آغا صاحب سے ہاتھ ملایا جب کہ فلکی نے بیگم آغا سے ہاتھ ملایا۔ مسز آغا نے فلکی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

" واقعی مسز آفاق تو آج غضب ڈھا رہی ہیں۔"

تب آفاق نے نظر اُٹھا کر فلکی کے سولہ سنگھار کو دیکھا۔ لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

پھر ہنس کر بولا۔

" اچھا ہوا آپ لوگ وقت پر آگئے ورنہ آج ان کا یہ غضب مجھ پر ہی قیامتیں توڑتا۔"

اس پر ایک قہقہہ اُبھرا۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی آج فلکی کو آفاق کی یہ تعریف چبھتی بالکل نہیں تھی۔ سب لوگ ہنستے مسکراتے ہال کمرے میں داخل ہوئے پھر مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک کے بعد دوسرا... سب آتے گئے۔ فلکی اور آفاق بار بار اُٹھ کر جاتے، مہمانوں سے ہاتھ ملا کر انہیں لاتے اور اپنی اپنی جگہ بٹھاتے۔

خوبصورت فقروں میں حال چال کا تبادلہ ہوتا۔ آج فلکی مُسکرا مُسکرا کر ہر مہمان کا استقبال کر رہی تھی۔ بیرے کو اشارہ کرتی تو وہ مشروبات کی ٹرے اُٹھا کر لے آتا۔ سُوپ اور مشروبات ایک ہی وقت میں سرو ہو رہے تھے جس کا جو دل چاہتا، وہ اُٹھا لیتا۔ آج آفاق نے دو اور بیرے بھی منگوا لئے تھے جو سفید براق ایسی وردیوں میں ٹرے اُٹھائے اِدھر سے اُدھر گھومتے پھر رہے تھے، لیکن آج فلکی صرف بیگم بن کر نہیں بیٹھی ہوئی تھی بلکہ مہمانوں کو بٹھانے کے بعد جلدی سے ایک چکر باورچی خانے کا بھی لگا لیتی تھی۔ کھانے کو بھی دیکھ لیتی۔ ڈائننگ ٹیبل پر بھی نظر دوڑا لیتی... اور اس کے علاوہ ملازمین کو اگر کچھ اور ہدایت دینی ہوتیں تو وہ بھی دے دیتی۔ آج احساس ہو رہا تھا جیسے وہ گھر کی مالک ہے... اس کے اندر نہ صرف مالک ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہی مالکانہ سا غرور اور خوشی بھی آگئی تھی۔ بڑی تمکنت سے چلتی اور بڑے اعتماد سے بات کرتی اور بڑے وقار سے مُسکراتی تھی۔ آفاق اسے بازو سے پکڑ کر کبھی ایک طرف لے جاتا اور کبھی دوسری طرف... اور اس کے تعارف کرانے کا انداز بھی تو کتنا انوکھا تھا۔

"بھئی یہ میری فلک ہے۔"

"بس اب اس کو چھوڑو بھی۔" کوئی منچلی ہنس کر کہتی "یہ سب جانتے ہیں کہ یہ تمہاری فلک ہے۔"

فلکی شرما کر ہنس پڑتی اور بازو چھڑا کر کسی اور کام میں مصروف ہو جاتی۔ آج لوگوں کے ریمارکس بھی اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"آہا مسز آفاق! آپ تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہیں۔" ایک کہتی۔

"اور دیکھئے کس قدر اسمارٹ ہیں۔" دوسری کہتی۔ "وہ شادی والی چربی تو ان پر چڑھی ہی نہیں۔"

فلکی ان کو کیا بتاتی کہ اس پر چربی کیسے چڑھ سکتی... کتنی مشقت کی ہے اس نے زندگی میں... اور پھر فلکی پہلے سے کمزور ہو گئی تھی اور رنگ بھی پہلے سا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی لوگ اسے کہہ رہے تھے وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے۔

عجیب اُلٹے دستور ہیں اس دنیا کے۔

فلکی جی ہی جی میں ہنس رہی تھی۔ جب پھلواری اپنے آپ کو پامال کر دیتی ہے تو لوگ کہتے ہیں... خوشنما ہو گئی ہے۔

"ارے یہ موٹی کیسے ہوتیں، موٹاپا تو بچے کے بعد آتا ہے۔" ایک خاتون نے فلکی کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہا۔

فلکی کا دل دھڑک اُٹھا۔ اس نے گھبرا کر آفاق کی طرف دیکھا جو اِدھر ہی آ رہا تھا اور اس نے خاتون کا فقرہ سُن لیا تھا۔

کہیں اب اس کا دل... اور آفاق کا چہرہ... اس کی زندگی کا یہ بھید نہ کھول دے۔ فلکی ڈر رہی تھی۔

مگر آفاق قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور فلکی کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"خواتین و حضرات! میری چھوٹی موٹی سی فلکی کو ایمبریس (EMBARRACE) نہ کریں۔ میں اتنا خود غرض نہیں کہ اتنی خوبصورت بیوی کو اتنی جلدی بچوں میں پھنسا دوں... ابھی نہیں..." یہ کہہ کر اس نے ایک آنکھ بند کی۔ اس پر سارے ہال میں ہنسی کے فوارے چھوٹ پڑے۔

کاش یہ بات حقیقت ہوتی فلکی نے دل میں سوچا۔

اور تو اور آج محفل کے سارے مرد بار بار فلکی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کو سراہ رہے تھے۔ ہر ایک کی نظر کہہ رہی تھی کہ وہ آج کی رات ملکہ ہے اور اس محفل میں سب سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے۔

جمال صاحب توصاف کہہ رہے تھے۔

" یار تیری بیوی تو ابھی تک تر و تازہ ہے اور تم بھی بڑے خوش باش نظر آ رہے ہو۔ لگتا ہے تقدیر تم پر مہربان ہو گئی ہے۔" آفاق۔

آفاق ہنسا۔ "تقدیر مجھ پر کب مہربان نہیں تھی جمال صاحب؟ اصل میں، میں دل کا اچھا آدمی ہوں اور بنیادی طور پر دیانت دار بھی ہوں۔ بے نا فلک" اس نے فلکی کی طرف دیکھا۔

آج فلکی بھی بار بار آفاق کو دیکھ رہی تھی سیاہ ڈنر سُوٹ۔ سفید قمیض اور سُرخ بو میں وہ بہت خوبصورت اور کم عمر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ کہیں بھی سرکشی کا عذاب نہ تھا۔

جب بھی کوئی فلکی کے حُسن کی تعریف کرتا، وہ چاہتی کہ آفاق بھی اس کی تعریف کو سُن لے۔ اسے اپنے اندر عجیب سی تبدیلی محسوس ہوتی۔ پہلے وہ ان محفلوں میں اِدھر اُدھر منڈلاتی رہتی تھی اور اگر کوئی مرد تعریف کرتا تو بار بار اس پر اپنے ناز و انداز سے بجلی گرایا کرتی تھی۔ مگر آج اسے مردوں کا بے باکانہ تعریف کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ آج صرف آفاق اس کی تعریف کرے۔ یہ حق صرف آفاق کو پہنچتا ہے۔

اس لئے وہ زیادہ تر آفاق کے پاس جا کر کھڑی ہوتی تاکہ لوگوں کو اس کی عدم موجودگی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ ملے... اور جو کچھ وہ کہتے ہیں آفاق خود سُن لے۔ آفاق کو احساس ہو جائے کہ آفاق کے مقابلے میں اسے کسی رائے کی پرواہ نہیں ہے۔

مگر آفاق بار بار ایک کالی ساڑھی والی محترمہ کے پاس جا کھڑا ہوتا تھا... اور فلکی کی نظریں بھی تعاقب کرتی ہوئی وہیں پر جا کر رُک جاتیں۔

یہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور سب سے آخر میں آئی تھی۔ اس نے سیاہ ساڑی پہن رکھی تھی کالی چھوٹا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ بڑے قرینے سے میک اپ کیا گیا تھا اور اتنی خوبصورت خاتون تھی کہ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر فلکی کو دھچکا سا لگا۔ فلکی کو یوں محسوس ہوا کہ اس پوری محفل میں شاید یہی خاتون اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اگر اس سے زیادہ خوبصورت نہیں تھی تو اس کی ٹکر کی ضرور تھی یا ممکن ہے دونوں کے حُسن کی ادائیں فرق ہوں۔ بہر حال دونوں اپنی اپنی جگہ پر غضبناک چیزیں تھیں۔ یہ خاتون جب محفل میں آئی تو فلکی کچن میں نوکروں کو ہدایت دینے گئی ہوئی تھی۔ وہ جب واپس آئی تو آفاق اس کالی ساڑی والی خاتون سے گفتگو کر رہا تھا۔

اس سے آگے کے حالات جاننے کے لئے اگلا شمارہ ملاحظہ کیجئے۔

میرا پسندیدہ شعر

لبیب النساء، علی آباد، حیدرآباد دکن
مجھکو یہ پاس ضبط کہ لب کھولنا گناہ
ان کو یہ آرزو کہ کوئی التجا کرے
نامعلوم

محمد حبیب الرحمٰن، پورنیا
کہاں دیوانوں میں وحشت کا منظر کبھی آئے گا
گزر رہے گے شہر سے تو میرا گھر بھی آئے گا
نامعلوم

شیخ ابراہیم عرب، کرناٹک
اک نظر دیکھا تھا اس نے ساحر
گھر والے دل نے فسانے کتنے
ساحر ہوشیار پوری

عشرت امیر، سہسرام
دل ویراں ہے تری یاد ہے تنہائی ہے
زندگی درد کی بانہوں میں سمٹ آئی ہے
نامعلوم

محمد ریاض الدین، حیدرآباد
عشرت کے آسماں پہ تم چاند بن کے چمکو
جس باغ میں بھی جاؤ تم پھول بن کے مہکو
نامعلوم

ام حبیبہ تشنہ بیگم، مرادنگر، حیدرآباد
جگر میں داغ ہے سینے میں داغ دل میں داغ
خدا کا شکر ہے دامن تو داغدار نہیں
رزمی

رانی گلنار ناز، چکر دھر پور، بہار
کتنی پرکیف کتنی شاداب جوانی ان کی
دل میں رقصاں ہے وہی شکل سہانی ان کی
نامعلوم

سید ریاض احمد، مشیرآباد، حیدرآباد
جو زر بستی میں کھو گئے وہ رہ جاتے بھلا کہیں
ہم اچھے تو پرائوں کی زندگی کیسا ہے
نامعلوم

ڈی۔ این۔ انجم، کچھی
کچھ نقش تیری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے
عظیم مرتضٰی

جی الدین شیخ، نیو نامپلی، حیدرآباد
اس کو یہ بات ذرا یاد دلا دو جامی!
جس کا شیشے کا مکاں ہے وہ نہ پتھر پھینکے
رحمٰن جامی

مس نورہ خان، بلند شہر
غیرت تشنہ لبی نے مری عزت رکھ لی
لب دریا ہوں مگر پیاس لئے بیٹھا ہوں
شمیم جے پوری

ایس۔ کے۔ برہان الدین، ورنگل
تم مرے سینے نہ کچھ پوچھو، آنکھیں تو بتاتی ہیں
کیا تم میں تمہارے جیسے ہم خوب سمجھتے ہیں
نامعلوم

انجم حباب، محبوبہ (آوالیہ)
جو کلیاں پھول بنتی ہیں وہی مرجھا بھی جاتی ہیں
خوشی کی ابتدا کو انتہائے غم بھی کہتے ہیں
(آزاد)

محمد اقبال قیصر، الطائف، سعودیہ
یار رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلے ہیں بہت
(نامعلوم)

محمد اشرف علی خان، حیدرآباد
خاموش رہے دونوں اظہار محبت پر
کچھ ضبط کیا ہم نے کچھ ان کو حیا آئی
نامعلوم

حامد مرزا، ضلع بیڑ
دوستوں نے اس قدر صدمے دئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
نامعلوم

سید یوسف الدین ساحر، محبوب نگر
ہر کوئی زندگی کے اندھیرے میں جو دیا جلا کے چلا گیا
وہ پتہ بھی اپنا نہ لکھ سکا مری جستجو کی کتاب میں
نامعلوم

مرزا آسیہ ناظم، حیدرآباد
زندگی کو سنبھال کر رکھئے
زندگی موت کی امانت ہے
بسمل سعیدی

رحیم خان، تندالریاض (سعودی عربیہ)
پیاسا سا بھی ہوں دریا سے محبت بھی رہا ہوں
تونے مجھے کیوں ریت کے ساحل پہ ہے چھوڑا!
نامعلوم

منظور الحسن نقوی، مرادآباد
جس پیڑ کے سائے میں تھا وہ گر گیا بارو!
اب گھر کی مرے کوئی بھی پہچان نہیں ہے
عظیم امروہوی

ایم۔ اے۔ ودود جاوید، نظام آباد
چمک اٹھتا ہے سر شام ترا یاد کا چاند
کبھی تاریک نہ دیکھی شب فرقت میں نے
احمد ندیم قاسمی

سید ریاض احمد، مشیرآباد، حیدرآباد
گھنی زلفوں کے سائے میں چمکتا چاند سا چہرہ
تجھے دیکھوں تو راتیں شہانی یاد آتی ہیں۔
میرا جی

محمد سیف الدین صدیقی، دہلی
میرے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانے میں معبود بنے بیٹھے ہیں
نامعلوم

حوریہ صدیقہ، حیدرآباد
ہر راستہ کہیں نہ کہیں مڑ ہی جائے گا!
رشتوں کے بیچ تھوڑا بہت فاصلہ بھی رکھ
مرغوب علی خاں

رحیم النساء بخشی، بلگام (کرناٹک)
ڈھونڈتے آئی ہوئی آواز کا مفہوم ہوں
جو سمجھنا چاہتا ہے دیر تک سوچا کرے
غلام ربانی تاباں

مرزا محمد حامد بیگ، حیدرآباد
یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے
بشیر بدر

ناظمہ ربی، بارہ بنکی
آپس میں جھگڑے تو پہلے کہاں ہوا کرتے تھے
اک محبت تھی مگر وہ رنجشیں شکایات میں تھی
کشور عثمانی مرادآبادی

منصور علی خاں، محبوب نگر (اے پی)
کہہ کر بہار کیا اس نے مگر اس کے لئے
میری آنکھوں سے بہیں گے تو دعا کے آنسو
ڈاکٹر اکبر یوسفی

شکیل احمد، ونا پور، مونگیر
اپنے لئے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا
مجاز

صاحب رشید لغنی (نٹ ط)، آمبور
آج وہ یادوں کی دستاویز چھوڑی ہو گئی
کوئی اس بستی کے نقشے سے مرا گھر لے گیا
سیدہ نشاں

زاہدہ فاطمہ، آمبور
منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو گئی
ہم خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں
نامعلوم

محمد مصطفٰے قریشی، نصاب پورہ، دہلی
یہ الگ بات ہے سفر اٹھا نہیں ہوں لیکن
تیرے ہر لفظ کو آک شعر کا پیار لکھوں
سکاوستی بنائے گرامی

سبہار جہاں، نظام آباد
سر محشر یہی پوچھوں گی خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے
نامعلوم

معراج محمد خان منو، حیدرآباد
ان ہواؤں میں اگر زہر نہیں ہے کوئی
آدمی سانس بھی لیتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے
نامعلوم

محمد مسیح الزماں قریشی، رانی گنج
وہ ہے بے بسی وہ ہے بے بسی
جسے لوگ کہتے ہیں — زندگی
ترنم

محمد ابراہیم خاں، نظام آباد
دل میں ہیں درد و غم کے فسانے بھرے ہوئے
کس کو سناؤں گر کوئی درد آشنا ملے
نامعلوم

(رشید حسین معصوم)، بتیا
نظروں نے خطا کی تھی نظروں کو سزا ملتی
دن رات تڑپنے کی کیوں دل نے سزا پائی
نامعلوم

محمد شہاب الدین حیدر، لہریا سرائے (بہار)
ترا ہاتھ ہاتھ میں ہو اگر تو سفر ہی اصل حیات ہے
میرے ہر قدم پہ ہیں منزلیں ترا پیار گر میرے ساتھ ہے
نامعلوم

سید حسین دلشاد، محبوب نگر
لبوں پہ چھوٹے تبسم کو سب نے دیکھ لیا
پڑی نہ زخم جگر پہ نظر زمانے کی
نامعلوم

نوٹ: اشعار کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھئے
اپنے اشعار اس پتے پر لکھئے: "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ "بانو"۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیوٹی کالج

چہرہ گلاب کیسے بنے؟

شہناز حسین

دنیا کی زیادہ تر عورتوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوب صورت نظر آئیں اور اپنے آپ کو خوب صورت بنائے رکھنے کے لئے وہ بہت سے طریقے استعمال کرتی ہیں۔ ان طریقوں میں چہرے کے میک اپ کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اگر چہرے کا میک اپ سلیقے اور نفاست کے ساتھ کیا جائے تو معمولی شکل و صورت کی عورت بھی خوب صورت نظر آنے لگتی ہے۔ اور اگر کوئی خوب صورت عورت سلیقے سے میک اپ کرے تو واقعی اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

میک اپ کرنے سے پہلے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے چہرے کی ساخت کیسی ہے۔ یہ جاننے کے لئے آپ کو اپنے چہرے کو تین حصوں میں بانٹنا ہوگا۔ پہلا حصہ ماتھے سے بھنوؤں تک، دوسرا بھنوؤں سے ناک کے آخری سرے تک اور تیسرا ناک کے آخری سے ٹھوڑی تک۔ ان تینوں حصوں کو الگ الگ انچ ٹیپ سے ناپئے۔ اگر آپ کے چہرے کے تینوں حصے ایک جیسے ناپ کے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا چہرہ بیلنس یا (کتابی) ہے۔ ایسے چہرے کو بہترین چہرہ مانا جاتا ہے لیکن بہت چہرے کتابی نہیں ہوتے۔ تاہم ان کو میک اپ کے ذریعہ کتابی چہرے کا تاثر دیا جا سکتا ہے۔

میک اپ کرتے وقت کچھ باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ جو یوں تو بہت معمولی ہیں، مگر ہیں بے حد ضروری۔

میک اپ سے پہلے ایک اسکارف سے اپنے بالوں کو باندھ لیں۔ پھر چہرے کے

ایک حصے کا الگ الگ میک اپ شروع کریں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ آپ کا میک اپ ایسا ہونا چاہئے جو چہرے کی خامیوں کو چھپا دے۔ مثلاً اگر آپ کی ناک چوڑی ہے تو میک اپ اس انداز کا ہونا چاہئے کہ ناک لمبی نظر آئے۔ اگر چہرے پر کسی قسم کے نشانات ہیں تو یہ نشان میک اپ کے بعد نظر نہیں آنے چاہئیں۔ ایسا میک اپ کرنے کے لئے آپ کو دو رنگوں کی فاؤنڈیشن استعمال کرنی ہوگی۔ ایک ذرا ہلکے رنگ کی اور دوسری گہرے رنگ کی۔ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ گہرے رنگ کی فاؤنڈیشن گالوں پر لگائیں اور ہلکے رنگ کی فاؤنڈیشن چہرے کے ان حصوں پر جو بہت زیادہ چھوٹے ہوں۔

موتھ (دہن) کا ناپ بھی لپ اسٹک کے ذریعہ درست کیا جا سکتا ہے۔ جب آپ لپ اسٹک کا استعمال کریں تو پہلے اپنے ہونٹوں کو اچھی طرح صاف کرلیں۔ اس کے بعد وہی فاؤنڈیشن لگائیں جو آپ لے اپنے چہرے پر لگائی ہے۔ اگر آپ کے پاس لپ پنسل ہے تو اپنے ہونٹوں پر اس پنسل سے آؤٹ لائن بنالیں۔ اگر آپ کے ہونٹ زیادہ چوڑے ہیں تو آؤٹ لائن تھوڑی سی اندر کی طرف بنائیں اور اگر ہونٹ زیادہ پتلے ہیں تو آؤٹ لائن تھوڑی سی باہر کی طرف بنائیں۔ اس کے بعد ہونٹوں پر برش سے لپ اسٹک لگائیں۔ اگر آپ کا اوپر یا نیچے کا ہونٹ موٹا ہے تو اس پر ہمیشہ گہرے رنگ کی لپ اسٹک لگائیں اور دوسرے ہونٹ پر تھوڑا سا ہلکا شیڈ لگائیں اس سے آپ کا ہونٹ چھوٹا اور خوب صورت لگے گا۔ ہمیشہ لپ اسٹک کو برش سے اس طرح لگائیں جیسے آپ پینٹنگ کر رہے ہیں۔

آنکھوں کا میک اپ بھی خاص توجہ چاہتا ہے۔ آئی لائنر ہمیشہ اوپر کے پپوٹوں پر بالکل بیچ میں سے لگانا شروع کریں۔ یعنی پہلے آدھی آنکھ پر باہر کی طرف لگائیں پھر اندر کی طرف لگائیں۔

چینی وضع کی آنکھوں پر ہمیشہ تھوڑا باہر کی طرف بڑھا کر لائنر لگائیں، تاکہ آنکھوں کی شکل بادامی لگے۔ اگر پپوٹے زرد ہیں یا آنکھوں کے کونوں پر جھریاں ہیں تو ان جگہوں پر ہلکا سا فاؤنڈیشن کا شیڈ ضرور لگائیں۔ آئی لائنر اور مسکارا ہمیشہ پلکوں کے اوپری حصوں پر لگانا چاہئے۔

اگر آپ کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں تو آنکھوں پر بہت باریک آئی لائنر لگائیں اور بالکل پلکوں کے ساتھ لگائیں، تاکہ دکھائی نہ دے سکے۔ آپ آئی لائنر بہت باریک اور صفائی سے اسی صورت میں لگا سکتی ہیں جب آپ کے لائنر کا برش بہت زیادہ باریک ہو۔ آئی شیڈ صرف آنکھوں کے اوپری حصے پر ہی لگائیں۔

اگر آپ کا چہرہ کتابی ہے تو ماتھے پر ہلکی سی چمک اور ٹھوڑی پر گہرے رنگ کی ہلکی سی فاؤنڈیشن زیب دے گی۔

اگر آپ کی ناک چھوٹی اور موٹی ہے تو پوری ناک پر گہرے رنگ کی فاؤنڈیشن لگائیں اور ناک کے دونوں نتھنوں پر ہلکے رنگ کی فاؤنڈیشن لگائیں اگر ناک زیادہ لمبی ہے اور آپ اس کو کچھ چھوٹا دکھانا چاہتی ہیں تو آپ کو دو رنگوں کا فیس پاؤڈر کا استعمال کرنا ہوگا۔ پہلے گہرے رنگ کا پاؤڈر پوری ناک پر اچھی طرح لگالیں اور اس کے بعد صرف ناک کے اوپر کے حصے پر ہلکے رنگ کا پاؤڈر لگائیں۔

اگر آپ کی آنکھوں کے نیچے کالے حلقے ہیں تو اس جگہ ہمیشہ ہلکے رنگ کی فاؤنڈیشن لگائیں۔

آپ کی بھنویں بھی آپ کے چہرے کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اگر آپ کا میک اپ بہت اچھا ہے اور آپ خوب صورت بھی ہیں، لیکن آپ کی بھنویں ٹھیک ڈھنگ سے نہیں بنی ہیں تو خوب صورتی کا سارا تاثر ختم ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر بھنویں زیادہ باریک یا موٹی یا چھوٹی ہیں تو آپ کی ساری خوب صورتی ماند پڑ جائے گی۔ اس لئے اپنے چہرے کی بناوٹ کے مطابق ہی آپ کو اپنی بھنویں بنوانی چاہئیں۔ اگر آپ کا چہرہ بالکل گول ہے تو آپ کو اپنی بھنویں کمان کی شکل میں بنوانی چاہئیں۔ اگر آپ کا چہرہ تکونا ہے تو آپ کو اپنی بھنویں تھوڑی سی اور باریک اور لمبی رکھنی چاہئیں۔ اگر آپ کا چہرہ چوکور ہے تو آپ کو اپنی بھنویں تھوڑی سی موٹی اور لمبی رکھنی چاہئیں۔

گالوں کے لئے سرخی (روژ) بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کو روژ لگانے کا صحیح طریقہ معلوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہترین میک اپ کر سکتی ہیں۔ چوکور چہرے والی عورتوں کو ہمیشہ تھوڑا گہرا روژ اپنے گالوں کی ہڈیوں پر لگانا چاہئے اور بہت ہلکا روژ پورے گالوں پر۔ اس طریقے سے روژ لگانے سے آپ کا چہرہ بہت حد تک گول لگے گا۔

اگر آپ کا چہرہ بہت گول ہے اور آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا چہرہ لمبا معلوم ہو تو ہمیشہ اپنے گالوں کی ہڈیوں سے لگانا شروع کریں اور کانوں کی طرف لے جائیں۔

لمبے چہرے پر روژ ہمیشہ اوپر کے آدھے گالوں پر لگائیں اور بہت ہلکا کانوں کی طرف پھیلا دیں۔

اگر آپ کا چہرہ بیضاوی ہے تو کیا ہی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہت خوش قسمت عورت ہیں۔ اس لئے پورے گالوں پر آرام سے روژ لگائیں اور تھوڑا سا کنپٹیوں پر بھی ضرور لگائیں۔

اگر آپ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا میک اپ کریں گی تو آپ کی خوب صورتی کو چار چاند لگ جائیں گے۔

○○

قلمی دوستی

نام : حسین بیگ مرزا فدا   عمر : ۲۴ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۵۱۳۴ الریاض سعودی عربیہ
شوق : ادبی اور اسلامی کتابیں پڑھنا، اسٹامپ جمع کرنا، خطوں کا جواب دینا

نام : عزان رضا خاں   عمر : ۱۹ سال
پتہ : معرفت صابر رضا خاں بی پی ایجنٹ ۱۴ اسکٹ کوٹھیاں، رامپور یوپی
شوق : قلمی دوستی کرنا، پہاڑی علاقوں کی سیر کرنا، بیڈمنٹن کھیلنا، پریس رپورٹنگ کرنا اور فوٹو گرافی۔

نام : محمد محمود علی جاوید (بی کام عثمانیہ)   عمر ۲۳ سال
پتہ : مکان نمبر 2B/551-4-20 خلوت مبارک حیدرآباد ۲
شوق : قلمی دوستی کرنا، شمع، بانو کا مطالعہ کرنا، شعر و شاعری کرنا، گانے گانا۔

نام : نسیم عرفانی   عمر : ۲۵ سال
پتہ : پی۔او۔ بکس نمبر 5448 الدمام۔ سعودی عربیہ
شوق : ٹکٹ جمع کرنا۔ فرسٹ ڈے کورز جمع کرنا

نام : شبنم سلطانہ بہار   عمر : ۱۶ سال
پتہ : سدھارتھ آئی ٹی آئی۔ بنجارہ گڑھ۔ تعلقہ نرمل ۵۰۴۱۰۶
شوق : ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ اگر کوئی بھی بھائی یا بہن خط لکھیں تو خط کا جواب ضرور دوں گی۔

نام : مامون رشید   عمر : ۲۵ سال
پتہ : جنتا اسٹورز نیو مارکیٹ کیونجھر گڑھ، ضلع کیونجھر، اڑیسہ
شوق : بھائی بہنوں سے قلمی دوستی کرنا۔ میگزین پڑھنا۔ بیڈمنٹن کھیلنا اور نماز پڑھنا

نام : عالیہ شیخ   عمر : ۲۰ سال
پتہ : معرفت اتحاد الرحمٰن 13/14- A پنڈت روڈ چوہان، بانگر نیو سلیم پور ۵۲
شوق : ہر کتاب کا مطالعہ کرنا، نئی نئی ڈریس سینا اور پہننا اور قلمی دوستی۔

نام : شبیر احمد گدی   عمر : ۲۸ سال
پتہ : مین روڈ۔ وارڈ نمبر ۱ چکردھرپور، بہار
شوق : قلمی دوستی۔ ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ افسانہ نگاری وغیرہ

نام : شیخ ابراہیم ولد عبدالجبار سپراپورکر   عمر : ۲۰ سال
پتہ : مکان نمبر 17/1/1041-11 جیلان آباد محبوب شاہی ملز گلبرگہ شریف ۵۸۵۱۰۳
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ اخبارات و رسائل کا مطالعہ، سیر و تفریح، شعر و ادب، افسانے لکھنا وغیرہ۔

نام : ڈاکٹر محمد اسلم عزیز   عمر : ۲۲ سال
پتہ : آپٹکس کورنر دکان نمبر ۵ نگر مہا پالیکا کمپاؤنڈ میرٹھ شہر ۲۵۰۰۰۲
شوق : قلمی دوستی، اچھی غزلیں پڑھنا، پھلواری لگانا۔ جھوٹ سے بچنا۔ سیر و تفریح کرنا وغیرہ۔

نام : محمد اعظم (بابا)   عمر : ۲۰ سال
پتہ : مکان نمبر 3/39-2-12 مرادنگر حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸
شوق : گھوڑ سواری کرنا، کرکٹ، شطرنج، کراٹے، مشاعروں میں حصہ لینا، فوٹو گرافی، خطوط کا پابندی سے جواب دینا۔

نام : محمد شمیم ریحان   عمر : ۲۶ سال
پتہ : 30B بینا پوکھر روڈ کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۴
شوق : کتب بینی، فوٹو گرافی، سیاحت اور قلمی دوستی

نام : شمس النساء معرفت حشمت اللہ   عمر ۲۶ سال
پتہ : ۲۸ پھول بگان روڈ۔ فلیٹ نمبر ۹۔ آخری منزل
شوق : قلمی دوستی۔ ادب۔ غزل سننا

نام : اسلم شریف   عمر : ۲۵ سال
پتہ : نمبر ۱۵/۷۔ اسٹیل نیکس مینس ویر و نیکلیشیورم روڈ بنگلور ۵۶۰۰۲۵
شوق : اردو، انگریزی اور ہندی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی، آرٹ

نام : محمد حنیف محی الدین سروے   عمر : ۱۹ سال
پتہ : 91/3274 تلک نگر، چمبور، بمبئی ۸۹
شوق : جاسوسی ناول پڑھنا، سائیکلنگ، غزل سننا وغیرہ وغیرہ

نام : فاروق احمد صدیقی   عمر : ۲۱ سال
پتہ : پرنس ووڈ ورکس، کلکٹریٹ چوک، عادل آباد اے پی ۵۰۴۰۰۱
شوق : کرکٹ کھیلنا، شطرنج کھیلنا، غیر ملکی کرنسی جمع کرنا۔ اور بہن بھائیوں کے خطوط کا جواب دینا۔ قلمی دوستی کرنا۔

نام : سدی سردار الدین   عمر : ۲۱ سال

نام :   عمر :
پتہ :
شوق :

پتہ : مکان نمبر ۱/۹۶-۱۲-۱۲ نیو کالونی عرب محلہ پوسٹ راگیز کرنانک
شوق : قلمی دوستی کرنا، ہمراہ خاتون مشرق، بانو، قلم اور دامن کا مطالعہ کرنا صرف لڑکوں سے دوستی کرنا۔

نام : سہیل شمسی عمر: ۲۲ سال
پتہ : سوار ضلع رامپور، یوپی۔
شوق : اچھی کتابیں پڑھنا، فلمیں دیکھنا، تعلیم حاصل کرنا

نام : سید انصار عمر: ۲۳ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر 5029 راس الخیمہ
شوق : شطرنج کھیلنا، فراک ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی، کتب کا مطالعہ

نام : شیخ اشفاق عمر: ۲۲ سال
پتہ : عزیز احمد خان ممبر رجسٹ، مندلا پورہ نزد مسجد ضلع بیڑ (ایم ایس) ۴۳۱۱۲۲
شوق : آل انڈیا ریڈیو کے پورے پروگرام سننا، خطوط کے جواب دینا، پرانے گیت سننا، کیرم کھیلنا، بانو، شمع کا پابندی سے مطالعہ کرنا، قلمی دوستی

نام : عشرت امیر عمر: ۱۷ سال
پتہ : محلہ کوٹھا ٹولی، پوسٹ سہسرام ضلع روہتاس ۸۲۱۱۱۵
شوق : دنیا بھر کے لڑکوں اور لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا، ادبی رسائل کا مطالعہ کرنا، رفیع اور مکیش کے درد بھرے گیت سننا، قدرتی مناظر کی سیر و تفریح کرنا۔

نام : محمد حبیب الرحمن عمر: ۱۹ سال
پتہ : موضع کنہیاباڑی پوسٹ لسٹن پور وایا بہادر گنج، پورنیہ (بہار) ۸۵۵۱
شوق : کرکٹ کھیلنا، کمینٹری سننا، سائنسی و معلوماتی میگزین پڑھنا، بینک P.O. بننا، پانچوں وقت کی نماز پڑھنا، قلمی دوستی کرنا۔

نام : پرویز احمد عمر: ۳۰ سال
پتہ : معرفت قمر الدین، پوسٹ بکس نمبر ۳۰۵ الدمام (کے۔ایس۔اے)
شوق : کتب و رسائل کا مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا، غزلیں سننا، کرکٹ، ہاکی کھیلنا۔

نام : احسان الحق بی۔اے عمر: ۲۱ سال
پتہ : شمع بک سینٹر مرزا بادی پورہ مئو ناتھ بھنجن، یوپی ۲۷۵۱۰۱
شوق : سبھی دوستوں کے پاس پابندی سے خطوط بھیجنا، بیڈمنٹن کھیلنا، شعر جمع کرنا وغیرہ۔

نام : ایم الیاس امروہوی عمر: ۲۴ سال
پتہ : دفتر افسانہ چمن نواب گنج، امروہہ
شوق : اردو کے افسانے پڑھنا اور لکھنا۔ ایک اردو کا رسالہ بھی شائع کیا ہے جس کا نام ہے "افسانہ چمن" اس کے علاوہ شمع، بانو کا مطالعہ کرنا اور جمع کرنا۔

نام : ایس محمد سلیم عمر: ۱۵ سال
پتہ : ۸۲۴ کاکا گلی تھار پیٹ وانمباڑی (تامل ناڈو) ۶۳۵۷۵۲
شوق : قلمی دوستی کرنا، بانو پڑھنا، کرکٹ کھیلنا، بڑوں کی عزت کرنا

— کہانی اور شگوفے لکھنا وغیرہ

نام : عبدالرشید فانی عمر: ۲۹ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۱۱۶ طائف کے ایس اے (سعودی عربیہ)
شوق : باوفا، باحیا، خوب سیرت، خوب صورت، بہن بھائیوں سے خط و کتابت کرنا۔ تنقیدی خطوط کو پسند کرنا۔ دلائل سے بحث کرنا، جواب سے نوازنا۔

نام : سید شمیم احمد عمر: ۲۷ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹ کراچی نمبر ۱ (پاکستان)
شوق : قلمی دوستی، مطالعہ، سیر و تفریح، رسائل کا تبادلہ وغیرہ

نام : ایم۔ الف سرور عمر: ۲۲ سال
پتہ : جنتا اسٹور، نیا مارکیٹ، کیونجھر گڑھ، اڑیسہ ۷۵۸۰۰۱
شوق : کرکٹ کھیلنا، بیڈمنٹن کھیلنا، قلمی دوستی کرنا، بانو اور ادبی کتب کا مطالعہ کرنا۔

نام : آصف علی شارق، عمر: ۲۲ سال
پتہ : محلہ سندکی بنگلہ سہروردی درگاہ منگل شاہ مکان نمبر ۲۵۷ شاہجہانپور، یوپی ۲۴۲۰۰۱
شوق : قلمی دوستی۔ شمع معمے حل کرنا۔ اردو کے تمام رسائل کا مطالعہ کرنا۔

نام : محسن اطہر عمر: ۱۵ سال
پتہ : شوکا بازار، ایم۔جی روڈ، چک منگلور ۵۷۷۱۰۱
شوق : فٹ بال کھیلنا، بانو اور شمع پڑھنا، اسٹامپ جمع کرنا۔ نماز پڑھنا۔

نام : زکار احمد عمر: ۳۰ سال
پتہ : پی۔او۔بکس 2087، الخبر (سعودی عرب)
شوق : مطالعہ، سیاحت، مصوری۔

نام : حاجی قدرت اللہ بھٹی عمر: ۲۰ سال
پتہ : الاحوال المدینۃ تیماء سعودی عرب
شوق : ملکی غیر ملکی بہنوں، بھائیوں سے قلمی دوستی

نام : خان عبدالسلام جالسی عمر: ۲۵ سال
پتہ : محلہ قریشی۔ امروہہ، یوپی
شوق : اچھی فلمیں دیکھنا۔ اداکاری کے جوہر دکھانا

نام : محمد رفیق عمر: ۲۵ سال
پتہ : مکتب برید شبیریہ رقم البرید ۱۳۱۹۱ البجادیہ، ریاض (سعودی عربیہ)
شوق : شاعری کرنا، قلمی دوستی کرنا، انڈین اور پاکستانی فلمیں دیکھنا۔

نام : امتیاز احمد اعظمی عمر: ۲۵ سال
پتہ : ڈی ۱۳/۲/۴۴ مدن پورہ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱
شوق : قلمی دوستی، رسائل اور جرائد کا مطالعہ کرنا۔ اچھے اشعار جمع کرنا۔

پیغام

۴۲ سالہ سنت الجماعت خوب صورت، سلیقہ مند، صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی کے عقد ثانی کے لئے ایک تعلیم یافتہ برسرِ روزگار لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے عقد ثانی کرنے والے لڑکے بھی جن پر کوئی ذمہ داری نہ ہو رجوع ہو سکتے ہیں۔

BOX NO. 122
BANO URDU MONTHLY
ASIF ALI ROAD
NEW DELHI- 110002

بمبئی کے ایک سنی مسلم تجارت پیشہ شخص عمر ۴۱ سال، ماہانہ آمدنی ...۵ روپے کے عقد ثانی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی ۲۵ سے ۳۰ سال، تعلیم یافتہ، پابند صوم وصلوٰۃ اور صحت مند ہو۔ تصویر اور مکمل تفصیل کے ساتھ اس پتے پر خط وکتابت کریں۔

P.O. BOX 16957
BYCULLA, BOMBAY -400 027

حیدرآبادی معزز سادات گھرانے کی انٹرمیڈیٹ (انگلش میڈیم) قبول صورت خوش اخلاق، مذہبی امور خانہ داری سے واقف (۱۸) سال لڑکی کے لئے معزز سادات گھرانے کے تعلیم یافتہ ملازم سرکار، بزنس مین حیدرآبادی لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ جہیز کے طالب زحمت نہ کریں۔

BOX NO. 124
BANO URDU MONTHLY
ASIF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

مسلم سنی قبول صورت ایک سالہ ٹی وائی بی کام (جو گورنمنٹ میں عارضی اسٹینو گرافر ہے) کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ برسرِ روزگار اور بمبئی کا سنی ہو

BOX NO. 125
BANO URDU MONTHLY
ASIF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

دہلی کے معزز خاندان سے تعلق رکھنے والے ۳۴ سالہ سنی مسلم لڑکے کے لئے رشتہ مطلوب ہے لڑکا چار سال سے امریکہ میں ہے وہاں اس کی اپنی دکانیں ہیں۔ لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ جہیز کی ضرورت نہیں۔

BOX NO. 126,
BANO URDU MONTHLY
ASIF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

اعلیٰ تعلیم یافتہ، اسلامی قدروں کے حامل خوش حال اور معزز خاندان کے نیک سیرت، خوب صورت، دل کش قد وقامت رکھنے والی، امورِ خانہ داری سے واقف لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔ لڑکے کا تعلق یوپی کے مہذب دولت مند (تجارت پیشہ) اعلیٰ خاندان سے ہے۔ تعلیم انگلش ایم اے۔ ۲۶ سال، دراز قد، جاذب نظر حسین وجمیل شخصیت ہے۔ علم وادب سے قدرتی شوق نئی دہلی میں نفیس ذاتی مکان۔

Box No. 127
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

موزوں ترین رشتے کی تلاش میں مدد کرنے کے لئے "بانو" کی پیش کش

آج کے دور میں مناسب رشتے کی تلاش ایک دشوار اور صبر آزما مرحلہ بنا ہوا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بیٹے، بیٹی، بھائی یا بہن کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے تو "بانو" کے ذریعے ہزاروں گھروں تک پیغام پہنچائیے اور بہترین رشتے کا انتخاب کیجئے۔

آپ کے پیغام کی اشاعت کی اجرت دو روپے فی لفظ کے حساب سے لی جائے گی۔ کم از کم اجرت پچاس روپے ہوگی، خواہ پیغام پچیس الفاظ سے کم پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو۔

رازداری اور سہولت کے خیال سے باکس نمبر کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی۔ باکس نمبر کی معرفت وصول ہونے والے جوابات ہم پیغام شائع کرانے والوں کو رجسٹرڈ پیکٹ کے ذریعے بھیج دیں گے۔ اس خدمت کے لئے برائے نام معاوضہ دس روپے لیا جائے گا۔ اجرت کا حساب لگاتے وقت باکس نمبر کے ساتھ "بانو" کے پتے کے الفاظ بھی پیغام میں شمار کئے جائیں گے۔

پیغام کے ساتھ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعے پوری اجرت ضرور ارسال کیجئے۔ اجرت وصول نہ ہونے کی صورت میں پیغام کی اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی۔

اجرت کے ساتھ پیغام اس پتہ پر بھیجئے: "پیغام" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ماں کی زندگی بچانے والی پانچ سالہ بچی

انگلینڈ کی ۲۵ سالہ ڈیبرا ہین کو مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ ایک بار اسے دورہ پڑا تو گھر میں اس کی صرف تین ننھی ننھی بیٹیاں تھیں، جن کی عمریں ۵، ۳ اور ۲ سال تھیں۔ پانچ سالہ کلیرا نے ڈھونڈ کر سانس لینے میں مدد کرنے والی نلی ماں کے منہ میں ڈال دی اس نے پچھلے دورے کے وقت ڈاکٹر کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر ایمبولینس کے لئے بھی اسی نے فون کیا۔ اس کی ماں کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ لوٹنے پر ماں نے کلیرا کو پیار کرتے ہوئے کہا" اگر کلیرا نہ ہوتی تو آج میں زندہ نہ ہوتی مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے"۔

چمڑے کی ساڑی

مدراس میں پہلی بار چمڑے کی خوبصورت ساڑی تیار کی گئی ہے۔ یہ ساڑی وہاں ایک فیشن شو میں رکھی گئی۔ اور دیکھنے والوں کو بہت پسند آئی۔

وہائٹ ہاؤس میں ایک بے ضرر بھوت

کہا جاتا ہے کہ وہائٹ ہاؤس میں ایک بھوت رہتا ہے۔ امریکہ کے صدر ریگن اس بھوت سے ملنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا آمنا سامنا کسی بھوت سے نہیں ہوا ہے، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے بھوت کا ملنا ان کے لئے کسی فائدے کا باعث بن جائے

حال ہی میں بتایا ہے: "میں نے ابراہیم لنکن کی روح کو خود تو نہیں دیکھا ہے لیکن کئی لوگوں نے بتایا ہے کہ انہوں نے دیکھا ہے۔ میں اس معاملے میں خود پس و پیش میں ہوں میرا چھوٹا سا کتا ریکس اکثر ابراہیم لنکن کے کمرے کے سامنے جاکر رک جاتا ہے اور اس طرح بھونکنے اور غرانے لگتا ہے جیسے اس نے وہاں کسی اجنبی کو دیکھا ہے"۔

صدر نے بتایا کہ ایک بار کتے کے بھونکنے پر انہوں نے خود کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تھا، لیکن کتا اندر نہیں گھسا، بلکہ ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ ڈر کر وہاں سے لوٹ پڑا۔

اس کے علاوہ صدر کی صاحب زادی مورین، برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل اور نیدرلینڈ کی ملکہ جولیانا کے نام بھی لئے جاتے ہیں کہ ان لوگوں نے ابراہیم لنکن کی روح کو وہاں دیکھا ہے۔

صدر ریگن نے کہا" اگر وہ یہاں موجود ہیں تو میں بالکل نہیں ڈرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے چھوٹی سی ملاقات بے حد دلچسپ اور غالباً کافی مفید ثابت ہوگی"۔

مورین ریگن اور ان کے شوہر ڈینس ریول

بانو نبی، دہلی

کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے لنکن کی روح کو دیکھا ہے۔ یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب وہ لنکن والے حصے میں ٹھہرے تھے۔ ڈینس کا قد چھ فٹ سات انچ ہے۔ وہائٹ ہاؤس میں لنکن کے کمرے میں ہی ان کے لئے موزوں ترین پلنگ ہے۔ ابراہیم لنکن بھی بہت لمبے قد کے آدمی تھے۔

مورین ریگن نے بتایا" میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ ہم نے یقیناً ابراہیم لنکن کی روح کو دیکھا ہے۔ وہ ایک ایسی شکل میں ظاہر ہوئے تھے کہ ان کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ اور وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑے تھے"۔

مورین کے شوہر نے لنکن کی روح کو آتش دان کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔

بہر حال، یہ بات طے ہے کہ اگر وہاں کوئی بھوت ہے بھی تو مکینوں کو وہ کوئی تکلیف نہیں پہنچاتا، بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھے ہوئے ہے۔

جب ۳۰۵ کلو کا آدمی ناچا

انگلینڈ میں سب سے زیادہ وزن والا آدمی جس کا نام آرتھر، اور وزن ۳۰۵ کلو ہے، ایک شادی کی تقریب میں شامل ہوا۔ وہاں لوگ ناچ رہے تھے۔ ان کو ناچتے دیکھ کر اسے بھی ناچنے کی سوجھی۔ لیکن کچھ ہی لمحوں میں وہ دھڑام سے گر پڑا۔ اسے اٹھانے کے لئے فائر بریگیڈ کو بلانا پڑا۔ فائر بریگیڈ والوں نے پانی کی موٹی ربڑ کی نلی اس کے نیچے ڈال کر سولہ آدمیوں کی مدد سے اسے اٹھایا اور پیروں پر کھڑا کیا اس حادثے کے بعد سے اسے بہت تھکن محسوس ہونے لگی۔

المونیم کے برتنوں سے ہوشیار

آج کل المونیم کے برتنوں میں چائے اور کھانا وغیرہ بنانے کا رواج بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔ المونیم کے ذرات دماغ کے خلیوں کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان اپنی یادداشت کھو دیتا ہے اور اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات حال ہی میں ہونے والے ایک جائزے سے

سامنے آئی ہے۔ یہ جائزہ آزادانہ طور پر سری لنکا اور برطانیہ میں ہوا اور اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب المونیم کے برتنوں میں چائے یا کھانا پکتا ہے تو ایسی چائے اور کھانے کے استعمال سے المونیم کے بہت زیادہ ذرات آدمی کے دماغ میں جمع ہونے لگتے ہیں جس سے دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے۔ اگر المونیم کے برتن میں پانی اُبالا جائے تو اس میں فلورائیڈ بنیا ہو جاتا ہے یہ رپورٹ سری لنکا کے ایک ڈاکٹر کے۔ ٹیناکرن نے برطانوی میگزین "نیچر" میں شائع کرائی ہے۔

دنیا میں چائے پینے والے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کی تیرہ ریاستیں ایسی ہیں جہاں المونیم کے برتنوں میں پانی اُبالنے سے فلورائیڈ کے پانی میں شامل ہونے کی وبا عام ہے۔ حالانکہ ڈاکٹروں کو ابھی اس بات کا کوئی اندازہ نہیں ہے کہ دماغ کو المونیم کے ذرات کس طریقے سے بے کار کر دیتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ المونیم کے ذرات جسم کے اندر پہنچتے ہی دماغ کے اندر کیمیائی طور پر اپنا اثر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

المونیم کے ذرات گردے کی بیماری میں مبتلا مریض کے لئے بھی بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے سینیئر ڈاکٹروں نے ثابت کی ہے۔

شور سے بہرے ہو رہے ہیں بچے

ایک رپورٹ کے مطابق کانپور میں ۴۸ فی صد اسکولی بچوں کو بے تحاشا شور کے باعث کم سُنائی دینے لگا ہے۔ اس کے علاوہ کم عمری میں ہی بچوں میں سر درد، چڑچڑاہٹ، یادداشت کم زور ہونے کی بھی شکایتیں بھی عام ہو رہی ہیں۔

موسیقی کے ریکارڈوں، کیسٹوں کی دھوم، لاؤڈ اسپیکر کے شور، گاڑیوں کے ہارن اور شہر کے درمیان سے گزر کر جانے والی ٹرینوں کے شور سے یہاں کے ماحول میں آوازوں کی بیجا گونج کی وجہ سے، ۲۰ فی صد بچے اپنی جماعتوں میں اطمینان سے نہیں بیٹھ پاتے۔

اسکولوں کے ایسے ۵۰۰ بچوں کا مشاہدہ کیا گیا جو شہر کے صنعتی علاقوں، ریلوے کالونیوں اور دوسری طرح طرح کی آوازوں کی گونج سے متاثر ہوتے ہیں۔ پانچ سے سولہ سال تک کی عمر کے بچے اس مشاہدے میں شامل تھے۔ مشاہدہ کرنے والے ڈاکٹر سوریہ کانت مشر نے بتایا کہ لگاتار شور و غل کا ماحول قائم رہنے سے بچوں کے اسکول کے کام پر غلط اثر پڑا ہے، کیوں کہ ایسی حالت میں ان کی سننے کی طاقت آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتی ہے۔ اور ان کی دماغی افعال پر بھی غلط اثر پڑتا ہے۔

تین سے چھ سال تک شور و غل کے ماحول میں پڑھنے والے بچے کو بار بار سر درد کی شکایت رہنے لگتی ہے اور طبیعت میں چڑچڑاپن رہنے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

اب حکومت اور شور و غل کو کم کرنے کے لئے سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔

اسکولوں کے پاس موسیقی، کیسیٹ، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ پر پابندی کی مانگ کرتے ہوئے ڈاکٹر مشر نے کہا کہ عمارتوں کا ڈھانچہ اس طرح کا ہونا چاہئے کہ آوازیں اندر شور و غل پیدا نہ کر سکیں۔ ہر چھ مہینے بعد ماہرین کے ذریعہ بچوں کی طبی جانچ بھی کرانا چاہئے۔

بیٹے کو گرو مان کر خوش ہے ماریا

ماریا دنیا کی اکیلی ایسی ماں ہوگی جس کا دو سال کا بیٹا اس کا گرو ہوگا

اسپین سے نیپال کے کوپین بدھ مٹھ کا لاما بنانے کے لئے لے جائے جانے والے دو سال کے بچے اوجیل کی ۳۸ سالہ ماں ماریا کا کہنا ہے" میں اپنے بیٹے کو گرو کے روپ میں پا کر بہت خوش ہوں۔ اوجیل کا مطلب ہوتا ہے 'دھیمی روشنی' اور لاما بن کر میرا بیٹا ہزاروں دلوں میں عرفان کا نور بکھیرے گا

ماریا اور پاکوری کے یہاں ۲۵ جنوری ۱۹۸۵ کو پیدا ہونے والا اوجیل پچھلے دنوں دہلی آیا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش جنوبی اسپین میں گرنیڈا کے پاس ہوئی تھی اور اس کے بارے میں بدھ بھکشوؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ ان کے پچھلے لاما ییشی ہیں، جن کی موت ۸ مارچ ۱۹۸۴ کو ہوئی تھی۔

پانچ بچوں کی ماں ماریا نے دہلی میں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وہ لاما ییشی کی شاگرد رہی تھی اور ان سے آخری بار ۱۹۸۳ میں ملی تھی۔ انہوں نے ماریا سے کہا تھا: "اگر میری موت ہو گئی تو بھی میں تم لوگوں کو نہیں بھولوں گا۔ میں تمہارے یہاں پھر آؤں گا"

اوجیل کی پیدائش سے پہلے ماریا نے خواب میں لاما ییشی کو دیکھا تھا۔ اب ماریا کا کہنا ہے کہ آہستہ آہستہ اس کے دل سے یہ خیال بھی نکل گیا کہ اوجیل اس کا بیٹا ہے۔ اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے اوجیل اس کا گرو ہی ہے

○○

پانڈی دہلی

بزمِ بانو

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔
ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔
سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزمِ بانو
ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ نئی دہلی ۲

ضیاء الدین ریاض کریم نگر (اے پی)

س: کیا شہرت حاصل کرنے کی خواہش ہر انسان کے دل میں موجیں مارتی ہے؟

ج: شہرت کے ساتھ عزت اور طاقت بھی ہاتھ آسکتی ہے جس کا صحیح استعمال مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

س: انسان کی زندگی میں غموں کی اہمیت ہوتی ہے؟

ج: اہم تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جو خوشی سکون اور اطمینان بخش ہوتی ہیں۔ ہاں ایک غم یعنی غمِ دنیا ہر حساس انسان کے دل و دماغ کو روشن کرتا ہے۔ عاقبت سنوارتا ہے۔ یہ غم پیغمبر ولی، مہاتماؤں، رشیوں، منیوں فلسفیوں اولیاؤں کو خدا نے بخشا تھا۔

نجمہ ایوب، علی گڑھ

س: آنکھیں ہوتے ہوئے بھی انسان اندھا کیوں بن جاتا ہے؟

ج: بے وقوف ہوتا ہے۔

س: محبت اور موت میں کتنا فاصلہ ہے!

ج: محبت کرنے والے کی عقل و دانش زندگی کی طرف بھی لے جا سکتی ہے اور حماقت موت کی طرف۔

اسماء انجم، شولاپور

س: لڑکیاں اپنی عمر کیوں چھپاتی ہیں؟

ج: دولہا کم سن لڑکیاں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سسرال والے بھی کچی عمر کی دلہن لانا چاہتے ہیں جو ان سے دنیا سیکھے حکم مانے جیسا کہیں ویسا کرے۔ شوہر کو اپنے قبضہ میں نہ کرے۔ پھر بڑھاپا کیسے بہتر ہوگا۔ باپ کی پنشن یا موت کی صورت میں کون پالے گا۔ مگر بات الٹی پڑتی ہے۔ کم سن بیوی شوہر پر زیادہ نخرے جھاڑتی ہے۔ کم سمجھ ہوتی ہے۔ میکے والوں نے کچی عمر سے ہی ساس نندوں کا خوف دل میں بٹھا دیا ہے۔ پڑھی لکھی سمجھ دار تو کچھ سمجھ بھی سکتی ہے۔ کم سن نہیں سمجھتی۔ عورت جب تک مرد کی کمائی پر انحصار کرتی رہے گی۔ مرد کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہوگا مردوں کو چاہئے اگر قوم کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو پڑھی لکھی کمانے والی بیوی لائیں تاکہ میاں بیوی مجبور ساس کا بھی سہارا ہو اور بچوں کو بھی اچھی تعلیم دلا سکیں۔

محمد ابراہیم راہی، بانسواڑہ، اے۔ پی

س: محبوبہ قدم قدم پر شرارت کرنے لگے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج: اپنے دل سے پوچھئے اس کی شرارتیں دل کو لبھاتی ہیں تو پھر اور کیا چاہئے اگر ناگوار حد تک شریر ہے تو سمجھائیے نہ سمجھے تو کوئی اور دلچسپ مشغلہ تلاش کیجئے۔

سلیم احمد، چوڑھلی، کھگڑیا

س: ابّا اور استاد میں پہلے کس کی عزت کرنی چاہئے؟

ج: ابّا پہلے ملتے ہیں۔ ان کی شفقت استاد مہیا کرتی ہے لیکن عموماً بچے ماں باپ کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اولاد پر جان نثار کریں کہ وہ ان کے نورِ نظر ہوتے ہیں۔ ویسے دونوں ہی عزت اور محبت کے حق دار ہیں۔

س: امّاں اور ابّا میں پہلے کس کی عزت کرنی چاہئے؟

ج: یہ عزت کا سوال بڑا فضول ہے اگر والدین سے محبت ہو تو یہی سب سے بڑی عزت ہے۔ عام طور پر والدین اور اولاد میں پیار نہیں فرض سمجھا جاتا ہے۔ والدین اور اولاد دونوں کے درمیان دوستی ہونا چاہئے۔ ایک دوسرے سے چھپا کر کوئی بے جا حرکت نہیں کرنا چاہئے۔ والدین کی محبت اور وہ خرچ جو اولاد پر کرتے ہیں اسے قرض سمجھنا چاہئے جو اولاد کو انہیں ادا کرنا چاہئے۔ اگر والدین محتاج نہ ہوں جیسا عام طور پر بچوں پر خرچ کرنے کے بعد ہوتا ہے تو بھی ان کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کبھی انہوں نے اپنے بچوں کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔

پہلا انعام: درست حل پر: (۲۲ کیراٹ، زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: **آٹھ ہزار روپے**

Rs 20,000.00

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل بر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ ۲۵-اپریل ۱۹۸۷ء، آٹھ بجے رات تک۔ پیر ۲۷-اپریل ۱۹۸۷ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لیے جائیں گے۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۳۷

■	■	۵	۴	۳	۲ ا	۱ ب
■	■	ج	ڑ			س
ے	۶	■	ی	ل		ا
ڑ	ک	۷	■	ے	ا	
و			۸ ا	■	ل	س
س	ا			۹ ا	■	ی
ی		ا	ف	س	۱۰ ب	■

اشارے:

اوپر سے نیچے:

۱۔ چھوٹے بڑے سبھی سے ــــ کا سلوک کرنا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دینا۔ یہی

۲۔ ذرا اپنے ــــ پر بھی تو نظر ڈالو۔ پھر دوسروں کو

۳۔ لیکن ــــ پیسے چکائے بغیر، اور ادھار مانگتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ میں نے کوئی

۴۔ کسی کو یہ دولت پڑی مل جاتی ہے اور کوئی ــــ مصیبتیں جھیل کر بھی گوہر مراد نہیں پاتا

۵۔ دیدہ خوں بار ہے مدت سے، و لے ــــ ندیم

دائیں سے بائیں:

۶۔ دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل ــــ

۷۔ اپنے کتے کو ــــ کر رکھو۔ محلے بھر کا ناطقہ بند کر رکھا ہے

۸۔ عورت بس ایک ــــ کو سنبھالے عمر بھر بیٹھی رہتی ہے جبکہ مرد

۹۔ میں نے تو کبھی ــــ نہیں کیا تھا پھر مجھ پر یہ تہمت

۱۰۔ یہاں دسمبر جنوری میں شمال سے ــــ ہوائیں چلتی ہیں اور مئی جون میں ●

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۱۳۷) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مینی معمہ نمبر ۱۳۷ کا صحیح حل بدھ: ۲۹-اپریل ۱۹۸۷ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع (نئی دہلی) میں بھی شائع کی جاتی ہیں

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں — فیس داخلہ فی حل صرف

★ ایک روپیہ۔

★ صرف دستی اشارے
انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۳۷ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ٹانک
ہرموسم کے لئے نباتاتی یونانی ٹانک
بڑتے ہوئے بچوں سے لے کر دودھ پلاتی ماؤں اور
بڑے بوڑھوں تک خاندان کا ہر فرد پورے سال،
ہر موسم میں شمع ٹانک استعمال کر سکتا ہے۔ اس کا
ہر مزے دار چمچہ صحت اور قوّت کا خزانہ ہے۔ شمع ٹانک
صحت کو بحال کرتا ہے، تھکے ہوئے اعصاب کو تسکین
دیتا ہے، فرحت بخش نیند کا ضامن ہے، بھوک بڑھاتا
اور نظامِ ہضم کو بہتر بناتا ہے۔ توانائی عطا کرتا ہے۔
بیماریوں کے خلاف قوّتِ مزاحمت پیدا کرتا ہے۔
بیماریوں سے بچنے کے لئے یا بیماری کے بعد زور اور
قوّت بحال کرنے کے لئے شمع ٹانک استعمال کیجئے۔
اس میں الکحل بالکل نہیں ہے۔
فی بوتل: ۲۸ روپے (مقامی ٹیکس علاوہ)
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶

BANO New Delhi 40th Year of Publication ISSUE NO. 481 Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 741/57 Regd. No. D-(C) 190

تکبّر انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ ایسا رنگ ہے جو انسان کی شخصیت کو کھوکھلا کردیتا ہے۔ جب انسان تکبّر اختیار کرتا ہے تو دراصل اللہ کی ایک صفت کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان مقامِ بندگی سے نکل جاتا ہے اور مقامِ بغاوت کو پہنچ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان اپنی سزا اور انجام سے بچ نہیں سکتا۔ تکبّر کا واحد علاج عاجزی اور انکسار ہے جو بندگی کی صفت ہے۔

دین و دُنیا میں عجز اور انکسار کا ہی بیڑا پار ہے۔ انسان کی یہی اعلیٰ ترین صفت اُس کی شخصیت کو جاذب اور دِل کش بنا دیتی ہے۔ تکبّر میں انسان اکڑ کر چلتا ہے اور عجز اور انکسار میں انسان خود جُھکتا ہے۔

سعدیہ دہلوی

اپریل ۱۹۸۷

به یادگار : یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی : زینت کوثر دہلوی
مدیرہ : سعدیہ دہلوی
ادارہ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی
اشاعت کا چالیسواں سال، ۴۸۲ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت : چار روپے
سالانہ قیمت : اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس : (031) 61601 SHMA IN
ٹیلی فون: 732668 732667 732666
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان : شمع میگزین
طابع و ناشر : محمد یونس دہلوی
مطبوعہ : شمع پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲

کہی ان سنی

محترمہ سعدیہ باجی
آداب و نیاز!

آج ہی معلوم ہوا کہ آپ کو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے واسطے محترم راجیو گاندھی نے کانگریس آئی (اقلیتی سیل) کا جنرل سکریٹری مقرر کیا ہے اور قدوائی صاحبہ کو صدر۔

میری علی گڑھ برادری کی جانب سے اس پُر وقار عہدے پر فائز ہونے کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ میں اِس وقت کسی عہدے پر فائز نہیں ہوں۔ اِس سے قبل علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (لاء سوسائٹی) کا جنرل سکریٹری رہ چکا ہوں۔ میں اِس وقت صرف آپ کا مدّاح ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں اور رب العزت آپ کو اس ذمّہ داری کو صحیح طرح نبھانے کی قوت عطا فرمائے۔ (آمین)

نعیم اختر، علی گڑھ

○ آپ کی دعائیں ساتھ رہیں تو ہم ضرور کچھ نیک کام انجام دیں گے۔

(مدیرہ)

سعدیہ باجی

مارچ کا بانو ملا۔ ہمیشہ کی طرح دل کش اور معلوماتی ہے۔ سبھی افسانے اور نظمیں پسند آئیں۔ بشریٰ رحمٰن کا ناول "لگن" تو ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا ہے۔ اتنی اچھی تخلیق پر انہیں مبارک باد۔

آپ کا سفرنامہ پڑھ کر بالکل ایسا لگا جیسے ہم بھی آپ کے شریک سفر ہوں۔ آپ کے طرزِ تحریر کی شگفتگی اور سادگی ہمیں بے حد اچھی لگتی ہے۔ ٹی۔ وی۔ سیریل "زندگی زندگی" میں آپ کی اداکاری بھی پسند آئی۔ آپ کی شخصیت میں ہمیں ادب، سیاست، مذہب سیاحت اور اداکاری کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ پتہ نہیں آپ اتنے سارے شوق کیسے پورے کر لیتی ہیں

شاہدہ پروین، صاحب گنج بہار

○ مجھے زندگی کے ہر پہلو سے دل چسپی ہے اور جب کام کرنے کا جنون سوار ہوتا ہے تو انسان کو ہر چیز کے لئے وقت مل جاتا ہے۔
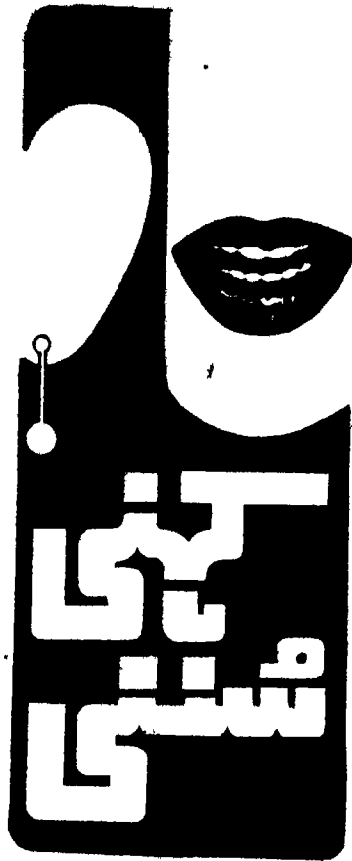
(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ بانو دہلوی صاحبہ
تسلیمات!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہم اراکین منتظمہ کمیٹی انصاری لائبریری خیر آباد، اعظم گڑھ آپ کو آل انڈیا جنرل سکریٹری اقلیتی سیل کانگریس آئی کے باوقار عہدے پر منتخب ہونے پر نیک خواہشات کے ساتھ مبارکباد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ کی صحیح قیادت اردو زبان اور مسلم برادری نیز ملت اسلامیہ کی مکمل حفاظت کرے گی اور ترقی کی نئی منزلوں پر گامزن ہوگی۔ آپ کے قلم نے اردو ادب میں جو تہلکہ مچایا ہے اللہ کرے وہی جذبہ اور حوصلہ برقرار رہے۔ امید ہے انصاری لائبریری پر آپ کی نظرِ عنایت بنی رہے گی۔ مشاعرے کے بعد ہم لوگوں نے مسلم اسپتال کے لئے زمین خریدی ہے جس کے سنگِ بنیاد کے موقع پر ہمیں منظوری اور تعاون کی پوری امید ہے۔ آپ کی مسلمانوں کے مسائل سے ہمدردی قابلِ تعریف ہے۔

○ ہم بھی آپ کو اسپتال کے لئے زمین خریدنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ خدا کرے آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔

(مدیرہ)

بہن سعدیہ

یہ میرا پہلا خط ہے۔ شاید آپ کی نظروں سے گزر جائے۔ لکھنے کا خاص مقصد یہ ہے کہ میں 'بانو' پابندی سے پڑھتی ہوں اور ہماری ساس کو بھی 'بانو' بے حد پسند ہے۔ بشریٰ رحمٰن کی کہانی "لگن" قابلِ تعریف ہے۔ اور خاص کر نسخے، اقوالِ زرّیں اور ہدایات اسلام اور نماز کے بارے میں تفصیلات خوب صورت انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ میری تو اللہ سے بس یہی دعا ہے کہ ماہ نامہ 'بانو' دن دونی رات چوگنی ترقی کرے (آمین)

رضیہ — اورنگ آباد

○ اپنی ساس کو میری طرف سے آداب کہئے۔

(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ باجی!

میں نے گزشتہ چار مہینوں سے رسالہ "بانو" کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ اور اب میں اِس بزم میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں اور آج پہلی بار اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں کہ آپ کی قیادت میں رسالہ 'بانو' روز افزوں معیاری اور وقیع ہوتا جائے گا۔ ہماری تو خدا سے یہی دعا ہے کہ بانو ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے، یہ اردو ادب کا ایک کامیاب رسالہ ہے اور اس میں شائع ہونے والے تمام مضامین بہت ہی معیاری ہوتے ہیں اور اس کا منظوم حصّہ بھی اپنی مثال

آپ سے۔ خدا کرے کہ بانو آسمانِ ادب پر ایک درخشاں ستارے کی مانند جگمگائے۔

(آمین)

انعام الرحمٰن غلی
کوٹہ، راجستھان

○ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ

مارچ کا بانو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ جس میں آپ کا سفرنامہ بہت پسند آیا۔ دیگر مضامین، افسانے اور غزلیں پسند آئیں۔ میری جانب سے تمام قلمکاروں کو مبارک باد پہنچا دیں۔ خدا اِس رسالے کو نظرِ بد سے بچائے اور دِن دونی رات چوگنی ترقی دے

(آمین)

محمد ظہیر الدین ساحل، نرمل

○ شکریہ

(مدیرہ)

ڈیر سعدیہ!

ایک عرصہ سے "بانو" کا مطالعہ کرتا آرہا ہوں!

زندگی کے تمام شعبوں، حالات اور وقت کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ترقی کی منازل کو طے کرتا ہوا یہ پرچہ "بانو" بے حد مقبولِ عام اور ہر دل عزیز ہے۔

مستقبل میں زیادہ سے زیادہ منظرِ عام ہونے اور نام نمود حاصل کرنے کی ڈھیر ساری دُعائیں!

فروری کا "بانو" تاخیر سے موصول ہوا۔ "افتتاحیہ" بے حد عمدہ اور نہایت سبق آموز ہے!

"اُمیدوں کا نیا موسم" پڑھ کر ایسا لگا کہ "کشمیر" میں نہیں بلکہ زندگی میں ایک نیا موسم آیا ہو۔ تفریحی اور معلوماتی بھی بے حد دِل چسپ!

ایک مقام پر "پاؤں پھسلا اور غڑپ سے جھیل میں گر گئے۔" آپ نے تو بالکل ہی خوف زدہ کر دیا۔ اگلا جملہ پڑھ کر بے ساختہ ہنسی نکل گئی کہ جان کی پروا کئے بغیر آپ نے اپنا قیمتی کیمرہ بچانے کی کوشش کی۔" نہایت ڈرامائی انداز"

"افسانہ" "بانو آر کے" کا "رنگ بیحالی" دِل و دماغ پر اِک نقش چھوڑ گیا۔ تقریباً سارے افسانے عمدہ ہیں۔ ان سے ملئے کی خاتون پسند آئی۔ مضمون غریبی اچھا ہے اور سبق آموز بھی۔ "کرن کلیانی کی البم" کی ترتیب نہایت دِل کش ہے۔

"اقوالِ زرّین" نہایت ہی عمدہ اور سبق آموز ہیں۔ آخر میں ایک فرمائش:

کیا یہ ممکن نہیں ہر ماہ ایک افسانہ کسی مشہور و معروف افسانہ نگار مثلاً رام لال، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، ہما ناصر، یا منشی پریم چند وغیرہ کا شائع کریں۔

نیک خیالوں کے ساتھ

شاہد اقبال مومن
حائل سعودی عرب

○ کرشن چندر کے افسانے کی فرمائش تو اللہ میاں سے کیجئے۔ باقی سب کے افسانوں کے لئے ہم کوشش کریں گے۔

(مدیرہ)

سعدیہ صاحبہ

"بانو" مارچ کچھ تاخیر سے ملا۔ شروعات آپ کے "افتتاحیہ" سے کی جو حسبِ معمول کافی پُر اثر ہے۔ اس کے بعد بشریٰ رحمٰن صاحبہ کی "لگن" کا جائزہ لیا جو دل چسپ موڑ پر آ گئی ہے۔ آپ کا سفرنامہ بھی معلومات میں اضافے کا باعث بنا۔ افسانوں میں صالحہ صدف کا "وہ ہم جیسا تھا" محمد طارق کا "اپنا گریبان" اور صفیہ یوسفی کی "بغیر عنوان" کہانی اچھی رہی۔ رفیق عادل کی کہانی "تنہا تنہا" نے سماج کی تلخ حقیقت ہے۔ شاہر مجروح کی تصویر کے ساتھ اُن کی تازہ غزل بھی اگر آپ شائع کریں تو بڑا لطف آتا۔ ایک اور بات آپ سے کہنی ہے کہ ٹی۔ وی۔ سیریل "زندگی زندگی" میں کام کرنے والے فن کاروں کا تعارف بانو کے صفحات پر شائع کریں اور یہ بتائیں کہ سیریل کتنی قسطوں پر مبنی ہے؟

○ "زندگی زندگی" اب اختتام کے قریب ہے۔

(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ!

مارچ کا بانو مجھے ملا۔ "سفر صدیوں کی راہوں کا" بہت دل چسپ اور معلوماتی ہے۔ مجھ جیسے شخص کے لئے قانون اور عدالت کے بغیر کسی اور شئے پر قلم اٹھانا مشکل ہے۔ لیکن بانو کے شمارے گزشتہ ایک برس سے پڑھنے کے بعد آپ کی صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور خاموش رہنا ناانصافی ہے۔ ناچیز کے ذہن میں "بانو" کے لئے کئی تجاویز ہیں۔ عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے پیش خدمت نہیں کر سکتا۔ سپریم کورٹ کی چھٹیاں (بوجہ ہولی تہوار) میں اپنی ریاست جموں کشمیر میں الیکشن مہم میں صرف کرنا چاہتا ہوں اور آج ہی کشمیر روانہ ہو رہا ہوں۔ ہاں محترمہ، دہلی پردیش کانگریس آئی کا اقلیتی شعبہ آپ کو دیا جا رہا ہے۔ اِس کے لئے مبارک باد۔ بانو کے ساتھ ساتھ آپ ہفت روزہ اخبار بھی نکالئے تاکہ قوم کی زبوں حالی پر قلم اٹھایا جا سکے اور عورتوں میں سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کی جا سکے۔ خصوصاً مسلم خواتین بہت ہی پسماندہ ہیں۔ معاف کرنا

ہاں ایک چھوٹی سی شکایت ہے۔ فروری کے شمارے میں "امیدوں کا نیا موسم" کے عنوان سے جو آرٹیکل چھپا ہے۔ اس میں "پپوش" کے بدلے "پاتپور" لکھا جانا چاہئے تھا۔ جہاں زعفران زار ہے اور جہاں راجیو جی آئے تھے۔

سید محمد شفیع، نئی دہلی

○ تصحیح کے لئے شکریہ (مدیرہ)

ڈیر سعدیہ باجی

مارچ کا بانو ملا۔ سارے مضامین پسند آئے۔ خاص طور سے افتتاحیہ بہت پسند آیا۔ "سفر صدیوں کی راہوں کا" بہت اچھا لگا۔ میری جانب سے مبارک باد!

○ شکریہ (مدیرہ)

کشمیر میں سیاسی استحکام

سعدیہ دہلوی

•

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

•

اس بات میں بڑی حقیقت ہے کہ قوموں کی تاریخ بنانے سے بنتی ہے۔ ہندوستان کو ترقی کی طرف لے جانا ہم سب کا فرض ہے۔ اس فرض کو ذمّہ داری سے نبھانے کے لئے ہم حالیہ اسمبلی کے چناؤ میں کام کرنے کے لئے کشمیر گئے۔ وہاں پہنچتے ہی وزیراعظم راجیو گاندھی کے جلسوں میں شرکت کی اور دوسرے دن وزیراعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ہمراہ ہیلی کاپٹر میں جگہ جگہ گئے۔ شہر قدرتی رنگوں کی رعنائی سے خالی تھے۔ کیوں کہ بارش کا موسم تھا۔ الیکشن کے پوسٹروں اور جھنڈوں نے بے شک راستوں کو رنگین بنا رکھا تھا۔ ہر طرف ایک گہما گہمی تھی۔ ہم ہیلی کاپٹر سے ریبی پورہ، بارہ مولہ، ڈارو، ہیپت نار اور دیگر علاقوں میں گئے۔

کہیں بارش زوروں سے ہو رہی تھی اور کہیں بوندا باندی۔ اس کے باوجود سارے گاؤں کے لوگ باہر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو سننے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہر جلسے میں بچے اور عورتیں شامل تھے۔ کشمیری عوام کی خاص بات یہ ہے کہ ہر شخص سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔

ہم اپنے اور پڑھنے والوں کی جانب سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

•

گود لینے میں خوشیاں ہیں یا الجھنیں

نجمہ تبسم

میری ایک سہیلی آشا ماتھر تھی۔
اس کی شادی کو سولہ سال ہوگئے تھے۔
کئی بار وہ اُمید سے ہوئی۔ پیر بھاری ہوئے۔
لیکن پتہ نہیں خدا کو کیا منظور تھا کہ اس کی گود ہری نہ ہوئی۔ چند ہفتوں کے بعد ہی حمل ضائع ہو جاتا تھا۔

متواتر اسقاط کی وجہ سے آشا کی صحت پر بہت برا اثر پڑا اور لیڈی ڈاکٹر نے آشا کے شوہر سے صاف کہہ دیا۔ "آپ بچہ چاہتے ہیں یا بیوی؟"

مسٹر ماتھر اس اچانک سوال کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ سٹ پٹا گئے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"میں صاف صاف یہ کہہ دینا چاہتی ہوں کہ کئی بار اسقاط ہونے کی وجہ سے آشا کا اندرونی جسمانی نظام بری طرح متاثر ہوا ہے۔ آئندہ حمل ہوا تو اس کی جان جانے کا اندیشہ ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔"

مسٹر ماتھر نے آشا کو شادی سے پہلے ہی پسند کر لیا تھا۔ انہوں نے ہی رشتہ کے لئے والدین کو رضامند کیا۔ وہ اُن کے سپنوں کی رانی ان کے گھر کی لکشمی بن کر آئی تھی۔ محبت کی شادی تھی۔ وہ کسی قیمت پر آشا کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔

"ڈاکٹر آشا کی جان بچانے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کا مشورہ کیا ہے؟"

"آپریشن کرنا پڑے گا۔ آشا کی صحت بحال ہو جائے گی لیکن وہ بچہ پیدا نہ کر سکے گی۔"

پہلے آشا خود آپریشن کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن جب ماتھر صاحب نے اُسے اپنی جان کی قسم دی تو وہ مان گئی۔

آپریشن کامیاب رہا۔ آشا تندرست ہوگئی لیکن وہ یہ جان چکی تھی کہ اب اولاد کا سکھ دیکھنا اُس کے نصیب میں نہیں۔ وہ اُداس اور مغموم رہنے لگی۔ بناؤ سنگار سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ شوہر سے اس کے برتاؤ میں بھی ایک تکلیف دہ سرد مہری محسوس ہونے لگی۔

رشتہ داروں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں اشاروں اور کنایوں میں ماتھر صاحب کو دوسری شادی کے مشورے دئے جانے لگے۔

اُڑانے والوں نے آشا کے کانوں تک یہ بات بھی پہنچا دی کہ اب ماتھر صاحب اپنی کمپنی کی خوب صورت سکریٹری پر کافی مہربان ہو رہے ہیں۔

جب آشا رات میں بستر پر لیٹی تو اسے

نرم لگتے تھے جو پہلے اُسے اپنے رفیق اور ہمدم معلوم ہوتے تھے اب کھردرے سخت پتھروں کی طرح بے رحم اور بے حس محسوس ہوتے ۔

اکثر وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی اور سوتے میں چونک اٹھتی ۔ اُسے یہ احساس ہوتا کہ ماتھر صاحب اس کی بغل میں نہیں ہیں ، بستر خالی ہے ۔ وہ کہیں چلے گئے ہیں ۔ لیکن آنکھ کھول کر جب وہ ان کو قریب پاتی تو اسے اطمینان ہو جاتا ۔ اکثر وہ یہ سوچتی کہ آخر ایسے کب تک چلے گا ۔ جب اولاد کی خواہش اُن کو ستانے لگی تو کیا ہوگا ؟ یہ خیال آتے ہی اُس کے ذہن میں طرح طرح کے کانٹے اُبھر آتے وہ اپنی جگہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتی ۔ ایک رات اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ماتھر صاحب کو دوسری شادی کے لئے آمادہ کرے گی بجائے اس کے وہ چوری چھپے کوئی چکر چلائیں اور اُس کے سینے پر اپنی مرضی کی سوت لا دیں ۔ وہ خود ہی اپنی مرضی سے ان کے لئے ایسی دلہن ڈھونڈ کر لائے گی جو اُس کی دوست اور سہیلی ثابت ہو اور ماتھر صاحب کو خاندان کا چراغ اور بڑھاپے کی لاٹھی دے سکے ۔

اس فیصلے سے اُسے بڑی دماغی راحت محسوس ہوئی ۔

ناشتے کے وقت اُس نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا ۔

" سنئے ۔ کئی دن سے ایک بات کہنا چاہ رہی تھی ۔ سوچتی تھی کہوں یا نہ کہوں ۔"

ماتھر صاحب نے توسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے آشا کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی ۔

" ایسی کون سی بات ہے جسے کہنے کے لئے اتنا تکلف ہو رہا ہے ۔ کہنے والی بات ہے تو کہہ ڈالو ۔ کہو گی نہیں تو سمجھنے والا کیسے سمجھے ؟" انہوں نے ایک ساتھ کئی جملے کہہ ڈالے ۔

آشا اُن کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی لیکن وہ کسی اور دُھن میں تھے ۔ ان کے تصورات عام دنوں کی طرح تھے ۔

آشا اپنی بات پوری تول کر پورے وزن کے ساتھ کہنا چاہتی تھی ۔ " پہلے وعدہ کیجئے آپ میری بات مانیں گے ۔"

یہ جملہ سن کر مسٹر ماتھر چونکے ۔ " ماننے والی بات ہوگی تو ضرور مانیں گے ۔ تم کو یہ ڈر کیوں ہے کہ تمہاری بات نہیں مانی جائے گی ۔"

" آشا ۔ پہیلیاں نہ بجھاؤ ۔ بحث کا میرے پاس وقت نہیں ہے ۔ صاف کہہ دو تم چاہتی کیا ہو ۔"

" دیکھئے گھر مجھے بھی سونا سونا لگتا ہے ۔ کچھ آگے کی فکر بھی ہونی چاہئے ۔"

" پھر کیا کیا جائے ؟"

" میری خواہش ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں ، میں اُسے دوست اور سہیلی بنا کر رکھوں گی ۔ اُسے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دوں گی ۔ بولئے ، انکار تو نہیں کریں گے ؟"

یہ جملہ سن کر ماتھر صاحب کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں ۔

ناگواری کے لہجے میں انہوں نے کہا ۔ " آشا ! تم ہوش میں نہیں ہو ؟ یا تمہیں ضرور کسی نے میرے خلاف ورغلایا ہے ، بھڑکایا ہے ۔ خیر اس کی مجھے پرواہ نہیں ۔ لیکن آئندہ اس قسم کی بکواس میرے سامنے نہ کرنا ۔"

اس کے بعد انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا اور تیار ہو کر دفتر چلے گئے ۔ اس کے باوجود دونوں کے رشتے میں ایک دراڑ سی پڑ گئی ۔

اولاد کی محبت میاں بیوی کے رشتے کو ایک نئی معنویت عطا کرتی ہے ۔ وہ خانہ ان دونوں کی زندگی میں خالی تھا ۔

کئی برسوں کے بعد آشا ملی تو اس کے چہرے کی ویرانی اور اُداسی پڑھنے میں مجھے دیر نہیں لگی ۔

ایک دو ملاقاتوں کے بعد وہ مجھ سے کھل اور اس نے اپنے دل کی باتیں کہہ ڈالیں ۔

میں نے کہا ۔ " آشا ! ہمارے مذہب میں تو گود لینے کی بات نہیں ، لیکن تم تو ایسا کر سکتی ہو کسی پیارے غریب بچے کو گود لے لو ، اُس کے دن پھر جائیں گے ۔ تمہاری زندگی میں بہار آجائے گی ۔"

" بچہ ! میں نے یہ بات چھیڑی تھی ، وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں ۔ کہتے ہیں کسی یتیم خانے یا اناتھالے سے ایرے غیرے نتھو خیرے کی اولاد کو اپنے سر منڈھنے والا نہیں ، کس کا پاپ ، کیسا خون ہو ؟ کون جانتا ہے ؟ نا بابا ۔ میں یہ کرنے سے رہا ۔"

میں نے بہت سمجھایا ۔ " بچے سب معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں ۔ گناہ گار اور پاپی تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہیں بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں ۔"

•

میری بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ اُن کی بات میرے پلے نہیں پڑتی ۔ آشا کے سُسر اُس وقت امریکہ میں تھے ۔ جب وہ وطن لوٹے تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آشا کی بڑی بہن کا ایک بچہ گود لے لیا جائے ۔ مسٹر ماتھر اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئے ۔ آخر اُن کے باپ نے الٹی میٹم دے دیا ۔

" دیکھو ۔ یا تو تم کسی بچے کو گود لے لو ، ورنہ میں اپنی زندگی میں ساری جائداد کا ٹرسٹ بنا کر کسی کالج یا اسپتال کے نام کر دوں گا تمہیں اس سے پھوٹی کوڑی نہ ملے گی ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری گاڑھی کمائی تمہارے بعد میرے رشتے داروں کے ہتھے چڑھے ۔"

جانے کون سی مبارک گھڑی تھی جب انہوں نے یہ دھمکی دی تھی کہ ماتھر صاحب نے اپنی بڑی سالی کی تیسری اولاد بیٹی کو گود لے لیا ۔ آشا اور مسٹر ماتھر سیدھے اسپتال سے اُسے گھر لے آئے ۔ اس کا نام بھی انہوں نے سوچ لیا تھا ۔

لکشمی •

وہ ننھی سی بچی ، مسٹر ماتھر اور آشا کے کلیجے کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی روشنی بن گئی ۔

جب وہ چھ مہینے کی ہوئی تو انہیں یہ دیکھ کر تشویش ہوئی کہ لکشمی " ہینگی " ہے ۔ اُس کی

دونوں آنکھوں کی پتلیاں مختلف زاویوں میں گھومتی تھیں، بولنے اور چلنے میں بھی وہ کافی سست تھی۔

مسٹر ماتھر اور آشا ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ بچی کو بچوں کے علاج کے مشہور معالج کے پاس لے گئے۔

ڈاکٹر کی تشخیص نے انہیں پریشان کر دیا۔

بچی دماغی طور پر کم زور تھی۔ اُس کے تلوے چپٹے تھے اور پتلیوں کے گھومنے میں نقص تھا۔ لیکن محبت تمام رکاوٹوں کو دُور کر دیتی ہے۔ دُشواریوں پر فتح حاصل کر لیتی ہے باقاعدہ علاج سے اُس کی کم زوریوں میں کمی ہوگئی۔

اِس وقت لکشمی دس برس کی ہو چکی ہے اور تقریباً نارمل ہے۔ بھولی بھالی، ملنسار۔ اس نے دماغی طور پر کم زور بچوں کے لئے مخصوص اِسکول میں تعلیم پائی ہے۔ وہ پڑھ لکھ سکتی ہے۔ قدرت نے اُسے اچھی آواز دی ہے۔ گانے کی وجہ سے وہ خاندان اور دوستوں میں مقبول ہے۔

لکشمی اگر اپنے حقیقی خاندان میں رہتی تو شاید اُسے اتنی توجہ نہ ملتی جو اُسے ماتھر گھرانے میں شامل ہونے کے بعد ملی۔ اس کو جو سماجی ماحول ملا، جو سہولتیں ملیں، ان سارے اسباب کی وجہ سے اس کی زندگی کا سفر آسان ہوگیا۔

اِس طرح گود لینے کی وجہ سے ایک خاندان کا بوجھ کچھ کم ہوگیا۔ دوسرے خاندان میں خوشیاں لوٹ آئیں اور ایک معصوم سی بچی کا مستقبل روشن ہوگیا۔

سب بچے اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے میری ایک رشتے کی خالہ ہیں۔ کُنبہ کثیرالاولاد تھا۔ اُن پر یہ قیامت ٹوٹی کہ ایک حادثے میں اُن کے میاں اللہ کو پیارے ہوگئے زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ اِس سانحہ نے خاندان کی کمر توڑ دی۔

دُکھ کی اس گھڑی میں رشتے داروں نے ان کا ہاتھ تھامنے کے بہانے اُن کے بچوں کا جائزہ لیا۔ ان کے پانچ بچوں میں سب سے بڑا لڑکا پندرہ سال کا اور سب سے چھوٹا صرف تین برس کا تھا۔ اُن کے بیچ میں تین بیٹیاں تھیں۔ خالہ کسی قیمت پر اپنے بیٹوں کو الگ کرنے کو تیار نہ تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ بڑا لڑکا قیصر ایک دو برس میں کوئی ہنر سیکھ کر کچھ کمانے لگے گا تو اُن کا سہارا بن جائے گا۔ سب سے چھوٹی اولاد سے ماں کو فطری طور پر محبت ہوتی ہے اس لئے وہ اکبر کو بھی جدا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

رہ گئیں بے چاری رخسانہ (دس برس) شبنم (آٹھ برس) اور ناہید (چھ برس) اُن کی چچیری بہن لچھے دار باتیں بنا کر رخسانہ کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ "میں پڑھاؤں گی، خانہ داری سکھاؤں گی۔ اپنے بچوں سے زیادہ اس کا خیال رکھوں گی۔"

اُن کی خالہ زاد بہن شبنم کو لے گئیں۔ انہوں نے بھی بڑھ چڑھ کر ہر طرح کا دلاسہ دیا۔ "جیسی میری بیٹی ویسی تمہاری۔ تمہاری بچی غیروں کے پاس تو نہیں جا رہی ہے۔ تم فکر نہ کرنا۔"

بے چاری خالہ جو تین بیٹیوں کے بوجھ سے سہمی ہوئی تھیں اُن میں انکار کی ہمت نہ ہوئی۔

لیکن ہوا کیا؟

دونوں کو بلا تنخواہ کام کرنے والی چھوکریاں مل گئیں۔ جھاڑو دینا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا زیادہ سے زیادہ کام ان بے چاری کمسن بچیوں پر ڈال دیئے گئے۔ نہ ڈھنگ سے اِن کے کھانے کی فکر ہوتی نہ اُن کے کپڑوں کی۔ دوسرے بچوں کی اُترن اُن کا مقدر بن گئی۔ اُن کے رشتے کے بھائی بہن اُن پر دھونس الگ سے جماتے۔ دونوں پرائے گھر میں کمر توڑ محنت کرنے کے باوجود نکو بنی رہتیں۔ دونوں زبردست احساسِ کمتری کا شکار ہو گئیں۔ اُوپر سے خالہ ان خود غرض رشتہ داروں کے احسان کا بوجھ محسوس کرتی تھیں کہ دو بیٹیوں کا بوجھ اُن کے کندھوں سے ہٹ گیا۔

یہ مثالیں گود لینے کی نہیں ہیں لیکن بے سہارا بچوں کے استحصال کے ایسے واقعات بہت مل جائیں گے۔ کاش اِن بچیوں کو بے اولاد گھرانے نے اپنا لیا ہوتا اور انہیں وہی توجہ، شفقت اور محبت ملی ہوتی جو لکشمی کو مل سکی۔ تو رخسانہ اور شبنم کا دامن بھی خوشیوں سے بھر گیا ہوتا۔ جس گھر میں وہ ہوتیں وہاں بھی ان کی شوخی، شرارت، اور معصوم ہنسی سے رونق چہل پہل ہوتی۔

جب میں رخسانہ اور شبنم کے بجھے ہوئے چہرے دیکھتی ہوں تو مجھے ایک اور بچی یاد آتی ہے جو اکثر اپنی ماں کے ساتھ میرے گھر آتی تھی۔ مایا اس کا نام تھا۔

اس کی ماں مر چکی تھی۔

باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔

اُس کی سوتیلی ماں ویسی تھی جیسی قصوں کہانیوں میں سنتے آئے ہیں۔

ظالم، خود غرض، بے رحم

جب ماں مری تھی تو مایا چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔

ایک روز وہ آئی تو اُداس، بجھی بجھی کھوئی کھوئی سی۔

اس کی ماں نے اُسے تھوڑی چینی اُدھار لینے کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"مایا۔ آج تم اسکول نہیں گئیں؟"

"آنٹی۔ میں نے اِسکول جانا چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں، کیوں، آخر ہوا کیا؟"

"آنٹی۔ اِسکول کا کام کروں تو گھر کا کام نہیں ہوتا، ممی ڈانٹتی ہے، مارتی ہے، پاپا سے شکایت کر کے ان سے بھی پٹواتی ہے۔ اسکول کا کام نہ کروں تو ٹیچر ناراض ہوتی ہے کلاس کے سامنے بے عزتی ہوتی ہے۔ پڑھائی میں بھی جی نہیں لگتا۔"

یہ سن کر میرے دل کو دھکا لگا۔ دو برس پہلے کی بات یاد آ گئی۔ مایا اپنی کلاس

میں فرسٹ آئی تھی۔ اس کی ماں اسے نئی فراک پہنا کر مٹھائی کھلانے آئی تھی۔ اُس وقت ایک فخر کا نشہ تھا اس کی ماں کو، کتنی چمک تھی مایا کی آنکھوں میں۔

آج وہی مایا میرے سامنے تھی۔ تھکی ہوئی، بجھی ہوئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک کہاں کھو گئی تھی؟

ایک روز مایا آئی تو مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آج کوئی کام نہیں ہے گھر پر؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شام کو اُس کا باپ ڈھونڈتا ہوا آیا

"مایا آئی ہے؟"

"آئی تو تھی۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مایا کہیں نظر آئی۔ میں نے اُس کے باپ سے کہا۔

"شاید گھر چلی گئی۔"

جب وہ چلا گیا تو ایک الماری کے پیچھے سے مایا برآمد ہوئی۔

"آنٹی مجھے بچالو۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے بہت مارتا ہے۔ اس نے اپنی فراک اٹھا کر دکھایا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ نیلے نشان پڑے ہوئے تھے۔

میرا دل اس کے لئے بھر آیا۔ میری کچھ میں نہیں آیا کیا کروں؟

شام کو جب میرے شوہر گھر آئے تو میں نے اُن کو ساری بات بتائی۔

وہ پریشان ہوگئے۔

"دیکھو ہم اِس کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ قانون اِس کی اجازت نہیں دیتا۔ میں اسے اِس کے باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ میں اُسے سمجھا دوں گا۔ ذرا میں کپڑے بدل لوں۔"

جب وہ کپڑے بدل کر تیار ہوئے تو مایا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ شاید اُس نے ہماری باتیں سن لی تھیں اور چپ چاپ باہر نکل گئی تھی۔

جب بھی مایا کا بھولا بھالا مظلوم چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے تو یہی خیال میرے ذہن میں آتا ہے۔ "کاش! مایا کو بھی کوئی بے اولاد گھرانہ اپنا لیتا تو اُسے بھی مہربان سایہ مل جاتا جس کی پناہ میں وہ عام بچوں کی طرح پنپ سکتی۔ لیکن کبھی قانون رکاوٹ بن جاتا ہے کبھی سماج بھی اندھے جذبات اور کبھی حالات کی مجبوریاں۔

ہندوستان میں یتیم و بے آسرا بچوں کی تعداد دس لاکھ ہے۔ اور کم از کم دو کروڑ افراد ایسے ہیں جو بچوں کو گود لے سکتے ہیں یا اُن کی پرورش کر سکتے ہیں، یعنی دس خوش حال افراد میں سے اگر صرف ایک کسی یتیم بچے کو اپنالے تو ملک کے کسی یتیم بچے کو مقدر سے شکایت نہیں ہوگی۔

■■

تیسرا گھر

مسرور جہاں

کال بیل کی آواز سن کر نومی چونک اُٹھی۔ ہر شگل کو، ایک مقررہ وقت پر مخصوص انداز سے کال بیل گنگناتی تھی۔ نومی بھی اس آواز کی منتظر رہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ اس آواز پر چونک پڑتی تھی۔

نومی نے ببلو کو جوتے اور موزے پہناتے ہوئے آیا سے کہا "آیا! صاحب سے کہہ دو، بابا پانچ منٹ میں آرہا ہے۔"

آیا اثبات میں گردن ہلا کر چلی گئی۔ اور نومی نے ببلو کے بالوں پر برش کرتے ہوئے پیار سے کہا "ببلو بیٹے، تمہارے ڈیڈی آگئے ہیں۔ ان کو تنگ نہ کرنا۔ اور — " "اور — جلد لوٹ آنا۔" ببلو نے شرارت سے آنکھیں گھماتے ہوئے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"شریر!" نومی نے پیار سے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ڈیڈی کے ذکر پر ببلو کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔

"ممی! ڈیڈی تو کہتے ہیں کہ میں بہت اچھا بچہ ہوں۔"

"ڈیڈی سچ کہتے ہیں، ممی کی جان! تم بہت سوئیٹ ہو۔ بس اب جاؤ۔ ڈیڈی انتظار

کر رہے ہوں گے۔"

"اونہوں۔ چلیے بچی!"

بلو نے اپنا پھولا پھولا سُرخ گال اس کے سامنے پیش کر دیا۔ نومی نے اسے پیار کیا اور وہ 'ٹاٹا' کرتا ہوا تیر کی طرح باہر کی طرف بھاگا۔

نومی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سلمان اسے ہلاتے ہوئے کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بلو کی نظر نومی پر پڑی اور اس نے ہاتھ ہلایا تو غیر ارادی طور پر سلمان نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ چلے گئے۔ وہ کمرے کا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگی۔ ابھی اسے تیار ہو کر ٹی وی سینٹر جانا تھا۔ گانے کی ریہرسل اور ریکارڈنگ میں کئی گھنٹے معروفیت میں گزارنے تھے۔ وہ آیا کو کچھ ہدایتیں دیتے ہوئے غسل خانے میں گھس گئی۔ شاور کے نیچے نہاتے ہوئے اس نے سوچا: بلو اب گھر پہنچ گیا ہوگا۔ یا پھر دونوں باپ بیٹے شاپنگ کر رہے ہوں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھے آئس کریم کھا رہے ہوں۔ شام کو جب تک بلو واپس آئے گا، میں بھی آجاؤں گی۔ ذرا دیر بھی ہوئی تو آیا اسے سنبھال لے گی۔

غسل سے فارغ ہو کر نومی نے لباس کا انتخاب کیا۔ چوڑی دار اور کُرتے میں وہ اپنی عمر سے کئی برس کم لگ رہی تھی۔ اس نے بالوں کو سیدھے سادے ڈھنگ سے سنوارا، ہلکا سا میک اپ کیا۔ میز سے پرس اور کار کی چابی اٹھا کر وہ آیا سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہہ کر باہر آ گئی اور اپنی فئیٹ اسٹارٹ کر کے ٹی وی سینٹر کی طرف روانہ ہو گئی۔

سلمان نے بڑے شوق سے اسے خود ہی ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ شروع میں تو وہ اسٹیرنگ ہاتھ میں لیتے ہوئے بہت ڈرتی تھی۔ پھر سلمان کی حوصلہ افزائی نے اس میں اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ جس روز پہلی بار اس نے سلمان کی مدد کے بغیر کار ڈرائیو کی تھی اور ایک لمبا چکر لگا کر اپنی مہارت کا ثبوت دیا تھا، اس دن سلمان بہت خوش ہوئے تھے اور انعام میں اسے ایک جڑاؤ بریسلیٹ دیا تھا۔ پھر تو وہ بڑے اعتماد سے پُرہجوم سڑکوں پر کار ڈرائیو کرنے لگی تھی۔ سلمان سے الگ ہونے کے بعد اس نے اپنے لیے فئیٹ خرید لی تھی، کیوں کہ اس کو خود بھی گاڑی کی ضرورت پڑتی تھی۔

ٹی وی سینٹر سے اسے کئی گھنٹے کے بعد فرصت ملی۔ وہ کافی تھک گئی تھی اور جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ بلو اب تک واپس آ چکا ہوگا اور اس کے بغیر اداس ہوگا۔ کئی گھنٹے ہنسی خوشی گزارنے کے بعد محض اس کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہو جائے، یہ اسے کبھی کب گوارا تھا۔ ایک دُکان پر گاڑی روک کر اس نے بلو کے لیے چاکلیٹ لی۔ اس کا مُوڈ بحال کرنے کے لیے یہ رشوت بھی ضروری تھی — پھر خاصی تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے وہ گھر پہنچی۔

جب وہ بنگلے میں داخل ہوئی تو اس نے سلمان کی کار پورٹیکو میں کھڑی دیکھی۔ وہ اپنی گاڑی سیدھی گیراج کی طرف لے گئی۔ اسے معلوم تھا کہ سلمان ڈرائنگ روم میں ہوں گے — وہ راہ داری سے ہو کر اندر گئی۔ آیا کافی کی ٹرے لیے ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رُک گئی۔

"صاحب جی باہر بیٹھے ہیں۔ بابا نے انہیں روک لیا تھا۔" آیا نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ بابا کو بتا دو کہ میں آ گئی ہوں۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ 'صاحب' جا سکتے ہیں۔ آیا نے اثبات میں گردن ہلائی اور باہر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ نومی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اچانک بلو آ کر اس سے لپٹ گیا۔ نومی اسے پیار کیا۔

"ممی، میں نے زبردستی ڈیڈی کو روک لیا تھا۔ آپ نہیں تھیں نا — کیا آپ ناراض ہو گئیں ممی؟"

اس کے دل میں ایک پھانس سی چُبھ گئی۔ وہ جلدی سے بولی "نہیں، بالکل نہیں۔ تم نے اچھا کیا جو ڈیڈی کو روک لیا۔ اکیلے بور ہو جاتے اب تم جا کر اپنے ڈیڈی کو گڈ نائٹ کہہ دو۔"

"او کے ممی!" بلو، اسے چھوڑ کر باہر بھاگا۔ پھر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ بلو زور زور سے 'ڈیڈی گڈ نائٹ — ڈیڈی گڈ نائٹ'، کہہ رہا تھا۔

بلو اندر آیا تو آیا نے اس کا لباس تبدیل کرایا۔ وہ خوشی خوشی نومی کو اپنی چیزیں دکھا رہا تھا۔ "یہ کامکس — یہ میجک، اور یہ دیکھیں نیا بال بیٹ — یہ سوٹ اور یہ ..."

"سب چیزیں بہت اچھی ہیں۔ آؤ اب کھانا کھا لو۔" نومی نے اس کے گال تھپتھپائے۔

"مجھے ذرا بھی بھوک نہیں ہے، ممی۔ ڈیڈی نے اتنی ڈھیر ساری چیزیں کھلا دی ہیں۔ سافٹی، پیسٹری اور کولڈ ڈرنک بھی۔"

"اور یہ رہی تمہاری چاکلیٹ۔"

نومی نے پرس سے چاکلیٹ نکال کر اس کو دی۔

"تھینک یو ممی۔" بلو خوش ہو گیا اور نومی کو دن بھر کی معروفیات کے بارے میں چہک چہک کر بتانے لگا۔ نومی اس کی باتوں پر ہنستی رہی، مسکراتی رہی۔ اس کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش تھی۔

بلو چار برس کا تھا جب سلمان اور نومی نے الگ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اب وہ آٹھ سال کا تھا۔ یعنی ان کو الگ ہوئے چار سال بیت چکے تھے۔ سلمان نے بلو کو لے کر کوئی تنازعہ کھڑا نہیں کیا اور بخوشی نومی کو اجازت دے دی کہ وہ بلو کو اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ وہ اس کے اخراجات کے لیے بھی نومی کو ہر ماہ معقول رقم دیتے تھے۔ البتہ وہ بلو سے لاتعلق نہیں رہے۔ منگل کے دن ان کی فیکٹری بند رہتی تھی۔ بلو کے اسکول سے آنے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور کئی گھنٹے اس کے ساتھ گزارتے تھے — شام کو وہ واپس نومی کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ چار سال سے وہ پابندی سے اس پروگرام پر عمل کر رہے تھے اور اب تو ان تینوں کو اس معمول کی عادت

ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی سلمان اور نوری کا آمنا سامنا بھی ہو جاتا، لیکن ان میں کبھی براہِ راست گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ پہلے تو آیا ان کے بیچ پیغام رسانی کا فرض ادا کرتی تھی۔ جب سے بلو ذرا سمجھ دار ہوا تھا، وہ یہ ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کام سے سخت بور ہوتا تھا، لیکن مجبوری تھی۔

بلو کبھی ممی سے کہتا، "ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ تم بہت کمزور ہو رہی ہو۔ کیا ٹھیک طرح کھاتے پیتے نہیں ہو؟"

پھر ڈیڈی سے کہتا: "ممی کہہ رہی تھیں، میں بلو کی ماں ہوں، دشمن نہیں۔ میں اپنا فرض اچھی طرح جانتی ہوں۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کبھی ڈیڈی سے کہتا: "ممی کہہ رہی تھیں آئس کریم اور چاٹ نہ کھانا، گلا خراب ہو جائے گا۔" پھر ممی سے کہتا: "ڈیڈی کہتے ہیں، بلو بڑا ہو گیا ہے۔ ذرا سی آئس کریم کھانے سے گلا نہیں خراب ہو گا۔ چاٹ بھی روز کہاں کھاتا ہے؟"

کبھی ڈیڈی سے کہتا: "ممی کہہ رہی تھیں، زیادہ دیر میں مت آیا کرو۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔"

پھر ممی سے کہتا: "ڈیڈی کہہ رہے تھے، روز تو اپنی ممی کے پاس رہتے ہو۔ کبھی کبھی دو چار گھنٹے میرے پاس رہتے ہو۔ تمہاری ممی کو یہ بھی پسند نہیں ہے۔"

ممی —— ڈیڈی —— ڈیڈی —— ممی ——

چکی کے یہ دو پاٹ تھے، جن کے بیچ میں معصوم بلو بُری طرح پس رہا تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کے دوستوں کے ممی ڈیڈی کی طرح ایک ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ اب تو اکثر وہ ان دونوں سے اس سلسلے میں سوالات بھی کرنے لگا۔ لیکن ان میں سے کسی کے پاس اس کے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ پتہ نہیں اس کے سوال ہی بےتکے ہوتے تھے یا وہی لاجواب ہو جاتے تھے۔ لیکن بلو ضرور پریشان ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے ڈیڈی سے ملنے کے لئے ایک ایک دن گن کر گزارتا۔

اور جب ڈیڈی اسے لے جاتے تو وہ بہت خوش ہوتا۔ اور سارے وقت بلبل کی طرح چہکتا رہتا، لیکن جیسے جیسے اندھیرا بڑھنے لگتا، وہ سب کچھ بھول کر ممی کے پاس جانے کی رٹ لگا دیتا اور اسی وقت وہ سلمان کے بہلانے پھسلانے سے بھی نہ مانتا۔ سلمان بےحد اُداس ہو جاتے اور اسے واپس پہنچا دیتے، جیسے وہ ان کا اپنا بیٹا نہ ہو کرائے کی اولاد ہو جسے وہ تھوڑا پیسہ خرچ کر کے دو چار گھنٹے اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو عدالت کے ذریعہ بلو کو نوری سے واپس لے سکتے تھے، لیکن وہ نوری کو اور زیادہ دُکھ دینا نہیں چاہتے تھے۔ اب تک جو کچھ، جس طرح ہوا تھا، وہی بہت تھا اس سے زیادہ بُرا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ جو کبھی ایک جان دو قالب تھے، اب متوازی لکیروں کے مانند الگ الگ اپنی اپنی راہ چل رہے تھے۔ زندگی بھر ایک چھت کے نیچے رہنے کا خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکا تھا۔ شادی کے چند سال کے بعد ہی اختلاف اتنا بڑھا کہ پہلے ان کے کمرے الگ ہوئے، پھر گھر بھی الگ ہو گئے۔ مزہ یہ کہ دونوں اپنی جگہ یہ سمجھتے تھے کہ غلطی ان کی نہیں ہے، دوسرے کی ہے۔ وہی ادائیں جو پہلے پسندیدہ تھیں، اختلاف کا سبب بن گئیں۔

سلمان اور نوری کی پہلی ملاقات ایک میوزک کنسرٹ میں ہوئی تھی۔ نوری اسٹیج پر میٹھی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ اور سلمان سامعین کی اگلی صف میں سحر زدہ سے بیٹھے تھے۔ آواز اور حُسن جادو انہیں مغلوب اور مسحور کر چکا تھا دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی سلمان نے نوری کے سامنے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ نوری نے بھی ان کی مخلصانہ پیش کش قبول کر لی، اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسے کبھی گانے سے روکیں گے۔ موسیقی سے اس کا لگاؤ پرستش کی حد تک تھا۔ سلمان نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کی یہ شرط مان لی۔ بظاہر اس میں کوئی بُرائی بھی نہیں تھی۔ وہ فن کار تھی اور یہی فن اس کی پہچان بن چکا تھا۔ وہ اپنی شناخت کھونے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن شادی کے بعد اکثر انہیں ایک دوسرے سے شکایت رہنے لگی۔ کبھی نوری ان کی منتظر رہتی تو وہ فیکٹری کی مصروفیات میں اپنا وعدہ بھول جاتے اور کبھی وہ دس کام چھوڑ کر گھر جلد واپس آتے تو پتہ چلتا کہ نوری کسی میوزک پروگرام میں گئی ہوئی ہے اور ایسے پروگرام بارہ ایک بجے سے پہلے نہ ختم ہوتے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام بھی اکثر لگے رہتے۔ ایسے موقعوں پر سلمان سخت کوفت محسوس کرتے۔

دونوں کی مصروفیات اس حد تک مختلف تھیں کہ تلخیاں اور بدگمانیاں ان کے دلوں میں راہ پانے لگیں۔ اکثر اپنی غلطی محسوس کر کے وہ مفاہمت کی کوشش کرتے۔ لیکن انجانے میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی کہ ان کی ساری کوشش رائیگاں ہو جاتیں۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد اور دائمی رفاقت کے وعدے انا اور ضد کی نذر ہو گئے۔ ایک وقت محبت کا نازک آبگینہ ان کی انا اور ضد کی پتھریلی چٹان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ چار سالہ بلو بھی، جو دونوں کو بےحد عزیز تھا، ان کی زندگی کے دھارے کا رُخ نہ موڑ سکا اور وہ ندی کے دو کناروں کی طرح دُور دُور، ایک دوسرے کے متوازی چلنے لگے۔ تعلیم یافتہ اور مہذب انسانوں کی طرح انہوں نے جو فیصلے کئے، ان پر وہ برسوں سے کاربند تھے۔ لیکن جن فیصلوں کو وہ بےحد اور معقول سمجھتے تھے، وہی بلو کے معصوم ذہن پر بوجھ بنتے جا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پورا انصاف کر رہے ہیں لیکن بیٹے کے ساتھ وہ کیسی ناانصافی کر رہے تھے، اس کا ان میں سے کسی کو احساس نہیں تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بےخبری میں اپنے اکلوتے بیٹے پر بےانتہا ظلم ڈھا رہے تھے۔

منگل کا دن تھا۔ اتفاق سے اس روز

بیلو کے اسکول میں بھی چھٹی تھی۔ ایسا اتفاق ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ بیلو نے سارا دن اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہنے کا پروگرام بنایا تھا۔ نومی نے اسے تیار کر دیا تھا اور اب وہ ڈیڈی کے انتظار میں باہر لان میں کھیل کر وقت کاٹ رہا تھا۔ آیا وہیں ایک طرف بیٹھی ہوئی صفائی کرنے والی مائی سے باتیں کر رہی تھی۔ نومی اندر کسی کام میں مصروف تھی۔ کھیلتے کھیلتے اچانک بیلو کیاری میں لگے گملے کے سنگھاڑے سے ٹھوکر کھا کر گرا اور گملے کا کونا اس کے سر میں گھس گیا۔ اس کی چیخ پر آیا دوڑی اور مائی نے لپک کر نومی کو خبر دی نومی بھاگی ہوئی آئی۔ آیا بیلو کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھی اور لال لال خون سے بیلو کا چہرہ اور لباس تر ہو رہا تھا۔ جیتا جیتا خون دیکھ کر تو نومی کے اوسان جاتے رہے۔ آیا کی مدد سے وہ بیلو کو اندر اٹھا کر لائی۔ ڈیٹول سے زخم صاف کر کے کاٹن کا موٹا سا ٹکڑا رکھ کر اس پر پٹی باندھ دی۔ پھر وہ آیا کے ساتھ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگی۔ ڈاکٹر نے زخم میں ٹانکے لگائے اور بینڈیج کر دی۔ سکون کے لئے ایک انجکشن لگایا اور دوائیں دے کر نومی کو تسلی دی کہ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ ایک ہفتے میں زخم بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

نومی بیلو کو لے کر گھر واپس آئی تو سلمان بڑی بے قراری سے باہر ہی ٹہل رہے تھے۔ جیسے ہی کار رکی، انہوں نے بڑھ کر بیلو کو گود میں لے لیا اور نومی کے پیچھے بیڈ روم میں داخل ہو گئے۔ بیلو کو آہستہ سے بیڈ پر لٹا کر انہوں نے کمبل اڑھا دیا۔ انجکشن کے اثر سے بیلو بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ چوٹ کی تکلیف اور خون کے اخراج سے وہ خاصا کمزور نظر آ رہا تھا۔ سلمان نے قریب کھڑی ہوئی نومی کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ نومی نے سر جھکا لیا۔ وہ ان کی نظروں کی تاب نہیں لا سکی۔ یہ نظریں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وہ مجرم ہے، قصوروار ہے۔ اس نے اپنی صفائی پیش کی: "بیلو آپ کے انتظار میں باہر لان میں کھیل رہا تھا۔ آیا بھی وہیں تھی۔ خدا جانے کیسے گر پڑا۔ زخم کافی گہرا ہے۔ چار ٹانکے لگے ہیں۔"

"اسے میرے آنے تک گھر میں بھی تو روکا جا سکتا تھا۔ وہ تو ناسمجھ ہے۔ لیکن جب بڑے ہی نادانی کرنے پر آمادہ ہوں تو۔ ۔ ۔"

"میں نے تو منع کیا تھا، لیکن جانے کی خوشی میں وہ مانا ہی نہیں۔"

"سر کی چوٹ، وہ بھی اس عمر میں بے حد نقصان دہ ہوتی ہے۔ دماغ کمزور ہو سکتا ہے اور بھی کسی طرح کے برے نتائج نکل سکتے ہیں۔"

نومی تو خود ہی ہراساں تھی اور بیلو کی چوٹ کے لئے اپنے کو قصوروار سمجھ رہی تھی، اب جو سلمان نے سخت الفاظ میں بازپرس کی اور سارا الزام اس کے سر تھوپ دیا تو وہ ضبط نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلمان غم و غصہ میں، پتھر بنے بیٹھے رہے۔ نہ اسے چپ کرایا اور نہ تسلی کا ایک لفظ کہا۔ رو دھو کر وہ خود ہی چپ ہو گئی۔ آیا کافی بنا کر لائی تو نومی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بیلو کے کپڑے نکالنے لگی، تاکہ بیدار ہونے پر اس کا لباس بدل سکے۔ جتنی دیر سلمان، بیلو کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ وہاں نہیں آئی۔ اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو سلمان چلے گئے۔

جتنے دن بیلو بستر پر رہا، سلمان روزانہ صبح و شام اس کے پاس آتے رہے۔ بیلو اتنے دنوں بے حد مسرور رہتا تھا۔ کبھی کبھی بیلو کے تعلق سے نومی اور سلمان میں ایک آدھ بات ہو جاتی تھی۔

بیلو تن درست ہو گیا اور اسکول جانے لگا تو سلمان بھی ہفتہ وار پروگرام پر پھر عمل کرنے لگے۔ اب روز ان کے آنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ شروع شروع میں تو بیلو بہت چڑچڑا رہا، پھر رفتہ رفتہ نارمل ہو گیا۔ ان سارے حالات پر اس کا کوئی بس بھی تو نہیں تھا۔

حسبِ معمول بیلو اس روز بھی ڈیڈی کا منتظر تھا۔ سلمان نے اسے انگریزی فلم دکھانے کا وعدہ کیا تھا، جو جنگلی جانوروں کی زندگی پر بنائی گئی تھی اور بیلو کے سارے دوست یہ فلم دیکھ چکے تھے۔ سلمان کی بجائے ڈرائیور کو دیکھ کر بیلو اُداس ہو گیا۔

"ڈیڈی کیوں نہیں آئے، لال خاں؟"

بیلو نے پوچھا۔

"صاحب کو بخار ہے۔ انہوں نے آپ کو بُلایا ہے۔"

بیلو نے ممی کو ساری بات بتائی۔ نومی اسے کار تک چھوڑنے آئی اور ڈرائیور کو تاکید کی کہ اسے شام ہونے سے پہلے لے آئے۔

سلمان اپنے بستر میں اوڑھے لپیٹے لیٹے تھے۔ بیلو کو دیکھ کر ان کے پژمردہ چہرے پر رونق آ گئی۔ بیلو بستر پر چڑھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ سلمان اس کے ہاتھ تھام محبت سے بولے۔ "سوری بیٹے، آج آپ کی پکچر مس ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں ڈیڈی۔ آپ اچھے ہو جائیں گے تو ہم فلم دیکھ لیں گے۔ بیلو نے بے حد متانت سے کہا۔

"میرا بیٹا کتنا سمجھ دار ہے۔ سلمان نے اس کے گال پر پیار سے چھوا۔ بیلو مسکرانے لگا۔ جیسے ان کی اس بات سے وہ بالکل متفق ہو۔

"آپ کے سر میں درد تو نہیں ہے ڈیڈی لائیے، میں دبا دوں — آرام ہو جائے گا۔"

سلمان نہیں نہیں کرتے رہے، لیکن جب بیلو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کا سر دبانے لگا۔ تو انہیں بھی مزہ آنے لگا۔ اس وقت انہیں ایسے ہی خلوص اور اپنائیت کی ضرورت تھی جسے بیلو نے پورا کر دیا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو وہ تنہا بستر پر پڑے بخار کی تپش سے جھلستے ہوتے۔ پچھلے چار برسوں میں کئی بار ایسا ہوا تھا اور بیماری کی اذیت انہوں نے تنہا برداشت کی تھی۔

بیلو سارے دن ان کی دیکھ بھال کرتا رہا اور ایک پل کے لئے بھی ان کے پاس سے نہ ہٹا شام ہوتی تھی تو سلمان نے بیلو سے کہا۔ "بیٹا، لال خاں سے کہو تمہیں گھر پہنچا دے۔ ممی انتظار

کر رہی ہوں گی۔"

"میں نہیں جاؤں گا، ڈیڈی۔ آپ اکیلے رہ جائیں گے۔"

"اکیلا کہاں ہوں؟ نوکر بھی تو ہیں۔"

"نوکر میری طرح آپ سے پیار تو نہیں کر سکتے۔" بلو نے معصومیت سے ایک پتے کی بات کہہ دی۔

"ہاں بھئی، یہ تو ہے۔ تم ممی کو فون کر دو اور انہیں بتا دو کہ آج تم میرے پاس رہو گے۔"

"او، کے ڈیڈی۔"

بلو نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون پر گھر کا نمبر ملایا اور بڑی مستعدی سے ماں سے بات کرنے لگا۔

"ہیلو ممی! میں آج نہیں آؤں گا۔ یہیں ڈیڈی کے پاس رہوں گا۔ بے چارے ڈیڈی کو بہت تیز بخار ہے، ممی۔ آپ بھی آجایئے پلیز ممی۔ مجھے آج رک جانے دیں۔ ڈیڈی اکیلے ہیں، ممی، میں یہاں ان ہی کپڑوں میں آرام سے سو جاؤں گا۔"

بلو کی بات چیت سے سلمان نے اندازہ لگایا کہ نومی اسے رات میں یہاں چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ انہیں دکھ تو ہوا، لیکن انہوں نے سمجھا بجھا کر بلو کو گھر بھیج دیا۔

بلو جاتے وقت بہت اداس ہو گیا۔ اسے اس وقت ممی پر غصہ آرہا تھا۔ وہ اس روز روز کی کھینچا تانی سے عاجز آچکا تھا۔ کھائے پئے بغیر وہ سونے کے لئے لیٹ گیا نومی نے کچھ بات کرنا چاہی۔ لیکن وہ آنکھیں موندے چپ چاپ لیٹا رہا اور اپنے ممی ڈیڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر وہ اتنے بڑے ہو کر بھی یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کا بچہ کیا چاہتا ہے، کس بات سے خوش ہوتا ہے، کس بات سے ناراض ہوتا ہے دونوں اس پر الگ الگ حکم چلاتے ہیں اور اسے اس طرح سزا دیتے ہیں جیسے وہ ان کا بیٹا نہ ہو، دشمن ہو۔ دونوں کی لڑائی ہے تو اس کا کیا قصور ہے؟ اس نے تو نہیں کہا تھا لڑنے کو ــ پھر اس کو سزا کیوں مل رہی ہے؟ وہ بھی تو اب بڑا ہو چکا ہے اور وہ بھی ان کو سزا دے سکتا ہے۔"

ان دنوں بلو کا دماغ الٹے سیدھے خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا۔ پڑھائی میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اسکول جاتا تو ٹیچر کی ڈانٹ کھاتا۔ گھر پر ٹیوٹر کی ناراضگی سہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ ڈیڈی کی بیماری کے بعد سے اس کا جھکاؤ ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور یہ حال دیکھ کر ممی خاصی پریشان رہتی تھیں۔ کئی بار وہ اس سے پوچھ چکی تھیں۔ "بلو، تم ہمیں چھوڑ کر اپنے ڈیڈی کے پاس تو نہیں چلے جاؤ گے؟"

وہ انہیں ستانے کے لئے کہتا "پھر کیا ہوا؟ وہ میرے ڈیڈی ہیں اور مجھ سے پیار بھی بہت کرتے ہیں۔"

"کیا میں تم سے پیار نہیں کرتی؟" نومی گھبرا کر پوچھتی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگتا۔

اتوار کا دن تھا۔ نومی اس روز بلو کو صبح سویرے نہیں جگاتی تھی۔ ایک ہی تو دن ملتا تھا غریب کو چین سے سونے کے لئے مگر اس صبح نومی کی آنکھ کھلی تو بلو اپنے بستر سے غائب تھا۔ اس نے سوچا کہ آیا کے پاس ہوگا اتنے میں ہی آیا آگئی اور بلو کے خالی بستر پر نظر ڈال کر بولی۔ "بابا کہاں ہے، میم صاحب؟"

"تمہارے پاس نہیں گیا؟"

"نہیں جی ــ میں تو کچن میں ناشتہ بنا رہی تھی۔

"باہر کھیل رہا ہوگا۔ جا کر بلا لاؤ۔"

آیا نے اندر باہر، پڑوس میں ہر جگہ بلو کو دیکھا، لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ ایک بار پھر نومی نے آیا کو ساتھ لے کر بلو کو تلاش کیا۔ چوراہے پر دو تین دکان داروں سے پوچھا جو بلو کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ لیکن انہوں نے بھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ تھک ہار کر نومی پورٹیکو کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر رونے لگی۔ آیا نے سلمان کو فون کر کے بلو کے کھو جانے کی اطلاع دی۔ سلمان اسی وقت بھاگے ہوئے آئے۔ نومی رات کے لباس میں سیڑھیوں پر بیٹھی، گھٹنوں پر سر رکھے رو رہی تھی۔

"یہ لٹی لٹی سی، شکست خوردہ عورت نومی تو نہیں لگتی۔ کہاں وہ انا، وہ ضد، اپنی شخصیت کے اظہار کی کاوشوں میں سرگرداں، اپنے وجود کی شناخت پر مصر نومی۔ اور کہاں یہ عورت جو صرف ایک ماں نظر آرہی ہے۔ اپنے اکلوتے بچے کی گم شدگی نے جس سے ہر احساس چھین لیا ہے۔"

سلمان کے دل میں نومی کے لئے ہمدردی اور محبت کا سوتا ابلنے لگا۔ یہ سوتا برسوں سے حالات کی گرد اور خودداری کی دبیز تہہ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اپنی پوری مردانہ قوت اور وقار کو بروئے کار لا کر انہوں نے اپنے دل کے سارے لطیف جذبوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ سارے جذبے، نرم اور نم مٹی میں دبے ہوئے بیجوں کے مانند برسوں سے پیار کی پھوار کے منتظر تھے۔ آبیاری ہوتے ہی ان میں کلے پھوٹنے لگے اور سلمان نے بڑھ کر نومی کی پشت پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

"نومی!"

صدیوں کی مسافت طے کرتی ہوئی یہ آواز نومی کی سماعت سے ٹکرائی نہ یہ آواز نئی تھی اور نہ یہ لمس اجنبی تھا۔ نومی نے تڑپ کر سلمان کو دیکھا۔ کیا کچھ نہ تھا اس کی نظروں میں دکھ، تاسف شکوے، ملامت اور احتجاج ــ برسوں سے وہ اپنے اپنے طور پر الگ الگ زندگی گزار رہے تھے۔ بس ایک بلو کی ذات تھی جس کی وجہ سے ان میں ایک برائے نام سا تعلق باقی تھا، ورنہ ان کے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں رہا تھا جسے تعلق اور رشتے کا نام دیا جا سکتا۔ ان کے دکھ سکھ، مسائل، مصروفیات، مشغلے، دوست، دشمن، کچھ بھی تو مشترک نہیں تھے۔ بلو کے سوا سب کچھ الگ تھا اور اب بلو بھی ــ بلو بھی۔

نومی بلک بلک کر رونے لگی۔ سلمان کے ہاتھ کا دباؤ جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ اور بڑھ گیا۔

"نومی! اس طرح رو رو کر ہلکان نہ ہو۔ خدا نے چاہا تو ہمارے بلو کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ جلد ہی ہم سے ملے گا۔ اوپر والا اتنا بے رحم نہیں ہے نومی کہ وہ ہماری خوشیوں کا واحد سہارا بھی ہم سے چھین لے۔ ہمت سے کام لو۔"

"خود ہم نے بلو کا کب خیال کیا جو اوپر والے سے شکوہ کریں۔"

"ناامیدی کی باتیں نہ کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سلمان نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ اسی طرح اب تک ہوتا آیا ہے؟ کیا بلو کی خاطر ہم اپنی انا اور ضد کی قربانی نہیں دے سکتے تھے؟ کچھ میں جھکتی، کچھ آپ درگذر سے کام لیتے۔ کبھی میں آپ کی خواہش کا احترام کرتی، کبھی آپ میرے شوق کی با   کرتے۔ لیکن ہم نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ سوچا بھی تو صرف اپنے لئے۔ بلو کے اچھے بُرے کا ہم نے کبھی خیال نہیں کیا۔ خیال آیا تو بس یہی کہ ہماری بات اونچی رہے۔ اور ہم نے یہی سب کیا بھی۔ بجائے اس کے کہ ہم دونوں مل کر اس کا خیال کرتے، ہم اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے رہے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ اپنا حق جتانے کی کوشش کرتے ہوئے ہم بالکل بھول گئے کہ وہ ہمارا بچہ ہے، ہم دونوں کا مشترکہ اثاثہ ہے کوئی بانٹنے یا تقسیم کرنے والی چیز نہیں ہے۔ اب وہ ہم دونوں کی کھینچا تانی سے بے نیاز ہو گیا ہے تو ہم اس کے لئے پریشان ہو رہے ہیں۔ آج تک اسے ہم ہتھیار کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہے اور ہم نے ایک پل کے لئے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ اب سمجھدار ہو رہا ہے، ہمارے رویّے سے اس کا معصوم ذہن متاثر ہو رہا ہے۔۔۔"

"نومی۔۔ نومی پلیز! میری سنو، تم نے تو اس حقیقت کو آج تسلیم کیا ہے، لیکن میں عرصے سے اسی نہج پر سوچ رہا ہوں۔ تم سے اس لئے کچھ نہ کہا کہ تم ہمیشہ کی طرح میری بات ٹھکرا دوگی۔"

"سلمان، میں تو ہر لمحے منتظر رہی کہ آپ ہم سے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہیں، ہم پر اپنا حق جتائیں، ہم پر زبردستی کریں، لیکن ہمیں تنہا نہ چھوڑیں۔"

"نومی، میں تم دونوں کے بغیر ٹوٹ گیا ہوں، بکھر گیا ہوں۔ میں بیمار رہا، لیکن تم مجھے دیکھنے تک نہ آئیں۔ اتنی بیزاری سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔"

"اگر آپ خود سے مجھے آنے کے لئے کہہ دیتے تو آپ کی خودداری کو ٹھیس لگ جاتی۔ آپ تو مجھے قصوروار سمجھتے تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ میں ہی جھکوں، تاکہ آپ ساری زندگی مجھے میری کم ظرفی کا طعنہ دیتے رہیں، مجھے مجرم گردانتے رہیں۔"

"نہیں نہیں نومی، تم غلط سوچ رہی ہو۔ مجھے اپنی غلطیوں کا ہر پل احساس رہا ہے۔ مجھے معاف کر دو، نومی۔ آؤ اب ہم مل کر اپنے بیٹے کو تلاش کریں۔"

دونوں نے ایک بار پھر ہر جگہ بلو کو تلاش کیا۔ ناامید ہو کر سلمان نے پولیس میں رپورٹ درج کرا دی اور تھک ہار کر بیٹھ رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو نومی تڑپ اٹھی۔ بلو اب تک لاپتہ تھا۔ سلمان اسے بہلانے کی خاطر لان میں لے آئے۔ گھومتے پھرتے وہ بنگلے کے عقبی حصے میں جا پہنچے۔ اس طرف سرونٹ کوارٹرز بنے تھے جو سب خالی تھے۔ نومی کے والدین کے وقت میں یہاں نوکروں کی فوج رہتی تھی۔ اب صرف آیا تھی۔ وہ بلو کی وجہ سے بنگلے کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔

اچانک سلمان کی نظر ایک کوارٹر کے دروازے پر پڑی۔ اس پر ایک سفید چوکور کاغذ چپکا ہوا تھا، جس پر رنگین پنسلوں سے انگریزی میں لکھا تھا: "ندیم سلمان۔ کلاس III" بلو کا اسکول میں یہی نام تھا۔ بلو تو وہ پیار سے کہتے تھے۔

سلمان نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ سامنے ہی کھٹیا پر بلو سو رہا تھا۔ سلمان نے نومی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا کہ کہیں اس کی چیخ سے وہ ڈر نہ جائے۔ پھر وہ آہستہ سے اندر داخل ہوئے۔ سامنے دیوار میں بنی ہوئی الماری میں بلو کے کچھ کپڑے، کتابیں اور بسکٹ کے بنڈل اور کھیل سلیقے سے الگ الگ خانوں میں سجے ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے جان بوجھ کر خود کو گم کر دیا تھا۔

سلمان نے دھیرے سے اس کو آواز دی اور پیار سے اس کا سر سہلانے لگے۔ بلو نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ممی ڈیڈی کو حیران پریشان دیکھ کر اس کے پتلے پتلے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ڈیڈی کا فکرمند چہرہ اور ممی کی روتی روتی آنکھیں دیکھ کر اس کے دل میں ہنسی کے ننھے ننھے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔ بظاہر اس نے ان کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور متانت سے بولا۔

"ممی، ڈیڈی آپ نے میرا گھر دیکھا؟ ابھی تو چھوٹا سا ہے۔ بڑا ہو کر میں خوب بڑا سا گھر بنواؤں گا اور اپنی کار میں بیٹھ کر آپ دونوں سے ملنے آیا کروں گا جیسے — جیسے ڈیڈی آتے ہیں۔"

"بدمعاش! ہمیں سبق سکھا رہا ہے!"

سلمان نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ نومی بھی اس کی پشت سے لپٹ کر رونے لگی۔ سلمان بلو کو گود میں اٹھائے اور ایک ہاتھ سے بےحال نومی کو سہارا دئے گھر میں آئے۔ بلو کو بستر پر بٹھا کر اس سے جڑ کر خود بھی بیٹھ گئے اور اس کو پیار کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولے: "بلو بیٹے! اب ہم سب لوگ ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہیں گے۔ تیسرے گھر کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے جانِ پدر۔"

"سچ مچ؟" بلو نے نومی سے پوچھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور بلو ممی سے لپٹ گیا۔ اس نے تو ممی اور ڈیڈی دونوں کو سزا دینے کے لئے اپنا الگ گھر بنا لیا تھا۔۔۔ تیسرا گھر۔

●●

اَللّٰھُمَّ لَبَّیک

اے میرے آقا
اے میرے مالک
نہیں ہے کوئی شریک تیرا
زمیں تری آسمان تیرا
اور ان میں جو کچھ ہے سب ہے تیرا
نہیں ہے کوئی شریک تیرا
رحیم تو ہے کریم تو ہے فہیم تو ہے نعیم تو ہے
نہیں ہے تیرا کوئی بھی ثانی
اے میرے آقا
میں آج حاضر ہوں، میرے مولیٰ
میں آ گیا ہوں اے میرے مالک
بہت سے بے کس نہ آسکے ہیں
طلب ہے تیری دلوں میں جن کے
انہیں بھی توفیق دینا اتنی
کہ وہ بھی آئیں
اور اپنے ماتھے سے خاکِ طیبہ آ کے چومیں
اے میرے مولیٰ
تو میرے دشمن کو دوست کو بھی
قریب کو بھی اور دور کو بھی
شہر پہ موقوف کیا ہے کہ
باشندگانِ ہند کو بھی
تو اپنی حفظ و اماں میں رکھیو
دعائیں سب کی قبول کیجو
اے میرے آقا و میرے مولیٰ
میں لوٹ کر جب وطن میں پہنچوں
وہاں پہ امن و امان پاؤں
نہ فرقہ وارانہ جنگ پاؤں
نہ قتلِ تہذیب ہوتے دیکھوں
اے میرے آقا
اے میرے مولیٰ
نہیں ہے کوئی شریک تیرا
تو اپنے پیارے نبیؐ کے صدقے
مری دعائیں قبول کیجو!!!

رئیس الدین رئیس

نعتِ پاک

انجم میناٸی

اُس ایک شب کا سفر کیا سفر رہا ہو گا
بہت طویل مگر مختصر رہا ہو گا

فرشتہ آپؐ کے جو ہم سفر رہا ہوگا
وہ فخر اپنے مقدر پہ کر رہا ہوگا

طنابیں ارض و سما کی کھنچی رہی ہوں گی
کہ وقت اپنی جگہ پر ٹھہر رہا ہوگا

کہ خیر مقدمِ سردارِ انبیاء کے لیے
دقیقہ کیا کوئی صرفِ نظر رہا ہوگا

رُخِ حجاب سے جب پردے اٹھ گئے ہونگے
تمام عرش پہ جلوہ بکھر رہا ہوگا

جہاں خیالِ بشر بھی نہ جا سکے لیکن
وہاں بہ نفسِ نفیس اِک بشر رہا ہوگا

مراجعت پہ جدائی کا کچھ اثر انجم
اِدھر تو ہوگا اُدھر بھی مگر رہا ہوگا

نئے زمانے کی نانی اماں

قاضی مشتاق احمد

جب نانی اماں پہلی بار گھر آئیں تو سب ہی بچوں کو بہت خوشی ہوئی۔ نانی اماں اپنے گاؤں والے گھر سے کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں لیکن ڈاکٹر نے ان سے بمبئی جا کر علاج کرانے کے لئے کہا تو وہ بڑی مشکل سے داماد کے گھر آنے پر راضی ہوئیں۔ رضیہ چھٹیوں میں اکثر اپنے بچوں کے ساتھ گاؤں جاتی تھی، لیکن اب بچے بڑے ہو گئے تھے اور گاؤں کی دھول بھری گلیوں میں جانے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے اور انہیں بمبئی جیسے شہر میں اکیلے چھوڑ کر جانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے رضیہ کبھی نہیں جا سکتی تھی، ورنہ اسے اپنے گاؤں، وہاں کے آم کے باغات اور اپنا قلعہ نما گھر بہت پسند تھا۔ بچے وہاں کی ہر بات میں عیب نکالتے تھے "ممی، آپ کا مکان تو بھوتوں کی حویلی نظر آتا ہے" (بچپن میں وہ انہیں کسی راجہ کا راج محل نظر آتا تھا۔)

"ممی، آپ کے باغ کے آموں سے رتناگیری کے ہاپوس اچھے ہیں۔ بمبئی میں ہی مل جاتے ہیں" (بچپن میں آم کھانے کا لالچ انہیں گاؤں لے جانے کے لئے کافی تھا۔ بچپن میں آم کھا کر اپنے کپڑے خراب کرنے والی شمیم اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے کہتی "آئی ہیٹ دز آم بابا! آئی لائک دا سیبری" موٹو اسلم کہتا: "آئی ایم آن ڈائٹ — آم کیسے کھائے گا؟" لیکن چھوٹا کلیم ضرور کہتا: "آئی لائک مائی گرانڈ ما یار!")

نانی اماں کے بارے میں بچوں میں بڑا اختلاف تھا۔ شمیم کا کہنا تھا کہ نانی کے کپڑے آؤٹ ڈیٹیڈ ہیں۔ انہیں دوسری نانیوں کی طرح کپڑے پہننے چاہئیں۔ موٹو اسلم کا خیال تھا کہ نانی اماں فلم "جنون" میں عصمت چغتائی کی طرح نظر آتی ہیں، جنہوں نے فلم میں جینفر کی ماں کا رول ادا کیا تھا۔

چھوٹے کلیم کی رائے تھی "شی از اے بیوٹی فل اولڈ لیڈی۔"

"بٹ — اگر وہ اپنے سفید بال کالے کرا لیں" شمیم رائے دیتی۔

"نو — ان کے سفید بالوں میں چارم ہے" کلیم اڑا رہتا۔

نانی اماں نے آتے ہی سب سے پہلے اپنی

بیٹی کو لتاڑا! "اے لو بی بی! یہ سر کے بال کیوں کٹوا لئے؟ تمہاری بال تو بڑے گھنے تھے۔"

"بمبئی میں گرمی بہت ہوتی ہے، اماں!"

"تو بی بی، بال کٹوا لیوں لئے، منڈوا لیتیں۔"

پھر وہ پان کھا کر بولیں "اور یہ پان کھائے بغیر تمہارے ہونٹ کیسے سُرخ ہوگئے؟"

"لپ اسٹک لگائی ہے۔"

"کیا لگائی ہے؟"

"دوا!" بیٹی نے اُکتا کر کہا۔

"ہونٹوں کی بیماری ہوگئی ہے کیا؟ بالائی لگا لیتیں۔"

"بیماری نہیں ہوئی اماں! فیشن ہے۔"

"اور تمہارا وہ برقع کیا ہوا؟"

"صندوق میں رکھ دیا ہے۔"

داماد کبھی کب چپ رہنے والے تھے، فوراً نانی کو سپھر کا یا "میں تو ہمیشہ کہتا ہوں، کبھی برقع پہنو ——— یہ تو اب میری بات کبھی نہیں مانتی۔"

"رجّو، کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ اپنے مجازی خدا کا بھی حکم نہیں مانتیں؟"

رضیہ پاؤں پٹختی باہر چلی جاتیں ——— داماد ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔

جب بات کرنے کے لئے کوئی اور نہ ملتا تو نانی نوکرانی کو پکڑ لیتیں ——— بمبئی کی نوکرانیاں آنے سے پہلے ہی جانے کی تیاری شروع کر دیتی ہیں۔ ایک دن اس نے رضیہ سے صاف کہہ دیا: "ہمارا تنخواہ ڈبل کر دو، بائی صاحب! ایک گھنٹہ تمہاری ماں کا بڑبڑ سننے کا چارج الگ دینا پڑے گا۔"

جب داماد آفس جانے کی جلدی میں ہوتے تو نانی اماں فرماتیں: "امجد میاں وہ تمہارا دوست کیا ہوا جو تمہاری شادی میں آیا تھا؟"

"کون سا دوست، اماں؟"

"وہی گورا گورا سا، سفید قمیص والا۔"

"پتہ نہیں کہاں ہوگا۔"

"اپنے دوستوں کی بھی خبر نہیں رکھتے میاں؟"

"ہمیں تو اب اپنی بھی خبر نہیں رہتی، اماں۔ صبح اٹھو، تو بج کر دس منٹ کی لوکل پکڑو اور شام چھ بج کر ۲۲ کی لوکل سے واپس آؤ ——— ہم تو مشین بن گئے ہیں آدمی سے۔"

"سُنا ہے امریکہ والوں نے مشین کا آدمی بنایا ہے۔"

"سُنا تو ہم نے بھی ہے اماں، لیکن دیکھا نہیں۔"

"اور وہ چاند پر جا کر واپس آنے کا قصہ؟"

"سُنائیں گے اتوار کے دن۔"

"میاں یہ سب شیطانی چکر ہے ——— میں کہتی ہوں ......"

"خدا حافظ اماں! دو منٹ دیر ہوگئی۔" وہ جلدی میں چلے جاتے۔

"اے رجّو، ذرا سُنو تو! بہتیرے آدمی کے پیر میں کیسا چکر ہے؟ بات تک سننے کے لئے تیار نہیں۔"

"انہیں ٹرین سے دفتر جانا ہوتا ہے اماں"

"ارے تو اپنے باپ کا دبدبہ بھول گئی ——— بس والا ان کی سواری کے آنے تک بس روکے رکھتا تھا۔"

"وہ زمانہ لد گیا اماں۔"

"خدا کی مار پڑے اس زمانے پر ———"

شمیم سامنے نظر آتی تو نانی اماں آواز دیتیں "اے شمّو بابا! ادھر آؤ۔"

"نانی، اب میں بابا نہیں رہی۔"

"میرے لئے تو بابا ہی رہے گی ——— موئی تازی ——— آموں سے کپڑے خراب کرنے والی ——— جانتی ہے تو گاؤں آئی تھی تو بچپن میں ہی تیرے بالوں کو شکاکائی سے دھویا تھا میں نے ——— کتنی روئی تھی ——— اور اب تو تُو نے بال ہی کٹوا دئے۔"

"نانی، میری سہیلی آنے والی ہے ——— ذرا اس سے ٹھیک طرح بات کرنا۔"

"تو کیا میں غلط طرح بات بھی کرتی ہوں ——— اے لو جی! بیٹی، زندگی کٹ گئی ہے۔ باتیں کرنے میں ——— محلّے کی عورتیں کیوں جمع ہو جاتی ہیں ہمارے پاس کہتی ہیں کہ بُوا جب بولتی ہیں تو مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔"

"اوہو!" شمیم سر پکڑ لیتی "ابھی آئی نانی۔" کہہ کر بھاگ جاتی۔

موٹو اسلم اس تاک میں رہتا تھا کہ نانی بستر پر لیٹ جائیں تو وہ ان کے دروازے کے سامنے سے گزرے، لیکن نانی بھی تاک میں رہتیں۔ وہ دبے پاؤں وہاں سے گزرتا تو وہ آواز دیتیں "منّا! ادھر آؤ۔"

"نانی اماں! اب میں منّا کہاں ہوں؟"

"تو کیا جوان ہوگئے ہو، میاں؟ ڈاڑھی مونچھ نکل آئی ہیں؟"

"نکل آنے والی ہے" نانی اماں۔"

"میں تو پھر بھی منّا ہی کہوں گی ——— ڈاڑھی مونچھ والا منّا۔" پھر وہ ہنستیں "منّا! تم موٹے بہت ہو۔"

"ڈائٹ کر رہا ہوں۔"

"کیا کر رہے ہو؟"

"ڈائٹنگ ——— ڈائٹ۔" ——— جب کوئی اور لفظ اسے یاد نہ آتا تو کہتا "روزہ رکھ رہا ہوں نانی۔"

"یہ کوئی روزوں کا مہینہ ہے میاں؟"

"وزن کم کرنے کے لئے روزہ رکھنا پڑتا ہے۔"

"بے وقوف ہو میاں! تمہارے نانا تو تم سے ڈبل تھے بچپن میں۔"

"نانی! میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ بھاگ جاتا۔

پھر شامت رضیہ کی آتی:

"دن بھر کیا کرتی ہو بی بی باورچی خانے میں؟"

"سارے کام مجھ کو کرنے پڑتے ہیں امّی۔"

"ہائے! تو کوئی ماما رکھ لو۔"

"یہ بمبئی ہے۔ یہاں ماماں کہاں؟"

"تو پھر اور کیا ہوتے ہیں یہاں؟"

"ہوٹل ——— لوگ ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں ———"

"لعنت بھیجو بی بی! ان ہوٹلوں میں، جہاں حرام، حلال کے گوشت کی تمیز نہیں؟"

ادھر اسلم ٹی۔ وی کھول دیتا شور و غل سن کر نانی پریشان ہو جاتیں "رضیہ، اپنے گھر میں ہی سینما اٹھا لائیں؟ خدا کو کیا جواب دو گی؟"

"کہوں گی، تیرے انسان نے ہی یہ آلہ بنایا ہے، اسی لئے گھر میں لگا لیا ہے ——— اور پھر عربستان سے منگوایا ہے۔"

"ہاں، پھر حرج نہیں۔" نانی فتویٰ دیتیں "ان کم بخت انگریزوں کی چیزوں سے بچو ——— میں کہوں بی بی ....."

"اُف گیس بند کرنا بھول گئی۔" رضیہ بھاگ جاتیں اور نانی کا لانگ پلیئنگ ریکارڈ شروع ہو جاتا "اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ سگی بیٹی بھی بات کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مزدور رکھنے پڑیں گے اب باتیں سنانے کے لئے۔"

شام کو داماد تھک ہار کر واپس آتے تو نانی انہیں آواز دے کر بلا لیتیں "اے میاں! کیا اس مرغِ مسلّم کا مزہ بھول گئے جو میں نے تمہاری پہلی دعوت میں بنایا تھا؟"

"وہ بھی کوئی بھول سکتا ہے امّی! اس کا مزہ تو آج بھی مچل رہا ہے ہونٹوں پر۔"

"میاں کیا زمانہ تھا وہ! لوگ انگلیاں چاٹ لیتے تھے ہمارا پکایا ہوا کھا کر ——— اڑہر کی دال پکانے میں تو میرا کمال تھا ——— ایک بار رضیہ کے ابا کے ایک دوست آئے۔ اڑہر کی دال چکھی تو جانتے ہو کیا بولے ——— کہنے لگے، کیا من و سلویٰ اسی کا نام ہے؟ میاں تمہارے خسر تو بس ....."

داماد کے دل میں آیا کہ کہیں "امّی! اب بس بھی کرو۔" لیکن یہ بات ان کے بس سے باہر تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ اوٹ پٹانگ باتیں سن لیتے، پھر تھک ہار کر کہتے "ابھی دفتر سے آیا ہوں ذرا منہ ہاتھ دھو کر سستا لوں۔"

"میاں، یہ بھی کوئی سستانے کا وقت ہے؟ مغرب کے بعد سونا اچھی بات نہیں۔"

امن

- امن کی فتح جنگی فتوحات سے کم نہیں ہے۔ (ملٹن)
- اگر امن باعزت نہیں تو وہ امن نہیں کہلا سکتا۔ (برٹرینڈ)
- اونچی قیمت پر تو امن بھی خریدا جا سکتا ہے۔ (فرینکلن)
- قیام امن کی خاطر جنگ کے لئے تیار رہنا بڑا ہی کار آمد حربہ ہے۔ (جارج واشنگٹن)
- انسانی امن کی پرکھ سماج میں ہی ہو سکتی ہے، ہمالہ کی چوٹی پر نہیں۔ (گاندھی جی)
- امن کے تصور میں رہنا جب کہ جنگ لازم ہو، یقینی طور پر امن کو ختم کرنا ہے۔ (ویدویاس)
- جب تک ایک انسان دوسرے انسان کی پیٹھ پر سوار ہے، اس وقت تک دنیا میں امن و اماں محض ایک خوب صورت خواب رہے گا۔ (ٹیگور)

"سونا نہیں، بس آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا ہوں۔" اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر اٹھ جاتے۔

اسی رات انہوں نے بیگم سے کہا "رضیہ معاف کرنا اگر تمہاری اماں چند ہفتے اور رکیں تو مجھے بلڈ پریشر کا مرض ہو جائے گا۔"

"میری حرکتِ قلب خود تیز ہو گئی ہے ——— اللہ بچائے امّی سے۔"

"اپنے بھائی کو خط لکھ کر بلا لو کہ امّی کا علاج ہو چکا، انہیں واپس لے جائیں۔"

"خط نہیں تار دے دیں گے۔"

"وہ لوگ گھبرا جائیں گے۔" داماد نے کہا "فی الحال خط ہی لکھ دو ——— "

خط پہنچتے ہی رضیہ کا بھائی نانی کو لینے آگیا۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ کھل اٹھیں اور اس کے کان میں کہا "اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں اس گھر کا پانی تک نہ پیتی ——— بیٹا، رضیہ نے تو گھر کو کفرستان بنا دیا ہے۔ خود کے اور بچی کے بال منڈواتے ہیں۔ گھر میں سینما لگا دیا ہے۔ یہاں تو دن پہاڑ سے ہو گئے تھے۔ کٹتے کٹتے نہ کٹتے ——— نہ کوئی بات کرنے والا، نہ کوئی سننے والا ——— اور ہاں، بہو کیسی ہے؟"

"اچھی ہیں۔" بیٹے نے مری ہوئی آواز میں کہا، کیونکہ اس کے کانوں میں اس کی بیوی کے جملے گونج رہے تھے: "جیسے تمہاری امّی رضیہ باجی کے گھر گئی ہیں، گھر میں سکون ہی سکون ہے، ورنہ ان کی باتیں ——— خدا بچائے! ہو سکے تو کچھ دن اور ٹال دو۔"

اور ادھر نانی کہہ رہی تھیں "میاں کہاں کھو گئے؟ چلو پہلی گاڑی سے۔"

"جی ....."

جب نانی ٹیکسی میں بیٹھ کر جانے لگیں تو رضیہ نے رسمی طور پر کہا "امّی، آپ چلی جائیں گی تو مجھے اکیلے اکیلے بڑی بوریت ہو گی ——— اب آپ واپس کب آئیں گی؟"

نانی نے تو کچھ جواب نہیں دیا، لیکن نجانے رضیہ کو اس طرح گھورنے لگیں جیسے انہوں نے کوئی غلط حرکت کر دی ہو۔

نانی اماں کی دعاؤں کا ریلا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ اور اسی لمحہ رضیہ کو احساس ہوا کہ اماں کی وجہ سے اس گھر میں زندگی تو تھی۔ ان کے جانے سے گھر بے روح سا ہو کر رہ جائے گا۔ ان کی آواز جس پر کوئی کان نہ دھرتا تھا، سب کو تھوڑی بہت دیر کے لئے باندھے رکھتی تھی۔ اب گھر میں سکون نہیں صرف سناٹا ہو گا۔

عجیب بات یہ تھی کہ بچوں کے دلوں کی بھی یہی کیفیت ہو رہی تھی۔ سب ہی سوچ رہے تھے کہ نانی اماں کی آواز کے دور ہو جانے سے یہ گھر خاموشی کا صحرا بن جائے گا جس میں ہر فرد صرف اپنی اپنی دیوانہ وار بھاگ دوڑ میں گم رہے گا ——— الوداع سوئیٹ نانی اماں! ○○

نزہت ضیاء، بلاسپور
شرار برق گرے لاکھ آندھیاں آئیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں
ساحر لدھیانوی

صبیحہ مجیب، الہ آباد
یہاں ہیں درد مگر طاقت کلام نہیں
یہ وہ چمن ہے جہاں کوئی انتظام نہیں
چکبست

مس رضوانہ پروین، گنگیل (کرناٹک)
عشق کا کھیل جدائی کے لئے ہوتا ہے
حوصلے عمر کے یوں ہی بہائے ہوئے لگتے ہیں
منور رانا

امتیاز احمد انصاری، آسنسول
مری مفلسی سے بچ کر کہیں دور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں
نامعلوم

سید مرزا اختر، بھاگلپور
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
نامعلوم

بشریٰ محمد صدیقی، اورنگ آباد
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
علامہ اقبال

رضیہ سلطانہ جلیلی، کھمم
قسمت ہماری گیسوئے جاناں سے کم نہیں
جتنا سنوارتے رہے اتنے ہی بل پڑے
نامعلوم

رخسانہ، علی گڑھ
تمنا، آرزو، چاہت، امید وصل اور حسرت
یہ لاشے رکھ کے لے جا تیری کنار نہیں جلتے
بہادر شاہ ظفر

کنیز فاطمہ، حیدر آباد
سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے
منور رانا

نصیر الدین، سدی پیٹھ
تیری نظروں کو محبت کی تمنا نہ سہی
تیری نظریں مری ہمراز تو بن سکتی ہیں
نامعلوم

نطیر سہروردی گیورائی، بیڑ
جہاں انسان بستے ہیں وہاں لغزش بھی ہوتی ہے
فرشتوں کی نہیں صاحب یہ انسانوں کی باتیں ہیں
عدم

حوریہ صدیقہ، حیدر آباد
آنسو چھلک چھلک کے ستائیں گے رات بھر
موتی پلک پلک میں پرو دیا کریں گے ہم
قتیل شفائی

امتیاز احمد انصاری، آسنسول
دیکھو مری نگاہ میں حسرت ہے آج بھی
محسوس کر کے دیکھو کہ تم سے محبت ہے آج بھی
نامعلوم

شکور صدیقی، شاہین، حیدر آباد
تڑپ کے شان کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں
نامعلوم

محمد عبد الرؤف اعظمی، نظام آباد
وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے
حامد عزیز

قمر رئیس قمر، بہرائچ
مرے پاس سے جو گزرے مرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ دور جا کے روئے
نامعلوم

اظہر سعید سہروردی، گیورائی
ہے سفر سب کا اندھیروں سے اندھیروں کی طرف
روشنی ہو کہ نہ ہو راستے سنسان نہیں
بشیر نواز

محمد مجیب علی جاوید، حیدر آباد
توڑ کر پیار کا رشتہ وہ گئے ہیں لیکن
کوئی لمحہ نہ انہیں مجھ سے بچھڑنے دے گا
نامعلوم

رفعت حسین، گیا
بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اسے بھی غم نہیں ہوتا مجھے بھی غم نہیں ہوتا
بشیر بدر

محمد عابد علی، نرمل
رخصت کے واقعات کا اتنا تو ہوش ہے
دیکھا کئے ہم ان کو جہاں تک نظر گئی
غالب

مس شگفتہ فردوس، بلاسپور
وہ دنیا تھی جہاں تم روک دیتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری
نامعلوم

فردوس، اندولہ
کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں
نامعلوم

اسد اللہ انصاری، علی گڑھ
سنگ مرمر کا بنایا تم نے میرا مقبرہ
بعد مرنے کے بھی قسمت میں مرے پتھر ہی تھے
نامعلوم

زاہدہ فاطمہ، آمبور
ان لبوں نے دی ہے جینے کی دعا جب بھی مجھے
زندگی کا جانے کیوں چہرہ اتر کر رہ گیا
فاروق شمیم

محمد سمیع اللہ خان ناز، بیدر (کرناٹک)
جل جاؤ خموشی سے کڑی دھوپ میں لیکن
اپنوں سے کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو
نامعلوم

محمد سعید بنیڈیل، ورنگل
سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
نامعلوم

محمد اظہر الدین، محبوب نگر
ذرا بھی جس کی وفا کا یقین آیا ہے
قسم خدا کی اسی سے فریب کھایا ہے
شمیم کرہانی

ستیدہ شاکرہ جبیں، کرنول
دل زار کس کی خاطر یوں تڑپ اٹھا اچانک
ترا کون ہے جہاں میں تجھے کس کی یاد آئی
نامعلوم

محمد ریاض الدین، جلگاؤں
حیا سے حسن کی قیمت دوچند ہوتی ہے
نہ ہو جو آب تو موتی کی آبرو کیا ہے
جلیل

رحیم النساء بخشی، بلگام (کرناٹک)
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
فیض احمد فیض

نزہت نبیلہ، مونگیر
کوئی خود بھی کہیں رسوائی کو کرتا ہے قبول
تم نے دیوانہ بنایا ہے تو دیوانہ بنے
احسان دانش

سید ریاض احمد، کھولک پور
ادھر سے چاند ہم دیکھیں ادھر سے چاند تم دیکھو
نگاہیں جوں ہی ٹکرائیں ہماری عید ہو جائے
اصغر گونڈوی

شبنم ادا حمزہ، دہلی
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
علامہ اقبال

سید حامد علی، مہو
اچھا ہے سنبھل کر ہی انسان چلے ورنہ
آکاش کی کوشش میں دھرتی بھی گنوا دے گا
حسرت

سہیل احمد، علی گڑھ
یزداں نے مسکرا کے بڑی دیر میں لکھا
اک حرف آرزو مرے دل کی کتاب میں
ساغر صدیقی

الیس شاداب احمد غازی، آمبور
ستم ہے اس کو بنایا ہے رازداں ہم نے
جو راز کہتا پھرے سب سے داستاں کی طرح
نامعلوم

رضیہ سلطانہ جلیلی، کھمم
خوشبو کی سرد لہر سے جلنے لگے جو زخم
پھولوں کو اپنا بند قبا کھولنا پڑا
نامعلوم

ملکہ بانو، نندربار (دھولیا)
اور کچھ چاہتی نہیں فطرت
آدمی صرف آدمی ہو جائے
نامعلوم

عطاء اللہ خاں، برہانپور
وعدے کا ذکر، وصل کا ارماں، وفا کا قول
یہ سب فریب ہیں دل شیدا کے واسطے
بیخود دہلوی

تری آرزو کے بدلے ملے داغ حسرتوں کے
مجھے کیا پتہ تھا دل پہ مرا اختیار کم ہے
نامعلوم

نوٹ: اشعار کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھئے
اپنے اشعار اس پتے پر لکھئے: "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ "بانو"۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

چھناک کی آواز کے ساتھ ہی آئینہ ٹوٹ کر فرش پر بکھر گیا اور آئینے کی کرچیاں جیسے اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئیں۔ دل کا درد کرب بن کر چہرے پر چھا گیا اور وہ اپنا سانولا چہرہ ہتھیلیوں کی کٹوریوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ایسے وقت میں گھر کے سب ہی افراد اسے تنہا چھوڑ دیتے تاکہ وہ اپنے غم کے احساس کو خود ہی مٹا سکے۔
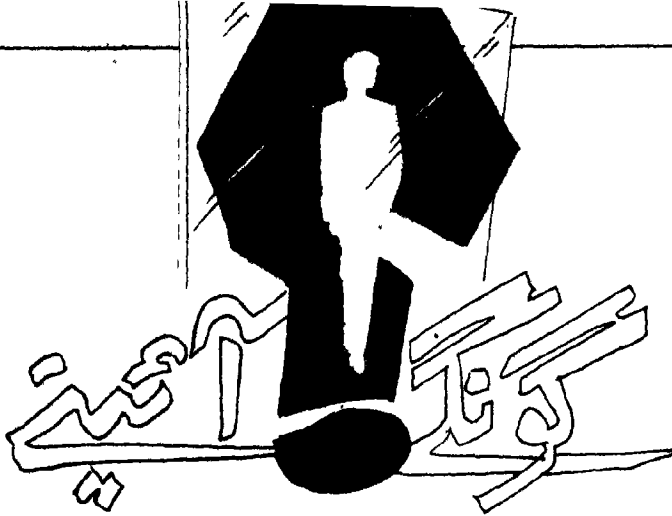
یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا کہ وہ اس درد کے صحرا سے نہ گزری ہو اس کے احساس کے نازک آبگینے کئی بار ٹوٹ چکے تھے۔ اکثر جگہوں سے اس کے لئے پیامات آتے رہے اور اکثر اوقات لوگ اسے دیکھنے آیا کئے۔ ہر بار اسے سجا سنوار کر خوب صورت ریشمی ملبوسات میں اس کے وجود کو سمیٹ کر کسی شوکیس میں سجی بے جان مورتی کی طرح مختلف انداز میں اور مختلف زاویوں میں دکھایا گیا لیکن ہر بار نتیجہ ایک ہی رہا۔ کبھی کسی نے

ان کے بالوں پر اعتراض تراشا تو کبھی کسی نے ان کے سانولے رنگ کو اپنی ناپسندیدگی کا سبب قرار دیا اور جب ان باتوں کی بھنک اس کے کانوں میں پڑتی تو وہ بے بس ہو جاتی اور پھر وہی آئینہ جس کے مقابل اسے بٹھا کر سنوارا جاتا، جو اس کے غموں کا، اس کے زخموں کا ہمراز بھی ہوتا، اس کے نازک احساسات کا نشانہ بنتا، ایک چھناکا ہوتا، آئینے کی کرچیاں فرش پر بکھر جاتیں اور وہ اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔

ویسے فرحین میں کسی بات کی کمی نہ تھی اس نے سائنس میں گریجویشن کیا تھا تعلیم کے ساتھ امورِ خانہ داری میں بھی وہ طاق تھی انتہائی سلیقہ مند اور سلیقہ شعار۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گھریلو کاموں کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔ دیکھنے میں بھی وہ کوئی مُری نہ تھی۔ قبول صورت تو اسے کہا ہی جا سکتا تھا۔ کتابی چہرہ، بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں اور ستواں ناک۔ صرف رنگ ہی کچھ سانولا سا تھا۔ لیکن اب تک وہ کسی کی نظروں میں نہ جچ سکی تھی۔ جب کبھی وہ مایوسی کا شکار ہوتی تو ذہن کے کسی دریچے سے ایک خیال اُبھرتا کہ شاید اسی میں خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو اور پھر فوراً ہی وہ خود پر قابو پا جاتی۔

فرحین کے والد احسن علی ایک پرہیزگار آدمی تھے۔ انہوں نے اس بات پر کبھی مایوسی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا، بلکہ ہر بار ان کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی: "شاید اللہ کی یہی مرضی ہو۔" فرحین کا نمبر گھر میں تیسرا تھا اور وہی خوب صورتی میں دوسروں سے کچھ پیچھے تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں نشاط اور فرحت کافی خوب صورت تھیں اور ان کی شادیاں دو، دو سال کے وقفے سے اچھے خاندانوں میں ہو چکی تھیں۔ فرحین کے بارے میں اس کی بہنیں بھی اکثر فکرمند رہا کرتی تھیں۔ وجہ ظاہر تھی آج کل اچھا بَر درکار ہو تو دو چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایک تو لڑکی حسین ہو، دوسرے دولت بھی ہو جس کے بل پر اچھا بَر خریدا جا سکے، کیوں کہ آج کل شادی بیاہ بھی ایک بیوپار بن چکا ہے۔ شادی کی منڈی میں لڑکیوں کی بہتات اور لڑکوں کی کمی نے صورتِ حال یہ پیدا کر دی ہے کہ جس نے بولی زیادہ لگائی، مال اسی کا ہو گیا۔ دولہا بکنے لگے ہیں اور باضابطہ لڑکوں کا نیلام ہونے لگا ہے اور یہاں احسن علی کا معاملہ یہ تھا کہ بے چارے معمولی کلرکی سے ترقی پاتے ہوئے منتظمی تک پہنچے تھے۔ آمدنی محدود تھی اور ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ۔ اپنے نفس کو دبا کر انہوں نے بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور دونوں بڑی لڑکیوں کی شادیوں سے جیسے تیسے سبک دوش ہوئے لیکن فرحین کا رشتہ طے ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اکثر جگہوں سے جوڑے کی معقول رقم کا مطالبہ اور جہیز کی لمبی چوڑی فہرستیں بھی آ چکی تھیں، لیکن ان کے بس کی بات کبھی تو ہو۔ وہ بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے اور اپنے خدا پر بھروسا کیے رہتے کہ کوئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی۔

آج جب چھناکا ہوا اور پڑوس سے کسی لڑکی کی مدھم مدھم سسکیوں کی آواز فضا میں اُبھری تو فرید چونک پڑا اور بے چینی محسوس کرنے لگا، کیوں کہ لڑکی کی سسکیاں وقفے وقفے سے اُبھر رہی تھیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے اپنے گھر میں کوئی رو رہا ہو۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو اس نے اپنی چھوٹی بہن زرّیں کو آواز دی جو برآمدے میں بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھی۔

"جی بھائی جان، فرمائیے۔" زرّیں نے قریب آ کر بھائی سے پُوچھا۔

"زرّیں، میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے احسن چچا کے گھر سے ایک چھناکے کی آواز سنی، جیسے آئینہ ٹوٹا ہو۔ اور ساتھ ہی کسی لڑکی کے رونے اور سسکنے کی آوازیں بھی سُنائی دیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ واقعہ کیا ہے؟" فرید نے ایک ہی سانس میں زرّیں سے سب کچھ کہہ ڈالا۔

"کیا کریں گے بھائی جان آپ یہ سب جان کر؟" زرّیں کے لہجے میں افسوس اور ہمدردی کا جذبہ شامل تھا۔

"پھر بھی کچھ معلوم تو ہو۔" فرید نے مزید کریدا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے بھائی جان کہ آپ جان کر بھی کچھ کر نہیں پائیں گے۔ پھر بھی اگر آپ جاننے کے لئے بضد ہیں تو سُنئے۔ احسن چچا کی چھوٹی لڑکی فرحین، جو میری کلاس فیلو رہ چکی ہے، اسی کی تھی وہ سسکیاں، جو شاید اپنی تقدیر پر رو رہی تھی۔ بے چاری لڑکیوں کی بھی کیا قسمت ہوتی ہے۔ آج کل لڑکیاں اپنے والدین پر بوجھ بنتی جا رہی ہیں۔ والدین بھی کیا کریں بے چارے۔ حالات سے تنگ آ چکے ہیں۔ احسن چچا کو بس یہی فکر لگی ہے کہ فرحین کے فرض سے سُبک دوش ہو لیں تو چین کی سانس لیں۔ لیکن ہائے رے فرحین کی قسمت! ہر بار لڑکے والوں نے اسے ناپسند ہی کیا۔ یا تو جوڑے کی موٹی رقم اور جہیز کی فہرست اتنی طویل ہوتی کہ احسن چچا بس ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتے، یا پھر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر لوگ چلتے بنتے۔ اچھی خاصی تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ تھوڑا رنگ ہی تو سانولا ہے۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے، کیا لڑکی اپنے طور پر خدا سے حُسن مانگ کر لائے! اور کوئی عیب نہیں فرحین میں۔ ان ہی باتوں کا وہ اتنا زیادہ اثر لیتی ہے کہ جذباتی ہو کر اپنا سارا غم و غصہ آئینے پر اُتارتی ہے۔ بے چاری!" بات ختم کرتے کرتے زرّیں کا لہجہ بھی بھاری ہو چلا تھا اور اپنی سہیلی کی حالت پر اس کی پلکیں بھی نم ہو چلی تھیں!

زرّیں سے جب تفصیلات معلوم ہوئیں تو فرید کو بھی صدمہ ہوا کہ لوگ اتنے خود غرض کیوں بنتے جا رہے ہیں۔ شادی بیاہ بھی تجارت ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ جانے ایسی کتنی بدنصیب لڑکیاں ہوں گی جو فرحین کی

طرح اپنے ارمانوں کو سینے میں دفن کئے سسک رہی ہوں گی۔ فرید نے تہیہ کرلیا کہ اگر خدا نے اسے کسی قابل بنایا اور موقع عطا کیا تو وہ ضرور فرحین کا غم دُور کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس حساس لڑکی سے ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔

فرید اس سال انجینیرنگ کے آخری سال کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا فرحین کے بارے میں دو ایک ہمدردی کی باتیں اس نے زرّین سے کہیں اور اٹھ کر اپنے اسٹڈی روم میں چلا گیا۔

وقت کا طائر پرواز کرتا رہا اور کچھ عرصہ یوں ہی بیت گیا۔ فرحین خوش تھی کہ اس کے لئے ان دنوں کوئی رشتہ کا چکر نہیں تھا وہ خدا کے حضور میں شکرانہ ادا کرتی کہ اس نے اس جہنم سے اسے بچائے رکھا ہے جس سے گزر کر اس کے احساسات جھلس جاتے ہیں۔

اُدھر امتحان کے بعد فرید کا نتیجہ آچکا تھا اور وہ فرسٹ کلاس کے ساتھ کامیاب ہوگیا تھا۔ اسے جلد ہی محکمۂ تعمیرات میں جونیر انجینیر کی جگہ مل گئی۔ پوسٹنگ بھی وطن ہی میں ملی۔ کچھ دن بعد جب اس کی شادی کا سلسلہ چھڑا تو اس نے زرّیں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ فرحین سے شادی کرے گا اور شادی گھوڑے جوڑے کے بغیر ہوگی۔ زرّیں اپنے بھائی کے اس اُونچے خیال پر پھولی نہ سمائی اور پل دیکھتے ہی دیکھتے بات اِس نچاتک جا پہنچی اور پکّی ہوگئی۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ گھر بیٹھے اتنے اُونچے خیالات رکھنے والا لڑکا داماد بن رہا تھا۔ یہاں پھر وہ قائل ہوگئے کہ خدا کے گھر دیر ہے، لیکن اندھیر نہیں۔

فرید کی خواہش کے مطابق شادی سادگی سے، بغیر کسی شور شرابے کے انجام پائی۔ براتیوں نے پلاؤ زردہ خوب خوب کھایا اور نئے جوڑے کو دعائیں دیں۔ فرحین سرخ

اچھی باتیں!

ایثار سے گناہ کی اصل رقم ادا ہوتی ہے اور دان سے گناہ کا سود۔ (ونوبا)۔

●

بُری باتوں کو بھول جانا چاہئے۔ بُری باتوں کو دیکھتے رہیں گے تو انسان حیوان بن جائے گا (ونوبا)

●

بھلائی کرنا فرض نہیں راحت ہے۔ کیوں کہ وہ تمہاری صحت اور سُکھ میں اضافہ کرتی ہے (زرتشت)

●

بھلائی کی خواہش بُرائی کی خواہش کو دبا دیتی ہے۔ (حضرت علی)

عروسی لباس میں وداع کردی گئی۔ چھوٹی موٹی رسموں سے چھٹکارا ملتے ہی اسے حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے میں چنبیلی اور موگرے کی کلیوں کی مہک مدہوش کن تھی۔ کچھ لمحے انتظار کے گزرے اور پھر فرید حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ اور جب اس نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ الٹ کر دیکھا تو بے اختیار وہ "ماشاء اللہ" کہہ اُٹھا۔ فرحین نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک فرید کی اُنگلیوں کا لمس محسوس کرکے ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔ پھر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بے تحاشا رونے لگی۔ فرید نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی سسکیاں تھمنے ہی میں نہ آتی تھیں۔ آخر جب غبار چھٹا تو اس نے فرید سے پُوچھا "سچ سچ بتائیے، آپ نے مجھ پر ترس کھا کر تو یہ شادی نہیں کی، کیوں کہ میں اتنی بدصورت ہوں کہ کسی نے کبھی مجھے پسند نہیں کیا تھا۔ لیکن آپ نے ......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرید نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور کہا "فرحین، غالباً تم احساسِ کم تری کا شکار ہو۔ تم سے کس نے کہا کہ تم بدصورت ہو دیکھو میری طرف، جس کی نظروں میں تم حوروں سے زیادہ خوب صورت اور مقدّس ہو۔ ویسے میرا پیمانۂ حسن کچھ اور ہے میری نظروں میں وہ لڑکی سب سے زیادہ حسین ہے جس کا دل خوب صورت ہو، جس میں ایثار و قربانی کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو اور جو دوسروں کی تکلیف پر خود کراہ اُٹھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا انتخاب غلط نہیں۔" پھر اس نے فرحین سے پوچھا "تم ہی بتاؤ کہ کیا میرا انتخاب غلط ہے؟"

فرید کے اس سوال پر فرحین بس شرما کر رہ گئی۔ فرید کے خیالات جاننے کے بعد وہ خوشی سے جھوم اُٹھی اور خیالوں ہی خیالوں میں اپنے مجازی خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگئی۔ لیکن پھر بھی اس کا دل نہ مانا تو اس نے کہا "تو وہ سارے آئینے جن کے سامنے بٹھا کر مجھے گھنٹوں سنوارا جاتا تھا، کیا وہ سب جھوٹے تھے؟"

"نہیں وہ جھوٹے نہیں، گونگے ہوں گے۔ وہ آئینے تمہارے اس سانولے سلونے حسن کی رعنائیوں میں کھو کر کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہتے ہوں گے — خیر چھوڑو ان گونگے آئینوں کا ذکر، اِدھر دیکھو میری ان آنکھوں میں۔ تمہارے حسن نے تو انہیں خیرہ کردیا ہے۔ دیکھو ان آنکھوں میں۔ یہ تمہارے حسن کا عکس تمہیں پیش کریں گی۔ آؤ آج نئی زندگی کی شروعات پر ہم عہد کریں کہ زندگی کی پُرپیچ راہوں پر ہم ساتھ ساتھ ہم قدم آگے بڑھیں گے۔" پھر فرید نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا اور وہ چپ چاپ اس کے کشادہ سینے سے لگی خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی محسوس کرنے لگی — خوشی کے دو آنسو اس کے رُخساروں کا سہارا لیتے ہوئے فرید کے سینے پر اُگے بالوں کے گھنے جنگل میں جذب ہوگئے۔

○○

گمشدہ لوگوں کا کیا ہوتا ہے

سعید سہروردی

پرتبھا اپنے باپ کی چہیتی بیٹی تھی۔ آٹھ سال کی ننھی پرتبھا اسکول سے واپس آرہی تھی تو اس نے یہ خبر سُنی کہ بھوپال میں ایک کارخانے سے زہریلی گیس پھیلنے سے ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ ہزاروں اندھے یا بیمار ہیں۔ پرتبھا کے باپ بھوپال گئے ہوئے تھے۔ پرتبھا سب کچھ بھول گئی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک خیال تھا۔ وہ اپنے پتا کو ڈھونڈنے بھوپال جائے گی۔

اس نے سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین کھڑی تھی۔ کسی سے اس نے پوچھا "یہ بھوپال والی گاڑی ہے؟"

جواب میں اجنبی نے سر ہلا دیا اور وہ ٹرین میں بیٹھ گئی۔

لیکن وہ بھوپال جانے والی گاڑی نہیں تھی۔

پرتبھا کے باپ تو خیریت سے بھوپال گئے بغیر گھر لوٹ آئے۔ لیکن پرتبھا کے غائب ہونے سے پورے گھر کی نیند حرام ہوگئی۔

ناگپور دُوردرشن سے پرتبھا کی تصویر گمشدہ افراد کے ساتھ دکھائی گئی تو وہ ناگپور میں مل گئی اور اپنے گھر لوٹ آئی۔ وہ غلط ٹرین میں سوار ہوکر ناگپور پہنچ گئی تھی۔

ہفتے میں ایک دو بار ٹیلی ویژن کے اسکرین پر گمشدہ افراد کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ بچے، نوجوان، عورتیں، بوڑھے، کند ذہن، معذور، حواس باختہ، ان میں ہر طرح کے لوگوں کے فوٹو ہوتے ہیں۔ عموماً اس وقفے میں ٹیلی ویژن دیکھنے والے اپنی نظریں اسکرین سے ہٹا لیتے ہیں۔ کوئی چھوٹے موٹا کام کرنے کے لئے اُٹھ جاتا ہے، کوئی اخبار یا رسالہ پڑھنے لگتا ہے۔ عام دیکھنے والوں کے لئے یہ ایک غیر دلچسپ وقفہ ہوتا ہے جسے گزارنے کے وہ کوئی نہ کوئی طریقہ تلاش کر لیتے ہیں، درحقیقت انہیں انتظار ہوتا ہے اگلے پروگرام کا، جو اُن کی پسند اور دلچسپی کا ہوتا ہے۔

اگر کوئی پانچ منٹ کا یہ مختصر وقفہ اس المیہ کے بارے میں غور کرنے میں صرف کرے جو تصویر کے پیچھے ہوتا ہے تو اُسے کئی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ فوٹو عموماً دھندلے ہوتے ہیں۔ ان کی تفصیلات یعنی نام، عمر، قد، رنگت اور شناختی نشانیاں، ساری باتیں جلدی جلدی بے دلی سے پڑھی جاتی ہیں۔ ایک کے بعد ایک تصویر اتنی تیزی سے گزر جاتی ہے کہ اس پر غور کرنا، ذہن میں محفوظ رکھنا یا اس سے ہمدردی محسوس کرنا دشوار ہوتا ہے۔

گمشدہ افراد اگر بچے، بوڑھے، معذور یا نیم پاگل ہوئے تو اُن سے وقتی ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں سے ہمدردی محسوس ہونے کی بجائے اُلٹا لوگوں کو اُن پر غصہ آتا ہے۔ دِل ہی دِل میں وہ پہلے سے یہ مان لیتے ہیں کہ وہ ضرور گھر سے بگڑ کر یا کسی اور چکر میں بھاگ گئے ہیں۔ یہ ہمدردی کے لمحے بھی صرف اُس وقت تک محدود رہتے ہیں جب تک اگلا پروگرام شروع نہیں ہوتا۔ جب اگلا پروگرام شروع ہوتا ہے تو لوگ گمشدہ افراد کے بارے میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ اگلے دن بھی اگر ان میں سے کوئی سڑک پر سامنے آجائے تو اُسے پہچانا نہ جاسکے۔ جلدی جلدی میں پلک جھپکتے میں دیکھی ہوئی دھندلی تصویریں کیسے یاد رہ سکتی ہیں!

آخر ٹیلی ویژن والے ان تصویروں کو کیوں دکھاتے ہیں؟ وہ اِسے ایک ضروری سماجی خدمت سمجھتے ہیں۔ لوگ بھی شاید یہی مانتے ہیں۔ اِس لئے ہر ہفتے گمشدہ افراد کی درجنوں تصویریں انہیں دکھانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ اِس کے لئے ایک ضابطہ بنا ہوا ہے۔ دُوردرشن پر دکھانے سے پہلے تھانے میں گمشدہ افراد سے متعلق محکمے میں اطلاع کا اندراج ضروری ہے۔ تھانے سے اندراج

کا تصدیق [illegible] حاصل کرنے کے بعد ۱۰×۸ سائز کا فوٹو دوردرشن میں دکھانے کے لیے پیش کرنا پڑتا ہے۔

آج کل دوردرشن پر تجارتی پروگراموں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ لیکن جب یہ بھیڑ نہیں تھی تو دوردرشن والے ہفتے میں دو بار کسی مقبول پروگرام، چترہار یا کسی اور عوامی پروگرام کے ساتھ چھ، سات گم شدہ افراد کی تصویریں دکھاتے تھے۔ اُس وقت یہ فوٹو دیکھنے اور ان کو ذہن میں رکھنے کے امکانات زیادہ تھے۔ اب دوردرشن کے موجودہ تجارتی دور میں جتنے اہم اوقات تھے وہ اشتہاری پروگراموں کی نذر ہو گئے ہیں۔ بے چارے گم شدہ افراد کے لیے وقت پہلے سے بھی زیادہ مختصر ہو گیا ہے۔ یہ ہدایت جاری کی گئی ہے کہ ایک وقت میں پندرہ سے زیادہ فوٹو نہ دکھائے جائیں۔ اس لیے دوردرشن کے پاس ہمیشہ گم شدہ افراد کی تصویروں کا انبار رہتا ہے۔ ظاہر ہے اِن حالات میں ایک تصویر دوبار دکھائے جانے کا امکان نہیں ہے۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے جب پولیس والوں کی درخواست پر ایک تصویر دوسری بار ٹیلی ویژن اِسکرین پر دکھائی جاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی کم سے کم چھ مہینے کے وقفے کے بعد ہوتا ہے۔

گم شدہ افراد کے والدین، سرپرستوں اور رشتہ داروں کو یہ شکایت ہے کہ بہت سے سرکاری اشتہارات اور پیغامات کو دوردرشن پر بار بار خبروں سے پہلے یا بعد میں یا دیگر اہم وقفوں میں دکھایا جاتا ہے۔ اِسی طرح گم شدہ افراد کی تصویریں بھی ایک سے زیادہ بار دکھائی جا سکتی ہیں۔ دوردرشن والوں کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ گم شدہ افراد کی تصویریں دکھانے کے لیے پہلے سے تیاری کرنا پڑتی ہے۔ سرخیاں لکھوائی جاتی ہیں۔ اعلان پڑھنے کی تیاری کرنا پڑتی ہے۔ گم شدہ افراد کے بارے میں اطلاع ڈائریکٹ ٹیلی کاسٹ کی جاتی ہے۔ اگلے پروگرام کی تیاری کے دوران ایک کیمرہ اور ایک اناؤنسر فوٹو اور اس سے متعلق اعلان ٹیلی کاسٹ کرتا رہتا ہے۔ کوئی اور اعلان یا پروگرام ہو تو حسبِ ضرورت اُسے روکا یا 'آف' کیا جا سکتا ہے۔ گم شدہ افراد کے متعلق پروگرام کو اچانک آف نہیں کر سکتے۔

اگر گم شدہ افراد کی تصویروں کا جائزہ لیا جائے تو ایک بات یہ سامنے آئے گی کہ ان میں سے ساٹھ فی صد افراد چودہ سے پچیس سال کی عمر کے لڑکے ہوتے ہیں۔ باقی چالیس فی صد بوڑھے مردوں، بوڑھی عورتوں اور بچوں کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم وہ بچے ہوتے ہیں جن کا سن چار اور دس کے بیچ ہوتا ہے۔

دوردرشن کو ہر ہفتے گم شدہ افراد کے چالیس پچاس فوٹو موصول ہوتے ہیں اور اُن کو سلسلہ وار نمبر کے حساب سے دوردرشن پر دکھایا جاتا ہے۔ اکثر بچوں کے پریشان والدین زور دیتے ہیں کہ اُن کے بچے کی تصویر پہلے دکھائی جائے۔ اگر بات چھوٹے بچے کی ہو تو اُن کی درخواست منظور کر لی جاتی ہے۔

دوردرشن والوں کو بہت کم لوگ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ گم شدہ فرد تصویر دکھانے کے بعد ملا یا نہیں؟ اس لیے تصویر ایک بار دوردرشن اسکرین پر دکھلانے کے بعد فائلوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ اگر گم شدہ فرد تصویر ٹیلی ویژن پر دکھلانے سے پہلے مل جائے تو درخواست دینے پر تصویر واپس کر دی جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوردرشن پر گم شدہ افراد کی تصویر دکھانے سے کیا اُنہیں تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پولیس والوں کا خیال ہے کہ اب تک اُن کے علم میں ایک بھی ایسی مثال نہیں آتی جب کسی نے دوردرشن کے اسکرین پر تصویر دیکھ کر کسی گم شدہ فرد کا پتہ بتایا ہو۔

دوردرشن والے فخر کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ گم شدہ افراد کی تصویر دکھا کر سماج کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں، جب کہ پولیس والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے اُنہیں تلاش کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی پھر آخر کیوں یہ فوٹو ٹیلی ویژن کے اسکرین پر دکھائے جاتے ہیں؟"

یہ کام لوگوں کی تسلی کے لیے ہوتا ہے۔

جب لوگ کسی کی گم شدگی اطلاع دینے آتے ہیں تو پولیس والے اپنا فرض سمجھ کر اُن کے رشتے داروں کو ٹیلی ویژن کی اِس بلا معاوضہ خدمت کے بارے میں بتا دیتے ہیں اور ان میں سے پچاس فی صد افراد اس سہولت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پولیس والوں کا تجربہ ہے کہ اُن میں سے پچاس فی صد افراد ٹیلی ویژن پر گم شدہ افراد کی تصویریں دکھانے کے خلاف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اونچے طبقے اور امیر گھرانوں کے لوگ پبلسٹی اور بدنامی سے گھبراتے ہیں۔ پولیس کو اطلاع دیتے ہوئے بھی وہ ڈرے، گھبرائے ہوئے چھپتے چھپاتے آتے ہیں۔

پولیس کی تنظیم میں بھی گم شدہ افراد کا محکمہ غیر ضروری اور فالتو سمجھا جاتا ہے، وہاں تقرر کو ایک تکلیف دہ سزا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کسی گھٹیا جگہ پر یہ دفتر ہوتا ہے۔ جہاں ڈھنگ کی کرسی میز بھی نہیں ہوتی۔ وہاں کام کرنے والے جتنے بے زار اور بد دِل ہوتے ہیں اتنے ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں بد قسمتی سے وہاں اِطلاع دینے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ ایک بار وہاں جانے والا خدا سے یہی دعا کرتا ہے، میرے مالک! یہاں پھر آنے کی نوبت نہ آئے۔

اِن حالات کے باوجود روزانہ پانچ چھ افراد گم شدہ افراد کے بارے میں اطلاع کا اندراج کرانے آتے ہیں۔ پولیس کے ریکارڈ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گم شدہ افراد میں نوے فی صد افراد سولہ سے چوبیس برس سن کے لڑکے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً ایسے لڑکے ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر اپنی مرضی سے بھاگ جاتے ہیں اس لیے ان کو ڈھونڈ نکالنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ان میں صرف دو فی صد ایسے

ہوتے ہیں جن کو اغوا کیا جاتا ہے یا جنہیں بہلا پھسلا یا ورغلا کر کوئی بھگا لے جاتا ہے۔ پولیس والے کہتے ہیں کہ اغوا کئے ہوئے افراد کو تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اغوا کئے ہوئے افراد اور فرار مجرموں کا پتہ لگانا پولیس کے لئے نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن کی شروعات سے پہلے پولیس اپنے روایتی طریقوں سے گم شدہ افراد کو تلاش کرتی تھی اور وہ طریقے اب بھی رائج ہیں گم شدہ افراد کی تصویریں، ان کے بارے میں تفصیلات کے ساتھ پولیس کے مخصوص گزٹ میں شائع کی جاتی ہیں۔ وائرلیس کے ذریعے شہر کے تھانوں کو اور قریبی اضلاع کے حکام کو اطلاع دی جاتی ہے۔

اگر گم شدہ فرد کا کوئی پتہ دو مہینے تک نہ چلے تو دیگر ریاستوں کو بھی اطلاع دی جاتی ہے۔ عوام کا تجربہ یہ ہے کہ اگر گم شدہ فرد کسی بڑے اور با اثر خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو پولیس اس کی تلاش میں چوکسی دکھاتی ہے اور کچھ بھاگ دوڑ کرتی ہے، ورنہ معاملہ اندراج سے آگے نہیں بڑھتا۔ اگر کسی بارسوخ گھر کا کوئی بزرگ، بچہ وہاں کی کوئی عورت اغوا کر لی جائے یا معاملہ اخباروں میں چھپ جائے یا علاقے میں لوگ مظاہرہ کرنے لگیں تو اس طرح کے دباؤ میں پولیس بدنامی سے بچنے کے لئے حرکت میں آجاتی ہے۔

پولیس گم شدہ افراد کی تلاش میں کئی زینے طے کرتی ہے۔ سب سے پہلے تھانوں کے حوالات اور اسپتالوں کا ریکارڈ دیکھا جاتا ہے گم شدہ فرد کسی مجرم کے شبہ میں گرفتار تو نہیں ہے یا کسی حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں تو داخل نہیں ہے؟ اس کے بعد وہ اسپتال کے مردہ خانوں میں لاوارث لاشوں کو دیکھتے ہیں۔ پولیس کا تجربہ ہے کہ گم شدہ افراد میں صرف ایک فی صد مردہ حالت میں ملتے ہیں۔

گم شدہ افراد کی تلاش میں اپنی ناکامی کے جواز میں پولیس والے کہتے ہیں، جب گھریلو الجھنوں کی وجہ سے لڑکے گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ ہماری مشکل اور بڑھ جاتی ہے جب اطلاع دینے والے ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ بھاگنے سے پہلے گھر میں کیا ڈراما ہوا تھا؟

ایک جیوتشی مہاراج کا بیٹا اسکول سے بچنے کے لئے تین بار گھر سے بھاگ چکا تھا۔ ہر بار اُسے تلاش کر کے واپس لایا جاتا تھا۔ چوتھی بار اُس کے باپ اُسے لے کر تھانے لے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ "صاحب۔ آپ لوگ ہی اسے سنبھالیں۔ میں تو تھک ہار گیا۔ اسے کسی ایسے اسکول میں داخل کرا دیں جہاں یہ کوئی ہنر سیکھ لے۔" اب پولیس ایسے معاملے کیا حل کر سکتی ہے؟

ایک لڑکے کا پریشان باپ اپنے بیٹے کی گم شدگی کی اطلاع درج کرانے آیا۔ صرف دو دن بعد وہ یہ خبر لایا کہ وہ لڑکا ہل اسٹیشن سیر کرنے چلا گیا تھا اور تفریح کر کے واپس آ گیا ہے۔

ایک دولت مند دودھ والا اپنے بیٹے کی گم شدگی کا اندراج کرانے آیا۔ بیٹا بیس برس کا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا فوٹو دوردرشن پر دکھانے کے خلاف تھا۔ وہ یہ بھی نہیں بتانا چاہتا کہ کن حالات میں لڑکا گھر سے بھاگا؟ بعد میں پتہ چلا کہ ماں باپ نے بچپن میں لڑکے کی شادی کسی لڑکی سے کر دی تھی جب کہ لڑکے کا چکر کسی اور لڑکی سے چل رہا تھا۔

پولیس گھریلو اور سماجی مسئلوں کو کیسے حل کر سکتی ہے۔ اگر پڑھے لکھے لوگ بیٹے کی شادی بچپن میں کر دیں اور لڑکے ماں باپ کو بتائے بغیر ہل اسٹیشن گھومنے چلے جائیں تو پولیس کے پاس اس کا کیا حل ہے؟

ان حالات میں گم شدگی کی ایک بڑی ذمہ داری فلموں اور ٹیلی ویژن پروگراموں پر بھی ہے۔ مار دھاڑ اور جاسوسی فلمیں دیکھ دیکھ کر بچے باغی، بے زار اور جرائم پیشہ بنتے جا رہے ہیں۔ فلمی ہیرو کی نقل کرتے ہوئے وہ کوئی بہانہ ملتے ہی گھر سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ بدنامی کا داغ پولیس والوں کی وردی پر لگتا ہے۔

ایک طرف دوردرشن قوم پر یہ احسان کر رہا ہے کہ وہ اپنے قیمتی پانچ منٹ (جس کے لئے وہ تجارتی فرموں سے تھیلی بھر کر روپے وصول کر سکتا ہے) گم شدہ افراد کی تصویریں ٹیلی ویژن اسکرین پر دکھانے میں صرف کرتا ہے دوسری طرف پولیس کا خیال ہے کہ فوٹو ٹیلی کاسٹ ہونے سے صرف رشتہ داروں کے دل کی تسلی ہو جاتی ہے لیکن گم شدہ کو تلاش کرنے میں مدد نہیں ملتی، یہ تو وہی بات ہوئی کہ بے چاری مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آیا۔

■■

کاش

ابھی تو دُور
بہت!
دُور تک اندھیرا ہے
ابھی تو رات
سیاہ!
رات کا بسیرا ہے
دل و دماغ پہ
جیسے
جمود طاری ہے
خیال
ذہن میں
کوئی تو ایسا آجائے
قدم قدم پہ
زمانے میں نور پھیلائیں
قلم کی نوک
سے
فکر و شعور پھیلائیں!!

قاضی انصار

پیغام

حیدر آباد کے اعلیٰ معزز نجیب الطرفین مذہبی ماحول، سادات گھرانے کے، اور صاحب جائداد ۲۷ سالہ گریجویٹ عہدیدار کے لئے، معزز سادات یا شیخ گھرانے کی تعلیم یافتہ اور مذہبی خیالات کی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

S. HABIBUDDIN
12.2.232 MURAD NAGAR
HYDERABAD 28
AHDHRA PARDESH

شمالی ہند کے مشہور صنعتی اشتی انصاری گھرانے کے ۲۱ سالہ لڑکے کے لئے ایک نیک سیرت، خوب صورت اور شیریں زبان، مہذب اور وفادار ی سے واقف، تعلیم کم از کم انٹرمیڈیٹ عزت دار گھرانے سے متعلق لڑکی چاہئے۔ لڑکی مزید تعلیم جاری رکھ سکتی ہے۔

M.A. ANSARI
34 CHATHAM
ALLAHABAD
PHONE NO. 7302-56873
50656

دہلی کے معزز خاندان سے تعلق رکھنے والے ۳۳ سالہ سنّی مسلم لڑکے کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا چار سال سے امریکہ میں ہے۔ وہاں اس کی اپنی دو کانیں ہیں۔ لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ جہیز کی ضرورت نہیں۔

BOX NO. 128
BANO URDU MONTHLY
ASIF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

پیغام

موزوں ترین رشتے کی تلاش میں مدد کرنے کے لئے "بانو" کی پیش کش

آج کے دور میں مناسب رشتے کی تلاش ایک دشوار اور صبر آزما مرحلہ بنا ہوا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بیٹے، بیٹی، بھائی یا بہن کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے تو "بانو" کے ذریعے ہزاروں گھروں تک پیغام پہنچائیے اور بہترین رشتے کا انتخاب کیجئے۔

آپ کے پیغام کی اشاعت کی اجرت دو روپے فی لفظ کے حساب سے لی جائے گی۔ کم از کم اجرت پچاس روپے ہوگی، خواہ پیغام ۲۵ الفاظ سے کم پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو۔

رازداری اور سہولت کے خیال سے باکس نمبر کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی۔ باکس نمبر کی معرفت وصول ہونے والے جوابات ہم پیغام شائع کرانے والوں کو رجسٹرڈ پیکٹ کے ذریعے بھیج دیں گے۔ اس خدمت کے لئے برائے نام معاوضہ دس روپے لیا جائے گا۔ اجرت کا حساب لگاتے وقت باکس نمبر کے ساتھ "بانو" کے پتے کے الفاظ بھی پیغام میں شمار کئے جائیں گے۔

پیغام کے ساتھ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعے پوری اجرت ضرور ارسال کیجئے۔ اجرت وصول نہ ہونے کی صورت میں پیغام کی اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی۔

ثبوت کے ساتھ پیغام اس پتہ پر بھیجئے: "پیغام" ماہ نامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بغیر عنوان کے

کلیم ضیاء

گاؤں کے بڑے میدان میں لوگ جمع تھے۔ پنچ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ چکے تھے۔ ان کے درمیان ایک مفلوک الحال گدرائے ہوئے بدن کی معمولی شکل وصورت کی جوان لڑکی کھڑی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں ماحول سے بے پروا ادھر ادھر ڈول رہی تھیں۔ کہیں کہیں سے اس کے پھٹے ہوئے لباس سے جسم کا کوئی حصّہ جھانک کر لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

لوگ یہاں اس کی حالت پر رحم کھاکر اسے زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے نہیں جمع ہوئے تھے۔ مسئلہ اس کے برعکس تھا۔

یہ لڑکی گاؤں میں 'باؤلی' کے نام سے مشہور تھی۔ بچپن ہی میں اس کے ماں باپ ایک فرقہ وارانہ فساد کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ دس بارہ سال اس نے کبھی لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرکے، کبھی بھیک کے ٹکڑے حاصل کرکے گزار دئے تھے۔ اب وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ گالوں پر گلاب کھِل اٹھے تھے۔ بے ترتیب مگر لمبے، گھنے بال اُلجھے ہوئے ہونے کے باوجود دیکھنے والوں کے دلوں میں ہلچل مچا دیتے۔ آنکھیں کھوئی کھوئی، مگر جوانی کے نشے میں چُور۔ پھولوں کی ڈالی جیسا جسم جسے دیکھتے ہی من چلوں کے دل تڑپنے لگتے۔

یوں تو اس کی شکل وصورت معمولی تھی اور قد بھی میانہ تھا، لیکن جس طرح آزاد اور بے فکر فضا میں پلے ہوئے جانور گھر میں پوری دیکھ بھال اور چارے کے ساتھ پلے ہوئے جانوروں سے زیادہ مضبوط اور زیادہ دل کش ہوتے ہیں یہی حال باؤلی کا تھا۔ انگ انگ سے جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ منچلوں پھینک اسے چھیڑتے۔ کبھی کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا، کبھی کوئی اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو چھو لیتا، کبھی کوئی اس کے گالوں کو چٹکی سے مسل دیتا، لیکن باؤلی کبھی جھڑک کر کبھی مُنہ چڑا کر، کبھی کوئی چیز اٹھا کر مارنے کے سوا کچھ نہ کرتی۔ بالکل جنگلی پودے کے مانند گاؤں کی کھلی ہوا میں پروان چڑھی ہوئی اسے روز بروز شباب کی رعنائیوں اور جوانی کی اندھی ڈگر پر انجانی منزل کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی اور انجام کار ایک دن اس کے پاگل پن سے فائدہ اٹھا کر اس کے بے فکری سے بڑھتے ہوئے جسم میں کسی نے اپنی ہوس کا بیج بو دیا جو دھیرے دھیرے پروان چڑھنے لگا۔ شروع شروع میں تو گاؤں والوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی، لیکن جب پیٹ صاف جھلکی کھانے لگا تو لوگوں نے اسے اپنے گھروں میں آنے سے منع کر دیا۔ مولوی صاحب جن کے گھر زیادہ تر باؤلی کام کاج کرنے جایا کرتی تھی۔ اپنے گھر کے دروازے اس پر بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آج پنچایت کے درمیان بے فکری کے عالم میں کھڑے کھڑے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے والی لڑکی کوئی اور نہیں، باؤلی ہی تھی۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ اس ہوس کار کا نام جاننے کے لئے یہ

غزل

زندگی درد کا عنوان کہاں تھی پہلے
تبلا، رنج میں یہ جان کہاں تھی پہلے

دل جو ٹوٹا تو کھلا سب کی محبت کا بھرم
اپنے بیگانے کی پہچان کہاں تھی پہلے

ہو نہ ہو یہ تری زلفوں کی مہک ہے ورنہ
بکھرے گل اتنی پریشان کہاں تھی پہلے

اب تو آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری
دل میں یہ گرمیٔ ایمان کہاں تھی پہلے

اب نہ ارماں ہے کوئی اس میں، نہ کوئی حسرت
دل کی بستی مری، ویران کہاں تھی پہلے

جذبۂ شوق کی تاثیر تو دیکھو نیرّ
وہ نظر مائلِ احسان کہاں تھی پہلے

نیّر ہاشمی

پنچایت بُلائی گئی تھی۔ پنچوں میں رام دیال، دینا ناتھ، ہری پرشاد اور مگل چرن سنگھ کے ساتھ ہی مولوی صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے مولوی صاحب گاؤں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے چھوٹے بڑے سب ہی ان کی عزت کرتے اور اپنے اپنے گھریلو مسائل اور اُلجھنوں کو حل کرانے کے لئے ان کے دروازے کو کھٹکھٹاتے۔

اچانک مولوی صاحب کی آواز گونجی:

"خاموش" ! اس آواز کے سُنتے ہی مجمع پر سناٹے کی حکمرانی ہوگئی مولوی صاحب نے دھیمی آواز میں باؤلی کو اپنے قریب بلایا اور پوچھا "اس نابنجار کا نام بتا دے جس نے تجھے اس حالت کو پہنچایا ہے ؟"

باؤلی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے پنچوں کو گھورا پھر مجمع کی طرف نگاہ اُٹھائی اور زور زور سے قہقہے لگانے لگی قہقہے لگاتے لگاتے وہ رونے لگی۔ پھر رُکتے رُکتے بولی "یہ ــــ یہ ہے میرا بچہ، میرا بچہ۔ میں ایسے کسی کو نہیں دوں گی۔ میں اسے دُودھ پلاؤں گی۔ ہاں اس طرح ......" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی چھاتی عریاں کردی۔ مولوی صاحب اور پنچوں نے اپنی آنکھیں مُوند لیں۔

کچھ عورتوں نے بڑھ کر باؤلی کے جسم کے عریاں حصّوں کو دوبارہ ڈھک دیا۔ انہوں نے بھی اسے بہلا پھُسلا کر اس پاپی کا نام پوچھنے کی کوشش کی، مگر باؤلی ہنسنے، رونے اور اول فول باتیں کرنے کے سوا انہیں کچھ نہ بتا سکی، تنگ آکر پنچوں نے سب لوگوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ لوگوں کے اُٹھنے سے پہلے ہی باؤلی مجمع سے نکل کر باغ میں اس پیڑ کے پاس چلی گئی جس کے گھنے سائے میں وہ اکثر بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔

لوگ پنچایت کے بعد بھی طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ کسی کو بند ھو موچی پر شک ہوتا، کسی کو زمین دار کے آوارہ لڑکے جگنو پر اور کسی کو حوالی پنڈت پر غرض جتنے مُونہہ اتنی باتیں۔ کسی ایک آدمی کی نشان دہی نہ تو وہ لوگ کرسکتے تھے اور نہ باؤلی کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ وہ اصل خطاکار کا نام بتاتی۔

اس واقعہ کے بعد سے گاؤں کے تمام گھروں کے دروازے باؤلی پر بند ہوگئے۔ کبھی کبھار کوئی ترس کھا کر کچھ ٹکڑے ڈال دیتا تو کھا لیتی، نہیں تو کھیتوں میں گھُس کر مٹر یا چنے کی بالیاں نوچ نوچ کر کھا لیتی۔ یا پھر کسی باغ میں گھُس کر امرود وغیرہ چُرا کر کھا لیتی۔ اس طرح پیٹ کا جہنم سرد ہو جاتا۔

ایک صبح اسی درخت کے نیچے جہاں باؤلی روزانہ بیٹھی رہا کرتی تھی، سمن ماسی نے باؤلی کو درد سے تڑپتے ہوئے دیکھا۔ سمن ماسی اس سے پہلے بھی اپنی بہو بیٹیوں کی زچگی کرا چکی تھی۔ اسے باؤلی کی کس مپرسی پر رحم آگیا۔ وہ ایک عورتوں کی مدد سے وہ اسے اُٹھا کر اپنے گھر کے دالان میں لے آئی جہاں کچھ دیر بعد باؤلی نے ایک گل گوتھنے بچے کو جنم دیا۔

دن گزرتے گئے۔ لوگ باؤلی کے حادثے کو کچھ بھُول چلے تھے مگر بچے کی پیدائش کے بعد پھر اس خطاکار کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ بچے کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں تو ہو بہو باؤلی کی اداس آنکھوں جیسی تھیں۔

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجیے۔

۲۵ اپریل ۱۹۸۷ تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام، پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔

بغیر عنوان کے ' ماہ نامہ بانو ' آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فرق اتنا تھا کہ باؤلی کی آنکھوں میں اداسی، ویرانی اور غم کا احساس سمندر تھا تو بچے کی آنکھوں میں مستقبل کی تاب ناکی۔ بچے کے ہونٹوں کو دیکھ کر مولوی صاحب کی شکل آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ گالوں کو دیکھ کر جگنوں کے بھرے بھرے گال تصور میں آ جاتے اور گول مٹول چہرہ پنڈو کے چہرے سے ملتا جلتا معلوم ہوتا۔ عورتیں آپس میں کانا پھوسی کرتیں۔ جگنو اور پنڈو کا نام تو آسانی سے لے لیتیں، مگر مولوی صاحب کا نام لینے سے زبان میں لکنت سی محسوس ہونے لگتی۔ اتنے بزرگ شخص اور ایسا کام کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بات پھر آئی گئی ہو گئی۔

بلّو باؤلی کے ساتھ چلنے لگا۔ ماہ و سال اپنا جمال دکھاتے رہے۔ بلّو رفتہ رفتہ بڑا ہوتا رہا اور اب وہ آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ گلی کوچوں میں اس کی شرارتوں سے بچے تو بچے بڑے بوڑھے بھی پریشان ہو رہے تھے۔ ایک دن بلّو نے مولوی صاحب کے ایک پتھر پھینک کر مارا۔ پتھر نے مولوی صاحب کی پیشانی لہو لہان کر دی۔ دنیا دہا نیہا سے بے خبر باؤلی بڑبڑا کر اٹھی اور بے ہوش مولوی صاحب کے زخم پر اپنے بلّو کا کپڑا پھاڑ کر باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد مولوی صاحب کو ہوش آیا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے بلّو کو مارنے کے لئے دوڑے، مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔

شام کو بلّو اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے مولوی صاحب کے گھر گیا۔ مولوی صاحب اس وقت بھی درد سے کراہ رہے تھے۔ بلّو نے ان سے اپنے کئے کی معافی مانگی۔ باؤلی عجیب نظروں سے مولوی صاحب کو تکتی رہی۔ روتے بسورتے ہوئے بلّو کو دیکھ کر مولوی صاحب بستر سے اٹھے اور بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور خود بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔ ●●

نتیجہ بغیر عنوان کے

'بانو' مارچ ۱۹۸۷ء میں صفیہ یوسف کا افسانہ "بغیر عنوان" کے شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان ہماری بانو بہنوں، بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔

تمام عنوانات کو غور سے پڑھنے کے بعد گلشن رحمٰن (رام پور) کے بھیجے ہوئے عنوان "معصوم زنجیر" کو پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

عمیر عثمانی کو (پنجاب) سے بھیجے ہوئے عنوان "جذبے اور تقاضے" کو دوسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ جنہیں ۳۰ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

مسعود بن محمد کے (حیدر آباد) سے بھیجے ہوئے عنوان "مخلص مالی" کو تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ انہیں بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

"یہ گھر میرے ڈیڈی کا ہے۔" ننھی مکتا نے کہا۔

مدھو نے مسکرا کر مکتا کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "صرف تمہارے ڈیڈی کا نہیں، میرا بھی یہی گھر ہے۔"

"تمہارا کیوں ہے؟" مکتا نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں تمہارے ڈیڈی کی بیوی ہوں۔"

"ہونہہ۔" مکتا نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔ "یہاں بڑی بُو آرہی ہے۔"

"بُو؟" مدھو نے اِدھر اُدھر مُونہہ کر کے گہرے سانس لے کر کہا۔ "مجھے تو کسی چیز کی بُو نہیں آرہی ہے۔"

"مگر مجھے آرہی ہے۔ گھر میں گندگی جو ہے۔"

"تمہیں اس گھر میں گندگی نظر آرہی ہے؟" مدھو حیرت سے بولی۔

"بُو جو آرہی ہے۔"

مدھو نے دوبارہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لے کر سُونگھ کر دیکھا۔ پھر بولی۔

"مجھے تو کوئی بُو نہیں آرہی ہے۔"

"تمہیں کیوں آئے گی؟ تمہاری ناک میں جو بُو بس گئی ہے۔"

مدھو لاجواب ہو گئی۔

وہ دن گزارنے کے بعد مکتا واپس چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی مدھو نے گھر کے ایک ایک کونے میں جا کر بُو سُونگھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ الماریاں کھول کھول کر دیکھنے لگی۔

اسی وقت اس کا شوہر سُریش آگیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ چلّایا، "مدھو — مدھو! تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں۔" مدھو کچن کی ایک الماری کھولتے ہوئے بولی۔

سریش نے کچن میں داخل ہو کر حیرت بھری آواز میں کہا "ارے! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ میں تم سے کہہ کر گیا تھا کہ ہمیں سات بجے رشید کے گھر پہنچنا ہے۔ آج اس کی شادی کی سالگرہ ہے۔"

"مکتا کہتی تھی کہ گھر میں بُو محسوس ہو رہی ہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ کہیں کوئی چیز سڑ تو نہیں رہی ہے۔"

"بُو!" سریش حیرت سے بولا۔ "مجھے تو کوئی بُو محسوس نہیں ہو رہی ہے۔"

"مگر مکتا کہتی تھی کہ ہمارے گھر میں اسے بُو محسوس ہوتی ہے۔"

"تم بھی بچی کی باتوں میں آگئیں۔ چلو اب جلد جا کر تیار ہو جاؤ۔ میں صرف دس منٹ تمہیں تیار ہونے کے لئے دے سکتا ہوں۔"

"اچھا، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر مدھو تیار ہونے چلی گئی۔

مدھو سریش کی دوسری بیوی تھی۔ آٹھ سال پہلے سریش کے ماں باپ نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کر دی تھی۔ اس کی بیوی سریتا سے اس کا مزاج بالکل نہیں ملتا تھا۔ سریش نے بہت نبھانے کی کوشش کی، لیکن نہ نبھ سکی۔ آخر دونوں نے الگ ہونے کا فیصلہ کر کے کورٹ میں طلاق کی درخواست دے دی۔ ایک سال بعد کورٹ سے طلاق مل گئی۔ دونوں کے ایک بچی تھی — مکتا۔ سریش مکتا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا، لیکن سریتا نہ مانی۔ عدالت نے بچی کے لئے ماں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ سُنا دیا۔ البتہ یہ اجازت دے دی کہ ہر اتوار کو باپ بچی کو اپنے گھر لے جا سکتا ہے، لیکن شام کو بچی کو ماں کے پاس واپس پہنچانا ضروری ہوگا۔

چھ مہینے تنہا زندگی گزارنے کے بعد سریش نے مدھو سے شادی کر لی۔ سریش کی عمر اب بتیس سال تھی اور مدھو کی عمر بائیس سال تھی۔ سریش کامیاب بزنس مین اور شریف آدمی تھا اس لئے مدھو کے ماں باپ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سریش کی یہ دوسری شادی ہے مدھو کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔

سریش نے اپنے اور مدھو کے لئے نیا فلیٹ لے لیا تھا۔ مدھو سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ وہ شوہر کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی تھی اس لئے اس نے شوہر کے ساتھ مکتا کو بھی قبول کر لیا۔ پچھلے چھ اتواروں سے روز [illegible]

اقوالِ زرّیں

محبت میں ہمت سے کام لینا نصف کامیابی حاصل کرلینا ہے۔

ناکام ہوئے بغیر شکست کو برداشت کرلینا دنیا میں محبت کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ (انگرسول)

جھوٹا وعدہ کرنے سے انکار بہتر ہے۔

وعدہ قسم سے بڑھ کر ہے — (نپولین)

وقت تبدیلی کا سرمایہ ہے (ٹیگور)

کرنے آتا تھا۔ وہ دن بھر مکتا ان کے ساتھ رہتی۔ شام کو سریش اس کو واپس گھر چھوڑ آتا۔

فلیٹ میں مدھو کے آجانے کے بعد پہلے اتوار کو جب مکتا آئی تھی تو اس نے کہا تھا۔

"تمہارے گھر میں بُو آرہی ہے۔"

"کس چیز کی بُو؟" مدھو نے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا پتہ؟ تم شاید گھر کی صفائی ٹھیک طرح نہیں کرتیں۔"

مدھو روز فلیٹ کا ایک ایک کمرہ صاف کرتی تھی اسے کسی چیز کی بُو محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن مکتا جب کبھی آتی تو آتے ہی کہتی "گھر میں بُو آرہی ہے۔"

مدھو اس فلیٹ میں نئی بیاہ کر آئی تھی۔ اسے خود بھی پتہ تھا کہ بچی جھوٹ نہیں بول سکتی ضرور گھر میں کسی کی بُو ہوگی جو اسے محسوس نہیں ہوتی، اس لئے وہ روز خوب صفائی کرتی۔

شادی کو دو مہینے ہی گزرے تھے کہ ایک روز سریش نے مدھو سے کہا "ایک پرابلم آگیا ہے، مدھو ڈیر۔"

"کیا ہوا؟" مدھو نے پوچھا۔

"سریتا کی ماں سریتا کو اپنے ساتھ لے جارہی ہے۔ سریتا کے ڈیڈی کی، یہاں سے بہت دور رہتے ہیں۔ سریتا یہاں رہتی تھی تو میں مکتا کو سیدھا جاکر لے آتا تھا۔ اب اگر سریتا اپنی ممی کے ساتھ چلی گئی تو مکتا کو لانا میرے لئے مشکل ہو جائے گا۔"

"تو آپ سریتا سے کہہ کر مکتا کو ہمیں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

"عدالت جو مکتا کو اس کی ماں کے حوالے کر چکی ہے۔"

"لیکن یہ بچی کے مستقبل کا سوال ہے، اس کی تعلیم کا سوال ہے۔ پھر سریتا ابھی جوان ہے وہ ساری عمر اکیلے نہیں گزار سکتی۔ اسے زندگی کا کوئی ساتھی تو ڈھونڈنا ہوگا۔ سوتیلا باپ پتہ نہیں بچی کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ تم سریتا سے بات کرو، بچی کے مستقبل کا حوالہ دو..."

سریش نے اس کی بات کاٹ کر کہا "تم سریتا کو نہیں جانتیں۔ اگر اس میں بات سمجھنے کی صلاحیت ہوتی تو ہم طلاق ہی کیوں لیتے۔ جانتی ہو طلاق کے بعد وہ میری صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ جب میں اتوار کو مکتا کو لینے جاتا ہوں تو وہ مجھے گھر میں بھی نہیں بلاتی۔ ذرا سا دروازہ کھول کر مکتا کو باہر دھکیل دیتی ہے اور پھر دھڑاک سے دروازہ بند کرلیتی ہے۔"

مدھو کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی "اگر آپ اجازت دیں تو میں سریتا سے جاکر ملوں؟"

"تم سریتا سے جاکر ملوگی؟" سریش حیرت سے بولا — "کیوں؟"

"میں اس کو سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ یہ اس کی بچی کے مستقبل کا سوال ہے۔ آپ دونوں میں اگر نہیں نبھ سکی تو اس میں معصوم بچی کا کیا قصور ہے۔ اگر سریتا کو آپ سے نفرت ہے تو اس نفرت کی آگ میں وہ اپنی بچی کا مستقبل کیوں جھلسا رہی ہے۔"

سریش نے ہنس کر کہا "تم اپنی بے عزتی کرانا چاہتی ہو؟"

"مکتا آپ کی بیٹی ہے اور اب میں آپ کی بیوی ہوں، اس لئے مکتا کی جتنی ذمہ داری آپ پر ہے، اتنی ہی مجھ پر ہے۔ مجھے ایک کوشش کرنے دیجئے۔ ایک عورت دوسری عورت کی بات جلد سمجھ لیتی ہے۔ شاید سریتا میری بات مان جائے۔"

"تو کیا تم مکتا کو ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ رکھ سکوگی؟"

"کیوں نہیں؟ مکتا بڑی پیاری بچی ہے۔ میں بھی گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔ اس طرح میرا دل بھی بہلا رہے گا۔"

"آل رائٹ ڈیر۔ تمہاری مرضی — میری جانب سے اجازت ہے تم سریتا سے مل سکتی ہو۔ لیکن اگر وہاں تمہاری بے عزتی ہوجائے تو مجھے الزام نہ دینا۔"

"نہیں میں تمہیں الزام نہیں دوں گی۔" مدھو نے مسکرا کر جواب دیا۔

دوسرے دن مدھو نے سریتا کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ ایک عورت نے آکر دروازہ کھولا۔ عورت کے کپڑے میلے اور بے ڈھنگے تھے۔ سر کے بال بھی اُلجھے ہوئے کاندھوں پر پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہفتہ بھر سے نہائی نہ ہو۔

دونوں عورتیں کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں، پھر مدھو نے پوچھا "کیا آپ سریتا جی ہیں؟"

"ہاں —" سریتا نے سر ہلا کر کہا "تم کون ہو؟"

"میرا نام مدھو ہے۔"

"اوہ! تم یہاں کیوں آئی ہو؟" سریتا نے ناگواری کے لہجے میں کہا۔

"آپ سے ملنے۔"

"مجھ سے ملنے کی تمہیں کیا ضرورت آپڑی؟" اس بار سریتا کا لہجہ تلخ تھا۔

"میں آپ سے مکتا کے بارے میں کچھ بات کرنے آئی ہوں۔ کیا آپ مجھے گھر کے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دیں گی؟"

سریتا نے چند لمحے سوچا — پھر بولی۔

"اچھا، اندر آجاؤ۔"

گھر میں قدم رکھتے ہی مدھو کو اندازہ ہو گیا کہ سریتا اور سریش میں کیوں نہیں بن سکی۔ سریتا میں سلیقہ نام کو نہ تھا۔ گھر کی ہر چیز بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سریتا ہفتے میں ایک بار ہی گھر کی صفائی کرتی ہے۔ صحن میں بغیر دُھلے برتن اور کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ دیواروں پر دھبے تھے۔ ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی تھی۔

لیکن مدھو سریتا کا سلیقہ دیکھنے نہیں آئی تھی۔ اس نے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے سریتا کو سمجھانا شروع کیا کہ اگر وہ اپنی بچی کا مستقبل بہتر دیکھنا چاہتی ہے تو مکتا کو اس کے باپ کے پاس رہنے دے۔ ایک گھنٹے تک وہ سر کھپاتی رہی تب کہیں جاکر وہ سریتا کو یقین دلا سکی کہ بچی کا مستقبل سریش اور سریتا کی باہمی نفرت سے زیادہ اہم ہے۔ آخر اس نے سریتا کو اس بات پر راضی کر ہی لیا کہ مکتا اپنے باپ کے ساتھ رہ سکتی ہے۔

سریش نے جب یہ سُنا کہ سریتا نے مکتا کو اس کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی ہے تو خوشی اور ممنونیت سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولا۔ "مدھو، یہ تم عورت نہیں ہو بلکہ دیوی ہو۔ یہ کام تم ہی کر سکتی تھیں۔"

مدھو کو خوشی ہوئی کہ وہ اپنے شوہر کو تھوڑی سی خوشی دے سکی۔

دوپہر کو سریش مکتا کو اسکول سے ہی لے آیا۔ سریتا نے مکتا کو بتا دیا تھا کہ آج سے وہ اپنے باپ کے ساتھ ہی رہے گی۔ سریش کو اپنے آفس جانے کی جلدی تھی، اس لئے وہ مکتا کو دروازے تک ہی چھوڑ کر چلا گیا۔

مکتا اندر داخل ہوئی۔ وہ کچھ جھینپی جھینپی سی تھی۔ اپنا بستہ ایک طرف رکھ کر وہ مدھو کے پاس آئی اور گناہ گاروں کی طرح نظریں جھکا کر بولی۔ "آپ میری ممی کے گھر گئی تھیں؟"

"ہاں مکتا۔" مدھو نے اس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گی۔"

مکتا نے اپنا سر اس کے سینے میں چھپا کر روتی آواز میں کہا۔ "میں جھوٹ بولتی تھی — آپ کے گھر میں بو نہیں آتی۔ آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔ آپ بھی بہت اچھی ہیں۔ میری ممی کا گھر بہت گندا ہے۔ وہاں بو آتی ہے۔"

مدھو نے مکتا کا چہرہ اوپر اُٹھا کر اس کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹی مکتا بہت اچھی ہے۔ مگر وعدہ کرو کہ اب تم کبھی جھوٹ نہیں بولو گی۔ کبھی مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گی۔"

"تو آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"

مکتا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں مکتا! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

"تم بہت اچھی ہو ممی۔" مکتا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور وہ مدھو سے اس طرح لپٹ گئی جیسے وہ اس کی سگی ماں ہو۔

***

فریج کی صفائی

فریج کو دھونا: فریج کو کبھی صابن کے ساتھ نہ دھوئیں بلکہ گرم پانی سے ہی دھونا کافی ہے۔ پانی میں سوڈا بائی کارب گھول کر فریج کو دھوئیں۔ فریج اچھی طرح صاف ہو جائے گا۔ سوڈا تھوڑی مقدار میں ڈالئے۔ اس کے بعد صاف کپڑے سے فریج کو خشک کر لیں۔

فریج کی بُو دُور کرنا: فریج کے اندر سے اگر کسی قسم کی بُو آ رہی ہو تو کوئلہ کو پیس کر کسی پلیٹ میں رکھ دیں۔ چند ایام کے بعد کوئلے کو بدل دیا کریں۔

فریج کی چمک برقرار رکھنا: اگر آپ چاہتی ہیں کہ فریج نیا دکھائی دے تو امونیا کے چند قطرے تھوڑے سے پانی میں ملا کر اس محلول سے فریج کو صاف کریں۔ اس کے بعد کسی نرم کپڑے سے پونچھ لیں۔

فریج میں چیزوں کو رکھنا:

فریج میں تمام چیزوں کو ڈھک کر رکھیں، تاکہ ان میں نمی پیدا نہ ہونے پائے۔ گرم چیزیں ہرگز نہ رکھیں۔ بلکہ انہیں ٹھنڈا کر کے رکھیں۔

فریج میں رکھی ہوئی چیزوں کو استعمال کرنا:

- فریج میں سے جو بھی چیز نکالیں، اسے دو چار منٹ باہر رکھیں اس کے بعد اسے استعمال میں لائیں۔
- فریج میں پینے کا پانی جب بھی رکھیں اس کی بوتل کس کے بند کر کے رکھیں تاکہ پانی فریج میں نہ گرے۔ باقی پینے کا پانی بھی ہمیشہ ڈھک کر رکھیں۔
- سبزیاں اور پھل کبھی بھی فریج میں بغیر دُھلے نہ رکھیں ہمیشہ دھو کر اور سُکھا کر رکھیں۔
- آدھے کٹے پھل جیسے پپیتا، خربوزہ وغیرہ پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ کر فریج میں رکھیں۔

شوگر کی بیماری

ذیابیطس کا روگ آج کل بہت عام ہو گیا ہے خوش حال طبقے میں یہ بہت بڑھتا جا رہا ہے اس کی وجہیں غلط قسم کا کھانا پینا، ذہنی کوفت، فکر، پریشانی، تیز رفتار دنیاوی بھاگ دوڑ، عدم قناعت اور جسمانی کام سے اجتناب وغیرہ بتائی جاتی ہیں۔ یہ مرض جسم میں کسی وجہ سے ہارمون انسولین کی نسبتاً کمی ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے لبلبہ کی جگہ پیٹ میں معدے کے پیچھے ہوتی ہے۔ ذیابیطس کے مرض میں انسولین لبلبے سے کسی وجہ سے یا تو پیدا نہیں ہوتی یا باہر نہیں نکلتی، یا باہر آنے کے بعد اس کا عمل موقوف اور اثر زائل ہو جاتا ہے۔

انسولین کے عمل سے خون میں شوگر کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح انسولین کی کمی کی وجہ سے خون میں شوگر کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور اس زیادتی کی وجہ سے جسم کے مختلف اعضاء اور حصوں پر اس کے نقصانات ظاہر ہوتے ہیں۔ جسم میں انسولین کی کمی ہو جانے کی ٹھیک ٹھیک وجہیں معلوم نہیں ہو سکی ہیں، مگر موروثی خاندانی وائرس کا لبلبے پر اثر، فکر، پریشانی اور جسم میں کسی وجہ سے بیماریوں سے بچاؤ کے نظام کا کمزور پڑ جانا اس کی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ کچھ ادویات کا بے جا یا غلط استعمال بھی یہ مرض پیدا کرتا ہے

عام طور پر ذیابیطس کے مریض کو پیشاب کی حاجت اور مقدار کی زیادتی بار بار ستاتی ہے۔ اسے زیادہ پیاس، زیادہ بھوک محسوس ہوتی ہے، مگر وزن میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ تکان، سستی، کمزوری، جسم کا ٹوٹنا، جلد پر خارش، پھوڑے پھنسیوں وغیرہ کا ابھرنا کسی زخم کا جلد ٹھیک نہ ہونا، نظر کی کمزوری دانتوں، مسوڑھوں میں درد اور سوجن، ہاتھ پیروں کی انگلیوں کا سُن ہونا وغیرہ اس بیماری کی دوسری علامتیں ہیں۔ لیکن عام حالات میں مریض کو کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

عموماً اتفاقیہ ٹیسٹ میں یہ مرض سامنے آتا ہے۔ اگر خالی پیٹ خون کے ٹیسٹ میں شوگر ایک سو چالیس ملی گرام سے زیادہ یا ناشتے کے دو گھنٹے بعد ایک سو پچاس ملی گرام سے زیادہ ہو، یا پھر کسی بھی وقت خون میں شوگر دو سو ملی گرام سے زیادہ ہو تو ذیابیطس کے مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے۔ اس طرح اگر خالی پیٹ خون ٹیسٹ میں شوگر ایک سو چھ ملی گرام سے کم اور ناشتے کے دو گھنٹے بعد ایک سو چالیس ملی گرام سے کم ہو تو ذیابیطس کے مرض کا احتمال نہیں ہوتا۔

خون میں شوگر اور چربی دُور کرنے کے لئے ایسی غذا مناسب ہے جس میں کاربوہائیڈریٹ کی کمی ہو۔ اس کے ساتھ ریشے بھی زیادہ ہوں تو بہتر ہے۔ غذا کو دن میں چار پانچ مناسب وقفوں کے ساتھ لیا جائے تو اچھا رہتا ہے۔ خاص طور پر انسولین کا ٹیکہ لینے والے مریض کے لئے اس بات پر عمل کرنا زیادہ ضروری ہے۔ کم کاربوہائیڈریٹ اور زیادہ ریشے والی غذا (مثلاً سبزیاں، سلاد، پھل، دالیں، مکئی، باجرہ بے چھنا آٹا وغیرہ) مناسب خوراک ہیں۔ تھوڑی مقدار میں آلو بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ غذا ذیابیطس کے ان مریضوں کے لئے درست ہے جہاں انسولین کا ٹیکہ استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ دوسری قسم کے ذیابیطس کے مریضوں کے لئے غذا میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہاں خوراک میں کمی اہم ہے، کیوں کہ وزن کم کرنا مطلوب ہے۔ یہاں غذا میں چربی، گھی کا تناسب بیس یا تیس فی صد ہونا چاہئے اور کاربوہائیڈریٹ چالیس پچاس فی صد کے قریب ہوں۔ سادہ، عام چینی مٹھائی اور تمام شکر والے مشروبات سے پرہیز ضروری ہے چپاتی، ٹوسٹ، تھوڑے سے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی سوئیاں تھوڑی مقدار میں آلو اور معقول مقدار میں سبزیاں، سلاد اور کچھ پھل لئے جا سکتے ہیں۔ ثابت پھل کھا لینا پھلوں کے جوس سے بہتر ہوتا ہے۔ مریض کے لئے آم، آم کا ملک شیک، گنا اور گنے کا رس سختی سے منع ہے۔ ذیابیطس میں شوگر کا بدل سکرین ہے۔ شکر کی متبادل گولیوں، سکرین وغیرہ کا استعمال مناسب تعداد اور مقدار میں مریض کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ تاہم شہد کا بے جا استعمال مناسب نہیں ہے، کیوں کہ اس سے خون میں شکر بڑھتی ہے البتہ کبھی کبھار ایک دو چھوٹے چمچے شہد کے لئے جا سکتے ہیں۔

باقاعدہ ورزش اور سیر کا عمل ذیابیطس کے مریض کے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ اس سے شوگر کنٹرول ہو جاتی ہے۔ کریلے کا جوس یا کریلے خشک کر کے ان کو پیس کر بنا یا ہوا سفوف یا پھر جامن کا استعمال بہت فائدہ مند ہے۔ جامن کی گٹھلیاں، لوکاٹ کے پتے میتھی کی روٹی وغیرہ شوگر کے مریض استعمال کریں تو شوگر کافی کنٹرول ہو سکتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ انسولین کے ٹیکے کا استعمال بیماری کی آخری اسٹیج میں ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ انسولین نقصان دہ ہوتی ہے۔

یاد رکھئے، انسولین کا ٹیکہ صحت اور جان بچا سکتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال صحیح طور پر ہونا چاہئے۔

●●

آنسوؤں کے اسیر

سعید ریاض

اس روز وہ بہت اُداس اُداس اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا تھا میری آمد پر بھی اس نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

جاوید میرے دوست اختر کا بیٹا ہے میں چھوٹے چھوٹے بچوں سے بہت پیار کرتا ہوں اس لئے محلے کے سارے معصوم بچے میرے گہرے دوست ہیں۔ جاوید چونکہ میرے دوست کا لڑکا ہے اور ساتھ ہی پڑوسی بھی، اس لئے میری، اس کی دوستی بھی بہت گہری ہے ہر شام میں جب اپنے دفتر سے واپس آتا ہوں تو وہ میرا انتظار کرتا ہوتا ہے۔ ایک معصوم فرشتہ کی طرح۔ کبھی کبھی اسے دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ کیونکہ آج سے کچھ سال پہلے میرے دروازے پر ہر شام کو ایک اور معصوم میرا انتظار کیا کرتی تھی، اپنی والہانہ محبت اور تمنا کا خزانہ لئے۔ مگر ایک دن میری اتنی پیاری دوست کے اندھیروں میں گم ہو گئی اور میرا دروازہ میری

اقوالِ زریں

- تجربہ ہی سب سے بڑا اُستاد ہے
(سوامی ویویکانند)
- اخلاق جمالی حسن کی کمی کو پورا کر دیتا ہے
(سوئیٹ مارڈن)
- ہمیں جو کچھ بھی چاہئے اسے مسکراہٹ کی طاقت سے حاصل کرو نہ کہ تلوار کی (شیکسپیر)
- کچھ سیکھنا اور اچھی سے اچھی منزل مندی ارادہ ہے۔ (نپولین)
- جو آدمی ارادہ کر سکتا ہے اس کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے (ایمرسن)
- انسان کو گناہ گار کہنا بذاتِ خود گناہ ہے
(سوامی ویویکانند)

زندگی کی طرح تنہا، اُداس رہ گیا۔ وقت گزرتا رہا میری تنہا زندگی کو دیکھ کر اختر نے کئی بار شادی کا مشورہ دیا مگر میں اپنی گھریلو الجھنوں کے باعث اس مسئلے کو ٹالتا رہا ہوں۔

اختر شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی خوش نہ تھا۔ شادی کے پانچ سال گزر جانے پر بھی ان کا گھر کسی معصوم بچے کی کلکاریوں سے محروم تھا۔ دونوں میاں بیوی نے ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر دعا پر قناعت کر لی تھی۔ مگر اختر کی بیوی عائشہ کے چہرے کی اُداسی دن بدن گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہر وقت کسی غم میں ڈوبی رہتی تھی۔ اس لئے ایک دن میں نے عائشہ سے کہا "عائشہ، تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کسی بچے کو گود لے لو"

"بچہ گود لے لوں؟"

"ہاں عائشہ"

"مگر اپنا بچہ کون دے گا؟"

"عائشہ، تم یتیم خانے سے کوئی بچہ لے لو۔ ایک طرف تمہاری ممتا کی پیاس بجھ جائے گی وہاں ایک بے سہارا بچے کو ماں باپ

زبان کی حفاظت

کہتے ہیں انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہے۔ زبان کی لغزش کو قدم کی لغزش سے زیادہ مہلک قرار دیا گیا ہے۔ زبان کی لغزش ہمیشہ امورِ شر کا ادراک کرتی ہے اور اس سے تخریبی پہلو کو تقویت ہوتی ہے۔ ہر مذہب میں زبان سے سرزد ہونے والی آفت سے محفوظ رہنے کی تلقین کی گئی ہے جن کی زبان احسن ہے۔ ایسے لوگ علم اور حکمت سے بہرہ مند ہیں اور ان کا وجود سارے سماج کے لئے مینارِ نور ہے۔ زبان کی جن خطاؤں سے خاص طور پر گریز لازم ہے، وہ ہیں دروغ گوئی، دو غلاپن، فحش کلامی، کسی پر لعنت ملامت کرنا، چغل خوری، لوگوں کا مذاق اُڑانا، تحقیر، غیبت، ان بُری عادتوں سے اجتناب میں ہی فلاح مضمر ہے۔ لہٰذا اپنی زبان کو قابو میں کریں اور خدا کے حضور پشیمان نہ ہوں۔

(ڈاکٹر سلطیہ سعید)

مل جائیں گے۔ کوئی معصوم بے آسرا تمہاری ممتا کی چھاؤں تلے بڑھ پل کر ایک اچھا شہری بن سکتا ہے۔ عائشہ، تمہیں بچے کی ضرورت ہے۔ تمہاری ممتا ایک معصوم کے لئے تڑپ رہی ہے۔ لیکن کچھ ایسے معصوم بھی ہوتے ہیں جن کو بے فصل پھل کی طرح لوگ نفرت سے ٹھکرا دیتے ہیں اور پھر وہ ننھے ننھے معصوم نفرت اور رحم کی صلیب پر لٹکے ہوئے پلتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کو سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، کبھی ان سے جان لیوا مشقت لی جاتی ہے۔"

"مگر بھائی صاحب، یتیم خانوں کے بچوں کا تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون ہیں، کس مذہب کے ہیں؟"

"عائشہ، بچوں کا کوئی مذہب یا قوم نہیں ہوتی۔ وہ صرف ممتا کے پیاسے ہوتے ہیں، چاہے یہ ممتا انہیں کہیں سے ملے۔"

عائشہ اور اختر نے میری بات مان لی۔

وہ شانتی نکیتن سے ایک خوب صورت سا بچہ لے آئے، جس کی عمر چھ ماہ کی ہو گی۔ شانتی نکیتن کے ذمہ داروں نے بچے کے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ یہ انسان کا بچہ ہے اور کبھی ان کے دروازے کی سیڑھیوں سے یہاں تک پہنچا ہے۔ نکیتن کے ذمہ داروں کی بات سن کر میرا تن بدن کانپ اٹھا اور میں سوچنے لگا کہ وہ انسان جو کائنات کے ذرہ ذرہ کو مسخر کرنے کی کوشش میں مشغول ہے، اخلاقی اعتبار سے کن پستیوں میں گر گیا ہے۔

میں نے بچے کا نام جاوید اختر رکھا جو عائشہ اور اختر دونوں کو بہت پسند آیا۔ دونوں میاں بیوی اس کھلونے کو پا کر بہت خوش تھے۔ کچھ دن بعد میں نے محسوس کیا کہ عائشہ یہ بھول گئی تھی کہ یہ بچہ اس کا اپنا نہیں۔ وہ رات دن اس کے لاڈ پیار میں لگی رہتی تھی۔ میں بھی روز جاوید کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

دن چپ چاپ گزرتے رہے جاوید بڑا ہوتا گیا۔ اب وہ بہت شریر ہو گیا تھا لیکن ایک بات نے مجھے سوچ کی سولی پر ٹانگ دیا تھا۔ میں نے کچھ عرصے بعد محسوس کیا کہ کبھی کبھی جاوید کے ساتھ کھیلتے کھیلتے عائشہ اُداس ہو جایا کرتی تھی اور اس کے چہرے پر بے نام غم کی بے شمار پرچھائیاں اُبھر آتی تھیں۔

ایک دن میں نے عائشہ سے پوچھ ہی لیا۔ "عائشہ، تم اکثر جاوید کے ساتھ کھیلتے ہوئے اُداس ہو جاتی ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ میرے اس سوال پر گھبرا گئی۔

"عائشہ، تم مجھے بھائی کہتی ہو پھر کیا

تم سمجھتی ہو کہ ایک بھائی اپنی بہن کے چہرے پر ابھرنے والی درد کی لکیریں نہ پڑھ سکے گا؟ ضرور کوئی بات ہے جو تم ہنستے ہنستے ایک دم اداس ہو جاتی ہو۔"

"بھائی صاحب، کبھی کبھی جاوید کے ساتھ کھیلتے کھیلتے میرے دل کے کسی گوشے میں ایک سوال سر ابھارتا ہے۔ کاش میرا اپنا بچہ ہوتا تو وہ بھی اسی طرح کھیلتا۔"

میں اس کے اس جواب پر کانپ اٹھا اور میرے دل میں ایک درد جاگ اٹھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "عائشہ، کیا جاوید تمہارا بچہ نہیں؟ یہ بھی تمہارا ہی بچہ ہے۔ اس معصوم کے ماں باپ کون ہیں، یہ کسی کو نہیں معلوم۔ پھر تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ یہ سچ ہے کہ تم نے اسے اپنی کوکھ سے پیدا نہیں کیا، مگر اس کی پرورش تمہاری آغوش میں ہو رہی ہے یہ تم کو ہی ممی کہہ کر پکارتا ہے۔"

میری بات سے عائشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی "ندیم بھائی، میں ایک عورت ہوں اور عورت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کی کوکھ سے کسی کا جنم نہ ہو۔"

"نہیں عائشہ، تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ عورت ماں بھی ہے اور ماں ممتا کی مورت، ایثار کا مجسمہ ہوتی ہے۔ میری بہن، تم کبھی اس طرح نہ سوچا کرو۔ صرف تم ہی نہیں، نہ جانے کتنی عورتیں ایسی ہوں گی جن کی گود سونی ہے۔ خدا کی مرضی میں ہمیں کس کو دخل ہے، عائشہ۔ ہمارا خدا ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔ وہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے تمہاری گود کیوں سونی رکھی ہے۔ خدا کے اس کام میں ضرور تمہاری بھلائی ہے۔ تم کبھی نہ بھولنا۔ اللہ کا ہر کام انسان کی بھلائی اور بہتری سے عبارت ہے۔ مگر اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔"

عمر کے ساتھ جاوید کی شرارتیں بھی

منتظر رہے

- زیادہ کمانے والا بیماری کا۔
- اوباش یا بدوں والا بربادی کا
- چغل خوری کرنے والا ذلت و خواری کا
- ماں باپ کا نافرمان اپنی اولاد کی نافرمانی اور مفلسی کا۔
- خسر اور ساس سے برا برتاؤ کرنے والا اپنے داماد کے ایسے ہی سلوک کا
- ظلم کرنے والا اپنی ہلاکت کا۔
- پڑوسی کو تکلیف پہنچانے والا خدا کے قہر و غضب کا۔

بہترین نیکی اور شرافت ہے

- قابو پا کر معاف کر دینا
- اہل و عیال والے مفلس کی خفیہ مدد کرنا۔
- مخفی قرض اور حق کو ادا کر دینا۔
- حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا مٹانے کے لئے خاموش ہو جانا۔
- کم زور اور مفلس کی حمایت کرنا۔
- جہاں کوئی نہ کہہ سکے اور ضرورت ہو وہاں حق بات کہہ دینا۔
- برائی پانے کے باوجود رشتہ داروں کے ساتھ احسان و سلوک کرتے رہنا۔

بڑھتی گئیں اور شرارتوں پر اس کی پٹائی بھی بڑھتی گئی۔ اس روز جاوید نے جب میری آمد پر کسی خوشی کا اظہار نہ کیا اور اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا تو میں نے اس کے قریب جا کر اسے پکارا۔

"کیا بات ہے جاوید؟"

لیکن جب اس نے سر اٹھایا تو میں اداس ہو گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی معصوم آنکھوں میں آنسوؤں کے دیپ جھلملا رہے تھے۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟"

میری اس بات پر اس نے روتے ہوئے کہا۔ "انکل، پرائی اولاد کیسی ہوتی ہے؟"

میں اس کی اس بات پر حیرت کے سمندر میں گرتا چلا گیا اور سیکڑوں اندیشوں نے میرے ذہن میں سوچ کی ریت بھر دی۔

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

وہ بولا "انکل، آج ممی نے کہا کہ تو پرائی اولاد ہے۔" اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتے روتے وہ بار بار ایک ہی سوال دہرا رہا تھا: "کیوں انکل یہ پرائی اولاد کیا ہوتی ہے؟"

میں اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا اور اس رات میں سو بھی نہ سکا۔ رات بھر میں سوچتا رہا کہ نہ جانے کتنے جاوید ہوں گے جنہوں نے اپنے ماں باپ کے ان جذبات کے ردِ عمل کے طور پر جنم لیا ہوگا اور ان کے معصوم ذہن اس سوال کی قید میں ہوں گے کہ پرائی اولاد کیا ہوتی ہے؟ میں سوچ رہا تھا کہ گناہ جذبات کی دلدل میں پھنسے لوگ کرتے ہیں، مگر اس کی سزا ان ننھے فرشتوں کو کیوں ملتی ہے جن کی معصوم زندگی ماں کی آغوش اور ممتا کے لئے ترستی رہتی ہے، جن کی بے سایہ زندگی ہمیشہ اداسیوں کے صحرا میں بھٹکتی رہتی ہے، جن کا ذہن ایک ہی سوال کی زنجیر میں جکڑا رہتا ہے کہ — پرائی اولاد کیا ہوتی ہے؟

جاوید کے اس سوال پر میرے احساس پر اندیشوں اور خوف کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کل جاوید کو جب اپنے اس سوال کا جواب مل جائے گا تو اس کی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوگا؟ کیا وہ حالات سے سمجھوتا کرے گا یا وہ حالات سے باغی ہو کر گناہوں کی راہ اختیار کر لے گا؟

اب
حاصل کرنے کا آخری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں

شبستاں اُردو ڈائجسٹ کی طرف سے شائع کئے ہوئے غالب نمبر اور فیض نمبر کے بارے میں بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس کے پاس یہ خصوصی نمبر ہیں وہ اُنہیں اپنے سے جُدا کرنا نہیں چاہتا اور جسے وہ حاصل نہ ہو سکے اُسے انہیں پانے کی تمنّا ہے۔

ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہے کہ غالب نمبر کی صرف تین سو کاپیاں اور فیض نمبر کی صرف دو سو کاپیاں ہمارے پاس محفوظ اسٹاک میں رکھی ہوئی مل گئی ہیں۔ اگر آپ یہ معرکتہ الآرا نمبر جو تاریخ کا ایک حصّہ بن گئے ہیں، اور آنے والی نسلوں کے لئے دستاویز کی صورت اختیار کر گئے ہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی منی آرڈر سے پچاس روپے بھجوادیں، یہ نمبر رجسٹری سے بھجوا دیے جائیں گے۔

تاریخ بتائے گی کہ یہ دونوں نمبر سونے سے تولے گئے تو سونا اِن کے آگے ہیچ ہوگا۔ اگر آپ کو ایک نمبر چاہیے تو اس کے لئے پچیس روپے کا منی آرڈر روانہ فرمائیں اور منی آرڈر کی رسید خط کے ذریعہ ہمیں بھیج دیں۔ اِن نادر اور نایاب نمبروں کو حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہے کیوں کہ یہ نمبر پھر سے طبع نہیں کئے جائیں گے۔

افسوس ہے یہ نمبر ایجنٹ حضرات کو نہیں بھیجے جائیں گے اور لائبریریوں یا دوسرے اداروں کو کوئی کمیشن بھی نہیں دی جا سکے گی۔

شمع بک ڈپو ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قلمی دوستی

نام : محمد خالد خان عمر : ۲۶ سال
پتہ : بلاک ایل بی - ۱۴۸ - نارتھ ناظم آباد کراچی (پاکستان)
شوق : مطالعہ - کرکٹ میوزک - قلمی دوستی۔

نام : محمد عبد المتین عمر : ۲۰ سال
پتہ : مکان نمبر 342/1A-1-20، کوکا بازار حسینی علم روڈ حیدرآباد (اے پی) ۲۶۴--۵
شوق : فٹبال، تیراکی، اتھیلیٹکس، فوٹو گرافی، قلمی دوستی، شعر و شاعری

نام : محمد اکبر یو - اے عمر : ۲۰ سال
پتہ : ۹۲/۱۰۲ یو-ایم - اے ہاؤس، ایم ایس - روڈ بھٹکل ۸۰۰۰۴
شوق : شعر و شاعری، قلمی دوستی، نئے تجربہ کرنا اسٹامپ اور سکے جمع کرنا

نام : سید معظم راز عمر : ۱۸ سال
پتہ : ۴۴-۵-۸-۱۶، جدید ملک پیٹھ حیدرآباد (آندھرا پردیش) ۳۶--۵
شوق : قدرتی حسن کا نظارہ اور ان کی فوٹو گرافی کرنا، ہندوپاک کے جاسوسی، مہاتی، رومانی، رسالوں کا مطالعہ کرنا، کھیلوں میں حصہ لینا

نام : تبریز علی عمر : ۲۷ سال
پتہ : A-S-K ۱۱۹۳- ریاض پوسٹ باکس نمبر ۴۴۳۴۴ ۹
شوق : قلمی دوستی کرنا، تیرنا۔ درد بھرے گیت سننا۔ اسٹامپ جمع کرنا

نام : طارق عظیم عمر : ۱۲ سال
پتہ : ۵۲۱۶، کوچہ رحمان، چاندنی چوک، دہلی ۶--۱۱
شوق : فوٹو گرافی، مکیش کے گانے سننا، کرکٹ اور شطرنج کھیلنا

نام : ابو طلحہ عمر : ۱۹ سال
پتہ : معرفت اے۔ ایس۔ ایچ صابر، ای ای ای ٹرانسمیشن ڈویژن، سہرسہ (بہار) ۸۵۲۲۰۱
شوق : فوٹو گرافی کرنا، کار چلانا، کرکٹ کھیلنا خوبصورت جگہوں کی سیر کرنا وغیرہ

نام : سید عارف علی، عمر : ۲۸ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۲۷۵۸۱، الریاض - ۱۱۵۹۴ (سعودی العربیہ)
شوق : قلمی دوستی کرنا، میوزک، سیاحت، فوٹو گرافی، اسپورٹ، اخبار اور رسالے۔

نام : محمد عبد القادر راز ورنگلی عمر : ۱۶ سال
پتہ : مکان نمبر ۲۳-۱-۱۰۶۲، پنج محلہ، چار مینار، حیدرآباد ۲--۵
شوق : قلمی دوستی، شاعری، اسٹامپ جمع کرنا، کرکٹ، پرانی فلمی غزلیں، قدرتی مناظر۔

نام : ایم۔ ایم۔ شاہد ہادی عمر : ۱۸ سال
پتہ : مکان نمبر ۲۳۲، دھرم آباد، ضلع ناندیڑ
شوق : کتابیں پڑھنا، مکیش اور رفیع کے گانے سننا، شطل کھیلنا۔

نام : عبد الغفور عمر : ۱۹ سال
پتہ : ڈیوٹی الیکٹریشن، روم۔ کے۔ پی۔ ٹی اسپتال کیماڑی کراچی نمبر ۲ (پاکستان)
شوق : قلمی دوستی، سیر و تفریح۔

نام : پرویز عالم عمر : ۲۲ سال
پتہ : گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ (بہار)
شوق : خطوط لکھنا، قلمی دوستی کرنا۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ بانو کا مطالعہ کرنا۔

نام : محمد یوسف انصاری عمر : ۲۲ سال
پتہ : معرفت ایم۔ ولے آٹو پارٹس، ۲۵۔ دولت گنج، اندور (ایم پی)
شوق : لڑائی جھگڑا کرنا۔ آتے جاتے (راہ چلتے) لوگوں کو پریشان کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

نام : محمد عامر خاں عمر : ۲۵ سال
پتہ : محلہ ماہ صوفیل، شاہجہانپور تحصیل مواتہ، ضلع میرٹھ
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ بہن بھائیوں کے خطوں کے پابندی سے جواب دینا۔ شعر و ادب سے دلچسپی، نماز پڑھنا، ورزش کرنا اور دوستوں کے لئے جان کی بازی لگا دینا

نام : سید محمد شاہ عمر : ۲۷ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۲۔ البھاد۔ الجاریہ، سعودی عرب

نام :
عمر :
پتہ :
شوق :

شوق : قلمی دوستی کرنا۔ کرکٹ میچ دیکھنا اور زندگی بھر دوستی نبھانا
نام : سید انفصال حمید نقوی (عرف صفدری) عمر : ۲۸ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴۵۹۔ الطائف سعودی عرب
شوق : بانو اور شمع پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے پیار کرنا اور اچھے بہن بھائیوں کے خطوں کا جواب دینا۔

نام : محمد اظہر الدین عمر : ۲۲ سال
پتہ : مکان نمبر ۳۵-۶-۴ محلہ احسان نگر، محبوب نگر (اے پی) ۵۰۹۰۰۱
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ بانو کا پابندی سے مطالعہ کرنا۔ ادبی کتابیں پڑھنا کرکٹ کھیلنا۔ ماں باپ کی خدمت کرنا۔

نام : اسامہ انجم عمر : ۲۰ سال
پتہ : مکان نمبر ۳۱۰-۴-۱ بھولکپور، مشیرآباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۸
شوق : اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ غزلیں لکھنا اور پڑھنا۔ میٹھے پکانا۔ خطوں کا پابندی سے جواب دینا۔

نام : مبین اکبر عمر : ۲۰ سال
پتہ : 402 — A امین آباد اپارٹمنٹ، بہرام باغ جوگیشوری بمبئی ۴۰۰۱۰۲
شوق : اخبار اور رسالے پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ کرکٹ کھیلنا اور فلمیں شوٹنگ دیکھنا۔

نام : محمد فہیم عرفان عمر : ۱۶ سال
پتہ : ۵۹۵، بالوجی گلی، تلعہ وانمباڑی (تامل ناڈو) ۶۳۵۷۵۱
شوق : فلمیں دیکھنا، انگریزی ناول پڑھنا، زبانیں سیکھنا، قدرتی مناظر دیکھنا۔

نام : نوید خلیل شیخ عمر : ۲۱ سال
پتہ : مقام پلگھا، بھیونڈی ضلع تھانہ۔ ۴۲۱۱۰۱
شوق : بانو کا مطالعہ کرنا۔ دیگر رسالے پڑھنا۔ نماز پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

نام : محمد شمیم الرحمٰن عمر : ۲۴ سال
پتہ : مقام و ڈاکخانہ پکھرا براہ رائے پور، ضلع سیتامڑھی (بہار)
شوق : خط و کتابت، کتب بینی، جسمانی ورزش، فلم بینی۔

نام : عبدالحمید کے مستری عمر : ۴۵ سال
پتہ : رائی نالاک نمبر ۲۱۸۳ سورت ٹیکسٹائل مارکیٹ، ۳۹۵۰۰۲
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ دوستوں سے رابطہ قائم رکھنا۔ سیر و تفریح اور اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔

نام : ڈاکٹر محمد اسلم عزیز عمر : ۴۳ سال
پتہ : اڈیشنل کارنر، ۵ جاپالیکا کمپاؤنڈ میرٹھ۔ ۲۵۰۰۰۲
شوق : اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ پھلواریاں لگانا وغیرہ

نام : محمد الطاف الدین عمر : ۱۷ سال
پتہ : مکان نمبر ۱۵-۴-۵ اسٹریٹ مجمع مارکیٹ حرل، وزن لیوم ۵۰

شوق : قلمی دوستی کرنا۔ رسالوں میں حصہ لینا۔ اخبارات پڑھنا۔ سائنسی معلومات کرنا۔ سیر و سیاحت کرنا

نام : ایم سرفراز نواز عمر : ۲۵ سال
پتہ : بسم اللہ لاج۔ چھوٹی مسجد جمال پور، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱
شوق : ادبی کتابیں پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ خطوط کے جواب دینا۔ سیر و سیاحت کرنا

نام : حفیظ الرحمٰن عمر : ۲۰ سال
پتہ : ۸۶/۱۷۷ چمن گنج۔ کانپور
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ کنگ، سیر و سیاحت، فوٹوگرافی بلیرڈ کھیلنا۔

نام : قمر الدین خان عمر : ۳۵ سال
پتہ : ۴۵۔ بھگوانداس چال — ۸۰۰ بھوانی پیٹھ، پونہ۔ ۴۱۱۰۰۲
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ اخبار نویسی، کتب بینی۔

نام : عطاء اللہ خاں عمر : ۲۷ سال
پتہ : ۳۸۴/۱۷ چندر کلاں، برہانپور، (ایم۔پی) ۴۵۰۳۳۱
شوق : ڈاک ٹکٹ و سکے جمع کرنا۔ انعامی پہیلیاں حل کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ سیر و سیاحت کرنا

نام : جاوید رضا عمر : ۲۸ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱/۴۱ الحسین، متحدہ عرب امارات
شوق : سیر و سیاحت۔ مطالعہ، میوزک، باغبانی۔

نام : ارشاد رشید عمر : ۲۰ سال
پتہ : اے کیو رشید مکان نمبر ۷-۸-۶ عالم گیر سلطان آباد کریم نگر (اے۔پی) ۵۰۵۱۸۵
شوق : کرکٹ کھیلنا۔ کیرم بورڈ کھیلنا۔ ہنسانا، اسلام پھیلانا۔ نماز پڑھنا قلمی دوستی، غزلیں سننا۔ ڈاک ٹکٹ و سکے جمع کرنا۔

نام : سید پروین عمر : ۱۸ سال
پتہ : غازی بلالپور سرپید کا غذ نگر اسٹیشن روڈ عادل آباد، ۵۰۴۲۹۶
شوق : اچھی کتابیں پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ اصلاحی فلمیں دیکھنا۔ لوگوں کو اچھے کاموں کی طرف راغب کرنا۔

نام : فرحت نسیم عمر : ۲۰ سال
پتہ : شاہ پور بگھونی دایا دیو ضلع سمستی پور (بہار)
شوق : ٹکٹ جمع کرنا۔ رنگ برنگ لوگوں کی کافرادانی پیدل سیر کرنا سکے جمع کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ معلوماتی کتابوں کو پڑھنا

نام : سید سفیر عمر : ۲۳ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۵ الخبر۔ ۳۱۹۵۲ سعودی عربیہ
شوق : اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ [illegible] قلمی [illegible] سبھی کو پسند کرنا

کرفیو

بیخود غازی پوری

زندگی زندگی پہ بھاری ہے
ہر طرف اِک سکوت طاری ہے
اِس قدر لوگ ہو گئے خائف
آنِ واحد میں ہو گئے غائب
ننھے بچے بھی سو گئے شاید
یعنی پتھر کے ہو گئے شاید
شہر کی رونقوں نے دم توڑا
اپنے پیچھے ہزار غم چھوڑا
ہر کوئی اب ڈرا ڈرا سا ہے
رنگِ چہرہ اُڑا اُڑا سا ہے
بے بسی کے گھنیرے سائے ہیں
بیکسی کے اندھیرے چھائے ہیں
سب مقید گھروں کے اندر ہیں
مسجدیں چپ اُداس مندر ہیں
شہر اب بے زبان لگتا ہے، دُور دور دہ خموشیوں کا ہے
خوف و دہشت الم کا سایہ ہے
جانے یہ وقت کیسا آیا ہے
چند کتے اداس سڑکوں پر
بھونکتے پھر رہے ہیں مُردوں پر
کوئی اپنا نظر نہیں آتا
گھر کوئی گھر نظر نہیں آتا
دامنِ صبر اب تو چھوٹ گیا
حوصلہ پست ہو کے ٹوٹ گیا
یا خدا! کیا کریں، کہاں جائیں
مضطرب دل ہے، کیسے بہلائیں
سوچ میں غرق ہو رہا تھا میں
اپنی حالت پہ رو رہا تھا میں
دلِ بیخود سے یہ صدا آئی
ہوش سے کام لے ذرا بھائی
پھر کوئی حادثہ ہوا ہوگا، اِس لئے کرفیو لگا ہوگا

اکیلاپن

وقار مانوی

ہر طرف بھیڑ، شور، ہنگامہ
اُف! جہاں تک نگاہ جاتی ہے
دُور تک
بستیوں کا جنگل ہے
اور اِس بستیوں کے جنگل میں
مستقل اِک ہجوم ہر جانب
لیکن، اتنے ہجوم میں بھی
یہ کیا!
میں اکیلا ہوں، میں تن تنہا
اور یہ رُوداد صرف میری نہیں!!

اب جہاں تک بھی کوئی دیکھ سکے
یہی منظر دکھائی دیتا ہے
کوئی محفل ہو، انجمن ہو کوئی
ہو کہیں بھی کوئی، مگر سب کے
اپنے اپنے الگ مسائل ہیں
ساتھ رہ کر بھی کوئی ساتھ نہیں
جو بھی ہے
اپنی فکر میں گم ہے
درد اپنا ہے، اپنی اپنی چبھن
اپنے دل پر ہے اپنا اپنا ہاتھ
ہم کلامی کے باوجود یہاں
نہیں کوئی کسی کا ہم آواز
مدعا یہ
کہ اتنی بھیڑ میں بھی
آج ہر آدمی اکیلا ہے
دُور کیسے ہو یہ اکیلاپن!!!

اب تک کی کہانی

آفاق ایک خوب رو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے ایک روز اس سجیلے نوجوان کو دیکھا تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے وہ اس کے دفتر میں ملازم ہو گئی مگر آفاق پر اس کے حسن اور اداؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُلٹا اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا۔

کچھ دن بعد جب آفاق نے فلک ناز کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تو اس کا دل کھل اُٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر سہاگ رات سے ہی فلک ناز کو احساس ہونے لگا کہ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اُڑانے پر تلا ہوا ہے۔ دن گزرتے گئے اور فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصّہ اور نفرت کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ ایک دن اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ مگر آفاق نے یہ شرط رکھی کہ آزادی پانے کے لئے پہلے اسے ایک اچھی سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا۔ چاروناچار فلک ناز نے یہ شرط بھی منظور کر لی۔

ملازموں کو آفاق نے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا۔ فلک ناز اکیلے سارے گھر کو صاف ستھرا بنانے میں لگ گئی۔ کھانا پکانے میں اسے سب سے زیادہ دشواری پیش آتی تھی۔ آفاق اس کے سامنے اپنی سگھڑ ماں اور بہن کے گُن اکثر گاتا رہتا تھا۔ اس سے اس کا جی اور جلتا تھا۔ نجات پانے کی دُھن میں وہ کڑی محنت کرتی رہی۔ ایک روز اس نے آفاق سے کہا کہ اس کے پاس گھر میں پہننے کے لئے سادہ کپڑے نہیں تو آفاق بولا "کل آپ میرے ساتھ بازار چلئے گا اور اپنی پسند کے کپڑے لے آیئے گا۔" ہمیشہ جلی کٹی سنانے والے آفاق کی مہربانی کیسے ہو گئی یہ بات سن کر فلک ناز کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

نلکی

بشریٰ رحمٰن

(چودھویں قسط)

نلکی جب پاس سے گزرنے لگی تو اس نے کہا۔

"نلک تم نوکری کر جاتی ہو؟"

"نہیں" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"یہ امریکہ میں میری کلاس فیلو تھی۔"

"اچھا۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" نلکی نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا پھر آفاق کسی اور مہمان سے مخاطب ہوا تو نلکی نے جھٹ اس سے پوچھ لیا۔

"آج کل آپ کہاں ہیں؟"

"آج کل تو میں پاکستان میں ہوں۔"

"یہاں مستقل آ گئی ہیں۔۔۔؟"

"تقریباً آ ہی گئی ہوں۔۔۔ یا آ جاؤں گی۔"

"امریکہ کیوں چھوڑ دیا؟"

اسی وقت آفاق ان کی طرف آ گیا۔ اس نے نلکی کے سوال کا خود جواب دے ڈالا۔

"کیونکہ ان کا دل پاکستان میں تھا۔"

اس پر نوری اتنے خوب صورت انداز میں ہنسی کہ نلکی کو پہلی بار محسوس ہوا جیسے جلترنگ بجتے ہیں۔

"ہاں واقعی آفاق نے سچ کہا ہے۔ میرا دل پاکستان میں تھا میں نے سوچا کہ جسم امریکہ میں رکھ کر کیا کروں گی؟"

پھر کسی نے نلکی کو بلا لیا اور وہ کسی اور طرف متوجہ ہو گئی۔

لیکن ہر بار کسی سے بات کرتے ہوئے۔۔۔ کسی کو کچھ پیش کرتے ہوئے۔۔۔ آتے جاتے

ہوئے فلکی اس کالی ساڑی والی کو ضرور دیکھتی وہ مسلسل مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی کالی ساڑی میں چاند کی طرح نمایاں ہو رہا تھا۔ ہر کوئی اس سے بات کرنے کا خواہاں تھا۔ ہر کوئی اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ جانے وہ بات بات میں چٹکلے چھوڑ رہی تھی یا اس کی گفتگو میں اتنی خوشبو تھی کہ جو کوئی بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا مسلسل مسکراتا رہتا۔ تب فلکی کو احساس ہوا کہ کسی عورت کے لئے صرف خوب صورت ہونا ہی ضروری نہیں، اسے خوب صورت طرزِ تکلم بھی آنا چاہئے۔ اس کے الفاظ کا استعمال بھی موزوں اور شائستہ ہونا چاہئے۔ اور خاص طور پر اس کی ہنسی۔۔۔ اس کی ہنسی اس کی شخصیت کی جان ہونی چاہئے۔ بے ہودہ انداز میں ہنسنے والی عورتوں کو مرد پسند نہیں کرتے۔ اگر گفتگو میں علم اور مزاح کی چاشنی نہ ہو تو کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔

پتہ نہیں فلکی کس طرح باتیں کرتی تھی اور کس طرح مسکراتی تھی مگر اسے یقین تھا کہ وہ نوری کی طرح عالمانہ اور شاعرانہ باتیں ہرگز نہ کر سکتی۔ اس کی ہر بات اور ہر ادا میں غرور تھا۔ صرف جوانی اور حسن کا غرور۔۔۔ ہاں واقعی۔۔۔

وہ بچپن سے اب تک بڑی حقارت سے باتیں کرنے کی عادی تھی۔ یہی رویہ اس نے آفاق کے ساتھ بھی اختیار کیا تھا۔

بھلا کہیں شوہر بھی اس رویے سے مسحور ہوتے ہیں۔

درد کی کچھ لہریں فلکی کے اندر اٹھنے لگیں۔ کتنی غلطیاں ہوئی ہیں اس سے۔

آج کی محفل میں وہ ہر خاتون کو غور سے دیکھ رہی تھی کوئی بھی خاتون محفل میں ناشائستہ حرکتیں نہیں کر رہی تھی۔ نہ اپنے شوہر سے اونچی آواز میں بات کرتی تھی، نہ کسی کے قہقہے۔۔۔ بے ہودگی اور بے باکی کا انداز لئے ہوئے تھے زندگی میں سیکھنے کے لئے کتنا کچھ ہے۔

اور اس نے کیا سیکھا ہے۔

اسے لگے، جب وہ آفاق اور نوری کے قریب سے گزری تو نوری نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"او آفو! اچھے جب سے تم نے چھوڑا! میں نے تو اس جھیل کے کنارے جانا ہی چھوڑ دیا۔"

"اچھا۔۔۔"

"ہاں، تمہیں تو پتہ ہے کنول کے پھول میری جان ہیں۔"

"اس انداز سے مت کہو کہ لوگوں کو کنول کے پھولوں سے حسد ہونے لگے۔" اس پر نوری نے چہرہ اٹھا کر مترنم قہقہہ لگایا۔

فلکی پولس تو پاس سے گزر گئی مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں پر بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

نوری نے کوئی خاص بات نہیں کہی تھی۔ آفاق نے کوئی خاص اشارہ نہیں کیا تھا مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ نہ جانے فلکی یہ سب سننے کے لئے کیوں تیار نہ تھی اسے تو آفاق کا بار بار نوری کے پاس جا کر کھڑا ہونا بھی برا لگ رہا تھا۔۔۔ اسی لئے وہ بہانہ بنا کر کبھی ان کے دائیں طرف سے گزر جاتی اور کبھی بائیں طرف سے۔

کبھی کوئی ادھورا فقرہ اس کے کان میں پڑ جاتا، کبھی کوئی مکمل فقرہ۔ ہر بار جلتی کڑھتی ہوئی وہ ان کے قریب سے گزر جاتی۔ نہ تو آفاق اسے بلاتا اور نہ نوری وہ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر مگن ہوتے۔

وہاں بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ فلکی کا جی جلنے لگا۔ وہ دور بیٹھ کر ان کا نظارہ کرنے لگی۔

آفاق کتنا خوش نظر آ رہا تھا اور کتنے والہانہ انداز میں نوری کو دیکھ رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہوں تو پھر مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی سے کر لیتا۔ ہاں پتہ نہیں کیا مجبوری ہو گئی کہ شادی نہ ہو سکی۔۔۔ اور اب آ گئی ہے دوسروں کی زندگی برباد کرنے کے لئے۔

مگر۔۔۔!

مگر۔۔۔!

فلکی کا دل قہقہہ لگا کر ہنسا، یہ تو کیا سوچ رہی ہے؟ تیری زندگی کا آفاق سے کیا واسطہ؟ اس نے تیرے ساتھ محبت کا دعویٰ ہی کب کیا تھا اور تو کب اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ تو تو ہر وقت بوریا سمیٹنے کی فکر میں ہے۔

تیری بلا سے۔ وہ جس کے ساتھ چاہے رہے۔۔۔ محبت کرے یا عشق۔۔۔

ہاں۔۔۔!

اسے آفاق کی کیا پرواہ ہے۔

مگر پھر بھی بار بار اس کی نگاہ کالی ساڑی پر جا کر اٹکتی۔ ہاں۔۔۔ مجھے تو کہہ دیا کالی ساڑی مت پہنو۔۔۔ اور۔۔۔ اس پر کتنا پیار آ رہا ہے شاید اس لئے کہا ہوگا۔ اس کی سہیلی جو کالی ساڑی پہن کے آ رہی تھی۔

بیٹھے بیٹھے اسے اپنی ساڑی اور اپنے کپڑوں سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ [illegible] پھینک دے۔ جانے کیوں [illegible] کی آنکھوں میں آنسو آنے جا رہے تھے۔

وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی۔

مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

مجھے ہرگز پرواہ نہیں۔

میرے ٹھوکر کی نوک پر۔

مگر اس کا دل برابر کڑھ رہا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب کرب سے گزر رہی تھی۔ یہ کیسا کرب ہے۔

اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاں اتنا وہ جان گئی تھی کہ اپنے چہرے یا گفتگو سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرنا۔ اسی لئے وہ بظاہر ہنس ہنس کر ہر ایک سے باتیں کر رہی تھی۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے!

اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا اور آفاق نے آ کر اس سے کہا۔

"بھئی کھانا لگوا دو۔"

ہائے، آج اس نے کتنے ارمانوں سے سارا کھانا خود پکایا تھا۔ کتنی خوش تھی کہ آج وہ مکمل عورت بن گئی ہے۔ اس کا خیال تھا آج آفاق اس کا مشکور ہوگا۔ اس کے ساتھ رہے گا۔ اس کی ہر بات کی تعریف کرے گا۔ مہمانوں میں وہ یوں گھومیں پھریں گے۔۔۔ جیسے ان جیسا کوئی اور نہیں۔۔۔

ہاں شروع میں تو ہر کام ایسا ہی ہوا تھا، مگر اس نوری کم بخت نے آ کر سارے معاملات میں گڑبڑ ڈال دی۔ نہیں اس میں نوری کا کیا قصور ہے۔ اگر آفاق اس کو نہ بلاتا تو اچھا تھا۔

وہ کھانا بھی نکالتی جاتی اور سوچتی بھی جاتی۔۔۔ جب بیروں نے کھانا میز پر چن دیا تو ڈائننگ ہال میں آئی۔ ایک نظر سب میزوں کو دیکھا اور پھر آفاق کی طرف دیکھا۔ آفاق نے سب مہمانوں سے درخواست کی اور وہ کھانے کی میز کی طرف چل پڑے۔

"واہ کتنی پیاری خوشبو آ رہی ہے۔"

"بھئی مجھے تو خوشبو سونگھتے ہی بھوک لگ جاتی ہے۔"

"شکل سے لگ رہا ہے کھانا لذیذ ہے۔"

"آفاق مجھے تم سے امید تھی کہ تم ہمیشہ اچھی روایات برقرار رکھو گے۔"

"خواتین و حضرات!" آفاق ایک دم بلند آواز سے بولا۔ "جہاں جہاں آپ کے ہاتھ اور چمچے ہیں وہیں رہیں انہیں روک لیجئے میں آپ کو پہلے ایک خبر سنانا چاہتا ہوں۔"

کچھ لوگوں نے کھانا ڈال لیا تھا۔ کچھ ڈال رہے تھے۔۔۔ کچھ چمچ منہ تک لے جانے والے تھے۔

واقعی سب اپنی اپنی جگہ پر رک گئے۔ عجیب منظر تھا۔

"اب یہ کیا کہنے والا ہے" فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

آفاق نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور ہنس رہا تھا۔۔۔ جب اس نے دیکھا سب لوگ ٹھٹھک گئے ہیں اور منتظر ہیں تو وہ بولا۔

"آپ سب کی معلومات کے لئے میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج کی دعوت کا سارا کھانا میری پیاری بیوی بیگم فلک ناز نے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔۔۔ ایک ایک چیز۔۔۔ اب آپ شروع کیجئے اور براہِ راست انہیں داد دیجئے۔" یہ کہہ کر وہ فلکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

اس بات پر لوگوں نے بہت زور دار تالیاں بجائیں اور پھر سے چھری کانٹوں کا کھیل شروع ہو گیا۔

لیکن اس کا نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا۔ واقعی فلکی کو ہر نوالے کے ساتھ ڈھیروں داد ملنے لگی۔ کسی نے روسٹ پسند کیا کسی نے چانپ، کسی نے قورمہ پسند کیا تو کسی نے ساگ۔ کوئی کباب کی تعریف کرنے لگا، کوئی سلاد کو پسند کر رہا تھا۔ کسی نے میٹھے کو سراہا۔ کوئی کوفتوں کا دیوانہ نکلا۔ بلکہ مردوں کو تعجب ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی بے شمار چیزیں فلکی نے پکائی ہیں اور وہ بھی تنہا۔

فلکی مسکرا مسکرا کر داد وصول کر رہی تھی۔۔۔ یہی اس نے چاہا تھا۔

۔۔۔ مگر جانے جی اس طرح کیوں خوش نہ تھا۔ خوشی میں کہیں کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔

سب کچھ اداس اداس سا لگ رہا تھا۔ تاہم فلکی بڑے وقار سے مہمانوں کو سنبھالے رہی اور ان کی داد وصول کرتی رہی۔

کھانے کے دوران بھی اور کھانے کے بعد بھی کوئی نہ کوئی دستر خوان کی تعریف کر رہا ہو۔

سب لوگ تعریف بھی کر رہے تھے اور بے یقینی سے فلکی کی طرف بھی دیکھے جا رہے تھے۔۔۔ گویا انہیں یقین نہ ہو کہ اتنی کم سن فیشن ایبل لڑکی اتنا اچھا کھانا بھی پکا سکتی ہے؟

خود فلکی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی دعوت کا انتظام اس اکیلی نے کیا ہے۔ وہ دن بھر کام کرتی رہی اور اس نے کھانا پکایا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس سے اس کھانے کو [illegible]

یہ تو سب کچھ نیا نیا ہے ۔۔ انجانا ہے ۔۔۔ ان دیکھا ہے ۔
وہ خوف سے لرز رہی تھی ۔
اس کا دل چاہ رہا تھا ۔ پلو مار کر سارے چراغ بجھا دے ۔۔۔ لیکن یہ چراغ بجھانے کی بھی اس میں ہمت نہیں تھی ۔
یکایک ایک گیت بجنا شروع ہوا ۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو مشکل ہو گی

فلکی کو ایسے لگا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا ۔ شاید وہ یہی سُننا چاہتی تھی یہی کہنا چاہتی تھی ۔ یہی اس کے من میں تھا ۔ اس نے اُٹھ کر آواز اُونچی کر دی ۔ چاروں کونوں میں پڑے ہوئے اسپیکر چیخ اُٹھے ۔ دھیمی دھیمی پُر سوز آواز سارے گھر میں پھیل گئی ۔

اب اگر میل نہیں ہے تو جُدائی بھی نہیں
بات توڑی بھی نہیں اور نبھائی بھی نہیں
یہ سہارا بھی بہت ہے مرے جینے کے لئے
تم اگر میری نہیں ہو تو پرائی بھی نہیں
میرے دل کو نہ سراہو تو کوئی بات نہیں
غیر کے دل کو سراہو گی تو مشکل ہو گی !
غیر کے دل کو سراہو ۔۔۔
تم اگر مجھ کو نہ چاہو ۔۔۔۔

گیت ختم ہو گیا تو فلکی نے اُٹھ کر دوبارہ لگا دیا ۔ سہ بارہ لگا دیا ۔۔۔۔ جانے اس دیوانی نے کتنی بار یہ گیت سُنا ۔ رات پہر پہر کر کے گزرنے لگی ۔ آفاق اپنے کمرے میں تھا ۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی ۔ اس کا مطلب تھا وہ جاگ رہا ہے ۔
۔۔۔ اور سُن رہا ہے ۔
سُن رہا ہے تو سُنے ۔
وہ گیت بجاتی رہی ۔۔ بجاتی رہی ۔
تب اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ جس طرح آبشار سے آب پھوٹ جاتا ہے ۔ اسی طرح گیت کے بولوں نے اس کے دل کا غبار آنکھوں کی راہ سے نکالنا شروع کر دیا ۔
وہ گیت سُنتی رہی اور روتی رہی ۔
رات پہر پہر ڈھلتی رہی ۔
پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے گھر کے در و دیوار میں یہ گیت رچ بس گیا ہے ۔
ایک ایک اینٹ کہہ رہی ہے ۔۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گے تو ۔۔۔
۔۔۔ تو مشکل ہو گی ۔۔۔۔
مشکل ہو گی ۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا ۔ اس نے گھبرا کر ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا ۔
خاموشی چھا گئی ۔ مگر اس کے کانوں میں سناٹا بہتے لگا ۔۔ "تم کسی اور کو چاہو گے تو ۔۔۔" وہ جدھر دیکھتی ، وہی آواز آتی ۔
جس طرح چاندنی میں ہر جگہ سراب کی سفید ڈھیریاں نظر آتی ہیں ، بالکل اسی طرح اندھیرے میں ہر جگہ اپنے خیال کے بُت نظر آتے ہیں ، آوازیں آتی ہیں ، سانسیں سُنائی دیتی ہیں ۔
کوئی دبے پاؤں چلتا ہوا قریب آتا ہے اس کی سانسیں گردن پر محسوس ہوتی ہیں مگر کوئی نہیں ہوتا ۔۔۔۔ ۔۔ صرف اپنا واہمہ جیسے سارا گھر بار بار دہرا رہا تھا ۔
"تم اگر ہم کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں ۔۔۔
تم کسی اور کو چاہو گے تو ۔۔۔۔"
فلکی ایک دم گھبرا اُٹھی ۔ خاموشی سے وحشت ہونے لگی ۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھی ۔
دل میں ایک موہوم سا خیال تھا ۔
اندر قدم رکھا اور آفاق کے پلنگ کی طرف دیکھا ۔ وہ اوندھے مُونہہ سویا پڑا تھا ۔
بے سُدھ ، بے خبر ۔۔۔۔
جلدی سے اس کی نظر کلاک پر پڑ گئی ۔
تین بج رہے تھے ۔
کافی وقت ہو گیا تھا پھر بھی جانے اسے کیوں اُمید تھی کہ آفاق اس کے انتظار میں جاگ رہا ہو گا ۔۔۔۔
کیوں جاگتا بھلا وہ ۔۔۔ ؟
اس نے بتی بجھائی اور سو گئی ۔
عادت بھی کیا بُری شے ہے ۔ تین بجے سوئی تھی ۔ ٹھیک چھ بجے آنکھ کھل گئی ۔ سات بجے آفاق دفتر جاتا تھا ۔ آفاق اس کے اُٹھنے سے پہلے ہی اُٹھ کر جا چکا تھا اس لئے وہ اُٹھ گئی ۔ پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ آج اس گھر میں دو دو نوکر بھی ہیں ۔ اگر بیگم صاحبہ دیر سے اُٹھیں گی تو وہ کیا سوچیں گے ۔
باورچی خانے میں گئی تو عبدالکریم وردی پہنے ہوئے اسٹول پر بیٹھا تھا ۔ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا ۔ سلیوٹ مارنے کے بعد بولا
"سر جی صاحب کے لئے کیا ناشتہ بناؤں ؟"
"ناشتہ میں خود بناؤں گی ۔" یہ کہہ کر فلکی باہر نکل گئی ۔ جھانک کر دیکھا ۔ واقعی آفاق تیار ہو رہا تھا ۔
اس نے ناشتہ بنایا ۔ جب میز پر لے کر گئی تو آفاق کرسی کے پاس بیٹھے کھڑا تھا ۔ شاید ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا ۔ فلکی ٹرے اُٹھائے نزدیک گئی تو وہ گنگنا رہا تھا ۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو ۔۔۔

گاتے گاتے گھوم کر مُڑا تو پیچھے ہی فلکی کھڑی تھی ۔ ٹرے ہوتی ہوئی فلکی کی نگاہ اس سے ٹکرائی تو وہ لڑکھڑا اٹھی ۔ ذرا سا آفاق کا کندھا لگا تھا ۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کر گری ۔ اور سب کچھ بکھر گیا ۔ ٹوٹ پھوٹ گیا
وہ ابھی تک آفاق کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی ۔ چونک کر جلدی سے بیٹھ گئی اور گرا ہوا ناشتہ اور ٹوٹے ہوئے برتن اُٹھانے لگی ۔ آفاق بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ بٹانے لگا ۔ فلکی کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے ۔
آفاق ابھی تک سیٹی پر وہی دُھن بجا رہا تھا اور فلکی کا دل کٹا جا رہا تھا ۔
"کوئی بات نہیں ۔" اس نے فلکی کا لرزتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا ۔
فلکی نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا ۔۔ اور دو چھپے ہوئے آنسو اس کی پلکوں کی باڑھ توڑ کر رُخساروں پر آ رہے ۔
آفاق بڑی محبت سے ہنسا
دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے ۔
"عبدالکریم اور ناشتہ بنا لائے گا ۔"
اس نے آہستہ سے کہا ۔
"نہیں ، میں خود بنا لاتی ہوں ۔" وہ باہر دوڑ گئی ۔ اس کے دل کی جو حالت تھی وہ وہاں رُک نہیں سکتی تھی ۔
باورچی خانے میں جا کر اس نے عبدالکریم کو بھیجا ۔ وہ جھاڑن ہاتھ میں لئے دوڑتا ہوا آیا ۔ اس نے باقی کرچیاں اُٹھائیں اور گیلے کپڑے سے قالین کو صاف کیا ۔
اتنے میں فلکی دوبارہ ناشتہ اُٹھائے میز پر آئی ۔
آفاق اب بھی دھیمی دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا ۔۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں

فلکی چُپ چاپ آ کر میز پر بیٹھ گئی ۔
"کیا بات ہے ۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ؟" آفاق نے بڑی آہستگی سے پوچھا ۔
"جی ، میں بالکل ٹھیک ہوں ۔"
"آپ بالکل زرد ہو رہی ہیں ، میرا خیال ہے تھک بہت گئی ہوں گی ۔ کل آپ نے کام بھی تو بہت کیا تھا ۔"
"نہیں ۔ تھکاوٹ کی تو کوئی بات نہیں ۔"
"بھلا ۔" وہ ایک دم یاد کرتے ہوئے بولا ۔
"کل میں آپ کو داد دینا تو بھول ہی گیا تھا ۔ واقعی شاندار دعوت تھی اور میری توقع کے خلاف سب کچھ اتنا اچھا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح تعریف کروں ۔"
فلکی خاموش بیٹھی رہی ۔
"رات دیر تک آپ کا انتظار کرتا رہا پھر جانے آپ کس وقت اندر آئیں ، میں سو چکا تھا ۔"
فلکی اب بھی چُپ بیٹھی رہی ۔ اسے آفاق کی تعریف سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی ۔ کاش اس نے یہ سب رات کو کہا ہوتا ۔
"میرا خیال ہے رات بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ؟"
"نہیں ، ایسی تو کوئی بات نہیں تھی ۔"
"شاید آپ کو نظر لگ گئی ۔"
"جی ۔۔۔" فلکی نے چونک کر اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا ۔
"آپ شوخ کپڑے نہ پہنا کریں ۔"
"آپ ہی نے کہا تھا ۔" فلکی نے ذرا چڑ کر کہا ۔
"ہاں ، مجھے اچھے لگتے ہیں ۔" پھر اس نے پیالی کی طرف اشارہ کیا ۔
فلکی ہر روز چائے بنا کر رکھا کرتی تھی ۔ آج بے خیالی میں بھول گئی تھی ۔ فلکی جلدی سے چائے بنانے لگی
"شکریہ !" اس نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا ۔ چائے پینے کے بعد بولا ۔
"آج آپ آرام کریں ۔ بیمار لگ رہی ہیں ۔"
"میں آرام کروں گی تو کام کون کرے گا ؟"
"عبدالکریم جو ہے ۔"
"عبدالکریم ۔۔۔"
"ہاں ۔ اب عبدالکریم اسی گھر میں رہے گا ۔ یہ میرا پُرانا خانساماں ہے ۔"
فلکی کا دل چاہا کہ پوچھے یہ اب تک کہاں تھا ؟ مگر وہ صرف سوگواری سے مسکرا کر رہ گئی ۔
اب اسے آفاق کی اداؤں کی سمجھ آ رہی تھی ۔
آفاق کھڑا ہو گیا ۔ فلکی بھی کھڑی ہو گئی ۔ دوڑ کر اس کا بریف کیس اُٹھا لائی ۔ وہ پھر گنگنا رہا تھا ۔۔

تم اگر ہم کو نہ چاہو تو ۔۔۔۔۔۔

"تو اس نے رات کو سب کچھ سُنا تھا ۔"
فلکی گم صُم کھڑی تھی ۔
"اچھا جی ۔۔۔ " وہ مُڑا " خدا حافظ !"
کوشش کے باوجود فلکی کے مُونہہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا ۔ جیسے اس کا سوال دل میں ایک ہی تال پر محوِ رقص تھا ۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو ۔۔۔ تم اگر ۔۔۔

یہ کیا ہوا کہ رہائی کے دن قریب آئے بلند ہو گئی دیوارِ قید خانے کی !
فلکی نے گھبرا کر کتاب ہاتھ سے چھوڑ دی اور کھڑی ہو گئی ۔
"بلند ہو گئی دیوار قید خانے کی ۔۔۔"
قید خانہ ۔۔۔۔
بھلا کون سا قید خانہ ۔۔۔ ؟

اب تو بری قید نہ تھی۔ اب تو ساری دیواریں گر گئی تھیں۔ پہرے اٹھ گئے تھے۔
اس زندان میں وہ آزاد تھی۔
آزاد چھوڑ دی گئی تھی۔
مگر پھر یہ کیسی دیوار تھی جو لاشعور میں کھڑی ہو رہی تھی۔ دل کے آس پاس تعمیر ہو رہی تھی۔
یہ دیوار کون تعمیر کر رہا ہے؟
رہائی کے دن تو واقعی قریب آتے جا رہے تھے۔ امتحان تو ختم ہونے والا تھا آزمائش میں تو وہ پوری اتری تھی۔
یہ میٹھا میٹھا درد کہاں سے دل میں اتر آیا تھا۔
اور یک بہ یک یہ درد اسے دنیا کی ہر شے میں کیوں نظر آنے لگا تھا۔ وہ درد بھرے گیت سنتی تھی۔
پہلے درد بھرے گیتوں سے اسے نفرت تھی۔ اسے تیز طرار لہو کو گرم کر دینے والے میوزک پسند تھے جس کی لے پہ سارا جسم خود بخود تھرکنے لگے۔ چا چا چا، رمبا سمبا، جاز...... پوپ میوزک، ڈسکو شور، ہیجان، تیزی...... ترنگ...... ہا ؤ ہو...... ہنگامہ، چیخ پکار، منگراب جانے کیا ہوا تھا۔
درد بھرے گیت لگا کر وہ فوڈ کو لے جیسے جا بیٹھتی اور آنکھیں موند کر سنا کرتی
انجانے میں، میں بالم ریا
بکھ بیٹھی تیرے نام عمریا
یہ بھی کوئی گیت ہیں کسی زمانے میں وہ کہا کرتی تھی۔ یہ جو لوگ سلو موشن میں گاتے ہیں۔ یہ تو جذبات کو سلا دیتے ہیں اور اب یہی سست رفتار گانے اس کے جذبات کو جگا رہے تھے۔ محبت کے مفہوم سے آشنا کر رہے تھے۔
اسے شعر و شاعری سے بھلا کبھی دل چسپی نہیں تھی۔ نہ اردو کی شاعری اچھی لگتی تھی نہ انگریزی کی۔ شیلے، کیٹس، بائرن...... سب ہی خبطی تھے۔ محبت کو روگ کہتے تھے اور درد کو خوشی کہتے تھے۔
درد بھلا خوشی کس طرح ہو سکتا ہے؟
اور ادھر مرزا غالب، اقبال، میر، ذوق، جانے کیوں لوگ ان پر مرتے تھے سبھی تھے محبت ہی کا راگ تھا جو انہوں نے اپنی غزل پر سجایا تھا۔
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس مرض کی دوا کیا ہے
واہ یہ بھی کوئی شعر ہے! وہ یہ غزل سن کر کہا کرتی تھی۔ اگر دل ناداں ہی ہے تو اس سے یہ پوچھنا کیا معنی کہ تجھے کیا ہوا ہے! اور درد کی کیا دوا ہے۔ یہ بات تو ڈاکٹر سے پوچھی جاتی ہے۔

اور اب غالب کی یہ غزل وہ سیکڑوں بار سن چکی تھی۔
ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
وہ دل میں سوچا کرتی کہ ہر شعر اور ہر لفظ کا مفہوم اسے کیوں کر سمجھ میں آنے لگا ہے۔ آفاق کی لائبریری میں شعر و شاعری کی بے شمار کتابیں رکھی تھیں۔ وہ ہر روز وہاں سے ایک کتاب اٹھا لاتی اور ورق ورق پڑھتی جو شعر اچھا لگتا، اس پر نشان لگا دیتی۔ بار بار پڑھتی اور پھر اسے شاعروں کی الہامی قوت پر ایمان لانا پڑتا۔ جو وارداتیں ایک عام انسان کے دل پر گزرتی ہیں، انہیں بھلا ایک شاعر کیسے سمجھ لیتا ہے۔ سمجھ لیتا ہے تو پھر ہر شخص کے احساسات سے مطابق بیان کیسے کر سکتا ہے؟
شاعر نہ ہو گیا ولی ہو گیا۔
اسی واسطے لوگ کہتے ہیں شاعروں کو الہام ہوتا ہے۔ ان پر شعر نازل ہوتے ہیں۔ وہ تو یوں ہی شاعری کو بک بک سمجھتی تھی۔
جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
جانے کیسے چپکے سے اتنا مشکل شعر اس کے دل میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ تو نگر نگر جانے کیا تلاش کرتی پھرتی تھی۔ اپنے دل میں جھانک کر دیکھا ہی نہ تھا۔
محبت میں نہیں کچھ فرق مرنے اور جینے میں
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
واہ کیا بات کہی ہے...... جو اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود میں خود نہ کہہ سکی۔
ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انہی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں
اب تو وہ آنکھوں کی زبان سمجھنے لگ گئی تھی۔ کیوں کہ اس کی اپنی آنکھیں بولنے لگی تھیں جب سے اس کی زبان بند ہوئی تھی اور آنکھیں بولنے لگی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتی تھی اور اس سے نظر ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔ یہ بے باک نگاہیں جن سے ہمیشہ اس نے بڑے سے بڑا کام لیا۔ آفاق کو بھی شروع میں پٹر پٹر دیکھا کرتی تھی شرماتی نہیں تھی، جھجکتی نہیں تھی۔ اب یہ نگاہ محتشم نہیں تھی۔ اس نگاہ سے اسے ڈر لگتا تھا۔ وہ نگاہ چغل خور ہو گئی تھی۔ اور چغل خور کا بھید کبھی نہ کبھی کھل جاتا ہے، اس لئے وہ ڈرتی رہتی تھی۔ سہمی رہتی تھی۔
اور پھر انہی شعروں نے اس پر اس کی بدلتی ہوئی ساری کیفیت عیاں کر دی۔

محبت کیا ہے دل کا بے کس و مجبور ہو جانا
سکونِ دل کی منزل سے کوسوں دور ہو جانا
ہاں...... تو وہ جو بولی سیکل چنچل، شوخ سے بچھڑی ہوئی ہرنی کی طرح ماری ماری پھرتی تھی تو اس کی یہ وجہ تھی...... جانے دل کیوں ہر وقت اڑا اڑا سا رہتا تھا۔ جانے کیوں نبض مدھم چلتی تھی، مگر دل تیز دھڑکتا تھا جانے کیوں بیٹھے بیٹھے وہ چونک جاتی تھی جانے کیوں ہر آہٹ پر مڑ جاتی تھی۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ دن کو چین نہیں آتا تھا۔ سارے گھر میں پاؤں جلی بلی کی مانند بولائی بولائی پھرتی تھی۔
کچھ تو گھر کا کام بھی کم ہو گیا تھا۔
عبدالکریم کھانا پکانے پر معمور ہو گیا تھا اوپر کا کام کرنے کے لئے ایک بڑا طفیل آ گیا تھا۔ جمعدارنی کی بیٹی سلیمہ بڑی اچھی لڑکی تھی اور صفائی کا سارا کام اس نے سنبھال لیا تھا۔ پودوں کی دیکھ بھال کے لئے پھر سلامت علی آنے لگا تھا اور یکا یک سارے کام کرتے کرتے نکلی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے ایک طرف ڈال دیا ہو۔
پورے نو مہینے اس نے اس گھر میں مشقت کی تھی اور اب اسے کام کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایک دو دن تو وہ مضمحل سی بستر پہ پڑی رہی اور دیکھتی رہی۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ اسے کسی کا کیا ہوا کام پسند نہیں آتا۔
گو عبدالکریم کھانا اچھا پکاتا تھا مگر مسالہ ضرورت سے زیادہ بھون دیتا تھا۔ جس سے سالن کا رنگ سیاہ ہو جاتا تھا اور سیاہ رنگ کا سالن کتنا بھی لذیذ کیوں نہ ہو، کوئی بھی کھانا پسند نہیں کرتا۔
طفیل جھاڑ پونچھ کرتے وقت چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنی جگہ سے نہیں ہٹاتا تھا، سو ان کے نیچے گرد ارہ جاتا تھا۔
سلیمہ غسل خانوں کو شیشے کی طرح نہیں چمکاتی تھی۔ دیواروں پر اور ٹائیلوں پر پانی کے قطرے ویسے ہی رہ جاتے تھے۔ بستر کی چادریں بھی ٹھیک نہیں ہوتی تھیں۔ آفاق کے جوتے صاف ہوتے تھے مگر ان کی پالش میں وہ چمک نہ تھی۔
ویسے تو ہر کام ہونے لگا تھا۔
مگر کسی کام میں اسے سلیقہ نظر نہ آتا تھا
اب شاید اسے نظر لگ گئی تھی تب اسے خیال آتا کہ نوکر کبھی گھر کو نہیں بسا سکتے جتنے زیادہ نوکر گھر میں ہوتے ہیں، اتنی گڑبڑ زیادہ ہوتی ہے۔ کام زیادہ بگڑتا ہے کہ ہر کوئی ذمہ داری دوسرے پر ٹال دیتا ہے۔
کبھی کبھی اس کا دل چاہتا، وہ سب نوکر نکال دے لیکن اس کو یہ حق کہ نہ دیا تھا! اور اس گھر پر اس کا استحقاق تھا ہی

کیا؟
اس نے کبھی جتایا ہی نہیں اور آفاق کو ہمیشہ یہی امپریشن دیا کہ وہ یہاں خوش نہیں ہے اور نہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہے۔
تو پھر کیا کیا جائے۔ سارے کاموں کا ایک اسٹینڈرڈ اس نے بنا لیا تھا۔ اور اب بناوٹی بیگمات کی طرح وہ محض حکم چلانے پر زندگی نہیں گزار سکتی تھی جب کہ اس کا کوئی اور مشغلہ نہیں تھا۔ تب اس نے سوچا وہ ان سب کے ساتھ مل کر کام کروایا کرے گی۔
نوکروں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں جسم بھی چست رہتا ہے اور وقت بھی کٹ جاتا ہے اور پھر نوکر بھی ٹھیک طرح سے کام کرتے ہیں۔
ایک اور تبدیلی بھی اس میں آ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفاق کا کام کوئی اور کرے۔ آفاق کا ہر کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتی تھی اور یہ بات اس نے نوکروں سے کہہ دی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ چاہتی تھی کہ آفاق کو کبھی بھی نوکروں کی عادت نہ پڑے۔ صبح اٹھ کر وہ خود باورچی خانے سے آفاق کے لئے چائے بنا کر لاتی۔ پھر اس کا ناشتہ بھی خود بناتی۔ پاس بیٹھ کر کھلاتی جاتے وقت اس کا بریف کیس اسے پکڑاتی اور جب وہ خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا تو دوبارہ میز پر آ کر بیٹھ جاتی۔ صبح کا اخبار دیکھ کر وہ یوں ہی میز پر پھیلا دیا کرتا تھا۔ وہ اخبار میں گم ہو جاتی۔ پھر عبدالکریم اس کے لئے ناشتہ بنا کر لاتا۔ وہ آہستہ آہستہ ناشتہ کرتی۔
ناشتہ کرنے کے بعد کچن میں جاتی عبدالکریم کو سودے سلف کے بارے میں سمجھاتی۔ اس روز کا مینو بتاتی۔ آفاق کے لئے ایک سالن خود بناتی پھر سارا کام سمجھا کر ڈرائنگ روم میں آ جاتی۔ وہاں بہت سے کام وہ طفیل کو سمجھاتی بلکہ اپنے سامنے ساری جھاڑ پونچھ کرواتی۔ گیارہ بجے کے قریب سلیمہ آ جاتی۔ سلیمہ چودہ پندرہ سالہ جوان لڑکی تھی مگر بڑی صاف ستھری تھی اور اتنی ہی باتونی بھی تھی۔
سلیمہ کے سوا وہ کسی کو اپنے کمرے میں نہیں آنے دیتی تھی۔ پھر وہ سلیمہ کے ساتھ مل کر بستر کی چادریں بدلتی، نئے پھول لگاتی، کمرے اور غسل خانے چمکاتی۔ بارہ ایک بجے تک وہ کام سے بالکل فارغ ہو جاتی ہاتھ منہ دھو کر صاف کپڑے بدل لیتی۔
ایک بجے آفاق دفتر سے گھر آ جاتا تھا۔ اب اس کے دوپہر کا کھانا گھر پر کھانا شروع کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد پھر دفتر

کھول سامنے، برتن لگا کے فلکی آفاق کا
انتظار کیا کرتی۔ دھیمے دھیمے سُروں میں
ریڈیو بھی لگا لیتی۔ گھر کو صاف ستھرا کرنے
کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا جیسے گھر میں ایک
زندگی آگئی ہے۔۔۔۔ سکون آگیا ہے۔ گھر
مُسکرا رہا ہے۔۔ بول رہا ہے۔۔۔ اور ایسا
ہنستا مُسکراتا گھر اسے بہت اچھا لگتا
تھا۔ ریڈیو سے نغمے بلند ہونا شروع ہوتے
تو وہ کوئی کتاب لے کر ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتی
کبھی اس کی نگاہ صفحے پر ہوتی، کبھی کان ریڈیو
کی سمت ہوتے۔ ایک لمحے کے لئے اگر وہ
اس شعر پر رُک جاتی ؎

آہٹ پہ کان در پہ نظر دل میں اشتیاق
کچھ ایسی بے خودی ہے تجھے انتظار کی

تو دوسرے ہی لمحے معنی کی آمار اس کی توجہ
کھینچ لیتی۔

تم میرے پاس رہو
میرے قاتل میرے دلبر تم میرے پاس رہو۔

لیکن اس کا دل۔۔۔!
اس کا دل محو رہتا۔۔ منتظر رہتا۔۔۔ دل
گیٹ کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔۔۔ دل
دوڑ دوڑ کر باہر جاتا۔

جانے اس شور میں اسے کار کے
ہارن کی آواز کیسے سُنائی دیتی۔ جونہی گیٹ میں
داخل ہو کر آفاق ایک مخصوص انداز میں ہارن
بجاتا۔ اس کا دل اُچھل کر حلق میں آجاتا۔ چہرہ
سُرخ ہو جاتا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو جاتی۔ کس قدر
بے چینی سے وہ روز آفاق کا انتظار کیا کرتی
مگر اس کے آجانے سے گھبراہٹ طاری ہو جاتی
تھی۔ ہاتھوں کو پسینہ آجاتا، دل دھڑکنے لگتا۔
کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ دوڑی دوڑی باورچی خانے
میں کھانا نکالنے چلی جاتی۔ واپس آتی تو آفاق
کھانے کی میز کے سرے پر بیٹھا کوئی انگریزی
رسالہ دیکھ رہا ہوتا۔ وہ کھاتے وقت نہ تو
باتیں کرتا اور نہ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا بس رسالہ
پڑھتا رہتا تھا۔ شروع سے ہی فلکی کو اس کی
یہ عادت بُری لگتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی تہذیب
ہے کہ دو شخص کھانا کھا رہے ہوں ان میں
سے ایک مسلسل پڑھتا رہے اور دوسرا اس کا
چہرہ دیکھتا رہے۔ فلکی کو آفاق کی یہ عادت
اخلاق سے گری ہوئی لگتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی
آفاق اس سے روگردانی کی خاطر پڑھتا رہتا
ہے۔ مگر اب رفتہ رفتہ اسے پتہ چل گیا تھا
کہ یوں پڑھنا آفاق کی عادت ہے اور آج کل
تو شکر کرتی کہ آفاق کی یہ عادت ہے کیونکہ
وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہتی۔۔۔ اس کی تیکھی تیکھی
پلکیں۔۔۔ اس کی وہ آنکھیں جو کبھی مہربان
نہ ہوئی تھیں۔ آفاق کی پلیٹ میں سالن ختم
ہو جاتا تو وہ سالن ڈال دیتی۔ پھلکا ختم ہو جاتا
تو پلیٹ میں دوسرا پھلکا رکھ دیتی۔

آفاق بس مشینی انداز میں کھاتا رہتا۔
۔۔۔۔ اور فلکی مشینی انداز میں ہر چیز
بڑھاتی رہتی۔
کیا وہ دونوں مشینی انسان تھے؟
کھانا کھانے کے بعد آفاق اُٹھ کر
ہاتھ دھوتا۔ اگر شام کا کوئی خاص پروگرام
ہوتا یا کسی نے آنا ہوتا تو فلکی کو بتا دیتا
ورنہ خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا۔ جب تک
اس کی کار گیٹ سے باہر نہ نکل جاتی، فلکی
یوں ہی گُم صُم بیٹھی رہتی۔ آفاق چلا جاتا اور
اس کی خوشبو اس کے سگریٹ کی خوشبو
کمرے میں رہ جاتی۔ فلکی برائے نام سا کھانا
پلیٹ میں ڈال کر اس کا رسالہ اُٹھا لیتی۔ رسالے
کے اوپر جا بجا سالن والی اُنگلیوں کے
نشان ہوتے۔ کتنی لاپرواہی سے آفاق
رسالہ پڑھتا تھا اور صاف پتہ چل جاتا تھا
کہ اس نے کہاں کہاں سے رسالہ پڑھا ہے
فلکی اس کے چھوڑے ہوئے حصے پڑھ جاتی
اور سوچتی رہتی کہ آفاق اس کے ساتھ بھی
غالباً رسالے والا سلوک کر رہا ہے۔ پڑھا
اور پھینک دیا۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ رسالے پر تو
وہ اپنے نشان چھوڑ جاتا تھا جبکہ فلکی پر
اس کی زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔
فلکی اس کی ضرورت نہ تھی۔
خواہش نہ تھی۔
اس کا حاصل نہ تھی۔
فلکی زبردستی اس کی زندگی میں
گھُس آئی تھی۔۔۔ اور اب وہ بڑی شرافت
سے اسے گوارا کر رہا تھا۔
فلکی کو اپنی پچھلی زندگی پر بہت افسوس
ہوتا۔ اپنی نادانی پر رنج ہوتا تھا۔ وہ کتنی
بے وقوف تھی۔ بھلا یوں بھی مرد کو جیتا جاسکتا
ہے۔ اس نے کتنا غلط قدم اُٹھایا۔ اپنی
زندگی برباد کی اور آفاق کا بھی سکون لوٹ لیا۔
اسے آفاق سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔
ہمدردی۔۔۔؟
اس کا دل اس سے پوچھا کرتا۔ کیا یہ
صرف ہمدردی ہے؟ اس کے پیچھے کوئی
اور جذبہ نہیں۔
کیوں باؤلی ہوئی سارے گھر میں
پھرتی ہے۔ اس کی موٹر کا ہارن تیرے اندر
ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی آہٹ سے
تیرا دل دھڑک اُٹھتا ہے۔ جب بھی فون
کی گھنٹی بجتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی
تیرے دل کو کھینچ رہا ہو۔ تو سارا دن اسی کے
بارے میں سوچتی ہے۔ جب وہ سامنے
بیٹھا ہو تو تیری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔
جب وہ اوجھل ہو تو اس سے ہزار شکوے
اور گلے کرتی ہے۔
بے چینی سے رات کا انتظار کرتی ہے

رات آتی ہے تو کروٹیں بدل بدل کر صبح کی
دعائیں کرتی ہے۔
"مجھے آخر کیا ہوا ہے؟"
"کیا ہوا ہے مجھے؟"
وہ اپنے دل سے پوچھتی۔۔۔ اور پھر
گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ گیٹ تک چلی جاتی
پھر گیٹ سے باہر نکل جاتی۔ اسٹول پر بیٹھا
ہوا چوکیدار ایک دم کھڑا ہو جاتا اور پھر
اسے سلیوٹ مارتا۔ وہ سر کے اشارے
سے اسے جواب دے کر۔۔۔ اور آگے نکل جاتی
سڑک پر کھڑی ہو کر دُور دُور تک دیکھتی۔
باہر کتنی بڑی دنیا تھی۔۔۔۔ ایک اور ہی دنیا
تھی۔۔۔ گو یہ اتنی بڑی دنیا ہے مگر ہر گھر کی
دنیا مختلف ہے۔
اب فلکی آزاد تھی۔ گیٹ سے باہر
آسکتی تھی۔ اب کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ہر
دروازہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی پہرہ نہ تھا۔
مگر نہ جانے اسے اپنے پاؤں میں ایک
وزنی زنجیر کا احساس کیوں ہوتا تھا۔ اسے
ایسے لگتا جیسے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں
اب اسے ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی۔
مگر اب اس کا کہیں جانے کو دل نہ چاہتا
اب اس کا دل چاہتا، اسی گھر کے کسی
کونے میں منہ چھپا کر سو جائے۔۔۔ پھر نہ
اُٹھنے کے لئے۔۔۔۔
وہ سڑک پر زیادہ دیر کھڑی نہ ہوتی۔
اس واسطے کہ جب تک وہ سڑک کے کنارے
کھڑی رہتی، چوکیدار اپنی جگہ پر کھڑا رہتا۔
ایک آدمی کو وہ اتنی تکلیف دینا نہیں
چاہتی تھی۔ وہ اندر آجاتی تاکہ چوکیدار
اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے۔
پھر لان میں چلی جاتی اور درختوں کے
تلے ننگے پاؤں یوں گھومتی جیسے کوئی ناآسودہ
رُوح ہو۔ اور اپنا جسم تلاش کرتی پھر رہی
ہو۔ وہ ایسا پرندہ بن گئی تھی جس کے پر کاٹ
کر کھلی فضاؤں میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ کس نے
کاٹے تھے اس کے پر۔۔۔ اس نے تو کسی کے
ہاتھ میں مقراض نہیں دیکھی تھی۔ اس کے اپنے
احساس نے اس کے پر کاٹ دئے تھے۔
ایک عجیب سا سودا اس میں سمایا تھا۔
وہ کسی سے حالِ دل کہنا چاہتی تھی۔ مگر کون تھا
سُننے والا۔۔۔؟
تصور ہی تصور میں آفاق سے بے شمار
باتیں کر لیتی مگر جب وہ سامنے ہوتا تو فلکی کی
زبان کو تالے لگ جاتے۔ کیا وہ اس سے
ڈرتی تھی۔۔۔؟ نہیں۔
ڈر کے سہے موسم تو بیت گیا تھا۔
کیا وہ اس سے نفرت کرتی تھی؟
نفرتیں تو اپنے لبادے کبھی کی اُتار چکی تھیں
تو پھر کیا تھا۔۔۔؟ کیا تھا۔۔۔؟

جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
بعض اوقات ایسا ہوتا کہ آفاق کے
پاس بیٹھے ہوئے وہ اپنے خیالات کی دنیا
میں اس طرح کھو جاتی کہ اسے احساس ہی نہ
رہتا۔۔۔ کہاں ہے۔ کیا کر رہی ہے۔ کس
کے پاس ہے۔ آفاق اسے بُلاتا رہ جاتا اور
پھر حیرت سے اس کی صورت دیکھنے لگتا۔
ایک روز اسے یوں ہی اپنے خیالات میں
غلطاں و پیچاں دیکھ کر آفاق نے پوچھا
تھا۔
"کیا بات ہے فلک۔۔۔ آج کل آپ
بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں؟"
"جی۔۔۔۔!" فلکی یوں چونکی جیسے
اس کے پاؤں پر بوجھ آن گرا ہو۔
"میں نے پوچھا تھا کیا بات ہے؟
آپ بہت چُپ چُپ رہتی ہیں؟"
"جی کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔"
فلکی نے سراسیمہ ہوتے ہوئے کہا۔
"کوئی بات تو ضرور ہے۔"
"جی آپ یقین کریں، کوئی بات نہیں ہے۔"
"میں اتنی دیر سے آپ سے کہہ رہا
ہوں۔ ایک گلاس پانی پلا دیجئے مگر آپ نہ
جانے کس جہاں میں گُم ہیں۔"
"اچھا جی۔۔۔!" فلکی ایک دم کھڑی
ہو گئی۔ "آپ نے پانی مانگا تھا۔ میں ابھی لاتی
ہوں۔۔۔" وہ اُٹھ کر بے تحاشا دوڑی۔۔۔۔
آفاق کو ہنسی آگئی۔
جب وہ پلیٹ میں پانی کا گلاس رکھے
اندر آئی تو آفاق ابھی تک ہنس رہا تھا۔
فلکی نے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے صاف
محسوس کیا فلکی کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور گلاس
میں پانی چھلک رہا تھا۔ آفاق نے آہستہ
سے گلاس سمیت پلیٹ پکڑ لی۔۔۔ اور دوسرے
ہاتھ سے فلکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔
فلکی ایک دم اُچھل پڑی۔
"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔
آپ کا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے؟ اور یہ اس
قدر ٹھنڈا کیوں ہو رہا ہے؟"
"جی۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔۔۔ میں تو
بالکل ٹھیک ہوں۔"
فلکی نے اپنا ہاتھ اس طرح چھڑا لیا جیسے
اس کی چوری پکڑی جانے والی ہو۔
"آپ کی طبیعت ناساز ہو تو آپ
ڈاکٹر کو دکھا لیں۔"
"آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ میں تو بالکل
ٹھیک ہوں۔" فلکی ذرا دور جا کر بیٹھ گئی۔ آفاق
نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کا جسم ابھی
تک سنسنا رہا تھا۔
"آپ [illegible] تو نہیں
ہو گئیں؟"

"جی نہیں ...."
فلکی نے نظریں جھکا کر کہا۔
"ان کا خط آیا تھا؟"
"جی!"
"آپ نے جواب دے دیا تھا؟"
"جی ہاں میں نے جواب دے دیا تھا۔"
"آج کل کہاں ہیں وہ؟"
"وہ امریکہ سے کینیڈا اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئی ہیں۔"
"کب تک آئیں گی؟"
"انہوں نے لکھا تھا۔ دو تین مہینوں کے بعد آ جائیں گی یعنی سردی کے شروع ہوتے ہی۔"
"اور ڈیڈی کہاں ہیں آج کل؟"
"وہ تو نائجیریا میں ہیں۔ ممی نے لکھا تھا ان کا کام مزید چھ مہینے کے لئے بڑھا دیا گیا ہے، اس لئے ممی بھی وہیں رک گئی ہیں۔ اب دونوں اکٹھے آئیں گے۔"
"امی کا .... میرا مطلب ہے آپ کی امی کا خط کبھی آیا تھا؟"
"پھر آپ نے مجھے کیوں نہیں دیا؟ بدلہ اُتارنے کے لئے ....؟"
"نہیں .... وہ تو میرے نام تھا۔"
"آپ کے نام نہیں تھا؟"
"اچھا .... !" آفاق نے تعجب سے کہا۔
"کیا لکھا تھا انہوں نے؟"
"میں آپ کو لا دیتی ہوں۔ آپ پڑھ لیں۔"
فلکی اٹھ کر خط لے آئی۔ آفاق نے پڑھ لیا۔ امی نے تو لکھا ہے کہ امید ہے تم دونوں خوش باش ہوگے۔"
"جی .... !"
"پھر اس کے جواب میں کیا لکھا جائے گا؟"
"جواب تو میں نے لکھ بھی دیا ہے۔"
"لکھ دیا ہے .... ؟" آفاق نے حیرت سے کہا "کب؟"
"جس دن خط آیا تھا۔"
"واہ .... کیا لکھا ہے؟"
"بس جو لکھنا تھا لکھ دیا۔"
"تو گویا آپ کا خط پڑھنے کے لئے مجھے امریکہ جانا پڑے گا۔"
"اتنا اہم نہیں ہے میرا خط ...."
"آپ کو کیا معلوم کہ کتنا اہم ہے۔"
جب فلکی نے حیران ہو کر نظر اٹھائی تو آفاق نے جلدی سے کتاب اٹھا لی تھی اور پڑھنے لگا تھا۔

فلکی سونے کی بجائے اپنے بستر پر بیٹھی حیرت سے آفاق کو دیکھ رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں دیکھے جا رہی تھی!
اسے معلوم تھا اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا انتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے۔ مگر نہ معلوم اسے کیا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ آفاق کی طرف دیکھتی رہے۔ دیکھتی رہے۔ حتیٰ کہ اس کے نقش و نگار میں کھو جائے۔

مرد کے لئے دنیا نے حسن کے خاص معیار مقرر نہیں کئے۔ مرد کا مرد ہونا .... بہادر ہونا .... جیالا ہونا ہی اس کا سب سے بڑا حسن ہوتا ہے۔ گورا ہو، کالا ہو، لمبا ہو، چھوٹا ہو .... کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں، اگر وہ کام بڑے بڑے کر رہا ہو تو وہ سب مردوں سے قد آور اور خوب صورت نظر آتا ہے
گویا خوب صورت مرد وہ ہے جو خوب صورت اور عظیم کام کرے۔ عزتِ نفس کو قائم رکھ کر روزی کمائے اپنی آن بان کو گھٹیا مشغلوں میں ضائع نہ کرے۔

آفاق کا دفتر فلکی دیکھ چکی تھی اور اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ آفاق بڑا اصول پرست آدمی ہے۔ لڑکیاں تو کیا وہ دفتر میں مردوں سے بھی ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ جو وقت کا پابند تھا۔ محنتی تھا .... اور دوسروں سے پابندیٔ وقت اور محنت کی توقع رکھتا تھا۔ فضول باتیں نہیں کرتا تھا ورنہ اس قسم کی ڈینگ ہانکتا تھا کہ میں نے دنیا کو اپنی ٹھوکر پر اٹھا رکھا ہے۔ میں فلاں ابن فلاں ہوں حالاں کہ اس ملک میں اس نے اپنے کاروبار کی دھاک بٹھا رکھی تھی اور باپ کے مرنے کے بعد دن بدن کاروبار کو پھیلا رہا تھا۔
گھر میں بھی اس کی عادتیں بڑی اچھی تھیں۔

ان کشیدگیوں کے علاوہ جو ابتدا میں دونوں کے درمیان ہوئیں، فلکی نے آفاق میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں دیکھی تھی۔ وہ مرد تھا کوئی کاٹھ کا پتلا نہیں تھا .... اور مرد بھی ایسا جس نے ایک دنیا سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ بھلا وہ ایک معمولی سی لڑکی سے شکست کیوں کھا جاتا۔ ہاں فلکی نے اس طرح اسے مات دینے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اسے محبت سے مسخر کرنے کی تمنا کرتی تو حالات بالکل مختلف ہوتے۔ ایسے آدمی اعصابی طور پر مضبوط ہوتے ہیں اور اپنی سطحی خواہشوں کے آگے اپنے دل اور جسم کو جھکاتے نہیں۔

اور یہی بات .... فلکی اس کے چہرے پر ڈھونڈ رہی تھی۔ جوں جوں فلکی اسے غور سے دیکھتی .... توں توں وہ فلکی کو اچھا لگتا، پیارا لگتا۔ وہ بے نیاز سا بن کر اس کے سامنے بیٹھا تھا حسبِ معمول آگے ایک انگریزی میگزین کھلا تھا۔ اس نے رات کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نیلے رنگ کی بش شرٹ کے ادھ کھلے گلے میں سے اس کی چھاتی کے بال صاف نظر آ رہے تھے اور جب وہ سانس لیتا تو وہ بال اس طرح ہلتے جیسے کسی نے ان پر ہلکی سی پھونک ماری ہو۔ بیٹھے بیٹھے فلکی کا دل چاہا، وہ یہ حرکت کرے۔ وہ آفاق کے قریب جائے .... بہت قریب .... اور آفاق کے سینے پر پھونک مار دے۔

نہیں .... !

فلکی کا دل چیخا اور .... اس نے خود ہی اس کی تصدیق کر دی۔ آفاق اسے کبھی نہیں اپنا سکے گا۔ وہ آفاق کے قریب کبھی نہ جا سکے گی .... کبھی نہیں، آفاق اس کے ماضی کے بارے میں سب جانتا ہے۔ اس نے تو اسے محض سبق سکھانے کے یہاں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ بھی تو اپنی قید کی مدت کاٹ رہی تھی۔
پھر یہ سب کیسے ہوا۔ رہائی کے دن قریب آئے تو

بلند ہو گئی دیوار قید خانے کی

کب .... کس وقت .... کیسے؟ یہ سب کیسے ہوا آفو .... !
نہ تو تم نے کوشش کی .... اور نہ میں نے چاہا۔
پر تم آرام سے میرے تن من میں چلے آئے۔ ایک دیوتا کی طرح اندر آ کر بیٹھ گئے۔ یوں میری رگ رگ میں سما گئے کہ تمہیں اپنے آپ سے الگ کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا ہے۔
کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر مجھے پتہ چلا کہ عشق کیا چیز ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے!
وفا کی منزل کہاں ہے؟
فنا کا طریقہ کون سا ہے؟
میں فضول جذبوں کو محبت کہتی رہی عشق سے مجھے نفرت تھی کیوں کہ عشق فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔
لیکن اب مجھے معلوم ہوا۔ عشق اور محبت کے درمیان جسم کوئی پڑاؤ نہیں۔ کوئی منزل نہیں۔
عشق جسمانی قرب سے ماوریٰ ہوتا ہے۔ وصال محبت کو فنا کر دیتا ہے۔
عشق تو مر جانے کا، مٹ جانے کا گھل جانے کا نام ہے۔ عشق تو ایک آنچ ہے جو دُور ہی دُور سے تن و من کو پھونکتی رہتی ہے۔ تم نے کتنا اچھا کیا آفو .... !
مجھے اپنے سے دور رکھا .... ایک فاصلہ رکھا .... اس فاصلے نے مجھے نئے جذبوں سے آشنا کیا۔ میں نے محبت اور احترام کو الگ دیکھ لیا .... سمجھ لیا .... اور پرکھ لیا .... اور مجھے پتہ چلا .... محبت .... عشق .... فنا .... یہ سب جسموں کے کھیل سے ماوریٰ ہیں۔ بہت آگے .... بہت عظیم جذبے ہیں۔ جسم تو ایک بھوک ہے۔ سیکس ایک ضرورت ہے اور ضرورت کو پورا کر لینا کسی مقصد کی معراج نہیں ہوتی۔ اور ضرورتیں بعض اوقات انسان کو بہت گھٹیا مخلوق بنا دیتی ہیں۔ ضرورتوں کے غلام نفس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ ضرورتوں کو شکست دینے والے وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ عشق ایسی سب ضرورتوں سے ماورا ہوتا ہے اور تم نے یہ کیسے مقدس جذبے میرے دل میں جگا دیئے ہیں آفو! تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں آفو! تم کبھی ضرورت بن کر میرے پاس نہیں آئے۔
حالاں کہ تم بھی ایک مرد ہو ....
تم نے کبھی سفلی جذبات کی خاطر جھولی نہیں پھیلائی ....
حالاں کہ تم فرشتہ نہیں ہو ....
تم جس لڑکی سے نفرت کرتے تھے۔ تم نے اس لڑکی کو پامال نہیں کیا۔ حالاں کہ تم چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ تمہیں قانون اور شریعت نے یہ حق دیا تھا ....
اور .... اور ....
میں نے بھی تمہیں یہ حق دیا تھا ....
میں نے بھی ایسا چاہا تھا ....
تمہارا ہونے کے لئے مجھے سب گوارا تھا ....
مگر تم دیکھو آج تمہارے نام سے میرے ارد گرد کتنے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ تم ان سب مردوں سے کتنے مختلف ہو .... کتنے عظیم ہو .... اور ظالم بھی ہو ....
تمہارے جیسے مرد کو ظالم بھی ہونا چاہئے ....
جو شخص اپنے آپ پر ظلم کر سکتا ہو۔ اپنے نفس پر جبر کر سکتا ہو۔ اسے دوسروں پر ظلم کرنے کا حق حاصل ہے .... اور یہ دوسروں کے حق میں ظلم نہیں ہو گا مہربانی ہو گی جس طرح مجھ پر یہ مہربانی ہوئی .... میں کیا سے کیا ہو گئی ....
کل تک میں جسم ہی جسم تھی اور آج میں روح ہوں .... اور عشق بھی روحوں کا ملاپ ہے۔ روح کسی سے کوئی توقع نہیں رکھتی، وہ توقعات سے بالا ہوتی ہے۔ میں بھی روح بن کر تمہارے بدن میں تحلیل ہو جانا چاہتی ہوں .... (اس سے آگے کے حالات جاننے کے لئے اگلے ماہ کا بانو ملاحظہ فرمائیے)۔

بیوٹی کالج

کیلوں مہاسوں سے چھٹکارا آسان ہے

شہناز حسین

عورتوں کے لئے خاص طور پر چہرے کی خوب صورتی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چہرے کو دل کش بنانے کے لئے انواع و اقسام کی کریمیں، لوشن اور گھریلو نسخے آزمائے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی بد احتیاطی یا جلد کی صفائی ٹھیک طرح نہ ہونے کے باعث چہرے پر کیلیں نمودار ہو جاتی ہیں، جس سے چہرہ بد نما ہو جاتا ہے۔

عام طور سے لوگ کیل کے بارے میں جانتے بھی نہیں کہ یہ کیا ہے اور اسی وجہ سے اس پر زیادہ دھیان بھی نہیں دیتے کیلیں اکثر چکنی جلد پر نمودار ہوتی ہیں اور ایک بار یہ شروع ہو جائیں تو ان کی روک تھام مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر شروع میں ہی ان کی احتیاط نہ کی جائے تو یہ بڑھتی ہی جاتی ہیں اور چہرے کو داغوں کا مجموعہ بنا دیتی ہیں۔ کیلوں کے نکلنے کی وجہ سے مسام بھی کالے معلوم ہوتے ہیں۔

کیلوں کے نکلنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ شحمی غدود SEBACEOUS GLANDS جلد کو بہت زیادہ چکنائی فراہم کرنے لگتے ہیں۔ جلد کو بہت زیادہ چکنائی ملنے کی وجہ سے جلد کے مسام کھل جاتے ہیں۔ پھر یہ مسام سخت ہو جاتے ہیں اور سخت ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ اب ایسے ہر مسام کے مونہہ پہ باہر کی خاک دھول جم جاتی ہے اور کیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ کیل بڑھ کر اپنی جگہ بناتی رہتی ہے اور اس کی وجہ سے مسام بہت بڑے ہو جاتے ہیں۔ جلد کی ساخت بگڑ جاتی ہے اور جلد بد نما نظر آنے لگتی ہے۔

یہی کیلیں بگڑ کر مہاسوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کیلوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ چہرے پر ہی نمودار ہوں، بلکہ یہ ناک پیشانی گردن سینے وغیرہ پر بھی ہو سکتی ہیں۔ یہی کیلیں مہاسے بن کر پک جاتی ہیں اور اس سے جلد کی اندرونی تہہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور اوپر کی جلد پر مستقل نشان بن جاتے ہیں۔ اگر شروع میں ہی قابو پا لیا جائے تو چہرے پر مہاسے کبھی نہیں نکلیں گے۔

کیلوں کی روک تھام کا سب سے کارگر طریقہ صفائی ہے۔ اگر آپ اپنی جلد کو صاف ستھرا رکھیں گی تو آپ کے چہرے پر کیلیں کبھی نہیں نکلیں گی۔ چہرے کی صفائی کے لئے دن میں کم از کم دو مرتبہ صابن اور نیم گرم پانی سے چہرے کو دھوئیں۔ اس طرح چہرے پر چکنائی جمنے نہیں پائے گی۔ یاد رکھئے، دن میں دو مرتبہ سے زیادہ چہرے پر صابن کا استعمال نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کو زیادہ گرمیوں میں دو مرتبہ سے زیادہ چہرے کو دھونا پڑے تو صرف پانی سے چہرے کو دھو ڈالیں۔ اس کے بعد روزانہ دو مرتبہ (صبح کو اور رات کو سوتے وقت) کلینزنگ ملک سے چہرے کی صفائی کریں۔ پہلے تھوڑا سا کلینزنگ کرنے کے بعد چند قطرے کسی اچھے اسکن ٹانک کے ضرور لگائیں اس اصول کو اپنانے سے آپ کے چہرے پر کیلیں بھی نہیں نکلیں گی، چہرہ ٹھیک نظر آئے گا چہرے کی جلد مردہ نہیں ہونے پائے گی، چہرے کی چکناہٹ رفتہ رفتہ کم ہو کر جلد کے مسام بند

ہو جائیں گے اور کیلوں کو پناہ دینے کی جگہ ختم ہو جائے گی اس کے علاوہ جلد پر غیر معمولی نکھار بھی آ جائے گا۔

چہرے کی صفائی کے ساتھ گھر سے باہر جاتے وقت آپ ایسی کریم ضرور استعمال کریں جس کو لگانے کے بعد باہر کی خاک دھول آپ کے چہرے پر اثر انداز نہ ہو اور جلد کی نمی برقرار رہے۔

چہرے پر روزانہ ماسک (لیپ) لگانا بھی جلد کی غذا ہے۔ اس سے چہرے کے مسامات کی گہرائی تک صفائی ہو جاتی ہے۔ جن عورتوں کے چہروں پر کیلوں کی ابتدا ہو چکی ہو، ان کے لئے ماسک لگانا نہایت ضروری ہے۔ ماسک آپ گھر پر خود بھی تیار کر سکتی ہیں۔ ایک آسان طریقہ یہ ہے۔ شہد (ایک چمچہ)، صندل (ایک چمچہ)، لیموں (چند قطرے)، انڈے کی سفیدی، آٹے کی خشکی (ایک چمچہ) ان سب چیزوں کا پیسٹ بنا لیں۔ اس کے بعد روئی سے اس کو چہرے پر لگائیں، دس منٹ تک بالکل سیدھی لیٹی رہیں۔ دس منٹ بعد جب لیپ سوکھ جائے تو اس کو دھو ڈالیں۔ اس طرح کیلیں آسانی سے نکل جاتی ہیں۔

کیلوں کو دبا کر کبھی نہیں نکالنا چاہئے کیوں کہ کیلوں کو دبا کر نکالنے سے جلد کے خلئے بے کار ہو جائیں گے اور آپ کے چہرے پر بدنما نشان الگ بن جائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ کیلوں کو کسی اچھے پارلر میں نکلوائیں، کیوں کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ تمام اوزار وغیرہ جراثیم سے پاک ہوں۔

کچھ عورتیں کیلوں کو نکالنے کے لئے چہرے کو بھاپ دیتی ہیں۔ اس طرح کیلیں تو آسانی سے نکل جاتی ہیں، مگر یہ ایک نقصان دہ طریقہ ہے۔ اس سے چہرے کے مسام اور بھی کھل جاتے ہیں اور جلد خراب ہو جاتی ہے۔

کیلیں عموماً کالی ہوتی ہیں لیکن بعض چہروں پر سفید کیلیں بھی نکلتی ہیں۔ یہ بھی جلد میں زیادہ چکنائی کے پہنچنے کی وجہ سے ہوتی ہیں مگر اس میں مسام کھلتے نہیں، بلکہ بند ہی رہتے ہیں اور اوپر سے کیلیں سفید نظر آتی ہیں، ان سفید کیلوں کا علاج صرف مساج ہے۔ ایسی کیل کو ہلکے ہلکے اپنی دو انگلیوں سے رگڑیں سفید کیلوں کو بھی دبا کر کبھی نہیں نکالنا چاہئے اور وہی طریقہ اپنانا چاہئے جو کالی کیلوں کو نکالنے کے لئے بتایا گیا ہے۔

ہر لڑکی اور ہر عورت کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی جلد کس قسم کی ہے اور اسے کیسا علاج کرنا ہوگا۔ اگر ضروری ہو تو کسی پارلر کی مدد سے یہ معلوم کر لیں کہ جلد کس طرح کی ہے اور اس کے لئے روزانہ کا معمول کیا ہونا چاہئے۔ ویسے جلد کسی بھی قسم کی ہو، اگر آپ اس کی صفائی اچھی طرح رکھیں اور ان باتوں کا دھیان رکھیں جو اوپر لکھی جا چکی ہیں۔ تو آپ جلد کی ان پریشانیوں سے یقیناً ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ □□

جج : (ملزم سے) تمہاری عمر کیا ہے؟
ملزم : حضور، تیس سال
جج : یہی عمر تو تم نے تیس سال پہلے بھی اس عدالت میں بتائی تھی
ملزم : جی ہاں، حضور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آج کچھ کہتے ہیں اور کل کچھ اور
محمد خورشید اقبال چکولیا (بہار)

●

ایک لڑکی ایک بڑی دکان میں کیشیئر کا کام کرتی تھی۔ ایک روز اس نے دکان کے مالک سے کہا "مجھے کچھ دن کی چھٹی چاہئے کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری خوب صورتی کچھ کم ہوتی جا رہی ہے۔"
دکان کا مالک حیران ہو کر بولا "کیا مطلب؟ یہ احساس تمہیں کیوں ہونے لگا ہے؟"
کیشیئر لڑکی نے جواب دیا "اب گاہکوں نے باقی پیسے گن کر لینے شروع کر دئے ہیں۔"
عطاء اللہ خاں، برہان پور

●

ایک صاحب کو راستے میں لگے ہوئے اشتہار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک شام کو انہوں نے ایک کھمبے پر ایک نیا اشتہار لگا ہوا دیکھا، مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے اشتہار ان سے پڑھا نہیں گیا، اس لئے اشتہار پڑھنے کے لئے وہ کھمبے پر چڑھ گئے اور اشتہار پڑھنے لگے۔ لکھا تھا "اس کھمبے کا رنگ گیلا ہے۔ مہربانی فرما کر ہاتھ نہ لگائیے۔"
کلیم اختر دلکش، راور کیلا

●

"آپ کو میرا چیک مل گیا؟"
"جی ہاں، دو بار۔"
"دو بار کیسے؟"
"ایک بار آپ سے اور دوسری

تبسم

بار بینک سے۔"
عطاء اللہ خاں، برہان پور

●

دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
ایک نے کہا۔ میرے باپ کو تین مہینے پہلے ہی اپنے مرنے کی تاریخ اور وقت تک کا علم ہو گیا تھا۔
دوسرے نے کہا "بالکل غلط۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"
پہلے نے کہا "غلط کیسے ہے؟ انہیں پھانسی کی سزا سناتے وقت جج نے وقت اور تاریخ بھی بتا دی تھی۔" (قاضی محمد افروز الہدیٰ، مستی پور)

●

ماسٹر نے بچے سے پوچھا "آنے والے کل کو انگلش میں کیا کہتے ہیں؟"
"بچے نے کہا "ٹومارو۔"
ماسٹر نے پھر پوچھا "اور پرسوں کو؟"
بچے نے کہا "ٹومارو پر ایک اور مارو۔"
مطلع تبسم، آمبور

●

دو گپی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
ایک بولا "میرے دادا جی کا دالان اتنا بڑا تھا، اتنا بڑا تھا کہ پورا سمندر اس میں سما جاتا

دوسرا بولا "میرے دادا جی کے پاس اتنا بڑا بانس تھا کہ جب بادل ہوتے تھے تو اس سے بادل صاف کر دیا کرتے تھے۔"
پہلے نے کہا "بھیا ایک بات تو بتاؤ تیرے دادا جی وہ بانس رکھتے کہاں تھے؟"
دوسرے نے جواب دیا "تیرے دادا جی کے دالان میں۔"
عالیہ شیخ۔ دہلی ۵۳

●

کرایہ دار : صاحب، اس گھر کی کھڑکیاں بہت چھوٹی ہیں۔ کسی نازک موقع پر کوئی باہر بھاگ بھی نہیں سکتا۔
مالک مکان : کوئی نازک موقع آئے گا ہی نہیں، کیوں کہ میں کرایہ پیشگی وصول کر لیتا ہوں۔"
کنیز فاطمہ، حیدر آباد

●

کتبے تیار کرنے والا ایک شخص ایک ڈاکٹر کی دکان کے پاس ہی رہتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے مذاق میں اس سے کہا "تم تو ہمیشہ دعا کرتے ہو گے کہ جلد کوئی شخص مرے اور تمہیں کتبہ بنانے کا آرڈر ملے۔"
کتبے تیار کرنے والے شخص نے جواب دیا "مجھے دعا کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ مجھے جیسے ہی پتہ چلتا ہے کوئی آدمی آپ سے علاج کرا رہا ہے تو میں اس کا کتبہ بنانا شروع کر دیتا ہوں۔

●

سراج : مجھے رات بھر نیند نہیں آتی
جاوید : کیا تم رات کو دروازہ بند کر کے سوتے ہو؟
سراج : ہاں
جاوید : تو پھر نیند بے چاری کہاں سے آئے گی؟
سید ریاض احمد، حیدر آباد

اپنے لطیفے اس پتے پر بھیجیے۔ "تبسم" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

چھٹی بار ماں بننے پر نوکری چھنی

بیجنگ (چین) میں چھٹی بار ماں بننے کے جرم میں ایک استانی کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔

چین کے سرکاری روزنامہ "چائنا ویمنس نیوز" کے مطابق آمدئی قصبے کے فلوجیا گاؤں کی استانی نے سرکار کی فیملی پلاننگ کے پروگرام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چھٹی بار اولاد پیدا کی۔

اس جوڑے پر الزام ہے کہ انہوں نے حاملہ ہونے پر چھپایا اور پاس پڑوس میں بتایا کہ استانی علاج کے لئے ووٹ کے اسپتال میں گئی ہیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد شوہر نے نوزائیدہ بچے کو گاؤں کے ایک ٹیل کے پاس رکھ دیا اور بعد میں یہ کہہ کر اٹھا لیا کہ وہ انہیں لاوارث پڑا ہوا ملا ہے۔

اسکول کی ایک میٹنگ میں ماں نے چھٹی بار ماں بننے کا اپنا جرم قبول کر لیا۔ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں اس کی اسکول سے چھٹی کر دی گئی۔

بالوں کے ذریعہ مسافروں سے بھری بس کھینچی

ملیشیا میں لیچ منان نام کے ایک لڑکے نے اپنے مضبوط بالوں کے ذریعہ ۲۵ مسافروں سے بھری ہوئی بس کھینچی۔ پوری بس کا وزن ۶٫۲۰۰ کلوگرام تھا۔ وہ اپنے بالوں کے ذریعہ بس کو گھسیٹ کر ۲۰ میٹر کی دوری تک لے گیا۔

ایک دلہن ایسی بھی

میرٹھ کے تھانہ پچ نگر کے ایک بارات کے غازی آباد سے واپس آنے پر دولہا کے خاندان والے اور پڑوسی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کار ڈرائیور کی جگہ پر خود دلہن لال جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ دلہن نے اپنے برابر والی سیٹ پر دولہا کو بٹھایا ہوا تھا۔ دوسرے باراتی جن میں دلہن کی نند اور بچے شامل تھے۔ وہ سب کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

دلہن کی نند ششی نے بتایا کہ وداع ہونے کے بعد میرٹھ روڈ پر دلہن نے کار کے ڈرائیور کو نیچے اتار کر ساتھ چل رہی بس میں بٹھا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی دلہن اتنی تیز گاڑی چلا کر لائی کہ اس میں بیٹھے دوسرے لوگ اپنی جان کی خیر مناتے رہے کار کی رفتار زیادہ ضرور تھی لیکن جس توازن سے دلہن نے اسے چلایا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

فلپائن میں کتے کا گوشت کھانے پر پابندی

میٹرو منیلا کمیشن نے شہر کے ۸۰ ہزار کتوں کا اندراج کرنے اور ان کو زہر کا انجکشن دئے جانے کے لئے ایک مہم شروع کی ہے تاکہ کتے ختم ہو جائیں۔ یہ مہم ۵ سالہ پروگرام کے ایک حصے کے طور پر کتے کھانے کی رسم ختم کرنے کے لئے شروع ہوئی ہے۔

اس پروگرام کو چلانے والے مسٹر ہنی فرنانڈیز نے بتایا ہے کہ فوج کتے کے ذبح کئے جانے والی جگہوں پر چھاپے مارے گی اور جس کسی کو کتے کا گوشت فروخت کرتے یا کھاتے ہوا پکڑا جائے گا اس پر ۵ سے لے کر ۱۰۰ امریکی ڈالر تک جرمانہ کیا جائے گا

صوبہ فلپائن میں کتے کا گوشت ایک اچھی غذا سمجھا جاتا ہے لیکن راج دھانی میں کتے کے گوشت کے نمونے جمع کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔

محبت اندھی ہوتی ہے

یہ مشہور کہاوت عام آدمی پر تو کئی بار

اثر کر چکی ہے لیکن حال ہی میں ایک جین سنیاسن بھی اس کا شکار ہو گئی۔ اندو پربھا ایک جینی سنیاسن تھی جو دوسرے پانچ سنیاسیوں کے ساتھ کھانڈوا پیدل سفر کرتے وقت اچانک غائب ہو گئی۔ دوسرے دن سمروں میں ہزاروں جین مرد، عورتوں اور سادھوؤں نے ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا اور کمشنر آف پولیس سے مانگ کی کہ وہ اندو پربھا کے اغوا کرنے والے کو تلاش کر کے فوراً سزا دے۔

مگر جب پولیس نے کافی محنت کے بعد اندو پربھا کو ڈھونڈ نکالا تو حیرت کی بات سامنے آئی کیوں کہ اندو پربھا نے حلفیہ بیان دیا کہ "اس کا اغوا نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ اپنی مرضی سے اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی کیوں کہ وہ اپنی سنیاسی زندگی سے بے زار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے سادھوؤں والا لباس اتار پھینکا تھا اور رکم ٹکم لگا کر ازدواجی زندگی گزارنی شروع کر دی۔"

انگلینڈ کے چرچ کی تاریخ میں پہلی عورت

انگلینڈ میں ریورنڈ سلویا میوش نے کل وہاں کے چرچ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ سرکاری چرچ میں عورت دھرم گورو کے ناطے شادی بیاہ کی تقریب کرانے والی وہ پہلی عورت ہو گئی ہیں۔

۵۰ سالہ میوش، ڈیکنس پادری کی ماتحت ہیں انہوں نے یارک کے چرچ میں ایک نوجوان جوڑے کو میاں بیوی بننے کا عہد کرایا گرجا گھر کے پادری کسی وجہ سے باہر گئے ہوئے تھے تو اس کام کو پورا کرنے کا ان کو موقع ملا۔ پہلی بار کسی سرکاری چرچ میں عورت پادری کے ذریعہ شادی کی تقریب خوبی سے پوری ہو گئی۔ اسی دوران پریس رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔

دو ہفتے پہلے ہی انگلینڈ کے چرچ کے قانون میں اصلاح ہونے کی وجہ سے ہی میوش کو شادی کرانے کا حق ملا تھا۔

فروری کا شمارہ نظر سے گزر اپیا "نادر" پر باندھی گئی ٹائی کا آپ نے دیس بدیس کی خبروں میں ذکر کیا ہے۔ میں اس کی تصویر بھیج رہا ہوں جو مجھے "گلف نیوز" دبئی سے حاصل ہوئی تھی۔ (ذاکر علی مرحوم، اندور)

بزم بانو

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دل چسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مُدیرہ

بزم بانو
ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

محمد الیاس عروج، امروہہ

س : اخلاق کی قدر کب نہیں ہوتی؟

ج : کسی غرض کے لئے میٹھی میٹھی باتیں کرے وہ خلیق نہیں مطلبی ہے۔ لوگ پہچان جاتے ہیں پھر اس کی قدر نہیں کرتے۔ خوش اخلاق کی قدر ہوتی ہے۔ بد اخلاق دُھتکارا جاتا ہے۔

شہناز کی نہٹور (بجنور)

س : کیا بغیر پیسے کے اچھی زندگی نہیں گزاری جا سکتی؟

ج : کچھ تو پیسہ، رہنے کو مکان کے لئے تن کے کپڑوں اور پیٹ کی روٹی کو چاہیے۔ آپ خود کچھ نہیں کماتیں؟ آج کل لڑکیاں چھوٹے بیوپار شروع کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ بھی مدد دیتی ہے عام طور پر مسلمان لڑکیاں اس میدان میں پیچھے ہیں قصور وار کون ہے؟

س : آج کل نیک راستے پر چلنے والوں کو بے وقوف کیوں سمجھا جاتا ہے؟

ج : میں نے تو نہیں سُنا۔ بہت سے لوگ فرسودہ روایات کو نیکی سے تعبیر دیتے ہیں۔ جو وقت کے ساتھ نہ چل پائیں۔ ایسے شرافت کہیں لوگ ان کا مذاق تو اُڑائیں گے اگر نیک راہ پر چلنے والوں کو یقین ہے کہ وہ سیدھی راہ پر چل رہے ہیں تو بکنے دیجیے لوگوں کو۔ ضرورت سے زیادہ معصومیت اور شرافت بھی بور کرتی ہیں۔

محمد قسمت علی چوڑھلی کھگڑیا (بہار)

س : مجھے اس دنیا میں صرف ایک ہی دوست ملا۔ لیکن وہ بھی پیسے کا یار ہے۔ میں کیا کروں؟

ج : ایسا کیجیے آپ کے شہر میں لائبریری ہے اس کے ممبر بن جائیے۔ کتابیں بہترین دوست ثابت ہوں گی۔ صرف کہانیاں اور ناول ہی نہیں بلکہ تاریخ، فلسفہ، پالیٹکس اور اکنامکس بھی سرسری طور پر پڑھ لیجیے۔ پھر لکھنا شروع کیجیے۔ قلم سب سے پیارا دوست ثابت ہوگا۔

رخسانہ جعفری، رانچی

س : اکیلا پن زندگی میں کب بوجھ بن جاتا ہے۔ جب کہ زندگی کا اصلی رُوپ اکیلا پن ہی ہے؟

ج : قدرت کو اکیلا پن ہی منظور ہوتا تو نر کے ساتھ مادہ کیوں پیدا ہوتی۔ اکیلے تو پہاڑ بھی نہیں ان کے گلے میں بھی ندیاں بارش ہوتی ہیں۔ ہر جاندار کا نصف بہتر موجود ہے۔

مسعود احمد، کانپور

س : ہم باوجود کوشش کے ایسا کام نہیں کرتے ہیں جس سے لوگ اُنگلی اُٹھائے مگر پھر کچھ لوگ اُنگلی اُٹھاتے ہیں۔ اب بتائیے میں کیا کروں؟

ج : اُٹھانے دیجیے اُنگلی آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ آپ دنیا سے سارٹیفکیٹ لینے کے لئے تو زندہ نہیں۔ سُنئے سب کی کیجیے وہی جو آپ درست جانیں۔

ایم۔ اے۔ حق۔ جولاساہی، کٹک

س : آنٹی! کیا یہ صحیح ہے کہ عورت ایک معمہ ہے؟

ج : ہمارے سماج میں عورت مرد کے درمیان بڑی دُوری رکھی جاتی ہے عورتیں کہتی ہیں مرد ایک معمہ ہیں۔ کیا آپ کی کوئی لڑکی دوست ہے محبوبہ یا رشتہ دار نہیں بلکہ بالکل غیر لڑکی جس سے آپ بغیر اس سے عشق کئے دل کی بات کہہ سُن لیں۔

رونق معبود، پٹنہ

س : اچھی کام یابی حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا ضروری ہے؟

ج : اپنی کام یابی کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ افراد کی کام یابی کے مسائل کو مِل جُل کر سُلجھایا جائے۔ اکیلا کم زور ثابت ہوتا ہے۔ بہت سے دُکھی اور کم زور مِل کر ہی سب کی مشکلات تلاش کر سکتے ہیں۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔

جاوید اقبال، جبلپور (ایم۔پی)

س : محبت انسان کو کس سمت لے جاتی ہے پستی کی طرف یا عروج کی طرف؟

ج : یہ تو محبت کے رُجحان پر منحصر ہے پستی اور عروج تو نیت پر منحصر ہے جیسی محبت کرنے والے کی خصلت ہوگی۔ ویسا ہی طرف جائے گا۔ محبت غیر جانب دار

شمع کہانی نمبر
کی زبردست مقبولیت کے بعد
ادارہ
شمع
کا
ایک اور بے مثال،
باوقار خاص نمبر
شمع
فلم
اور
ٹی وی
نمبر
تاریخ اشاعت کا
انتظار فرمائیں
فلم اور ٹی وی کی شخصیتوں پر دل چسپ مضامین، ستاروں کی رنگین تصویریں، ممتاز افسانہ نگاروں کے قلم سے فلم اور ٹی وی کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانیاں، خصوصی نظمیں اور وہ سب کچھ جس کی آپ شمع سے توقع رکھتے ہیں۔
اِن تمام خوبیوں کے باوجود اس خاص نمبر کی قیمت صرف پندرہ روپے ہوگی۔ شمع کے کہانی نمبر کی طرح یہ "فلم + ٹی وی نمبر" بھی شمع کے عام شماروں سے الگ، ایک خصوصی اشاعت کے طور سے پیش کیا جائے گا۔
ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

BANO New Delhi 40th Year of Publication ISSUE NO. 482 Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No 741/57 Regd. No. D-(C) 120

بچّوں پر مزدوری کا بے رحم بوجھ
پانی زیادہ پی کر مٹاپا کم کیجیے
نکّی بیوی ، پکّی بیوی
RS.
SR. 4/-

شمع کہانی نمبر
کی زبردست مقبولیت کے بعد
ادارہ
شمع کا
ایک اور بے مثال
باوقار خاص نمبر
شمع فلم اور ٹی وی نمبر
تاریخ اشاعت کا انتظار فرمائیں

افتتاحیہ

توبہ بندگی کا بیج ہے۔ اور بیج جتنا صحت مند ہوگا اُتنا ہی صحت [illegible] کے بطن سے نمودار ہوگا۔ توبہ کے مفہوم میں اللہ کی ذات و صفات پر بھروسا مضمر ہے۔ اور جب تک یہ بھروسا نہ ہو، انسان گناہوں پر شرمسار نہیں ہوسکتا۔ اور جب تک شرمسار نہ ہو، توبہ مقامِ قبولیت کو نہیں پہنچتی۔

جب تک توبہ صحیح نہ ہوگی، عبادت بھی صحیح نہ ہوگی۔ جس نیت سے بندہ اللہ کی طرف لوٹتا ہے، ویسی ہی اُسے مُراد مِلتی ہے۔ توبہ مُردہ دِلوں کی حیات ہے، زندہ دِلوں کی بیداری ہے مغفرت مانگنے والوں کے لئے معافی کا اعلان ہے، سیاہ قلوب کے لئے روشنی ہے۔

توبہ کی جان نیت ہے۔ بندہ جس نیت سے اللہ کی طرف لَوٹتا ہے، اُسی اعتبار سے اُسے پھل مِلتا ہے، اور پھل کے ذائقے سے ہی نیت کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے۔ جو مفادِ دُنیا کے لئے توبہ کرتے ہیں، وہ مفادِ دنیا کو ہی سامنے رکھتے ہیں اور مصیبت میں اللہ سے جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جو اللہ کے لئے توبہ کرتے ہیں وہ مصیبت میں صبر کرتے ہیں اور نعمت میں شکر ادا کرتے ہیں۔

سعدیہ دہلوی

جون ۱۹۸۷

اشاعت کا چالیسواں سال، ۴۸۴ واں شمارہ

بہ یادگار : یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی : زینت کوثر دہلوی
مدیرہ : سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی
عام شمارے کی قیمت : چار روپے
سال بھر کی قیمت : ۵۳ روپے (اس میں سال نامہ کا رجسٹری خرچ شامل ہے)

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی NEW DELHI
ٹیلکس : (031) 61601 SHMA IN
ٹیلی فون: 732668 732667 732666
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان : شمع میگزین
طابع و ناشر : محمد یونس دہلوی
مطبوعہ : شمع پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲

دہلی میں کرفیو کے باعث یہ شمارہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ شمارہ جون اور جولائی کی فروخت کے لئے ہے۔

کہی سنی

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

آپ کے زیرِ ادارت بانو یقیناً ملک کا سب سے معیاری خواتین کا جریدہ بن گیا ہے وقت کے ساتھ اس کے حسن میں اور بھی نکھار آتا جا رہا ہے۔ آج کل بیشتر رسالے اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ تو بانو ہی کا حصہ ہے کہ یہ اخلاقی قدروں کو بلند کرنے میں برابر کوشاں نظر آتا ہے۔ اس اصلاحی کوشش کے ساتھ اس کا طرزِ نگارش اور مضامین کا معیار بھی نہایت بلند ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کا جریدہ معاشرتی بُرائیوں کے خلاف مہم میں کامیاب رہے گا۔

حبیب احمد، سہسرام

● سماجی بُرائیوں کے خلاف آواز اُٹھانا صرف لکھنے والوں کی ہی نہیں پڑھنے والوں کی بھی ذمّہ داری ہے۔ آپ کے تعاون سے ہی اس مہم میں بانو کو خاطر خواہ کامیابی ہو سکتی ہے (مدیرہ)

ڈیر سعدیہ باجی:

بانو کا میں ہر ماہ مطالعہ کرتی ہوں۔ عرصے سے آپ کی کاوشوں کو سراہنے کو دل چاہ رہا تھا اور آج پہلی بار آپ کی بزم میں حاضر ہوں۔

اس ماہ کے سب ہی افسانے اچھے تھے "دھڑکن" کی ہر قسط ایک دوسرے سے بازی لے جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

کالم "قلمی دوستی" میں کچھ بھائی اپنے شوق میں نماز پڑھنا بھی لکھ دیتے ہیں، جو اچھا نہیں لگتا۔ ربّ العزّت سے التماس ہے کہ وہ انہیں نماز مشغلے کے طور پر نہیں، بلکہ فرضِ خداوندی سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نوشابہ سعدیہ، سہسرام

● نماز کے بارے میں آپ کا خیال بالکل دُرست ہے۔ (مدیرہ)

محترمہ باجی صاحبہ:

بانو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سب ہی افسانے اور نظمیں پسند آئے۔ خاص طور سے نجمہ تبسم کا افسانہ دل و دماغ پر چھا گیا۔ انہیں میری طرف سے دلی مبارک باد

آپ کا کشمیر کا سفرنامہ پڑھ کر ایسا لگا جیسے ہم بھی آپ کے ساتھ سفر میں شریک تھے یہ اندازِ بیان مبارک ہو۔ فاطمہ ذی شان، ترلی

● شکریہ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ دہلوی:

آج کے "آزاد ہند" میں آپ کا مضمون میر ٹھ کی پدیا تراسے متعلق پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ آپ نئی نسل کی قیادت اچھے اور سیکولر ڈھنگ سے کرنا چاہتی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔

سال نامہ بہت پسند آیا۔ بہت جامع بہت وسیع ہے آپ کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔

آپ قبول فرمائیں تو کبھی کبھی عمدہ فوٹو فیچر بانو کے لئے روانہ کرتا رہوں۔ لیکن ظاہر ہے یہ ترجمے کئے ہوئے ہوں گے۔

ف۔س۔ اعجاز، کلکتہ ۳۷

● نیکی اور پُوچھ پُوچھ، آپ اپنی تحریریں ضرور روانہ کریں۔ (مدیرہ)

سعدیہ آنٹی:

بانو اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ تمام مصروفیات کو پسِ پشت ڈال کر بانو کا مطالعہ کیا۔ اپنے محبوب رسالے بانو میں آپ کا تحریر کردہ افتتاحیہ میں بے حد پسند کرتا ہوں۔ افتتاحیہ میں آپ کا ایک ایک لفظ بہت ہی نصیحت آموز ہوتا ہے اتنا سلجھا ہوا رسالہ نکالنے کے لئے واقعی ذہانت، عقل اور فن کارانہ حس کی ضرورت ہے۔ بانو کی کامیابی میں جہاں اللہ تعالیٰ کی مہربانی شامل ہے، وہاں آپ کی محنت، لگن، اور کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ ماہ بہ ماہ بانو ترقی کی جانب گامزن ہے۔ صوائی اور معنوی اعتبار سے اس کے معیار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے — اس آردہ کش دور میں اتنا خوب صورت رسالہ نکالنا واقعی قابلِ تحسین ہے۔ رسالہ اتنی خصوصیات کا حامل ہے کہ تجسس بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ سرزمین دہلی کو آپ نے اپنی صحافت سے نہ صرف سنوارا ہے، بلکہ بامِ عروج پر پہنچایا ہے۔ اعلیٰ صحافت کو جو کچھ آپ نے دیا ہے، وہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں، بلکہ 'عیاں را چہ بیاں'، کی مثال ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا آپ کے رسالے کو دن دُونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور ہمیں خوب صورت چیزیں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ آپ حیدرآباد تشریف لا کر یہاں کی تاریخی عمارتوں کے بارے میں اپنے خوب صورت رسالے بانو میں اپنے خیالات اور تاثرات لکھیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ۔

عبدالخلیل کشش، شکر نگر (آندھرا)

● پچھلی بار ہم صرف ایک دن کے لئے حیدرآباد آئے تھے۔ زیادہ گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ انشاء اللہ اب کی بار حیدرآباد آئے تو زیادہ وقت اس

حسین شہر میں گزاریں گے اور تفصیل سے وہاں کے مقامات کے بارے میں لکھیں گے۔ (مدیرہ)

محترمہ خالہ صاحبہ:

میں نے پہلی دفعہ آپ کا ماہ نامہ بانو پڑھا۔ کافی اچھا لگا۔ آئندہ بھی پڑھنے کو جی چاہا۔

اگر آپ اپنے رسالہ کے لئے یہاں جدہ میں کسی قسم کی کنویسنگ کرانا ہو تو میں حاضر ہوں۔ ویسے بھی میں کافی لوگوں کو بانو کی طرف راغب کرا رہا ہوں۔ بانو ہمارا اپنا رسالہ ہے اسی لئے میں اس رسالہ کا زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تعارف کرانے کے لئے ضرور کوشش کروں گا۔

محمد نواز، سعودی عربیہ

● ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ جدہ میں بھی بانو کافی مقبول ہو رہا ہے۔ تعاون کا شکریہ۔ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

اس مرتبہ سرورق کی دل کش تصویر نے دل موہ لیا۔ یہ تصویر بانو کے لئے ایک نیا نکھار ہے۔ آپ کا فوٹو فیچر "کشمیر میں سیاسی اتحکام" پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ لیکن تحریر مختصر رہی۔ اگر تفصیل سے بات کہی جاتی تو کچھ اور مزہ آتا۔ "گود لینے میں خوشیاں ہیں یا الجھنیں؟" "تیر اگھر" "نئے زمانے کی نانی اماں" "گونگے آئینے" "رُت" "لگن" کی چودھویں قسط اور اس کے علاوہ نظمیں، اقوالِ زریں، "ہیلتھ کلب" "بیوٹی کالج" "کیا کیلوں مہاسوں سے چھٹکارا آسان ہے؟" "تبسم" میں لطیفے وغیرہ بے حد پسند آئے۔ عصمت چغتائی صاحبہ کو شاید میرے سوال پسند نہیں آ رہے ہوں گے۔ اس لئے جواب نہیں دیا جا رہا ہے۔ وہ بڑا خوش نصیب دن ہو گا جب میرے سوال کا جواب دیا جائے گا۔ میں انتظار کروں گی۔

رضیہ سلطانہ جلیلی، تھم

● صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے انشاء اللہ آپ کا سوال عصمت صاحبہ کے جواب کے ساتھ "بزمِ بانو" میں ضرور شامل ہوگا۔ (مدیرہ)

ڈیئر بہن سعدیہ صاحبہ:

ایک طویل انتظار کے بعد سال نامہ موصول ہوا۔ بہت جتن کر کے میں نے فرصت کے اوقات نکالے اور آج اس کو مکمل طور پر ہضم کر چکی ہوں، چوں کہ یہ بے حد دل چسپ تھا، لہٰذا میں نے اسے بہت کم احتیاط میں پڑھا۔ اس کی تعریف احاطۂ تحریر سے باہر ہے آج کل "لگن" ہر لحاظ سے ستائش کے قابل ہے، سال نامہ میں چوٹی کے فن کاروں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ میری مختصر سی تحریر "زندگی کو سنواریں" کی اشاعت کا شکریہ۔ سال نامہ کی شان کو دوبالا کرنے والے مضامین میری نظر میں یہ ہیں:

"افتتاحیہ" "ایک تاثر" (گوپی چند نارنگ) "خدمتِ خلق" "لگن" اور "پچھلے پہر کی چاندنی" (بشریٰ رحمٰن) "بغیر عنوان کے" (رضیہ منظور الامین) "بادبان" "ممتا کا زہر" (صالحہ عابد حسین) "درد کا رشتہ" (سراج انور) مزاحیہ ڈرامہ "گھر کی مرغی" "نذرانہ" "ڈال جھک گئی" "دوسری سوت" "بھنور اور کنارہ" "شاید" "ایک لوہار کی" "سرپرائز" "شکست کا مزہ" "فیصلہ" "برفیلی آگ" وغیرہ۔ ان سب فن کاروں کو مبارک باد اور آپ کو بھی۔

ڈاکٹر عطیہ سعید، حیدر آباد

● سال نامہ آپ کو پسند آیا، سمجھئے ہماری محنت وصول ہو گئی۔

(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

امن مارچ کرتا ہوا آپ کا کارواں کرفیو کی آگ میں جھلستے ہوئے میرٹھ میں پہنچا تھا — یہ بات مقامی اخبارات میں چھپے ہوئے آپ کے بیان اور امن مارچ کی تصویروں سے معلوم ہوئی۔ افسوس ہے کہ انتظامیہ نے آپ کو شہر کے کھلے ہوئے علاقہ تل بیگم پور ہی جانے کی اجازت دی۔ میں ضرور آپ سے ملتا، مگر ہمارے علاقہ میں زبردست ناکہ بندی ہو رہی تھی۔ بہرحال آپ کے حالیہ دورے کا بہت خوش گوار اثر میرٹھ کے عوام اور انتظامیہ پر ہوا ہے اور میرٹھ کے دگرگوں حالات میں مسلمانوں کی طرف سے آپ کی نمائندگی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

(سید اختر الاسلام، میرٹھ)

● ہم سب کا فرض ہے کہ میرٹھ اور ملک کے باقی سب ہی حصوں میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کوشاں رہیں۔

(مدیرہ)

پتھرا گئیں تھیں آنکھیں اسی انتظار میں
آخر سخن کا پھول کھلا اس بہار میں

عزیزی سعدیہ! بے شمار دعائیں۔

بانو کا سال نامہ ملا گویا کہ فال نامہ ملا میں نے بغور پڑھا جیسے کوئی چہرے کی کتاب پڑھتا ہے۔ خوب اور بہت خوب ماشاء اللہ!

ہر ادیب، ہر شاعر اپنی اپنی جگہ مہکتا ہوا پھول ثابت ہوا۔ اور وہ بھی ادبی پھول۔ تم نے ان پھولوں کو سمیٹ کر شان دار ایک ادبی گل دستہ بنا دیا ہے نازک اور آرزو کی خدمت بخدا تمہارا ہی کام ہے۔ تم وہاں ہو جہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میری طرف سے دلی مبارک باد قبول قبول ہو۔ جب اور جس وقت بھی قلمی خدمات آپ چاہیں، میں حاضرِ خدمت ہوں تمہارا یونس بھائی کا، ادریس بھائی کا۔ الیاس بھائی کا مجھ پر حق ہے۔ ان سب حضرات کا مجھ پر صدیوں سے بڑا کرم ہے۔ اللہ تم کو خوش رکھے۔

ایک شعر کے ساتھ خط ختم کرتا ہوں بقول اصغر گونڈوی مرحوم کے:

اگر خموش رہوں میں تو تم ہی سب کچھ ہو
جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود

اقبال حسرت بے پوری

● سال نامہ کو خوب تر بنانے میں آپ کا شکریہ۔ (مدیرہ)

لڑکیوں اور عورتوں کے لئے مشرقی قدروں کے ساتھ
ماہ نامہ
ایک نئی ذہنی بیداری کا پیامی
شائع ہو گیا ہے
سالنامہ
1987
آج ہی منگائیے
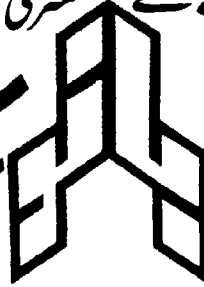
امن کے لئے پدیاترا

سعدیہ دہلوی

میرٹھ میں فسادات کا پانچواں دن تھا۔ سارے شہر میں ایک وحشت خیز، المناک سناٹا۔ سپاہیوں کے سوا سڑکوں پر میلوں تک کوئی آدم زاد نظر نہیں آیا۔ در و دیوار پر گولیوں کے نشان نظر آرہے تھے۔ محلوں کے اندر قیامت کا منظر تھا۔ گولیوں سے اڑے ہوئے سر کے ٹکڑے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بے قصور بیوائیں چیخیں مار مار کر سوال کر رہی تھیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ ان کے بچوں کو کون پالے گا؟

گھروں کے اندر پاور لوم جلے پڑے تھے۔ ایک ۸۰ برس کے آدمی نے رو رو کر بتایا کہ اس کا جوان بیٹا اور پوتی دونوں گولیوں کا شکار ہوگئے۔ کرفیو کی وجہ سے ان کو دفنانے کے لئے

کوئی باہر نہیں نکل سکا اور اس نے وہاں گھر سے باہر گلی میں اپنے بچوں کو خود ہی دفنا دیا۔ گلیوں میں جا بجا بھوک سے مرے ہوئے جانور پڑے تھے۔ محلوں میں لوگوں کے کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ لوگ ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نکل ہی نہیں رہے تھے۔

ایسے رُوح فرسا حالات دیکھ کر دل پر اتنا اثر ہوا کہ کئی دن تک نہ حلق سے کچھ اُترا اور نہ راتوں کو نیند آئی۔ انتہائی بے بسی اور لاچاری محسوس ہوئی۔ آج آزادی کے چالیس برس بعد بھی ہم ایک دوسرے کو مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ افسوس! کہ ہم لوگوں نے اپنی پہچان ہندوستانی کے بجائے صرف ہندو، مسلم، سکھ کی حیثیت سے کھو رکھی ہے جس ملک کی آزادی کے لئے سب نے مل کر قربانی دی، آج اسی ہندوستان میں ایسی جارحانہ فرقہ پرستی کیوں پھیل رہی ہے۔ جو ہمارے ملک کی جڑوں کو کمزور کرتی جارہی ہے؟ کیا ہم لوگ اپنا ضمیر کھو چکے ہیں!

اسی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے خلاف لڑنے کا ہم نے عہد کیا ہے۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں ہم نے 'امن پد یاترا' پر میرٹھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۹ مئی کو ہم نے مختلف مذاہب کے نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور دلی میں بوٹ کلب سے میرٹھ کے لئے پیدل روانہ ہو گئے۔ چلچلاتی گرمی اور کڑی دھوپ میں ہم بس چلتے ہی رہے۔ پہلی بار جمنا پار کے کچھ علاقے دیکھے۔ یقین نہیں آیا کہ دلی اتنی پھیل گئی ہے۔ دلی کی سرحد سے نکلتے نکلتے شام ہو گئی۔ راستے میں جگہ جگہ لوگ کچھ دور ہمارے ساتھ چلتے گئے شام کو ساڑھے چھ بجے موہن نگر پہنچے، جہاں ہم نے رات کو بسیرا کیا۔

بستر پر لیٹے ہی تھے کہ تھکن کے باعث فوراً آنکھ لگ گئی، صبح کو چار بجے اٹھے اور نہا دھو کر پانچ بجے پھر شاہ راہ پر آ گئے دوسرے دن بھی بہت سے لوگ ہمارے ساتھ چلے ہم کچھ دیہاتوں میں بھی گئے۔ غازی آباد میں شہانا میں جاکر بڑی مسرت ہوئی۔ بالکل ایسا لگا جیسے ریگستان میں بھٹکتے بھٹکتے کسی سرسبز اور شاداب نخلستان میں جا نکلے ہوں۔ ہندو مسلم وہاں بڑے اتحاد کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہاں کے مدرسے کے لئے محلے کے ہندو روپے پیسے دیتے ہیں۔ بڑے فخر سے ان محلے والوں نے ہمیں بتایا کہ اس گاؤں میں ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک ایک آدمی کا قتل نہیں ہوا ہے۔ ایسے ہی دیہات میں ہندوستان کے روشن مستقبل کی کرن نظر آتی ہے اور یہ یقین ہوتا ہے کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔

شہروں میں جہاں تعصب اور فرقہ پرستی کی آگ تیزی سے پھیل رہی ہے۔ وہاں ہمارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر آج بھی انسانیت کا مینارِ نور بنا ہوا ہے۔ ان میں بھائی چارہ ہے۔ ہمدردی ہے محبت ہے۔ گاؤں کے لوگوں کے اندر آج بھی سادگی اور نیک نیتی ہے۔ انہوں نے دل کھول کر ہمیں اپنی پریشانیاں بتائیں۔ گاؤں والوں کی سیاسی بیداری دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ سیاسی مفاد اور ذاتی غرض کی وجہ سے معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بہہ رہا ہے۔ جگہ جگہ رُک کر ہم نے یہ درس دیا کہ گاندھی جی کے اہنسا کے راستے پر چل کر ظلم اور ناانصافی کے خلاف ہمیں متحد ہو کر آواز اُٹھانی چاہیے۔

اس دن ہم ۳۲ کلو میٹر تیز دھوپ میں پیدل چلے۔ پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ ہونٹ گرمی کی شدت سے خشک ہو رہے تھے لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ ہمیں نہ درد کا احساس ہوا اور نہ تپتی دھوپ کا۔

رات کو ہم مودی نگر پہنچے اور وہاں کچھ گھنٹے آرام کیا۔ صبح کو پانچ بجے پھر میرٹھ کی راہ پر روانہ ہو گئے۔ ہم کافی تیزی سے چل رہے تھے۔ ایک بجے کے قریب ہم میرٹھ میں داخل ہو گئے۔ وہاں جگہ جگہ لوگ ہمارے استقبال کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔ شام تک ہم مختلف محلوں میں امن کا پیغام لے کر گئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ ماحول میں تناؤ گھٹتا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ اگر انسان نیک ارادے رکھے تو خدا اس کو عمل کے لئے ہمت، حوصلے، اور طاقت سے نواز دیتا ہے۔ ●

بچّوں پر مزدوری کا بے رحم بوجھ

سعید سہروردی

رامو کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ ٹھیکے پر ایک دفتری خانے میں روز بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کی یومیہ آمدنی دس اور پندرہ کے درمیان ہوتی ہے۔

رامو کا باپ کارخانے میں ہڑتال کی وجہ سے گھر آ بیٹھا۔ ہڑتال ختم ہوئی تو چھٹنی کی زد میں آ گیا۔ اب رامو کی ماں اور رامو کے کندھوں پر گرہستی کا بوجھ ہے۔ ماں چار گھروں میں جھوٹے برتن مانجھ کر دو سو روپے ماہوار کماتی ہے۔ تین چار سو روپے ہر مہینے رامو گھر لے آتا ہے۔

اسکول، کھیل کا میدان اور سنہرے مستقبل کے خواب یہ سب رامو اور اس کی طرح کروڑوں بچّوں کے لئے پرائے اور اجنبی ہوتے ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں نے بچپن کو بادشاہت کا زمانہ کہہ کر اس کی سہانی یادوں کا ذکر کیا ہے لیکن رامو اپنے بچپن کو یاد کر کے کیا پائے گا؟ اس کی یادیں کیسی ہوں گی؟

اُکتانے والی بے کیف زندگی، مالک کی گھڑکیاں، مجبوری اور حقارت کا چبھنے والا احساس ——— یہی یادیں رامو کے بچپن کا سرمایہ

جائے گی۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ملک کی آزادی کے تقریباً چالیس برس گزر جانے کے بعد بھی زندگی ہم ملک کے کروڑوں بچوں کو دے سکے ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب بڑے بچوں کا بوجھ اُٹھا تے تھے، ان کی کفالت کرتے تھے۔ اب نوبت یہ آگئی ہے کہ کروڑوں بچے اپنے کنبے کا اپنے ماں باپ کا بوجھ اُٹھانے کے لئے مجبور ہیں۔

بچوں سے مزدوری لینے یا کرانے میں بعض قانونی بندشیں یا رکاوٹیں ضرور ہیں لیکن اس لعنت کو دُور کرنے کی بجائے کچھ حلقے اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ بچوں کی مزدوری کو قانونی شکل دے دی جائے۔ اس کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ ملک میں عوام کی غربت کو دیکھتے ہوئے بچوں کی ملازمت کو ایک ناگزیر بُرائی مان کر قبول کرلینا چاہئے۔ حکومت کو بھی اس دلیل میں کشش نظر آئی ہے اور اس طرح کا قانون مرتب کرنے کی کاغذی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

مزدوروں کے تحفظ کے لئے انجمن متحدہ اقوام سے وابستہ مزدوروں کی بین الاقوامی تنظیم آئی۔ ایل۔ او ہے جس کا رکن ہندوستان بھی ہے۔ اس کے منظور کئے ہوئے معیار کے مطابق پندرہ برس سے کم عمر کے بچوں سے کارخانوں، کانوں اور دیگر مخدوش پیشوں میں کام نہ لیا جاسکے گا۔ ان شعبوں کے علاوہ دیگر پیشوں میں بچوں کی کم سے کم قانونی حد گھٹ کر بارہ برس ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں بارہ برس کے بچے کو مزدوری کے لئے بازار میں دھکیلا جاسکے گا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ حکومت ہند کی وزارت محنت یہ معیار بھی مقرر نہیں کرسکی ہے کہ کون سے پیشے مخدوش ہیں اور کون سے نہیں ہیں۔ سنا ہے اس مقصد کے لئے ایک تکنیکی کمیٹی قائم کی جائے گی جو اپنی عالمانہ اور ماہرانہ رپورٹ پیش کرے گی جس کی روشنی میں وزارت محنت فیصلہ کرے گی۔ کسی نیک کام کو ٹالنے کا بہترین نسخہ ہے کہ اس کے بارے میں ایک کمیٹی بٹھادی جائے۔ جب تک ڈاکٹر سوچ کر نسخہ لکھیں گے، اس وقت تک مریض کا کام تمام ہو جائے گا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ کون سا کام یا پیشہ خطرناک یا مخدوش ہے، عالم یا ماہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ آنکھیں کھُلی اور دماغ روشن ہونا چاہئے۔

آج کل ملک کے لاکھوں بچے قالین، دیاسلائی اور آتش بازی کے کارخانوں میں کام کر رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان کاموں میں کیا خطرے ہیں؟ بچوں کے ماں باپ بھی جانتے اور سمجھتے ہیں، لیکن مجبوری ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ قالین کے کارخانوں میں اُون کے رُوئیں اندر کی سانس کے ساتھ جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ دیاسلائی اور آتش بازی کے کارخانوں میں گندھک کا دُھواں صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔

قانون میں بچوں کے مزدوری کرنے کے سلسلے کو دس برس بعد ختم کرنے کی بات کہی گئی ہے لیکن قانون میں میعاد مقرر کرنے کا تجربہ کیا کہتا ہے؟ یہی کہ جب کسی مقصد کے حصول کے لئے قانون کے اندر کوئی میعاد مقرر کی گئی ہے تو وہ مقصد میعاد کے اندر کبھی پورا نہیں ہوا اور قانون میں ترمیم کرکے میعاد کی توسیع کی گئی ہے۔ اس کی دو مثالیں کافی ہوں گی۔ آئین کے تحت ہریجنوں کو ایک خاص مدت کے لئے تحفظ حاصل تھا۔ وہ میعاد گزر چکی ہے اور یہ آنکھوں دیکھی، کانوں سُنی بات ہے کہ سماج میں اب بھی ہریجنوں کو برابری اور عزت کا درجہ نہیں ملا ہے۔ قانون میں ترمیم کرکے میعاد بڑھائی جاچکی ہے۔ ہریجنوں کی حالت میں تھوڑا بہت ہی سُدھار ہوا ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی بے روزگاری کی وجہ سے اُونچی ذاتوں کے بے روزگار جوان تحفظات کے خلاف آواز اُٹھانے لگے ہیں۔

اسی طرح انگریزی کی سرکاری حیثیت ایک خاص مدت کے لئے ہی تھی، اس کے بعد ہندی کو قومی زبان بن جانا تھا۔ لیکن کیا کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ انگریزی کی بالادستی میں کوئی کمی ہوئی ہے؟ اُردو کی حق تلفی اور اس کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوئی، لیکن انگریزی کو پیچھے ہٹانے میں ہندی کو صرف کسی حد تک شمال کی ہندی ریاستوں میں کامیابی حاصل ہوئی ہے، ورنہ اب بھی ہر جگہ انگریزی کا بول بالا ہے۔

ان دو مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قانون میں کسی مقصد کے لئے میعاد مقرر کرنا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس لئے یہ سوچنا حقیقت پسندی سے دُور ہوگا کہ دس برس میں حالات اتنے بدل جائیں گے کہ کسی بچے کے نازک جسم پر کڑی محنت کا بوجھ نہ رہے گا۔ آزادی کے بعد چالیس برس میں ہم اس سلسلے میں کوئی خاص کارگزاری نہیں پیش کرسکے ہیں تو اب کون سی جادو کی چھڑی ہمیں دکھائی دے رہی ہے جو صرف دس برس میں کروڑوں مزدور بچوں کی کایا پلٹ دے گی؟ اس وقت سماجی اقتصادی حالات کا نام لے کر بچوں کے مزدوری کرنے کے لئے کم سے کم عمر گھٹائی جارہی ہے۔ کیا یہ شکست کا اعتراف نہیں ہے؟ کیا یہ اس بات کا اعلان نہیں ہے کہ ہم ایسے حالات پیدا نہیں کرسکے ہیں جو بچوں کی نشوونما اور ان کے بہتر مستقبل کی ضمانت بن سکیں، حالانکہ آئین مرتب کرتے وقت یہ مقصد اس میں شامل کیا گیا تھا کہ بچوں کے مزدوری کرنے پر پابندی لگائی جائے گی۔

قانون میں آئندہ کے لئے نیک ارادوں کو بڑی فیاضی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ گنجائش رکھی جارہی ہے کہ مزدور بچوں کے لئے کم سے کم مزدوری کی شرح مقرر کی جائے۔ ان سے مقررہ وقت سے زیادہ یعنی اوور ٹائم کام نہ لیا جائے، رات میں ان سے کام نہ کرایا جائے۔ ان کے کام کے لئے صاف ستھرا اور صحت مند ماحول پیدا کیا جائے۔ دوسرے مزدوروں کی طرح

مزدور بچوں کو بھی ہفتہ وار چھٹی دی جائے۔ فاضل اوقات میں ان کی پڑھائی لکھائی اور پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ ان کی صحت کی دیکھ بھال کا بندوبست کیا جائے۔ اس وقت بھی ایک محکمہ اور اس کا عملہ مزدوروں کے مفاد اور ان کی فلاح کے بندوبست کی نگرانی کرتا ہے۔ ان میں اضافے کے طور پر مزدور بچوں کی نگہداشت کے لئے چائلڈ لیبر انسپکٹر مقرر کئے جائیں گے۔ ان کی کفالت کے لئے ان صنعتوں پر ٹیکس لگایا جائے گا۔ جن میں بڑی تعداد میں بچے کام کرتے ہیں۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ حکومت بچّوں کے مزدوری کرنے پر قانونی پابندی لگانے کی بجائے، اسے قانونی تحفظ دینے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس مسئلے کا اور بھی زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ مزدور بچّوں کی تعداد کم ہونے کی جگہ بڑھی ہے۔ ٹرینوں میں، سڑکوں پر، ہوٹلوں میں اور چھوٹے کارخانوں میں ہر جگہ کم سن نونہال سخت مشقت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۵ میں پانچ سے چودہ برس کے سن کے درمیان کام کرنے والے بچّوں کی تعداد تقریبًا پونے دو کروڑ پائی گئی۔ پریشان کن بات یہ ہے کہ اس تعداد میں ہر برس تقریبًا چھ فی صد اضافہ ہو رہا ہے۔

ایسی کچی عمر کے بچے کیوں سخت مزدوری کے لئے مجبور ہوتے ہیں؟ حکومت کے پاس اس کا سیدھا جواب ہے: اقتصادی مجبوری یا غربت اور مفلسی کی وجہ سے۔ حکومت اس سوال کا جواب نہیں دیتی کہ آزادی کی چار دہائیوں کے بعد بھی ایسی مفلسی اور مجبوری کیوں ہے کہ ملک کے باشندے اپنے بچّوں کو دو وقت کی روٹی نہیں دے سکتے انہیں دھکے دے کر سڑک پر روزی کمانے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ ملک کی آبادی غربت کی لکیر کے نیچے زندگی بسر کرتی ہے۔ بڑھتی مہنگائی، بے روزگاری اور ان سے جڑے ہوئے مسئلوں نے بچّوں کو مزدوری کے لئے مجبور کیا ہے۔ مزدور بچّوں کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے سماج کے اقتصادی ڈھانچے کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ صنعتی ترقّی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنی چاہئے۔

۱۹۶۰ کے بعد حکومت نے مسلسل چھوٹی صنعتوں کی ترقی کو اہمیت دی ہے۔ بظاہر یہ معلوم دیتا ہے کہ بڑے تاجروں، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی اہمیت کم کر کے چھوٹے کارخانہ داروں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑا کارخانہ دار چھوٹے کارخانہ دار پر حاوی ہے۔ چھوٹا صنعت کار زندہ رہنے کے لئے بڑے صنعت کار کا سہارا لینے پر مجبور ہے، کیوں کہ وہی اس کا مال خریدتا ہے اور وہی بازار میں بیچتا ہے۔ مثال کے لئے جو چھوٹا صنعت کار، کار کے پرزے بناتا ہے اس کا سب سے بڑا خریدار کار بنانے والا بڑا صنعت کار ہی ہوگا۔

فرق یہ ہے کہ بڑے کارخانے پر حکومت کی نظر رہتی ہے اور وہ بڑی حد تک مزدوروں کی فلاح کے بارے میں سرکاری قانون اور ضابطوں کی پابندی کرنے کے لئے مجبور ہے۔ بڑا کارخانہ دار کسی مزدور کو آسانی سے نوکری سے الگ نہیں کر سکتا۔ لیکن چھوٹے کارخانے میں مزدوروں اور خاص طور پر مزدور بچّوں کا سب سے زیادہ استحصال ہوتا ہے۔ مزدوروں کی سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت غیر منظّم اقتصادی شعبہ یا بڑے کارخانوں کے باہر ہے۔ دیگر الفاظ میں دیہی شعبۂ زراعت اور چھوٹے کارخانوں میں مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کڑی محنت لی جاتی ہے۔ اور کم سے کم معاوضہ انہیں کام کا ملتا ہے۔

بڑے کارخانے میں صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ چھوٹے کارخانوں میں یا کھیتوں میں بارہ گھنٹے کام لینا عام بات ہے۔ کام عام طور پر ٹھیکے پر لیا جاتا ہے، اس لئے کاریگر یا مزدور زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ صرف ایک آدمی کے کام کرنے سے کنبے کا گزارہ نہیں ہوتا، اس لئے عورتیں اور بچے بھی کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کم پڑھے لکھے اور پچھڑے ہونے کی وجہ سے وہ کم مزدوری قبول کر لیتے ہیں۔ صنعتی اور شہری علاقے میں جگہ کا کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے صنعت کار ٹھیکے پر مزدوری کرنے والوں کو کام گھر لے جانے کی سہولت دیتا ہے۔ اس طرح بغیر کوئی معاوضہ دیئے مزدور کا گھر بھی کارخانے کا حصّہ بن جاتا ہے، جہاں عورتیں اور بچّے سب کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔

حکومت بھی اب یہ اعتراف کرنے لگی ہے کہ چھوٹی صنعتوں کی ترقّی کی وجہ سے مزدور عورتیں اور بچّوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ان چھوٹے کارخانوں میں نہ کام کرنے والوں کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے نہ انہیں مناسب مزدوری ملتی ہے۔

حکومت مزدور بچّوں کی پڑھائی لکھائی اور ان کی پیشہ ورانہ تربیت کی بات کرتی ہے۔ یہ بھی افیونی کی جنت کا خواب جیسی بات ہے۔ بارہ گھنٹے بدن توڑ محنت کرنے کے بعد وہ کون سا بچہ ہوگا جو پڑھائی لکھائی اور تربیت میں دماغ لگانے کے لائق ہوگا؟ وہ تو مزدوری سے کچھ پیسے بچا کر سنیما کا سستے سے سستا ٹکٹ لے کر کوئی واہیات تفریحی فلم دیکھنا ہی پسند کرے گا۔

سیدھی سچی بات یہ ہے کہ جب تک صحیح معنوں میں عوام کی غربت دُور نہیں ہوگی، بے روزگاری کی لعنت ختم نہیں ہوگی، بچّے محنت مزدوری کے لئے مجبور رہیں گے۔ ایک طرف حکومت کنبے کو محدود رکھنے کی بات کرتی ہے دوسری طرف حالات ایسے ہیں کہ بچّے غریب عوام کی اقتصادی ضرورت بن گئے ہیں۔ ایسی مثالیں کم نہیں ہیں کہ بڑے، بزرگ بچّوں کی پرورش نہیں کرتے، بلکہ محنت کش بچّے اپنے بے روزگار ماں باپ کا سہارا بن جاتے ہیں۔ بچّوں کو کلیاں اور پھول کہا جاتا ہے، لیکن ملک میں لاکھوں ایسی کلیاں ہیں جو کھلنے سے پہلے مُرجھا جاتی ہیں، لاکھوں پھول ایسے ہیں جن کو زندگی کی بہار کے دو دن بھی نصیب نہیں ہوتے۔ یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ یہ حالات کب بدلیں گے۔

دہلی میں راجہ محمود علی خاں کی کوٹھی پر جگر مرادآبادی کے اعزاز میں دعوت تھی اور سب مہمان ایک دائرے کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب دیر سے تشریف لائے اور پیچھے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ جگر صاحب یہ دیکھ رہے تھے۔ مسکراتے ہوئے کہا ارے بھائی! برابر آجاؤ۔ اس طرح کیوں بیٹھ گئے جیسے ہندوستان کے نقشہ میں سیلون۔

●

ایک مسخرے صاحب اپنے بال اتروانے ایک نائی کے پاس پہنچے۔ نائی نیا تھا۔ اس نے آدھا ہی سر مونڈنے میں کوئی تیس چالیس جگہ زخم لگائے مگر ہر زخم پر روئی چپکاتا رہا۔ جب مسخرے نے اپنی صورت آئینہ میں دیکھی تو فوراً بیٹھ اٹھا بس بھائی بس! اب ہمارے بال نہ اتارو۔

نائی بولا: کیوں صاحب کیا ہوا۔

مسخرے نے جواب دیا۔ ارے ہوا کیا۔ آدھے سر پر تم نے روئی بوئی ہے۔ اب آدھے سر پر چاول بوئیں گے کیا۔

(سید ریاض احمد، حیدرآباد

●

ایک بار ایک مشہور سیاست داں قیدیوں کی حالت کا جائزہ لینے جیل میں پہنچا اور جب دوپہر کے کھانے پر سارے قیدی اکٹھے ہوئے تو جیلر نے سیاست داں سے درخواست کی کہ وہ قیدیوں سے خطاب کرے کچھ سوچے سمجھے بغیر سیاست داں نے تقریر شروع کردی۔ "میرے ساتھی معزز شہریوں" مگر قیدیوں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ جیل میں آنے کے بعد معزز شہری نہیں رہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی اصلاح کرکے کہا: "میرے ساتھی مجرمو!" لیکن یہ الفاظ تو پچھلے الفاظ سے بھی زیادہ

برے تھے۔ چنانچہ اس نے جھلا کر کہا: "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تمہیں کیا کہہ کر مخاطب کروں لیکن مجھے اپنے آپ کو تمہارے درمیان پاکر بہت خوشی ہورہی ہے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنوں میں آگیا ہوں۔"

(صاحب ونٹولبنی نشاط، آمبور)

●

بحری جہاز میں ایک ملازم کھڑا آنے والے مسافروں کو بتا رہا تھا کہ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کس طرف ہے۔ ایک عورت بچہ اٹھائے آئی۔ ملازم نے اس سے پوچھا۔ فرسٹ یا سیکنڈ۔ یہ تو تیسرا ہے۔ عورت نے شرماتے ہوئے کہا۔

جمیل احمد خاں، آکولہ

●

شراب کی بوتل گری اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ شراب فرش پر بہنے لگی۔ تین چوہے بلوں سے نکلے اور شراب چاٹنے لگے تھوڑی دیر میں وہ نشے میں دھت ہوگئے۔

پہلا چوہا نشے میں للکارا "میں جارہا ہوں میں محمد علی کلے سے مقابلہ کروں گا۔"

دوسرا چوہا بولا "میں اسرائیل جاکر یہودیوں کی ایسی تیسی کردوں گا۔"

تیسرے چوہے نے مسکرا کر کہا: "میں اوپر جارہا ہوں۔۔۔ بلی سے شادی کرنے۔"

(سیدہ رحمانی، دہلی)

●

نوکر مالک سے: حضور! آپ ہمیشہ اپنے ساتھ یہ چار چشمے کیوں رکھتے ہیں؟

مالک: ایک چشمے سے میں بہت دور کی چیز دیکھتا ہوں۔ دوسرے چشمے سے میں تھوڑی دور کی چیز دیکھتا ہوں اور تیسرے سے نزدیک والی چیز۔

نوکر: (بڑی حیرانی کے ساتھ) تو پھر یہ چوتھا چشمہ؟

مالک: ابے اُلّو، چوتھے چشمے سے تو میں ان تینوں چشموں کو ڈھونڈتا ہوں۔

(سید ضمیر احمد، سرنگیہ)

●

ڈاکٹر نے بظاہر مردہ مریض کا ایک سرسری معائنہ کرنے کے بعد اعلان کردیا کہ مریض میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔ وہ مرچکا ہے۔

یہ سن کر مریض جو ابھی مرا نہیں تھا۔ کراہ کے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب میں مرا نہیں ابھی زندہ ہوں۔"

مریض کی بیوی جو قریب ہی کھڑی تھی ڈپٹ کر مریض سے بولی۔

"چپ پڑے رہو۔۔۔ تم کیا ڈاکٹر صاحب سے زیادہ قابل ہو۔"

(رفیضان رشید، رام پور)

●

ایک آدمی پولیس اسٹیشن پہنچا اور کہنے لگا صاحب مجھے آج کل دھمکی بھرے خطوط مل رہے ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے پوچھا کون لکھتا ہے دھمکی بھرے خطوط۔ یہ تو جرم ہے اس آدمی نے کہا۔ کم بخت انکم ٹیکس والے۔

اپنے لطیفے اس پتے پر بھیجیے برائے "تبسم" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شکی بیوی پکی بیوی

پرویز یداللہ مہدی

بیوی شوخ ہو، شائستہ ہو، شریر ہو، گمبھیر ہو، سگھڑ ہو، پھوہڑ ہو، گرہست ہو، فیشن پرست ہو، شریف ہو، صحت مند ہو، مریل ہو، فرماں بردار ہو، اڑیل ہو، غبی ہو، فہیم ہو، جدید ہو، قدیم ہو، غرض کیسی بھی ہو، بنیادی طور پر ہر بیوی تھوڑی بہت شکی ضرور ہوتی ہے۔ بلکہ بلکہ بعض تجربہ کار اور دنیادار خواتین کا خیال ہے کہ صرف شکی بیوی ہی پکی بیوی ہوتی ہے — گویا بیوی کے منصب کی پوری طرح مستحق صرف وہی عورت ہوتی ہے جو امورِ خانہ داری سے زیادہ شک کی چنگاری کو ہوا دینے میں طاق ہو — بہ الفاظِ دیگر نت نئے انداز، انوکھے اچھوتے زاویہ سے شوہر پر شک کرنے میں ایکسپرٹ ہو۔ البتہ شک کا تناسب اپنی اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے مختلف خواتین میں مختلف ہوتا ہے۔ بعض خواتین میں شک کا درجۂ حرارت ہمیشہ "نارمل" کے آس پاس ہی رہتا ہے تو کچھ خواتین کے شک کا پارہ

ذرا ذرا سی بات پر چھلانگ جاتا ہے — ایسی خواتین کی پہچان بڑی آسان ہے۔ یہ خود تو ذہنی اعتبار سے نارمل نظر آتی ہیں — لیکن ان کے شوہر حضرات اپنی حرکات و سکنات سے مکمل اپنا "ابنارمل" نظر آتے ہیں، بالخصوص اس وقت جب یہ گھر میں پائے جاتے ہوں۔ یا پھر اگر دفتر میں ہوں تو جیسے جیسے چھٹی کا وقت قریب ہوتا ہے لگتا ہے ان کی "ابنارملٹی" قابلِ دید ہو جاتی ہے ایسے عالم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھے تو یہ حضرات ریسیور کی جگہ "پیپر ویٹ" اٹھا کر کان سے لگا لیتے ہیں، بلکہ اس میں بولنے کی کوشش بھی کرتے ہیں — ایسے میں اگر کوئی انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لے تو جھینپ مٹانے کے لیے یہ عجیب و غریب دلیل پیش کرنے لگتے ہیں۔ "یہ فلمی شاعر بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ شاعری کے نام پر کچھ بھی اوٹ پٹانگ لکھ مارتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ گانا دیکھئے: "گیت گایا

پتھروں نے" بڑی دیر سے پیپر ویٹ کان سے لگائے یہی جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا واقعی پتھر بھی گیت گا سکتے ہیں۔ لیکن توبہ کیجئے صاحب ایسا تو دور، اس میں سے کسی شیر خوار کے رونے کی آواز بھی نہیں آ رہی ہے بھلا پتھر بھی کہیں گاتے ہیں۔"

یہ بات نہیں کہ صرف عورتیں ہی شکی ہوتی ہیں ـــــ بعض مرد بھی شکی ہوتے ہیں ـــــ لیکن عام طور سے مردوں کے شکوک پانی کے بلبلے کی طرح ہوتے ہیں جب کہ عورت ذات کے شکوک ربڑ کی طرح ہوتے ہیں اور کھنچتے ہی چلے جاتے ہیں۔ پھر اپنی انتہا کو پہنچ کر یا تو ربڑ ٹوٹ جاتی ہے یا پھر رشتہ ہر نام نزار کا سر اصل میں جس طرح مردوں کا ایک بڑا طبقہ عورت یعنی صنف نازک کو صنف ضعیف جان کر اس پر حکومت کرنے رعب جمانے، اس سے بیگار کرانے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے ـــــ اسی طرح خواتین کی اکثریت مردوں پر طرح طرح سے شک کرنے کو اپنے فرائض منصبی میں شمار کرتی ہے۔ یوں بھی پڑھی لکھی خواتین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ جو بیوی شکی نہیں ہوتی وہ یقیناً "جھکی" ہوتی ہے اور جھکی بیوی کے مقابلے میں شکی بیوی بدرجہا بہتر ہوتی ہے ـــــ اس کے علاوہ ترقی پسند خواتین جو ازدواجی زندگی کو تاش کی بازی کے برابر سمجھتی ہیں، شوہر کو جوکر اور شک کو ترپ کے پتے "کا نعم البدل تصور کرتی ہیں چنانچہ اسی ترپ کے پتے کی مدد سے یہ جوکر کو قدم قدم پر مات دیتی چلی جاتی ہیں۔

شک کا شوشہ بنت حوا کے دل میں کب جاگا، اس کے تعلق سے دنیا بھر کے نفسیاتی ماہرین بڑے بڑے محققین یہاں تک کہ مختلف شعبوں میں جھنڈے لہرانے والی نامور خواتین بھی خاموش ہیں ـــــ اس ضمن میں خود یہ حضرات و خواتین بھی شاید شک میں مبتلا ہیں ـــــ البتہ اس سلسلے میں ہم ایک لطیفہ پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ یہ لطیفہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے کہ اس زمانے کا ہے جب آدم و حوا کو باغ ارم سے اس کارجہاں کی طرف اذن سفر کا آفیشل آرڈر نہیں ملا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت آدم کو کھو یا کھویا، چپ چپ اور اداس دیکھ کر بی بی حوا کو پریشانی لاحق ہوئی ـــــ لاکھ پوچھا بہتیرا کریدا، مگر حضرت آدم نے جیسے کچھ نہ کہنے کی قسم کھا رکھی تھی ـــــ نتیجہ اس گمبھیر خاموشی اور چپ کا یہ ہوا کہ بی بی حوا کے دل میں شک کا پودا پھوٹا ـــــ ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھارنے لگے۔ حضرت آدم نے کہیں اور اپنی دلچسپیوں کا مرکز تو نہیں تلاش کر لیا؟ کہیں کوئی دوسری حوا تو نہیں پیدا ہو گئی ـــــ چنانچہ جیسے ہی حضرت آدم کی آنکھ لگی بی بی حوا نے اپنے شک کو دور کرنے کی غرض سے حضرت آدم کی دائیں اور بائیں دونوں پسلیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور جب پسلیوں کی تعداد میں کوئی کمی، ان کی ساخت میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تو اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

اس لطیفے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ عورت عموماً اپنے شک کی بنیاد کسی اور عورت کے وجود پر رکھتی ہے ـــــ گویا عورت کا شک جب شکل اختیار کرتا ہے تو کسی اور عورت ہی کی صورت میں ڈھلتا ہے۔ جو عرف عام میں 'دوسری عورت' کہلاتی ہے، جسے کوئی بھی شادی شدہ عورت کسی صورت برداشت نہیں کرتی، بلکہ اس کے تصور سے بھی نفرت کرتی ہے، کیوں کہ ہر عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے شوہر کی پہلی، دوسری، تیسری، بلکہ آخری بیوی بھی وہی ہو۔

عورت کا شک اکثر اوقات مفروضات کے ایسے قلعے تیار کرتا ہے جو بڑے بڑے مرد کی سرچ، بلکہ اس کے وجود تک کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ یہاں ہم ایک سچا واقعہ پیش کرتے ہیں: سچا اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ہم نہ صرف اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں بلکہ کچھ دیر کے لئے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں ـــــ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، دفتر سے حسب معمول اس توقع کے ساتھ گھر لوٹے تھے کہ بیگم صاحبہ ہاتھ میں گرم گرم چائے کا پیالہ اور ہونٹوں میں نرم نرم مسکراہٹ اچھالتے حسب دستور ہماری منتظر ہوں گی لیکن اس روز نقشہ ہی دوسرا تھا ـــــ نہ ہونٹوں پر مسکان کی رانی تھی نہ ہاتھوں میں چائے کی پیالی بلکہ تو کیلی اور نی سلائیاں، انگلیوں میں تھامے بظاہر سوئیٹر بن رہی تھیں، لیکن بباطن کسی ادھیڑ بن میں غلطاں تھیں ـــــ ہم نے جو یہ سنگین صورت حال دیکھی تو گڑ بڑا کر پوچھا: "خدا خیر کرے بیگم، آج تیور کچھ بدلے ہوئے لگتے ہیں۔ کیا بات ہے؟"

طنزیہ لہجہ میں بولیں: "اسی سے پوچھئے وہی اس کا جواب دے گی۔"

ہم نے سٹپٹا کر کہا: "کیا مطلب؟"

تنک کر بولیں: "مطلب بھی وہی سمجھائے گی۔"

بات کو خواہ مخواہ خطرناک رخ اختیار کرتے دیکھ کر ہم نے چاپلوسی کے لہجے میں کہا: "مذاق چھوڑو بیگم، اور جلدی سے تم وہی نیذ رویٹر والی مسکراہٹ کے ساتھ چائے لے آؤ۔"

جواب میں بیگم صاحبہ نے سلائیاں ایک طرف رکھ کر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: "اب نہ یہاں مسکراہٹ ہے، نہ چائے، جائیے اسی کے پاس ـــــ اب چائے بھی وہی پلائے گی اور مسکرائے گی بھی وہی!"

ہم نے جھنجھلا کر کہا: "پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ، کیا آج تم پر وہی کی وحی نازل ہوئی ہے؟ صاف صاف بتاؤ، یہ وہی آخر ہے کون؟"

غصے سے لال پیلی، بلکہ نیکی کلر ہوتے ہوئے بولیں: "جاننا چاہتے ہیں آپ یہ وہی ہے کون؟ تو سنئے، یہ وہی ہے جس کے نام کی مالا جپی جا رہی ہے، آج کل ہر محفل میں جس کا چرچا کرتے آپ کی زبان نہیں تھکتی۔ اور تو اور کل رات اپنے پڑوسی قاسم بھائی رشتی والا کے گھر میں بیٹھے اسی کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے آپ۔"

اس اطلاع پر ہمارا چونکنا لازمی تھا کیونکہ پچھلی رات ہم مسٹر رسی والا کے ہاں کافی دیر تک گپیں ہانکتے رہے تھے اور اسی بات کا فائدہ اٹھا کر ضرور کسی نے رسی کا سانپ بنا ڈالا تھا ـــــ تاہم ہم نے اصلیت جاننے کے لئے پوچھا: "یہ بات آخر تمہیں بتائی کس نے"

موہنہ بنا کر بولیں "کسی نے ہی بتائی، آپ کو اس سے کیا؟ آپ اپنی جگہ یہی سمجھے ہوئے تھے نا کہ چھپ چھپ کر کھیل کھیلتے رہیں گے اور مجھے اس کی خبر ہی نہیں ہوگی ـــــ کل رات جس وقت آپ قاسم بھائی کے پاس بیٹھے گل فشانی کر رہے تھے۔ اپنی کام والی ان کے ہاں برتن بھانڈے مانجھ رہی تھی۔ آپ اور قاسم بھائی بڑے زوروں سے پہلی دوسری پہلی دوسری کی تکرار کئے جا رہے تھے۔

ہم بات کی تہہ تک پہنچ چکے تھے، اس لئے طنزیہ لہجے میں فقرہ کسا۔" اور یہی باتیں آپ کی جاسوس نے اپنی طرف سے مرچ مسالہ لگا کر آپ کے سامنے اگل دیں۔"

بیگم نے اپنی جاسوس کی طرف داری کرتے ہوئے فرمایا: "اس غریب نے کوئی مرچ مسالہ نہیں لگایا، صرف اتنا کہا کہ قاسم بھائی رسی والا پہلی پر اڑے ہوئے تھے اور آپ دوسری کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔"

ہم نے محترمہ کا جملہ اچک کر قطع کلام کیا، اور دوسری کا لفظ سنتے ہی تمہارے کان کھڑے ہو گئے اور تم نے اپنی طرف سے دوسری سے مراد دوسری عورت سمجھ لیا؟"

روہانسے لہجے میں بولیں: "بالکل، اور پھر کیوں نہ سمجھوں؟ آپ بھی آخر مرد ہیں نا ـــــ!"

ہم نے ہنستے ہوئے کہا" اس سے پہلے کہ آپ کا بے بنیاد شک انگاروں کی تو شک بن جائے اصلی بات سنئے: اصل میں ہمارا موضوع گفتگو بقول آپ کے پہلی یا دوسری عورت نہیں تھا، بلکہ ہم ذی قعدہ کے مہینے کی تاریخوں پر بحث کر رہے تھے۔ مسٹر رسی والا اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ آج چاند کی پہلی تاریخ ہے جب کہ میں رویت ہلال کمیٹی اعلان کے مطابق دوسری تاریخ پر مصر تھا ـــــ حالانکہ پچھلی شام کا حجم اس قدر منحنی تھا کہ واقعی پہلی تاریخ کا معلوم ہوتا تھا، لیکن اب ہم لوگ چونکہ ہلال سے زیادہ رویت ہلال کمیٹی کے پابند ہو گئے ہیں، اس لئے مسٹر رسی والا کو بھی آخر میری بات تسلیم کرنا ہی پڑی۔

مرزا غالب نے برسوں کے گہرے مشاہدے کے بعد فرمایا تھا کہ" شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ـــــ لیکن جہاں تک شک کی 'شمع' کا تعلق ہے، جیسے ہی یہ کسی خاتون کے دل و دماغ میں جلتی ہے فوراً دھواں دینے لگتی ہے ـــــ یوں بھی عشق اور مشک بھی کسی کے چھپائے نہیں چھپتا ـــــ اس کے باوجود کچھ بیویاں اپنے شک کو چھپانے یا دبانے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔ ایسی خواتین یا تو قسمت پرست ہوتی ہیں، طبعاً جابر ہوتی ہیں، عقل سے فاتر ہوتی ہیں یا پھر بے حد شاطر ہوتی ہیں ـــــ اگلے وقتوں کی بیش تر بیبیوں کے بارے میں تو سنا ہے۔ شک کے یقین میں بدل جانے کے باوجود نہ تو واویلا مچاتی تھیں، نہ گھر میں کوئی طوفان کھڑا کرتی تھیں۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس زمانے کی بیویاں غالباً اس کہاوت کی دل سے قائل ہوا کرتی تھیں:

ہاتھی پھرتا گاؤں گاؤں
جس کا ہاتھی اس کا ناؤں

اس کہاوت میں ہاتھی سے مراد یقیناً شوہر نامدار ہے جو اگلے وقتوں میں واقعی ہاتھی کا ہم پلہ ہوا کرتے تھے ـــــ کم از کم اس معاملے میں کہ بیٹھی ہوئی حالت میں ان کا مول بھی سوا لاکھ ہوا کرتا تھا۔

ایک اور کہاوت ہے کہ "قرض محبت کی قینچی ہے۔" اسی طرح شک کو اگر محبت کو کاٹنے والا استرا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

یوں بھی بعض انتہا پسند بیویاں شک کو ہتھیار کے طور پر ہی استعمال کرتی ہیں، یاد رکھئے، شک جب 'حربہ' بن جاتا ہے تو ازدواجی زندگی اختلافات اور جوتم پیزار کا بھونڈا حربہ بن جاتی ہے، جس کے نتیجے میں ایسے بسائے اور آباد گھر کی جگہ محرومیوں اور ناکامیوں کا دلیہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے شک کی ڈور میں تھوڑی سی لچک لازمی ہے تاکہ اگر صبح کا بھولا شام کو واپس لوٹنا چاہے تو اسے اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح دیوار پھاند کر نہ داخل ہونا پڑے ـــــ یوں بھی خود ہمارے ملکی قانون میں شک کا فائدہ اکثر مجرموں کے ہی حق میں جاتا ہے، چھوٹی بڑی ساری عدالتیں شک کا فائدہ دیتے ہوئے بڑے بڑے قاتلوں کو بھی باعزت بری کر دیتی ہیں جب کہ شوہر حضرات حالانکہ قاتلوں اور مجرموں کے مقابلے میں یقیناً معصوم ہوتے ہیں اس کے باوجود ان ہی بے چاروں کی گردن شک کے پھندے کے لئے موزوں ترین سمجھی جاتی ہے ـــــ ہماری اس تقابلی دلیل سے یہ مراد ہرگز نہ لی جائے کہ ہم شوہر برادری کی تائید کر رہے ہیں ـــــ یقین کیجئے ہم خود تہہ دل سے اس بات کے قائل ہیں کہ شوہروں کی تخلیق محض اس لئے کی گئی ہے کہ بیویوں کی قوم ان پر اٹھتے بیٹھتے شک کرے ـــــ تاہم شادی شدہ خواتین سے ہماری دست بستہ گزارش ہے کہ شک کا چابک لہراتے ہوئے یہ ضرور دیکھ لیں کہ اس کی ضرب صرف شوہر پر پڑنے والی ہے یا پورے گھر سنسار پر، کیوں کہ اگر صرف اول الذکر ہستی زد میں آتی ہے تو معاملہ الجھ کر پھر سلجھ سکتا ہے، لیکن اگر خدانخواستہ آخر الذکر شے زد میں آ جائے تو پھر ازدواجی زندگی کی شہ مات یقینی ہے ـــــ لہٰذا آگے آپ کی مرضی ـــــ چاہے ہماری گزارش پلہ عذر فرمائیں یا پھر اسے رد کر دیں ـــــ بہر حال، ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں ـــــ

●●

بغیر عنوان کے

مشرف عالم ذوقی

گاؤں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا
ابا نے اپنے گاؤں کا جو نقشہ میرے ذہن میں اُبھرا تھا، یہ ویسا گاؤں لگ ہی نہیں رہا تھا — ابا نے کہا تھا: "اسٹیشن سے اترنے کے بعد تمہیں گاؤں کے لئے کوئی سواری نہیں ملے گی — دو میل کا سفر تمہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ باغات کا ایک لمبا سلسلہ جہاں سے شروع ہوگا، وہاں کھاٹ بچھائے بہت سے لوگ بیٹھے ملیں گے۔ تم جیسے ہی ادھر سے گزرو گے، ساری نگاہیں بس تمہاری جانب اُٹھ جائیں گی — پھر حیرت سے تمہارا جائزہ لیا جائے گا۔ بوڑھی نگاہیں تمہیں گاؤں کے ہی کسی عزیز یا رشتہ دار کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کریں گی — ہو سکتا ہے وہ لوگ تمہیں آواز دے کر تمہارے بارے میں پوچھیں بھی — پھر دیکھنا کتنی آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ بوڑھے رام دین کاکا کا وہ باغ ہے۔ وہ بوڑھا اب پچھتر سے کم کا نہیں ہوگا، مگر اس عمر میں بھی وہ تمہیں چارپائی پر بٹھا کر اندر سے گڑ اور پانی لانے ضرور جائے گا — یہ گاؤں کی پہلی رسم ہے — اجنبی اور برسوں بعد آتے ہوئے شناسا چہرے کی خاطرداری کی یہ رسم گاؤں میں ہمیشہ سے چلی آرہی ہے — گاؤں میں آج بھی اپنوں کے لئے جو محبت ہے اس کی مثال نہیں ملتی — آگے بڑھنے پر کھیت کھیلتے ہوئے بچے تمہیں دیکھ کر رک جائیں گے۔ پھر سب اپنے اپنے گھروں میں گھس کر اجنبی کے آنے کا قصہ بیان کریں گے — ہر گھر کی چوکھٹ پر مسکراہٹوں کا رنگ بکھر جائے گا — سب کے سب تمہارے پیچھے ہو لے اور تمہارے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا کریں گے — اور جب تم بتاؤ گے کہ تم ابرار چاچا کے گھر سے آرہے ہو تو یہ ٹولیاں بھی تمہارے ساتھ وہاں تک پہنچ جائیں گی۔

ابا کی آنکھیں اتنا کہتے کہتے گاؤں کے حسین جلووں میں گم ہو گئی تھیں — وہ گزرے ہوئے کل میں کھو گئے تھے — گاؤں میں میرا بچپن گزرا ہے۔ وہیں مسجد کے پاس تمہیں ایک اسکول ملے گا — ابتدائی تعلیم میں نے وہیں پائی تھی — پھر پڑھنے کے لئے شہر بھیج دیا گیا تھا — ابرار وہیں رہ گئے تھے — ابرار کو پڑھنے سے زیادہ کھیتی باڑی کا شوق تھا — ابا مریٹھا باندھے، کندھے پر پھاوڑا رکھے دن بھر کولہو کے بیل کی طرح کھیت پر کام کرتے تھے — ابرار کبھی مٹی کھود رہا ہوتا، کبھی کیاری بنا رہا ہوتا —

پھر دونوں مل کر کھانے کو ساتھ کھاتے — اماں جب تک زندہ رہیں، کھانا پہنچانے کھیت میں وہی جاتی — ستو کے بڑے بڑے لڈو ابا اور ابرار بڑے شوق سے کھاتے — پھر کنوئیں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے — اس وقت گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی ایسی کتنی ہی باتیں سننے میں آتیں کہ فاروق میاں یا اشرف میاں کو بھی یہ سب سکھاؤ — ہر وقت کتابوں میں گم رہتا ہے۔ کتابیں بھلا کیا دیں گی؟ کتنا دبلا ہو گیا ہے — ابرار کے چوڑے چکلے سینے کو دیکھ کر ابا فخر سے کہتے: "جانے دو۔ ایک بیٹا تو کام سیکھ رہا ہے نا — دوسرے کو پڑھانا ہے۔ ذرا شہر کی ہوا بھی کھانی چاہیئے۔"

اور اس کے بعد ابا شہر آگئے تھے — شہر آنے کے بعد وہ گاؤں سے بالکل ہی کٹ گئے تھے — ہاں، گاؤں کے قصے ضرور زندہ تھے۔ اکثر تنہائی میں قصوں کو یاد کر لیتے اور خوش ہو جاتے — ان کی اماں جلد ہی ساتھ چھوڑ گئیں
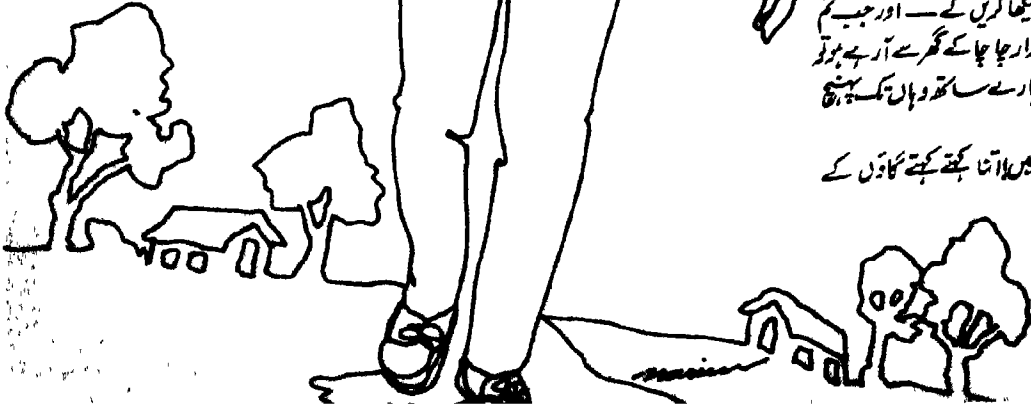
— بڑے ابا سے بھی اب کام نہیں ہوتا تھا۔ پھر بڑے ابا نے کھیت پر جانا بند کر دیا — شام کو چوپال لگتی تو وہیں لاٹھی ٹیکتے ہوئے پہنچ جاتے اور دیر رات گئے واپس لوٹ آتے — ابا کہتے تھے: "اب دل نہیں لگتا، تم تو شہر چلے گئے — ابرار سے امید باقی ہے — وہی گاؤں کی پرانی روایت کو قائم رکھے گا — پھر بڑے ابا بھی ساتھ چھوڑ گئے تو گاؤں سے برسوں پرانا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔

ابا اتنا کہہ کر تھک جاتے، پھر دم لے کر ایک لمبی سانس کھینچ کر ہم سے مخاطب ہوتے: "بیٹے، اب تم لوگ بڑے ہو رہے ہو، اپنا گاؤں ہے — پرکھوں کی یادگار — کبھی کبھی ہو آیا کرو" مگر ہمیں گاؤں کے نام سے ہی سخت الجھن ہوتی — دھول بھری سڑکیں، مٹی کی دیواریں — یہی تصور ذہن میں پیدا ہوتا — پھر وہاں ابرار چچا کے سوا پہچاننے والا بھی کون تھا — ابرار چچا سال میں ایک بار ضرور آتے۔ جتنا اناج پیدا ہوتا اس کا آدھا حصہ ایمان داری سے گھر پہنچا دیتے پھر دوسرے روز گاؤں کے لئے روانہ ہو جاتے — ابا لاکھ روکتے، مگر ابرار چچا گہری اداسی اوڑھ کر بس اتنا کہہ پاتے: "نہیں بھیا! ریشم وہاں اکیلی ہوگی۔ شہر کی ہوا راس نہیں آتی۔"

ابرار چچا جب بھی آتے، اپنے مخصوص لباس میں آتے۔ بڑا سا انگوچھا کندھے پر رکھے ہوئے کبھی لنگی، کبھی دھوتی میں — ہم چھیڑنے کی غرض سے پوچھتے ابرار چچا۔ آپ پینٹ شرٹ کیوں نہیں پہنتے؟ کتنے فٹ کی باڈی ہے آپ کی — بڑا اچھا لگے گا!"

ابرار چچا مسکرا کر رہ جاتے: "جب بچپن میں نہیں پہنا تو اب کیا پہنوں گا — اب تو یہی اچھا لگتا ہے۔ آرام دہ بھی اور خوبصورت بھی۔"

ہمارے ملنے ملانے والوں کو یقین نہیں آتا کہ ابرار چچا! کے اپنے بھائی ہیں۔ ابا، جو گھر میں بھی عمدہ سوٹ میں ڈٹے رہتے — ابرار چچا کو ڈائننگ ٹیبل پر کھانا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ لے ایک اور بھی فتوی دے دیتے۔ وہ چٹائی بچھا لیتے اور اسی پر کھانا نوش فرما لیتے — ان کا کہنا تھا: کرسی پر بیٹھ کر کھانے سے کھانا پچتا ہی نہیں ہے پتہ نہیں تم لوگ کیسے کھا لیتے ہو۔ ابرار چچا کے آنے سے ہمیں ایک کھلونا مل جاتا۔ ہم انہیں گھیر کر مچل جاتے — کبھی کبھی ابرار چچا کچھ سوچ کر اداس ہو جاتے۔ پھر گلوگیر آواز میں کہتے: "بھیا کی طرح تم لوگوں نے بھی گاؤں کو خیرباد کہہ دیا ہے یہ بھی بھول گئے کہ تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی ہے جو گاؤں میں رہتی ہے — بے چاری بن ماں کی بچی تم لوگوں کو تو بہت یاد کرتی ہے۔ ہر وقت تم ہی لوگوں کا ذکر اس کے ہونٹوں پر رہتا ہے۔ کہتی ہے کہ بھیا لوگ تو خوب کتابیں پڑھتے ہوں گے، میرے لئے بھی کتابیں لا دو نا..."

"چچا، یاد کرو بھائی — ہم تو کہتے کہتے تھک گئے —" ابا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہانک لگائی۔ ابرار چچا کچھ چپ ہو گئے۔ ریشم کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد چچی ساتھ چھوڑ گئی تھیں — ابا ملنے گئے تھے — تسلی کیا دیتے، وہ بھی گھنٹوں روتے رہے۔ آہستہ سے اتنا کہہ پاتے: "صبر کرو ابرار شاید ہم دونوں بھائیوں کے بچوں کے نصیب میں ماں نہیں لکھی، پھر وہ دونوں کو ساتھ لے کر آ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ پانچ چھ روز تک گھر میں رہے ابا نے دل بہلانے کی بہت کوشش کی مگر ابرار چچا ہمیشہ یہی کہتے رہے: "تم نہیں جانتے بھیا، اب گاؤں کتنا تاریک ہو گیا ہے۔ اب گاؤں میں دل نہیں لگتا" ریشم جلد ہی ہم لوگوں میں گھل مل گئیں۔ دن بھر مچلتی رہتی — نئی نئی رنگین تصویروں والی کتابیں کھولے بے مطلب سوال کئے رہتی۔ یہ سب بڑا اچھا لگتا — مگر مجھے پتہ تھا کہاں ہیں ابرار چچا ابا سے کہہ رہے تھے: "گھر میں ایک منشی رکھ لیا ہے۔ ریشم کی دیکھ بھال وہی کرتا ہے۔ میں تو کھیت پر نکل جاتا ہوں۔ تب تک منشی ہی اس کا دل بہلاتا ہے۔"

"اسے یہاں چھوڑ دو — بچوں میں کتنی گھل مل گئی ہے۔"

"پھر تو میں اکیلا ہو جاؤں گا بھیا!"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔" ابا نے سمجھایا مگر جب تم بھی ٹوٹ جاؤ گے تو پھر ریشم کا کیا ہوگا؟"

پھر وہ وداعی کا دن آ گیا۔ جب ابرار چچا ریشم کو لے کر جانے والے تھے تو اچانک ابا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ریشم بھی سب سے گلے مل کر خوب روئی — ریشم کے جانے کا انہیں بہت غم تھا — ہماری کوئی بہن بھی نہ تھی، اس لئے جانتے نہ تھے کہ بہن سے گھر میں کتنی رونق رہتی ہے۔ پانچ چھ دن کے اندر ہی ریشم نے گھر میں ایک نئی تازگی پیدا کر دی تھی — جاتے وقت ہم دونوں بھائیوں نے مل کر رنگین کتابوں کا ایک بنڈل ریشم کے ہاتھ میں دیا: "یہ وہی کتابیں ہیں جو تمہیں پسند تھیں انہیں خوب دل لگا کر پڑھنا اور ہمیں یاد کرتی رہنا۔"

ریشم کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر سب رخصت ہو گئے —

ابا اکثر چوپال کا ذکر کر کے کر بیٹھ جاتے گاؤں میں کیسے چوپال لگتی ہے۔ تھکے ہارے لوگ کیسے پرانے قصے کہانیوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں —

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجئے۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۷ء تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام، پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔

بغیر عنوان کے، ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جاڑے میں الاؤ کے گرد سنگتی کہانیاں کتنی اچھی لگتیں۔ گاؤں آج بھی سادگی اور معصومیت کی زندہ تمثیل ہے —— شہر میں آئے دن ہونے والے فسادات پر تبصرہ کرتے —— گاؤں میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ معصوم بھولے بھالے لوگ کھیت کھلیان سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتے —— کبھی کبھی اندر ایک خواہش پلتی —— گاؤں دیکھنا چاہتے —— کیسے میٹھی ہے چوپال —— کیسے ہوتے ہیں گاؤں کے لوگ، وہاں کے انوکھے رسم و رواج —— ننھی منی سی ریشم تو اب بہت شریر ہو گئی ہوگی —— اب ابرار چاچا جب بھی اناج پہنچانے آتے تو اکیلے آتے۔ پوچھنے پر کہتے: "ایک دن کے لئے ریشم کو کیا لاؤں —— گاؤں میں اکیلے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

ابا سمجھاتے: "لڑکی اب بڑی ہو گئی ہے اسے اکیلا نہ چھوڑا کرو —— پھر ابرار چاچا کے آنے جانے کا یہ سلسلہ بھی ٹوٹنے لگا۔ اناج پہنچانے ان کا منشی آتا تھا اسی سے خیریت مل جاتی تھی۔

اور پھر نہ جانے کتنے منظر بدلے اور ان میں ایک سرخ رنگ کا منظر بھی تھا —— ہم لرز کر رہ گئے —— ابّا کے تبصرے بے جان محسوس ہونے لگے۔ گاؤں میں فرقہ وارانہ فساد —— یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا —— مگر ابا! بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ اب بہت کچھ سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا —— ابا نہیں نہیں کرتے رہے۔ مگر آگ تو سلگ چکی تھی۔ گاؤں کے کنوئیں پر نہانے کی باری کو لے کر ایک ہندو اور ایک مسلمان لڑکے میں لڑائی ہو گئی —— پھر کچھ اور لوگ جٹ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ معمولی جھگڑا ایک بڑے فساد میں تبدیل ہو گیا۔

میرے بدن میں لرزہ سا طاری ہوا۔ یا الٰہی تیرا آنکھوں میں ننھی منی ریشم سا گئی، جو بڑی بڑی آنکھوں کو مٹکاتی ہوئی رنگین تصویروں والی کتاب دیکھ رہی تھی —— ابا رات کو دیر تک بڑبڑاتے رہے۔ وہ بار بار اٹھتے اور کمرے میں ٹہلنے لگتے —— ابا کی یہ کیفیت دیکھ کر چھوٹا بھائی ارشد رہ رہ کر مچل جاتا تھا۔

"سو جائیے ابا۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔"

ابا پھر پلنگ پر لیٹ گئے۔ آہستہ سے بولے: "تم نہیں جانتے، میرے سامنے بھرا پورا گاؤں ہے۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے چھلک پڑے، جنہیں وہ بڑی آسانی سے پی گئے۔ ابا نے وہ پرانا گاؤں دیکھا ہے، جہاں کی فضائیں محبت کے گل بوٹے کھلے تھے، جہاں چوپال کے قصّے سنتے سنتے آیا پڑے ہوتے تھے —— پورا گاؤں جب ان آنکھوں میں ہو تو کھنڈر میں زلزلہ کیوں نہ آئے گا۔

صبح وہ اٹھے تو آنکھیں لال تھیں —— تپائی کے ایک طرف ارشد سویا تھا۔ پہلی بار ابا کو دیکھا کہ صبح کو اٹھتے ہی سوٹ نہیں ڈاٹا بلکہ پرانے کپڑوں کی بھیڑ سے لنگی نکالی اور لنگی گنجی پہن کر برآمدے میں نکل آئے —— ہمیشہ کی طرح برش نہیں کیا، بلکہ داتون والے سے داتون خریدی اور دیر تک برآمدے میں داتون کرتے رہے —— آس پاس کی نگاہیں حیرت سے ابا کو گھور رہی تھیں —— سب کچھ تبدیلیوں کے درمیان واضح تھا —— ابا پھر 'کل' میں لوٹ جانا چاہتے تھے —— 'کل' ابا میں پھر زندہ ہو گیا تھا۔

سامنے کے مکان کے ایڈیشنل جج رام مورتی صاحب نے وہیں سے آواز لگائی: "بھائی اشرف صاحب خیریت تو ہے؟"

"ابا رکے —— داتون ہاتھوں میں لرز گئی۔

"نہیں جج صاحب بُری خبر ہے۔ گاؤں میں فساد ہو گیا ہے طبیعت سخت پریشان ہے۔"

"سب ٹھیک ہی ہوگا —— گھبراتے کیوں ہیں آپ؟"

مگر ابا گھبرائے رہے۔ سارے دن —— اور اور ہم گاؤں کے تمام گزرے ہوئے کل میں ابا کو داخل ہوتے ہوئے دیکھتے رہے —— پھر دوسرا دن آیا۔ حواس پر اچانک بجلی سی گر پڑی —— ننھی ریشم کا خط ہاتھوں میں مچل گیا —— ابا دھاڑیں مار کر رو پڑے۔ گاؤں کا فساد تو ختم گیا تھا، مگر ابرار مارے گئے تھے۔ منشی مارا گیا تھا —— کتنے گھر خاکستر ہو گئے —— ابرار کا گھر بھی گرا دیا گیا —— ننھی ریشم کے ٹوٹے ہوئے جملے اور شکستہ حروف بجلیاں برساتے رہے۔

"چچا ابا، میں کیا کروں؟ اب کہاں جاؤں"

ابا تو صلح کرانے گئے تھے۔ مگر واپس نہیں آتے۔ واپس آئی ان کی لاش —— منشی کاکا بھی اکیلے چھوڑ گئے —— ابا کو کیا بچاتے، خود بھی گولی کھا گئے —— میں نے ابا کو بہت جھنجھوڑا، مگر ابا کے جسم میں حرکت پیدا نہ ہوئی —— کچھ بولے نہیں، صرف سوتے رہے —— گاؤں کے لوگوں نے انہیں سفید کپڑا پہنا دیا اور قبرستان لے گئے —— مجھے نہیں جانے دیا —— گھر بھی گر گیا ہے چچا ابا! پتہ نہیں کون تھے۔ میں دبکی بیٹھی رہی —— آگے والا پورا حصہ گر گیا —— دروازے پر آگ لگا دی گئی —— میں ڈر کے مارے الماری کے پیچھے چھپی تماشا دیکھتی رہی —— صرف ایک کوٹھری بچ گئی ہے —— میں اسی کوٹھری میں ہوں۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔

نتیجہ بغیر عنوان کے

'بانو' مئی ۱۹۸۷ کے شمارے میں رفیعہ منظور الامین کا افسانہ "بغیر عنوان کے" شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہماری بہنوں، بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔

تمام عنوانات کو غور سے پڑھنے کے بعد شوکت علی (پچورہ، جلگاؤں) کے بھیجے ہوئے عنوان:

"سوکھی ڈال کا پھل" کو

پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

محمد اختر (دہلی) کے بھیجے ہوئے عنوان

"پرائی چھاؤں" کو

دوسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں تیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

رقیہ رحمٰن (حیدرآباد) کے بھیجے ہوئے عنوان:

"پیار کی مسیحائی" کو

تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

خود مصنفہ نے اپنی کہانی کا عنوان

"سلام میم صاحب"

رکھا تھا۔

سیدہ [illegible] اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے [illegible] میں نہیں گئی — مجھے معلوم ہے مرنے والے کی روح چالیس دن تک گھر میں آیا کرتی ہے۔ اور ابھی تو پانچ ہی دن .... میں روز شام کو لالٹین جلا کر چراغاں کرتی ہوں، اس لئے کہ اگر ابا آئے اور مجھے نہیں دیکھا تو پتہ نہیں کتنے پریشان ہوں ....

"تم نے خط پڑھا؟"

ابا کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارے ضبط بھی جواب دے گئے تھے — ابا نے اپنے ہونٹ بھینچے: "پتہ نہیں ریشم کیسے ہو گی — کس حالت میں ہو گی — اسی دن کے واسطے کہا تھا بیٹا گاؤں گھوم آؤ۔ ایک ہی بار سہی مگر چلے جاؤ۔"

پھر اچانک ابا کو چکر آ گیا۔ کب تک ضبط کرتے؟ وہ دھڑام سے فرش پر چت ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جب ان کو ہوش آیا تو پلکیں جھپکاتے ہوئے نیم غنودگی کی حالت میں دیواروں کو گھورتے رہے اور سسکتے روتے سو گیا تھا۔ میں صرف اتنا کہہ سکا: "ابا دیر تو ہو گئی ہے، مگر میں جا رہا ہوں — ریشم کو لانے کے لئے۔"

گاؤں کی ساری کہانیاں زندہ ہیں۔ مگر یہ گاؤں ابا کا گاؤں نہیں لگ رہا ہے۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے — شام کی ہلکی ہلکی پرچھائیوں نے گاؤں کو ڈھک لیا ہے — یہاں سے پیدل چلنا ہے — آگے کچھ دور جا کر ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ گھاٹ پر ایک بوڑھا پھٹا پرانا کمبل پہنے اکڑوں بیٹھا ہے — یہی رام دین کاکا ہیں — آہستہ سے بوڑھے کی نگاہیں اٹھیں، پھر جھک گئیں۔ ابا نے تو کہا تھا جیسے ہی اس جگہ سے گزرو گے، گھاٹ پہ پائے بہت سے لوگ بیٹھے ملیں گے — پھر رام دین کاکا اندر جا کر گڑ اور پانی لا کر بڑی محبت سے تمہیں پیش کریں گے — ساری رسم ٹوٹ گئی شاید — ابا کی بات ایک ایک کر کے غلط ثابت ہو رہی تھی — سب کچھ بدل گیا ہے حادثوں نے گاؤں کا پورا ڈھانچہ ہی بدل دیا ہے۔

مسجد کے پاس کچھ روشنی تھی، کچھ لوگ بھی کھڑے تھے — آنکھوں میں گہری ویرانی۔ کچھ تجسس بھری نگاہیں اٹھیں پھر جھک گئیں — ایک طرف پولیس بیٹھی تھی۔

ایک شخص نے حیرت سے پوچھا: "کس سے ملنے آئے ہو بھائی؟"

"ابرار چاچا کا یہاں مکان تھا"

"آ گئے ہے"، جواب میں ٹھنڈک گھل گئی تھی۔ "وہ جو ریت کا ٹیلا دکھائی دے رہا ہے — وہی ہے۔"

"تم کون ہو ابرار کے؟" دوسری نگاہ نے تعاقب کیا۔

"بھتیجا ہوں۔"

"پہلی بار گاؤں آئے ہو؟"

"ہاں۔"

"وقت نے محبت کی رسم توڑ ڈالی — آج تک ایسا نہیں ہوا۔"

ایک بوڑھے نے لاٹھی پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی۔ "تم اشرف کے لڑکے ہو؟ بیٹا وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا — ابرار جیسا محبت والا انسان صلح کرانے کے جرم میں مارا گیا — اور بات بھی کیا تھی بیٹا؟ ایک ہی وطن کے دو سپوت ایک ہندو دوسرا مسلمان، نہانے کی باری کو لے کر جھگڑ گئے — بس اتنی سی بات پر سب نے اپنے ہوش کھو دیے، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا فساد پھیلا کہ ... ..."

بوڑھے نے اشارے سے دکھایا: "جہاں جہاں ویرانی کے منظر دیکھ رہے ہو، سب اسی منحوس دن کی یادگار ہیں — ہم سب شرمندہ ہیں — اب کسی سے نظر ملانے کی تاب نہیں۔"

ابرار چاچا کی یادیں ایک بار پھر سلگ گئیں — ہونٹ کانپ گئے — گلا بھر آیا — ضبط کرتے ہوئے میں نے پوچھا: "بابا کبھی یہاں چوپال لگتی تھی؟"

"اب وہاں پولیس چوکی ہے — وہ دیکھو۔" بوڑھا ہنسا "اب تمام پرانے قصے اس زندہ اور تازہ زخم سے دھل گئے — اب صرف یہ دکھ بھری کہانی بچ گئی ہے۔ آنے والی نسلیں اس کہانی کو لے کر چوپال میں بیٹھا کریں گی۔"

بوڑھے نے لاٹھی اٹھائی اور لاٹھی ٹیکتا ہوا دور نکل گیا — میں چند لمحوں تک وہیں کھڑا آس پاس کا جائزہ لیتا رہا — گاؤں کتنا اداس اور ویران نظر آ رہا تھا — باغات کے لمبے سلسلے نے خوف کی چادر دور تک تان دی تھی۔

سامنے ہی ریت کا ٹیلا تھا — ابرار چاچا کا مکان — کچھ ملبہ، کچھ جلے ہوئے نقوش — میرے قدم تھم گئے — میں نے آہستہ آواز لگائی: "ریشم!"

مگر ایک لمبی چپ طاری رہی۔

گرے ہوئے مکان میں اندر جانے کا راستہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا — اور پھر رات کا وقت — کدھر سے جاؤں؟ ریشم کے خط کے مطابق ایک کوٹھری بچ گئی ہے۔

"ریشم!" آواز پھر لگاتا ہوں — صدا بازگشت کے بعد لوٹ آتی ہے۔

ایک راستہ ملا ہے اینٹوں کے درمیان سے ایک کواڑ جیسی چیز جھلکی ہے — اینٹوں پر پاؤں رکھتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوں اور اچانک نگاہ جم جاتی ہے۔

کنارے ایک لالٹین جل رہی ہے جس کی بتی ہلکے ہلکے کانپ رہی ہے — پلنگ پر ایک لڑکی سو رہی ہے۔

"ریشم!" آگے بڑھ کر میں اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتا ہوں — گرم گرم جلتی پیشانی — میرے اندر سے گھٹی ہوئی آواز نکلی: "تو اس ویران گھر میں اکیلے جی رہی ہے پگلی — تیرے تو دو دو بھائی ہیں — تجھے ڈر نہیں لگتا؟ میری بہن — میری پیاری بہن اٹھ جا —"

ریشم نے آنکھیں کھول دیں — غور سے مجھے دیکھا اور سسکی چھوڑتے ہوئے میرے گلے لگ گئی "بھیا — ڈر تو لگتا ہے بھیا۔"

"میں تمہیں لینے آیا ہوں ریشم۔"

"مگر میں کیسے جاؤں گی؟ چالیس دن تک ... ..."

میں نے اس کے مونہہ پر ہاتھ رکھ دیا "ابرار چاچا تجھے یہاں نہیں دیکھیں گے تو کیا وہ سمجھ نہیں لیں گے کہ تو ہمارے یہاں چلی گئی ہے۔"

ریشم کو جیسے تسلی مل گئی۔

اندھیرے کمرے میں لالٹین کی بتی ہلکے ہلکے کانپتی رہی —

●●

گرمیوں میں قدرتی چیزوں سے سنگھار

ایم، فاطمہ

گرمیوں کے موسم میں سارا جسم اور خاص طور پر چہرہ چکنا اور روغنی رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موسم گرما میں مختلف غدودوں سے رطوبت زیادہ نکلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں میں کئی بار صابن سے منہ دھونے پر بھی چہرے پر دوبارہ چکناہٹ آجاتی ہے اور چہرہ بُرا معلوم ہوتا ہے ——— لیکن کچھ ایسی قدرتی چیزیں ہیں جن کے استعمال سے اس چکناہٹ پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا ہے ——— یہی نہیں، ان چیزوں سے چہرے کی جلد کو شادابی اور قوت بھی ملتی ہے ———

آج کل سنگھار کے لئے مصنوعی اشیا کا استعمال بڑھتا جارہا ہے۔ یہ اشیا مختلف کیمیائی اجزا سے تیار کی جاتی ہیں، جو ہماری جلد پر خراب اثرات چھوڑتے ہیں ——— ان کی جگہ قدرتی اشیاء سے سنگھار کیا جائے تو ہم سارے مضر اثرات سے بچ سکتے ہیں ——— بہت پُرانے زمانے سے آرائش کے لئے ان اشیاء کا استعمال ہوتا آرہا ہے ——— مثلاً نیم کے پھولوں سے کاجل تیار کیا جاتا ہے ——— حنا، مختلف قدرتی خوشبوئیں پھولوں میں بسائے ہوئے مختلف اقسام کے تیل، عطریات حسن کو چار چاند لگانے کے لئے طرح طرح کے ابٹن اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سنگھار کے لئے کہیں نہ کہیں آج بھی استعمال کی جاتی ہیں یہ اشیاء جدید کیمیائی مصنوعی اجزا سے پاک ہیں اس لئے ان کے استعمال سے چہرے کی نرم اور نازک جلد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ——— مثال کے طور پر ٹماٹر کی ایک قاش آپ چہرے پر رگڑ کر دیکھیں، آپ کو فوراً چہرے پر تازگی کا احساس ہوگا اور پہلے کی طرح وہ چکناہٹ بھی فوری طور پر واپس نہیں آئے گی جو گرمیوں کے موسم میں بدنما معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک اور چیز پیپرمنٹ ہے، جس کی پتیاں پودینے کی پتیوں سے ملتی جلتی ہوتی ہیں ——— اس کا رس بھی چہرے کی جلد کو صاف کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس کا طریقہ استعمال نہایت آسان ہے ——— پیپرمنٹ کی کچھ پتیوں کو پانی میں ہلکا جوش دے کر رکھ لیجئے پانی کے ٹھنڈا ہونے پر پتیوں کو علیحدہ کر لیجئے اور اس پانی کو روئی سے چہرے پر لگائیں ——— اس کے استعمال سے آپ جلد پر شادابی محسوس کریں گی ——— اس کے ساتھ ہی جلد صاف اور ملائم بھی ہو جائے گی ——— ان پتیوں کو آپ برف کے چھوٹے ٹکڑوں کے ساتھ بھی آپ استعمال کرسکتے ہیں ——— اس کے لئے آپ پتیوں کی بہت تھوڑی سی مقدار کو ایک پیالی میں رکھ لیں۔ اور ان کے ساتھ برف کے تین چار چھوٹے ٹکڑے ڈال دیں۔ اب انہیں چمچے سے اچھی طرح ملالیں۔ پھر چھاننے کے بعد آپ اسے استعمال کرسکتی ہیں ——— اس کے استعمال سے آپ کا چہرہ نکھر آئے گا۔

گرمیوں میں اکثر جلد پر سرخ دھبے پیدا ہو جاتے ہیں اور چہرے کو بدنما بنا دیتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ کسی غذائی اثر کی وجہ سے تو یہ دھبے نمودار نہیں ہوتے ہیں ——— ممکن ہے آپ نے کوئی ایسی غذا استعمال کی ہو جو آپ کو راس نہ آئی ہو ——— اکثر رات کو کافی دیر سے مرغن غذاؤں اور مچھلی وغیرہ کے استعمال سے اس طرح کے دھبے پیدا ہوسکتے ہیں ——— لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ان دھبوں کو آپ آسانی سے ختم کرسکتی ہیں ——— ان کو ختم کرنے کے لئے چنبیلی کے پھول اور پتیاں بے حد کارگر ہیں ——— چنبیلی کے کچھ تازہ پھول پانی میں ڈال کر ہلکا جوش دے لیں اور اس محلول کو اسی نیم گرم حالت میں دھبوں پر لگائیں ——— چنبیلی کی پتیوں کے استعمال کی ترکیب بھی یہی ہے، یہ جلد کے ورم کو دور کرنے میں بھی مفید ہے۔

نارنگی اور سنگترے کا چھلکا بھی چہرے پر ملتے ہیں تازگی آتی ہے۔ موسم گرما میں کھیرا بھی جلد کے لئے نہایت مفید ہے۔ کھیرے کی ایک قاش چہرے پر ملیں۔ آپ کو خود بخود اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کے استعمال کے بعد جلد پر آپ تازگی محسوس کریں گی۔

گرمیوں میں تربوز عام طور پر ملتے ہیں ——— تربوز میں عام کی افزائش کی بڑی خوبیاں موجود ہیں ——— تربوز کے گودے میں کئی حیاتین (وٹامن) کے علاوہ فولاد بھی ہوتا ہے، جس سے چہرے کا رنگ نکھرتا ہے اور بال بھی چمکیلے ہوجاتے ہیں ——— تربوز کے استعمال کی ترکیب اس طرح ہے کہ تربوز کے پانی کا ایک بڑا چمچہ لیجئے۔ اس میں تین چار پتیاں پیپرمنٹ کی ڈال دیجئے۔ دونوں کو چمچے سے اچھی طرح ملا لیجئے ——— اگر یہ لیپ آپ کو گاڑھا معلوم ہوتا ہے تو اسے چھان لیجئے اور لیپ کو چہرے پر لگا کر اسے خشک ہونے دیجئے کچھ دیر بعد ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو ڈالئے اور خشک کر لیجئے۔

بیسن اور سنگترے کے چھلکے سے بھی آپ جلد کو خوب صورت اور نرم رکھ سکتی ہیں۔ سنگترے کے چھلکے پیس کر رکھ لیجئے۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ سنگترے کے چھلکے دھوپ میں خشک نہ کئے جائیں ——— صبح کے وقت آدھا چمچہ بیسن اور آدھا چمچہ سنگترے کے چھلکوں کا سفوف لیجئے۔ اور اس میں ٹھنڈا دودھ ملا لیجئے پھر اس کو چہرے پر لگا کر پانچ سے آٹھ منٹ تک کے لئے چھوڑ دیجئے، اس کے بعد چہرے کو دھو ڈالئے ——— اس کے استعمال سے کچھ ہی دن میں جلد ملائم ہو جائے گی اور دھبے جاتے رہیں گے ——— اس طرح گرمیوں کے موسم میں ہم مختلف قدرتی اشیا کی مدد سے چہرے کی جلد کو آسانی سے اور بہت کم خرچ میں نکھار سنوار سکتے ہیں، اسے صحت مند شاداب اور دلکش بنا سکتے ہیں۔ ●●

چال میں دل کشی پیدا کرنے کے گُر

افسر بانو

کسی بھی عورت یا مرد کی صحت اور شخصیت کے لیے اس کے چلنے کا انداز نہایت اہم ہے۔ مناسب ڈھنگ کے قدم اٹھانے سے شخصیت جاذبِ نظر بنتی ہے اور انسانی جسم کے اندرونی اعضا بھی بہتر طور پر کام انجام دیتے ہیں۔

بے مقصد بھاگم بھاگ کا انداز نہ صرف ایک خوب صورت لڑکی کی امیج کو بگاڑ دیتا ہے، بلکہ اس سے ایک جاذبِ نظر مرد کے جسم کی ساخت بھی بے ڈھب نظر آنے لگتی ہے۔ لوگ کس طرح قدم اٹھاتے ہیں، کس طرح بیٹھتے، اٹھتے یا ٹہلتے ہیں، اسی سے ان کی شخصیت کا مجموعی تاثر بنتا ہے۔

ڈانسر اور ماڈل کی صحت اور جسمانی ساخت ہمیشہ بہتر رہتی ہے، کیوں کہ یہ گھٹنوں ورزش کرتے ہیں اور چلتے وقت اوپر اٹھتے ہوئے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوپر اٹھتے ہوئے چلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے جسم کے بالائی حصے کو کمر سے اُچھالتے ہیں، کندھوں کو پیچھے کرتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ چلتے ہیں۔

چلتے وقت جسم کی موزوں ترین وضع یہ ہوتی ہے کہ پسلیوں کا ڈھانچا سیدھا ہو اور پیچھے یا آگے کی طرف جھکا ہوا نہ ہو۔ سر سے پاؤں تک جسم بالکل سیدھا ہو۔ دونوں پیروں کے درمیان چلتے ہوئے فاصلہ ایک یا دو انچ کے برابر ہو۔ ویسے پیروں کا درمیانی فاصلہ قد پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ اگر آپ کی ٹانگیں لمبی ہیں اور آپ چھوٹے قدم اٹھاتے ہیں یا آپ کی ٹانگیں چھوٹی ہیں اور آپ لمبے قدم اٹھاتے ہیں تو یہ بھدا ہی لگے گا۔ اس سے آپ کی چال بھی خراب ہو جائے گی۔ قدم ہمیشہ اپنی ٹانگوں کی لمبائی کے حساب سے اٹھائیں۔

خیال رہے کہ چال میں کوئی بناوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر آپ کی چال خراب ہے اور آپ اپنی چال کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلیں یا بھیگے پیروں سے اخبار کے ایک ٹکڑے پر چلیں۔

چال میں توازن کی بڑی اہمیت ہے۔

اپنے بدن کا پورا بوجھ پیروں کے وسطی حصے پر ڈالیے، ایڑی یا پنجوں پر نہیں ——— کولھوں اور رانوں کے

اندرونی پٹھوں کو سخت رکھتے ہوئے پیروں کو متوازی شکل میں رکھیے۔

چلتے ہوئے دھیان رکھیے کہ سر سیدھا رہے۔ ہر قدم پر ایڑی پہلے زمین پر پڑے اور انگوٹھوں کو چھوتے ہوئے اگلا قدم اٹھے۔

چلنے کے چند اصولوں کو ضرور اپنائیے۔

آگے جھکتے ہوئے پنجوں کے بل نہ چلیے۔

پنجوں کو اندر کی طرف سکیڑ کر کبوتروں کی طرح نہ چلیے۔

اس طرح چلیے کہ کولھوں پر سارا زور پڑے، گھٹنوں پر نہیں۔

فرش پر کسی ڈانسر کی طرح پھسلیے۔

اچھلتے ہوئے چلنا اچھا نہیں۔

کندھے صرف ایک حد تک لہراتے ہوئے چلیے۔ اس میں زیادہ کشش پیدا کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔

چلتے وقت گردن کو نہ اکڑائیے۔

بھاگم بھاگ کا انداز اور بڑے قدم بھونڈے لگتے ہیں۔ آہستہ، اطمینان اور وقار سے چلیے۔

آپ کے چلنے کے انداز پر کسی حد تک آپ کے جوتوں اور چپلوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ جب بھی چپل یا جوتا خریدیں، یہ خیال رکھیں کہ یہ بہت تنگ یا بہت ڈھیلے نہ ہوں۔ اونچی ایڑی کے جوتے سینڈل صرف کم قد والے ہی پہنیں تو بہتر ہے۔ اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر قدم نہایت سنبھال کر اٹھائیں۔ جوتا یا چپل کتنا ہی خوب صورت اور قیمتی کیوں نہ ہو، اگر وہ آرام دہ نہیں ہے تو اس کی قیمت اور خوب صورتی بے کار ہے۔ تکلیف دہ جوتوں سے قیمت بھی کافی متاثر ہوتی ہے۔ چلنے پھرنے کا خراب انداز مختلف بیماریوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ جیسے کمر کا درد، کندھوں کا درد وغیرہ، اس لیے ضروری ہے کہ آپ صرف قیمتی غذا یا قیمتی کپڑوں، جوتوں وغیرہ پر ہی توجہ نہ دیں، بلکہ اپنے چلنے کے انداز پر بھی زیادہ سے زیادہ دھیان دیں۔

●●

دُعا

الٰہی میں ہوں تیرے دَر پر سَوالی
مجھے بھی عطا کر دے عزمِ بلالیؓ
میں قطرہ ہوں مجھ کو سمندر بنادے
مرے ذہن میں آبِ کوثر بہا دے
مری روح آلودۂ درد و غم ہے
مری روح کی یہ اذیت مٹا دے
میں غفلت کے شانوں پہ سویا ہوا ہوں
وہ جذبہ عطا کر جو مجھ کو جگا دے
جو مسحور کر دے زمانے کو مولاؑ
مجھے وہ زباں دے، مجھے وہ نوا دے
ترستا ہوں کب سے، تڑپتا ہوں کب سے
الٰہی مجھے بھی مدینہ دکھا دے
جسے پی کے سرشار تھے تیرے بندے
مجھے معرفت کی وہ صہبا پلا دے
کٹھن راہ میں استقامت عطا کر
ہراِک گام پر مجھ کو صبر و رضا دے
دُعاؤں کو بابِ اجابت عطا کر
سرابوں میں اِک موجِ دریا بہا دے
مجھے جاہ و حشمت کی حاجت نہیں ہے
دلِ بے ریا دے، متاعِ وفا دے
مجھے دولتِ فکر و احساس دے کر
ہراِک شعر میرا دوامی بنا دے

نہ رہ جائے دستِ طلب میرا خالی
الٰہی میں ہوں تیرے دَر پر سوالی
ابوبکرؓ کا مجھ کو جذبہ عطا کر
بنا دے مری زندگی بھی مِثالی

مہدی پرتابگڑھی

حسینؑ

حسینؑ کیا ہے
یہ کون سمجھے
یہ کون جانے
حسینؑ فخرِ نبیؐ و حیدرؑ
حسینؑ فخرِ خدائے برتر
حسینؑ زہراؑ کے دل کا ارماں
حسینؑ واحد حسینؑ یکتا
حسینؑ ہے نفسِ مطمئنہ
حسینؑ راہِ نجات بھی ہے
حسینؑ یزداں صفات بھی ہے
حسینؑ کیا ہے
سوارِ دوشِ نبیؐ برحق
حسینؑ کیا ہے
وجودِ رب کی دلیلِ مطلق
بقولِ شاعر حسینؑ وہ ہے جو بے یقینوں کو
روشنیٔ یقین بخشے

ہوا ہے اکثر
کہ دہریوں نے بھی کربلا پر نگاہ ڈالی
تو اُن کو کہنا پڑا کہ بے شک
کوئی تو ہوگا خدا کہ جس کے لئے بھرا گھر
حسینؑ نے یوں لٹا دیا ہے
کوئی تو ہوگا خدا یقیناً

علی عرفان

واپسی

قدسیہ انصاری
(کراچی، پاکستان)

بانو آپا کا مزاج شوریدہ ندی کی طرح تھا، جو اپنے ساتھ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ مگر بانو آپا تو بے چاری کسی کو بھی نہیں گھسیٹ سکیں اور دودھ کے برتن کی طرح اُبل اُبل کر خالی دیگچی کی طرح ادھر ادھر لڑھکا دی گئیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ بانو آپا کا مزاج ہی ایسا ہے کہ نہ میکے والے ان سے خوش ہیں اور نہ سسرال والوں سے ان کی نبھی۔ اور پھر ان کا میاں بھی کوئی ایسا مسکین شکل اور منکسر المزاج نہیں تھا۔ ڈاکٹر تھا۔ مردوں کی چیر پھاڑ کے باوجود رنگینیٔ طبع ختم نہیں ہوئی تھی۔ اور غالباً اسی لئے ڈاکٹر صاحب سرکاری نوکری کے خلاف تھے اور بانو آپا بے چاری بے وقوف بن گئیں۔ سمجھنے لگیں کہ اپنا ذاتی کلینک ہوگا تو فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ دن رات ہُن برسے گا۔

بڑے دھوم دھام سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے کلینک کا افتتاح کیا اور کلینک میں مریض عورتوں کے علاج کے ساتھ حسینوں میں بھی اپنے لئے دوائے دردِ دل ڈھونڈنے لگے۔ بانو آپا نے سنا تو سر پیٹ لیا اور ساتھ میں ڈاکٹر کو بھی نوچ ڈالا۔ دن رات بانو آپا کا بس یہی مطالبہ تھا: "تمہارے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے طلاق دے دو۔" سب ہی نے سمجھایا کہ دو بچے ہیں کہاں جاؤ گی؟ کیسے رہو گی؟ تھوڑا بہت برداشت کرلو۔ اپنے طور پر بھی میاں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو۔ اللہ مالک ہے۔ بعض مردوں کی عادت ہوتی ہے ادھر ادھر منہ مارنے کی۔ تجربہ کار بیویوں نے تیر بہدف نسخے بھی بتائے۔ ساتھ میں یہ بھی جتادیا کہ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو۔ ایسے مردوں کی بیویوں کو تو سرحدی فوج کے چاق و چوبند دستے کی طرح ہر دم رائفل تانے رہنا چاہئے کہ ذرا سا کھٹکا ہوا اور بندوق کا نشانہ اس طرف گھوم گیا۔ شام کے وقت جب شوہر کلینک بند کر کے گھر واپس آئے تو صاف ستھرے کپڑے پہن کر میک اپ خوشبو سے لیس ہو کر اس کا استقبال کرو۔ اس کی پسند کا کھانا پکاؤ۔ مثل مشہور ہے کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ بچوں کو باپ سے اس قدر مانوس کردو کہ جہاں باپ نگاہ سے اوجھل ہوا، بچوں نے ڈھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیا۔ شوہر کے سامنے اپنی خدمت گزاری اور بچوں کی بے پناہ محبت کا ذکر دن میں بیسیوں بار کیا کرو۔ کب تک وہ اس لن ترانی کو کان دھر کر نہیں سنے گا۔ انجام کار وہ بیوی کا معتقد ہو کر رہے گا۔ مگر بانو آپا میں اتنا بوتا نہیں تھا کہ وہ یہ پتہ مار کام کرسکیں۔ انہوں نے گھر بار، شوہر، سب کو لات ماری اور آگئیں سیدھے اپنے باپ کے گھر جس کا دروازہ اولاد کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

بانو آپا کے گھر سے چلے جانے کے بعد ان کے میاں کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے مصالحت کی بہت کوشش کی۔ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم بھی کھائی مگر بانو آپا کا دل ان کی طرف سے کھٹا ہو چکا

تھا۔ اب تو وہ مر کر بھی دوسرا جنم لیتے تو بھی بانو آپا ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ ساتھ جانا تو بڑی بات ہے، انہیں ڈاکٹر صاحب کا سامنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب اگر بھولے بھٹکے بچوں کی خیر خبر لینے آ بھی جاتے تو بانو آپا فوراً پردے میں چلی جاتیں مگر پردے میں جانے سے کیا ہوتا ہے؟ دل پر کسی کا قابو تھوڑا ہی ہے ڈاکٹر کو دیکھے بغیر بھی جی نہیں مانتا تھا۔ اور بانو آپا بیٹھک کے برابر والے کمرے کی بتی بجھا کر کھڑکی کی اوٹ سے جھانکا کرتیں۔

غرض بانو آپا اپنا گھر چھوڑ کر باپ کے گھر براجمان ہو گئیں۔ گھر میں کوئی نہیں تھا بہن بھائی سب اپنے اپنے دھندے سے لگے تھے اور دور دراز جا کر بس گئے تھے۔ بوڑھے ماں باپ کو بیٹی کے گھر اجڑنے کا دکھ تو بہت ہوا مگر یہ اطمینان بھی تھا کہ گھر میں ان کی دیکھ بھال کرنے والا اور ان کی تنہائی کا ساتھی تو آ گیا ہے۔ اور بانو آپا نے گھر گرہستی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بانو آپا کا مزاج ویسا ہی تھا۔ بقول نانی کے، بانو آپا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کی ہیروئن حسن آرا تھیں۔ جس کے مزاج کے سب ہی شاکی تھے۔ بانو آپا نے سسرال میں تو شوہر، ساس سسر، دیور نند، سب کو جوتے کی نوک پر رکھا لیکن میکے میں بھی کوئی ان سے خوش نہیں تھا۔ نوکر چاکر بھی ان کا کام کرنے سے جان چراتے تھے مالی دھوبی آپس میں بات کرتے تو کہتے "ایسی بٹیا کو تو نرک میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔ ہر ظلم کے ساتھ تو جوتا لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔"

ویسے تو بانو آپا کا مزاج طوفانی تھا ہی، مگر سب سے زیادہ ان کا غصہ وسیم پر اترتا تھا۔ وسیم جوان کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ بیٹے کا بے پناہ لاڈ بھی کرتیں اور اکثر اوقات جا و بیجا بات پر وسیم کی اس بری طرح ٹھکائی بھی کر دیتیں کہ دیکھنے والے دل تھام کر رہ جاتے۔ ایک بیٹا اور اس سے چھوٹی بیٹی، یہی تو ان کی کل جمع پونجی تھی مگر وہ اس اثاثے کی بھی ٹھیک طریقے سے حفاظت نہیں کر رہی تھیں۔ بیٹی پر انہوں نے اس قدر سختی کر رکھی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دیوار پھلانگ کر گھر سے باہر نکل جائے گی۔ اسے دیکھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس نے کانونٹ اسکول سے پڑھا ہے۔ عام طور سے ایسے بچوں میں ضرورت سے زیادہ اعتماد ہوتا ہے مگر وہ لڑکی ایسی، کہ کسی سے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتی تھی۔ کسی اجنبی کو دیکھ کر ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ ہر وقت کتابوں سے دل بہلایا کرتی۔ کتابیں ہی اس کی دوست تھیں۔

پڑھے لکھے لوگوں کو بانو آپا سے ہمدردی تھی۔ ان کے خیال میں بانو آپا کو تو حالات نے اذیت پسند بنا دیا تھا۔ ویسے حقیقت یہ تھی کہ حالات جیسے بھی ہوں جو بانو آپا سے دبتا، اسے وہ بے پناہ دباتی تھیں اور جس شخص سے خود ان کی کور دبتی تھی، وہ اس کے آگے بچھ بچھ جاتی تھیں۔ وسیم کا مزاج بھی کچھ کچھ بانو آپا سے ملتا جلتا تھا۔ ویسے ہی مضبوط جسم اور اعصاب والا، اور ویسے ہی بے پناہ قوت ارادی کا مالک۔ وہ ماں کی سختی کو آسانی سے جھیل لیتا اور کرتا وہی جو اس کا دل چاہتا تھا۔ اس کی شکل و صورت باپ سے بہت ملتی تھی۔ وہی ناک نقشہ اور ویسا ہی قد و قامت۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ وسیم سب سے زیادہ بانو آپا کے ظلم کا نشانہ بنا رہتا۔

وسیم نے بچپن تو جوتے اور چپل کی چوٹ سہہ سہہ کر کاٹ دیا۔ لوگوں نے بانو آپا کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اب وہی بچوں کی ماں اور باپ ہیں مگر بانو آپا کے نزدیک ان کا وسیم سے رشتہ صرف جزا اور سزا کا تھا اور مشکل یہ تھی کہ کوئی ان کے معاملات میں دخل دے بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی بولتا بھی تو بانو آپا اسے نہ صرف دو ٹوک جواب دے دیتیں، بلکہ اس کے بخیے بھی ادھیڑ کر رکھ دیتیں۔ مگر جیسے جیسے وسیم جوان ہوتا گیا، بانو آپا اس سے مرعوب ہوتی گئیں۔ اس کی معمولی کارگزاریوں کو بھی سب سے بڑھا چڑھا کر بیان کرتیں۔ نوکروں کو تاکید کرتیں کہ وہ وسیم کو "چھوٹے صاحب" کہہ کر پکاریں۔ اس کے کھانے پینے کا خاص اہتمام کرتیں۔ وسیم اب جوان ہو چکا تھا۔ وہ طاقت کے نشے میں سرشار تھا کسی معمولی بات پر بھی ماں کو بری طرح ڈانٹ دیتا۔ اور بانو آپا اس کی کڑوی کسیلی باتیں خاموشی سے پی جاتیں اس کے مزاج کی افتاد بھی ماں ہی کی طرح تھی۔ بسا اوقات وہ بغیر کسی لحاظ کے ماں پر ہاتھ بھی اٹھا دیتا اور بانو آپا سوجے ہوئے ہونٹوں، پھولے ہوئے پپوٹوں کے ساتھ اس کی زیادتیوں کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کرتیں۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ بانو آپا کی لڑکی ماں بیٹے کے تعلقات میں بالکل الگ تھلگ رہتی وہ نہ کبھی اس معاملے میں ماں سے بات کرتی نہ کبھی بھیا کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔ وہ بس اپنے کام سے کام رکھتی، اسکول جانا اور واپس آ کر اپنے کمرے میں مقید ہو جانا اس کا معمول تھا۔

وسیم لاکھ کوشش کے باوجود بانو آپا کی خواہش کے مطابق پڑھ لکھ نہ سکا۔ بس کھینچ تان کر اس نے بی ایس سی کر لیا۔ مگر خالی بی ایس سی سے کیا ہوتا ہے۔ آج کل تو مقابلے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ٹیکنیکل تعلیم کا زمانہ ہے۔ لڑکے ڈاکٹر، انجینیر بن رہے ہیں اور کالج سے فارغ ہو کر نکلتے ہی دھندے سے لگ جاتے ہیں لیکن ادھر وسیم تھا کہ پڑھائی کے نام سے ہی بدک جاتا اور اس کی خواہشیں بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگ رہی تھیں۔ ہر وقت سیکڑوں کی فرمائشیں لئے کھڑا رہتا اور بانو آپا تھیں کہ ہر طرف سے جوڑ توڑ کر کے گھریلو اخراجات میں سے رقم بچا کر اس کی خواہشات کی تکمیل کرتیں۔ اس کا عالم یہ تھا کہ کبھی یار

دوستوں کی محفل میں جاکر بیٹھ جاتا تو رات کے بارہ بج جاتے اور اس کو فکر نہ ہوتی۔ رات کے گھُپ اندھیرے میں بانو آپا بیچاری حیران و پریشان گیٹ پر کھڑی اس کی راہ تکا کرتیں اور صبح کو اٹھ کر وہ حسبِ معمول لاابالی گھومتا کرتا۔ بانو آپا بہت صفائی کے ساتھ گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتیں پہلے تو جب وسیم کے بارے میں کوئی پوچھتا یا اس کے دوستوں کے متعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا تو بانو آپا صاف بات ٹال جاتیں مگر جب بات کھُل کر سامنے ہی آ جاتی تو وہ صفائی پیش کرنے میں زمین آسمان ایک کر دیتیں لیکن وہ ہزار صفائی دیں، بانو آپا کے بھائی بہن سب یہی کہتے سمجھتے تھے کہ وسیم بالکل ہی ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب بانو آپا کے لئے داستانِ پارینہ بن چکے تھے، لیکن اکثر ان کی وسیم سے راہ چلتے یا کسی دکان پر مڈبھیڑ ہوتی رہتی۔ ڈاکٹر صاحب کے خود دل میں چور تھا۔ وہ وسیم کی جب بھی موقع ملتا، بے انتہا خاطر کرتے اس کو اپنے ساتھ کسی بڑے ہوٹل میں لے جا کر کھانا کھلاتے، آئس کریم کھلاتے اور وسیم ایسا کہ سب کچھ کھا پی کر نکل آتا گھر آ کر وہ پاپا کا خوب مذاق اڑاتا، سب سے کہتا کہ پاپا نے اس کی بہت خاطر کی ہے اور بانو آپا نہ چاہتے ہوئے بھی وسیم سے پاپا کا ذکر سنتیں اور پھر بیزاری سے اٹھ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتیں۔ انہوں نے تو وسیم سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جس شخص نے ہم سب کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اس سے کسی قسم کا تعلق رکھنا بھی فضول ہے۔

مصیبت یہ تھی کہ وسیم کے پاپا اور بانو آپا ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور بانو آپا کو ان کی پل پل کی خبر ہو جاتی تھی۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ شہر کے ایک بارونق علاقے میں اپنی حرکتوں کی وجہ سے پٹ بھی چکے ہیں اور محلے کے سب سے زیادہ بدنام ڈاکٹر ہیں۔ لوگ تو انہیں رنگیلے ڈاکٹر کے نام سے پکارتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مختلف جگہ قسمت آزمائی کرنے کے بعد آخرکار اپنے ہی کلینک میں ملازم ایک موٹی سی نرس پر قانع ہو گئے۔ وہ نرس بھی ایسی تھی کہ اس کے ہاتھوں سے انجکشن لگوانے کو بھی دل نہ چاہے بےحد موٹی اور کالی بھجنگ۔ عمر میں بھی ڈاکٹر سے دو چار سال بڑی ہی ہوگی۔ لوگ حیرت کرتے کہ ڈاکٹر نے بانو آپا کو چھوڑ کر اس موٹی بھینس کو کیسے پسند کر لیا۔ بانو آپا تو ایک معزز خاندان کی پڑھی لکھی عورت تھیں اور کہاں یہ توپ ایسی عورت جس کا کچھ اتہ پتہ بھی نہیں معلوم مگر ڈاکٹر صاحب بھی کیا کرتے؟ بے چارے مجبوری میں پھنس گئے تھے۔ وہ تو منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر مختلف ہانڈیوں کو چکھ رہے تھے۔ مگر یہ نرس تو کمبل ہو گئی تھی۔ کمبل کو وہ چھوڑنا چاہتے تھے مگر کمبل انہیں نہیں چھوڑ رہا تھا ناچار نکاح کر کے گھر بسانا پڑا۔ اور جب شادی کے دس سال کے بعد اوپر تلے پانچ چھ بچے ہو گئے تو ڈاکٹر غریب گھوڑے سے خچر بن گئے۔

چہرے بشرے سے مسکینی ظاہر ہونے لگی وہ نرس بھی بڑی زبردست تھی۔ ڈاکٹر کی تو اس کے آگے گھگھی بندھی رہتی تھی۔ کلینک بند کرنے سے آدھے گھنٹے پہلے پہنچ جاتی تھی اور کمپاؤنڈر سے سارا حساب کتاب لیتی۔ فیس کی رقم، دواؤں کے پیسے وہ سب اپنے ہاتھ میں رکھتی۔ اور ڈاکٹر اپنی میز پر خاموش بیٹھے مٹر مٹر اس کی شکل دیکھا کرتے۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دہاڑتی: "کمپاؤنڈر بے ایمان ہے۔ وہ حساب میں ہیرا پھیری کرتا ہے۔"

نرس رکھنے کا چکر تو اس نے شادی کے بعد ہی ختم کر دیا تھا۔ "تم مرد ہو۔ کمپاؤنڈر رکھو۔ نرس تو لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ ہوتی ہے۔" ڈاکٹر کی تو یوں ہی سٹی گم رہتی تھی اس نادر شاہی نے اور بھی عقل خبط کر دی۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔ مگر بعض وقت ان کا دل ان بچوں کے لئے بھی کڑھتا جن کا حق مار کر انہوں نے بانو آپا کو زک دینے کی کوشش کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب بڑھاپے کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو گئے۔ پچاس سال کی عمر میں مختلف امراض کا مجموعہ بن گئے۔ بلڈ پریشر کی لکیر اوپر کی طرف جانے لگی قلب تو ان کا پہلے ہی وسیع تھا، اب ڈاکٹروں نے بھی اعلان کر دیا کہ دل بڑھا ہوا ہے احتیاط لازم ہے۔ مگر احتیاط کراتا بھی کون۔ ان کی بیوی ان کو طعنہ دیتی کہ جب بچے پیدا کئے ہیں تو ان کی تعلیم و تربیت کا سامان بھی کرو۔ وہ بیوی نہیں تھی، جو مونس اور غم خوار ہوتی ہے وہ بدروح تھی جو ان سے چپٹ گئی تھی اور جونک کی طرح ان کا خون پی رہی تھی۔

بانو آپا کے کانوں میں یہ خبریں پہنچیں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ پتھر میں پہلے دراڑ پڑ رہی تھی اب تو کچی مٹی کی طرح ڈھیر ہو گئیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو پھر کیسے بچے، کس کے بچے۔ اس کم بخت کا کوئی میکہ بھی نہیں ہے کہ وہی لوگ اسے آ کر سمیٹ لیں۔ لوگ آ کر وہ نقشہ کھینچتے کہ بانو آپا کا دل ہولنے لگتا کہ اب آئی خبرِ بد۔ مگر جسے خدا رکھے، اسے کون چکھے۔ ڈاکٹر صاحب جملہ امراض کو گلے سے لگائے جیتے رہے اور ختم ہو گئی چھ بچوں کی ماں، جو بظاہر دیکھنے میں اچھی بھلی تھی۔ ایک رات کو جو سوئی، تو پھر قیامت میں ہی اٹھنے کا وعدہ کر کے منہ پھیر لیا۔ رات کے کسی حصے میں دل کی حرکت بند ہو گئی۔ ڈاکٹر پر اپنی ذات کے علاوہ چھ بچوں کا بوجھ آ پڑا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے یا بچوں کو دیکھتے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ انہوں نے پہلی بیوی اور اس کے بچوں کو گھر سے بے گھر کیا، اب خود ان کے بچے تتر بتر ہو رہے تھے۔ اب تو وسیم بھی انہیں کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ پھر کسی سے انہیں معلوم ہوا کہ وسیم طہران چلا گیا ہے اور وہاں کسی کام سے لگ گیا ہے۔

غیروں نے بانو آپا کو ان کی سوت کی موت کی اطلاع اس طرح دی جیسے شہر میں اس سے بڑا واقعہ اب تک رونما نہ ہوا ہو۔ بانو آپا بیٹھی تو

اپنی سوت سے بہت ہمدردی رکھتی تھیں، مگر اس کی موت کی خبر سن کر ان کا دل دہل گیا۔ زندگی اور موت کا کچھ بھروسا نہیں۔ بھلا یوں بھی کوئی منٹوں میں دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ بے چارے چھ بچوں کا باپ پہلے ہی ریض تھا اب تو اس کی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے۔

بانو آپا بھی تن تنہا زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ ان کی لڑکی رخصت ہو کر اپنے گھر بار کی ہو گئی تھی۔ وسیم اگرچہ ان پر زیادتیاں کرتا تھا مگر پھر بھی ان کی اولاد تھا۔ ماں کے بڑھاپے کا سہارا۔ سو وہ اتنی دور جا کر بیٹھ گیا۔ اب تو گھر میں کوئی پانی کا ایک گلاس بھی دینے والا نہیں تھا۔ بیماری آتی بھی تو خود ہی لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتیں۔ وسیم کو بھی اب ماں کی قدر معلوم ہو رہی تھی۔ ماں کو برابر روپیہ بھیجا کرتا۔ جانے والوں کے ہاتھ تحفے تحائف بھی آتے۔ خط بھی لکھا کرتا تھا اور خط کا لہجہ بھی اتنا سخت نہیں ہوتا تھا لیکن بانو آپا کے لیے تنہائی اتنی جان لیوا تھی کہ لگتا تھا کہ دن رات ربڑ کی طرح کھنچ کر دگنے ہو گئے ہیں۔ وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹتا تھا۔

بانو آپا نے بہت کوشش کی، کہ کانوں کی طرح اپنے دل کو بھی بند کر لیں لیکن لوگ بھی کہاں باز آتے ہیں۔ وہ آتے جاتے ان کو ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر کی خبر دیا کرتے۔ اب تو خود بانو آپا کا دل بھی چاہتا کہ کوئی ان سے ڈاکٹر کی بات کرے۔ اگر آنے والا اس موضوع کو نہ چھیڑتا تو بانو آپا گھما پھرا کر وسیم کے باپ کی زیادتیوں کو دہرانا شروع کر دیتیں۔

ایک دن صبح کے وقت جب ڈاکٹر صاحب ناشتہ کر رہے تھے تو گیٹ پر کھٹکا ہوا۔ وہ سمجھے کہ کوئی مریض ہے ملازم سے کہلوا دیا کہ شام کے وقت کلینک میں آئے یا پھر ان کا وہیں بیٹھ کر انتظار کرے۔ ابھی وہ ملازم سے بات پوری بھی نہیں کر پائے تھے کہ کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور جھپٹ کر بانو آپا نے ڈاکٹر کی گود سے سب سے چھوٹے بچے کو اٹھا لیا۔ ڈاکٹر نے گھبراہٹ میں انڈے کی زردی بچے کے منہ میں دینے کی بجائے اس کی ناک میں ٹھونس دی تھی اور وہ بری طرح رو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بانو آپا نے اسے بہلایا، چپ کرایا۔

ڈاکٹر صاحب ہکا بکا بانو آپا کا منہ تک رہے تھے۔ ان کے بڑے بچے نے ان سے پوچھا "پاپا، یہ کون ہیں؟"

ڈاکٹر سنبھل کر بولے "بیٹا، یہ میری بہت پرانی مریضہ ہیں، اور رشتہ دار بھی" اور پھر شرارت سے بانو آپا کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

بانو آپا کے چہرے پر سہاگ رات کا پرتو جھلملانے لگا۔ وہ جھینپ کر بولیں "چلو ہٹو، رشتہ داری بھلا ایسے نبھائی جاتی ہے؟"

●

ناخن جلد بڑھانے کی ترکیب

اگر ناخن جلد بڑھانے ہوں تو لہسن کو باریک پیس کر اس کا پانی رات کو سوتے وقت ناخنوں پر لگائیں۔ یہ عمل ایک ہفتے تک جاری رکھیں۔ ناخن تیزی سے بڑھیں گے اور مضبوط رہیں گے۔

لپ اسٹک زیادہ دیر تک قائم رکھنے کی ترکیب

لپ اسٹک زیادہ دیر قائم رکھنے کے لئے ایک دفعہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانے کے بعد ٹیشو پیپر ہونٹوں کے درمیان رکھ دیا جائے اس کے بعد ایک مرتبہ اور لپ اسٹک لگائیے اب آپ کی لپ اسٹک دیر تک قائم رہے گی۔

گردن کا میک اپ کرنا نہ بھولیں

آپ جب اپنے چہرے پر میک اپ کریں تو اپنی گردن کو نہ بھولئے کریم لگاتے وقت گردن پر بھی نیچے سے اوپر کی طرف کریم لگائیے اسی طرح پوڈر لگاتے وقت گردن پر بھی پوڈر لگائیے۔

رنگ سرخ و سفید کرنے کی ترکیب

رات کو سونے سے پہلے لیموں، زعفران اور روغنِ زیتون ملا کر چہرے پر ملنے سے رنگ سرخ و سفید ہو جاتا ہے۔

رنگت نکھارنے کی ترکیب

رات کو اصلی شہد اور بالائی دونوں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ اس سے دانے وغیرہ کے جو داغ چہرے پر ہوں گے وہ بھی صاف ہو جائیں گے اور رنگت بھی نکھر آئے گی۔

چہرے کے دانے ٹھیک کرنے کی ترکیب

کالی مرچ کو بھگو کر گھڑے پر رگڑیں اور گھڑے پر رگڑی ہوئی مرچ کے لعاب کو دانوں پر لگائیں۔ رات کو بھی اسے لگا کر سو جائیں۔ دانے جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔

○○

ان سے ملئے

جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ لداخ ریاست جموں و کشمیر کا ایک حصّہ ہے، بُدھ مذہب اور ثقافت کا اہم مرکز ہے۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ دنیا کے تین بڑے مذاہب اس ریاست میں اپنے جُداگانہ تشخص کے ساتھ انتہائی رواداری، مفاہمت اور جذباتی یگانگت کے ساتھ رہتے ہیں اور پروان چڑھتے آئے ہیں۔ جموں ہندو اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ ڈوگرا فرقہ کی روایات اس کا فنی، ثقافتی ورثہ اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ویشنو دیوی، امرناتھ عقیدت مندوں کے لئے اہم تیرتھ استھان ہیں۔ وادیٔ کشمیر اسلامی عقائد، تشخص اور اخوت کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ لداخ، بُدھ مذہب کے ماننے والوں کی رنگا رنگ زندگی کا حسین نمونہ ہے۔

لداخ کی ایک جھلک ہم نے مدیرہ بانو سعدیہ دہلوی کی آنکھوں سے دیکھی تھی، جب انہوں نے لداخ کا سفر کیا تھا اور اپنے سفرنامے کے ذریعے ہمیں بھی لداخ کی سیر کرائی تھی۔ ارمان تو خود اپنی آنکھوں سے لداخ جاکر وہاں کے حسین مناظر اور وہاں کے مہمان نواز سیدھے سادے، صاف دل عوام سے ملنے کا تھا، لیکن زندگی میں کبھی کبھار ایسے معجزے بھی ہوتے ہیں جب کنواں خود پیاسے کے پاس آجاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات اُس وقت ہوئی جب لداخ کی پہلی خاتون گریجوایٹ سٹرنگ انگمو شانو (TSERING ANGMO SHANOO) اپنے بچے کے داخلے کے سلسلے میں دہلی آئیں اور بانو کے دفتر میں بھی تشریف لائیں۔ سٹرنگ انگمو شانو لداخ کی زندگی، وہاں کے مسائل اور ثقافتی روایات سے پوری طرح جڑی ہوئی ہیں۔ لیکن انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصّوں اور ہندوستان کے باہر بھی بعض ملکوں کا سفر کیا ہے۔ اس لیے ان کے تجربے اور مشاہدے میں وسعت اور گہرائی ہے۔ وہ بُدھ مذہب کی ماننے والی ہیں، لیکن تمام مذاہب کا احترام کرتی ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۳۷ برس ہے۔

انگمو لداخ کے صدر مقام لیہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ چھوٹا سا شہر سمندر کی سطح سے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بڑا خوب صورت شہر ہے۔ پاکستان اور چین سے کشیدگی کی وجہ سے اب یہ فوجی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ایک بہت بڑی چھاؤنی بن گیا ہے۔ ہر طرف وردی پوش فوجی نظر آتے ہیں۔ آج کل لیہ کی معیشت کا انحصار بڑی حد تک ان فوجی سرگرمیوں پر ہی ہے۔

سٹرنگ انگمو شانو لداخ کی ایک ممتاز سماجی کارکن ہیں۔ وہ ریاست جموں و کشمیر کی یوتھ کانگریس (آئی) کی نائب صدر ہیں اور لیہ ریڈیو میں پروڈیوسر ہیں۔ لیہ میں رہنے والا کوئی بھی اجنبی ہو، وہ ہر ایک کی مدد کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتی ہیں۔ ان کی اس خوبی نے ان کے مداحوں کا بہت بڑا حلقہ پیدا کیا ہے۔

اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے انگمو نے بتایا ــــ "میرے والد تنڈوپ صنم زمیں دار تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں اکثر وہ گھر سے باہر دَورے پر رہتے تھے۔ بڑا بھائی بھی اکثر باہر رہتا تھا۔ اس طرح زمیں داری کا انتظام بڑی حد تک میرے کندھوں پر آگیا۔ میں اس معاملے میں بڑی خوش نصیب تھی کہ تعلیم اور عملی زندگی میں والدین نے میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ ہماری اقتصادی زندگی میں گھوڑے، گائے اور بکریوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی تعلق سے مجھے شہ سواری کا شوق ہوا، جو آج تک برقرار ہے۔

س: آپ کے خاندان میں آپ کے والدین اور

آپ کے علاوہ اور کون کون ہیں؟

ج: مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

س: کچھ اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیے؟

ج: میری ابتدائی تعلیم لیہ میں ہوئی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے سری نگر آگئی۔ میں نے وہاں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ میں لداخ کی پہلی خاتون گریجوایٹ تھی جس نے سیاسیات کے ایم۔ اے کے کورس میں داخلہ لیا تھا۔ بی۔ اے کے لئے میں نے جو مضامین منتخب کئے تھے، اُن میں اُردو بھی ایک تھی۔

س: آپ نے ایم اے کب کیا؟

ج: یہ میری بدقسمتی تھی کہ ایم اے مکمل نہ کر سکی۔

س: کیوں؟

ج: اس سوال کا جواب دینے کے لئے بعض زخموں کو کُریدنا پڑے گا۔ میں ایم۔ اے کر رہی تھی، اسی زمانے میں مجھے اپنی برادری کے باہر ایک دوسری ریاست سے تعلق رکھنے والے فوجی افسر سے محبت ہوگئی۔ ہم نے کورٹ میں شادی کرلی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

س: محبت کی شادی کی آپ کے والدین اور عزیزوں نے مخالفت نہیں کی؟

ج: اُنہیں یہ رشتہ پسند نہیں تھا لیکن میری مرضی دیکھ کر اُنہوں نے مخالفت نہیں کی، لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صحیح تھے۔ اور میں غلطی پر تھی۔

س: ایسا کیوں سوچتی ہیں؟

ج: چند برس گزرنے کے بعد ایک عورت مجھ سے ملنے آئی اور اُس نے مجھے بتایا کہ وہ میرے شوہر کے بچّے کی ماں بننے والی ہے۔ میرے شوہر نے اُس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے یا وہ خودکشی کرے یا میرے شوہر کے خلاف دستخط دے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ وہ ایسا کچھ نہ کرے۔ میں خود اس کے راستے سے ہٹ جاؤں گی

س: آپ نے اتنا بڑا فیصلہ چند لمحوں میں کیسے کرلیا؟

ج: یہ میں نہیں جانتی کہ میں نے بڑا فیصلہ کیا یا چھوٹا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں نے وہی کیا جو میرے ضمیر نے مجھ سے کہا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ سوال صرف اس عورت اور اس کی کوکھ میں پلنے والے بچّے کا نہیں ہے، سوال اس رشتے کا بھی ہے جو شوہر اور بیوی کے درمیان مکمل اعتماد اور مفاہمت کا ہوتا ہے۔ جب میرے شوہر نے مجھے اپنے اس تعلق کے بارے میں لاعلم رکھا تو ہمارے رشتے کی بنیاد ختم ہوگئی وہ ہمیشہ کے لئے کھوکھلا ہوگیا۔ اس لئے ایسے مہمل بندھن میں بندھے رہنے کا کیا فائدہ تھا۔

س: آپ نے اپنے شوہر سے اس بارے میں پوچھا تھا؟

ج: پوچھا تھا۔ اُس نے انکار نہیں کیا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سے تعلق رکھنا فوجی اور سرکاری ضوابط کے خلاف ہے۔ اگر وہ عورت شکایت کر دیتی تو اس کا کورٹ مارشل ہوتا اور ملازمت سے اس کا برطرف کیا جانا یقینی تھا۔

س: پھر آپ نے کیا کیا؟

ج: میں نے صرف ایک شرط رکھی کہ میرے بچّے میرے ساتھ رہیں گے۔ وہ اس شرط کو مان گیا۔ میں نے کوئی مالی مطالبہ نہیں پیش کیا۔ کوئی اور شرط نہیں رکھی۔ میں نے اُسے آزاد کر دیا۔

س: آپ نے بہت بڑی قربانی دی ہے؟

ج: میں یہ نہیں سمجھتی کہ میں نے کوئی قربانی دی ہے۔ میں نے وہی کیا، جسے ٹھیک سمجھا جسے اپنا فرض تصوّر کیا۔ میرے لئے وہ ایک سُہانا خواب تھا، جو ڈراؤنا بن گیا۔ میں نے جاگنا اور سنبھلنا ہی بہتر سمجھا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں، ملال نہیں۔

س: آپ کے بچّے اس وقت کہاں ہیں؟

ج: سچ پُوچھئے تو اس وقت میری زندگی میں دو بڑی دلچسپیاں ہیں۔ اپنے بچّوں کو لائق بنانا اور اپنے علاقے کے عوام کے دُکھ درد کو دُور کرنا۔ میرا تعلق پہاڑی علاقے سے ہے، اس لئے میرے دو بچّے پہاڑی علاقوں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک نینی تال میں ہے دوسرا شملہ میں۔ تیسرے کو دہلی میں داخل کرانا چاہتی ہوں۔

س: آپ بچّوں کو دُور کیوں رکھنا چاہتی ہیں؟

ج: سوال دُوری یا نزدیکی کا نہیں ہے۔ سوال ان کے بہتر مستقبل کا ہے۔ میں سماجی کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔ میری پوری توجہ انہیں نہیں ملے گی۔ اس کے علاوہ میں ان کے سارے سوالات کا جواب نہیں دے سکتی۔ گھر کے ماحول میں دس طرح کی باتیں ہوتی ہیں، جن سے بچّوں کا ذہن ہٹ جاتا ہے وہ پوری یک سُوئی کے ساتھ پڑھائی نہیں کر سکتے۔ ہوسٹل میں دوسرے بچّوں کے ساتھ، والدین اور گھر سے الگ رہنے سے بچّوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ وہ عوام اور سماج میں جگہ بنانے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ میری رائے میں یہ اسباب بچّوں کو پاس رکھنے کی جذباتی تسکین سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

س: آپ اپنے بچّوں کو کیا بنانا چاہتی ہیں؟

ج: میں کوئی فیصلہ اپنے بچّوں پر لادنا نہیں چاہتی وہ جس پیشے کے لئے موزوں ہیں، وہ اس میں ضرور جائیں، جس کام سے اُنہیں دلچسپی ہے، وہ اُسے ضرور کریں، میں ان کی مدد کروں گی۔ لیکن ہر ماں کے اپنے بچّوں کے بارے میں کچھ خواب ہوتے ہیں، اس طرح میرے بھی ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ میرا کوئی بچّہ بزنس مین بنے۔ میری زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ پیسے کو انسان کا غلام ہونا چاہئے۔ انسان کو پیسے کا غلام نہیں ہونا چاہئے۔ میری یہ

تمنا ہے کہ میرا ایک بچہ جرنلسٹ بن جائے صحافت میں نام پیدا کرے۔

س: آپ نے بہت سے شہروں کا سفر کیا ہے۔ آپ کو کون سی جگہ سب سے زیادہ پسند ہے؟

ج: ہندوستان کے شہر بھی دیکھے ہیں۔ ملک سے باہر بھی گئی ہوں، مگر جو بات لیہ میں ہے وہ بہت کم جگہوں پر دیکھنے کو ملی۔ چھوٹا شہر ضرور ہے۔ آبادی صرف پندرہ ہزار ہے، جن میں آدھے بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں۔ آدھے مسلمان ہیں، لیکن آپس میں کسی طرح کی تلخی یا کڑواہٹ نہیں ہے سب آپس میں میل محبت سے رہتے ہیں۔ کبھی اذان کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ کبھی بدھ مت سے گھنٹیوں کی گونج بلند ہوتی ہے۔ لداخیوں کے مذہب اور عقیدے جداگانہ ہیں، لیکن ان کا رہن سہن اور ان کی تہذیب لداخی ہے۔ سب برابر سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ سب کی زبان لداخی ہے۔ راستے میں سب ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ حال ضرور پوچھتے ہیں۔ شاید آپ نے سنا یا پڑھا ہو کہ لیہ کی اہم شاہراہ پر بادشاہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی ایک تاریخی مسجد بھی موجود ہے۔

س: آپ نے بتایا تھا کہ بی اے میں اردو کو بھی بطور اختیاری مضمون منتخب کیا تھا۔ یہ آپ کی ذاتی دلچسپی تھی یا لداخ میں اور لوگ بھی اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں؟

ج: یہ محض میری ذاتی دلچسپی کی بات نہیں۔ لداخ کے سب پڑھے لکھے لوگ اردو سے واقف ہیں۔ وہاں اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

س: لداخی سماج میں عورتوں کی حیثیت کیا ہے؟

ج: جب تک میں لداخ سے باہر نہیں گئی تھی۔ میں اپنے سماج کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم ان پڑھ، غریب اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ملک کے دوسرے حصوں میں عورتوں کی حالت دیکھنے کے بعد میں یہ سمجھتی ہوں کہ لداخی عورتیں بہت خوش نصیب ہیں۔ لداخ میں عورتوں کو برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ جہیز کی لعنت نہیں ہے۔ کسی طرح کی کوئی پابندی یا رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی عورت جہیز یا سسرال کے مظالم سے تنگ آکر خودکشی نہیں کرتی۔ صرف بیٹے کی پیدائش کا جشن نہیں منایا جاتا، بیٹی کی پیدائش کا جشن بھی ناچ اور گانے کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ لداخ میں عورت کسی طرح کے تعصب کا شکار نہیں ہے۔

س: آپ نے کہا تھا کہ میرا زیادہ وقت سماجی کاموں میں گزرتا ہے۔ کیا آپ کو کھانا پکانے سے بھی دلچسپی ہے یا اس کے لئے کچھ وقت نکال پاتی ہیں؟

ج: آپ نے بڑا مشکل سوال کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے لداخ دیکھا نہیں۔ لداخ کی عورتوں کا سب سے زیادہ قریبی تعلق دو جگہوں سے ہوتا ہے۔ کھیت سے اور باورچی خانے سے۔ ہر گھر سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا کھیت ہوتا ہے۔ ان کھیتوں کی ذمہ داری عورتوں کے کندھوں پر ہوتی ہے۔ وہ خاندان کی ضرورت کے مطابق وہاں سال بھر کے لئے سبزیاں اگاتی ہیں۔ لداخ کا سرد موسم ہمارے لئے ریفریجریٹر کا کام کرتا ہے۔ سردیوں میں سبزیاں زمین میں دبا دی جاتی ہیں اور مہینوں محفوظ رہتی ہیں۔ لداخی گھروں کا باورچی خانہ آپ کے ڈرائنگ روم کی طرح سجا سنورا رہتا ہے۔ ہمارے یہاں تانبے کے برتن زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ فرش پر چٹائیاں بچھی رہتی ہیں۔ اور ان کے سامنے چھوٹی چھوٹی رنگین منقش چوکیاں بھی رہتی ہیں۔ اسی جگہ شام کو کنبہ کے افراد جمع ہوتے ہیں اور اسی جگہ مہمانوں کی ضیافت ہوتی ہے۔

س: یہ سننے میں آیا ہے کہ لداخ میں کئی بھائیوں کی ایک مشترکہ بیوی ہوتی ہے؟

ج: یہ عام بات نہیں ہے۔ ایک پرانا رواج ہے جو اب بھی بعض دور دراز کے دیہاتوں میں چل رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اقتصادی ہے۔ زمین یہاں سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ اور ترکہ ہے اور اس طرح زمین بٹوارے سے بچ جاتی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔

س: آپ کو کیسا لباس پسند ہے؟

ج: مجھے تو لداخی لباس سب سے زیادہ پسند ہے۔ ناچ گانے کے علاوہ لداخی عورتوں کو بناؤ سنگھار سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ ہر لداخی عورت موتیوں کا ہار ضرور پہنتی ہے جس میں مونگے اور فیروزے بھی پروئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کانوں میں موتی پروئے ہوئے کنڈل ڈالتی ہیں اور سینگ کے کنگن ان کے ہاتھوں کی زینت ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر لداخی لباس اور زیورات کی جگمگاہٹ دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔

س: کیا آپ اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ بتائیں گی؟

ج: جہاں تک میری ذاتی زندگی کی بات ہے میں اپنی شادی اور علیحدگی کی بات بتا چکی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور واقعہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ جب میں نے برلن میں ورلڈ یوتھ فیسٹول میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ میں پہلی لداخی لڑکی تھی، جو ہندوستانی ڈیلیگیشن کی رکن تھی۔ وہاں ایک بار میں گم ہو گئی تھی۔ ہوا یہ کہ میں گھومنے پھرنے نکلی اور راستہ بھول گئی۔ مقامی اسٹیشن قریب تھا میں ادھر کو گئی۔ ایک ٹرین آئی میں اس میں یہ سمجھ کر بیٹھ گئی کہ اپنے کیمپ

میں پہنچ جاؤں گی۔ جرمن زبان مجھے آتی نہیں تھی۔ ایک اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن آیا اور گزر گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ آخری اسٹیشن آیا۔ ایک ریلوے ملازم نے اشارے سے بتایا کہ ٹرین آگے نہیں جائے گی۔ میں ٹرین سے اتری اور چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ کس سے مدد مانگوں کس طرف جاؤں۔ حسنِ اتفاق سے میرے لدّاخی لباس اور ورلڈ ٹیورزم فیسٹول کو دیکھ کر ایک شخص میرے پاس آیا۔ اُسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی۔ میں نے اُسے اپنی دشواری سمجھائی۔

اس کے منہ سے یہ سُن کر پریشان ہو گئی کہ میں اپنی منزل سے بہت دُور نکل آئی ہوں۔ اس کے مشورے کو مان کر میں دوسری ٹرین پر سوار ہو کر اپنی جگہ واپس آگئی، جہاں سے میں نے سفر شروع کیا۔ اسٹیشن سے باہر آئی اور کسی طرح واپس کیمپ پہنچی تو میرے تمام ساتھی پریشان تھے اور اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کہاں اور کس طرح تلاش کریں۔ لدّاخی لباس پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ میری شناخت کے کام بھی آتا ہے اور اس پہچان سے مجھے اپنی منزل تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔

س : آپ کی خاص دلچسپیاں کیا ہیں؟

ج شہسواری، باغبانی میرے محبوب مشغلے ہیں۔ کہانیاں لکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ لکھی بھی ہیں۔ مطالعہ کا شوق بھی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے کمزور، ضرورت مند، مجبور، معذور اور مصیبت زدہ لوگوں کا کام کرکے ہوتی ہے۔ ایسے لوگ دُور دُور سے میرے پاس آتے ہیں۔ اُمیدیں لے کر آتے ہیں۔ ان کی مدد کرکے، ان کا کام کرکے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔

س : آپ کو ان نیک کاموں کی تحریک کہاں سے ملی ہے؟

ج کچھ بڑے آدمیوں کے بارے میں پڑھ کر، کچھ ان کے بارے میں سن کر، کچھ اپنی طبیعت اور مزاج سے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ مجھے پہاڑوں سے اُمنگ اور حوصلہ ملتا ہے۔ جب میں اُن کی طرف دیکھتی ہوں تو بلندی، طہارت، پاکیزگی اور صفائی کا ایک عجیب احساس میری رگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب بھی کوئی مشکل ہوتی ہے تو میں پہاڑوں کی طرف دیکھتی ہوں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ گیانی، رِشی مُنی لوگ روحانی مسرت اور سکون کے لئے کیوں پہاڑوں پر سکونت اختیار کرتے تھے ——

آخر میں ایک بات میری طرف سے۔ میں نے بہت کچھ آپ کو لدّاخ کے بارے میں بتایا۔ مزا تو جب ہے کہ آپ لدّاخ آئیں اور خود اپنی آنکھوں سے وہاں کے حسین مناظر اور وہاں کے عوام کی نیک نفسی اور مہمان نوازی کا لُطف اُٹھائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میرا وطن کتنا خوبصورت ہے اور وہاں کے لوگ کتنے عالی ظرف ہیں۔ ■■

ایک اور سیتا

قدیر جاوید پریمی

اس نے زیرِ لب کہا "یہ دل کش سماں، یہ رُوح پرور منظر" اور اپنے ارد گرد ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ "لیکن میں ان سے بھی زیادہ خوب صورت منظر چاہتا ہوں۔"

وہ کینوا س سنبھالے آگے بڑھا۔ لیکن چند قدم چل کر پھر ایک آبشار کے کنارے ٹھہر گیا۔ کینوا س اور رنگ برش کا تھیلا ایک طرف رکھا اور کنارے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد جلد ہی اسے احساس ہونے لگا کہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے۔ تھکن اُتارنے کے لئے وہ ہاتھوں کا تکیہ بنا کر گھاس پر لیٹ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ نمائش کے لئے وہ کس عنوان سے تصویر بنائے کہ وہ حاصلِ نمائش بن جائے۔ بڑی دیر تک وہ اس سوال کا جواب خلا میں تلاش کرتا رہا، لیکن کوئی موضوع اس کے ذہن میں نہ اُبھرا۔ وہ اپنے دماغ پر جھنجھلا اُٹھا کہ اتنی دیر سوچنے کے بعد بھی کوئی روشنی کی کرن نہیں اُبھر سکی۔ درحقیقت وہ اب اس سپنے کی تعبیر دیکھنا چاہتا تھا جس میں اس کو بہترین آرٹسٹ کا خطاب مل سکے۔

وہ خیالات کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے پازیب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا تو چار جوان لڑکیاں گاگریں اُٹھائے آبشار کی جانب چلی آرہی ہیں۔ یہ ان ہی کی پازیب کی جھنکار تھی جس نے اسے خواب سے بیدار کر دیا تھا۔ سب سے آگے والی لڑکی بھرپور جوانی کا حسین پیکر تھی۔ اس نے اس قدر خوب صورت لڑکی کو سامنے دیکھ کر فوراً برش سنبھال لیا۔ لڑکی کچھ زیادہ ہی شرمیلی واقع ہوئی تھی۔ اسے اسکیچنگ کرتے دیکھ کر شرم سے سُرخ ہوگئی۔ ادھر اس کی سہیلیوں نے اسے شرماتے دیکھ کر چھیڑنا شروع کر دیا۔ "ڈرپوک کہیں کی!"

"اری بنوالے اپنی تصویر۔ ہم بھی تو دیکھیں آخر بابوجی کیسی تصویر بناتے ہیں!"

ایک کے بعد دوسری نے اسے چھیڑا۔ پھر بھلا تیسری پیچھے کیوں رہ جاتی۔ اس نے بھی فقرہ چست کر دیا۔ ادھر آرٹسٹ کو موقع ملا اور ادھر کاغذ پر اس شرمیلی جوانی کا مکمل رُوپ رنگوں نے اُبھار دیا۔

آرٹسٹ زیرِ لب بڑبڑایا: "لاجواب — لاج کی ماری لاجو۔"

وہ سوچتا رہا اور رنگوں سے اس کو کاغذ پر اُبھارتا رہا۔ اور جب تصویر مکمل ہوئی تو لاجو کی سہیلیاں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئیں۔ ان کے سامنے ایک لاجو متحرک تھی اور دوسری ساکن۔ لیکن ایسی جیسی ابھی اس میں جان پڑنے والی ہو۔

فن کار نے اپنی اس تصویر کا عنوان رکھا۔ "ایک اور سیتا"

"ہائے رام!" ایک نے اپنی اوڑھنی کا پلّو دانتوں میں دبالیا۔

"یہ تو بالکل لاجو ہے، اپنی لاجو!" دوسری سے کہا۔

جب لاجو نے اپنی تصویر خود دیکھی تو محوِ حیرت رہ گئی۔

"ہائے میری مَیّا!" اس کے مُونہہ سے بے اختیار نکلا۔ "یہ تو میری ہی شکل ہے۔"

"ہاں لاجو۔" فن کار نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔ "یہ تم ہی ہو یعنی ایک اور سیتا۔"

دوسرے دن فن کار نے وہ تصویر نمائش گیلری میں رکھ دی۔

یوں تو آرٹ کی اس نمائش میں بہت سی تصاویر تھیں، ایک سے ایک بڑھ کر خوب صورت۔ ایک سے ایک فن کارانہ خوبیوں سے مرصع لیکن لاجو کی تصویر میں جو فن کارانہ خطوط فن کار نے اُبھارے تھے، وہ بے مثال تھے حُسن اور معصومیت سے بھرپور جوانی جو خاموشی کا لفظ پا لینے کے لئے لبوں کو بس جنبش دینے والی ہی تھی۔ آرٹ کے شیدائیوں نے فن کار کے اس شہ پارہ کو خوب سراہا۔ تصویر کا ایک ایک پہلو فن کار کی صلاحیتوں کا حاصل تھا۔ دیکھنے والوں نے اس کی اس تصویر کو حاصلِ نمائش قرار دیا۔ فن کار جیت گیا۔

لیکن لاجو ——؟

لاجو کے گاؤں میں طاعون کی ہلاکت خیز وبا نے کہرام مچا رکھا تھا۔ ہر فرد ایک دوسرے کی فکر کئے بغیر بس اپنی فکر میں اُلجھا ہوا تھا۔ کون کدھر ہے، کیسے پر واکتی، کون کب نظروں سے اوجھل ہو گیا، یہ جاننے کی کیا ضرورت تھی، اس وقت تو بس محض اپنی ہی ذات سے تعلق تھا۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ گاؤں والے تیزی سے گاؤں چھوڑ رہے تھے۔ شہر ان کا نشانہ تھا۔ لاجو بھی گاؤں والوں کے ہمراہ شہر کی جانب چل پڑی، لیکن جلد ہی ساتھیوں سے بچھڑ گئی۔ صبح سے شام تک وہ بے یار و مددگار شہر میں بھٹکتی رہی۔ دھیرے دھیرے شام کے سائے فضا پر اپنی تاریکی پھیلانے لگے۔ صبح سے اس وقت تک اسے کھانے کو مطلق نہ ملا تھا۔ جب بھوک سے نڈھال ہونے لگی تو دستِ سوال لوگوں کے سامنے پھیلنے لگا۔ لیکن ایک بھرپور جوان کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کو اس شہر میں کوئی آمادہ نہ ہوا۔ تیار ہوتے تو اس کی خوب صورتی کو لوٹنے کے لئے۔

چلتے چلتے وہ اس جگہ جا نکلی جہاں نمائش لگی تھی۔ یہ وہی نمائش تھی جس میں اس کی تصویر نے تمام تصاویر پر فوقیت حاصل کی تھی۔ وہ نمائش کے صدر گیٹ پر پہنچی۔ سوچا یہاں خوش پوش لوگ آجا رہے ہیں۔ شاید بھوکے پیٹ کو بھرنے کا سہارا بن جائے۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھی، اُلجھے بال، بوسیدہ لباس دیکھ کر گیٹ کیپر نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ وہ مایوس سی ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اب اس کا میلا سا جوان ہاتھ اندر سے باہر آنے والے ہر فرد کے سامنے پھیل رہا تھا۔ لیکن کسی نے بھی اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر کوئی سکہ نہ رکھا۔

ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ باہر سے بھیڑ کا ایک زبردست ریلا اندر کی طرف چلا اور جب تک وہ اس ریلے کے زور سے بچے انجانے میں ریلے کے ساتھ صدر گیٹ سے اندر پہنچ گئی۔

اندر پورا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

تصاویر سے ہال میں جیسے رونقوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ طرح طرح کی حسین تصاویر نے ہال کو وہ رونق بخش دی تھی کہ لاجو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند لمحے تک تو وہ محض تصاویر دیکھتی رہی، مگر جب بھوک نے زور کیا تو وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر پھر مجبور ہو گئی۔ مگر تصویروں کے مصنوعی رنگوں کے اس سنسار میں کسے اتنی فرصت تھی کہ جو اس کی بھوک کا احساس کرتا۔

ابھی لاجو کو ایک پیسہ بھی میسّر نہ ہوا تھا کہ تصاویر کی [illegible] لگ رہی تھی۔ شاید کسی تصویر کی قیمت کسی دل جلے نے لگائی تھی:

"ایک سو گیارہ روپے۔"

"صرف ایک سو گیارہ روپیہ؟" آواز نے جیسے اعتراض کیا۔ "جناب فن کار کی قیمت اس قدر کم نہ لگایئے۔"

اسی وقت دوسری آواز لاجو نے سُنی۔

"اجی صاحب، اس تصویر کی تو کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟" پہلی آواز نے بڑے رعب سے کہا:

"میں ایک ہزار گیارہ دوں گا۔"

"اچھا۔" دُوسرے نے تضحیک بھرے انداز میں فوری جواب دیا۔

"دو ہزار گیارہ میری طرف سے۔"

"اُف میرے بھگوان!" لاجو نے بڑی دیر تک ان آوازوں کو سُنا اور پھر سوچا۔

"آخر ان کاغذ کے بے جان ٹکڑوں میں ایسی کیا بات ہے جو لوگ ہزاروں کی بات کر رہے ہیں ...."

سوچتی ہوئی وہ اس بھیڑ میں سے آگے بڑھی جہاں اس تصویر کی بولی لگانے والے کھڑے تھے۔

بڑی مشکل سے لاجو بھیڑ کو چیرتی ہوئی اس تصویر کے سامنے پہنچ سکی جس کی قیمت اس وقت تک دو ہزار گیارہ روپے لگ چکی تھی۔

"ارے!" بے اختیار اس کے مُونہہ سے نکلا۔ "یہ تو میری تصویر ہے، جس کا مول بہت ہے اور خود میری قیمت کچھ بھی نہیں —— کچھ بھی نہیں!"

اور اس وقت لاجو کو اس حقیقت کا پتہ چلا کہ اصلی اور نقلی میں کتنا فرق ہے۔

●○

ہیلتھ کلب

پانی زیادہ پی کر موٹاپا کم کیجیے!

ماں باپ بچوں کو کہتے رہے ہیں کہ روزانہ آٹھ گلاس پانی ضرور پینا چاہیے۔ غذائیت [illegible] اور [illegible] یہی نصیحت کرتے ہیں۔ اس مشورے پر عمل کرنے سے ایک نہیں، ہزار فائدے ہیں۔ دن میں آٹھ گلاس پانی پینے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ جلد تازہ اور چمک دار رہتی ہے جسمانی نظام کی صفائی ہوتی ہے۔ بدن سے مضر اور زہریلے اجزاء باہر نکل جاتے ہیں۔ بے کار اور فاضل مادے کے اخراج میں مدد ملتی ہے۔ ہاضمہ بہتر ہوتا ہے۔ قبض کی شکایت اگر ہے تو دور ہو جاتی ہے۔

یہ ساری باتیں تو لوگ دادی اماں کے زمانے سے بزرگوں اور سرپرستوں کی زبانی سنتے آرہے ہیں تازہ ترین انکشاف ہوا ہے کہ زیادہ پانی پینے سے جسم کی فاضل چربی گھل کر باہر آنے لگتی ہے اور موٹاپا دور کرنے اور وزن کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

بہت سے لوگ مشکل سے اس بات پر یقین کریں گے کہ زیادہ پانی پینے سے موٹاپا کم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ امریکہ کے غذائی ماہر ڈاکٹر ڈونالڈ رابرٹسن کی حالیہ کتاب نے اس خیال کو اور زیادہ تقویت دی ہے مغربی دنیا میں جو تجربات ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ پانی کم پیتے ہیں ان کے جسم میں چربی زیادہ مقدار میں جمع ہونے لگتی ہے۔ اس انکشاف کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ زیادہ پانی پینے سے جسم میں جمع چربی کم ہونے لگتی ہے۔ ایسا کس طرح ہوتا ہے؟

ہوتا یہ ہے کہ جب لوگ پانی کم پیتے ہیں تو گردے بخوبی کام نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کام کا تھوڑا بوجھ جگر پر آجاتا ہے۔ گردے کا بار جب جگر پر آجاتا ہے تو جگر اپنا اصلی کام بخوبی نہیں کر سکتا اور اس کا فعل خراب ہو جاتا ہے۔ جگر کا ایک اہم کام یہ ہے کہ وہ جسم کے اندر موجود چربی کو جسمانی نظام کے لئے قوت یا توانائی کی شکل میں تبدیل کرتا ہے۔ جب جگر اپنی عام صلاحیت سے کم کام کرتا ہے تو چربی کے توانائی میں تبدیل ہونے کا عمل بھی سست ہو جاتا ہے۔ اس طرح چربی جسم میں جمع رہ جاتی ہے اور انسان کا وزن بڑھنے لگتا ہے اگر وزن نہیں بڑھتا تو بھی وزن کے گھٹنے کا عمل سست ہو جاتا ہے یا رک جاتا ہے۔
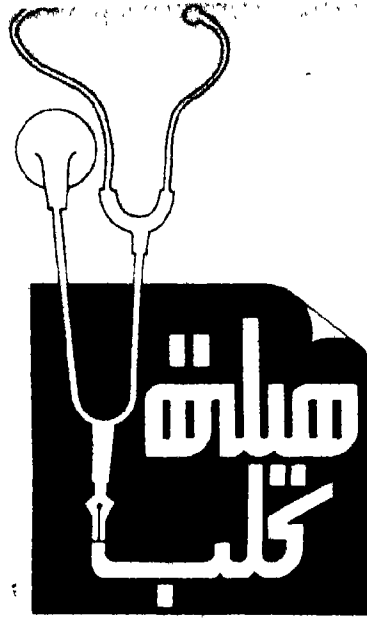
پانی کی مقدار کا موٹاپے سے تعلق اور بھی کئی پہلوؤں سے ہے۔ پانی کم پینے سے کئی طرح کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پانی کم پینے سے جسم میں پانی جمع رہنے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے جسے اُڈیما (OEDEMA) کہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی پانی کم پیتا ہے تو جسم جان کا خطرہ محسوس کرنے لگتا ہے اور اپنے دفاعی نظام کو متحرک کر دیتا ہے۔ حفاظتی حربے کے طور پر جو پانی یا نمی اسے ملتی ہے اسے وہ آخری قطرے تک محفوظ کرنے لگتا ہے۔ یہ پانی خلیوں (CELLS) کے باہر جمع ہونے لگتا ہے۔ اس طرح اُڈیما کی شروعات ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے پیر، ٹانگوں اور پاؤں پر سوجن آجاتی ہے۔

اگر جسم میں نمکوں کی مقدار زیادہ یا فاضل ہو جائے تو اسے کم کرنے میں اور گھلانے میں بھی پانی سے مدد ملتی ہے۔

وزن کم کرنے کے پروگرام میں پانی کی بڑی اہمیت ہے۔ عموماً جب کوئی شخص وزن گھٹانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی جلد پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ جلد کی کشش اور چمک کم ہونے لگتی ہے۔ پانی پینے سے خلیوں کے سکڑنے کے عمل کی روک تھام ہوتی ہے، جلد کو تقویت ملتی ہے اور وہ صاف اور تر و تازہ نظر آنے لگتی ہے۔ عضلات (یعنی پٹھوں) کو پانی سے طاقت ملتی ہے جس سے وہ مضبوط اور صحت مند رہتے ہیں ان کی سکڑنے کی فطری صلاحیت برقرار رہتی ہے۔ اس لئے جب آپ وزن کم کرنے کے لئے غذا کم کریں تو اس بات کا دھیان رکھیں کہ جسم میں پانی کی کمی نہ ہونے پائے اگر پانی زیادہ پئیں گے تو جسم میں رقیق کا توازن برقرار رہے گا اور پانی کی کمی مرض کا سبب نہ بن سکے گی۔

وزن کم کرنے کے پروگرام کے دوران میں جسم کو بڑی مقدار میں چربی کو توانائی کی شکل میں تبدیل کر کے خارج کرنا ہوتا ہے۔ اس فاضل مادے کو جسم سے نکالنے کے لئے پانی کی بڑی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ موٹے لوگوں کو وزن کم کرنے کے سلسلے میں پانی کی زیادہ مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وزن کم کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ پانی بھوک کو کم کرتا ہے یہ طریقہ بالکل فطری ہے۔ اس طرح بھوک کم کرنے کے لئے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پانی پینے سے پیٹ بھرا ہونے کا احساس ہوتا ہے اگر کوئی کھانا شروع کرنے سے پہلے ایک گلاس پانی پی لے تو لازمی طور پر وہ کھانا کم کھائے گا۔ غذا کم کرنے کا یہ ایک آسان اور بے ضرر نسخہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدمی کو کتنا پانی پینا چاہئے؟ ایک دن میں کم سے کم آٹھ [illegible] یہ اصول بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن [illegible]

کا فقدان زیادہ ہے، ماہرین کہتے ہیں پونڈ فاضل وزن کے لئے ایک گلاس زائد پانی پینا چاہئے۔ کتنی اور باتیں بھی جن پر پانی کی مقدار منحصر ہے۔ اگر آپ نے زیادہ کسرت کی ہے تو فطری طور پر آپ کو زیادہ پانی پینے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔ یہاں پسینہ زیادہ نکلتا ہے اس لئے جسم میں رقیق کا توازن درست رکھنے کے لئے ہر دو گھنٹے کے بعد ایک گلاس پانی پینا ضروری ہے۔ اس طرح بھی دن میں آٹھ دس گلاس پانی پینا چاہئے۔

پانی اگر تھوڑا زیادہ بھی پیا جائے تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ فاضل پانی پسینے یا پیشاب کی شکل میں باہر نکل جاتا ہے۔ بچے کے جسم میں نوے فی صد اور بالغ کے جسم میں پچاس فی صد سے زائد حصہ رقیق ہوتا ہے۔ پسینے، پیشاب اور سانس باہر نکالنے سے جو رقیق کا نقصان ہوتا ہے، اسے پورا کرنے کے لئے کافی پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پیاس کو کبھی نظرانداز نہ کیجیے کیوں کہ اس طرح جسم اپنی ضرورت کا اظہار کرتا ہے۔

آج کل بازار میں کئی طرح کے مشروبات ملتے ہیں۔ مختلف طرح کے کھانوں کی طرح ان میں بھی پانی ہوتا ہے۔ لیکن افادیت کے لحاظ سے ان میں سے کوئی مشروب سادہ، صاف پانی کی برابری نہیں کرسکتا۔ پیاس بجھانے میں کوئی مشروب پانی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ صاف سادہ پانی میں کوئی مضر ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اس سے چربی نہیں پیدا ہوتی، نہ موٹاپا بڑھتا ہے۔

ایک اور بات بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ کھانا کھانے کے دوران پانی نہیں پینا چاہئے۔ لیکن ڈاکٹروں نے مشاہدہ کیا ہے کہ کھانا کھانے کے دوران میں پانی پینے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ان کا خیال ہے کہ کھانے کے ساتھ پانی پینے سے ہاضمہ میں مدد ملتی ہے۔ لیکن کھانا کھاتے وقت بہت زیادہ پانی نہیں پینا چاہئے۔ کیوں کہ اس طرح ہاضم این زائم (ENZYMES) پتلے ہوکر تقریباً بے اثر ہوجاتے ہیں۔

وزن گھٹانے میں معاون ثابت ہونے کے علاوہ خوب صورتی کی حفاظت کے لئے بھی پانی پینا بہت مفید ہے۔ پانی زیادہ پینے سے جلد میں فطری تازگی پیدا ہوتی ہے۔ آنکھوں میں چمک اور کشش پیدا ہوتی ہے۔ سنگار کا یہ قدرتی طریقہ ہے جو مصنوعی اشیا کے استعمال سے بہتر ہے۔

بہتر یہ ہے کہ پانی ٹھنڈا پیا جائے۔ ڈاکٹر رابرٹسن کا خیال ہے کہ گرم پانی کے مقابلے میں ٹھنڈا پانی زیادہ جلد جسم میں جذب ہوتا ہے۔ تجربے سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ ٹھنڈا پانی پینے سے کلوریاں کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سہل طریقے سے وزن کم کرنا زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔

اگر آپ اپنے موٹے بھدے بدن سے پریشان ہیں یا آپ کو وزن کم کرنے کی صلاح دی گئی ہے تو کولا، اور ایسے دیگر مشروبات کو چھوڑ کر صاف سادہ پانی پیجئے۔ پیسے بھی بچیں گے اور وزن بھی کم ہوگا۔ موٹاپا کم کرنے کے لئے زیادہ پانی پینا ہر لحاظ سے کم خرچ بالانشیں نسخہ ہے۔ ○○

تنہا پیڑ

نور جہاں سلیم سہارن پوری

کار پہاڑوں کی پرپیچ راہوں سے گزر رہی تھی۔ دہرہ دون سے مسوری تک کا یہ سفر بہت رومان پرور لگ رہا تھا۔ ایک طرف اونچی پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا تو دوسری طرف خوف ناک گھاٹیاں۔

اس کی نظر ایک پہاڑی پر پڑی جس کی چوٹی پر ایک پیڑ اکیلا لہرا رہا تھا۔ نیچے گھاٹیوں کی ڈھلان پر بہت سے پیڑ تھے۔ جب ہوا زور سے چلتی تو اسے ایسا لگتا جیسے سب پیڑ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے ہوں۔ لیکن وہ تنہا پیڑ ہوا کی شدت سے کانپ کانپ جاتا۔

صوبی کی نگاہیں اس پیڑ پر مرکوز ہو گئیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو صوبی؟" انور نے اسے کھوئے ہوئے دیکھ کر سوال کیا۔

"انو، اس پیڑ کو دیکھ رہے ہو؟"، صوبی نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

انور نے پیڑ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا "ہاں! لیکن اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے کہ اسے دیکھا جائے بالکل عام پیڑوں کی طرح ہے۔"

"نہیں انو، تم نے غور سے نہیں دیکھا۔ وہ عام پیڑوں سے بالکل مختلف ہے۔ اتنی بلندی پر۔ لیکن بالکل تنہا۔"

"تو کیا ہوا؟" انور نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ وہ سب پیڑ جو اس سے نیچے ہیں ہوا کے زور سے ڈرتے نہیں۔ بلکہ جب ہوا چلنے سے ہلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ لیکن وہ تنہا پیڑ ہوا کے خوف سے کانپ کانپ اٹھتا ہے۔"

تمہارا فلسفہ سمجھنے کے لئے میرے پاس فلاسفر کا دماغ نہیں" انور نے ہنس کر بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیا اور صوبی نے خود کو اس کی آغوش میں چھپا لیا۔

صوبی مسوری اپنی پینٹنگز کی نمائش کے سلسلے میں آئی تھی۔ وہ صبح کو ہی پینٹنگ کا سامان لے کر نکل جاتی تو انور جھنجھلا جاتا۔

کبھی کبھی ابر پارے جب پرپیچ سڑکوں اور وادیوں میں اترتے اور ہر سو دھند چھا جاتی تو انور کا دل چاہتا کہ اس رنگین موسم میں صوبی اس کے نزدیک ہو، بالکل نزدیک۔ لیکن صوبی اس کے جذبات سے بے خبر اپنی آرٹ کی دنیا میں کھوئی رہتی۔

انور جانتا تھا کہ صوبی کو پانے کے لئے اسے آرٹ کے زینہ سے ہی جانا ہوگا۔ وہ قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اس کے ساتھ نمائش میں جاتا اور اس کی تصویروں کو سراہتا۔ صوبی بھی اسے اپنی پینٹنگ کے بارے میں تفصیل سے بتاتی۔

"دیکھو انو' اس پینٹنگ کو غور سے دیکھو۔ ایک کشتی طوفان میں پھنس کر ہچکولے کھا رہی ہے۔ اور بیک گراؤنڈ میں ایک لڑکی حیران و پریشان کھڑی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان کو پریشانیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ جب ایک کشتی طوفان میں پھنس کر جدوجہد کر سکتی ہے تو انسان کیوں نہیں کر سکتا؟ اور اس تصویر میں یہ پیڑ..."

انور بور ہونے کے باوجود سب کچھ سنتا رہا۔

اس بار مقابلے میں صوبی کی تصویر 'تنہا پیڑ' کو سال کی بہترین پینٹنگ قرار دیا گیا۔ صوبی خوشی سے جھوم اٹھی۔

"انو' میں نے کہا تھا نا یہ پیڑ..."

"صوبی پلیز! اس پیڑ کے بارے میں اتنا سن چکا ہوں کہ اب اس کا نام سن کر بھی بوریت ہونے لگتی ہے۔"

"انو" صوبی تڑپ کر بولی۔

"صوبی میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بھی تو میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ آئی لو یو صوبی، آئی لو یو۔"

صوبی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کیسی تپش تھی کہ صوبی کو اپنا وجود پگھلتا محسوس ہوا۔ اور وہ انور کے بازوؤں میں سما گئی۔

صوبی گھر آئی تو والدین سے کئے گئے وعدے کے مطابق انور کی زندگی میں آگئی۔

انور تو بچپن سے ہی صوبی کے خواب دیکھتا آیا تھا۔ اسے جیسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی۔ جب اس نے گھونگھٹ ہٹایا تو صوبی کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔

صوبی نے بڑے پیار سے کہا۔ "انو! ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور!" وہ شوخی سے مسکرایا۔

"شادی کے بعد تم مجھے آرٹ کی دنیا سے الگ تو نہ کرو گے؟"

"کیوں بھلا؟ کیا میں نے آج تک کبھی اعتراض کیا ہے؟"

"سچ' مجھے تم پر پورا بھروسا ہے کہ تم میرا قدم قدم پر ساتھ دو گے۔"

انور کے دل پر چوٹ سی لگی۔

"آج کی رات بھی یہ باتیں!"

یہ رات تو صرف پیار کے لئے ہوتی ہے اور صوبی ہے کہ آج بھی آرٹ کی دنیا میں کھوئی ہے۔ کاش آج وہ اس سے کہتی: "انو میں صرف تم

نے میرا انتظار کیا ہے اسی طرح میں بھی اس رات کے چھپنے دیکھتی آئی ہوں۔"

لیکن انور صرف سوچ کر رہ گیا۔ وہ صوبی سے بے پناہ پیار کرتا تھا، اس لئے حرفِ شکایت زباں پر نہ لاسکا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا شکوہ کرکے وہ اپنی ازدواجی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

صوبی کے تصور سے بڑھ کر انور اسے پیار کرتا تھا۔ نہ صرف پیار کرتا تھا، بلکہ آرٹ کی دنیا میں بھی اس نے صوبی کو پہلے سے کہیں زیادہ روشناس کرایا تھا۔ صوبی روز بروز کامیابی کی طرف بڑھتی گئی۔ صوبی انور اب ملک کی نامور آرٹسٹ تھی۔ کسی نمائش میں اس کا شامل ہونا ہی نمائش کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ وہ دن رات اپنی پینٹنگز میں گم رہتی۔

دن بھر آفس سے تھکا ہوا انور شام کو جب گھر آتا تو اس کا دل چاہتا کہ صوبی پیار سے اس کا استقبال کرے لیکن صوبی صرف اتنا کہتی:

"بس انو، یہ آخری ٹچ ہے۔ اس کے بعد فوراً پھر ہم بیٹھ کر دیر تک باتیں کریں گے۔" لیکن اُس کا آخری ٹچ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔

رات آتی تو وہ اتنی تھک جاتی کہ پڑ کر ہوش ہی [illegible]۔ انور اسے پیار سے جگانے کی کوشش کرتا لیکن وہ کروٹ بدل کر پھر بے سدھ ہو جاتی۔

"سوجاؤ نا پلیز! انو ڈارلنگ! دیکھو نا، صبح کو پانچ بجے سے اٹھ کر پینٹنگ میں لگ گئی تھی۔ اور صبح کو اٹھ کر اسے پھر مکمل کرنا ہے۔"

اور انور پوری رات سگریٹ پھونکتے ہوئے گزار دیتا۔ رات کے پچھلے پہر نیند اس پر مہربان ہوتی۔ صبح آٹھ بجے وہ سو کر اٹھتا تو نوکر کہتا۔ "صاحب، میم صاحب تو صبح ہی اٹھ کر چلی گئی ہیں آپ کے لئے باتھ روم تیار کر دوں؟"

یہ سن کر انور جل کر رہ جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ صوبی کی بنائی ہوئی پینٹنگز کو آگ لگا دے اور صوبی کو جھنجھوڑ کر کہے "کاغذوں پر جذبات کی عکاسی کرنے والی احمق لڑکی، کبھی گوشت پوست کے بنے ہوئے اس انسان کو بھی دیکھو جسے قدرت نے ایک دل بھی دیا ہے۔ اور اس دل میں ارمان ہیں، جذبات بھی ہیں۔ کیوں میرے ارمانوں کا جنازہ نکال رہی ہو؟" لیکن جب صوبی سے اس کا سامنا ہوتا تو وہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا بے پناہ پیار اس کے لبوں پر قفل ڈال دیتا۔ اور صوبی جب آتی تو اسے اپنی پینٹنگز کے بارے میں بتانے لگتی۔ اب تو اس کی پینٹنگز نمائش کے لئے ہندوستان سے باہر بھی جانے لگی تھیں۔

انور بہرحال ایک مرد تھا۔ کب تک بیوی کی بے اعتنائی کا شکار ہوتا۔ اس نے بھی اپنے تسکین کا سامان کر لیا۔ لیکن اپنی شہرت اور دولت کے انبار تلے دبی ہوئی صوبی کو احساس ہی کہاں تھا کہ اس نے یہ سب پانے کے لئے کیا کھو دیا ہے۔ اسے احساس اس وقت ہوا جب انور نے اس کی پینٹنگز میں دلچسپی لینی بند کر دی اور رات میں بھی اُسے پیار کرنے کی کوشش نہ کی۔

اب صوبی کو احساس ہوا کہ اس کے اندر کی فن کار مر رہی ہے اور اس کی جگہ ایک عورت بیدار ہو رہی ہے عورت جو ازل سے پیار چاہتی ہے — پہلے کسی کی بیٹی بن کر، پھر کسی کی بیوی بن کر۔

اور ان سب سے بڑھ کر ایک مرحلہ اور ہے جس سے عورت کے وجود کی تکمیل ہوتی ہے۔ ماں بننا۔

صوبی کی شادی کو چھ سال گزر چکے تھے، لیکن وہ آج تک ماں نہ بن سکی تھی۔ اس میں انور کا کوئی قصور نہ تھا۔ قصور تو سب اس کا ہی تھا۔ جو آج تک شہرت اور دولت کے پیچھے بھاگتی آئی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ انور کے قدموں میں گر پڑے اور کہے "انو، مجھے معاف کر دو! میں سب کچھ تیاگ کر صرف تمہاری بیوی بن کر جینا چاہتی ہوں، تمہارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔"

لیکن پھر اس کے اندر کی خودداری بیدار ہو گئی۔ اب تو میں انور کے لئے جاگتی ہوں — اسے اپنے ہاتھوں سے چائے اور کھانا بنا کر دیتی ہوں۔ پھر وہ کیوں نہیں سمجھتا میرے جذبات کو؟

انور دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ صوبی کسی طرح ٹھیک راستے پر تو آئی۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔

چھ سال پہلے مسوری میں گزارے ہوئے رومان پرور دن بار بار انور کی نگاہوں میں گھومنے لگتے۔ ایک دن انور نے اسے مسوری چلنے کے لئے کہا تو وہ فوراً راضی ہو گئی۔

کار میں مسوری جاتے ہوئے صوبی نے انور کے کاندھے پر سر رکھنا چاہا تو انور نے اُسے ٹوک دیا: "ڈارلنگ آگے خطرناک موڑ ہے۔ الگ ہو کر بیٹھو۔"

صوبی کی نظر اچانک اسی پہاڑی کی طرف اٹھ گئی جہاں آج بھی وہی تنہا پیڑ ہوا کے جھونکوں سے کانپ رہا تھا۔ اور اسے ایسا لگا جیسے وہ خود بھی تنہا پیڑ ہے۔ وہ بلندی پر تو پہنچ گئی ہے۔ لیکن اس کا اب کوئی ساتھی نہیں رہا ہے۔

ہوٹل پہنچ کر انور اسے چھوڑ کر باہر گیا تو تنہائی اور شدید ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔

انور واپس آیا تو اس کی نظر ایک پرچے پر پڑی، جس پر لکھا تھا:

انو ڈارلنگ!

"بلندی پر پہنچ کر میں بھی ایک تنہا پیڑ بن کر رہ گئی ہوں۔ کاش میں نے اتنی بلندی پر پہنچنے کی تمنا نہ کی ہوتی۔ اب میں وہیں جا رہی ہوں۔"

انور کا سر چکرا گیا۔ تیزی سے جب وہ وہاں پہنچا تو صوبی ہمیشہ کے لئے اس پیڑ کی چھاؤں میں ابدی نیند سو چکی تھی۔ لیکن اس کی بے جان کھلی آنکھیں اب بھی کسی کی راہ تک رہی تھیں۔ شاید اپنے انو کی!

●●

قلمی دوستی

نام : ارجمن بانو   عمر : ۱۷سال
پتہ : آڑہ روڈ، کرن سرائے، سہسرام۔ ۸۲۱۱۱۵
شوق : اُردو سے دلچسپی۔ فلمی ہیرو بننا، قلمی دوستی کرنا، خطوں کے جواب دینا۔ آئی پی ایس افسر بننے کی خواہش رکھنا

نام : محمد عامر خان   عمر : ۲۱سال
پتہ : معرفت جناب ظفر احمد خان، محلہ صادھو فیل، تحصیل موانہ، شاہجہاں پور ضلع میرٹھ، (یوپی)
شوق : بھائی بہنوں سے بے لوث دوستی کرنا۔ سچی ہمدردی رکھنا اور سچے دوستوں کے لئے جان کی بازی لگانا۔ خطوں کے پابندی سے جواب دینا۔ نماز کی پابندی کرنا۔

نام : محمد عبدالقدیر   عمر : ۱۴سال
پتہ : محمد لٰسین شریف مکان نمبر ۱۲/۱ گنج کالونی گلبرگہ (کرناٹک اسٹیٹ) ۱۰۴
شوق : کرکٹ کھیلنا، پکچر دیکھنا، دوستی کرنا، ٹی وی شوق سے دیکھنا وغیرہ۔

نام : انور شریف ناصر   عمر : ۲۶سال
پتہ : محمد لٰسین شریف مکان نمبر ۱۲/۱ گنج کالونی گلبرگہ (کرناٹک اسٹیٹ) ۱۰۴
شوق : کتابیں پڑھنا، دوستی کرنا اور نبھانا۔ مضامین لکھنا وغیرہ

نام : وسیم احمد عراقی   عمر : ۱۹سال
پتہ : ۲۶ فیبرس لین۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
شوق : ڈاک ٹکٹ اور سکے جمع کرنا۔ مطالعہ کرنا۔ دین و دنیا کی زیادہ سے معلومات حاصل کرنا۔

نام : محمد محمود علی جاوید (بی کام عثمانیہ)   عمر : ۲۳سال
پتہ : مکان نمبر 28/551-4-20 خلوت مبارک حیدرآباد، اے پی، ۲
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ غزل گانا۔ افسانہ لکھنا۔ شاعری کرنا۔ کتب بینی۔

نام : نسیم سلطانہ لٰسین   عمر : ۱۲سال
پتہ : محمد لٰسین شریف مکان نمبر ۱۲/۱ گنج کالونی گلبرگہ (کرناٹک) ۱۰۴

شوق : قلمی دوستی کرنا، مطالعہ کرنا، ٹی وی دیکھنا، بچوں سے شفقت برتنا وغیرہ

نام : عبدالجبار   عمر : ۱۳سال
پتہ : میاں جان، استاغر لین کلکتہ۔ ۱۷
شوق : کرکٹ کھیلنا، کومیک پڑھنا۔ شعر لکھنا

نام : خالد جاوید   عمر : ۲۲سال
پتہ : پوسٹ بکس ۷۸۳۔ حائیل، سعودی عرب
شوق : سیر و سیاحت، قلمی دوستی، کرکٹ، موسیقی

نام : چودھری افتخار احمد آرائیں   عمر : ۲۱سال
پتہ : معرفت عارف علی بٹ، ص ب ۸۹۲۳ الریاض سعودی عرب ۱۱۴۹۲
شوق : پڑھائی کرنا۔ جوڈو کراٹے اور یوگا ایکسرسائز، اور ملکی اور غیر ملکی لڑکوں، لڑکیوں کے ساتھ خط و کتابت کرنا۔

نام : ایم۔ فہمی ایم عادل   عمر : ۲۳سال
پتہ : کارخانہ نمبر ۵۴ درگاہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ رسائل پڑھنا

نام : راحیلہ پروین (پی ایس سی)   عمر : ۲۲سال
پتہ : معرفت عبدالحمید بیڑی والے، ۸۰ کیسر گنگل برانچ ریلوے اسٹیشن کے سامنے (ایم۔ ایس) سانگلی ۴۱۶۴۱۶
شوق : ہر خط کا فوراً جواب دینا۔ اچھی کتابیں اور ناول پڑھنا۔ غزل سننا، بانو، کا پابندی سے مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا۔ خطوط کو باعثِ مسرت سمجھنا۔

نام : چودھری محمد انور نعیم   عمر : ۲۵سال
پتہ : شری لیموزین۔ ص ب ۱۴۰۸۔ الخبر ۳۱۹۵۲۔ سعودی عربیہ
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ بانو۔ شمع کا مطالعہ کرنا، معیاری اشعار جمع کرنا۔

نام : محمد عمران خان   عمر : ۱۸سال
پتہ : مکان نمبر ۱۶۰۴ گلی اندھیری، پہاڑی بھوجلہ جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶
شوق : کراٹے، کرکٹ، جاسوسی دنیا اور اردو رسائل کا مطالعہ کرنا۔ غزلیں پڑھنا اور سننا۔

نام : شاہد آصف خان کاندھلوی   عمر : ۲۴سال
پتہ : مکان نمبر ۳/۲۱۸ خان منزل، پانی پت، ہریانہ ۱۳۲۱۰۳

نام :-   عمر :-
پتہ :-
شوق :-

شوق : قلمی دوستی۔ غریب لوگوں کی مدد کرنا۔ پینٹنگ ویو کارڈس اور
سونسی جمع کرنا۔ اچھی کتابیں پڑھنا۔

نام : محمد اختر عبد الجلیل بی کام عمر : ۲۰ سال
پتہ : مکان نمبر ۴/۳۰-۲-۱ محلہ بوئے پلی گیٹ محبوب نگر ۵۰۹۰۰۱
شوق : قلمی دوستی کرنا اچھے اشعار جمع کرنا، کرکٹ کھیلنا۔

نام : صلاح الدین اعظمی عمر : ۲۳ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۳۴۵۴ الحسار الحفوف سعودی عربیہ ۳۱۹۸۲
شوق : قلمی دوستی پرخلوص لڑکے لڑکیوں سے۔

نام : ایم اے صدیق عمر : ۲۸ سال
پتہ : ایل آئی سی ڈویژنل پوسٹ آفس حیدر آباد ۵۰۰۴۶۳
شوق : سیر و سیاحت، مزاح، سماجی مسائل پر تبادلہ خیال تمامی دوستی
خطوں کا فوری جواب دینا۔ ٹی وی سیریل دیکھنا وغیرہ

نام : ایم اے رشید خان عمر : ۳۲ سال
پتہ : مکان نمبر ۳-۲-۸ سطام پیٹھ، کھمم، ۵۰۷۰۰۱
شوق : فلمیں دیکھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ سیر و تفریح کرنا۔

نام : سید منہاج علی وارثی عمر : ۲۷ سال
پتہ : ۲۰۱/۲۲ سرائیں بانس، چوک لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۳
شوق : خطوں کا جواب دینا۔ اسٹاروں کے فوٹو جمع کرنا پرانے نغمے
سننا۔ اچھے معیاری رسائل پڑھنا

نام : جمیل احمد ابن نورالہدیٰ عمر : ۲۷ سال
پتہ : ۳/۱۸ امیر باغ ۲ جیمبور اسٹیشن بمبئی ۸۹
شوق : سوشل کام کرنا۔ کہانی لکھنا غزلیں اور نظمیں لکھنا اور ذاتی
تخلیق کو خود شائع کرواکر فروخت [illegible] اور اپنے دوستوں کے
لطیفہ یا پسندہ اشعار اپنی کتاب میں شائع کروانا خط کا جواب فوراً دینا۔

نام : محمد اشرف علی خان عمر : ۲۴ سال
پتہ : مکان نمبر ۶۲۹-۵-۱۸ بیرون علی آباد حیدر آباد ۲۵۳ ۲ (اے پی)
شوق : شمع، بانو، بیسویں صدی پڑھنا، سیر و تفریح کرنا۔ اچھے اشعار جمع
کرنا۔ غزلیں سننا۔

نام : محمد اسلم شیخ عمر : ۲۴ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۳۴۵۲ الحسار المحفوف، سعودی عربیہ ۳۱۹۸۲
شوق : فلمیں دیکھنا، تنہائی پسند کرنا، خطوں کا جواب دینا، سیر و تفریح۔

نام : ایم۔ ایم۔ اسلم عمر : ۲۹ سال
پتہ : شاہ منزل، مینا بازار، مدھوپور ۸۱۵۳۵۳ (بہار)
شوق : قلمی دوستی، تفریح،

نام : سید وقار احمد عمر : ۱۵ سال
پتہ : معرفت سید شفیع احمد، بارد نمبر دو، بیگوسرائے (بہار) ۸۵۱۱۱۸
شوق : کرکٹ اور شطرنج کھیلنا۔

نام : محمد ارشاد عالم خان عمر : ۲۳ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۷ الزلفی ۱۱۹۳۲ السعودیہ العربیہ
شوق : بانو، شمع کا مطالعہ کرنا۔ ناہید اختر کے شوخ و چنچل گانے سننا
خوب صورت چیز پسند کرنا۔ خط کا جواب پابندی سے دینا۔

نام : ایم۔ الف۔ اے سرور عمر : ۲۳ سال
پتہ : جنتا اسٹور، نیو مارکیٹ۔ کیونجھر گڑھ، اڑلیسہ ۷۵۸۰۰۱
شوق : بانو پڑھنا بھائی بہنوں سے قلمی دوستی کرنا۔ محمد رفیع کے گانے
سننا اور اچھا سین دیکھ کر تصویر کھینچنا۔ کرکٹ کھیلنا ون ڈے
کرکٹ میچ دیکھنا۔

نام : شفیق الرحمٰن عمر : ۲۶ سال
پتہ : پوسٹ بکس ۴۲۶ مراد آباد، ۲۴۴۰۰۱
شوق : جرنلزم، کرکٹ، ادب، شعر و شاعری، موسیقی، سوشل ورک
اور قلمی دوستی۔

نام : شیخ نشاط الرحمٰن عمر : ۲۶ سال
پتہ : A ۱۴/۱۳ - پنڈت روڈ چوہان بانگر۔ نیو سیلم پور دہلی ۱۱۰۰۵۳
شوق : قلمی دوستی کا بہت شوق۔ فلمیں دیکھنا۔ سیر و تفریح۔ سب
خطوط کے جواب دینا۔ سب طرح کے میگزین پڑھنا۔

نام : عبد المنیم خان دآجاد عمر : ۲۱ سال
پتہ : زیڈ۔ پی۔ کالونی۔ تعلقہ۔ پوسد ضلع، یوتمحل (مہاراشٹر)
شوق : ناول پڑھنا۔ ٹی وی دیکھنا۔ اچھے اشعار یاد کرنا۔ قلمی دوستی کرنا
چائے پینا۔

نام : شیخ شہاب الرحمٰن عمر : ۱۶ سال
پتہ : A ۱۴/۱۳ - پنڈت روڈ، چوہان بانگر، نیو سیلم پور، دہلی ۵۳-۱۱
شوق : قلمی دوستی۔ کرکٹ میچ دیکھنا۔ ٹی وی سیریل۔ اور فلمیں دیکھنا
میگزین پڑھنا۔

نام : حاجی حنیف احمد یوسف عمر : ۲۵ سال
پتہ : الباح ص۔ ب ۲۰۵ (سعودی عربیہ)
شوق : دوستوں اور بزرگوں سے ملاقات کرنا۔ فلم دیکھنا اور
خطوط لکھنا، بانو پڑھنا

نام : اقبال کریم بیتاب عمر : ۲۶ سال
پتہ : پوسٹ، ہلدی پوکھر۔ وایا جمشید پور ۸۳۱۰۰۱ ضلع سنگھبوم (بہار)
شوق : قلمی دوستی۔ شاعری۔ ادب اور تنہائی پسند کرنا۔

نام : شکیب احمد عمر : ۲۱ سال
پتہ : پلاٹ نمبر ۲۔ راج نگر کالونی، کاٹول روڈ۔ ناگپور (مہاراشٹر)
شوق : مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ ہر معاملے میں انصاف
سے کام لینا۔

شریکِ سفر کے نام

زندگی کاوشِ باطل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
تو ہی اک عمر کا حاصل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

لوگ ملتے ہیں سرِ راہ، گزر جاتے ہیں
تو ہی اک ہم سفرِ دل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

تو نے سوچا ہے مجھے، تو نے سنوارا ہے مجھے
تو مرا ذہن، مرا دل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

تو نہ ہوگا تو کہاں جا کے جلوں گا شب بھر
تجھ سے ہی گرمیٔ محفل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

میں کہ بپھرے ہوئے طوفاں میں ہوں لہروں لہروں
تو کہ آسودۂ ساحل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

اس رفاقت کو سپر اپنی بنا لیں، جی لیں
شہر کا شہر ہی قاتل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

ایک میں نے ہی اگائے نہیں خوابوں کے گلاب
تو بھی اس جرم میں شامل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

اب کسی راہ پہ جلتے نہیں چاہت کے چراغ
تو مری آخری منزل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

مظہر امام

گاؤں کی گوری

چوری چوری چپ چپ چپ چپ
گاؤں کی گوری چپ چپ چپ چپ
نندیا رانی کس کے بس کی
تلخی ہے موسم میں امس کی
عمر بھی ہے جب سولہ برس کی
من ترساتی مست پون سے

سن کر لوری چپ چپ چپ چپ
گاؤں کی گوری چپ چپ چپ چپ
دنیا ہے یہ آنی جانی
درد بھری شبنم کی کہانی
حشر بڑھاپا سمجھ جوانی
راس نہ آئی گل بوٹوں کو

چاند چکوری چپ چپ چپ چپ
گاؤں کی گوری چپ چپ چپ چپ
بہت بڑے دنیا کے میلے
شب تنہائی دن ہیں اکیلے
کہاں وہ ساتھی ساتھ جو کھیلے
منہ تکتا ہے موہ کا بندھن

پریم کی ڈوری چپ چپ چپ چپ
گاؤں کی گوری چپ چپ چپ چپ

عدیل مستحسن

اردو کی مقبول ترین ادیبہ
واجدہ تبسم
کے مقبول ترین ناول
ساتواں پھیرا
واجدہ تبسم کا تازہ شاہکار
قیمت: تیس روپے
نتھ کی عزت
ایک حیدرآبادی نواب سے ان کی طوائف محبوبہ کا دردناک انتقام
قیمت: تیس روپے
نتھ کا غرور
حیدرآباد کی کہانیاں جس میں غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل ہیں۔
قیمت: تیس روپے
نتھ کا زخم
انوکھے انداز کا ناول حیدرآباد، انگلستان اور امریکہ کی داستان
قیمت: تیس روپے
اترن
حیدرآباد کے رنگین ماحول کی کہانیاں
قیمت: تیس روپے
نتھ اترائی
گیارہ طوائفوں کی تیرہ کہانیاں
قیمت: تیس روپے
نتھ کا بوجھ
دل چسپ بے باک افسانے
قیمت: تیس روپے
قلم کے جادوگر الیاس سیتاپوری کے شاہکار
پارسائی کا خمار
قیمت: بیس روپے
آشنا پرست
قیمت: پندرہ روپے
حرم سرا کا محبوب
قیمت: پندرہ روپے
دیوی کے پرستار
قیمت: بیس روپے
کشمیر کی کلی
قیمت: سولہ روپے
داستانِ حور
قیمت: پندرہ روپے
شہزادی کا نیلام
قیمت: پندرہ روپے
بالاخانے کی دلہن
قیمت: پندرہ روپے
حرم سرا
قیمت: پندرہ روپے
چاند کا خدا
قیمت: پندرہ روپے
عجائب خانۂ عشق
قیمت: پندرہ روپے
اندر کا آدمی
قیمت: دس روپے
راگ کا بدن
قیمت: دس روپے
انتباہ
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

سید اسلام حیدر نوگانوی

فیصلہ

گاڑی کی آواز سن کر میں باہر آ گئی۔ سامنے سے شوکت بھائی ہاتھ میں اپنی خوبصورت کیپ گھماتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے سوچا، اپنی بہادری کی بہت ڈینگیں مارتے ہیں۔ آج انہیں ڈرا دوں۔ لیکن اسی وقت کہیں سے آپی آ کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور میں دیکھتی ہی رہ گئی۔

"کہاں تھے آپ ابھی تک؟" آپی نے تلخ آواز میں پوچھا۔

"ذرا خان صاحب..."

"بہانے کیوں بناتے ہیں؟ اگر آپ نے یہ رات کو دیر سے آنے کی عادت نہ چھوڑی تو میں خالہ جان کو لکھ دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے آپی نے آگے بڑھنا چاہا تو شوکت بھائی نے جلدی سے ان کی کلائی پکڑ لی۔

چوڑیاں کھنکیں تو فضا میں جل ترنگ بج اٹھے رات کی رانی مہک اٹھی۔ "حنا تمہارا یہی روپ دیکھنے کے لئے تو میں اتنی دیر سے آتا ہوں جس میں پیار کی خوشبو ہے، چاہت کی مہک ہے۔"

آپی نے جواب میں کچھ نہ کہا، صرف خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے پکار کر کہا: "بس اسی طرح کھڑے رہیے۔ بہت اچھا فوٹو آئے گا۔"

دونوں بری طرح اچھل پڑے اور میں ہنستی ہوئی سامنے آ گئی۔ آپی جلدی سے آنچل برابر کر کے اندر کی طرف بھاگ گئیں اور میں شوکت بھائی کے پیچھے پڑ گئی۔

"یہ کون سی نشست تھی بھائی جان؟" وہ جھینپے ہوئے تھے اور گھبرا بھی رہے تھے۔ میں نے ان کا گرم دیکھ کر پھر چوٹ کی؟ "اگر میں اس وقت پاپا کو بلا لاتی تو شوٹنگ میں اور لطف آتا نا!"

"نیلو، دیکھو پریشان نہ کرو۔" وہ گھبرا کر بولے۔

لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی "خیر اب جا کر کہتی ہوں کہ آئندہ شوٹنگ وہ خود کریں۔"

شوکت بھائی کا تقرر ایک فارسیٹ آفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اپنا چارج سنبھالنے سے پہلے وہ امی کے اسرار پر ہمارے گھر رک گئے تھے۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ ان کے لطیفوں سے پورا گھر قہقہہ زار بنا رہتا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد ہم لوگ باہر چاندنی میں نکل آتے اور رات گئے تک محفل جمی رہتی۔ شوکت بھائی کا نشانہ آپی زیادہ بنتی تھیں اور آپی ان کی چھیڑ چھاڑ پر سرخ ہو جاتی تھیں۔ پھر جانے کیسے ہماری محفل کو گہن لگ گیا۔ اندھیروں نے ہماری بزم کو گھیر لیا۔ ان دنوں پھوپی اماں کراچی سے پندرہ سال بعد آئی تھیں اور آتے ہی انہوں نے وہ بم چھوڑا کہ ہم سب بیٹھے رہ گئے۔ آپی اٹھ کر اندر چلی گئیں اور میرے منہ کا نوالہ حلق سے نہ اتر سکا۔ شوکت بھائی پر جو بھی گزری ہو وہ جانیں۔

"بھتیا، اس مرتبہ آپ کا فیصلہ سن کر ہی جاؤں گی۔" پھوپی اماں پاپا سے مخاطب تھیں۔

"لیکن آپا..."

پاپا نے کچھ بولنا چاہا تو پھوپی اماں نے انہیں وہیں خاموش کر دیا۔ "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ حنا کو بچپن ہی میں میں نے مانگ لیا تھا۔ اب کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔"

میں نے دیکھا، پاپا خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد رک رک کر بولے "ابھی تو آپ ایک مہینہ ٹھہریں گی۔"

اس کے بعد اس مسئلے پر کوئی بات نہ ہوئی۔ میں اٹھ کر آپی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنے بستر پر پڑی تکیے میں منہ چھپائے سسک رہی تھیں۔ شوکت بھائی کا ستا ہوا چہرہ

انمول موتی

- خوش اخلاقی ایک ایسا جوہر ہے جس کا سارا زمانہ خریدار ہے
- کم زوروں کی مدد کرنا اور ان کو پناہ میں لینا مردانگی کی نشانی ہے۔
- یاد رکھو کر تمام دنیا کو فتح کرنے پر بھی موت تمہارے اوپر فتح یاب ہو گی۔
- بدصورت آدمی کو چاہئے کہ اپنی صورت خوش خلقی کے پردے میں چھپالے
- دولت کی خوشی عارضی اور کھوکھلی ہے لیکن پریم اور دوستی سے جو خوشی ہوتی ہے وہ میٹھی اور ہمیشہ رہنے والی ہوتی ہے۔
- تن درستی کے لئے فاقہ کرنا بہت ضروری ہے۔
- زیادہ ہنسی قلب کے مردہ ہوجانے کا سبب ہو جاتی ہے۔
- احسان جتلانے والا جنت میں نہ جا سکے گا۔
- موت تم کو آکر رہے گی اگرچہ مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو۔
- ظلم ایک ایسی بے راہی ہے جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے

(صہبا ندیم رضوی بہار زنانہ)

سب انتظار کے سامنے آگیا اور میں بھی رہ گئی۔ اس روز سے ہمارے گھر کی فضا بوجھل ہو گئی۔ چاروں طرف عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ شوکت بھائی کے قہقہے ٹوٹ کر جانے کہاں بکھر گئے۔ لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ تھک کر ہونٹوں پر بکھر گئی

صبح کو میں شوکت بھائی کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی کہ اندر سے آتی ہوئی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔

"مجھے اس رشتے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ سب دقیانوسی روایتیں ہیں۔ میں ان کو نہیں مانتی۔"

"حنا، والدین کی مرضی کے آگے ہی سر خم کرنا اچھے خاندان کی لڑکیوں کا شیوہ ہے۔ جو کچھ ہوا خواب سمجھ کر اسے بھول جاؤ اور ایسی دنیا بساؤ جیسی خالو جان چاہتے ہیں۔ مجھے ان کا فیصلہ معلوم ہے۔ میں بھی پرسوں چلا جاؤں گا تاکہ خالو جان کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔"

مجھ سے اور کچھ نہ سنا گیا تو منہ میں دوپٹے کا پلو ٹھونس کر واپس چلی آئی۔ اللہ! یہ کیا ہو گیا؟ اچھے بھلے گھر میں پھوپی اماں نے آکر یہ کیا طوفان کھڑا کر دیا! کیا نازک سی آپی یہ سب برداشت کر سکیں گی؟ اور اگر عزت کی خاطر برداشت کر بھی لیا تو کیا شوکت بھائی پر یہ ظلم نہ ہوگا؟ وہ بچپن سے ہی آپی کو اپنے تصور میں بسائے ہوئے ہیں۔ اب پاپا کے لئے ان کی فرسودہ آن کے لئے کتنی سنجیدگی سے اپنی قربانی پیش کر دی! میں پاپا کو سب کچھ بتا دوں گی کہ وہ یہ ظلم نہ کریں۔

اس رات بارش شروع ہو گئی اور اتنی زبردست برف باری ہوئی کہ ساری پروازیں کینسل ہو گئیں۔ شوکت بھائی کو بھی اپنا ہوائی ٹکٹ کینسل کرانا پڑا۔ آج جب پھر راستے کھلنے کی خبر آئی دی پرسٹی تو شوکت بھائی بھی اپنا بستر باندھنے لگے۔

"اب کب آئیں گے، شوکت بھائی؟"

میں نے اپنی آواز پر قابو پانا چاہا، لیکن ضبط نہ کر سکی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

بستر باندھ کر وہ خاموشی سے میری طرف مڑے، میری آنکھوں سے آنسو پونچھے اور سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "حنا کی شادی پر!"

میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور میں وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ اس جملے میں نہ جانے کتنا درد تھا کہ برداشت نہ ہو سکا۔ وہ مجھے روتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر پاپا کی آواز پر کھانے کے لئے چلے گئے۔

کچھ دیر بعد گڈو آیا اور کہنے لگا "پاپا بلا رہے ہیں"۔ ایسے میں بھوک کسے تھی۔ لیکن جی نہ چاہتے ہوئے بھی میں امی کے پاس جا بیٹھی۔ سب میکانیکی انداز میں کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی۔ آپی وہاں نہیں تھیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ آپی کو بھی بلا لاؤں کہ پاپا کی آواز پر چونک پڑی۔

"شوکت، تم شام کو جا رہے ہو؟"

"جی خالو جان" شوکت بھائی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"میاں، ہماری بہن حنا کا رشتہ لائی ہیں۔ ان کا لڑکا عارف انجینیر ہے۔ اور میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"

میرا دم حلق میں آ اٹکا۔ میں نے نظر اٹھا کر شوکت بھائی کو دیکھا وہ خالی خالی نظروں سے پاپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک پاپا پھوپی اماں سے مخاطب ہوئے "آپا، دیکھئے آج زمانہ بدل گیا ہے، قدریں بدل چکی ہیں اور پھر رشتے ہمارے آپ کے طے کرنے سے نہیں ہوتے۔ اتنی دور کا معاملہ ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کا الگ مسئلہ۔ آپ میری صحت کا حال دیکھ رہی ہیں نہ جانے کب چراغ گل ہو جائے۔ بڑھاپے میں مجھ سے اتنی دور کے سفر بھی جلدی جلدی نہ ہو سکیں گے۔ آپ بھی تو شادی کے پندرہ سال بعد لوٹی تھیں اور اب پھر دس سال کے بعد آئی ہیں۔ بچی بالکل چھوٹ جائے گی۔ اس لئے اس بات کو میرے خیال میں یہیں ختم کر دیجئے۔"

میں حیران پریشان سی پاپا کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی، جن کے عجیب و غریب فیصلے نے سب کچھ پلٹ دیا تھا۔ شاید آپی کی معصوم محبت پر قدرت کو ترس آگیا تھا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے میں نے شوکت بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ گردن جھکائے بیٹھے تھے لیکن ان کے چہرے پر سیکڑوں شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ ●●

سولھویں قسط

اب تک کی کہانی

آفاق ایک خوب رو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے ایک روز اس پہلے نوجوان کو دیکھا تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے وہ اس کے دفتر میں ملازم ہو گئی۔ مگر آفاق پراس کے حسن اور ادا ؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُلٹا اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا۔

کچھ دن بعد جب آفاق نے فلک ناز کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تو اس کا دل کھل اُٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر سہاگ رات سے ہی فلک ناز کو احساس ہونے لگا کہ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اُڑانے پر تُلا ہوا ہے۔ دن گزرتے گئے اور فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصّے اور نفرت کی آگ تیز تر ہو گئی۔ ایک دن اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ مگر آفاق نے یہ شرط رکھی کہ آزادی پانے کے لئے پہلے اسے ایک اچھی، سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا

آفاق سے نجات پانے کی دُھن میں فلک ناز نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ اس کے سارے ناز نخرے ہوا ہو گئے۔ پھر ایک نیا احساس اس پر شدت کے ساتھ طاری ہونے لگا۔ آفاق چپکے چپکے اس کے دل میں گھر کر چکا تھا اور اب وہ آفاق کو اپنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس دوری کو کیسے ختم کرے جو اس نے خود پیدا کی تھی۔ وہ جی جان سے آفاق کی خدمت کرنے لگی۔ ایک دن وہ آفاق کے سامنے اپنے بیتے دنوں کی کتاب کھول کر بیٹھ گئی جب دولت کے بوتے پر نوکروں کی فوج اس کی خدمت کے لئے حاضر رہتی تھی، لیکن نہ بے پناہ مصروف باپ کی شفقت اسے میسّر تھی، نہ فیشن اور سیر سپاٹے کی دلدادہ ماں کی ممتا۔

بشریٰ رحمٰن (لاہور، پاکستان)

فلکی قیمتی سے قیمتی شے کا جان بوجھ کر نقصان کر دیتی تھی۔ وہ ممی کو ستانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی امی بھی ویسے ہی چلائیں جس طرح دوسرے بچوں کی مائیں اپنے بچوں پر چلاتی تھیں۔۔۔ وہ فیشن بھی کرتی تھیں انگریزی بھی بولتی تھیں۔ میک اپ بھی کرتی تھیں۔۔۔ پڑھی لکھی بھی تھیں۔۔۔ پھر غصہ آنے پر اپنے بچوں پر خوب چلایا کرتی تھیں اور چلانے سے ایک دم وہ مائیں لگا کرتی تھیں۔ ممی تو کبھی نہیں چلاتی تھیں۔ ممی کہتی تھیں غصہ کرنے سے اعصاب سُکڑ جاتے ہیں۔۔۔ چہرے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ موڈ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ جلد کی تازگی اور چہرے کی شگفتگی زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ غصے کو زیادہ سے زیادہ ضبط کیا کرتی تھیں۔ انہیں اپنے چہرے کا بہت خیال تھا۔ وہ ہر وقت مسکرایا کرتی تھیں تاکہ تازہ دم نظر آئیں اور ان کی مسکراہٹ کے آگے ڈیڈی کچھ بھی نہ بول سکتے تھے۔

ممی رات کو سونے سے پہلے اپنے چہرے اور جسم پر مساج کیا کرتی تھیں۔ وہ فلکی کو پیار کرنا بھول جاتیں مگر مساج کرنا نہ بھولتی تھیں

وہ آیا کو حکم دیتی تھیں کہ بچی کو ساڑھے سات بجے سلا دیا کرے۔ کیونکہ سب جلدی سونا پسند کرتے تھے۔ وہ سوچا کرتی تھیں۔ صبح اٹھ کر ممی نہار منہ ایک گلاس پانی میں لیموں کا رس ملا کر پیتی تھیں۔ سردیوں میں ایک چمچ شہد کا ملا لیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنی ایکسرسائز سائیکل پر بیٹھ کر ورزش کیا کرتیں۔ ان کے پاس ورزش کرنے کی بہت سی مشینیں تھیں۔ کبھی ہاتھ الٹے چلاتیں، کبھی سیدھے کبھی ٹانگیں اوپر کبھی نیچے... فلکی دروازے کے پیچھے چھپ کر ممی کے کرتب دیکھا کرتی تھی۔ ڈیڈی نو بجے چار سے اٹھ کر نوکروں پر چلا کر دفتر چلے جاتے... ان کے جانے کے بعد ممی اپنے چہرے پر ایک ماسک لگا لیا کرتیں۔ بالوں کو رولرز لگا لیتیں اور گرم پانی کے ٹب میں بیٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی کافی گھنٹوں تک سپ کرتیں۔

تیار رہنے کے دن تک وہ بالکل تیار ہو جاتیں... کیونکہ ان کے حلقۂ احباب میں کہیں نہ کہیں "کافی پارٹی" یا "برج پارٹی" ہوتی تھی۔ جس دن ایسی کوئی پارٹی نہیں ہوتی تھی اس دن وہ بیوٹی سلیپ لیتی تھیں۔

شام کو جب ڈیڈی گھر آتے وہ سر سے پیر تک تیار ہوتیں۔ شام کو دونوں کلب جاتے تھے اور ڈنر باہر ہی ہوتا تھا۔

کبھی کبھی اگر کسی نے آنا ہوتا تو وہ دونوں گھر رہ جاتے۔

ورنہ اس اتنے بڑے محل میں جس کا نام "فلک بوس" تھا فلکی بادلوں کی طرح پھرتی رہتی — چیزیں توڑتی رہتی... نوکروں کو مارتی رہتی۔

کہیں نہ کہیں سے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہتیں... اور نہیں تو ہر کمرے میں جا کر ریڈیو اونچی آواز میں لگا لیتی۔

اور جب ممی ملک سے باہر چلی جاتیں.... اور اس گھر کے سب درو دیوار گویا بے رنگ ہو جاتے۔ ممی کے دم سے پھر بھی کچھ بہار تھی۔ یہاں کچھ لوگ آتے رہتے... جاتے رہتے... آوازیں آتی رہتیں... فون آتے رہتے... شاپنگ ہوتی رہتی....

ممی کو خوب صورت ملبوسات کا بھی شوق تھا۔ ممی کو ہر شے کی ہوس تھی... سوائے اولاد کے... اور ایک بیٹی کی ماں بننے کے بعد انہوں نے جیسے ڈیڈی کی سات پشتوں پر احسان کر دیا تھا۔

سارا وقت کہتیں "دیکھو میری کمر میں دو انچ کا فرق پڑ گیا ہے۔"

"کہاں... ؟" ڈیڈی ان کی کمر میں ہاتھ حمائل کر کے کہتے "ابھی تک تو تمہاری کمر پورے ایک ہی ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ تم تو

اس دنیا کی لاجواب عورت ہو۔"

اس پر ممی بہت اترا جاتیں۔

ویسے ممی کا دل چاہتا تھا۔ دنیا کے سارے مرد بس ہر وقت ان ہی کی تعریف کرتے رہیں۔ اگر شاعر ہوں تو وہ ان کے قصیدے لکھتے رہیں۔ اگر ادیب ہوں تو ان پر کتابیں لکھتے رہیں۔ اگر مصور ہوں تو ان کی صورت بناتے رہیں۔ اگر موسیقار ہوں تو ان کی مداح سرائی میں راگ الاپتے رہیں۔ ممی چاہتی تھیں ان کے حلقۂ احباب میں ہر شخص ان کا دیوانہ ہو۔ ان کا تذکرۂ حسن ہر زبان پر ہو.... اور پھر ان کے روبرو اس کا اظہار بھی کیا جائے۔ ان کے دوست و احباب ممی کی اس کمزوری سے واقف تھے، اس لئے ممی کی تعریف کرنا نہیں بھولتے تھے۔

ممی حسین تھیں۔ طرح دار تھیں۔... دولت مند تھیں مگر ذہانت کا کونہ بالکل خالی تھا اور وہ اس وقت بڑی مضحکہ خیز لگتیں، جب انٹلیکچول بننے کی کوشش کرتیں۔ اپنے آپ کو فن کار ظاہر کرنے کے لئے وہ انتہائی بے ہودہ پینٹنگز مہنگے داموں خرید لیتیں۔ شاعروں، ادیبوں کے جلسے کرواتیں، موسیقی بھری پارٹیاں دیا کرتیں، مصوروں کی تصویروں کا افتتاح کرتیں۔ دل کھول کر چندہ دیتیں۔ دل کھول کر خرچ کرتیں۔ جہاں ان کا نام ہو رہا ہو، اسی طرف کو الٹ جاتیں۔

ویسے لوگوں نے ان کا نام سدا بہار رکھ چھوڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا جسم اور حسن سدا بہار تھا اس قدر دھیان رکھتی تھیں وہ اپنا۔ ...

بہت عرصے تک وہ اکیس بائیس سال کی ہی نظر آتی رہیں۔ اس میں ان کی کوششوں کا بھی بہت دخل تھا۔

فلکی بڑی ہو گئی مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک آیا رہتی تھی۔ آیا کے جانے کے بعد ممی کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس واسطے وہ آیا کے بہت نخرے اٹھاتی تھیں۔ ایک آیا کے جانے سے پہلے ہی دوسری آیا کا بندوبست کر دیتی تھیں..... وہ جمبو جیٹ میں بیٹھ کر ساری دنیا کا سفر تو کر سکتی تھیں مگر اپنی بچی کو پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں سنبھال سکتی تھیں۔

رفتہ رفتہ فلکی نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ وہی کار، شوفر اور آیا اس کے ساتھ اسکول جاتے۔ اسکول میں وہ کوئی خاص اچھی بچی نہیں تھی۔ بچوں پر ویسے ہی اس کی موٹر کا رعب پڑ گیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب فلکی نو سال کی تھی اور چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ فلکی کی آیا کا داماد مر گیا اور اس کو اچانک

گاؤں چلے جانا پڑا۔ گو ممی نے کہہ دیا تھا کہ وہ دو دن کے بعد ضرور واپس آ جائے مگر وہ واپس نہ آ سکی۔ اس کا خط آ گیا کہ "داماد کے مرنے سے اس کی بیٹی کا دماغ الٹ گیا ہے اور جب تک اس کی بیٹی ٹھیک نہیں ہو جاتی، وہ نہ آ سکے گی۔"

ممی عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گئیں "کم بخت نے نہ تو آنے کے بارے میں صحیح بتایا تھا اور نہ نوکری چھوڑنے سے متعلق صاف الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔" تاہم انہوں نے دو چار دن انتظار کر کے ادھر ادھر دوسری آیا کے لئے کہنا شروع کیا۔

ان ہی دنوں انہوں نے نیا اور نوجوان ملازم رکھا تھا جو ممی کے کپڑے استری کرتا تھا، میز پر برتن لگاتا تھا اور باقی سارا بیروں والا کام کرتا تھا۔ فلکی کو صبح صبح آیا سے تیار ہونے کی عادت تھی۔ صبح صبح خوب چلایا کرتی تھی۔ اس سے ممی کی نیند خراب ہوتی تھی۔ کیونکہ ممی رات کو بارہ ایک بجے سوتی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ انہیں ڈسٹرب کیا جائے۔

انہوں نے شیر خان کی ڈیوٹی فلکی کے کمرے میں لگا دی۔ فلکی کو جانے کیوں شیر خان اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اس طرح فلکی کو دیکھتا کہ فلکی کو ایک دم غصہ آ جاتا تا۔ اسے شیر خان کی نظریں بری لگتی تھیں مگر چلانا فضول تھا۔ ممی نے فلکی کے سارے چھوٹے چھوٹے کام اسی کے ذمے لگا دیے تھے۔

اس رات کلب میں نیو ایئر پارٹی تھی۔ ڈیڈی کو اچانک ایک کاروباری میٹنگ کے لئے کراچی جانا پڑ گیا تھا۔ گو وہ ممی سے بہت معذرتیں کرتے گئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ شام تک لوٹنے کی کوشش کریں گے مگر انہوں نے ممی سے کہہ دیا تھا کہ وہ انتظار میں اپنی پارٹی برباد نہ کریں۔ اگر ڈیڈی واپس آ گئے تو خود ہی کلب پہنچ جائیں گے۔

اس پارٹی کے لئے ممی نے نہایت شاندار ساڑھی منگوائی تھی۔ نیویارک سے وہ ایک منک کوٹ لائی تھیں۔ دوپہر کے کئی گھنٹے انہوں نے بیوٹی ٹریٹمنٹ میں صرف کئے تھے اور شام کو چھ بجے وہ جب نئی طرز کے بال کٹوا کر گھر میں داخل ہوئیں تو فلکی چیخنے لگی۔ اس کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ آج پھر ممی رات بھر کے لئے باہر جانے والی ہیں۔ شیر خان نے جب ممی کی ساڑھی استری کر کے پلنگ پر پھیلائی تو اس نے سارا غصہ اس ساڑھی پر نکالا۔ اپنے گندے ہاتھوں سے مسل دیا۔ اس پر ممی نے پہلی بار اس کے بال نوچے اور برا بھلا کہا۔ ڈرایا بھی، دھمکایا

بھی۔ ممی تیار ہوتی رہیں اور فلکی سسک سسک کر روتی رہی۔ ممی کریمیں لگاتی رہیں۔ اتارتی رہیں... فلکی اپنی بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ممی کو آج نہ جانے دے گی یا خود ان کے ساتھ چل دے گی۔ ممی نے میک اپ کرنے میں اتنی دیر لگائی کہ روتی روتی فلکی سسک سسک کر ان کے بستر پر ہی سو گئی۔

ممی نے جب تیار ہو کر اس کی جانب مڑ کر دیکھا تو اطمینان کی سانس لی۔ بلا خود ہی سو گئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے پارٹی شروع ہونا تھی اور پونے آٹھ بجے ممی گھر سے نکل پڑیں۔ جاتے جاتے انہوں نے شیر خان سے کہا۔

"شیر خان! بے بی کو میرے کمرے سے اٹھا کر اس کے کمرے میں لٹا دو۔ اس کا ہیٹر آن کر دینا اور بے بی کو کمبل اچھی طرح اوڑھا دینا۔ میرے آنے تک تم بے بی کے کمرے میں رہو۔ نیند آئے تو دری قالین پر سو جانا....

اور ہاں... اگر صاحب آ جائیں تو انہیں کلب بھیج دینا۔"

"بہت اچھا حضور۔" یہ کہہ کر شیر خان نے تابعداری سے سر جھکا دیا۔

موٹر گیٹ سے باہر نکل گئی۔ پھر چوکی دار نے گیٹ بند کر لیا۔ شیر خان بیگم صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں بے شمار خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے ابھی دلہن یہاں سے تیار ہو کر گئی ہو۔ اس نے اس خوشبو میں ایک مستی بھرا سانس لیا۔ پھر صاحب کی دراز سے ولایتی سگریٹ نکالے لائٹر اٹھایا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ سگریٹ پینے کے بعد اس نے بیگم صاحب کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹیں ان کے کپڑے اٹھائے۔ تاکی اور پاجامہ نکال کر ہینگر پر لٹکا دیا۔ کمرے کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا۔

پھر ٹی وی لگا کر ایک طرف بیٹھ رہا۔ ٹی وی دیکھ کر جب اس کا دل بھر گیا اور انگریزی فلم میں اسے سوائے ننگی ٹانگوں کے اور کچھ نظر نہیں آیا تو اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ دس بجنے والے تھے لیکن صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ وہ اٹھ کر فلکی کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں اس کا ہیٹر آن کیا۔ بستر ٹھیک سے لگایا۔ اس کے بکھرے ہوئے کھلونے جمع کر کے الماری میں رکھے۔ بے بی نے رات کے کپڑے بھی نہیں پہنے تھے اور اگر بیگم صاحب نے صبح ناشتے پر اسے رات کے کپڑوں میں دیکھ لیا تو قیامت برپا کر دیں گی۔

اس نے بے بی کی نائٹی نکالی اور

پلنگ پر رکھ دی۔ روزنہی وہ اس کو کپڑے بدلوایا کرتا تھا۔ آج سوتے میں بدلوانے گا۔ بس ذرا سا مچلے گی۔

یہ سوچ کر وہ پھر بیگم صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کیسٹ ریکارڈ پڑا تھا۔ ذرا گانے سننے کو جی چاہا۔۔۔ وہ لگا دیا۔۔۔

وہ چار اور سگریٹ پیے۔

گیارہ بج گئے۔ اب تو صاحب کے آنے کی بالکل اُمید نہیں تھی۔ اس نے فلکی کو اٹھایا اور اس کے کمرے میں لے آیا۔

فلکی کے رُخساروں پر ابھی تک آنسوؤں کے داغ تھے۔ سوتے میں ایسا مُنہ بنایا ہوا تھا جیسے ساری دنیا سے رُوٹھ چکی ہو۔ ماشاءاللہ صحت مند بچی تھی۔ ایک نگوڑے نوجوان سے اُٹھائی نہیں جارہی تھی۔ کہنے کو نو سال کی تھی مگر اُٹھان سے بارہ سال کی لگتی تھی۔ بھرا بھرا جسم خوب صورت، سڈول ٹانگیں۔ صحت مند گول چہرہ، آنکھوں میں ظالم چمک، ہونٹ عُنابی جنہیں وہ کاٹ کاٹ کر اور سُرخ کر دیتی تھی۔ سوتے میں اور رونی ہو گئی تھی اور جلنے کس کس انداز سے شیر خان اسے اُٹھا کر لایا تھا۔ دھپ سے بستر پر پٹخ دیا۔

تین بجے شب ممی جھومتی جھامتی پرس جھلاتی گھر میں داخل ہوئیں۔ باہر چوکیدار نے گیٹ کھول کر انہیں سلیوٹ مارا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول کر انہیں نہایت تکریم سے باہر نکالا تھا

"اب تم جاکر آرام کرو۔"

نہایت شاہانہ انداز میں ان پر لطف و عنایات کی بارش کر کے جب ممی نے انٹرنس کے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ خود بخود کھل گیا۔

لاؤنج میں کھڑے ہو کر انہوں نے شیر خان کو دو تین آوازیں دیں۔ جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ٹھک ٹھک کرتی اور گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ کمرہ اپنے معمول کے مطابق بالکل ٹھیک تھا۔ دولہن کی طرح بستر پر سفید چادروں کے ساتھ کمبل بچھے تھے۔ ان کی گلابی نائٹی اور پاجامہ ہینگر پر لٹک رہا تھا۔ گلابی سوفٹ سلیپر بیڈ کے ساتھ پڑے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل صاف ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب ہے شیر خان نے بے بی کو اپنے کمرے میں سُلا دیا ہے۔۔۔ وہیں گلہ۔۔۔

آج کس غضب کی پارٹی تھی۔ یوں تو ڈیڈی کبھی بھی ممی کے کسی مشغلے میں حائل نہیں ہوتے تھے مگر ان کی موجودگی سے خود ممی کو بھی خیال رکھا جاتا تھا۔

آج انہوں نے جی کھول کر اپنے حسن اور جسم کی داد لی تھی۔ پارٹی خوب انجوائے کی تھی۔ بہت خوش تھیں۔۔۔ بے حد سُرور۔! حد درجہ تھک چکی تھیں۔

کپڑے بدلتے ہی بستر میں گھس گئیں۔ گرم گرم بستر میں بڑا سکون ملا۔ اسی وقت انہیں فلکی کا خیال آیا۔ روتے روتے سو گئی تھی، جانے اب کیسی ہوگی؟ شیر خان بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کم بخت وہیں سو گیا ہوگا۔ اُٹھ کر ایک نظر بچی کو دیکھ لیں تو اچھا ہے۔

ممی تو نہیں چاہ رہا تھا، انسان کی عادت میں یہ شامل تھا کہ رات کو اُٹھ کر بچی کو دیکھا کریں۔ جیسے کسی غیبی قوت نے انہیں اُٹھ کر جانے پر مجبور کر دیا۔

شیر خان کیوں غائب ہو گیا؟ یہ بات ممی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انہوں نے باقی نوکروں کے رُوبرو اس بات کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ انہیں خوشی تھی کہ اس رات گھر میں اور کوئی نوکر نہیں تھا۔ آیا بھی نہیں تھی اور ڈیڈی بھی نہیں تھے۔ ڈیڈی اتفاق سے دو دن بعد آئے۔

فلکی اسی طرح بیمار تھی اور ممی کے کمرے میں لیٹی رہا کرتی تھی۔ ممی زیادہ تر اسے سونے کی دوا دے کر سلا دیا کرتی تھیں مگر جب وہ جاگتی تو چیخنے چلانے لگتی۔

وہ اپنے کپڑے پھاڑتی اور چیخ کر کہتی۔

"مجھے بچاؤ۔۔۔ مجھے بچاؤ۔۔۔ ممی مجھے بچاؤ۔۔۔"

"ممی اسے کہہ دو، مجھے نہ چھوئے۔"

"ممی، مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ممی، مجھے اپنے پاس سُلا لو۔"

ڈیڈی اس کی اس حالت سے پریشان ہو گئے تو ممی نے انہیں سمجھا دیا۔

"آیا کے ساتھ بہت ہلی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اُداس ہو گئی ہے۔ ایک رات سوتے میں ڈر گئی تھی اس لئے میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی ہوں۔۔۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تم اس کے لئے جلدی کسی آیا کا بندوبست کر دینا۔"

"دیکھ رہی ہوں۔ اب اس زمانے میں بغیر سوچے سمجھے نوکر نہیں رکھے جا سکتے۔"

"اور وہ کم بخت شیر خان کیوں بھاگ گیا کچھ پتہ چلا۔۔۔ گھر کی دیکھ بھال کر لیتیں کہیں کوئی قیمتی چیز چُرا کر نہ بھاگ گیا ہو۔"

"میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔" ممی سر جھکے ہوئے کہتیں۔ کم بخت کو جانا تھا چلا گیا۔"

۲

حالانکہ ممی جانتی تھیں کہ وہ اس گھر کی سب سے قیمتی چیز چُرا کر بھاگ گیا۔

لیکن فلکی آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے کے بجائے اور خراب ہوتی گئی۔

اس نے کھیل کود میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔

وہ اسکول جانے سے گھبراتی، جب کسی نئے آدمی کو دیکھتی، چلانے لگتی۔ اپنے کمرے میں اکیلی نہ بیٹھتی۔ اگر کوئی پاس سے بھی گزر جاتا تو چلانے لگتی۔ کوئی بُلا کر پیار کرنے لگتا تو اس کے بال نوچ لیتی۔ سارا وقت چُپ چاپ بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی۔ رنگ مُرجھا کر زرد ہو گیا تھا زیادہ تر ممی کے کمرے میں گھسی رہتی۔ بات بات میں روتی کسی سے بات نہ کرتی اور خاص طور پر نوکروں کے تو قریب ہی نہ جاتی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کوئی ہیبت ناک واقعہ آکر ٹھہر گیا تھا اس لئے اس کی خوب صورت آنکھیں وحشت زدہ ہو گئی تھیں۔ پھٹی پھٹی اور دیوانہ سی آنکھیں۔۔۔ ڈیڈی کہتے۔

"یہ بیٹھی خلاؤں میں کیا دیکھا کرتی ہے کہ آنکھیں جھپکنا بھی بھول جاتی ہے۔"

ممی کہتیں۔

"بچوں پر مختلف سٹیجز آتی ہیں۔ ان کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔"

ممی اسے باقاعدہ ماہر نفسیات کے پاس لے جایا کرتیں۔ اس کو پھر ایک نارمل بچی بنانے پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ بلکہ اپنی طبیعت کے خلاف اسے زیادہ تر اپنے ساتھ بھی رکھتی تھیں۔ مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ڈرپوک تو اس قدر ہو گئی تھی کہ بلی بھی قریب سے گزر جاتی تو ڈر کر چلانے لگتی۔

اسکول کی اُستانیاں شکایتیں لکھ کر بھیجا کرتیں کہ یہ تو وہ بچی نہیں، خوش باش، خوش لباس، اور

AGGRESSIVE

ہر وقت ڈری سہمی ایک کونے میں بیٹھی رہتی چھٹی کے وقت دوڑ کر گاڑی میں آ بیٹھتی اگر ڈرائیور بازو سے پکڑ کر اتارنے لگتا تو چلانے لگتی۔ کہتی:

"اس نے مجھے چھوا کیوں ہے؟"

شام کو ممی گھمانے کے لئے لے جاتیں تو وہ کار کے شیشے چڑھا لیتی۔ کوئی فقیر بھی شیشے پر دستک دیتا تو چیخنے لگتی۔

بار بار خواب میں ڈر جاتی جھٹکے میں ایک بار بخار آ جاتا۔

بانو شیخ دہلی

ٹھیک تھا وہ اپنی کلاس میں فیل ہو گئی۔ اسکول سے بددل ہو گئی۔ انسانوں سے مُنہ موڑ لیا۔ اور الماریوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھی رہتی۔ موسم بہار میں ممی اسے اپنے ساتھ یورپ لے گئیں۔ اس بار ممی نے یہ ٹرپ فلکی کے لئے پلین کیا تھا۔

بچے فرشتے ہوتے ہیں اور فرشتوں کی روح داغدار کر دی جائے تو ان کے پنکھ ٹوٹ جاتے ہیں۔

فلکی کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے۔

اور یہ بات بڑی وضاحت سے ممی نے ہر ڈاکٹر، ہر پروفیسر کو بتائی تھی کیوں کہ وہاں کوئی حجاب نہ تھا اور وہاں ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے تھے۔

ڈاکٹروں نے ممی کو مشورہ دیا کہ کچھ عرصہ فلکی کو اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دُور رکھا جائے اور ہر ممکن کوشش کی جائے کہ وہ اپنی زندگی کا یہ دل خراش واقعہ بھول جائے۔ بچوں کے ذہن میں گرہ پڑ جاتی ہے اور آپ لوگ ذرا جذباتی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہ دیں اور یوں اظہار کریں جیسے کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی۔

ممی نے وہ ایک سال ملک سے باہر ہی گزارا۔ فلکی کو خوب سیریں کرائیں۔ خوب فلمیں دکھائیں۔ ساحل سمندر پر بھی لے جایا کرتیں۔ کاسٹیوم پہن کر خود بھی نہایا کرتیں اور اسے بھی طریقے طریقے سے بتاتیں کہ عورت چونکہ خوب صورت چیز ہے اس لئے اس کا بے نقاب اور بے حجاب ہونا ہی بہتر ہے۔

مگر فلکی کا معصوم اور کچا ذہن ممی کا فلسفہ نہیں سمجھ سکتا تھا مگر اس کا دل بہلتا جا رہا تھا۔ دنیا کے رنگ روپ میں وہ اپنی مسل ہوئی صورت بھولتی جا رہی تھی ممی اس کے چہرے پر مسکراہٹوں کی نمی کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھیں۔

پورے ڈیڑھ سال بعد ممی واپس آئیں تو فلکی پہلے سے زیادہ تنو مند اور بڑی لگتی تھی۔ اس کے لمبے سنہرے بال اس کے گلے میں جھول رہے تھے اور وہ آسٹریلیا کے ساحلوں کی خوش خرام اور خوش ادا بے فکری سی حسینہ لگتی۔

واپس آکر ممی نے اسے ایک نئے اسکول میں داخل کر دیا۔ نئی لڑکیاں، نیا ماحول، نیا اسکول۔۔۔ اور اسکول بھی امریکن تھا۔ فلکی کا دل لگ گیا۔ ویسے ممی نے ایک اور کام بھی کیا۔

شام کو فلکی کو باقاعدہ کلب لے جاتیں۔ وہاں سب لوگ اسے باقاعدہ ہاتھ

تھے۔ ایک تو نازلی صدرالدین کی بیٹی۔ اس
پہ اتنی عجیب صورت اور شوخ....
کبھی ڈیڈی کے ساتھ گولف کھیلنے جاتی اور
وہ سنہرے بال جھلاتی گیند کے پیچھے دور
دور تک جاتی۔
کبھی ممی کو بلیرڈ کھیلتی دیکھتی اور وہ
ممی کے دوستوں کے کندھوں پر یا گھٹنوں
پہ سوار رہتی۔
اس کلب میں گھوڑ سواری کا بھی
بندوبست تھا۔ شام کو بابا عرف ایک سائیس
اسے گھوڑ سواری کرانے لے جاتا کبھی کبھی
اسے کسی انکل کو ساتھ کر دیتیں۔
اس کلب میں بے شمار انکل اور بے شمار
آنٹیاں تھیں۔ کلب کی دنیا فلکی کو بہت پسند
آئی۔ کوئی کسی بات کو برا یا معیوب نہیں سمجھتا
تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کلب خوش باش اور
خوش فکروں کی ایک الگ سی دنیا ہے۔
ممی کسی انکل سے کہہ دیتیں۔
"بے بی رو رہی ہے، پلیز اس کو ڈانس سکھا دو۔"
کسی سے کہتیں۔
"اسے وائلن بجانا سکھا دو۔"
کوئی انکل اسے گاڑی چلانا سکھاتا۔
کوئی کیرم بورڈ کے داؤ پیچ سکھاتا۔
کوئی کوک پلانے لے جاتا۔
بے شمار انکلوں کی گودیوں میں ہنستی کھیلتی
فلکی جوان ہو گئی تھی۔
اس نے آنکھ ہی کلب میں کھولی تھی۔
میٹرک کرتے ہی کالج میں داخل ہو گئی۔
مگر دوسری سب لڑکیوں سے مختلف
رہی۔
ممی نے اس کے ذہن میں ڈال دیا تھا کہ
عصمت کا تصور ایک فرسودہ روایت ہے۔
عصمت کوئی شے نہیں ہوتی۔ زندگی کی بہت
سی خوشیاں حاصل کرنے کے لئے اس
حد کو توڑ دینا چاہئے۔ اتنا کچھ حاصل
کرنے کے لئے کچھ تھوڑا بہت گنوانا بھی
پڑتا ہے۔ اس روشن زمانے کے ساتھ چلنے
کے لئے روشنی کو اپنے ساتھ لے کر چلنا
چاہئے۔ اندھیرے پیچھے چھوڑ دینے چاہئیں۔
فرسودہ روایات ...
فرسودہ تصورات ....
شرم کی ساری باتیں، ممی نے اسے ان سب سے
نفرت کرنا سکھایا تھا۔ انہوں نے بچپن کا ایک
دماغ دھونے کے لئے فلکی کا سارا فلسفۂ حیات
ہی بدل دیا تھا۔
"محبت کرو اور محبت کراؤ۔"
"کم عقلوں کے ساتھ جیو۔"
"جس چیز سے جی بھر جائے اسے
چھوڑ دو۔"
"اس کے لئے اپنی زندگی دوبھر نہ کرو۔"

یہ ممی کے اصول تھے۔ ممی کے کئی دوست
فلکی کو بہت لپٹا کر لے تھے۔ انہوں نے
وقت سے بہت پہلے فلکی کو بتا دیا تھا کہ
وہ کون سی قیامت اٹھانے والی ہے۔
کئی لوگ تو ممی کے سامنے ہی اس سے اظہار
عشق کرتے۔ مگر کبھی ممی نے برا نہیں مانا بلکہ
جب لوگ کہتے۔
"مسز صدرالدین! ہمیں تو ابھی تک
سمجھ نہیں آئی آپ دونوں میں سے کون زیادہ
حسین ہے؟"
تو نازلی صدرالدین بڑی ادا سے قہقہہ
لگاتیں۔ انہیں یقین تھا وہ ہمیشہ فلکی سے زیادہ
حسین اور طرح دار رہیں گی۔ اس لئے وہ فلکی سے
حسد محسوس نہیں کرتی تھیں۔ کالج میں بھی فلکی کو
بہت آزاد قسم کا ماحول ملا۔ ایک موٹر، بے شمار
ملبوسات، فالتو پیسے، پارٹیاں، رنگین فلمیں
اور لو افیئرز۔
زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو اپنے عشق
میں مبتلا کرنا اور تڑپانا فلکی کا محبوب مشغلہ
بن چکا تھا۔
جب ممی نے کوئی روک ٹوک بھی نہ
رکھی اور صاف کہہ دیا کہ عصمت کوئی چیز
نہیں تو پھر فلکی اپنے سفلی جذبات کے منہ زور
پر ہاتھ کیوں رکھتی؟ انگریزی ناولوں اور
انگریزی فلموں نے سونے پر سہاگے کا کام
کیا۔
تن کی دولت لٹاتے ہوئے اسے کبھی
دکھ نہ ہوا اور من کی آنکھیں کھول کر دیکھنے کی
اسے آرزو نہ تھی۔
وہ حسین تھی....
جوان تھی ......
دولت مند تھی.....

لطف انجوائے کرنے کے لئے
ممی اور ممی نے کہا تھا۔ جوانی کے درخت پر
بار بار ثمر آتا ہے اور بار بار اس سے لطف اندوز
ہونا چاہئے۔
یوں ...
لاعلمی میں ...
جہالت میں ..
یا بے محابا آزادی کے نشے میں ...
وہ ہر تار یا جوڑ ہوتا تھا ......
اسے کیا پتہ تھا، محبت کیا شے
ہے؟ شوہر کسے کہتے ہیں؟ شادی کا پھندا
کیوں بنایا گیا ہے؟
شادی کا مقصد کیا ہے؟
گھر بار کسے کہتے ہیں؟
بچے کیوں ضروری ہیں؟
اور یہ گھر داری ... !
اور یہ آگہی ... ادراک ... عرفان ...

یہ سب ... یہ سارے راز تو پُراسرار
میں آ کر کھلے ... یہ راز داں تنہائی نے اسے زندگی
کی آگہی دی ... تو پھر اس کے لاشعور کے
بند روزن خود بخود کھل گئے۔
یہاں وہ تنہا رہتی تھی اور سوچتی تھی۔
تنہائی میں ذہن ایک ایسی مشعل بن
جاتا ہے جس کی روشنی دور تک جاتی ہے
جہاں جہاں وہ اس روشنی کو ڈالتی، واقعات
چھپے ہوئے ملتے۔ وہ انہیں کریدتی، آگے
بڑھ جاتی۔
اس نے اپنے بارے میں اس قدر
سوچ لیا تھا کہ اس کے ذہن میں اس کی گزشتہ
زندگی کی ایک مربوط کہانی بن گئی تھی۔ تب
اسے اپنا آپ بڑا گھٹیا اور ہیچ نظر
آنے لگا تھا۔ آفاق ایک عظیم دیوتا نظر
آتا ... اور وہ ایک حقیر ذرہ ... پاؤں
کی ٹھوکر ...
شاید وہ سب کچھ اپنے دل میں رکھتی ..
مگر ایک دن ....
ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا
ساتھ بہت سی خوشبو بھی لایا ....
اس جھونکے نے پٹ سے ایک نیا
دروازہ کھولا۔
اسے آواز آئی۔
جن کو عزیز جانتے ہیں ... جن کے آگے
سجدے کرتے ہیں جن کو اپنا دین و ایمان
سمجھتے ہیں۔ ان سے کچھ نہیں چھپاتے۔ داغ
داغ دل اور تار تار دامن ان کے آگے
پھیلا دیتے ہیں۔ ان سے رحم کی بھیک
نہیں مانگتے .... ان کے فیصلے پر اپنی زندگی
کا رخ موڑ لیتے ہیں ....
یہ تو ضرور ہے کہ وہ آفاق کے قابل
نہیں تھی۔ مگر آفاق کا دل کتنا عظیم تھا
یہ جاننے کی بہت ضرورت تھی۔
اور پھر محبت میں حاصل کرنا ہی معراج
نہیں ہے۔ اپنے ہاتھوں لٹ جانا بھی ایک
منزل ہے۔ خدا سے کوئی پردہ نہیں ... پھر
ناخدا سے پردہ کیوں ہو۔
جب خدا کے آگے گناہوں کا اعتراف
کر لیتے ہیں تو پھر ناخدا کے آگے لغزشوں کا
اعتراف کیوں نہ کیا جائے؟
پہلی بار ٹھوکر کیا کھائی تھی؟
پہلی بار وہ کہاں گری تھی؟
پہلی چوٹ کا رد عمل کیا تھا؟
آخر ایک دن اسے سہارا مل ہی گیا ...
اور پھر اس نے من و عن سب کچھ آفاق کو
بتا دیا .... ایک ایک بات ... ایک ایک لفظ۔
جب اس کی بات ختم ہوئی تو صبح کی
اذان ہو رہی تھی۔
آفاق اپنی سوچی سوچی آنکھوں سے

اس کے روتے روتے چہرے کو دیکھ رہا
تھا۔ اسے فلکی بالکل نئی اور بدلی بدلی سی
لڑکی لگ رہی تھی۔
آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس
بدلی ہوئی لڑکی کو وہ اپنے کلیجے سے لگا لے
... مگر ... وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑا
ہوا اور آ کر اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور بولا۔
"آپ نے کبھی نماز پڑھی ہے؟"
حیرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے
ہوئے فلکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"نماز پڑھنے سے بھی اتنا سکون
ملتا ہے، جتنا گناہوں کا اعتراف کرنے
سے۔"
"مگر میں نے تو کبھی نماز نہیں پڑھی
... اب اللہ میاں کیا کہیں گے؟"
"اللہ میاں کچھ نہیں کہتے ... اللہ کا
در ہمیشہ کھلا رہتا ہے ... وہ کبھی اپنے
بندوں سے مایوس نہیں ہوتا ... اور چاہتا
ہے بندے اس کو پکاریں۔ نماز آتی ہے؟"
"جی ..." اس نے نظریں جھکاتے
ہوئے کہا۔
"آئیے، آج میرے ساتھ نماز
پڑھیے۔"
فلکی جب وضو کر کے لاؤنج میں آئی
تو سنہری اور کاسنی پو پھوٹ رہی تھی۔
آسمان کے سرمئی کناروں سے پُرنور بادل
کھنچے اور بکھرتے جا رہے تھے۔
تب یکایک اس کے دل میں درد سا
ہونے لگا۔
"کیا ... کیا ... خدا اس نورانی صبح
میں پوشیدہ ہے۔ کیا ... کیا ... خدا یہیں
آس پاس ہے ... دل میں ہے۔ کہاں ہے۔
فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن ...."
جب فلکی نماز پڑھ کے لاؤنج میں
آئی تو آفاق کے کمرے سے تلاوت کی بڑی
دل سوز آواز آ رہی تھی۔

فلکی کی آنکھ کھلی تو اس نے ارد گرد
دیکھا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دوپہر کا سماں
تھا۔ دھوپ گھر کے صحن کو پار کر گئی تھی۔
دن بھی معمول کے مطابق معروف سا دکھائی
دے رہا تھا ... مگر وہ ابھی تک سو رہی
تھی بلکہ ابھی ابھی اٹھی تھی۔ وہ جلدی سے
اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے کمرے کے بجائے
ٹی وی لاؤنج میں سو رہی تھی۔
لاؤنج میں وہ کیسے پہنچ گئی ... کیا رات
پھر کوئی لڑائی ہوئی تھی؟
نظر ادھر ادھر گھما رہی تھی تو اس کی
نظر سرہانے پڑی جائے نماز پر پڑی۔
جب اس نے خود ہی تہہ کر کے سرہانے کی

دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ ایک بج رہا تھا۔

"اچھا، تم اب جاؤ۔"

عبدالکریم چلا گیا۔

اور فلکی گرم گرم چائے کے ساتھ بالکل بچکانی سوچوں میں گم ہو گئی۔

اسے رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

پتہ نہیں، یہ کیا رات کو ہوا تھا... کیا تھا یا حقیقت... لیکن خواب تو نہیں تھا۔

سالہا اتنی بہادر کیسے ہو گئی کہ اس نے آفاق کو اپنی زندگی کی ایک ایک بات بتا دی... یعنی ناممکن ممکن ہو گیا تھا۔

اگر وہ دیر سے دم سادھ لیتی تو اسے کبھی یقین نہ آتا کہ وہ اتنا بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھا چکی ہے۔

لیکن اسے پچھتاوا نہیں تھا... ہاں آفاق کا ردِ عمل جاننے کی بے چینی ضرور تھی۔

کیا وہ آفاق سے رحم کی بھیک مانگنا چاہتی ہے؟

چ چ... ہرگز نہیں... اس کے دانستہ اعتماد کیا عشق رحم کی بھیک نہیں مانگتا۔

عشق ترحم سے بالاتر ہوتا ہے... رحم اور محبت میں بڑا فرق ہے... کوئی عورت محبت کے بدلے ترس نہیں لینا چاہتی... رحم کے سہارے زندگی گزر سکتی ہے... مگر جیا نہیں جا سکتا۔

خدا کی قسم اس نے رحم کی خاطر یہ کہانی آفاق کو نہیں سنائی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ سارے پردے سارے حجاب اٹھ جائیں۔

وہ آفاق کو بتا دے کہ واقعی وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اس کا ماضی داغ دار ہے۔

اس کا دامن تار تار ہے۔

اور اگر آفاق اس سے اور بھی نفرت کرے تو وہ برداشت کر سکتی ہے۔

اگر آفاق کی نفرت کچھ اور دل جلانے والے انداز اختیار کرے تو وہ بھی سہہ لے گی۔

وہ آفاق کو بتا دینا چاہتی تھی... کہ وہ ایک بالکل نئی لڑکی بن گئی ہے۔

نفرتوں کی فصیل پر وہ محبت کی شمع جلا کے جلائے گی... اور جلتی رہے گی۔

عشق بے طلب ہوتا ہے۔ عشق بے غرض ہوتا ہے۔ عشق کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ جلنا اور آہ نہ کرنا اس کا مسلک ہوتا ہے۔

اور پھر ایک بڑی حقیقت اس پر عیاں ہو گئی تھی جسے وہ زندگی کا حاصل سمجھتی تھی... وہ جان گئی تھی... کہ مرد کے ساتھ رہنے کے لئے عورت کو جیتنا پڑتا ہے۔

مرد چاہتا ہے کہ مسلسل جدوجہد سے عورت، اس میدان میں اس کو جیتے۔ وہ مالِ غنیمت کی طرح کسی بھی عورت کی جھولی میں گرنے کو تیار نہیں ہوتا... وہ ایک کوہِ گراں ہے۔

عورت کو کوہ پیما بننا پڑتا ہے۔

راستے کی صعوبتیں اور موسموں کے مقابلے کرنا پڑتے ہیں۔

مرد ایک قلعہ ہے۔

اور عورت ایک زیرک جنرل کی طرح اس قلعہ کو تسخیر کرنا پڑتا ہے۔

قلعے صرف محاصرہ کرنے سے فتح نہیں ہو جاتے۔

جنگ کرنے کے لئے تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور اسے مرد کی خاطر جذبات اور عقل کی بے شمار جنگیں لڑنا پڑتی ہیں

کبھی عورت پسپا ہوتی ہے۔

کبھی شہید ہوتی ہے۔

کبھی غازی بنتی ہے۔

تب کہیں جا کر وہ اس قلعے کی مالک بنتی ہے۔

مرد ایک سلطنت ہے... ایک راجدھانی ہے۔

بغیر قربانی دیئے کوئی عورت اس تخت و تاج کی وارث نہیں بن سکتی۔ اس مرد پر حکومت کرنے کے لئے عورت کو سیاست، مصلحت، فراست، خدمت، اطاعت اور محبت کی فوجیں لے کر میدان میں اترنا پڑتا ہے...

جہاں کہیں غلط منصوبہ بندی کی وہیں پر زندگی کی شکست مقدر بن جاتی ہے۔

مرد چاہتا ہے۔

اسے باقاعدہ فتح کیا جائے، تسخیر کیا جائے۔ اس کے لئے آگ کے دریا پار کئے جائیں۔

اس کے لئے جیا جائے۔ اس کے لئے مرا جائے۔

صرف نکاح کے دو بولوں کے عوض وہ اپنا آپ کسی عورت کے حوالے نہیں کرتا۔

اور اب فلکی آفاق کو تسخیر کرنا چاہتی تھی۔

کشمکش کا دور گزر گیا تھا۔

انا اور پندار کے بت ٹوٹ گئے تھے۔

حسن کی آن بان اور جوانی کی اکڑ فوں رخصت ہو گئی تھی۔

بے عقلی اور بے چارگی کے دن بیت گئے تھے۔

فلکی کے ذہن کے سارے گوشے روشن ہو چکے تھے۔ وہ ایک دم سیانی ہو گئی تھی۔

اسے حسن کی چوکھٹ پر عشق کی لبیک

نہیں چاہئے تھی۔

وہ آفاق کی ضرورت بن جانا چاہتی تھی۔

ایسی ضرورت جس کے بغیر زندگی گزر نہیں سکتی۔

کوئی سگریٹ پیتا ہے۔ کوئی پان کھاتا ہے۔ کسی کو شراب لگ جاتی ہے۔ کسی کے دن کی ابتدا اخبار کے بغیر نہیں ہوتی۔

کتنے فضول نشے ہیں... جن کو انسان نے اپنی کمزوریاں بنا رکھا ہے۔

کہتے ہیں عادت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے

فلکی آفاق کی فطرتِ ثانیہ بن جانا چاہتی تھی اور وہ جانتی تھی کہ

"اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ"

محنت سے وہ گھبراتی نہیں تھی بلکہ اس نے کمرِ ہمت باندھ لی تھی... اور ایسا لگ رہا تھا... آج ہی اس نے طویل سفر کا ارادہ کیا ہے۔

آہستہ آہستہ اس نے سارا ناشتہ ختم کیا۔

پھر بھی جیسے اس کے دل میں کچھ بدلی ہوئی تھی۔ ممکن ہے آفاق دوپہر کے کھانے پر آ جائے۔

اور... اور وہ اس کا ردِ عمل دیکھ سکے۔

ناشتے کے بعد فلکی نے سوچا، وہ نہا دھو کر کپڑے بدل لے۔ ذرا ڈھنگ سے اپنا آپ سنوار لے۔

مسلسل بجتی ہوئی فون کی گھنٹی نے فلکی کو جگا دیا۔ دوپہر کو جب نہا دھو کر وہ تازہ دم ہو گئی تو گیلے بالوں سمیت بستر پر لیٹ گئی تھی۔ جانے کب جھپکی آ گئی... اب جو نیند کھلی تو وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی... اور کوئی ملازم قریب نہیں تھا۔

"ہیلو!"

اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا تو آفاق بولا۔

"فلک کیا بات ہے؟ کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں تو..."

"پھر آپ کی آواز بھاری کیوں ہے؟"

"میں سو رہی تھی۔"

"کیا صبح سے اب تک...؟"

"جی نہیں۔" فلکی نے ہنس کر کہا۔

"دوپہر کے کھانے پر آپ کا انتظار کرتی رہی... آپ نہیں آئے تو پھر سو گئی۔"

"ہاں، مجھے افسوس ہے۔ میں آج دوپہر کو کھانے پر نہیں آ سکا۔ اب اطلاع دے رہا ہوں۔"

فلکی نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا شام کے پانچ بج رہے تھے... دوپہر تک آفاق نہیں آیا تو اسے طرح طرح کے وسوسوں نے ستایا۔

"آج ہمارا کاروباری لنچ تھا۔ صبح جب میں آیا تو آپ سو رہی تھیں، اس لئے نہ بتا سکا... اور اب ابھی میٹنگ سے فارغ ہو کر ابھی آیا ہوں۔ سوچا آپ کو اطلاع دے دوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" فلکی نے آہستہ سے کہا

"مجھے معلوم نہیں تھا، اس لئے میں دیر تک آپ کا انتظار کرتی رہی۔"

"آپ نے کھانا کھا لیا؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"جی... وہ... ایک بات تو یہ ہے کہ میں نے ناشتہ ہی ایک بجے کیا تھا۔ پھر سوچا، جب آپ آئیں گے تو کھانا کھا لوں گی... اور... پھر سو گئی۔"

"اب بھی آپ کو میرا انتظار ہے یا نہیں؟"

"انتظار تو آخری سانس تک رہتا ہے آپ جانتے ہیں۔"

"اور کسی کے آ جانے سے یہ خوبصورت کیفیت ختم ہو جاتی ہے... ہے نا؟"

"نہیں۔" فلکی ہنس پڑی۔

"بعض اوقات کوئی پاس بھی بیٹھا ہو تو یوں لگتا ہے... اس کا انتظار ہے۔"

"کون سی کیفیت اچھی لگتی ہے آپ کو؟"

"جس میں بے کلی ہو۔"

"یعنی کوئی پاس بھی ہو اور دور بھی ہو۔"

فلکی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کا رواں رواں جاگ اٹھا۔ دل بولنے لگا۔ زبان گنگ ہو گئی۔

"کوئی دور ہی کب ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر فلکی نے جلدی سے فون رکھ دیا۔

جو کچھ اس نے کہہ دیا تھا، اس کا ردِ عمل نہیں جاننا چاہتی تھی۔ اپنے آپ سے ڈر رہی تھی۔

ریسیور رکھ کر نہیں تم ضم کھڑی رہی۔ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ آفاق سوچتے ہوں گے کہیں نے بھی ماڈرن لڑکیوں کی طرح فلمی انداز اختیار کر لیا ہے۔

اسی وقت گھنٹی دوبارہ بجی۔

اس نے آہستگی سے ریسیور اٹھا لیا۔

"بھئی، میں نے آپ کو یہ بتانا تھا کہ آج رات کی فلائٹ سے اسحاق آ رہا ہے۔"

"اسحاق... یعنی آپ کا بھائی؟"

"ہاں، ہاں..." آفاق نے کہا۔ "آج بھائی جان کی ٹیلیکس آئی ہے کیا آپ انہیں لینے ایئرپورٹ جا سکیں گی؟"

"میں تو انہیں پہچانتی بھی نہیں۔"

"وہ آپ کو پہچان لے گا۔"

"مگر میں کیسے جاؤں گی؟"

"ڈرائیور کے ساتھ۔"

"کتنے بجے جہاز آئے گا؟"

"رات ساڑھے نو بجے۔"

"نہیں" وہ ایک دم بولی۔ "آپ خود ہی لے آئیں۔ میں گھر پر رہوں گی اور کھانے کا بندوبست کروں گی۔"

"میں آ جاؤں آپ کو لینے؟"

"جی نہیں۔ میرا گھر پر رہنا ضروری ہے۔ اس کے لئے کمرہ ٹھیک کرانا ہوگا۔ آپ خود ہی لے آئیں جا کر۔"

"اچھا..." آفاق کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "میں نو بجے دفتر سے اٹھوں گا، پھر ایئرپورٹ چلا جاؤں گا۔ ہمیں ذرا آنے میں دیر ہو جائے گی لیکن ہم کھانا گھر پر کھائیں گے۔"

"جی بہت اچھا۔"

"خدا حافظ۔"

آفاق نے فون بند کر دیا۔

فلکی نے عبدالکریم کو آواز دی... لیکن پھر خود ہی باورچی خانے کی طرف چل دی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب آفاق کی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ فلکی نے ٹی وی ہلکا کر دیا اور کھڑی ہو گئی۔

آج وہ بطور خاص تیار ہوئی تھی۔ گلابی کے اودے پھولوں والا گلابی سوٹ اس نے پہنا تھا۔ اس کے بال کافی لمبے ہو گئے تھے۔ ان کی ایک ڈھیلی سی چٹیا باندھ لی تھی۔ ایک چٹیا میں وہ بہت کم سن اور معصوم دکھائی دیتی تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ پیاری سی خوشبو لگائی۔ آنکھوں میں ذرا سا کاجل بھی لگا لیا۔

یہ اہتمام اس نے اس لئے کیا تھا کہ اسحاق ان کے اندرونی حالات بالکل نہیں جانتا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی سادگی سے کوئی غلط قسم کا اندازہ لگائے۔

انٹر فس کا دروازہ کھول کر وہ پورچ میں آئی تو وہ دونوں کار سے اتر آئے تھے اور چلتے ہوئے اسی کی طرف آ رہے تھے۔

ان دونوں کے قد برابر تھے لیکن حلیے میں واضح فرق تھا۔

اسحاق اکہرے بدن کا دبلا پتلا سانولا سا تھا۔ چہرہ بھی آفاق سے زیادہ گورا تھا۔ غالباً امریکہ میں رہنے کا اثر تھا۔ مگر سر کے بال لمبے لمبے... لمبی لمبی قلمیں، بڑی بڑی مونچھیں۔ وہی امریکہ پلٹ لڑکوں والا حلیہ تھا۔ شوخ رنگوں کی دھاری دار شرٹ پر اس کے گلے میں ایک لاکٹ پہنا ہوا تھا۔ نیلے کھدر کی ابھرتی ہوئی سلوٹوں والی پینٹ تھی جس کے گھٹنوں اور جیبوں پر چمڑے کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔

اس حلیے کے لڑکے اس نے پاکستان میں بھی دیکھے تھے..... بلکہ اس کے حلقہ احباب میں بھی تھے۔

آفاق کے ساتھ اسے دیکھ کر فلکی کو جدید اور قدیم کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔

حالاں کہ آفاق اور اسحاق میں پانچ سال کا فرق تھا۔ یہ اسے ایک دن آفاق نے بتایا تھا لیکن حلیے سے پوری ایک نسل کا فرق لگ رہا تھا۔

آفاق اس کے سامنے بہت سنجیدہ اور بردبار لگ رہا تھا۔

رنگت بھی اسحاق کے مقابلے میں سانولائی ہوئی تھی۔

مگر وہ پھر بھی فلکی کو اچھا لگ رہا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اسحاق کے حلیے والے لڑکوں کو پسند کرتی تھی۔

مگر اب.....

متین، سنجیدہ، باوقار اور آفاق کی طرح لئے دیئے رہنے والے لوگ اس کا آئیڈیل بن چکے تھے۔

اسحاق اسے دیکھ کر فوراً پیشوائی کو بڑھا... اور پھر دونوں ایڑیاں جوڑ کر بڑی شوخی سے اس نے ایک عدد سلیوٹ کھینچ مارا۔ فلکی ہنسنے لگی۔

"بھئی سلیوٹ کا جواب تو دیں۔"

اسحاق نے جھک کر کہا۔ "میرے سر پر ہاتھ پھیریں۔ کمر سہلائیں۔ پوتوں، نواسوں کی دعائیں، کیسی بھابی ہیں آپ؟"

فلکی نے سر جھکا لیا اور ہنسنے لگی... ہنسے گئی... وہ ہنستی جاتی اور شرم سے دوہری ہوئی جاتی۔

آفاق نے دروازہ کھول دیا اور سب اندر چلے۔ ملازم نے اسحاق کا سامان اٹھا لیا... اور اس کے کمرے میں لے گیا۔

"آپ پہلے چائے پئیں گے یا کھانا..."

"بھئی پہلے کھانا لگوا دو۔ دوپہر میں بھی میں ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکا تھا" آفاق نے کہا۔ "اب ہوٹلوں کی دعوتیں کھائی نہیں جاتیں۔ آپ نے گھر پر کھانے کی عادت ڈال دی ہے۔ کھانے کے بعد کافی پئیں گے۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ باورچی خانے کی طرف چل دی۔

(اس سے آگے [illegible])

حامد رضا، بیڑ (مہاراشٹر)
کون کرتا یہاں وقت کے کانٹے کا علاج
لوگ تو زخم کو ناسور بنالیتے ہیں
(نامعلوم)

[illegible] ریواڑی (ہریانہ)
ملی جو دل سے جو سجدہ تو اس سجدہ کے کیا کہنے
میں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی
(نامعلوم)

محمد ظہیر الدین ساحر - نرمل
غزل تمام ہوئی حسن پہ لگے پہرے
[illegible] پھر بھی شاعرانہ رہا
(قتیل شفائی)

محمد الطاف الدین، نرمل
کوئی آرزو نہیں ہے کوئی مدعا نہیں ہے
ترا غم رہے سلامت مرے دل میں کیا نہیں ہے
(نامعلوم)

محمد [illegible] جاوید حیدرآباد
پتھروں کے نام؟ وقت کے چہرے بدل گئے
اب کیا بتائیں کس کو کہاں چھوڑ آئے ہیں
(ندا فاضلی)

سید یوسف الدین ساحر، محبوب نگر
ٹوٹ جائیں گے ابھی اتنا تغافل تو نہ کر
ہم نے شیشوں سے بکھرنے کی ادا پائی ہے
(نامعلوم)

شبنم سلطانہ، بہار (نرمل)
بڑھا کے پیاس مری اس نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ کر رہا تھا مروت بھی دل لگی کی طرح
(قتیل شفائی)

رفیق احمد خاں، علی گڑھ
ابھی زندہ ہوں مگر سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے
(نامعلوم)

سیدہ رابعہ رشید، نرمل
رفاقتیں کوئی زنجیر پا نہیں ہوتیں
نہ چل سکو تو بچھڑ جاؤ دوستوں کی طرح
(فارغ بخاری)

عقیل گدی، چکردھرپور
تم دور ہو گئے ہو تو کچھ بھی نہیں رہا
جب تم قریب تھے مری دنیا میں کیا نہ تھا
(نامعلوم)

سید رضوان حیدر، گیا
مرے طرز زندگی سے کوئی دل نہ ٹوٹ جائے
مجھے باوقار کر دے مجھے پاکباز کر دے
(ہاشم سلطانپوری)

رئیسہ شبنم، بمبئی
اب کتاب زندگی محفوظ رہ سکتی نہیں
لگ رہی ہے ہر ورق پر غم کی دیمک دیکھنا
(شاہد ساگری)

محمود، جھانسی
تیرا ملنا ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا جہنم کیا
(جگر مرادآبادی)

محمد شہاب الدین حیدر، لہریا سرائے
پتھروں کے شہر میں شیشے کے گھر دیکھے گئے
دار پر سچ بولنے والوں کے سر دیکھے گئے
(نامعلوم)

شفق ناز قادری (روزی) علی گڑھ
ہم ایسے پیڑ ہیں جو چھاؤں بانٹ کر اپنی
شدید دھوپ میں خود سائے کو ترستے ہیں
(نامعلوم)

فرح یاسمین، دہلی
مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے
(علامہ اقبال)

محمد رئیس سوار ضلع رامپور
کچھ خطا اس میں بھی ہوگی آندھیوں کی دوستو
شاخ سے یوں ٹوٹ کر گرتا نہیں پتہ کبھی
(ظفر کاشی پوری)

[illegible] بھونگیری حیدرآباد
[illegible]
(اسمٰعیل ظریف حیدرآبادی)

صاحب [illegible] انشاط آسپور
محاسبہ بھی ضروری ہے زندگی کے لئے
گناہ جتنے کئے ہیں انہیں حساب میں رکھ
عفت زریں

محمد صالح، تبوک سعودی عرب
ملی ہے آہ کیا تقدیر بھی ہم کو مقدر سے
کہ جس کو عمر بھر چاہا اسی کو عمر بھر ترسے
نامعلوم

نوٹ: اشعار کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھئے

اپنے اشعار اس پتے پر لکھئے: "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیوٹی کالج

شہناز حسین

جسم کو دل کش بنانے کے لئے ورزشیں

خوب صورت نظر آنے کی خواہش
ہر عورت کی ہوتی ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے خوب صورتی چہرے کے ساتھ متناسب جسم میں بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو اصل کشش کی وجہ حسین چہرہ نہیں، حسین سراپا ہوتا ہے اکثر عورتیں مثلاپے یا بے ڈول جسم کی وجہ سے فکرمند رہتی ہیں۔ مگر وہ اس کی روک تھام کے لئے مناسب تدبیر نہیں کرتیں۔ بہت ہوا تو ڈائیٹنگ شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن صرف ڈائٹنگ سے آپ کا جسم سڈول اور متناسب نہیں بن سکتا خوب صورتی بلاشبہ قدرت کا عطیہ ہے، مگر اس کو قائم رکھنے کے لئے خود ہی جتن کرنے پڑتے ہیں اس کے لئے اپنے من کو مارنا پڑتا ہے۔ غذا کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ورزش جسم کو سڈول بنانے کی مہم کا ایک اہم حصہ ہے۔ باقاعدہ ورزش سے فالتو چربی دور ہو جاتی ہے اور جسم مضبوط خوب صورت اور متناسب بن جاتا ہے۔

اکثر خواتین ورزش کے نام سے ہی گھبراتی ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ آپ زیادہ سخت ورزش کریں۔ آپ آسان ورزشیں بھی کر سکتی ہیں۔ اگر روزانہ ایک یا دو کلو میٹر پیدل چلیں تو بھی یہ عورتوں کے لئے کافی ورزش ہے۔ مگر چہل قدمی کرتے وقت بھی آپ یہ خیال رکھیں کہ آپ کی کمر سیدھی رہے، سر کو جھکا کر نہ چلیں۔ پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑ کر چلیں۔ اس کے علاوہ آپ کسی بھی ورزش کو اختیار کریں، اس بات کا خیال ضرور رکھیں کہ ورزش میں باقاعدگی ہو یعنی کُنڈے دار نہ ہو۔

اس بار ہم آپ کو مختلف اعضاء کے لئے مختلف ورزشیں بتا رہے ہیں۔ ان کو آزما کر آپ اپنے جسم کو چھریرا اور متناسب بنا سکتی ہیں۔

بازو

کچھ عورتوں کے بازو کافی موٹے ہو جاتے ہیں اور ڈھلک جاتے ہیں۔ بازوؤں کو سڈول بنانے کے لئے یہ ورزش آزمائیں۔ زمین پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ پیروں کو الگ الگ رکھیں۔ ہاتھوں کو دائیں بائیں سیدھا تان لیں بازوؤں کو گولائی میں آہستہ آہستہ ایک بار پیچھے سے آگے کی طرف لائیں۔ پھر آگے سے پیچھے کی طرف لے جائیں۔ یہ ورزش کم از کم بیس مرتبہ کریں۔
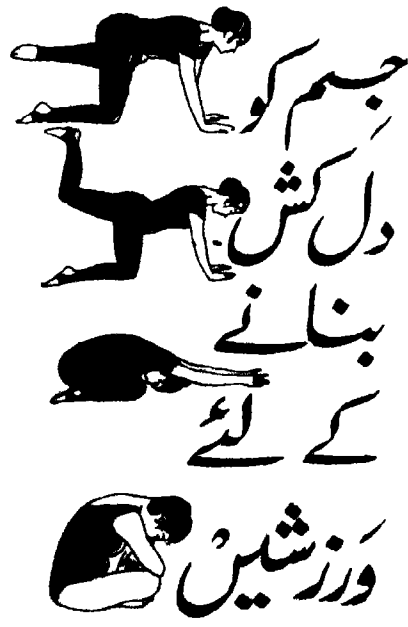
اس کے بعد سیدھی کھڑی ہو جائیں اور اپنے ہاتھوں کو سر کے اوپر دھیرے دھیرے جتنا اوپر لے جا سکتی ہیں، لے جائیں۔ ساتھ ہی لمبی لمبی سانسیں بھی لیتی رہیں۔ چند سیکنڈ بعد ہاتھوں کو نیچے لے آئیں۔

پیٹ

پیٹ کا بڑھنا اکثر خواتین کا مسئلہ ہے اس کے لئے زمین پر سیدھی لیٹ کر دونوں پیروں کو ملا لیں۔ ہاتھوں کو سیدھا زمین پر رکھیں۔ پھر پیروں کو آہستہ آہستہ زمین سے اوپر اٹھانا شروع کریں اور دس تک گنتی گنیں اس طرح پیروں کو آہستہ آہستہ پھر واپس لے جائیں۔ پہلے دن یہ ورزش دس تک گن کر کریں۔ دوسرے روز ۵ تک گنیں اس طرح ہر روز گنتی کے ساتھ ورزش کا وقت بڑھاتی جائیں۔ رفتہ رفتہ پاؤں اور ٹانگیں مزید اونچی اٹھتی جائیں گی۔ گنتی کو اتنا ہی بڑھالیں جتنی ٹانگیں اونچی کر سکتی ہیں۔

پیٹ کے لئے ایک اور ورزش یہ ہے پہلی ورزش کی طرح زمین پر سیدھی چت لیٹ جائیں۔ پھر اپنے گھٹنوں کو تھوڑا سا موڑیں۔ پیروں کو زمین پر سیدھا لگالیں۔ جسم کو تھوڑا سا اوپر کی طرف اٹھائیں اور آدھے بیٹھنے کی پوزیشن لے لیں۔ ہاتھوں کو آگے کی طرف گھٹنوں سے اوپر کی طرف کھینچ کر سیدھا کریں۔ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو ملالیں اور ہتھیلیاں نیچے کی طرف رکھیں ہلکے ہلکے سانس کی مدد سے پیٹ کے پٹھوں کو اوپر کی طرف کھینچیں۔ یہ ورزش بہت آہستہ آہستہ کرنی چاہئے۔ شروع میں تین چار بار، اس کے بعد بڑھا کر ایک وقت میں اس ورزش کو دس بار تک کر سکتی ہیں۔

کولہے

اگر آپ کے کولہے بھاری ہیں تو اس کے لئے زمین پر سیدھی لیٹ جائیں۔ دائیں ٹانگ آہستہ آہستہ بائیں ٹانگ کے اوپر سے جتنی دور تک لے جا سکتی ہیں لے جائیں۔ اسی طرح بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ کے اوپر سے جتنی دور تک لے جا سکتی ہیں لے جائیں لیکن یہ خیال رہے کہ ٹانگ کے ساتھ آپ کا

کولہا بھی گھٹ جاتا ہے۔

کولہوں کو سڈول بنانے کے لئے ایک اور ورزش یہ ہے۔ فرش پر اپنے پیروں کو سیدھا پھیلا کر اس طرح بیٹھیں کہ دونوں ہاتھ زمین کا سہارا لئے ہوں۔ اب بائیں بازو کو اٹھا کر بائیں بازو کے ساتھ رکھ لیں۔ پھر اپنے جسم کو دائیں طرف لڑھکائیں، تاکہ زمین کا سارا وزن دونوں ہاتھوں اور دائیں ران پر پڑے۔ کہنیاں سیدھی رہنی چاہئیں۔ اسی انداز میں تھوڑی دیر تک رہیں، تاکہ آپ کے کولہے اور پیروں کے پٹھے سخت ہو جائیں۔ اب سر کو اتنا اونچا اٹھا کر دیکھیں کہ آپ کو اپنے گھٹنوں کی پشت نظر آنے لگے۔ پھر ستا کر بائیں جانب جسم کو لڑھکائیں اور ٹھیک اسی طریقے سے دونوں ہاتھوں کو جسم کے بائیں جانب کر کے جسم کو پھیلائیں۔ پہلے دائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں۔ ۱۰ سے ۲۰ منٹ تک جسم کو ادھر ادھر گھماتی رہیں۔

پچھایا

یہ ورزش پچھائے کو سڈول بناتی ہے جسم کو آرام پہنچاتی ہے۔ اعصاب کے تناؤ کو کم کرتی ہے۔ گردش دوران خون کو بحال کرتی ہے۔ صبح کو اٹھ کر سب سے پہلے یہ ورزش کریں۔ اپنے ہاتھوں کو پیچھے کی طرف لے جائیں۔ اگر بیڈ دیوار سے لگا ہو تو دیوار پر ہاتھ لگا لیں۔ پہلے ایک ہاتھ پھیلا کر پیچھے لے جائیں، اس کے بعد دوسرا۔ پھر اپنے پیروں کو پھیلائیں اور پاؤں کی انگلیاں بیڈ کے کنارے سے لگا لیں۔ پہلے ایک پاؤں پھیلائیں، پھر دوسرا۔ اس کے بعد جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ اس ورزش سے جسم سیدھا رہتا ہے، دوران خون تیز ہوتا ہے اور اعصاب میں چستی آتی ہے۔

پچھائے کو متناسب بنانے کے لئے ایک ورزش یہ ہے۔ اپنے پنجوں پر کھڑی ہو جائیں اور اس طرح اونچا ہونے کی کوشش کریں جیسے آپ چھت کو چھو لینا چاہتی ہوں، پنجوں پر کھڑے کھڑے ایک بازو اوپر اٹھائیں اور اسے جتنا اوپر لے جا سکتی ہیں لے جائیں۔ دس تک گنتی گنیں۔ پھر ہاتھ کو واپس لے آئیں اب دوسرے ہاتھ سے یہی عمل دہرائیں اس کے بعد دونوں ہاتھوں کو اوپر لے جائیں اس دوران میں پنجوں پر کھڑی رہیں۔ دس تک گنتی گنیں۔ اس کے بعد بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیں سر کو جھکا کر گھٹنوں کے درمیان رکھ لیں جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر گرائیں۔ بازوؤں کو بھی ڈھیلا چھوڑ دیں جیسے وہ بالکل بے جان ہوں۔ اس طرح جسم کو تان کر ڈھیلا چھوڑ دینا ہی اس ورزش کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ایک دو بار اس ورزش کو دہرائیں۔

سینہ

یہ ورزش عورتوں کے سینے کو سخت اور سڈول بناتی ہے اور پیٹ کو گھٹاتی ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ بازوؤں کو پیچھے کی طرف لے جائیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا لیں۔ لمبا سانس لیں۔ کہنیاں سیدھی رکھیں سر کو پیچھے کی طرف جھکا لیں سینے کو پیچھے کی طرف جھکا کر کمر کو کمان بنا لیں۔ اب سانس باہر نکالیں۔ سیدھی کھڑی ہو کر فوراً ہی آگے کی طرف جھکیں۔ اتنی جھکیں کہ سر گھٹنوں سے لگ جائے۔ ہاتھ سامنے کی طرف پھیلے رہیں دس سیکنڈ انتظار کریں۔ آہستہ آہستہ اوپر اٹھیں آنکھیں بند کر لیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ ورزش دوبار کریں۔

سینے کے لئے ایک اور ورزش یہ ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ پیروں کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رکھیں۔ ہاتھوں کو پیچھے کی طرف لے جا کر انگلیاں آپس میں پھنسا لیں ہاتھوں کو پیچھے کی جانب جس قدر دور لے جا سکتی ہوں لے جائیں۔ کولہوں اور گھٹنوں کے اعصاب کو اکڑا لیں۔ اندر کی طرف لمبا سانس لیں۔ ٹھوڑی کا رخ چھت کی جانب کر کے سینے کو پھیلائیں۔ آنکھیں بند کر لیں۔ پانچ سیکنڈ انتظار کر کے ہاتھوں کو واپس لے آئیں۔ یہ ورزش چار بار دہرائیں۔

رانیں

اگر آپ کی رانوں کا باہری حصہ بھاری ہے تو یہ ورزش آزمائیں۔ کروٹ سے لیٹ جائیں۔ پہلے بائیں طرف کروٹ لیں جسم کو سیدھا کریں بایاں بازو سر کے نیچے لے جا کر جسم کی سیدھ میں رکھیں۔ دایاں بازو جسم کے سامنے رکھیں اور اسے پھیلا لیں۔ اس طرح جسم متوازن رہے گا۔ اب دایاں پاؤں اٹھائیں اور ۴۵ درجہ کا زاویہ بنا کر ۵ تک گنتی کریں۔ اس کے بعد بایاں پیر اٹھائیں اور ۵ تک گنتی کریں۔

رانوں کو سڈول بنانے کے لئے دوسری ورزش یہ ہے کہ ایک جگہ کھڑی ہو کر بھاگنے کی مشق کریں۔ دونوں ٹانگیں اس طرح چلائیں جیسے دوڑنے میں چلاتی ہیں۔ یہ ورزش گھر میں کسی بھی جگہ کھڑے ہو کر کر سکتی ہیں۔ عورتوں کے لئے یہ نہایت آسان ورزش ہے۔

دردِ سر

ہندوستان میں آج کل عورتوں میں دردِ سر نے عام وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دردِ سر اگر اعصابی تناؤ کی وجہ سے ہو تو اس ورزش سے کسی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔ گردن کے پچھلے حصے کے لئے بھی یہ ورزش مفید ہے۔

فرش پر دو زانوں بیٹھ جائیں۔ کولہے دونوں پیروں پر ٹکا لیں۔ دونوں پنجوں کا رخ ایک دوسرے کی جانب ہونا چاہئے۔ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر رانوں پر رکھ لیں۔ کہنیوں کو خم دے کر کندھے جتنے زیادہ اچکا سکتی ہیں اچکائیں آہستہ آہستہ گردن کو کندھوں سے ملا کر آگے اور پیچھے کی طرف لے جائیں۔ شانوں کی رگڑ سے گردن کی مالش کریں۔ دو منٹ تک یہ ورزش کریں اور ایک دو بار دہرائیں۔ ●

امن کا پرچم

وقار مانوی

یہ سرزمینِ وطن امن کا تھی گہوارہ
ہزار رنگ کے پھولوں کا یہ گلستاں تھا
ہر ایک پھول کی خوشبو الگ تھی رنگ جدا
علیحدہ شاخوں پہ کھلنے کے بعد بھی یہ پھول
یہ سارے پھول تھے آپس میں ایسے وابستہ
ہمیں تھا ناز کہ ہم بھی اسی چمن کے ہیں
زمانے بھر میں تھا مشہور اتحاد اپنا
حریفِ وقت ہمارے جو تھے وہ جلنے لگے
سماج دشمن عناصر بھی سر اٹھانے لگے
کہیں زبان کہیں دھرم آڑے لائے گئے
جو پائے جاتے تھے ہر دم فدائے یک جہتی
ہوائیں ہر طرف ایسی چلیں تعصب کی
دراز ہونے لگا سلسلہ فسادوں کا
جو لوگ پھول تھے وہ مثلِ خار بننے لگے
حقیقتوں سے بھی آنکھیں چرائی جانے لگیں
وہ اپنے فرض سے ہر آدمی چرانے لگا
تمام اصول تعصب کی نذر ہونے لگے
جو ذمہ دار تھے، قانون کے تھے رکھوالے
کچھ اہلِ شر اگر اک فرقے کے اُلجھنے لگے
پھر انتقام میں کیا کیا نہ ظلم توڑے گئے
سنا ہے صف میں کھڑا کر کے نوجوانوں کو
قصوروار کچھ ان میں ضرور مارے گئے
وہ چاہے کچھ بھی کریں، ان کا بول بالا ہے
بیان جس کا کیا جا سکے وہ حال نہیں
نہیں کہ اب کوئی منصف مزاج ہے ہی نہیں
مگر عیاں ہو جہاں پر سزائے حق گوئی
گزرنے والا تو ہر حادثہ گزرنا ہے
نہ آرزو، نہ یہاں سے فرار کا امکاں
زمین دلی ہو، ملیانہ ہو کہ میرٹھ ہو
مصالحت کی فضا کاش پھر سے ہو پیدا

جہاں نے دیکھا ہے صدیوں سے اِس کا نظارہ
ہر ایک پھول یہاں حاصلِ بہاراں تھا
مگر ہر ایک کا مقصد تھا باغ مہکانا
کیا نہ کرتے تھے اِک دوسرے کی دوری قبول
یہ سرزمین ہو پھولوں کا جیسے گلدستہ
طرح طرح کے چراغ ایک انجمن کے ہیں
گلوں سے رہتا تھا پُر دامنِ مراد اپنا
کچھ آستینوں میں دیکھا کہ سانپ پلنے لگے
طرح طرح کے سبق ہم کو وہ سکھانے لگے
چراغ ایکتا کے اِس طرح بجھائے گئے
ہوئے وہ لوگ بھی ناآشنائے یک جہتی
کہ عام لوگوں نے اپنی روش بدل ڈالی
چمن اجڑنے لگا باہمی مرادوں کا
قرار لوٹنے کو بے قرار رہنے لگے
پرانی قدریں جو تھیں وہ مٹائی جانے لگیں
فقط یہی نہیں بلکہ خلاف جانے لگا
جو ناخدا تھے وہی کشتیاں ڈبونے لگے
وہ خود ہی بن گئے قانون توڑنے والے
تو یہ حریف اُسی فرقے کو سمجھنے لگے
کہاں کے پیر و جواں، طفل بھی نہ چھوڑے گئے
پھر آزمایا گیا جبر کے نشانوں کو
زیادہ تر تو مگر بے قصور مارے گئے
محافظوں کو سزا کون دینے والا ہے
کہ منصفوں کو بھی انصاف کی مجال نہیں
غلط ہے یہ بھی کہ سچ کا رواج ہے ہی نہیں
تو حق بیانی کی جرأت ہی کیا کرے کوئی
مگر ہمیں یہیں جینا یہیں پہ مرنا ہے
سوال یہ ہے کہ جائیں اگر تو جائیں کہاں
بچانا جبر سے ہے ایک ایک خطے کو
سروں پہ اب نہ رہے جبر و ظلم کا سایہ

بھلا دیں دل سے انھیں، جو ہیں تلخیاں باہم
کریں بلند پھر اک بار امن کا پرچم
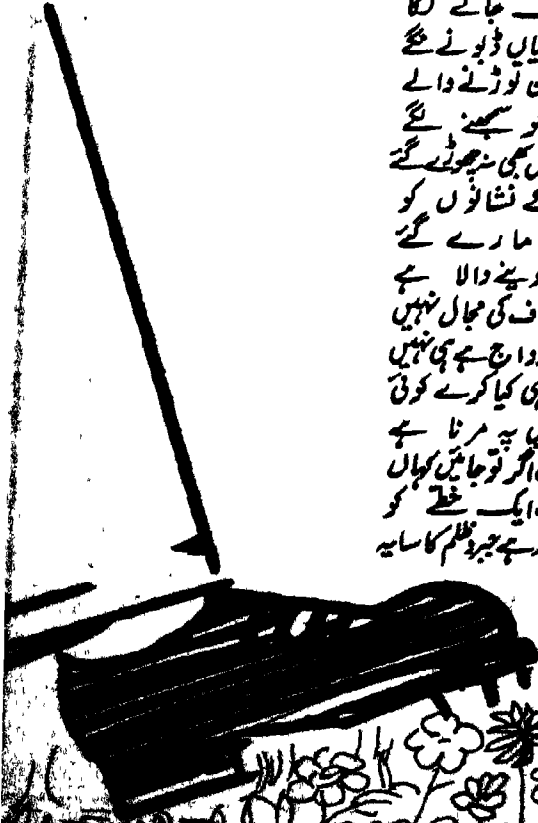
خوش شکل، گوری، پابندِ مذہب، درمیانہ قد، سُنّی مسلم، ۲۳ سالہ ایم۔ اے بی۔ ایڈ (فرسٹ کلاس) لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے۔ لڑکی کانونیٹ ٹیچر ہے۔ نرم دل، برسرِ روزگار لڑکے کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی بھی پیغام بھیج سکتے ہیں۔ خط کے ساتھ لڑکے کی تصویر اور پوری تفصیل بھیجیں۔

POST BOX 132
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

معزز بزنس گھرانے کے سُنّی مسلم نوجوان کے لئے (عمر ۳۸ سال) باعزت گھرانے کی بہت ہی خوب صورت گوری، مذہبی ہوتے ہوئے بھی جدید طرز کی اُردو ادب اور موسیقی کی دلدادہ لڑکی کی ضرورت ہے۔ طلاق شدہ یا بیوہ، شیعہ یا سُنّی امیر غریب وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔

POST BOX 133
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

سُنّی مسلم قبول صورت ۲۸ سالہ (بی۔ یو۔ ایم۔ ایم۔ ایس) میڈیکل آفیسر لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ جہیز کے خواہش مند رجوع نہ کریں۔

POST BOX 134
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

دلی کے معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والے سیّد سُنّی مسلم ڈاکٹر (ڈی۔ ایچ۔ ایم۔ ایس) ۲۳ سالہ لڑکے کے لئے خوب صورت پڑھی لکھی لڑکی کی ضرورت ہے۔ دلی والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

POST BOX 135
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

سُنّی معزز خاندان۔ ۳۰ سالہ تعلیم یافتہ صاحبِ جائداد اسسٹنٹ منیجر لڑکے کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی تعلیم یافتہ خوبصورت اچھے قد و تندرست و شریف خاندان کی ہو۔

BOX NO 136
MAHANAMA BANO
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI 110002

لڑاکا عورتیں

زبان کی جگہ ہتھیاروں سے لڑتی ہیں

ندیم نواز

ہم مردوں سے کم نہیں

ملک کی حفاظت میں پیش پیش

ہم سے نہ ٹکرانا

عورت کو "صنف نازک" کہا جاتا ہے شاعروں نے عورت کی اداؤں کو اس کے ہتھیاروں سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ صرف نظر کے تیروں سے گھائل کر سکتی ہے۔ لیکن عورت ہر دور میں ثابت کرتی رہی ہے کہ وہ بہادری اور جاں بازی میں مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ خود ہمارے ملک میں رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، اہلیا بائی اور جھانسی کی رانی جیسی سورما عورتیں جنگ کے میدان میں اپنی بہادری اور جنگی مہارت کی دھاک جما چکی ہیں۔

پہلے اگر ہلاکت خیز ہتھیاروں کا استعمال محض چیدہ چیدہ عورتوں تک محدود تھا تو اب عورتیں زیادہ بڑے پیمانے پر اسلحہ سے لیس نظر آتی ہیں آج وہ اگر ایک طرف ملک کے دفاع میں اپنا رول ادا کر رہی ہیں تو دوسری طرف دہشت گردی کے میدان میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں عورتیں دہشت گرد تنظیموں سے وابستہ ہیں کچھ عورتیں تو ایسی تنظیموں کی سربراہ بھی ہیں۔ کینیڈا میں حال ہی میں ۲۴ سالہ اسکول ٹیچر این ہنسین اور ایک ہوٹل کی ۲۴ سالہ استقبالیہ کلرک جولی بلماسن کو ملک میں بموں کے دھماکے کرنے کے الزام میں ۲۰ سال قید کی سزا دی گئی ہے۔ مغربی جرمنی میں آل وین ریڈ روز گروپ نے ہر اس جگہ کو تباہ کر دیا جس کے بارے میں شبہ تھا کہ وہاں عورتوں کے خلاف کام ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر اس گروپ نے ہیڈل برگ یونیورسٹی کے نئے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اس لئے بموں سے ملیا میٹ کر دیا کہ وہاں جینین کی ٹیکنالوجی کے بارے میں تحقیق ہو رہی ہے۔

دہشت گردی کے امور کے ایک ماہر پروفیسر پال کا کہنا ہے "لڑکیاں ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ مرد جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بھی کر سکتی ہیں"۔ آئرلینڈ کی باغی تحریک میں دہشت گرد عورتیں باقاعدہ ملازم ہیں۔ ان میں ملیوان اور ڈولورسیں بہت مشہور ہیں۔ آئرلینڈ کی دہشت گرد عورتوں میں سب سے زیادہ شہرت ۲۴ سالہ ایولائن کوٹی ہے۔ قانونی الجھنوں کی وجہ سے اسے برطانیہ دلایا جا سکا۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے دو افراد کو قتل کیا اور بحریہ کے سابق کمانڈنٹ جنرل پر نکل پر قاتلانہ حملہ کیا۔

لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی کی حفاظت بھی عورتیں کرتی ہیں۔ یہ ہر وقت خطرناک ترین اسلحہ سے لیس رہتی ہیں اور اپنے سربراہ کی حفاظت کے لئے جان ہتھیلی پہ لئے پھرتی ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے چیلنج کا مقابلہ آسانی کر سکتی ہیں۔ انہوں نے دو مرتبہ اپنے سربراہ کی جان بچائی ہے۔ اس محافظ دستے کو (GREEN SISTERS) کا نام دیا گیا ہے۔

اسرائیل کی فوج میں شامل عورتیں اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں اور انہیں اہم فوجی عہدے دئے گئے ہیں۔ یہی صورت حال برطانیہ میں ہے جہاں فوج میں ۶۵۰۰ عورتیں شامل ہیں۔ امریکہ میں اس امر پر خاص بحث ہو رہی ہے کہ فوجی عورتوں کو کمان سونپی جائے یا نہیں!

ہندوستان میں بھی عورتوں کے نیم فوجی دستے موجود ہیں۔ ان میں طالبات بھی شامل ہیں جو تعلیمی اداروں میں ابتدائی فوجی تربیت حاصل کرتی ہیں۔ این سی سی کے علاوہ عورتوں کا ایک خصوصی دستہ مرکزی پولیس (سی آر پی) میں بھی شامل ہے۔ مختلف ریاستوں کی پولیس میں وہ نچلی صفوں میں ہی نہیں، اعلیٰ عہدوں پر بھی عمدہ کارگزاری کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے وہ دن دور نہیں جب دنیا بھر کے ملکوں کی فوجوں میں عورتیں مردوں کے قدم سے قدم ملا کر اپنی جاں بازی کا سکہ جماتی نظر آئیں گی۔

جاپان کی عورتیں آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔

جاپان میں ہر تین عورتوں میں سے ایک عورت شادی کو غیر اہم سمجھتی ہے جب کہ ہر دو عورتوں میں سے ایک عورت طلاق کو بالکل اہمیت نہیں دیتی۔ جاپان کے لائف انشورنس کے ادارے کے جائزے کے مطابق اکثر جوان عورتیں شادی کرنے اور گھریلو زندگی گزارنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں انہیں معاشی طور پر خود کفیل ہونا اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا زیادہ پسند ہے۔

مالی طور پر کسی کی محتاج نہ رہنے کے باعث وہ کسی کی پابند رہنا بھی پسند نہیں کرتیں جاپان کی ۲۴ فی صد جوان لڑکیوں کا کہنا ہے کہ اب جب کہ وہ بیس کی عمر سے پہلے ہی معاشی طور پر خود کفیل ہوتی ہیں، اپنی آزادی کو محدود کرنا انہیں منظور نہیں۔ گیارہ فی صد لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ قانونی طور پر کسی کی پابند ہونا پسند نہیں کرتیں۔

کیڑے مکوڑے کھاؤ اور صحت بناؤ!

کئی ملکوں میں سانپ، بچھو، چھپکلی، مینڈک وغیرہ عام طور سے کھانے کی چیزوں میں شمار ہوتے ہیں۔ غریب لوگ انہیں زیادہ استعمال کرتے ہیں کیوں کہ یہ آسانی سے مہیا ہو جاتی ہیں۔ اب ان کی افادیت بھی سامنے آ رہی ہے۔ ان میں حیاتین اور نمکیات ہوتے ہیں۔ میکسیکو کے غذائی تحقیقاتی ادارے نے تجربے اور تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ پتنگوں، ننھے منے کیڑوں اور چیونٹی کے انڈوں میں بڑی طاقت پوشیدہ ہے۔ وہ غریب جو ایسی ناقص غذا کھاتے ہیں ان میں وٹامن کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کے لئے یہ کیڑے مکوڑے بہترین نعمت ثابت ہوتے ہیں۔ ۵۰ گرام پتنگوں، ۳۰ گرام کیڑوں اور ۲۰ گرام چیونٹیوں کے انڈوں سے ایک ایسی مقوی غذا تیار ہو سکتی ہے جو ایک لیٹر دودھ، ۲۰۰ گرام گوشت، ایک سیب اور ایک کپ سنترے کے رس کے برابر قوت رکھتی ہے۔
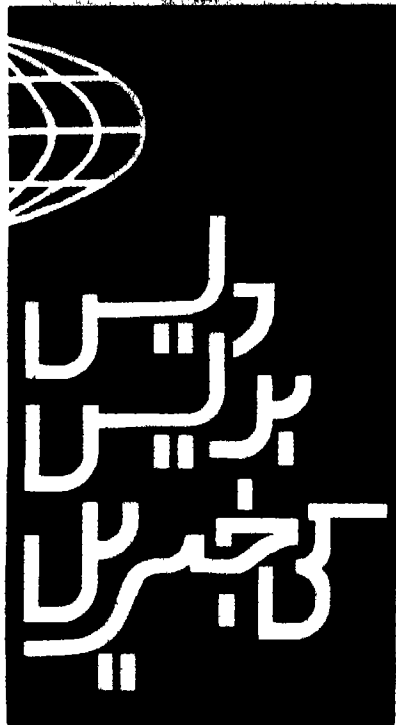
قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب یہ کیڑے مکوڑے میکسیکو کے اکثر بڑے ہوٹلوں کی مینو لسٹ میں شامل ہو رہے ہیں۔

اس طرح دور ہو گی غریبی!

واشنگٹن انٹرنیشنل بینک اینڈ فنڈ کی سالانہ میٹنگ میں غریبوں کی بھلائی میں مصروف بینکر اور کچھ دوسرے لوگ ایک عجیب طریقے سے دنیا کے غریبوں کی مشکلیں سلجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس میٹنگ میں شرکت کے لئے ۴۴ ڈالر فی گھنٹے کے حساب سے کرائے پر لی ہوئی ان کی لمبی چوڑی کاروں کا قافلہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ سڑک پر ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

اخبار "واشنگٹن پوسٹ" نے اپنے کچھ رپورٹروں کو اس میٹنگ کی روداد قلم بند کرنے کے لئے بھیجا۔ "غریبوں کی بھلائی" کے لئے ہونے والی اس میٹنگ کے سلسلے میں ایک ہی ہوٹل "شیرٹن" میں ۷۶ پارٹیاں ہو رہی تھیں۔ اندازے کے مطابق ایک ہی دن میں ہوٹل کو تقریباً سوا کروڑ روپے کی کمائی ہو گئی۔ یہ تو ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکا کہ بینکرز کون سے "ستم رسیدہ" لوگوں کو پھول اور گل دستے بھیج رہے تھے، لیکن شہر کے پھولوں کے بیوپاریوں کا کہنا تھا کہ ان کا دھندا صد فی صد بڑھ گیا ہے۔ اتنے اہتمام کے بعد شراب کے بغیر بھلا "غریبوں کی مشکلیں" کیسے دور ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ پورے علاقے کے شراب بیچنے والوں کی بکری بڑھ گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ نئے سال کے موقع پر جتنی شیمپین فروخت ہوتی ہے، اتنی ہی شیمپین اس موقع پر بک گئی۔

ایک بڑے بینک نے تو اپنی پارٹی کے لئے نیشنل گیلری آف آرٹ کا ایک پورا حصہ ہی کرائے پر لے لیا تھا۔ جب پارٹی ختم ہو گئی تو گیلری کے ایک افسر نے بتایا کہ اس نے زندگی میں اتنی مہنگی پارٹی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ سیڑھیوں پر پھول کے قالین بچھے ہوئے تھے۔

شیرٹن ہوٹل کے ۵۰۰ گیسٹ روموں کے لئے خاص طور سے ۱۱ میل لمبی ٹیلی فون لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ ویسے شیرٹن سے بھی زیادہ مہنگے ہوٹل وہاں ہیں جو صرف ایک رات کے لئے ۲۴۰۰ ڈالر (یعنی ۳۳ ہزار روپے) لیتے ہیں۔ بینکروں میں مقابلہ ہو رہا تھا کہ کون دوڑ میں آگے نکلے اور اپنے مہمانوں کو مہنگے سے مہنگے ہوٹل میں رکھے۔ اس طرح بینکروں نے "غریبوں" کی خوب خدمت کی۔

مرغے کا انعام: دو لاکھ ۵ ہزار ڈالر

جب امریکہ میں ایک بہت بوڑھی عورت جالی بلیٹ کی موت ہو گئی تو اس کے مرنے سے

ایک لفافہ نکلا جس کے اوپر لکھا تھا: "مجھے صبح کو پانچ بجے دفنایا جائے اور اس لفافے کو میرے دفنانے کے بعد کھولا جائے۔" امریکہ کی سرد کواتی سردی میں بھلا صبح کو پانچ بجے دفنانے کون آتا، لہٰذا صرف پانچ آدمی دفن کے وقت موجود تھے۔ دو قبر کھودنے والے، ایک پادری، ایک مرنے والے کا خانساماں اور ایک دوسرا نوکر جو تیس سال سے مرنے والے کے یہاں نوکر تھا۔ دفنانے کے بعد گھر آ کر لفافہ کھولا گیا تو اس میں سے دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی رقم نکلی، جو مرنے والے کی وصیت کے مطابق اس کے جنازے میں شریک ہونے والے پانچ آدمیوں میں برابر برابر بانٹ دی گئی۔

پرنس چارلس نے غلط عورت سے شادی کی ہے!

پرنس چارلس (جو برطانوی تخت کے وارث ہیں) نے ایک غلط عورت سے شادی کی ہے،" یہ سرخی اخبار 'ڈیلی ایکسپریس' نے پہلے صفحے پر چھاپی ہے۔ پرنس چارلس کے سوانح لکھنے والی پینی جونز کا کہنا ہے کہ چارلس ایک سنجیدہ شخصیت ہیں۔ اس کے ساتھ وہ بے حد تنہائی پسند بھی ہیں۔ مسز پینی جونز کی یہ سوانحی کتاب جون میں شائع ہو رہی ہے۔ وہ لکھتی ہے: "پرنس چارلس کو وہ مدد اور سہارا نہیں مل رہا ہے جو ایک بیوی کی طرف سے ملنا چاہئے۔" بی بی سی کو دیتے ہوئے انٹرویو کے دوران میں مسز جونز نے کہا: "میں یہ بات صاف طور پر کہہ سکتی ہوں کہ پرنس چارلس نے ایک غلط عورت سے شادی کی ہے۔ پرنس چارلس اور لیڈی ڈیانا دونوں ایک دوسرے سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں۔" نہ تو مسز جونز کی اس بات کو کسی نے غلط ثابت کیا ہے اور نہ جھٹلایا ہے۔ یہ بات ان کو محل کے ایسے لوگوں سے معلوم ہوئی ہے جو پرنس اور لیڈی کے بہت قریب ہیں۔ برطانیہ کے ۷۵ فی صد لوگ آج بھی ۶۱ سالہ ملکہ کو تخت پر بیٹھا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ○

چڑیا گھر میں بے موت مرتے ہوئے جانور

نئی دہلی کے چڑیا گھر میں خاصی تعداد میں جانور مر رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں علاج کی مناسب سہولتیں نہیں مل رہی ہیں۔

اتنے بڑے چڑیا گھر میں ہسپتال کے نام پر صرف ایک چھوٹا سا ہال ہے جس میں کئی سال سے کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ ہی ڈاکٹر کا کام کرتا ہے۔ اس کے صرف دو مددگار ہیں۔ ایک کمپاؤنڈر اور ایک لیبوریٹری اسسٹنٹ۔

حالاں کہ بیرونی ماہرین سے علاج کرانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن انہیں اسی وقت بلایا جاتا ہے جب کسی جانور کا مرض کافی بڑھ چکا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ایک ہی شخص کو علاج معالجہ کی پوری ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (جنہیں چڑیا گھر کے سب لوگ 'ڈاکٹر صاحب' کہتے ہیں) پیدل ہی پورے چڑیا گھر کا چکر لگا کر دیکھتے ہیں کہ اب کون سا جانور بیمار ہے۔

قاعدے سے تو ان کو تین چار چکر روز لگانے چاہئیں، مگر کوئی سواری نہ ہونے کی وجہ سے وہ صرف ایک ہی چکر لگا پاتے ہیں۔ اس لئے بیمار جانوروں کی اطلاع ان کو وقت پر نہیں مل پاتی۔

اتنا ہی نہیں، اگر ایک بار علاج کے لئے جانور ہسپتال میں پہنچ جائے تو وہیں کا باشندہ ہو جاتا ہے۔ اور مر کر ہی وہاں سے نکلتا ہے۔ ایک سانپ پچھلے تین سال سے وہاں پنجرے میں بند پڑا ہے۔ ٹھیک ہونے کے بعد بھی ابھی تک اسے گھر الاٹ نہیں ہوا ہے۔

یہی حالت ایک بندر کی ہے اس کو ایک چھوٹے سے پنجرے میں کئی مہینوں سے رکھا ہوا ہے۔ اس کو اگر بڑا پنجرا مل جائے تو شاید ہسپتال کا ماحول اس پر زیادہ گراں نہیں گزرے گا۔ لیکن وہ تو تنگ پنجرے میں اداس بیٹھا آنے جانے والوں کی صورت تکا کرتا ہے۔ اچھل کود کرنے کی جگہ اس کے لئے نہیں۔ ایسے ماحول میں تو وہ اچھا بھلا ہوتے ہوئے بھی بیمار ہو جائے گا۔

اسی طرح کی گردش کے دن اور دوسرے کئی جانوروں پر بھی بیت رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کے ساتھ سراسر ناانصافی ہو رہی ہے۔ لیکن وہ بے چارے بے زبان اپنی اس بری حالت کی داستان خود نہیں کہہ سکتے۔

سری لنکا میں بچوں کو بیچنے کا دھندا!

پچھلے دنوں سری لنکا کے اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبریں چھپیں کہ وہاں کچھ زر پرست لوگ بچوں کو فروخت کر رہے ہیں۔ ان خبروں کے عام ہوتے ہی پولیس نے گھروں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ وہاں سے تقریباً ۲۵ بچے برآمد کئے جن کی عمر ایک سال یا اس سے اوپر تھی۔ ان کے خریدار یورپ کے بے اولاد جوڑے تھے۔ اس طرح بچوں کی برآمد کی بہت منافع بخش تجارت ہو رہی تھی۔ ○○

امتیاز علی نصرت، پڑاپلی (کریم نگر)

س: دنیا میں انسان کا سچا ساتھی...؟

ج: علم و دانش اور محبت نیصلہ۔ دوست نواز انسان کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ جو خود اپنے ساتھی بنانے کا فن جانتے ہیں وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ بے غرض دوستی کرسکتے ہیں۔ اس لئے لوگ انہیں پسند کرتے ہیں یہ کافی ہے۔

س: کیا دولت ہی دنیا کی اٹل اور سچی حقیقت ہے؟

ج: دولت دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے لیکن بہت طاقت ور۔ مگر عقل نہ ہو تو بڑے بڑے راجوں نوابوں کو ان کے چھٹ پرزہ مصاحبوں نے کھوکھلا کر دیا ہے۔ عقل اور سمجھ بوجھ سب سے بڑی دولت ہے۔ جسے علم سے اور اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ قناعت کے یہ معنی نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائے۔ بلکہ چال بازی سے کمائی دولت کی بجائے اپنی محنت سے کمانے پر گزارا کرنا سیکھے۔

مس نشاط زہرہ، بھاگلپور (بہار)

س: انسان اپنی زندگی سے کب نفرت کرنے لگتا ہے؟

ج: دل میں کئی بار نفرت کرتا ہے پھر لوٹ کر محبت کرنے لگتا ہے۔ حالاں کہ آج کسی کی بھی زندگی اپنی نہیں، سماج کی ہے۔ نفرت محبت بھی سماجی ہونا چاہئے۔

س: ایثار کا جذبہ مرد میں زیادہ ہوتا ہے یا عورت میں؟

ج: ایثار کا جذبہ تربیت پر منحصر ہے۔ جس عورت یا مرد کے خاندان میں ایثار کی رسم رائج ہوگی وہاں اس کا اظہار سچے معنوں میں کرسکیں گے۔ عورت کے ایثار میں اگر بیوقوفی شامل ہو تو استحصال کا تحفہ ہے۔

بزم بانو

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دل چسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں، صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزم بانو
ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

سلطان احمد آشک، کریم نگر

س: شوہر کا درجہ بلند ہوتا ہے یا بیوی کا؟

ج: جو بھی دونوں میں سے زیادہ تعلیم یافتہ نیک اور شریف ہو۔ مفت خوری کا عادی نہ ہو۔ کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہ ہو۔ کہ محتاجی بے ایمانی کی جڑ ہوتی ہے۔

محمد قیصر احمد، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

س: کیا تعلیم ختم ہو جانے کے بعد دوستی بھی ختم ہو جاتی ہے؟

ج: اتنی گہری تو نہیں رہ پاتی۔ میل جول جاری رہے تو زندہ رہتی ہے ورنہ زیادہ تر تو ختم ہی ہو جاتی ہے۔

رُمانہ پروین صدیقی، علی گڑھ

س: سچی دوستی کس کو کہتے ہیں؟

ج: بے غرض دلچسپی سوائے محبت کے اور کسی مروت، سفارش، دھن دولت کی طلب نہ ہو۔ لین دین ہو بھی تو بغیر حساب کتاب۔ جہاں ناپ تول آجائے درمیان میں وہ دھندہ بن جاتا ہے۔

س: جب کوئی رشتہ دار پیٹھ پیچھے برائی کرے اور سامنے تعریف تو اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے؟

ج: بڑی مہربانی سے پیش آئیے۔ بے چارہ آپ سے ڈرتا ہے یا ادب کرتا ہے۔ اس پر ہرگز نہ ظاہر ہو کہ آپ کو پتہ ہے پیٹھ پیچھے برائی کرتا ہے۔ بڑا نادم ہوگا آپ کی نرمی پر اور توبہ کرے گا۔ اس کی رائے کو اہمیت دیجئے۔

محفوظ احمد، گرول، دربھنگہ

س: عورت کی زندگی کب مصیبت بن جاتی ہے؟

ج: جب اس کے گھر کے مرد چوری اور بے ایمانی میں گرفتار ہو جائیں تو وہ چلو بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ عورت مرد ایک دوسرے کی عزت کے نگہبان ہیں۔ عورت کو انسان بننے کے لئے اپنا بوجھ خود اٹھانے کی ہمت پیدا کرنی چاہئے۔ ایک بیل تھک جاتا ہے منزل پر پہنچنے سے پہلے۔ جب تک عورت ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہے گی مصیبت میں گرفتار رہے گی۔

پالک مسالہ کھچڑی

ارہر، چنے، مونگ کی چھلکے والی دال		۲۰۰ گرام
چاول باسمتی	:	۱۵۰ گرام
پالک	:	۱۲۵ گرام
چنے اور اُڑد کی دُھلی دال	:	½ چائے کا چمچہ
زیرہ	:	¾ چائے کا چمچہ
کالی مرچ	:	¾ چائے کا چمچہ
میتھی سُوکھی	:	¾ ۱ چائے کا چمچہ
ہینگ	:	ایک چٹکی
سوکھا ناریل	:	۲۵ گرام
گھی	:	۳ میز کے چمچے
پیاز (بڑا سائز)	:	ایک عدد
مکھن	:	۵۰ گرام
ہرا دھنیا، نیم کی پتیاں	:	حسبِ ضرورت
املی	:	مرضی کے مطابق
بگھار کے لئے زیرہ اور رائی	:	ایک چائے کا چمچہ

تینوں دالوں اور چاولوں کو دھو کر نمک اور ہلدی کے ساتھ کوکر میں ڈال دیجئے۔ اسی میں پالک بھی صاف کر کے کاٹ کر ڈال دیجئے۔ پانی اتنا ڈالیں کہ کھچڑی گل جائے۔

چنے اور اُڑد کی دال، زیرہ، کالی مرچ، رائی، میتھی، ہینگ، ان سب کو کڑھائی میں بھونئے آخر میں ناریل کے چُورے کو کڑھائی میں ڈال دیجئے بھُن جانے پر سب کو ملا کر پیس لیں۔

املی کو ڈیڑھ کپ پانی میں بھگو دیجئے۔ آدھے گھنٹے بعد املی کو اچھی طرح مَسل کر گُودا نکال لیں۔

کڑھائی میں تیل ڈال کر گرم کریں۔ گرم ہونے پر اس میں زیرہ اور رائی ڈالیں۔ زیرہ لال ہونے پر پیاز باریک کاٹ کر لال کر لیں۔ اب اس میں میتھی، نیم کی پتیاں ڈال کر تھوڑا پسا ہوا مسالہ اور املی کا گُودا ملا دیں۔ پانی میں اُبال آنے پر [illegible] اس میں ضرورت کے مطابق نمک اور لال مرچ ڈال دیں۔ اب کوکر کھول کر پورا مسالہ اس میں اچھی طرح ملا دیں۔ مکھن بھی ڈال کر ملا دیں۔ اوپر سے ہرا دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں۔

لچک ایرانی

(یہ ایک ایرانی ڈش ہے، جو سموسوں کی طرح ہوتی ہے)

میدہ	:	آدھا کلو
پالک	:	آدھا کلو
قیمہ	:	آدھا کلو
دہی (کھٹا)	:	پاؤ کلو
چنے کی دال	:	۵۰ گرام
نمک	:	حسبِ ذائقہ
سُرخ مرچ	:	حسبِ ذائقہ
سُوکھا پودینا	:	حسبِ خواہش
چاٹ مسالہ	:	ایک چمچہ
کالی مرچ	:	چند دانے
گھی	:	تلنے کے لئے

ایک دیگچی میں چنے کی دال اور پانی ڈال کر دھیمی آنچ پر رکھ دیں۔ دال گل جائے تو ایک ڈش میں نکال لیں۔ لیکن پانی اتنا ڈالیں کہ دال گل جائے اور پانی خشک ہو جائے، دیگچی میں معمولی سا گھی ڈال کر نمک، سُرخ مرچ، کالی مرچ ڈالیں ساتھ قیمہ، پودینا، اور چنے کی دال ڈال کر بھون لیں۔ ایک تسلے میں میدہ، نمک اور دہی ڈال کر سخت گُوندھ لیں۔ میدے کا پیڑا بنا کر چپاتی کی طرح بیل لیں لیکن یاد رکھیں چپاتی پتلی ہونی چاہئے۔
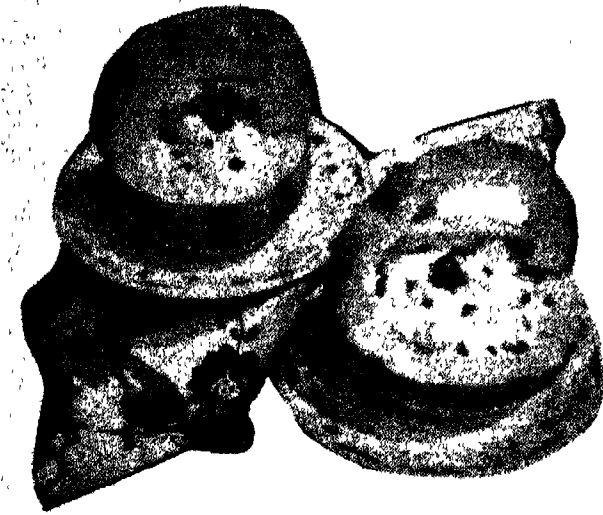
اب چپاتی کے چار انچ کے ٹکڑے چوکور یا تکون کاٹ لیں۔ ایک ٹرے میں ٹکڑے رکھ لیں ایک ٹکڑے پر قیمہ کا آمیزہ ڈالیں۔ قیمے پر پالک ڈال کر چاٹ کا مصالحہ چھڑک دیں۔ اب آمیزہ بھرے ٹکڑے پر چپاتی کا سادہ ٹکڑا رکھ کر ہاتھ سے چاروں طرف سے دبائیں یہ سموسہ کی طرح ہو جائے گا۔ اسی طرح بقیہ ٹکڑوں میں آمیزہ بھر کر بنائیں یہ لچک ایرانی ہیں۔

فرائی پان میں گھی گرم کریں۔ گھی گرم کر کے اس میں ایک ایک لچک ایرانی ڈال کر تل لیں۔ پودینے اور انار دانے کی چٹنی کے ساتھ کھائیں۔

ٹی کوزی، پتیاں سبز، پھول تمام نیلے، گڑیا کے فراک و ٹوپی کا دھاگہ شیڈ والا پیازی

پہلا انعام : درست حل پر ، ز... (۲۲ کیرٹ طلائی زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار روپے

Rs 20,000.00

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر، یا شمع ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعے ادا کی جاسکتی ہے۔ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ : ہفتہ یکم۔ اگست ، ۱۹۸۰ آٹھ بجے رات تک
پیر ، ۳۔ اگست ، ۱۹۸۰ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لیے جائیں گے۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۴۰

ن	و	ت	س	و	۱ د	
ی	س	ب	ے	۲ ب		۱ پ
د	و	د	۳ ح		۹ ن	ا
ک	م	۴ چ		۸ ب	س	گ
ج	۵ آ		۷ م	ش	ل	ل
		۶ ت	ا	ا	ت	و
		ے	ل	ے	ا	ن

اشارے :

دائیں سے بائیں :

۱۔ بیوی کو نظر انداز کرکے ہر وقت دوسروں کے ساتھ رہنا کہاں کی شرافت ہے

۲۔ یہ سیاستداں عوام کی ۔۔۔ سے واقف ہیں اور اسکا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں

۳۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران لوگ شرافت اور انسانیت کی ۔۔۔ کو فراموش کرکے وحشی درندوں سے بدتر حرکتوں پر اتر آتے ہیں

۴۔ ہیرے جواہرات کی ۔۔۔ سے جب آنکھیں چندھیا جاتی ہیں تو صحیح اور غلط کا فرق دکھائی دینا بند ہو جاتا ہے

۵۔ دیدہ خوں بار ہے مدت سے ، ولے ۔۔۔ ندیم!

۷۔ یہ خیال درست نہیں کہ بغیر ۔۔۔ کے بچے بگڑ جاتے ہیں اور

۸۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ کوئی اور بھی تو ہاتھ ۔۔۔

۹۔ اِن پہاڑی نالوں کا پانی ۔۔۔ دوڑتا میدانوں کیطرف بڑھتا ہے۔ یہاں

۱۰۔ بیماریوں کا اگر صحیح وقت پر اور مناسب علاج کیا جائے تو فائدہ ضرور ہوتا ہے

اوپر سے نیچے :

۶۔ دل کے ٹکڑے بھی کسی خون کے شامل ۔۔۔

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۱۴۰) ماہنامہ شمع ، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع مینی معمہ نمبر ۱۴۰ کا صحیح حل منگل ، ۴۔ اگست ، ۱۹۸۰ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہنامہ بانو میں شائع کیے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع (نئی دہلی) ...

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر، یا نقدناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف

★ ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے
انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لیے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کیے جاسکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجیے یا چھپ کر ماہنامہ بانو یا ماہنامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۴۰ کا نتیجہ ماہنامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ٹانک
ہر موسم کے لئے نباتاتی یونانی ٹانک
بڑھتے ہوئے بچوں سے لے کر دودھ پلاتی ماؤں اور
بڑے بوڑھوں تک خاندان کا ہر فرد پورے سال،
ہر موسم میں شمع ٹانک استعمال کرسکتا ہے۔ اس کا
ہر مزے دار چمچہ صحت اور قوت کا خزانہ ہے۔ شمع ٹانک
صحت کو بحال کرتا ہے، تھکے ہوئے اعصاب کو تسکین
دیتا ہے، فرحت بخش نیند کا ضامن ہے، بھوک بڑھاتا
اور نظام ہضم کو بہتر بناتا ہے۔ توانائی عطا کرتا ہے۔
بیماریوں کے خلاف قوتِ مزاحمت پیدا کرتا ہے۔
بیماریوں سے بچنے کے لئے یا بیماری کے بعد زور اور
قوت بحال کرنے کے لئے شمع ٹانک استعمال کیجئے۔
اس میں الکحل بالکل نہیں ہے۔
فی بوتل: ۲۸ روپے (مقامی ٹیکس علاوہ)
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶

BANO New Delhi 40th Year of Publication ISSUE NO. 484 Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R.N No. 741/57 Regd. No. D-(C) 120

بانو
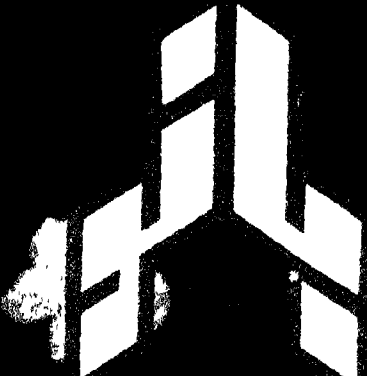
بقرعید کے بکرے
کا وصیّت نامہ

معذرت
کرنے کا فن

کیا بچّوں کو
مارنے پیٹنے سے
آپ کی پریشانی
دور ہو سکتی
ہے؟
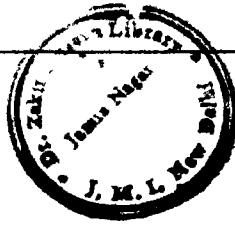
انسان کو ہر مرحلے، ہر مقام کے لئے سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان کا پہلا مقام دُنیا ہے، یہ دارالفنا ہے۔ اور دوسرا مقام آخرت ہے، جو دارالبقا ہے دنیا کا سرمایہ سونا چاندی اور آخرت کا سرمایہ دین ہے۔ دُنیا کا سفر انسان کے جسم سے ہوتا ہے اور آخرت کا سفر دل اور رُوح سے۔ دنیا کے سفر کا رہبر علم ہے اور آخرت کے سفر کا رہبر دل۔

علم ایک لاٹھی ہے۔ لاٹھی بینا کے ہاتھ میں بھی ہو سکتی ہے اور نابینا کے ہاتھ میں بھی۔ نابینا کی لاٹھی دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتی۔ جو جسم آنکھوں سے محروم ہے وہ دُنیا کا اندھا ہے، اور جس دل میں محبت نہیں وہ آخرت کا اندھا ہے، اس لئے آخرت کے ابدی حسن کی دید اس کے حصے میں نہیں آئے گی۔

دین کے سرمائے کی بنیاد ہی محبت ہے اور محبت نام ہے شفاف آئینۂ باطن کا۔ جو اس باطن کے آئینے میں خود کو پہچان کر اپنے عیوب دُور کرتا ہے، وہ صحیح معنوں میں انسان بن جاتا ہے۔ ایسا شخص دنیا میں بھی سُرخ رُو رہے گا اور آخرت میں بھی اور جس کے پاس جتنی زیادہ محبت ہوگی، اُتنا ہی وہ آخرت کا رئیس ہوگا، کیونکہ محبت بُرائیوں سے گریز ہے، نیک اعمال کی اساس ہے، ایسا خزانہ ہے جو جیتے جی ہی نہیں، مرنے کے بعد بھی انسان کو مالا مال رکھے۔

سعدیہ دہلوی
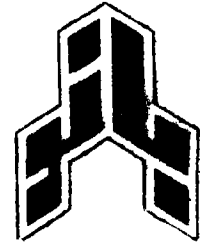
اگست ۱۹۸۷

اشاعت کا چالیسواں سال، ۴۸۵ واں شمارہ

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
اعانۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سال بھر کی قیمت: ۵۲ روپے (اس میں سالنامہ کا رجسٹری خرچ شامل ہے)

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی NEW DELHI
ٹیلکس: 031) 61601 SHMA IN
ٹیلی فون: 732668 732667 732666
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزینز
طابع ناشر: محمد یونس دہلوی
مطبوعہ: شمع پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲

کہی سنی

باجی :

خدا آپ کو سلامت رکھے۔

شدید انتظار کے بعد، بانو کا سال نامہ ملا بہت خوب صورت سال نامہ ہے۔ باجی یقیناً آپ نے بڑی محنت کی ہوگی۔ دہلی میں ہونے والے ہنگاموں کا کرب جھیلتے ہوئے بھی آپ نے اتنا شاندار سال نامہ نکالا ہے۔ یہ کارنامہ آپ ہی کے بس کا ہے، مبارکباد دیتا ہوں۔

تنویر اختر رومانی، جمشید پور

○ : شکریہ۔

مدیرہ

سعدیہ صاحبہ،

بانو کے سال نامے کا بہت مدت سے انتظار تھا۔ لیکن ہمیں یہ پتہ تھا کہ ہمارے انتظار کی زحمت رائیگاں نہیں جائے گی۔ واقعی سال نامہ ہاتھوں میں آیا تو آپ کی محنت اور لگن کی داد دینی پڑی۔ آپ کی قیادت میں یہ تیسرا سال نامہ منظرِ عام پر آیا ہے اور ہر سال نامہ پہلے سے بہتر نکلا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی تحریر کا انداز بالکل منفرد ہے۔ تقریباً ہر ماہ آپ کی تحریر نگاہوں سے گذرتی ہی ہے۔ لیکن اس بار سال نامے میں آپ کے سفرنامے کی بجائے ایک نئے انداز کی تحریر سے سابقہ پڑا جو ہر اعتبار سے آپ کی دوسری تحریروں سے جدا اور نمایاں تھی۔ خوشونت سنگھ کی کہانی کا ترجمہ بہت تاثر انگیز تھا۔ بیان کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے ہم آپ کے مونہہ سے واقعی یہ پورا قصہ سن رہے ہوں۔ امید ہے آئندہ بھی اسی قسم کی تحریریں پیش کرتی رہیں گی۔

آپ نے سچ مچ بڑی کوشش کر کے تمام بڑے مصنفوں کو ایک بار پھر اکٹھا کر کے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔

رفعیہ منظور الامین کا "بغیر عنوان کے" ابرار محسن کا "نذرانہ" شہناز عرفان کا "برفیلی آگ" ایس۔ ایم حیات کا "فیصلہ" بہت اچھے افسانے ہیں۔ امید ہے آگے بھی آپ کی کوششیں رنگ لاتی رہیں گی اور اسی طرح سال نامے کی کشش یہ یاد دلاتی رہے گی کہ صبر کی طرح انتظار کا پھل بھی میٹھا ہوتا ہے۔

اخلاق احمد، بھساول

○ : سال نامہ آپ کو پسند آیا۔ ہماری تحریر آپ کو اچھی لگی۔ اس طرح گویا ہمیں اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔

مدیرہ

سعدیہ جی

سال نامہ کل ملا۔ چونکہ کل میں گھر پر موجود نہیں تھی، اس لئے آج دوپہر کو یہ میرے ہاتھ لگا سرورق دیکھ کر کچھ کمی کا احساس ہوا۔ شاید یکسانیت اسی کی وجہ رہی ہو۔ بہرحال سرورق سال نامے کے شایانِ شان نہیں رہا تاہم اندر سے شمارہ بہت خوب رہا۔ مشہور اور بڑے قلم کاروں کے افسانے اور مضامین کافی پسند آئے۔ آپ کا اداریہ تو ہوتا ہی بے مثال ہے۔ باقی دوسری چیزیں بھی اچھی لگیں۔ "میری دادی" نے بہت متاثر کیا۔ یہ سچ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اپنے بزرگوں کی قدر کھوتے جا رہے ہیں۔ آج سے پچاس سال قبل کے زمانے اور آج کے زمانے کا موازنہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم مغرب کی طرح "اولڈ ہوم" کے تصوّر کو پسند کرنے لگے ہیں تاکہ ان بوڑھوں سے چھٹکارا پالیں۔ ان کے لئے نہ وہ عزّت رہی نہ احترام، اس کے بدلے دُکھ، کرب اور تنہائی کی سوغات ہم اپنے بزرگوں کو دے رہے ہیں۔ ایسے میں وہ جانوروں اور پرندوں کو اپنی محبت اور شفقت کا محور بنالیں تو تعجب کیا ہے۔

واجدہ تبسّم کا افسانہ پسند آیا، کیونکہ یہ کچھ مختلف سا تھا ورنہ تو اب تک ان کے جتنے بھی افسانے پڑھے وہ حیدر آبادی ماحول کے نوابوں اور کنیزوں کے مابین موضوعات پر جن میں مخصوص چٹخارے اور واقعات ہیں۔ باقی افسانے اور مضامین بھی بہت پسند آئے۔

دیس بدیس کی خبروں میں کولمبو کی جل پری کا تو بخدا یقین ہی نہیں آیا۔ کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے، اگر وہ سچ مچ جل پری ہے تو سمندر سے باہر زندہ کیسے ہے؟ کیسے رہتی ہے؟ اس کے کیا احساسات ہیں؟ کیا کھاتی ہے؟ اسے انسانوں کی زبان سکھانے کا کوئی انتظام ہے یا نہیں؟ یہ تفصیلات بھی پڑھنے کو ملتیں تو اور مزہ آتا۔

مہناز عرفان، کراچی
(پاکستان)

○ : مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرے ترجمے کی کاوش پسند آئی۔ آپ کے افسانے نے بھی سال نامے میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مدیرہ

ڈیر سعدیہ باجی

بانو کا سال نامہ نظروں سے گذرا۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بانو کے افتتاحیہ کا ایک الگ معیار ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ خدا کرے بانو دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ سال نامے میں شامل سب افسانے اور مضامین بہت

پسند آئے۔ بشریٰ رحمٰن کے ناول "لگن" کی قسط بھی بہت خوب ہے۔ سب قلم کاروں کو مبارک باد

دل ناز درناز، آمبور

○ : سال نامہ ہمارے پڑھنے والوں کو پسند آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہماری محنت اور لگن وصول ہوئی۔

مدیرہ

محترمہ مدیرہ صاحبہ:

بانو کا سال نامہ دیکھ کر دِل باغ باغ ہوگیا۔ یہ ہر پہلو سے قابلِ تعریف ہے۔ سرورق سچ مچ دل موہ لینے والا ہے۔ تمام افسانے، نظمیں اور مضامین تعریف کے قابل ہیں۔ میں بانو کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں اور آج پہلی بار آپ کی بزم میں حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے شریکِ محفل کریں گی۔

افتخار احمد ٹانڈہ (فیض آباد)

○ : خوش آمدید

مدیرہ

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

بانو کا سال نامہ نظر نواز ہوا۔ گوہر نوازی کے لئے شکر گزار ہوں۔ نظم کی اشاعت کے لئے شکریہ قبول فرمائیں۔

سال نامے کے تمام مشمولات معیاری ہیں۔ آپ سے ایک خاص درخواست ہے اگر تخلیق کاروں کا پتہ بھی آپ شائع فرمادیا کریں تو کیا ہی اچھا ہو مکمل پتہ ہونے سے قارئین کو اپنے پسندیدہ تخلیق کاروں سے رابطہ قائم کرنے میں آسانی ہوگی اور اس طرح قارئین اور تخلیق کاروں کے درمیان جو پیار اور محبت کا اٹوٹ رشتہ ہے وہ سدا قائم رہے گا۔

گوہر شیخ پوروی، وارانسی

○ : آپ کی تجویز پہ ہم غور کریں گے۔

مدیرہ

سعدیہ صاحبہ:

پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ بانو ہم لوگوں کے لئے ایک بے کار رسالہ ہے، لیکن بعد میں مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ بانو بنیادی طور پر عورتوں اور لڑکیوں کا رسالہ ضرور ہے مگر مردوں کے لئے بھی اس میں کشش کا سامان ہے۔ ہر لحاظ سے بانو ایک عمدہ اور معیاری رسالہ ہے

آپ کا سفرنامہ پسند آتا ہے مگر یہ عموماً بہت مختصر ہوتا ہے۔ خاص طور سے تاریخی مقامات کی سیر کی رُوداد ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کیا کریں۔

سال نامے میں سب افسانے بہت اچھے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن کے ناول "لگن" کی قسط کا اثر دل پر دیر تک رہا۔

سال نامے کے علاوہ عام شماروں میں بھی آپ چُن چُن کر سمندر کو کوزہ میں سمو دیتی ہیں۔ ہیلتھ کلب، بیوٹی کالج، گھریلو نسخے، قلمی دوستی، پیغامات اور تبسم سے لے کر باورچی خانہ، کشیدہ کاری اور سینا پرونا تک سب ہی کچھ شامل رہتا ہے۔ افسانوی اور شعری حصہ تو بلند معیار کا ہوتا ہی ہے۔

نواب جان،
الہفوف (سعودی عرب)

○ : خیالات بدلنے کا شکریہ۔

مدیرہ

محترمہ سعدیہ باجی:

سال نامہ دیکھتے ہی میں خوشی سے اچھل پڑی۔ میں بانو بہت ہی شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس لئے مجھے ہر مہینے اس کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ آج کل چھٹیاں ہیں اور میں سال نامہ پڑھنے میں لگی ہوئی ہوں۔ سب سے پہلے میں نے آپ کا افتتاحیہ پڑھا۔ افتتاحیہ میں بہت ہی اچھی باتیں پڑھنے اور عمل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بشریٰ رحمٰن کے ناول "لگن" کی قسط پڑھی جو بہت ہی دل چسپ ہوتی ہے۔

اُردو رسالوں میں مجھے سب سے زیادہ بانو ہی پسند ہے۔ میں اسے کسی ماہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ بانو ملتے ہی ممی اور چھوٹی بہن کہتی ہیں کہ پہلے اسے ہم پڑھیں گے۔ فیصلہ اکثر قرعہ اندازی سے ہوتا ہے۔ یہ عالم ہے بانو کی کشش کا۔

نعمہ شیریں، پٹنہ

○ : ہماری دعا ہے کہ آپ سب کا شوق اسی طرح قائم رہے۔

مدیرہ

سعدیہ صاحبہ:

سال نامہ کا حسین گل دستہ ملا۔ دیکھتے ہی زبان سے واہ نکلی۔ سال نامہ بے مثال، آن بان اور شان سے جلوہ گر ہوا ہے۔ سب پھول اپنی اپنی جگہ نہایت دِل کش ہیں۔ اتنا پیارا سال نامہ نکالنے پر دِلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

ہمارے گھر میں بچوں سے لے کر بڑوں تک بانو کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ بانو میں سب کو اپنے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان مِل جاتا ہے۔

منور اقبال، دیلور

○ : ہماری کوشش یہی رہتی ہے کہ بانو ہر طرح کی پسند کی کسوٹی پر پورا اترے۔ اسی لئے ہم پڑھنے والوں کی رائے طلب کرتے ہیں اور اسے اہمیت بھی دیتے ہیں۔

سویٹ باجی:

پچھلے چار پانچ برس سے بانو کا مطالعہ کرتا آرہا ہوں۔ یہ رسالہ مجھے بے حد پسند ہے۔ ابھی حال میں بانو کا سال نامہ نظر سے گزرا اور دل کی گہرائیوں کو چھو گیا۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔

بہت دِن سے ایک بات آپ سے کہنے کو جی چاہ رہا ہے۔ آپ ہر ماہ بانو میں باقاعدگی کے ساتھ غزلیں بھی شائع کریں تو بانو کے حُسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔

○ : آپ نے شاید دھیان نہیں دیا کہ ہم بانو میں غزلیں بھی شائع کرتے ہیں۔

مدیرہ

ڈیئر سعدیہ صاحبہ

پہلی مرتبہ بانو کے لئے اپنی تحریر ارسال کر رہی ہوں امید ہے اسے کہی سنی کے کالم میں ضرور شامل کریں گی۔ ہندوستان میں اُردو زبان کی بے بہا خدمت کا ادارہ کوئی ہے تو بلاشبہ شمع گروپ ہے۔ بانو میں ہر قسم کا ملتا ہے، پڑھ کر دل کھِل اٹھتا ہے اور دل سے دعا ہے کہ خدایا بانو کو دن دُونی رات چوگنی ترقی دے۔

جمیلہ بٹ، سیالکوٹ (پاکستان)

○ : آپ کی دُعا ہمارے لئے سب سے بڑا سرمایہ ہے

مدیرہ

شمع کہانی نمبر کی زبردست مقبولیت کے بعد

ادارہ

کا

ایک اور بے مثال، باوقار خاص نمبر

فلم اور ٹی وی کی شخصیتوں پر دلچسپ مضامین، ستاروں کی رنگین تصویریں، ممتاز افسانہ نگاروں کے قلم سے فلم اور ٹی وی کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانیاں، خصوصی نظمیں اور وہ سب کچھ جس کی آپ شمع سے توقع رکھتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس خاص نمبر کی قیمت صرف پندرہ روپے ہوگی۔ شمع کے کہانی نمبر کی طرح یہ فلم + ٹی وی نمبر، بھی شمع کے عام شماروں سے الگ، ایک خصوصی اشاعت کے طور سے پیش کیا جائے گا۔

ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آج ۱۰ ذی الحجہ ہے۔ عیدالاضحیٰ میں دو روز باقی ہیں اور اتنے ہی دن میری زندگی کے باقی ہیں۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ میں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ، جنہیں عرفِ عام میں ریوڑ کہتے ہیں، راجستھان سے دہلی لایا گیا تھا ویسے میں گزشتہ سال اپنے ریوڑ کے ساتھ دہلی آیا تھا لیکن اس وقت تک میں بالغ نہیں ہوا تھا۔ میرے تمام ساتھی ایک ایک کرکے اچھے داموں فروخت ہوگئے۔ میرے بڑے بھائی جو مجھ سے عمر میں بڑے اور بہت فربہ تھے دو ہزار میں فروخت کئے گئے۔ میرے بڑے بھائی (خدا ان کی قربانی قبول کرے) بڑے تن و توش کے مالک تھے۔ لیکن ان میں غرور نام کو بھی نہیں تھا۔ دو ہزار میں جب ان کا سودا ہوا تو وہ سر جھکائے اپنے خریدار کے ساتھ اس کے گھر روانہ ہوگئے

راستے میں وہ اڑیل ٹٹو کی طرح کھڑے نہیں ہوئے اور نہ ان کی دُم کھینچنے کی نوبت آئی۔

میرا سودا چار سو روپے میں طے ہوا۔ چوں کہ میں "ادنت" تھا اس لئے میری قربانی نہیں ہوسکتی تھی۔ دہلی کے ایک کارخانہ دار بخش الٰہی نے مجھے خریدا اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو وہاں شور مچ گیا۔ بخش الٰہی کے آٹھ بچے ہیں۔ وہ سب مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ ریحانہ، فرزانہ، سلطانہ اور رُخسانہ، چاروں بچیوں نے مجھے گھیر لیا۔ کوئی کہتی تھی یہ میرا بکرا ہے۔ کوئی کہتی تھی نہیں، یہ میرا ہے۔ چاروں بھائی ناصر، عامر، شکیل اور جمیل جب اسکول سے آئے تو انہوں نے بہنوں سے مجھے چھین لیا۔ مرد واقعی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات کہہ کر اپنا

حق جتایا کہ ہم اسے باغ میں نہلانے لے جائیں گے باغ میں جاکر اس کا جی خوش ہوگا۔ راستے میں میرے لئے پتے اور دانہ بھی خریدیں گے۔ بہنیں یہ سن کر خاموش ہوگئیں۔ جب وہ مجھے باغ میں لے گئے تو واقعی میرا جی بہت خوش ہوا۔ مجھے راجستھان کے کھلے میدان یاد آگئے۔ میں نے باغ میں خوب چوکڑیاں بھریں۔ ناصر اور عامر میرے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے۔ اور میں رُکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

دوسرے دن بھائیوں نے بازار سے مہندی خریدی۔ میرا جسم براق کے مانند سفید ہے۔ انہوں نے میری کھال پر جا بجا مہندی سے پھول بنائے۔ اللہ کا نام لکھا۔ جب مجھے نہلایا گیا تو میرے سفید جسم پر سُرخ پھول دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

سال بھر تک میں بخش الٰہی کے گھر والوں

مفید اور کارآمد

نکسیر پھوٹنے پر بیاؤں پیر کا ایک چھوٹا ٹکڑا تہہ کر کے اوپری ہونٹوں اور مسوڑھوں کے بیچ میں رکھنے سے خون آنا بند ہو جاتا ہے۔

گردن کے پچھلے حصّے پر برف رکھنے سے بھی نکسیر کا خون بند ہو جاتا ہے۔

اگر سخت دھوپ سے کھال جھلس گئی ہو تو تھوڑے سے دودھ میں برف ڈال کر اس میں ایک بڑا چمچہ نمک ملا کر اس گھول میں کپڑا بھگو کر جھلسی ہوئی کھال پر رکھ دیں۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ یہ عمل کریں۔ دن میں تین چار بار یہ عمل کرنے سے بہت فائدہ ہوگا۔

پیروں کی تھکن مٹانے اور خون کا دوران بڑھانے کے لئے یہ طریقہ آزمائیں۔ ایک پیالی پسی ہوئی ادرک لیں۔ ایک پتیلے یا ٹب میں گنگنا گرم پانی بھر کر اس میں پسی ہوئی ادرک گھول لیں پھر اس پانی میں پاؤں بھگو کر بیٹھیں جب پانی ٹھنڈا ہونے لگے تو پیروں کو پانی سے نکال کر پونچھ ڈالیں۔

کی آنکھ کا تارہ بنا رہا۔ انہوں نے میرا نام ٹیٹو رکھا تھا۔ مجھے بھی یہ نام پسند تھا سب مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ انہوں نے میری دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک بار میں بیمار ہوا تو سارا گھر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس کی دوا سے میں جلد ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس جب ایک بار ناصر کے پیٹ میں درد اٹھا تو گھر والوں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی۔ وہ دو روز میں خود ہی لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو گیا۔ یہ لوگ مجھے اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے۔

جب عیدالفطر کا تہوار نزدیک آیا تو مجھے خاص طور پر سجایا گیا۔ میرے جسم کے نقش و نگار پر دوبارہ مہندی رچائی گئی۔ میرے گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی مالا ڈالی گئی۔ عید کے دن مجھے پتوں اور دانوں کا ڈبل راشن دیا گیا۔ میں ایک بار زیادہ کھانے سے بیمار پڑ چکا تھا اس لئے میں نے کھانے میں ہمیشہ احتیاط برتی۔ فرزانہ اور ریحانہ بہت موٹی ہو گئی تھیں۔ اور موٹاپے سے نجات پانے کے لئے ڈائٹنگ کر رہی تھیں ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ڈائٹنگ شروع کر دی۔ اس پر گھر میں میرا خوب خوب مذاق اڑایا گیا۔ وہ کہتے: ارے ٹیٹو کو کیا ہو گیا ہے! آدھے پتے کھا کر باقی چھوڑ دیتا ہے۔ بخش الٰہی بھی زیر لب شکایت کرتے کہ بقر عید آ رہی ہے اور یہ موٹا ہونے کا نام نہیں لیتا۔

ذی الحج کا چاند دیکھتے ہی گھر میں سناٹا چھا گیا۔ جب بچے میرے جسم پر ہاتھ پھیرتے تو ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ میری قربانی کا مسئلہ جھگڑے کا موضوع بن گیا۔ بچے باپ سے کہتے کہ ہم ٹیٹو کو ہرگز مرنے نہیں دیں گے آپ دوسرا بکرا لے آئیں۔ بخش الٰہی جواب دیتے کہ میں نے اسے قربانی کی نیت سے خریدا ہے اس کی قربانی مجھ پر لازم ہے۔ بچے کہتے کہ آپ نے اسے اپنے بچے کی طرح پالا ہے کیا آپ اپنے بچے کو قربان کر دیں گے؟ بخش الٰہی کہتے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے نوعمر بچے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین چیز کو قربان کرنا ہی خدا کی رضا کا باعث ہوتا ہے۔ بچے یہ دلیل سن کر خاموش ہو جاتے دوسرے دن یہ جھگڑا پھر شروع ہو گیا۔

تیسرے دن بخش الٰہی کے بھائی کرم الٰہی گھر پر آئے تو بخش الٰہی نے انہیں اپنی بپتا سنائی کرم الٰہی نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ بچوں کا دل نہ توڑیں۔ اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ وہ مجھے ان کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ انہوں نے کہا: تم نے ٹیٹو کو چار سو روپے میں خریدا ہے۔ میں تم کو آٹھ سو دیتا ہوں۔ اس طرح تمہیں اس لین دین میں نفع ہوگا اور بچوں کو بھی ٹیٹو کی قربانی کا نظارہ نہیں کرنا پڑے گا۔ بخش الٰہی نے یہ بات سنی تو وہ بھڑک اٹھے اور بولے: بھائی! میں نے اسے قربانی کی نیت سے خریدا ہے بیچنے کے لئے نہیں۔ آپ آٹھ سو تو کیا، اگر آٹھ ہزار بھی دیں گے تو میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ کرم الٰہی یہ بات سن کر خاموش ہو گئے۔

آج ۷ ذی الحجہ ہے۔ عیدالاضحٰی میں دو روز باقی ہیں۔ اس لئے میں اپنے چاہنے والوں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ میری موت کا غم نہ کریں۔ موت برحق ہے اور خدا کی راہ میں مرنے والے کی موت عام موت سے اعلیٰ ہے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں خدا کی راہ میں ذبح ہونے والا ہوں اور مجھے ذبح کرنے والے ثواب کے مستحق ہوں گے۔ دہلی کے ایک شاعر نے کہا ہے:

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

دوسری بات یہ کہ ناصر عدم تشدد کے حامی ہیں۔ وہ گوشت خوری سے پرہیز کرتے ہیں میں نے گھر میں ان کا ذکر سنا ہے کہ وہ بقر عید کے دن نماز پڑھ کر باغ میں نکل جاتے ہیں۔ ان سے جانور کا خون خرابہ نہیں دیکھا جاتا۔ وہ دوپہر تک گھر نہیں آتے۔ گھر میں اس وقت داخل ہوتے ہیں جب سارا کام ختم ہو چکا ہو۔ ناصر سے یہ میری درخواست ہے کہ وہ اس بار اس کام سے جی نہ چرائیں۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو مجھے ذبح کرنے کی

ذمہ داری اپنے سر پہ لے لیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجھے ذبح ہوتے ضرور دیکھیں۔

بخش الٰہی صاحب سے میری درخواست ہے کہ وہ خود میری گردن پر چھری پھیریں۔ یہ کام قصائی کے سپرد نہ کریں۔ چھری محبت اور نرمی سے چلائیں تاکہ مجھے ان سے یہ نہ کہنا پڑے:

وہ بے دردی سے سر کاٹیں امیر اور میں کہوں ان سے
حضور آہستہ آہستہ جناب آہستہ آہستہ

چاروں بہنوں سے میری التجا ہے کہ وہ میرے ذبح ہونے کے وقت آنسو نہ بہائیں۔ حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کے صبر اور قربانی کے جذبے کو یاد کریں۔ میں ان سے وعدہ کرتا ہوں کہ پل صراط پر میں ان کا منتظر رہوں گا۔ فرزانہ اور ریحانہ کتنی بھی موٹی کیوں نہ ہو جائیں، میں انشاءاللہ ان کا بوجھ اٹھا لوں گا۔ پل صراط بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ اس وقت یہی ٹیٹو آپ کی سواری کے کام آئے گا۔

قربانی کے بعد میرے گوشت کے تین حصے کئے جائیں۔ ایک حصہ گھر والوں کے لئے دوسرا رشتہ داروں کے لئے۔ تیسرا غریبوں اور مسکینوں کے لئے۔ اس تقسیم میں انصاف سے کام لیں۔ میں نے ایک بار کسی کو کرم الٰہی کو یہ مشورہ دیتے سنا تھا کہ سالم بکرا قربانی کے بعد کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیا جائے۔ ہر ہفتے دو تین کلو گوشت کاٹ کر گھر لے آئیں۔ اس طرح قربانی کا گوشت دو تین مہینے چل سکتا ہے۔ آج کل بکرے کا گوشت تیس روپے کلو ہے۔ قربانی کا گوشت پچاس بلکہ سو روپے کلو تک پہنچتا ہے۔ بخش الٰہی یہ مشورہ سن کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ میری وصیت ہے کہ مجھے قربانی کے بعد سرد خانے میں نہ لٹکائیں اور ہر ہفتے میرے پارچے کاٹ کر مجھے اذیت نہ پہنچائیں۔ قربانی کے دن ہی سارا گوشت تقسیم کر دیں۔

میری کھال کو قصائی کے ہاتھ فروخت نہ کریں۔ کھال کی قیمت آج کل پچاس روپے ہے قصائی اسے اپنے محنتانے کے عوض لے لیتا ہے بلکہ مزید کچھ روپے واپس کر دیتا ہے۔ میری وصیت ہے کہ میری کھال کا سودا نہ کریں۔ اسے کسی یتیم خانے میں بھجوا دیں۔ قربانی کے احکام بجالانے پر فخر نہ کریں۔ یاد رکھیں کہ خدا کے یہاں قربانی کی کھال اور گوشت نہیں پہنچتا، بلکہ صرف انسان کا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اگر قربانی تقویٰ کے ساتھ کی جائے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ قربانی کے خون کے فرش پر گرنے سے پہلے انسان کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔

آخر میں تمام بہنوں اور بھائیوں سے معافی چاہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو معاف کریں۔ ریحانہ باجی میری مینگنیوں کو جھاڑو لگاتے لگاتے ہلکان ہو جاتی تھیں۔ بخش الٰہی صاحب و راماں بی کی نیند میری میں میں سے اچاٹ ہو جاتی تھی۔ میں میں کرنا میری مجبوری ہے۔ مگر یہ انسانوں کی تو تو میں میں سے بہتر ہے۔ انسان کی میں میں پر انا کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہماری میں میں صرف میں سے مشابہ ہے۔ اس میں انا کا غلبہ نہیں ہے۔ ہماری ذہنیت ایک گلے کی ذہنیت ہے۔ ایک بکرا دوسرے کی دُم میں مُونہہ لگا کے چلتا رہتا ہے گلے کو جدھر چاہو ہنکا لے جاؤ۔ ہم انسان کی طرح انا پرست نہیں اس کی طرح الگ الگ کھچڑی پھر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں چنتے۔

اب میں اپنی وصیت ختم کرتا ہوں اپنے گھر والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنا سمجھ کر پالا پورے ادنت سے دروانت کیا۔ اور جب میں اس قابل ہوا کہ میری قربانی دی جائے تو اپنی محبت کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اپنے کرم فرما کے ہاتھ سے ذبح ہو رہا ہوں۔

سرِ وقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

فقط
پل صراط پر آپ کا منتظر
آپ کا ٹیٹو

ناؤ کھویا رے

لہر لہر کھیتا چل ناؤ کھویا رے۔
کھور تیری راہ تکے چل میرے بھیا رے
مانجھی او مانجھی بڑھتا چل کنارا دور ہے
ساگر میں طوفان چھپے ہیں بادل میں بجریا
دیکھ کھال کے چل او مانجھی بھکے نہ بجریا
رات کے سر سے غم کا آنچل ڈھلکے گا
کھور بھئے آشا کا سورج چمکے گا
دیتی ہے سندیسہ تجھکو یہ پُروائے رے
کھور تیری راہ تکے چل میرے بھیا رے
مانجھی او مانجھی بڑھتا چل کنارا دور ہے
مجھدھار نے مونہہ کھولا ہے ناگ بنے ہیں دھارے
طوفانوں کے کہیے میں آ کے روٹھ گئے ہیں کنارے
ہر مشکل اور ہر خطرہ ٹل جائے گا
دُھن کا پکا ہے تو منزل پائے گا
تجھکو پار لگا دے گی یہ ڈولتی نیا رے
کھور تیری راہ تکے چل میرے بھیا رے
مانجھی او مانجھی بڑھتا چل کنارا دور ہے

رفیق شاہین علی گڑھ

ذکیہ مشہدی

"اس روز رشید کی زبردست پٹائی ہوئی تھی۔" بجیا، جو رشید کی اس تاریخی پٹائی کے وقت بہت چھوٹی سی تھیں۔ آج تک اس کا ذکر کرتی تھیں۔ بجیا کو دو مختلف دورے اکثر پڑا کرتے تھے۔ ایک ہنسنے کا اور دوسرا ماضی میں ڈبکی لگانے کا۔ شادی کے دس برس گزار کر اب ہنسنے کا دورہ تو کم پڑتا تھا، ہاں اس کے بدلے ماضی میں ڈبکی زیادہ لگانے لگی تھیں۔

"پھر کیا ہوا، ماں؟ ہمیں اپنے نانا ابا کے گھر کا پورا قصہ سنائیے۔" بجیا کا چھوٹا بیٹا تالیاں بجا کر بولا۔ اس کے ننھے سے ذہن میں ماں کی ننھیال کا تصور بڑا مضحکہ خیز تھا۔ بھلا کہیں "ممی لوگوں" کی ننھیال ہوا کرتی ہے۔ نانی، نانا تو بس چھوٹے بچوں کے ہوتے ہیں۔"

کی ہڈیاں بھی مٹی چاٹ چکی۔ اس وقت بھی اس کی عمر اچھی خاصی تھی۔ ادھیڑ ہو چلا تھا۔ دبلا پتلا، مریل۔

"تمہارے نانا ابا کو کھانے کا بڑا شوق تھا۔ گوشت کے معاملے میں تو بے حد نفاست پسند تھے، بلی، کتوں کا راتب تک خود سامنے منگا کر دیکھتے تھے کہ کم بخت چکوے نے بالکل ہی کوڑا کباڑ تو نہیں بھر دیا۔ بقرعید میں بڑے اہتمام سے بڑے تام جھام کے ساتھ خود بکرے خریدنے جایا کرتے تھے۔"

"اماں، جواب تک تخت پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں اپنے میکے کے ذکر پر ذرا دیر کے لئے خدا رسول کو بھول گئیں اور بجیا کی کہانی میں کلی پھندنے ٹانکنے لگیں۔

"ہاں، خدا بخشے، انسانوں کی ہڈیاں بھی اسی طرح ٹٹولا کرتے تھے جیسے بکروں کی۔"

"ابا کو خوب ٹٹول کر داماد بنایا تھا۔" چھوٹے بھیا نے لقمہ دیا۔ وہ ہمیشہ کے بے ادب اور گستاخ تھے۔ اماں کے پیچھے جھک کر جوتی ٹٹولنے

نانا ابا نے قورمے کے ڈونگے میں چمچہ ڈالا۔ بوٹیوں کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا اور خاموشی سے بغیر کھانا کھائے اٹھ گئے۔" بجیا نے دسیوں بار کا دہرایا ہوا پھر جزئیات سمیت سنانا شروع کیا۔

"پھر۔ پھر کیا ہوا ماں؟"

"لمحہ بھر کو تو سناٹا چھا گیا۔ پھر ماموں یک بیک اس طرح اٹھے جیسے ساکن فضا میں اچانک آندھی اٹھتی ہے۔ "حرام زادے! یہ اپنی صورت کا سا گوشت لے کر کیوں آیا تھا؟" انہوں نے قورمے کا ڈونگا رشید کے سر پر الٹ دیا اور شروع ہو گئے تڑا تڑ۔ جھٹکے جھٹکے رشید کا برا حال تھا۔ مونچھوں سے اصلی گھی اور گرم مصالحوں کی خوشبو والا شوربا دھار بن کر بہہ رہا تھا۔ پورا کمرہ معطر ہو گیا تھا۔

"ہاہاہا!" بچوں نے قہقہہ لگایا۔

"اس وقت میں بھی اسی طرح ہنسی تھی۔" بجیا نے افسردگی سے کہا۔ "بے چارا رشید!"

"رشید اب کہاں ہے پھوپھی؟" بڑے بھائی جان کی آٹھ سالہ بچی نے دلچسپی سے پوچھا۔

بجیا کی اداسی گہری ہو گئی۔ "رشید؟ - رشید

لطیفہ

ایک گھر میں چار چور گھس آئے اور گھر کے مالک کو پیٹنے لگے۔ اس شخص کی بیوی نے اپنے شوہر کو مصیبت میں دیکھ کر کھڑکی سے اپنے پڑوسی کو آواز دی۔

"بھائی ذرا دوڑ کر آنا۔" میرے شوہر کو چار آدمی مل کر پیٹ رہے ہیں۔ پڑوسی سویا سویا ہوا تھا۔ اس نے ذرا سی آنکھ کھولی اور بولا: "چار آدمی کیا تھوڑے ہیں جو مجھے بلا رہی ہو۔"

لگیں۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے انہوں نے بات جاری رکھی لیکن پڑ"ی بوٹی نوچنے سے آپ کو کیا ملا' اماں؟ جی چاہتا ہے نانا ابا کو قبر سے اکھاڑ لاؤں سارا تماشا دیکھنے کو۔ مزے سے جاکر ٹانگیں پھیلائے سو رہے ہیں۔"

"بد تمیز کہیں کا! جو مونہہ میں آتا ہے بکتا رہتا ہے مرے ہوئے بزرگوں تک کا لحاظ نہیں۔ ان کا کیا قصور تھا؟ سب کھیل مقدر کے ہیں۔" اماں روہانسی ہوگئیں اور چھوٹے بھیا پر جوتی پھینکنے کا ارادہ ملتوی کر کے شاست تسبیح گننے لگیں بھیا دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ یہ بے وقت کی شہنائی انہوں نے ہی شروع کی تھی۔ بات ہو رہی تھی زرینہ کی شادی کی اور وہ رشید کی پٹائی لے کر بیٹھ گئیں۔

اچانک اماں نے خلا میں دیکھتے ہی دیکھتے تسبیح ہاتھ سے رکھ دی۔ "ہمارے وقتوں میں شادیاں اسی طرح ہوتی تھیں۔ ماں باپ نے جہاں کر دی وہاں چپ چاپ کر لی اور پھر نباہ بھی کر لیا۔"

اماں شاید دیوار سے مخاطب تھیں۔ "اب تمہارا زمانہ دوسرا ہے۔"

"بے شک زمانہ دوسرا ہے۔ (بھیا نے سوچا)" رشید اپٹتا جاتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا جاتا تھا۔ اب ایک دن بڑی بھابی نے جھاڑو برتن کرنے والی پندرہ سالہ چھوکری پر جوتی اٹھائی تو وہ اسی وقت تنتنا کر بھاگ گئی وہاں سے۔ دوسرے دن اس کی ماں آئی اور آنکھیں نکال کر بولی: "بڑی دلہن، ہم کام کرتے ہیں تو کیا عزت نہیں ہماری؟ لڑکی پر جوتی اٹھائی آپ نے! لائیے ہمارا پندرہ دن کا حساب کر دیجئے۔" بڑی بھابی کا پاؤں بھاری تھا۔ اماں لاکھ صفائی دیتی رہیں کہ ایسے میں کچھ عورتیں چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔ اب جانے بھی دو بُوا۔ مگر بُوا پندرہ دن کا حساب کر کے یہ جا وہ جا۔ بڑی بڑی مصیبتوں سے یہ چھوکرا ملا ہے۔ بڑی بھابی کی سنگار میز سے تیل لے کر سر میں آملے کا خوشبودار تیل لگاتا ہے' ٹی وی چل رہا ہو تو مجال نہیں کہ اٹھ جائے کسی کام کو۔ پڑوس کی شکورا بی بی اور بڑکی چھٹکی آتی ہیں تو اماں کی بغل میں پلنگ پر بیٹھتی ہیں۔ دادی کے وقت میں زمین پر بیٹھا کرتی تھیں۔ پھر تخت پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اب سیدھی برابر بیٹھتی ہیں۔ ان کے چھپر والے گھروں پر پکی چھتیں پڑ گئی ہیں اور لڑکے اسکول پڑھنے جاتے ہیں۔ اور کیا خود اپنے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟ دادی (بقول چھوٹے بھیا) صرف میلاد شریف پاس تھیں۔ باہر نکلتی تھیں تو برقعے کے ساتھ موزے اور دستانے پہنتی تھیں کہ ہاتھ پاؤں نہ دکھائی پڑ جائیں رکشا پر ایک پردہ بھی باندھا جاتا تھا۔ اماں نے پانچویں جماعت تک پڑھا تھا۔ موزے اور دستانے نہیں پہنتی تھیں' صرف برقعہ اوڑھتی تھیں۔ دادی کے مرنے کے بعد رکشا پر باندھنے والا پردہ ہٹا دیا گیا تھا۔ صرف برقعہ برقرار تھا۔ اور اب؟ ۔ اب بجیا بی ایس سی ہیں۔ زرینہ ایم اے اور چھوٹی سلمیٰ میڈیکل فرسٹ ایر میں ہے۔ تینوں میں سے کوئی پردہ نہیں کرتا۔ بڑے بھیا نے اپنی پسند سے شادی کی ہے۔ بجیا کی شادی لَو میرج تو نہیں۔ لیکن رشتہ طے کرنے سے پہلے بھیا نے ان سے باقاعدہ پوچھ لیا تھا۔ ساری تفصیلات پر بحث کر لی تھی۔ لڑکا کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ چھپا کر بجیا کو دکھا بھی دیا گیا تھا ان کے مطمئن ہو جانے اور ہاں کہہ دینے پر بات پکی کی گئی تھی۔

زرینہ نے اپنا تازہ ترین رشتہ ویٹو کر دیا ہے زرینہ ایم اے کر رہی ہے' وہ بھی میتھمیٹکس میں۔ وہ حضرت پانچ برس لڑھکے تب کہیں جا کر اردو فارسی لے کر بی اے کر سکے۔ ویسے جائیداد بہت ہے۔

"ارے تو کیا بی اے کم ہے؟" اماں غرائی تھیں۔

"کم کہاں ہے۔" چھوٹے بھیا ہنسے تھے "پہلے ہر ہندوستانی فلم کا ہیرو یا تو بی اے پاس ہوا کرتا تھا یا بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ آج بھرے بازار میں پتھر پھینکیے تو کسی گریجویٹ پر ہی جا کر گرے گا۔"

"ہاں اور کیا۔ اماں بغیر سوچے سمجھے بول رہی تھیں۔" نجیب الطرفین سید بھی ہے۔ جانے پہچانے لوگوں میں رشتہ داریاں ہیں۔"

"کس سن میں سید ہوئے تھے؟" چھوٹے بھیا نے مسکین سی صورت بنا کر کہا تھا۔ بڑے زبردست سور تھے چھوٹے بھیا۔

زرینہ پاس بیٹھی خاموشی سے یہ ساری بحث سن رہی تھی۔ بھیا کے اس جملے پر ہنسی برداشت نہ

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجیے۔

۱۵ راگست ۱۹۸۸ء تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں' دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام' پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔

"بغیر عنوان کے" ماہنامہ بانو' آصف علی روڈ' نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کر سکی۔ ہنستی ہوئی بھاگی وہاں سے اور کمرے میں اگر بستر پر لوٹ گئی۔ اماں نے زور سے سروتے پر ہاتھ مارا اور ڈلی کے دو ٹکڑے اِس طرح کئے جیسے ڈلی چھوٹے بھیا کا سر تھی یا زرینہ کے دانت۔

ہمارے وقتوں میں تو لڑکیاں ادھر جاتی بھی نہیں تھیں جدھر ان کے جہیز کے کپڑے سِل رہے ہوتے تھے۔ کہاں اب رشتوں کا ذکر سُننا اور یوں کھِلّی کھِٹی کر کے ہنسنا۔ ہونے والی سسرال کی عورتوں تک سے پردہ ہوتا تھا۔" اماں جل کر بولیں۔

"بڑا اچھا دستور تھا اماں، کانی، لنگڑی پھوہڑ، بدمزاج، بدصورت، سب طرح لڑکیاں کھپ جایا کرتی تھیں۔" چھوٹے بھیا نے سنجیدگی سے کہا

یہ اور بات ہے کہ بے چارہ کھپاتا، وہ باقی زندگی سر پر ہاتھ رکھ کے روتا۔ بجیا کبھی کبھی چھوٹے بھیا جیسی ہی اُجاڑ بن جایا کرتی تھیں باوجود اس کے کہ ادھر وہ بہت کم سخن ہو گئی تھیں۔ اس وقت باز نہیں رہیں۔

"اجی روتا کیوں؟ مزے سے دوسری لے آتا تھا۔" بھیا نے ناریل کا چُورا پھانکتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

اماں کے ہاتھ سے سروتا گر گیا۔ چہرے پر راکھ اُڑنے لگی۔ چھوٹے بھیا چور بن گئے۔ زبان دانتوں تلے دبالی۔ یہ کترتی سی چلتی زبان کبھی کبھی تلوار کی زبان سے زیادہ بے رحم بن جاتی ہے۔ انہوں نے پانچ سو یں بار اپنی کبھی نہ پوری ہونے والی قسم دہرائی کہ اب وہ اِس طرح پڑپڑ نہیں بولیں گی۔ لیکن فی الحال تو تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔

"اماں، میری اماں۔ تم نہ تو کانی تھیں، نہ لنگڑی نہ بدصورت، نہ پھوہڑپن، نہ بے وفا، نہ بدزبان پھر ابا دوسری کیوں لے آئے؟ چھوٹے بھیا کے دِل میں کسی نے کچوکا لگایا اور اس ایک لمحے میں خیالات کی فوج دھڑا دھڑ مارچ کرتی ذہن کے آنگن سے گذر گئی۔ ہر وقت گھر کے کام کاج میں بیل کی طرح جُتی سب کی خدمت کرنے والی، شوہر کے پاؤں دھو دھو کر پینے والی نیک جفاکش اماں سے ابا نے کبھی محبت سے بات تک نہ کی۔ چھ بچے البتہ پیدا کر لئے۔ نہ جانے کل پرسے رِٹ کرتے میں اللہ میاں سے یہاں ... ہو گئی تھی کہ ہر زچگی میں اماں مر مر کے بچیں۔ بس اتنا اطمینان ہو جاتا کہ ملک الموت چالیس قدم دُور چلا گیا ہے تو اٹھ کر بیٹھ جاتیں اور جسم گھسیٹ کر سنبھال لیتیں۔ ان کے اباکے گھر تو نوکروں کی فوج تھی۔ نازک بدن، نازوں کی پالی اماں نے اپنے گھر ہل کے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ ابا بڑے نازک طبع تھے۔ وکالت پاس تو کر لی تھی، لیکن جی چاہا تو کورٹ گئے، نہیں چاہا تو پڑے شطرنج اور تاش کھیلتے رہے۔ کوئی موکل آیا تو اسے بھی ساتھ بٹھا لیا باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد بیچ بیچ کر ختم کر دی دادی مر گئیں تو ان کے سارے زیور بیچ کھائے۔ اماں نے اپنے زیور دینے سے انکار کیا تو گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ خیریت یہی تھی کہ دادی اپنے جہیز میں ملا ہوا مکان اور دو کانیں اماں کے نام کر گئی تھیں۔ گزارے کے لائق کرایہ آجاتا تھا۔ اور اماں کے پاس زیور بھی بہت سے تھے۔

بہتے بہاتے ابا دِلّی پہنچ گئے۔ وہاں کسی دور کی رشتے دار دولت مند بیوہ کی کنواری صاحبزادی آئیڈیل کی تلاش میں ادھیڑ ہو چکی تھیں۔ انہوں نے ابا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی بی کی پوری جائیداد بیٹی کے نام تھی۔ ابا نے ان سے نکاح پڑھوا لیا۔ بڑی بی نے چین کی سانس لی اور خوشی خوشی گھر گئیں۔ ابا کا بڑھاپا بڑے آرام سے گزر رہا ہے۔ کبھی کبھار آکر بچوں کو دیکھ جاتے تھے۔ جب سے دوسری بیوی سے اولادیں ہوئیں اِدھر کا رُخ کرنا بھی بند کر دیا۔ لیکن اماں نے کبھی بُرے الفاظ میں ابا کا ذکر نہیں کیا۔ ان کے نام کی چوڑیاں وہ اب بھی پہنتی ہیں۔ عید کے عید مہندی رچاتی ہیں۔

بدتمیز، گستاخ، مونہہ پھٹ، چھوٹے بھیا آنکھیں پٹپٹاتے اُٹھ گئے۔ گلے میں کچھ اٹکنے لگا تھا۔ اماں پیاری اماں۔ وہ زرینہ کے کمرے میں چلے آئے۔ اور کھسیانا پن مٹانے کو اس کی کتابوں پر مکا مار کر کہنے لگے۔ "اماں کو بغاوت کر دینا تھی۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو بھاگ جاتا ابا کو چھوڑ کر۔"

"مگر کہاں؟" زرینہ ہنس کر بولی۔ "اماں بے چاری کا تو میکہ بھی ختم ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟ جن کا میکہ ہوتا ہے وہ عورتیں کیا میکے بھاگ آتی ہیں؟ کیا میکہ سارے مسائل کا حل ہے؟" بجیا نے اُداس آنکھوں کے ساتھ سوال کیا۔ وہ بھی چھوٹے بھیا کے پیچھے پیچھے ادھر چلی آئی تھیں۔

ٹن ٹن ٹن۔ زرینہ اور چھوٹے بھیا کے ذہن میں بیک وقت کسی نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ چھوٹے بھیا نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور آنکھیں ٹیڑھی کر کے پوچھا۔ "تہمینہ، کیا ہوا تمہیں؟"

زرینہ کو کل رات کی بات یاد آگئی۔ سارے بچے اماں کے پاس انگیٹھی میں بھرے انگاروں کے

نتیجہ بغیر عنوان کے

'بانو' جون ۲۰۰۷ء کے شمارے میں مشرف عالم ذوقی کا افسانہ بغیر عنوان کے شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان ہماری بہنوں بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔

تمام عنوانات کو غور سے پڑھنے کے بعد ایم۔ خلیق خاں تاج (بھوپال) کے بھیجے ہوئے عنوان "چھاؤں کی تپش" کو پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

صہبا ندیم رضوی (بہار) کے بھیجے ہوئے عنوان "کانپتی روشنی" کو دوسرے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ انہیں تیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جارہی ہیں۔

نکہت فاطمہ (حیدرآباد) کے عنوان "اماوس کے بعد" کو تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جارہی ہیں۔

پسند آنے والے کچھ عنوانات یہ ہیں:- بیتا ہوا کل محترم جاوید (بنگال) "جھاگ کا طوفان" معین مرزا، کھلیان کی آگ (مرزا فیاض جیون بیگ) خود مصنف نے اپنی کہانی کا نام "چوپال کا قصہ" رکھا تھا۔

پاس بیٹھے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ کسی نے بھوبل میں آلو اور شکر قندیاں دبا دی تھیں اور بار بار راکھ کرید رہا تھا۔ چنگاریاں تیسری بار اڑیں تو اماں نے ماتھے پر ہاتھ مار لیا۔ "کیسے بے چین بچے ہیں۔ ارے کم بختو، گھر میں آگ لگاؤ گے کیا؟ ذرا چین سے بیٹھو۔" اور بجیا نے اپنی سیاہ آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں اور خاموشی سے کہا تھا۔ "اماں سمجھتی ہیں کہ آگ صرف چنگاریوں سے لگتی ہے۔"

یہ بجیا کیسی کیسی باتیں کرنے لگی ہیں۔ ان کو تو ہی ہی ہا ہا کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ شادی کے وقت بھی خاصی چوبیس پچیس برس کی یہ بھی تھیں۔ بقول اماں ڈھینگ کی ڈھینگ، لیکن جب دیکھو اُچھل کود، ہنسی مذاق۔ رخصتی کے وقت اماں نے نصیحت کی تھی۔ "دیکھو سسرال میں یہ بچھڑے کی طرح کلیلیں نہ کرنا۔ تمیز سے رہنا۔ شوہر سے زیادہ ہنسی مذاق نہ کرنا وہ خدائے مجازی ہوتا ہے۔ والی وارث ہوتا ہے عورت کا۔ بجیا سُرخ زرکار دوپٹے میں مونہہ چھپا کر کھی کھی کرکے ہنس پڑی تھیں۔ خیریت ہوئی جو لوگوں نے سمجھا کہ وہ بلک بلک کر رو پڑی ہیں۔

"کیا بات ہے بجیا؟ بتاؤ گی نہیں،" زرینہ نے بڑی محبت سے پوچھا۔ چھوٹے بھیا کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

"تہمینہ۔" چھوٹے بھیا نے بھاری آواز میں کہا۔ "ہمیں تو اعتماد تھا کہ اماں کی جفاکشی اور قربانیوں کی وجہ سے ہماری اِس نسل کی ناؤ بڑے آرام سے پُرسکون پانیوں پر رواں دواں ہے۔ ہم لوگوں کے پاس اچھی نوکریاں ہیں۔ بھیا کی اور تمہاری اچھی جگہ شادیاں ہوئیں۔ دونوں چھوٹی بہنوں کے اچھے رشتے آرہے ہیں۔ سارے کل پرزے صحیح جگہ فٹ ہیں۔ اماں نے مصلوب ہوکر ہم سب کی خوشیوں کی گارنٹی لی ہے۔"

"اور میں اماں کے اِس بھرم کو نہیں توڑنا چاہتی۔ وہ پہلے ہی بہت دُکھ دیکھ چکی ہیں اور شاید میں اپنا وہ گھر بھی نہیں توڑنا چاہتی جیسے میں نے دس برس میں اینٹ اینٹ کرکے کھڑا کیا ہے اور شاید میں نے اپنے بچوں کے محفوظ مستقبل کو مزید محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے لئے سارے راستے بند ہیں۔ سارے راستے۔"

بجیا آج کھُل گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ان کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔

چھوٹے بھیا نے اٹھ کر کنڈی لگا دی۔ کہیں اماں اِدھر نہ آنکلیں یا پھر بڑی بھابی۔

زرینہ بُت بنی سوچ رہی تھی: اور اماں نے بجیا کو رخصت کرتے وقت یہ بھی تو کہا تھا۔ جاؤ بٹیا، سدھارو۔ تمہارا زمانہ دوسرا ہے۔ تم پڑھی لکھی ہو، عاقل و بالغ اور ہوشیار۔ تمہاری تقدیر تمہاری مٹھی میں ہے۔ خدا تمہیں کبھی وہ دُکھ نہ دے جو میں نے دیکھے۔

تو کیا بجیا بھی وہی دُکھ دیکھ رہی تھیں، کیا زمانہ وہیں تھا جہاں سے صدیوں پہلے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔

"بالکل وہیں بھی نہیں۔" بجیا کہہ رہی تھیں میں نے جب طارق کو اچھی طرح سمجھا، اس وقت میں دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ پھر بھی میں اسے اپنے لئے چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ بہت سے اکھڑ، خشک مزاج، دقیانوسی خیالات والے مرد شادی کے بعد بہت بدل جاتے ہیں۔ میں نے سوچا پتھر کے اِس ٹکڑے سے تراش خراش کرکے وہ بُت نکال سکوں گی جو میرے تصوّرات کے محل سے ایستادہ تھا۔ بعد میں معلوم ہوا یہ وہ میٹریل جس سے ٹکرا کر سنگتراش کی چھینی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جب تک مجھے یہ معلوم ہو سکا، اس وقت تک میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ دس برس کی بیاہتا چونتیس پینتیس کی عورت، زندگی جس کے پاؤں میں بیڑیاں ہی بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ بے شک اماں کی طرح میں کولہو کا بیل نہیں ہوں۔ نہ مجھے مالی پریشانیاں ہیں اور نہ طارق نے کسی اور عورت سے شادی کی ہے۔ لیکن زندگی گیلی ریت کے بورے جیسی بوجھل ہے۔ بے رس و سپاٹ۔ چاہنے اور چاہے جانے کے سارے تصوّرات پاش پاش ہو چکے ہیں۔ میں گھر میں اِس طرح رہتی ہوں جیسے طارق کا محبوب کتا رہتا ہے۔"

"اور تم نے خاموشی سے اپنی اِس حیثیت کو قبول کرلیا ہے؟ لعنت ہے تم پر!" چھوٹے بھیا کے چہرے پر تنفر تھا۔

بجیا ہنسیں۔ ان کے اوپر کے دانتوں کا خوب صورت خلا اور موتی جیسے دانت کوندے اٹھے۔

"تو کیا کروں؟" بڑی سادگی سے انہوں نے پوچھا۔ "نہ میں اپنی قوّتِ بازو سے اپنے تین بچوں کو وہ آرام و آسائش مہیّا کر سکتی ہوں۔ میں اماں کو ان کی زندگی کا آخری اور جان لیوا صدمہ بھی نہیں پہنچا سکتی اور شاید خود کو بھی نہیں۔ ہاں چھوٹے بھیا۔ کسی سے نفرت کرنا بہت آسان ہے اور محبت کرنا بھی۔ لیکن ذرا سی محبت کی وجہ سے نفرت نہ کی جاسکے تو زندگی سولی پر ٹنگ جاتی ہے۔ یہی ہے میرا اور طارق کا رشتہ۔"

"پھر۔؟" چھوٹے بھیا سر کھجا رہے تھے۔ شاید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

"پھر کیا پیارے بھیا۔ اگلے ہفتے میں واپس لوٹ جاؤں گی۔ بچوں کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ اور میں یہ سوچ کر یہاں کبھی نہیں آئی تھی کہ مجھے واپس نہیں جانا ہے۔ اماں کے پیروں میں جو بیڑیاں تھیں وہ سماج نے انہیں پہنائی تھیں۔ میں خود اپنی بیڑیوں کی اسیر ہوں۔ اور چھوٹے بھیا، یہ اِتنا لمبا لیکچر میں نے صرف یہ بتانے کی خاطر دیا ہے کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جانا اور بغاوت کرنا کسی بھی عورت کے لئے اتنا آسان نہیں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔ اِس لئے کہ زمانہ بدلنے پر بھی انسانی رشتوں کی پیچیدگی جوں کی توں ہے،" بجیا یکایک خاموش ہو گئیں۔

جاڑوں کی شام کی کم زور دھوپ نے کھڑکی کی جالیوں سے گزر کر شطرنجی، سائے بُنے تھے۔ وہ ایک ایک کرکے غائب ہو چلے تھے۔ کمرے میں سناٹا تھا اور ایک دھواں دھواں سی کیفیت۔ کچھ ویسی ہی جیسی اب سارے مادّی سُکھ ملنے کے باوجود اماں کے چہرے پر طاری رہتی ہے۔

"کھٹ!"

زرینہ نے اُٹھ کر بجلی کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ باہر محلہ کے بچے گھیرا بنا کر گھوم رہے ہیں اور ساتھ ساتھ گاتے جاتے ہیں: دیا بتی جل جا۔ چل مائی گھر جا۔ چل مائی گھر جا..... چل مائی...."

بجیا نے اُٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دئے ہیں مگر آواز اب بھی ویسی ہی صاف اور تیز ہے۔ ■■

معذرت کرنے کا فن

حسن کریم

انسان کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو، اس سے غلطی ہونا بعید نہیں۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اس کے لئے معذرت کرنا اخلاقی جرات کی نشانی ہے۔ بڑے آدمی کا اپنی غلطی تسلیم کرنا اس کی بڑائی کی علامت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ پھل دار درخت ہمیشہ جھکتا ہے تاہم معذرت کرنے کے بھی کچھ اصول اور آداب ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے شرما شرمی معذرت کر بھی لی تو دوسرے فریق کو اس بات کا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ آپ نے دل سے اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ آپ نے صرف فائل کا پیٹ بھرا ہے۔ خلوص سے معذرت کرنے کے لئے آپ کو دوسرے فریق سے آنکھیں ملا کر بات کرنی چاہئے۔ نظر کو زمین پر گاڑ کر معذرت کرنا بے دلی کی نشانی ہے۔ اگر آپ سر اٹھا کر اور نظر ملا کر معذرت کریں گے تو دوست یا رشتہ دار کو آپ کے خلوص پر یقین آجائے گا۔

معذرت کرتے وقت خود کو کسی دوسرے کام میں نہ اُلجھائیں۔ مثلاً آپ نے دانستہ یا نادانستہ اپنی سہیلی کا دل دکھایا ہے، دوبارہ اس سے ملاقات ہو تو آپ کا دل چاہتا ہے کہ اس سے صلح صفائی ہو جائے لیکن شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ آپ کپڑے سینے بیٹھ جاتی ہیں۔ سلائی کے دوران بھی آپ کی نظر کپڑے پر ٹکی ہوئی ہے اور آپ دھیرے دھیرے معذرت کر رہی ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ آپ کے بچے نے گلاس توڑ دیا۔ آپ نے اُسے نوکر کی غلطی سمجھا اور اُسے بے نقط سُنا ڈالی۔ بعد میں آپ کو حقیقت معلوم ہوئی تو آپ کا فرض ہے کہ آپ نوکر سے معذرت کریں۔ زبانی معذرت ضروری ہے۔ ناانصافی ہوگی کہ اگر آپ اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے اُسے روپیہ دو روپیہ بخش دیں یا اپنے خاوند کا پرانا کوٹ دے دیں۔ ان چیزوں سے معذرت کی تلافی نہیں ہوتی۔

معذرت کے فن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرلے۔ ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے بہانہ نہ تراشے اور دوسروں پر اپنی ذمہ داری کا بوجھ رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ مثلاً کسی محفل میں بحث کے دوران میں کسی سے آپ کی تو تو میں میں ہو گئی۔ بات بڑھ گئی۔ آپ نے بھی غصے میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ بعد میں آپ کو خیال آیا کہ زیادتی آپ کی تھی۔ لیکن ساتھ میں یہ خیال بھی آیا کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اس طرح آپ آدھی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں۔ یہ فرار کا راستہ ہے اسے اختیار نہ کیجئے۔

آدھی ذمہ داری لینے سے بات نہیں بنتی۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ پوری ذمہ داری سر پر لے لیں۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ بہن ساری غلطی میری تھی۔ اس معذرت کے بعد آپ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا۔ آپ کی سہیلی جواب دے گی: نہیں بہن غلطی میری بھی تھی، در گزر کرنے کے لئے انسان ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔

جب انسان خود بڑھ کر اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے تو لوگوں کی نظر میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا فریق جب یہ بات دیکھتا ہے تو اس کی رگ حمیت بھی پھڑکتی ہے اور وہ بھی بڑھ کر اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے۔ اِس طرح آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرکے دوسرے کو بھی اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرے نتیجے میں آپ کی ذمہ داری آدھی رہ جاتی ہے۔ لیکن ایسا پوری ذمہ داری اپنے سر لینے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ معذرت کا دائرہ دوستوں، رشتہ داروں اور ملاقاتیوں تک محدود ہے۔ بھائی، بہن، میاں بیوی، بچے والدین اس کی زد میں نہیں آتے۔ یہ بات غلط ہے۔ اِن رشتوں میں بھی اِس بات کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی دوسرے رشتوں میں۔ ماں باپ بچوں پر زیادتی کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اگر ان سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ بچوں سے معذرت کرنے کا خیال بھی دِل میں نہیں لاتے۔ اس طرح وہ ظلم اور ناانصافی کا بیج بوتے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے بیٹے کو ناحق الزام دیا اور بعد میں آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو آپ کا فرض ہے کہ آپ اس سے کہیں کہ بیٹا مجھ سے چوک ہو گئی۔ اس طرح اس کا دِل بڑا ہو جائے گا۔ اس کے دل سے کدورت کا غبار دُھل جائے گا۔

میاں بیوی کے درمیان بھی معذرت ضروری ہے۔ شوہر اکثر انا پرست ہوتے ہیں وہ معذرت کرنا چاہتے ہیں، مگر الفاظ اُن کے حلق میں اٹک جاتے ہیں۔ اگر کبھی معذرت کا اظہار کر بھی دیا تو اس سے اُن کی عادت نہیں سُدھرتی۔ ایک خاوند کو شک کی بیماری تھی۔ وہ ہر بات میں بیوی پر شک کرتے۔ شک دُور ہو جانے پر معذرت بھی کرتے، لیکن اپنی عادت نہ چھوڑتے۔ اِس قسم کی معذرت بے کار ہے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر آپ خلوص سے معذرت کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ وہ بات پھر کبھی نہیں دہرائیں گے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے اور معذرت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، لیکن وہ غلط الزام پر معافی مانگنے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے بعض

اوقات اپنی غلطی نہ ہونے پر بھی معافی مانگنی پڑتی ہے۔ مثلاً آپ کا اپنی ساس سے جھگڑا ہوا غصّے میں آپ کے مونھ سے ان کے لئے جھوٹی یا فندی کا لفظ نکل گیا۔ آپ کا مقصد اُنہیں بُرا بھلا کہنا نہیں تھا۔ لیکن یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے ہیں اس لئے ان کے لئے معافی بھی آپ کو ہی مانگنی پڑے گی۔

آپ کا خاوند سے جھگڑا ہو رہا ہے، آپ حق پر ہیں۔ لیکن کچھ ہی دیر میں آپ کی بہن اپنے خاوند کے ساتھ آپ کے گھر آنے والی ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ خاوند سے معذرت کرکے بات وہیں ختم کردی جائے تاکہ بہن کے آنے تک مطلع صاف ہوجائے۔

آپ اپنی سہیلی سے دوسری سہیلی کے متعلق بات کررہی ہیں۔ اِس گفتگو میں اچھی اور بُری دونوں باتیں شامل ہیں۔

اِن میں وہ باتیں بھی شامل ہیں جو آپ نے لوگوں سے سُنی ہیں۔ آپ اُنہیں دہرا رہی ہیں۔ آپ کی سہیلی نے ساری باتیں دوسری سہیلی کو سُنادیں۔ یا کسی تیسرے اِنسان نے آپ کی باتیں سُن لیں اور آپ کی چغل خوری کی۔ اِس صورت میں آپ کیا کریں گی؟ آپ سنی سُنائی باتیں دہرا رہی تھیں؛ دروغ برگردنِ راوی، کہنے سے بات نہیں بنے گی آپ کو اُس کے لئے معذرت کرنی پڑے گی۔

کچھ لوگ اِس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ وہ صرف اسی صورت میں معذرت کریں گی جب اُنہیں اس بات کا یقین ہوجائے کہ غلطی ان کی ہے۔ بے جا الزام پر وہ ہرگز معذرت نہیں کریں گی۔ یہ لوگ حق پر ہیں، لیکن ان کے دوست ایک ایک کرکے انہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اِس عادت میں ایک خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ ہی خود کو حق پر سمجھتے ہیں۔ اب ان کی غلطی ثابت کرنے کے لئے کون مغز کھپائے۔ بہتر یہی ہے کہ ان سے دُور دُور رہا جائے۔ عقلمند انسان جھگڑے کو طول دینے کی بجائے معذرت کرکے اپنا دامن بچا لیتا ہے۔

معذرت قبول کرنا معذرت کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ اگر بازار میں آپ کا پاؤں کسی عورت کے پاؤں پر پڑ گیا اور آپ نے اس سے " سوری " کہہ دیا تو بات وہیں ختم ہو جانی چاہئے لیکن بعض اوقات بات وہیں ختم نہیں ہوتی، دوسری عورت چلّاتی ہے۔ سوری کی بچی! اندھی ہے! دیکھ کر نہیں چل سکتی۔ اَب آپ کیا کرسکتی ہیں؟ جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔ ایسے موقع پر خاموشی ہی بہتر ہے۔

جب آپ سے کوئی معذرت کرے تو آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ اُس نے اپنی انا کے پہاڑ کو سر کیا ہے۔ ایسا کرنا خاصا دشوار ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ اِس کوشش کی داد دیں اور کہیں! نہیں بہن کوئی بات نہیں۔ مجھے تو اِس بات کا خیال بھی نہیں تھا۔ آپ کے مُونہہ سے انجانے میں یہ بات نکل گئی ہوگی، میں خود کئی بار ایسی غلطی کرچکی ہوں۔ آؤ چائے پئیں۔ اِس طرح سارا غبار دُھل جائے گا۔

■■

ساون کی پھواروں میں

آگ لگی ہے گلشن گلشن، ساون کی پھواروں میں
کیسے بچائیں اپنا دامن، ساون کی پھواروں میں

لطف اُٹھائیں محلوں والے ساون کی پھواروں میں
آنکھیں ہماری روئیں ساون، ساون کی پھواروں میں

آنچ لپکتے شعلوں کی ہے بھیگی بھیگی فضاؤں میں
کس کا جلا ہے آج نشیمن، ساون کی پھواروں میں

ٹپ ٹپ ٹپکے چھت سے پانی کمرے میں دالانوں میں
ڈوب چکا ہے چوکا برتن، ساون کی پھواروں میں

ماں کی گود میں سہمے بچے، باہر جھانکیں کیسے اب
خوف سے لرزاں لرزاں ہے من، ساون کی پھواروں میں

ساون کی پھواروں میں تم لطف اٹھاؤ عیش کرو
میرا کمرہ بھی ہے آنگن، ساون کی پھواروں میں

جاڑوں میں تھی برفانی تو گرمی میں تھی آگ لہو
اور ہے بھیگا بھیگا تن من، ساون کی پھواروں میں

اونچے اونچے ایوانوں میں اکثر ساری ساری رات
چوڑی کھنکے باجے کنگن، ساون کی پھواروں میں

پگڈنڈی پر کھیتوں کی اب گھوم رہے ہیں البیلے
شاید گوری کے ہوں درشن، ساون کی پھواروں میں

پنگھٹ پر اک گاؤں کی گوری اپنی سکھی سے کہتی تھی
مجھ کو بہت یاد آئے ساجن، ساون کی پھواروں میں

دن تو جیسے تیسے گزرے گوہر ہم ناداروں کے
رات میں دل کی تیز ہو دھڑکن، ساون کی پھواروں میں

گوہر شیخپوری

برکھا رانی

بدلی میری دیس دلاری اس کی ادائیں سب کو پیاری
پربت پربت اس کا ڈیرا طلق ہوا پر اس کی سواری
بجلی اس کے کان کا جھومر سرمئی بدلی اس کی ساری
جگنو اس کے رات کے ساتھی چاند ستارے اس پر واری
بھنورے اس کی کالی آنکھیں کوئل اس کے درد کی ماری
رات کی چھاتی دھڑکی جائے بولے پپیہا باری باری
اس کو کسی سے چھوٹ نہیں ہے سب سے انوکھی ہے یہ ناری
رنگ دکھاتی رہتی ہے اس کا تتلیاں اُڑ کر باری باری
ہوتی ہے ساون میں وہ سیانی بھادوں نذیر اس کی ہے جوانی
ساتھ ہے اس کے آندھی پانی نام ہے اس کا برکھا رانی
برسا نذیر آج ایسا پانی پیاسوں کے گھر تک پہنچا پانی
سوکھ گیا گرمی کا پسینہ جم کے جو برسا پہلا پانی
سوکھ رہے تھے ندی نالے بھر لیا سب نے اپنا پانی
ایک میں سب کی بدلی نظریں بھرتی ہے آکر سب کا پانی
کیسے بھلا دوں بات ہے کل کی خون تھا سستا مہنگا پانی
خون کے دھبے سب دھل جائیں بادلو برسو ایسا پانی
جاؤ جہاں بھی چاہو جانا بھول نہ جانا اپنا ٹھکانا
رات ہے اور برسات کا موسم گھات بھی کر سکتا ہے زمانہ
شام سے پہلے جلتے ہو جاؤ رات سے پہلے لوٹ کے آنا

نذیر بنارسی

صبر

کوثر محمود

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ گھر کے سب ہی لوگ آتش دان کے آگے بیٹھے ہاتھ سینک رہے تھے۔ اماں پاندان سامنے رکھے بڑے اطمینان سے چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ نوکروں کو ہدایتیں بھی دے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے پکار کر کہا "ارے ہاں، چھوٹی بہو، تم کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟ لاکھ منع کیا ہے کہ سردی کا موسم ہے، باہر برفیلی ہوائیں چل رہی ہیں، باہر نہ نکلو۔ مگر کیا مجال جو بات مان لیں۔"

"اماں، ذرا کام کر رہی ہوں۔ کام نہ کروں تو وہ بڑی بہو....."

"کیا مطلب؟" بڑی بہو کا نام سن کر اماں چراغ پا ہو گئیں۔ "اس کی کیا مجال ہے جو تم کو آدھی بات بھی کہہ دے۔"

بڑی بہو کی تو اماں جان دشمن تھیں، چوں کہ ان کے بڑے لڑکے جاوید نے اماں کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اماں اس شادی کے سخت خلاف تھیں، کیوں کہ ایک تو اماں اپنے سسرال والوں سے شروع سے ہی نفرت کرتی تھیں۔ دوسری وجہ ان لوگوں کی غربت تھی۔ مگر جاوید کا خیال تھا کہ اماں اپنے لاڈلے بیٹے کی اس غلطی کو معاف کر کے بہو کو گلے سے لگا لیں گی۔ اسی خیال سے وہ عائشہ کو گھر لے آئے تھے۔ لرزتی کپکپاتی عائشہ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ جاوید ساتھ تھے سب سے پہلے وہ عائشہ کو اماں کے پاس لے گئے۔ گھر کے دوسرے افراد بھی اسی کمرے میں تھے۔ اماں نے دلہن کو دیکھتے ہی چیخنا چلّانا اور برے برے کوسنے دینا شروع کر دیا۔ "ارے بیٹے! میں نے تجھ کو اسی دن کے لئے پالا تھا! کیا کیا ارمان تھے میرے دل میں کہ دھوم دھام سے شادی کروں گی۔ خالی خولی جنم جلی کو میرے پاس لے آیا۔ ہائے کیا کیا سوچا تھا۔ مہینوں پہلے سے ڈھولک بجے گی۔ جوڑے بناؤں گی۔ بینڈ باجے سے بیاہ کے لے کر آؤں گی۔ خوب جہیز آئے گا۔ سب لوگ میری واہ واہ کریں گے۔ ارے اب میں سب کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" چیختے چیختے اماں بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئیں۔

مگر عائشہ اسی طرح کھڑی زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ آنسوؤں کے قطرے زمین پر گر گر کر جذب ہوتے رہے۔

گھر کے اور لوگ بھی خاموش نفرت کے ساتھ دلہن کو دیکھتے رہے۔ جب گھر والوں کا یہ رویّہ دیکھا تو جاوید علی زور سے گرجے: "لعنت ہے اس گھر پر اور اس جھوٹی واہ واہ پر۔ [illegible] اس گھر سے۔ اب میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ چلو عائشہ۔"

سیما جو جاوید علی کی اکلوتی اور بہت پیاری بہن تھی، ایک دم بیچ میں آگئی "نہیں بھائی جان! آپ اور بھابی کہیں نہیں جائیں گے۔ آخر اس گھر میں آپ کا بھی تو حصّہ ہے۔" پھر وہ جلدی سے بھابی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے بڑی محبت سے اوپر کمرے میں لے گئی۔ اوپر کا حصّہ بالکل الگ، جاوید علی کے قبضے میں تھا۔ سیما نے عائشہ سے کہا "بس بھابی، آج سے آپ یہاں رہیں گی۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ابھی ایک سال تو میں بھی یہاں رہوں گی، کیوں کہ میرے شوہر باہر گئے ہوئے ہیں۔"

سیما کی باتوں سے عائشہ کی کچھ ڈھارس بندھی۔

رات دن گزرتے رہے۔ اماں بات بات پر عائشہ کو طعنے دیتی رہتیں۔ نوکروں کے سامنے، گھر کے دوسرے لوگوں کے سامنے بڑی بہو کو برا کہنا ان کا فرض تھا۔ عائشہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اس کی صحت گرنی شروع ہو گئی۔ جاوید علی بھی کچھ بدلے بدلے ہو گئے۔

ایک دن سیما کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ کوٹھی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ مگر عائشہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ نیچے کس طرح جاؤں۔ اماں مہمانوں کے سامنے پھر کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گی۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ جاوید علی آ گئے کہنے لگے "ارے! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ وہاں سب مہمان آ بھی چکے ہیں۔ کمال ہے! سیما تم کو کتنا چاہتی ہے اور ایک تم ہو کہ اس کی خوشی تک میں شریک نہیں ہونا چاہتی۔"

جاوید بھی اسی کو برا بھلا کہہ کر چلے گئے۔ عائشہ آہستہ آہستہ تیار ہوئی اور زندہ لاش کی طرح نیچے اتر آئی۔

"بھابی آپ نے آنے میں اتنی دیر کر دی میں نے تو ابھی تک آپ کے انتظار میں کیک تک نہیں کٹوایا۔"

"دیکھ لو، کتنی جان دیتی ہے بھاوج پر! اور ایک بھاوج ہے کہ مزاج ہی نہیں ملتے صورت نہ شکل، نخرے اتنے! اگر کچھ ہو گئیں

تو شاید نیچے ہی نہ اُتریں۔"

امّاں اور نہ جانے کیا کیا بولتیں کہ بیچ میں سیما آگئی "یہ کیا بات ہے امّاں! آپ ہر وقت ایک ہی موڈ میں کیوں رہتی ہیں؟ یہ کوئی موقع ہے جو آپ نے پھر حملہ شروع کر دیا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ ساس بننے کا شوق ہے تو ذرا چھوٹی بہو کو ایک لفظ کہہ کر دکھا دیجیے جب جانیں!"

عائشہ اتنے میں واپس اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ وہاں اوندھی لیٹ کر وہ خوب روئی اور سوچتی رہی کہ اگر میں اتنی ہی فالتو تھی تو میرے امّاں ابّا نے میرا گلا گھونٹ کر کیوں نہ مار دیا۔ کیا ضرورت تھی میری شادی جاوید سے کرنے کی۔ وہ سوچتی رہی اور اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی۔ آخر صبح ہوتے ہوتے وہ سو گئی۔

دن چڑھے جب عائشہ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہے سب لوگ گھبرائے ہوئے ہیں۔ جاوید علی فون پر ڈاکٹر سے بات کر رہے ہیں۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور اس نے جاوید علی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ کس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے؟"

"امّاں کو دل کا دورہ پڑا ہے" یہ کہہ کر گھبرائے ہوئے جاوید علی چلے گئے۔ عائشہ سوچنے لگی: "یا اللہ! اتنی جلدی بدلہ۔۔" مگر فوراً ہی اس نے خود کو ملامت کی اور وہ بھی نیچے کے کمرے میں پہنچ گئی۔

کمرے میں گھر کے سب لوگ جمع تھے صرف امّاں کی لاڈلی چھوٹی بہو (جو بقول امّاں کے بہت بڑے گھر کی بیٹی تھی) کمرے میں نہیں تھیں۔

تھوڑی دیر میں ہی دروازہ کھلا اور چھوٹی بہو داخل ہوئیں "اب طبیعت کیسی ہے امّاں کی؟"

"ٹھیک نہیں ہے" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"میں ذرا بھیّا کے گھر جا رہی ہوں" چھوٹی بہو اطلاع دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

"یہ تو جا رہی ہیں!" عائشہ تلملا کر رہ گئی۔

"بھابی، آپ کو پتہ نہیں، امّاں اس کی بات کا بالکل بُرا نہیں مانیں گی۔ وہ ان کی ایسی باتوں کی عادی ہیں۔ آپ ذرا امّاں کے پاس بیٹھ جائیے۔ میں اپنی بچی کو دیکھ آؤں۔ یہ دوا دو گھنٹے بعد امّاں کو دینی ہے۔"

یہ کہہ کر سیما چلی گئی اور عائشہ کرسی لے کر بالکل امّاں کے قریب بیٹھ گئی۔ امّاں بے سُدھ بے ہوش پڑی تھیں۔ عائشہ سوچ رہی تھی: انسان کتنا کمزور ہے۔ ذرا سی دیر میں دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ہم کتنا بھی گھمنڈ کر لیں، مگر اس جسم پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ رات بھی امّاں کتنی ظالم اور گھمنڈی لگ رہی تھیں اور اب یہ دوسروں کی محتاج پڑی ہیں۔ اس پر بھی لوگ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔

سوچتے سوچتے کرسی پر بیٹھے بیٹھے عائشہ کو جھپکی آگئی۔ چند منٹ بعد ہی ہلکے سے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا، امّاں بڑے غور سے اس کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ ایک دم اُٹھ کر امّاں کے قریب گئی "اب کیسی طبیعت ہے؟"

امّاں نے نحیف آواز میں کہا "ٹھیک ہے۔ تم برابر جاگتی رہی ہو۔ آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ جاؤ، جا کر سو جاؤ۔"

"آپ میری فکر نہ کیجیے۔ ڈاکٹر نے آپ کو بولنے سے منع کیا ہے۔" یہ کہہ کر عائشہ نے امّاں کو لیٹے لیٹے دوا پلائی اور جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

امّاں کے چہرے پر محبت اور ممتا کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ "نہیں بیٹی، تم سو جاؤ۔ سیما کو بھیج دو۔"

اتنے میں سیما خود ہی آگئی "جائیے، اب آپ سو جائیے۔"

عائشہ بوجھل قدموں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ امّاں نے پہلی بار آج اس کو بیٹی کہا تھا۔ بار بار اس کے کانوں میں وہی لفظ گونج رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ دیر تک نہ سو سکی۔

صبح کو سیما بھاگی بھاگی عائشہ کے کمرے میں آئی "جلدی سے بھابی، آپ کو امّاں بلا رہی ہیں۔"

"مجھے!" عائشہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جی ہاں ۔۔۔ جلدی چلیے۔ بس اب سب دُکھ درد دُور ہو جائیں گے۔"

امّاں بیڈ پر تکیوں کے سہارے لگی بیٹھی تھیں۔ عائشہ کمرے میں داخل ہوئی تو امّاں نے بڑی محبت سے کہا "آؤ، میرے پاس بیٹھو۔"

چھوٹی بہو بھی اس وقت امّاں کی مزاج پُرسی کرنے آئی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر وہ جل بھن گئیں "دُلہن بیگم، اگر اپنے باپ کے گھر سے کپڑے نہیں لائیں تو کیا شوہر کے گھر کے بھی کپڑے نہیں پہنیں گی؟"

پہلے تو امّاں چھوٹی بہو کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھیں، مگر اس وقت چھوٹی بہو کا کہنا انہیں بہت بُرا لگا۔ غصے سے کہنے لگیں "چھوٹی بہو، بس بہت ہو گیا۔ آئندہ ایک لفظ بھی تم بہو کو نہیں کہو گی۔ یہ بڑی بہو ہے اور تم چھوٹی ہو۔ چھوٹی ہی بن کر رہو۔"

چھوٹی دُلہن یہ سب آنکھیں پھاڑے سُن اور دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے ہوا۔

"جاؤ، جا کر جاوید کو بُلا لاؤ۔ میں کل ہی اپنی بہو کے لیے دعوتِ ولیمہ کروں گی، اپنی بیٹی کو دوبارہ اپنے ہاتھوں سے دُلہن بناؤں گی۔ میں نے اس کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے ۔۔۔ بیٹی، میں اپنے کیے کی معافی مانگتی ہوں ۔۔۔ ارے بیٹی سیما، ذرا میرا صندوقچہ تو لا۔"

سیما بہت خوش تھی۔ جلدی سے صندوقچہ لے آئی۔ امّاں نے وہ سارے گہنے جو جاوید کی دُلہن کے لیے برسوں سے رکھے تھے، بڑی بہو کو پہنا دیے۔ عائشہ آنکھیں پھاڑے سب دیکھ رہی تھی۔ ایک دم امّاں نے اس کو سینے سے لگا لیا۔

عائشہ امّاں کی گود میں سر رکھے آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھیں، مگر یہ سسکیاں یہ آنسو پہلے کے آنسوؤں سے مختلف تھے۔ یہ تو خوشی کے آنسو تھے، جو ماں کے آنچل میں گر گر کر جذب ہو رہے تھے۔

○○

ہیلتھ کلب

"بستر مرگ" سے بچے کو کیسے بچائیں

* خالدہ شاکر

ہم نے جب یہ سُنا کہ عطیہ کے یہاں تین بیٹوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا ہے تو دوسرے ہی دن مبارک باد دینے کے لئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں جاکر پتہ چلا کہ انہوں نے ایک بہت ہی خوب صورت اور تندرست بچے کو جنم دیا ہے۔ لیکن وہ اگلے دن سوکر اٹھیں تو بچہ پلنے میں مُردہ حالت میں پڑا تھا۔ موت کس وجہ سے ہوئی اس کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہو سکا۔ ڈاکٹروں نے اِس حادثے کو بسترِ مرگ کے نام سے منسوب کر دیا۔

آیئے ہم اب یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بسترِ مرگ کیا ہے؟ کیوں یہ مرض اچھے خاصے بچے کو ماں کی گود سے محروم کر دیتا ہے۔ بسترِ مرگ کا اصلی مطلب ہے کہ ماں نے ایک تندرست بچے کو دودھ پلا کر سُلا دیا اور اگلے دِن بچہ مردہ حالت میں پایا گیا۔

کئی بار اس موت کی صحیح وجہ کا پتہ نہیں لگ پاتا۔ بسترِ مرگ کی خاص وجہ سانس کی نلی کا بند ہو جانا ہے۔ سانس کی نلی میں کئی بار دودھ کا داخلہ اہم رول نبھاتا ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ مونہہ کے اندر سانس کی نلی اور کھانے کی نلی پاس پاس ہوتی ہیں۔ جب بچے کو دودھ پلا کر پلنے میں لٹایا جاتا ہے تو اس کے بعد ڈکار آنے پر کئی دفعہ ڈکار کے ساتھ ساتھ دودھ بھی نکل آتا ہے اور سانس کے ساتھ یہ دودھ سانس کی نلی سے ہوتا ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور وہاں جاکر موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اِسی لئے ڈاکٹر ہمیشہ غیر تجربہ کار ماؤں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ دودھ پلانے کے بعد بچے کو کندھے سے لگا کر اس کی کمر تھپتھپا کر ڈکار دِلوائیں اور جب تک ڈکار نہ آجائے بچے کو نہ لٹائیں۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نومولود بچوں کو مائیں لٹا کر دودھ پلاتی ہیں۔ لیٹ کر دودھ پلانے کے سبب ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لیٹے لیٹے نیند آنے سے یا پھر سُستی کی وجہ سے مائیں بچے کو ڈکار نہیں دلوائیں اور ڈکار کے ساتھ اُلٹا ہوا دودھ بچے کی موت کی وجہ بن جاتا ہے۔

کئی دفعہ زیادہ مقدار میں دودھ پلانے سے بھی بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچہ دودھ پینے کے باوجود روتا رہتا ہے۔ بچے کے رونے کی وجہ ضرورت سے زیادہ دودھ پینا ہو سکتی ہے کیونکہ بچے کا پیٹ پھول جاتا ہے اور پیٹ میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ ماں یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کا بچہ ابھی بھوکا ہے اِس لئے وہ اور زیادہ دودھ پلاتی ہے اور بچہ جب تک اُلٹی نہ کر دے وہ پلانا بند نہیں کرتی۔ اس کے سبب بھی بچہ موت کے مونہہ میں پہنچ جاتا ہے۔

بعض اوقات بچے کی پیدائش کا عمل بہت مشکل بن جاتا ہے۔ اس مشکل کے وقت ماں کی 'پیلوس' کی ہڈیوں کے درمیان بچے کا سر دَب جاتا ہے اور اس کے دماغ کو چوٹ پہنچتی ہے۔ اس کے اندر خون کا دوران صحیح نہ ہونے کی وجہ سے بچے کی موت واقع ہو جاتی ہے اس لئے ایسی نازک حالت میں ڈاکٹر آپریشن کو ترجیح دیتے ہیں۔

بسترِ مرگ کی ایک بڑی وجہ ماحول کا غیر مناسب ہونا بھی ہے خاص طور پر ان بچوں کے لئے جو بچے وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں ایسے بچے سخت سردی یا گرمی برداشت نہیں کر سکتے اگر انہیں سردی سے نہ بچایا جائے تو یہ سردی جان لیوا بھی بن جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ سردی سے احتیاط بھی خطرناک ہو جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مائیں بچے کو ضرورت سے زیادہ گرم کپڑوں میں لپیٹ دیتی ہیں اور سردی سے بچاؤ کے لئے مونہہ اور ناک پر کمبل یا لحاف ڈال دیا جاتا ہے۔ اِس سے بچے کا دم گھٹ جاتا ہے۔ بہت سے لوگ کمرے میں انگیٹھی جلا کر رکھ دیتے ہیں اور کمرے میں حبس ہو جاتا ہے۔ انگیٹھی سے نکلی کاربن مونو آکسائیڈ ماں اور بچہ دونوں کے لئے مضر بن جاتی ہے۔ ہمیشہ خیال رکھیں بچے کے کمرے میں درجہ حرارت ۲۶-۲۵ سینٹی گریڈ کے آس پاس ہونا چاہئے۔ تازی ہوا کے آنے کا بندوبست ضرور ہونا چاہئے۔ بچے کا مونہہ کبھی ڈھک کر نہ سُلائیں۔

اگر مائیں اِن چند باتوں کا خاص دھیان رکھیں اور احتیاط سے کام لیں تو بچے کو خطروں سے دور رکھ سکتی ہیں۔

زچگی کے دوران نارمل طریقہ یا آپریشن دونوں میں کون سا طریقہ نسبتاً زیادہ محفوظ ہوگا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹروں سے مشورہ ضرور لیں۔ اِس سے پیدائش کے وقت ہونے والی دیگر تکلیفوں سے ماں اور بچے دونوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

بچے کو دودھ پلانے کا صحیح طریقہ اپنائیں بھول کر بھی لیٹ کر دودھ نہ پلائیں اور ماؤں کو اتنا دودھ نہیں پینا چاہئے کہ بہت زیادہ بہنے لگے اور سختی کی وجہ سے دودھ پلاتے وقت بچے کی ناک دبے۔ ناک بچا کر دودھ پلائیں۔

دودھ پلاتے وقت اِس بات کا خیال رکھیں کہ جس طرف سے آپ دودھ پلا رہی ہوں اس طرف کی کہنی کو اِتنا موڑیں کہ کہنی کے موڑ پر بچے کا سر آجائے۔ بچے کا سر اس کے دھڑ سے تھوڑا اونچا رہنا چاہئے۔ دودھ پلانے کے بعد کندھے سے لگا کر ڈکار ضرور دلوائیں۔ دودھ خود اپنا پلائیں یا شیشی سے پلائیں اس کا دھیان رکھیں کہ بچے کو ڈکار آجائے۔

وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں کی پرورش میں خاص احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمزور بچوں کو وقفے وقفے سے دودھ دیں لیکن کم مقدار میں۔ کمرے میں انگیٹھی جلا کر رکھیں۔ سوتے وقت بچے کا مونہہ نہ ڈھکیں۔

تبسم

مالک فقیر سے : تم ہر روز صرف ہمارے مکان پر ہی کیوں مانگنے آتے ہو۔ روٹی کیا اور گھروں سے نہیں ملتی۔

فقیر : جی یہ ڈاکٹر کا حکم ہے۔

مالک : ڈاکٹر کا حکم کیسے۔

فقیر : مجھے پیٹ کی بیماری ہے اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کہ جو خوراک تمہارے لئے ایک بار موزوں ثابت ہو ہمیشہ اسی کو جاری رکھو۔ (سید ریاض احمد، حیدرآباد)

●

"یا اللہ اس سے تو ہمیں جہنم میں پھینک دے" دو آدمی اللہ سے یہ بددعا خود اپنے حق میں کر رہے تھے۔ وہ دونوں سائبیریا کے تھے۔ سردی کے مارے ان کے دانت بج رہے تھے۔ انتہا ٹھنڈ سے ان کے بدن کا خون جما جا رہا تھا جس سے بچنے کے لئے وہ یہ دعا مانگ رہے تھے تاکہ جہنم کی آگ سے ان کی یہ بلا کی سردی ختم ہو جائے گی۔ (ظفر اقبال، فیروزآباد)

●

ایک صاحب نے اخبار میں کچھ اس طرح اشتہار دیا : ضرورت ہے ایک نوکر کی۔ آدھا گھنٹہ صبح اور آدھا گھنٹہ شام ڈیوٹی ہوگی۔ دونوں وقت روٹی ملے گی۔ تنخواہ کچھ نہیں ملے گی۔

ایک شخص نے یہ اشتہار پڑھا اور ان صاحب کے پاس پہنچا اور ان سے کام دریافت کیا۔

وہ صاحب بولے۔ روزانہ صبح و شام لنگر میں روٹی تقسیم کی جاتی ہے تم وہاں سے جا کر لایا کرو اور میرے لئے بھی چار روٹیاں لے آیا کرو بس یہی ایک کام تمہارے ذمے رہے گا۔

●

ماسٹر صاحب نے اپنے شاگردوں سے پوچھا بتاؤ بیت الخلا کسے کہتے ہیں۔

جلدی سے ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ سوخطہ جات کے گھر کو۔ (ایس۔ محمد سلیم، وانمباڑی)

●

ایک کلرک نے دفتر فون کر کے اپنے افسر کو بتایا۔ جناب میں ایک ہفتے تک نہیں آسکوں گا۔ پچھلی رات میری بیوی کا ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔

افسر غلط فہمی کی وجہ سے غرایا۔ لیکن تم ہفتے بھر دفتر کیوں نہیں آسکتے؟ کلرک نے کہا: آپ کچھ نہیں جناب اس نے جو ٹانگ توڑی ہے وہ میری ہی ہے۔

●

پاگل خانے میں ایک پاگل دیوار سے کان لگائے کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے ایک نرس گزری۔ پاگل نے نرس سے کہا: سسٹر ذرا اس دیوار سے کان لگا کر سنئے تو کیسی آواز آرہی ہے۔ نرس نے تھوڑی دیر سننے کے بعد کہا مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔

پاگل : میں دو گھنٹے سے کان لگائے کھڑا ہوں۔ ابھی تک تو کچھ سنائی نہیں دیا۔ تمہیں دو منٹ میں کیا خاک سنائی دے گا۔

(رحیم النساء بخشی، ملگام۔ کرناٹک)

●

ایک آدمی نے اپنی بیوی کے سر پر زور سے ڈنڈا مارا اور بھاگتا ہوا پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہاں جا کر کہنے لگا۔ تھانیدار صاحب، مجھے گرفتار کر لیجئے۔

تھانیدار نے پوچھا کیوں کس لئے؟

آدمی : میں نے اپنی بیوی کے سر پر زور سے ڈنڈا مارا ہے۔

تھانیدار : تو کیا وہ مر گئی؟

آدمی : نہیں بلکہ وہ ڈنڈا لے کر میرے پیچھے آرہی ہے۔ (رحیم النساء بخشی، بلگام کرناٹک)

●

لڑکا (فون پہ ماسٹر سے) ماسٹر صاحب میرا لڑکا بیمار ہے آج وہ اسکول نہ آسکے گا

ماسٹر : (آواز پہچان کر) اور یہ کون بول رہا ہے

لڑکا : (گھبراہٹ میں) جی میرا باپ بول رہا ہے

(محمد خورشید اقبال، ککولیا، بہار)

سفر کرتے وقت ایک شخص نے ماچس طلب کی مگر کسی نے نہیں دی تو اس نے تھوڑی دیر بعد اپنی جیب سے ماچس نکالی اور کہنے لگا۔ اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک کنجوس ہے۔

(نعیم احمد عراقی، کلکتہ)

●

اپنے لطیفے اس پتہ پر بھیجئے

تبسم، ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

آئینے کی گرد

حیدر راحت

بازار سے لوٹتے ہوئے اختر سوچ رہا تھا پیار کا نشہ اتنی جلد کیوں اُتر جاتا ہے؟

"یہ رہنے کی جگہ ہے یا کوئی قید خانہ؟" نجمہ ابل پڑی۔

"زارق ابھی تین ماہ کا ہی تو ہے۔ اسے اپنا دودھ کیوں نہیں پلاتیں؟" اختر بڑبڑایا۔

اس سے پہلے کہ نجمہ اس کے جواب میں کچھ بولے۔ وہ مڑا اور کھڑکی کے پاس رکھے ٹو۔ان وَن میں اس نے امراؤ جان کی غزلوں کا ٹیپ لگا دیا۔ وہ مست اور بے خود کر دینے والی غزلوں پر جھوم رہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے موسیقی کا ساتھ دے رہا تھا۔

"اُف! میں تو بور ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی جگہ ہے — بازار کے نام پر چار دکانیں ہیں۔ زارق کے لئے دودھ کا ڈبا بھی نہیں ملتا — اب کیا ہوگا؟" کہتے ہوئے نجمہ نے اپنی ساڑی اور بلاؤز اُتار کر پلنگ پر پھینک دئے اور ہاؤس کوٹ پہن لیا، وہ اپنی دلی اور شاپنگ کی جنت کناٹ پلیس کی یاد میں کھو گئی تھی — شام کو گھومنے نکلو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وقت کب کا پر لگا کر اڑ گیا — اور ایک یہ منحوس جگہ ہے — نہ کوئی بازار، نہ گھومنے کی جگہ — سنیما کے نام پر بھی ایک ٹین کا ڈبا۔ جس میں اس کی پیدائش سے پہلے کی فلمیں 'رام راج' سنت تکارام، اور جادوگر کی چھڑی' جیسی فلمیں چلتی ہیں — اس نے پچھلے مہینے کی پانچ تاریخ کو اختر سے اپنے دل کی باتیں کہی تھیں: "اختر تم آفس چلے جاتے ہو اور یہاں میں دن رات بور ہوتی ہوں۔ کیوں نہ ایک وی۔سی۔آر خرید لیا جائے؟"

"وی، سی، آر؟" سن کر اختر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا: "تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وی، سی آر نہ ہوا کوئی معمولی ٹرانزسٹر ہو گیا۔ قیمت معلوم ہے تمہیں؟

"قیمت شاید تمہیں نہیں معلوم ہوگی — لیکن تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ میرے پاپا کے گھر پر تھا میرے پاپا کے ایک دوست ہانگ کانگ سے لائے تھے اور...."

"اور تمہارے پاپا نے اپنے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر کسٹم ڈیوٹی میں کافی کمی کرالی ہوگی۔ میم صاحب آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ آپ کے پاپا اور آپ کے شوہر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک اعلیٰ افسر، چار ہزار سے زیادہ تنخواہ پانے والے اور میں صرف ایک اپر ڈویژن کلرک — میں تو وی، سی، آر چھوڑ ٹیلی ویژن خریدنے کی سکت بھی نہیں رکھتا۔" اختر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"پاپا کو لکھوں؟ وہ انتظام کر دیں گے" نجمہ نے بے قراری سے کہا۔

اختر کو بُرا لگا۔ زارق تین مہینے کا ہو گیا تھا، مگر اس کی سسرال سے نہ کوئی مدد کے لئے آیا تھا اور نہ اُسے تحفے کی شکل میں کچھ ہاتھ لگا۔ پھر بھی نجمہ ہمیشہ اپنے مائیکے کی تعریف

کے پل باندھتے نہ تھکتی —— تو تلخی بڑھانا نہیں چاہتا تھا اسی لئے اس نے صرف اتنا ہی کہا: "مانا کہ پاپا وی، سی آر بھیج دیں گے لیکن یہاں فلموں کے کیسٹ کہاں ملیں گے؟ یہاں تو ٹیلی ویژن کے پروگرام بھی صاف صاف نہیں آتے۔"

"یہی تو رونا ہے" نجمہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

"یہ کیا جگہ ہے دوستو ——" اختر امراؤ جان فلم کی یہ غزل سن کر جھوم رہا تھا کہ وہ روتے ہوئے زارق کے پاس جا کر بولا: "معلوم ہوتا ہے آپ کو بھی یہی رونا ہے۔"

اختر کے اس مذاق نے نجمہ کو گدگدا دیا۔ وہ مسکرا دی، آخر وہ کیا کرے؟ اختر کو دیکھتی ہے تو اس کا دل کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے لیکن جب اس کے ساتھ جڑی ہوئی اپنی زندگی پر نظر ڈالتی ہے تو جیسے اس کا دل بجھ سا جاتا ہے۔ اس کے کانوں میں اس کے پاپا کے الفاظ آج بھی گونجنے لگتے ہیں: "نجمہ، تم خود ہی فیصلہ کر لو۔ تم پڑھی لکھی ہو، سمجھدار ہو۔ میں تمہاری محبت میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا —— اس گھر میں تم بڑے لاڈ پیار سے پلی ہو، موٹر، نوکر چاکر، ٹی وی، فریج وی، سی، آر، سارے آسائشیں تمہیں حاصل ہیں ایک کلرک سے شادی کر کے تم کس قدر خوش رہ سکتی ہو، اس کا فیصلہ تم خود ہی کر لو۔" اور آج وہ اپنی اس شادی کو محض پاگل پن کا درجہ دے رہی تھی۔

آخر اختر کا ٹرانسفر دوسری جگہ ہو گیا۔ اس نے نجمہ کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ اداس ہو گئی —— اختر نے اداسی کا سبب پوچھا تو وہ بولی "تمہارے پیچھے میں اکیلی یہاں کس طرح رہوں گی؟"

"تم یہاں کیوں رہو گی؟ تم تو میرے ساتھ چلو گی۔"

"مگر یہ راج نگر ہے کہاں؟"

اختر نے راج نگر کا جغرافیہ بتایا تو وہ بے حد اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی: "یہ کیا اختر؟ یہ تو کنوئیں سے نکل کر کھائی میں گرنے والی بات ہوئی۔ کیا زندگی بھر تمہیں دلی، بمبئی، کلکتہ جیسی جگہوں پر پوسٹنگ نہیں ملے گی؟"

"نجمہ ڈارلنگ، جہاں میاں بیوی ساتھ ہوں، وہیں دلی ہے، وہیں بمبئی ہے اور وہیں جنت بھی۔"

"مجھے تمہاری یہ فلمی باتیں بالکل پسند نہیں۔ تم مجھے دلی پاپا کے یہاں پہنچا دو —— دو چار مہینے وہاں رہ لوں، پھر میں خود راج نگر آ جاؤں گی ——"

"میرے خیال سے تو یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔"

"وہ میرا گھر ہے، کوئی پرایا تو نہیں آخر تم میرے اپنے گھر کے بارے میں سن کر اتنے اکھڑ کیوں جاتے ہو؟"

اختر نے احتجاج کے بغیر ہتھیار ڈال دیے تاہم دل ہی دل میں وہ نجمہ کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھا۔ پورے دو تین ماہ تک ممی پاپا کے یہاں ڈیرا ڈالنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

سنیچر کی شام کو چار بجے کے قریب وہ لوگ دلی پہنچ گئے —— گھر کے صدر دروازے پر لگی ہوئی بیل کا بٹن نجمہ نے ہی دبایا۔ زارق کو اختر نے اپنی گود میں لے لیا تھا۔

دروازہ کھلا۔ نجمہ نے پاپا کو دیکھا تو وہ چونک گئی —— اس وقت پاپا گھر میں؟ لیکن نجمہ سے زیادہ شاید اس کے پاپا چونکے۔ انہوں نے سوالوں کی بوچھار کر ڈالی: "اس وقت؟ اچانک کیسے آنا ہوا؟ کوئی خاص بات؟ سب ٹھیک تو ہے؟ آنے کی خبر کیوں نہیں دی؟"

نجمہ نے پاپا کو دیکھا —— ایک بجھی بجھی سی شخصیت —— اس ہڑبڑاہٹ نے انہیں اور بھی مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔

"پاپا، آپ اس وقت گھر میں کیسے ہیں؟ ممی تو ٹھیک ہیں نا؟" کہتے ہوئے نجمہ اندر گھسی۔

"تجھے دو مہینے پہلے لکھا تھا نا کہ ۳۱ مارچ کو ریٹائر ہو رہا ہوں۔ ادھر تیری ماں کے گھٹنوں میں گٹھیا کا تیز درد رہنے لگا ہے۔"

"اور رضیہ اور انور بھیا؟ وہ لوگ کہاں ہیں —— نوکر بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔" کہتی ہوئی نجمہ ماں کے پاس جا کر ٹھٹھک گئی۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں —— نڈھال اداس اور تھکی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر ماں کے چہرے پر ایک چمک سی ابھری بھی تو صرف چند لمحوں کے لئے —— ماں سچ مچ تھک سی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے نواسے کو پہلی بار دیکھا تھا —— اختر کو اشارہ کر کے زارق کو اپنے پاس لٹا کر اسے پیار کرنے لگا۔

"اچانک کیسے آ گئی؟" ماں نے پوچھا تو نجمہ نے سارا قصہ سنا دیا۔ اختر چپ چاپ اکھڑا اکھڑا سا بیٹھا تھا۔ اتنے میں پاپا ایک ٹرے میں دو گلاس شربت بنا کر لے آئے۔

"ارے پاپا، آپ نے کیوں تکلیف کی نوکر کہاں مر گیا؟"

"اسے تو ہم نے ایک سال پہلے ہی نکال دیا تھا۔" پاپا نے دھیرے سے کہا —— "آج کل نوکر رکھنے کا مطلب ہے تین ساڑھے تین سو روپے کا خرچ۔ تنخواہ، کھانا پینا، کپڑا لتا، ان سب میں اتنا کچھ تو لگ ہی جاتا ہے۔"

"پھر تو بڑی پریشانی ہوتی ہوگی؟"

"شروع میں ہوئی تھی، پھر بعد میں سب ٹھیک ہو گیا —— یہ تو عادت کی بات ہے۔ جیسی عادت ڈالو، ویسی پڑ جاتی ہے۔"

باتوں کا الٹ پھیر سلسلہ چلتا رہا۔ نجمہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس گھر سے بالکل کٹ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے گھر میں ہونے والی اہم تبدیلیوں سے بھی وہ بالکل بے خبر تھی۔ انور بھیا کو دلی کے کسی کالج میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ ہاں، گیا کے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا، سو وہ وہاں چلے گئے تھے۔ اس کے لئے پاپا کو پانچ سو روپے انور بھیا کو بھیجتے ہوتے تھے —— رضیہ بی۔ اے کے آخری سال میں تھی ان سب مسائل سے جو سب سے بڑا اور خوفناک مسئلہ درپیش تھا وہ پاپا کے ریٹائرمنٹ کے بعد

مکان کا مسئلہ۔ آئندہ دو مہینے میں ان لوگوں کو سرکاری کوارٹر چھوڑ کر کسی نجی مکان میں جانا ہوگا۔ اتنے دنوں تک دلی میں رہے، لیکن نہ کوئی مکان بنوایا اور نہ کوئی نیا بنایا مکان خریدا۔ اب سر چھپانے کے لئے جگہ چاہئے۔ پرائیویٹ مکانوں کے کرائے آسمان کو چھو رہے ہیں۔ دو کمرے کم سے کم درکار ہوں گے ——— چار پانچ سو روپے کم کرائے میں کیا ملیں گے؟ نجمہ سوچ سوچ کر اندر تک جیسے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ——— کہاں وہ عیش و آرام کی زندگی اور کہاں اب مختلف مسائل سے دوچار اس اپنا یہ گھر۔

رات کو اختر نے باہر لان میں سونے کی خواہش ظاہر کی ——— نجمہ نے اس کی چارپائی باہر بچھا دی۔ باقی چاروں برآمدے میں سو گئے تک بھگ گیارہ بجے روشنی بجھا دی گئی ——— نجمہ نے سونے کی بہت کوشش کی، لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گھنٹوں وہ لیٹی ہوئی کروٹیں بدلتی رہی ——— شاید ممی پاپا بھی نہیں سو پائے تھے ——— اپنے اپنے طور پر وہ دونوں ہی کچھ سوچ رہے تھے ——— اتنے میں اسے ممی پاپا کی بات چیت کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"خبر تو دینا تھی ——— شادی کے بعد پہلی بار آئی ہے اپنے بچے کو لے کر۔ کچھ تو کرنا ہوگا۔"

"میرے پاس کون سے خزانے گڑے ہیں نمائشی چونچلے نہ کرو انور کی ماں۔ آئی ہے تو کم سے کم پورے دو مہینے تو رہے گی۔ ساتھ میں چھوٹا بچہ بھی ہے۔ اس کے لئے بھی دودھ، دوا وغیرہ کے لئے پورا خرچ چاہئے۔"

"وہ تو ہے۔"

پھر ایک گہری خاموشی چھا گئی ——— نجمہ جیسے اندر تک کانپ کر رہ گئی۔ تو شام سے اب تنہائی ملی ہے ممی پاپا کو ——— شاید ان لوگوں نے سوچا ہوگا کہ وہ سو گئی ہے۔ نجمہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج تک وہ سوتی ہوئی تھی اور اس رات نے اسے پہلی بار جگا دیا تھا۔

صبح کو نجمہ جلدی ہی اٹھ گئی۔ دو پیالی چائے بنا کر وہ لان میں آئی، اختر جاگ چکا تھا۔ چائے دونوں نے ساتھ ساتھ پی ——— اختر کی مسکراتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں ——— اچانک اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔

"راج نگر کے لئے بکنگ کراتے جائیں تو دو سیٹیں لے لیجئے گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیا تم بھی ساتھ چل رہی ہو؟"

"ہاں ———"

"کیوں، کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ——— اب تک سو رہی تھی ——— پرائے گھر کو اپنا گھر سمجھتی رہی تھی ——— شادی کے بعد شوہر کا ہی گھر عورت کا اپنا گھر ہوتا ہے۔"

اختر ہنس پڑا۔ اس نے اٹھ کر نجمہ کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

●●

شاہد انصار، مکہ مکرمہ، سعودی عربیہ
ہمیں کبھی خوابوں کی دنیا عزیز ہے لیکن
زمیں پہ رہنے کا احساس مارے دیتا ہے
(وسیم بریلوی)

سید معین اللہ حسینی، جدہ،
ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
(علامہ اقبال)

محمد مشیت اللہ، پرتاپ گڑھی
خوش ہوں مرے خلوص کی قیمت تو مل گئی
بہتر ہے کچھ نہ ملنے سے رسوائیاں ملیں۔
(کاوش پرتاپ گڑھی)

رخسانہ علی گڑھ
میں ایک جام ہوں کس کس کے ہونٹ تک پہنچوں
غضب کی پیاس لئے ہر لب شر لگے ہے مجھے
(نامعلوم)

سیدہ رابعہ رشید نرمل (اے پی)
نئے دور کے نئے خواب ہیں نئے موسموں کے گلاب ہیں
یہ محبتوں کے پرانے ہیں انہیں نفرتوں کی ہوا نہ دے
(بشیر بدر)

انیس چرورآنواں
ایک عشق، ہی علاج غم زندگی نہیں
دنیا میں اور بھی ہیں تقاضے حیات کے
(نامعلوم)

تنویر، چھتہ بازار، حیدرآباد
زندگی جب بھی کسی شے کو طلب کرتی ہے
میرے ہونٹوں پہ ترا نام مچل جاتا ہے
(نامعلوم)

کنیز فاطمہ، چنچل گوڑہ، حیدرآباد
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے
(نامعلوم)

محمد شمیم انصاری باری (دھنباد)
پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو کبھی کبھی
(نامعلوم)

سید سحاج، سرائے بانس، لکھنؤ
ہم ان سے تو بہتر ہیں جو روپ بدلتے ہیں
مانا کہ خراشیں ہیں چہرہ تو ہمارا ہے
(نامعلوم)

سید ریاض احمد، حیدرآباد
اظہار ندامت ہو بھی چکا تم ہنس بھی چکے ہم رو بھی چکے
اب آؤ گلے مل جاؤ ذرا، یا اور ابھی تڑپانا ہے۔
(نامعلوم)

طفیل انجم، الریاض، سعودی عرب
آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
دل نہ ٹوٹے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں
(نامعلوم)

محمد عبدالرشید عاقل۔ آرمور۔
یاد محبوب ہے، میں ہوں شب تنہائی ہے
زندگی میری مرے غم کی تماشائی ہے
(جمیل نظام آبادی)

پروفیسر ڈاکٹر شمیم، سمستی پور
تمام پیڑ جلا کر خود اپنے ہاتھوں سے
عجیب شخص ہے سایہ تلاش کرتا ہے
(نامعلوم)

حامد مرزا بیٹر (مہاراشٹر)
لہو کا رنگ وہی دل کی دھڑکنیں بھی وہی
تو قومیت کا تصور نصاب میں کیوں ہے
(نظام)

عائشہ پروین عاقل آرمور
بحر محبت تو یہ تو بہ
تیرا جائے ڈوبا جائے
(حفیظ میرٹھی)

رشید احمد، تاندیر، مہاراشٹر
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
(علامہ اقبال)

آمنہ عاقل، سعیدہ آباد، نظام آباد
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے
(علامہ اقبال)

اے۔ ڈبلیو۔ علوی، قاسم پور، علی گڑھ
پیغام دئے ہیں کبھی پیغام لئے ہیں۔
ان مست نگاہوں نے بڑے کام کئے ہیں۔
(نامعلوم)

مرزا محمد حامد بیگ، حیدرآباد
ہم اپنی ذات کی پہچان کس طرح کرتے
ہمارے نام کی تختی کسی مکان پہ نہیں
(خسرو متین)

نوٹ: اشعار کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھئے

اپنے اشعار اس پتے پر لکھئے: "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دِل جیتنے میں دیر نہیں لگتی

سید لئیق احمد

ایک ڈاکٹر دوست نے اپنی مریضہ کا ایک دل چسپ واقعہ مجھے سُنایا۔ وہ ایک بزنس مین کی بیوی تھی ——— اس کا شوہر مضبوط اور طاقتور جسم کا مالک ہونے کے ساتھ انتہائی خاموش اور کم گو تھا ——— بیوی بے چاری پہلے ہی کم زور تھی، اس پر اپنڈکس کے مرض میں ایسی مبتلا ہوئی کہ آپریشن کے لئے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا ——— خوش قسمتی سے اس کا آپریشن کام یاب ثابت ہوا۔ اس کی کم زوری کو دور کرنے کے لئے کئی مرتبہ گلوکوز اور خون چڑھایا گیا ——— لیکن حیرت انگیز طور پر وہ اور بھی کم زور ہوتی جارہی تھی ——— ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے اسے نفسیاتی طور پر خوش کرنے کی کوشش کی: "غالباً آپ اپنے شوہر کی طرح تندرست اور طاقت ور ہونا چاہتی ہیں"

اس نے جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب، میرے شوہر اتنے توانا ہیں کہ انہیں کسی کی ضرورت نہیں"

ڈاکٹر بات سمجھ گیا ——— اس شام کو ڈاکٹر نے شوہر سے کہا: "میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری بیوی صحت یاب ہونا نہیں چاہتی"

"وہ ضرور صحت یاب ہوگی ڈاکٹر ——" شوہر نے کہا: "اگر اسے کچھ اور خون چڑھا دیا جائے تو وہ یقیناً اچھی ہوجائے گی"

اتفاق سے شوہر کا خون اس کی بیوی کے گروپ کا ہی نکلا۔ اور ڈاکٹر نے راست اس کے جسم کا خون اس کی بیوی میں منتقل کرنے کا انتظام کیا۔ شوہر اپنا خون اپنی بیوی کی رگوں میں منتقل ہوتے دیکھ کر بولا: "میں تمہیں صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں"

"کیوں؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے"

اس نے سادہ سا جواب دیا۔

پھر اس نے کروٹ لی۔ عورت کی نبض کی رفتار مسرت سے تیز ہوگئی ——— اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا: "تم نے یہ بات پہلے تو کبھی نہیں کہی تھی۔"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا: "دراصل اس عورت کو صحت یاب کرنے میں اس کے شوہر کے خون کی منتقلی سے زیادہ اس کی گفتگو کو دخل ہے، اس گفتگو نے ہی اس عورت کو نئی زندگی اور توانائی بخشی۔

یہ واقعہ بظاہر ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیوں کہ ہم ایک معمولی انسان ہیں، جو روزمرہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مصروف رہتے ہیں اور ہمیں کبھی کسی کی موت و زیست کی کشمکش سے الجھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن فی الحقیقت یہ واقعہ ہمارے لئے بھی سبق آموز ہے: کیوں بطور انسان ہم کو بھی اس قسم کے واقعات اور حقائق کا سامنا ہوتا ہے۔ جس کے ردِ عمل کا اظہار ہم ضروری تو سمجھتے ہیں، لیکن اکثر اوقات نہیں سمجھتے۔

کسی کی پوشیدہ طاقت، صلاحیت اور قابلیت کو ابھارنے کے لئے ہر وقت سادہ اور مختصر الفاظ میں ہی سہی، تعریف ضروری ہے ——— مثلاً: "تمہاری صحت بہتر نظر آتی ہے" یا "مجھے تم پر فخر ہے" یہ وہ سادہ الفاظ ہیں جو کسی کو نئی توانائی یا جینے کا حوصلہ بخشنے کا باعث بن سکتے ہیں ——— برعکس اس کے اگر ہم بروقت تعریف کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کریں یا کسی اور دن کے لئے تعریف کو اٹھا چھوڑیں تو یہ عادت کسی کی موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

الفرڈ سٹرو نے اپنے ایک ڈرامہ:

"میں ایک ایسے بنک کلرک کی کہانی پیش کی ہے جو زندگی سے مایوس ہوچکا ہے ایک مرتبہ وہ اپنی بیوی سے نہایت افسردگی سے کہتا ہے کہ جس ترقی کا اسے یقین تھا وہ کسی اور کو دے دی گئی ہے۔ میں ایک ناکام انسان ہوں، میں نے زندگی میں کچھ نہیں کیا" وہ رونے لگتا ہے۔

اس کی بیوی اس کی جانب بڑھی اور کہنے لگی: "میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم نے اپنی زندگی میں کیا کیا ہے۔ تم نے ایک عورت کو اپنی محبت سے جیت لیا۔ اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا۔ سوائے عیش و عشرت کے تم نے اسے سب کچھ مہیا کیا اور عیش کی مجھے ضرورت نہیں۔ اور احساس کمتری سے ہٹ کر سوچو تو تم زندگی کے ہر اہم موڑ پر ایک کامیاب ترین انسان ثابت ہوتے ہو۔" اس قسم کے الفاظ کا ہر وقت استعمال مایوسی کی تیز دھار کو کند بنا دیتا ہے۔

کسی کے پرمسرت موقع پر آپ کا مظاہرہ کس قسم کا ہوتا ہے؟ کیا آپ ہر وقت مبارکباد دینے کے عادی ہیں؟ یا مبارک باد کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش میں وقت ضائع کرکے مبارک باد کا پیغام پہنچاتے ہیں؟ یا پھر خاموشی اختیار کرتے ہیں؟

"مجھے ازحد مسرت ہوئی۔" یہ ایک سادہ سا تعریفی جملہ ہے، لیکن کبھی کبھی اگر اس قسم کا اظہار ہم اپنے اس جان پہچان والے سے نہ کریں جس نے کوئی کارنامہ کیا ہو تو ہماری یہ بھول یا بے پروائی ہماری شخصیت کے ایک ایسے پہلو کا انکشاف کرتی ہے جسے ہم نہیں جانتے "مجھے اس کا آج تک پتہ نہ تھا کہ میرا بھائی حاسد ہے۔ ایک قابل دوست نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا: "یونیورسٹی نے جب مجھے گولڈ میڈل عطا کیا تو سارے خاندان والوں نے اور دوست احباب نے ازحد خوشی کا اظہار کیا اور مبارک باد دی۔ لیکن میرے بھائی نے مبارک باد کا ایک لفظ بھی لکھنا گوارا نہ کیا اور نہ بعد میں ایسا کوئی اظہار کیا۔"

مقصد نکل جانے کے بعد اپنے محسن سے طوطا چشمی کر لینے والے اپنے ذرائع اور وسائل کو محدود کر لیتے ہیں، جبکہ "شکریہ" جیسے الفاظ کے استعمال کو عادت بنا کر اس برائی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ذرا سوچئے آپ کو کتنا عرصہ ہوا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے ہی بیوی کے اچھے پکوان کی تعریف کئے ہوئے؟ یا بیوی کے طور پر اپنے شوہر کے جا یا بے جا فرمائش کے پوری کرنے پہ شکریہ ادا کئے ہوئے؟ کتنے والدین ہیں جو اپنے بچوں سے کام لے کر "شکریہ" کہتے ہیں یا کتنے بچے ہیں جو اپنے والدین سے کھلونے پا کر "شکریہ" ادا کرتے ہیں؟

دراصل ہماری یہ غفلت ہے جو کبھی کبھی ارادی ہوتی ہے۔ اسے فطری بے پروائی نہیں کہہ سکتے ـــــ اکثر اوقات یہ ہمیں الجھن میں بھی ڈال دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ایک دوست دانتوں کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کے لڑکے کے انتقال پر میں نہ خود جا کر تعزیت کر سکا اور نہ تعزیتی پیام بھجوا سکا، کیوں کہ اس وقت میں شہر سے باہر تھا لیکن واپسی کے بعد بھی بغیر کسی خاص مصروفیت کے میں ان سے نہ مل سکا۔ بس دل کو سمجھاتا رہا کہ کل ضرور ملاقات کروں گا یا کم از کم تعزیتی خط بھجوا دوں گا۔

کل پرسوں میں، پھر ہفتوں میں تبدیل ہوتا گیا ـــــ اپنے سوگوار دوست کے بارے میں خیال کرتا تو احساسِ جرم کی کٹار سے دل خون ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلانے لگا کہ اب جا کر تعزیت کرنا گویا ان کے مندمل ہونے والے زخموں کو کریدنا ہے۔

ایک دن میں دانت کی اذیت ناک تکلیف میں مبتلا ہوا ـــــ کچھ روز خود ہی اس کا مقابلہ کیا، لیکن آخر کار ہار مان کر میں نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ایک گھنٹہ بعد میرے مہربان ڈاکٹر نے میرے بے حس جبڑے کو رگڑ کر مواد کے ساتھ وہ ناکارہ دانت نکالتے ہوئے مجھ سے پوچھا: "ابتدائی تکلیف میں کیوں نہیں آئے؟"

میں نادم ہوا کہ اس کے دکھ میں لفظی ہمدردی بھی نہ جتا سکا۔ اور بولا: "میں ان دنوں کاہلی یا 'کل کریں گے' کی عادت کا شکار ہو گیا تھا جو ندامت کا سبب بنی۔ اسی احساسِ ندامت نے تم سے رجوع ہونے سے باز رکھا تھا۔" پھر میں نے ڈاکٹر کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ مجھے بھی اس کی محرومی سے کتنا صدمہ ہوا تھا۔

"شکریہ ــــ" ڈاکٹر نے کہا: "تم نے بروقت پرسا نہیں دیا۔ لیکن میں تمہارے پرخلوص جذبات کو سمجھتا ہوں، ہم سب کسی نہ کسی طرح 'کل کریں گے' کی عادت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اتنا اثر لینے کی ضرورت نہیں۔"

ڈاکٹر کی فراخ دلی کو دیکھ کر میں مزید ایک عرصہ تک اس واقعہ پر پچھتاتا رہا۔

'کل کریں گے' کی عادت نہ صرف دوسروں کا چین چھین لینے کا سبب بنتی ہے، لیکن بعض مرتبہ اپنی اور دوسروں کی عزت اور وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے ـــــ اس لئے اب کبھی طبیعت کل پر ٹالنا چاہے تو اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ کیا تاخیر مناسب رہے گی؟ اگر طبیعت مائل نہ ہو رہی ہو یا وقت تنگ محسوس ہوتا ہو، خواہ وہ مبارکباد پہنچانے کا موقع ہو یا تعزیت کرنے کا، تو سوچئے کہ کہیں حقیقتاً یہ محض آپ کی کاہلی تو نہیں ہے؟ یا پھر جیسا کہ اکثر موقعوں پر ہوتا ہے، کہیں محض آپ اس احساس یا خوف کے تحت تو خاموش نہیں کہ آپ کے پاس تعریف کے لئے یا افسوس کے اظہار کے لئے موقع کی مناسبت سے الفاظ نہیں مل رہے ہیں؟

یاد رکھئے، اہم یہ نہیں ہے کہ آپ کتنے اچھے پیرائے میں اظہار کرتے ہیں، بلکہ اہم یہ ہے کہ آپ بروقت اپنے دلی جذبات کا اظہار صاف الفاظ میں جیسے بھی ہو کر دیں اور کل پر ٹالنے کی عادت ختم کر دیں۔

اگر آپ کسی سے 'مجھے افسوس ہے' کہنا ہے تو ابھی ربط پیدا کریں اور کہہ دیں۔ اگر کہہ نہیں سکتے تو ایک رقعہ ہی لکھ دیجئے۔

مسرتوں کے دروازے باہر کی جانب کھلتے ہیں اور جتنے طریقے ان دروازوں کو کھولنے کے رائج ہیں، ان میں اس سے بڑھ کر شاید کوئی اور طریقہ اہم نہیں کہ آپ کسی سے یہ کہیں کہ "مجھے آپ کی بات کا پاس ہے۔"

دیکھئے، کوئی آپ کے توجہ کا شدید طالب ہے۔ اگر آپ حساس ہیں تو دیر نہ کیجئے۔ ●●

مہمات

شمیمہ بیگم
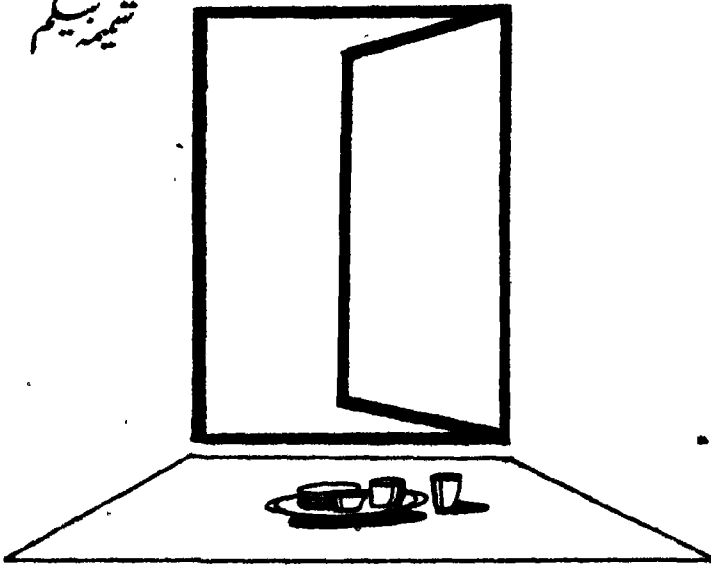
بزرگوں کا کہنا ہے: "مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے۔" "مہمان اپنے ساتھ اپنا رزق لاتا ہے۔" "مہمان کے آنے سے گھر میں برکت ہوتی ہے۔" ان کا کہنا سر آنکھوں پر۔ لیکن ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ پھر اس 'رحمت' کے کیوں نہ ہوں! یہاں تو بس ایک نقطہ لگانے کی دیر ہے کہ وہ زحمت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ میری نانی اماں مرحومہ فرماتی تھیں: "ٹڈیوں کھایا کھیت اور مہمانوں بھرا گھر کبھی نہیں پنپتا۔ بھئی ہم تو وہی کہیں گے جو اپنے اوپر سے بیتے گی۔ جس تن لاگے وہی تن جانے۔"

میرے والد صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ جو گھر پر آئے بغیر کھانا کھائے نہ جائے بلکہ کم از کم دو چار دن قیام بھی کرے۔ وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ گھر بھر کے لاڈلے۔ ماشاءاللہ دادا ابا کے پاس پیسے کی فراوانی، سستا زمانہ، شوق تھا اور خوب تھا۔ دوست آتے، کھاتے پیتے، گلچھرے اڑاتے، مٹو کھیوں پتا اڑ دیتے اور چل دیتے۔ خوب خاطر داریاں اور ناز برداریاں ہوتیں۔ کیوں نہ ہوں۔ چار بہنوں کے لاڈلے بھائی۔ سب ہی خدمت میں حاضر۔ کوئی شامی کباب بنا رہا ہے، کوئی مچھلی تل رہا ہے، کسی کے ذمہ قورمہ اور بریانی ہے اور احباب مزے کر رہے ہیں۔

جوان ہوئے شادی ہوئی، تو بچوں کی یلغار شروع، دوسرے شہر میں ملازمت ملی۔ ایک نوکر۔ اماں بیچاری بچے پالیں۔ گھر سنبھالیں یا مہمانوں کی خاطر مدارات کریں۔ اوپر سے مہنگائی نے سر اٹھانا شروع کیا۔ بچوں کی پڑھائی کا خرچ الگ۔ اور آمدنی رہی محدود۔ کیا تنگی نہ لئے کیا نچوڑے۔ مگر جناب مہمان نوازی میں فرق آنا رواداری کے خلاف تھا۔

اتوار کا دن ہے۔ سارے بچوں کی چھٹی۔ شوہر گھر میں۔ عمدہ کھانا پکایا گیا۔ بچوں نے ضد کی کہ برف کی قلفی چاہئے۔ سب کھانا تیار ہے۔ برف کی مشین کھڑر کھڑر کر رہی ہے۔ بچوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے ہیں۔ مشین چلاتے چلاتے ہاتھ تھکے جا رہے ہیں۔ مگر کھانے کی خوشی نے سب بھلا رکھا ہے۔ لیجئے دستر خوان بچھا۔ کھانوں کی خوشبو نتھنوں میں گھسی جا رہی ہے کہ کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ نوکر نے بیٹھک کھولی۔ دروازے سے آواز آئی "اماں خاں صاحب! بڑی خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں!" اباجان نے ازراہِ اخلاق یا عادت سے مجبور ہو کر کھانے کے لئے پوچھ لیا۔ وہاں کیا اعتراض تھا۔ پہلے تو آواز آئی "بسم اللہ کیجئے۔" پھر تھوڑا ہی فرمایا "لائیے، آپ اصرار کرتے ہیں تو چکھ لیتا ہوں۔" لیجئے، سینی میں لگا کر کھانا بھیجا ہی تھا کہ چار لفنگے اور تشریف لے آئے۔ اب تو ہمارا سانس اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ کیوں کہ ایک دو آدمیوں کا کھانا تو اماں ہمیشہ ہی زائد پکاتی تھیں۔ مگر یہ پانچ پانچ! اُف اللہ! تمام کھانا ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اماں بے چاری اس چلچلاتی دوپہر میں جب چیل انڈا چھوڑے پھر باورچی خانے کی نذر۔ جلدی جلدی انڈوں کا خاگینہ اور چائے بنا کر بچوں کو بہلایا۔ ادھر دیکھتے ہی دیکھتے برف کا قلفا بھی خالی اور ہم حسرت سے تکتے ہی رہ گئے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ گھر میں شوق سے کوئی سجاوٹ کی چیز لائی گئی۔ مناسب مقام دیکھ کر رکھی گئی۔ بچوں کو ہدایات دی گئیں کہ چھیڑیں نہیں۔ دور سے دیکھیں۔ سب نے خوب خوب تعریف کی۔ دل خوش ہوا کہ کسی صاحب یا صاحبہ کا دل آ گیا اور فرمایا "بھئی دلی میں رہنے والوں کے ہی ٹھاٹ ہیں۔ ایک سے ایک عمدہ چیز ملتی ہے اور سچ پوچھئے تو سجانے کا ذوق بھی بہت خوب ہے۔ بھئی آپ اگلے پھیرے میں اور لیتی آئیے یہ تو ہم لے جاتے ہیں۔ واللہ! بہت خوب صورت ہے۔" اور سجانے والی بصد حسرت پیش کر دیتیں، چاہے دل پر آرے کیوں نہ چل رہے ہوں۔

اولاد تو ادھر ایک صاحبہ تھیں ہماری دور کی رشتہ دار جن کو سب 'ممانی' کہتے۔

اس طرح وہ جگت ممانی بنتیں۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے، جب کبھی آتیں، سیکڑوں بلائیں ہاتھوں لیتیں، اماں پر واری صدقے ہوتیں، ان کی رحم دلی اور اخلاق کے قصیدے پڑھتیں، کچھ اپنی بہو بیٹیوں پر تبرا بھیجتیں، دو چار آنسو بہاتیں، مزے میں پلنگ توڑتیں، کھاتیں، دندناتیں، بچوں کو قدم قدم پر نصیحت اپنا فرض سمجھ کر کرتیں، اماں کو مفید مشوروں سے نوازتیں اور نوکروں پر اعتراض کر کر کے اس کا جینا حرام کرتیں۔ ہمیشہ دو دن کے لئے آتیں اور بیس دن میں کبھی بمشکل گئیں۔ وہ بھی سترّ احسان ہمارے سر پر۔ "اے کیا کروں دُلہن، تم سے کچھ ایسی محبت ہو گئی ہے کہ نہ دیکھوں تو دل پھڑکنے لگتا ہے۔ اللہ ایسی بہو سب کو نصیب کرے۔ کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ تم نے تو بیٹیوں کو مات کر رکھا ہے۔ اللہ تمہاری ساس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میری ہی عمروں کی تھیں — اے ہاں دُلہن، پچھلے سال جو تم نے شال دی تھی، بہت اچھی نکلی۔ دیکھنا، اب کے بازار جاؤ تو ایک جوڑے کا کپڑا اپنی پسند کا لیتی آنا۔ میں پیسے پھر دے دوں گی۔" اللہ معاف کرے اور ان کی رُوح نہ شرمائے، ہم نے تو اپنی زندگی میں ان کی پھر کبھی نہ آتے دیکھی

ایک محترم تشریف لاتے تو آتے ہی حُقّہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کا حکم۔ "اگر نوکر نہ ہو تو بیٹا تم ہی بھر دو۔ تمہارے ہاتھ ول کا حقہ پی کر دعائیں دیں گے۔" دعاؤں کے لالچ سے نوکو کی کیا پوچھتا، ہاں ابا جان کی خوشنودی کے خیال سے یہ کڑوے گھونٹ بھی پینے پڑتے، ورنہ بد لحاظ اور گستاخ گردانے جاتے۔

غرض اپنے رنگ میں ہر مہمان نرالا ہوتا ہے۔ چلئے وہ تو لشتم پشتم گزاری ہے، مگر ان کی روایات نبھانے میں اپنی جو حالت ہے، وہ خدا ہی جانتا ہے۔ یہ کمر توڑ مہنگائی تین روپے کلو آلو اٹھائیس روپے کلو گوشت۔ بجٹ بناتے بناتے، کفایت شعاری کرتے کرتے پھونک پھونک کر قدم رکھتے رکھتے ہزاروں طرح دل مارتے ہیں۔ اچھے بُرے وقت کے لئے بچا کر رکھتے ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ان غیر ملکی اور پاکستانی مہمانوں کا کہ کبھی کوئی پھوپی کے دیور کی سالی تشریف لے آئی ہیں تو کبھی چچا کے سالے کے ہم زلف براجمان ہوتے ہیں۔ پھر سات میں پانچ سات خطوط اور ایک لمبی فہرست فرمائشوں کی، کہ ایسی ساڑی، یہ بلاؤز، کولہاپوری چپل، کھوپرا، مکھانے، چائے، کافی، تمباکو اور نہ جانے کیا کیا الم غلم۔ لیجئے صاحب، کھلاؤ، پلاؤ، گھماؤ پھراؤ، سنیما دکھاؤ، تحفے تحائف پیش کرو، مگر ان کے چونچلے ہی پورے نہیں ہوتے۔ چلتے چلتے جب یہ سنو کہ "اے ہندوستان میں رکھا ہی کیا ہے تو دل جل کر سوختہ کباب ہو جاتا ہے۔ دو دو کی تنخواہ چھوٹی چھوٹی کھلیاں۔ یہ گھٹے گھٹے گھر۔ اے مرے تو ہر بیٹے کی کوٹھی ہے اور سب کے پاس کار۔ اللہ کی سنوار، یہاں رہ کر بھی تمہیں کیا ملا؟ پاکستان میں ہوتیں تو اب تک ٹھاٹھ سے رہ رہی ہوتیں۔" ملاحظہ فرمائیے ہماری بے بسی کہ مُرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والے کو سواد نہ آیا۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے کہ ایسی ساڑی خریدیں گے، یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ مگر صاف ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئے اور اس پر طرّہ یہ کہ چلتے چلتے محترمہ ایک اور گُل فشانی فرماتی گئیں: "ہاں بہن، سُنا ہے کہ ہندوستان میں جب دو پڑوسنیں لڑتی ہیں تو ایک دوسرے کو اس طرح کوسنے دیتی ہیں کہ اللہ کرے تمہارے گھر پاکستانی مہمان آئیں۔ لو بھئی، مہمان کی ایسی ناقدری! توبہ توبہ! مہمانوں سے بھی بھلا کوئی گھبراتا ہے۔ اے یہ تو خوش قسمتی ہے کہ کسی کے گھر مہمان آئیں، ورنہ کون اپنا گھر آسانی سے چھوڑتا ہے۔ مہمان تو گھر کی رونق اور برکت لے کر آتے ہیں۔ اے بیٹی تم تو آج تک نکلیں نہیں۔ کبھی پاکستان آؤ تو دکھائیں مہمان نوازی کسے کہتے ہیں۔" بس جناب یہ خون کا گھونٹ بھی پینا پڑا۔ دل چاہتا ہے کہ کاش ہمیں بھی اتنی فرصت ملے کہ جا کر دو ماہ کے لئے ان کے گھر دھرنا دیں اور پھر پوچھیں کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ مگر اپنی ایسی قسمت کہاں کہ اتنا وقت نکال سکیں؟

احسان نہ جتائیں

احسان کر کے جتانا ایک قبیح فعل ہے۔ احسان نہ کرنا جتانے سے ہزار گنا بہتر ہے۔ خدا نے ہم پر بے شمار احسانات کئے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اس کا شکر ادا کریں۔ اور اس احسان کا بدلہ دیں اس کی سب سے افضل صورت یہ ہوگی کہ ہم خدا کے بندوں پر احسان کریں۔ بصورت دیگر قابلِ استقامت ہونے کے باوجود مدد نہ کرنا خدا سے احسان فراموشی کے مترادف ہے۔ اکثر و بیشتر ہم صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی بھی تمیز اُٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اس حالت کو دانستہ یا نادانستہ یکسر فراموش کر دیتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہم پر احسان بھی کیا گیا تھا۔

احسان موجودہ دور میں ناپید ہو گیا ہے اس کے مفہوم و معنی بدل گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر احسان اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا لہٰذا یہ ایک تجارت کی صورت اختیار کر گیا ہے خدا ہم سب کو اس غیر اخلاقی فعل سے پرہیز کی توفیق دے۔

(ڈاکٹر عطیہ سعید، حیدرآباد)

کیا بڑھاپے کو روکا جا سکتا ہے؟

محمد خلیل

ہر دور میں انسان نے دو باتوں کے لئے بہت کوشش کی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ جوان رہے۔ دوسری یہ کہ اس کی عمر بہت لمبی ہو جائے کبھی کبھی تو اس نے دائمی زندگی کی آرزو بھی کی ہے۔ امرت اور آبِ حیات کی داستانیں اسی آرزو کی دین ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان آج تک نہ بڑھاپے سے محفوظ رہا ہے، نہ موت سے۔ جو چیز پیدا ہوئی ہے اسے فنا ہے۔ آج طبی سائنس بے انتہا ترقی کر چکی ہے۔ آج بھی اگر کسی شخص سے پوچھا جائے کہ وہ ہمیشہ جوان رہنا چاہتا ہے یا بوڑھا ہونا بھی اسے قبول ہے تو یقیناً وہ جوان رہنے کو ترجیح دے گا۔ کم از کم عورتیں تو ہر حال میں جوان رہنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ طبی سائنس کی موجودہ تحقیق ممکن ہے ان کی اس خواہش کو پورا کر سکے۔

انسان کی زندگی تین مرحلوں سے گزرتی ہے: بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ بڑھاپے میں مختلف اعضا اپنا کام اتنی مستعدی سے نہیں کر پاتے جیسے بچپن یا جوانی میں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بڑھاپا ظاہری صورت کو بھی بگاڑتا ہے۔ بڑھاپے کے ساتھ چہرے پر جھرّیاں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ اسی لئے لوگ بڑھاپے کو دُور رکھنا چاہتے ہیں۔

بڑھاپا آخر کیوں آتا ہے؟ سچ پوچھئے تو بڑھاپا پیدائش کے بعد سے ہی شروع ہو جاتا ہے جس طرح کوئی عمارت چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے مل کر تعمیر ہوتی ہے اسی طرح ہمارا جسم خلیات (سیلس) سے مل کر بنتا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں خلیات مل کر جسم کے صرف ایک حصّے کو بناتے ہیں۔ یہ تمام خلیے پیدائش سے ہی بڑھاپے کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ جسمانی نشو و نما کا عمل عموماً عمر کے پہلے ۲۵ سال تک چلتا ہے۔ دنیا کے مختلف حصّوں میں ماحولیاتی اختلاف اور غذائی فرق کے باعث اس اوسط میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے۔ اس عمر کے بعد نشو و نما کا عمل رُک جاتا ہے اور جسمانی اعضا رفتہ رفتہ اپنی توانائی کھونے لگتے ہیں۔ انسانی جسم کی وہ خصوصیات جو انسان کو ماحول سے نا موافق حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں، ختم ہونے لگتی ہیں اور یہی کیفیت بڑھاپا کہلاتی ہے۔ جب بڑھاپے کا عمل شروع ہوتا ہے تو جسمانی نظام کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل کا فعل، گُردوں کے چھاننے کا عمل کا تناسب اور دورانِ خون کا نظام، اعصابی نظام وغیرہ کم زور ہونے لگتے ہیں۔ لیکن شروع میں اس زوال کا اندازہ اس لئے نہیں ہوتا کہ جسمانی نظام کی کارکردگی میں یہ ابتری بہت دھیرے دھیرے آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بیماریوں کے خلاف جسم کا دفاعی نظام (یا قوتِ مدافعت) بھی کم زور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بڑھاپا ایک حیاتیاتی عمل ہے۔ چنانچہ بڑھاپے سے ایک باعمل جسم رفتہ رفتہ عمل کے ناقابل ہو جاتا ہے۔

کافی عرصے سے سائنس داں بڑھاپے کو دُور کرنے کی تحقیق میں مصروف ہیں، لیکن ابھی وہ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بڑھاپا ایک ایسا عمل ہے جو جینیاتی طور پر طے شدہ ہے اس کی ایک خاص وجہ ڈی این اے میں موجود جینیاتی اکائی، یعنی جین میں تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے ڈی این اے میں غیر موافق قسم کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد جسم میں جو کچھ

> حال ہی میں ایک تجربے سے کچھ سائنس داں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بڑھاپے کی ایک خاص وجہ "ایجنگ پگمنٹ" ہے جو انسان کے خلیوں کے اندر جمع ہوتا رہتا ہے اس میں چربی کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین ہوتے ہیں۔ اس پگمنٹ کے خلیوں کے اندر جمع ہو جانے پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔

(پروٹین) بنتے ہیں، وہ بڑھاپے کا موجب ہوتے ہیں۔ لیکن دوسری جانب کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ بڑھاپے کی اصل وجہ ہارمونز اور اعصابی نظام میں تبدیلیاں ہیں۔ ان کے نتیجے میں جسم کے خلیات (سیلس) کم زور ہو جاتے ہیں اور اس کم زوری کے باعث بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے کی کچھ اور وجہیں بھی بتائی گئی ہیں، مثلاً جینیاتی اکائیوں میں غیر منظم تبدیلی کا عمل، جسے میوٹیشن، کہا جاتا ہے۔ یا جسم کے دفاعی نظام میں کم زوری ایسی صورت میں انسان بیماریوں کا بھی شکار ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جسم کے اندر بیکٹیریا اور وائرس زیادہ طاقت ور ہو جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ خود بھی دیکھتی ہیں کہ بچے بیماریوں کا شکار زیادہ ہوتے ہیں کیوں کہ بچوں کے جسم میں امیونی نظام یا جسمانی دفاعی نظام اس وقت ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے آپ ٹیکے بھی لگواتی ہیں تاکہ کم از کم مصنوعی طریقے سے بچوں کے دفاعی نظام کو آپ مضبوط کرتی رہیں، ورنہ بچہ کسی خطرناک بیماری سے دوچار ہو سکتا ہے۔

عام نظریہ کے مطابق بڑھاپے کی کچھ اہم وجوہ یہ ہیں: عمر کا تقاضا۔ مختلف بیماریاں جو انسان کو کافی حد تک بڑھاپے کے قریب لے جاتی ہیں۔ ذہنی پریشانیاں بھی بڑھاپے کو قریب لاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان شروع سے ہی کم زور جسمانی نظام رکھتا ہے تو اس پر بھی بڑھاپا جلد آ سکتا ہے۔ ایک اہم وجہ غیر متوازن غذا بھی ہے۔ یعنی اگر خوراک متوازن نہ ہو اور اس میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی ہو تو جوان انسان بھی بوڑھا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ۵۰ سالہ انسان بھی متوازن اور مناسب غذا کے استعمال سے ۴۰ سال سے بھی کم عمر کا معلوم ہوتا ہے لیکن بڑھاپے کو ہمیشہ کے لئے روکنے میں کوئی بھی نسخہ آج تک کارگر نہیں ہوا ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ طب یونانی اور آیورویدِ طریقۂ علاج میں بڑھاپے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بہت سے طریقوں کا بیان ملتا ہے۔ مثلاً مخصوص ورزشوں اور جڑی بوٹیوں کی مدد سے بڑھاپے کے اثرات کو ختم کرنا۔

بڑھاپے میں چہرے پر جھرّیاں عام طور پر پڑ جاتی ہیں۔ حواس خمسہ (یعنی پانچ حواس یا دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی پانچ قوتیں) جو چہرے کی جلد کے نیچے کافی تنے رہتے ہیں، بڑھاپے میں سکڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے جلد بھی سکڑتی ہے اور چہرے پر جھرّیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ دوسری جانب بڑھاپے میں خون کی نالیوں کی اندرونی دیواروں پر چربی کی تہہ جم جانے سے ان میں خون کا دوران بھی کم ہو جاتا ہے اور جسمانی اعضا بھی اس طرح کم زور ہو جاتے ہیں۔

حال ہی میں ایک تجربے سے کچھ سائنس داں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بڑھاپے کی ایک خاص وجہ "ایجنگ پگمنٹ" ہے جو انسان کے خلیوں کے اندر جمع ہوتا رہتا ہے۔ اس میں چربی، کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین ہوتے ہیں۔ اس پگمنٹ کے خلیوں کے اندر جمع ہو جانے پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں جب سائنس دانوں نے بڑھاپے کی جین دریافت کر لی ہے اور اس کی توڑ پھوڑ کی مرمت کرنے والے مستری کو ڈھونڈ نکالا ہے تو بڑھاپے کے دوسرے ضروری سائنسی عوامل کو ڈھونڈ نکالنا شاید زیادہ مشکل نہ تھا۔ لیکن اس میدان میں کام ہی بہت کم ہوا ہے۔ بڑھاپے کی جین پر کام کرنے والا پہلا سائنس داں اس جانب تحقیق کے لئے راغب ہوتے اور ایک بڑے عرصے تک اس سلسلے میں کام نہ ہو سکا لیکن اب بائیو انجینیرنگ جو بڑھاپے کو کنٹرول کرنے میں مصروف ہے۔ بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بڑھاپا تو آنا ہی ہے، لیکن سائنس داں اگر اپنی کوششوں میں کام یاب ہو گئے تو لوگ زیادہ عمر میں بھی نہ صرف جسمانی اور ذہنی طور پر ٹھیک رہیں گے، بلکہ خطرناک بیماریوں (جیسے جوڑوں کا درد، گٹھیا اور دوسرے امراض) کے اثرات سے بھی بچے رہیں گے۔

سائنس داں تو اپنے کام میں مصروف ہیں لیکن ہم خود بھی بڑھاپے اور بیماریوں کے خلاف کچھ ضروری قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان میں غذائیت سے بھرپور خوراک، ورزش، اپنی صحت کی دیکھ بھال اور نشہ آور چیزوں سے پرہیز یقینی طور پر لمبی عمر اور اچھی صحت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ بڑھاپا تو آنا ہی ہے۔ اس کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ تاہم کچھ عرصہ تک بڑھاپے کو ٹالا تو جا سکتا ہے۔ اگر آدمی ورزش، متوازن غذا اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کے ذریعہ اپنے دفاعی نظام کو مضبوط اور اپنے اعضا کے افعال کو درست رکھے تو وہ بڑھاپے کی عمر میں بھی یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔

ابھی تو میں جوان ہوں۔

قمر رضا زیدپوری

گلشن

عید قرباں کا دن تھا ـــــ میں صبح کو اُٹھ کر جب محل سرا میں چائے پینے گیا تو چچی جان بڑبڑا رہی تھیں : "ابھی سارا کام پڑا ہے اور کتنا دن چڑھ آیا ہے ـــــ کم بخت کو تیوہار کے دن کا بھی کوئی خیال نہیں۔ کل جاتے جاتے سمجھایا تھا، اس حرام خور گلشن کو کہ عید کا دن بھی بھاری ہے، اندھیرے مونہہ آ جانا ـــــ اکیلی میں بہاؤ کیا کیا کرے گی ـــــ لیکن منحوس کا ابھی تک پتہ نہیں ـــــ نہ جانے کہاں مر گئی! تم چائے پی لو تو باہر جا کر کسی سے گلشن کو بلوا دو۔"

محل سرا سے باہر آ کر میں نے گلشن کو بلوانے کے لئے چچا جان کے خدمت گار کو آواز دی۔

"شبراتی ـــــ!"

"شبراتی کو میں نے بھیجا ہے ـــــ ماسٹر عزیز کے گھر قربانی کا گوشت دینے کے لئے۔" چچا جان کی آواز آئی۔

پچھلے کئی برس سے گرمیوں کی چھٹیوں میں میں وقت گزاری کے لئے چچا جان کے ہاں لکھنؤ چلا آتا تھا ـــــ بس گزشتہ برس اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے نہ آ سکا تھا ـــــ مجھے معلوم تھا کہ گلشن بشیر حجام کی لڑکی ہے جس کی کوٹھری چچا جان کی حویلی کے پیچھے، تھوڑے ہی فاصلے پر بنی ہے۔

بشیر کی کوٹھری کے پاس پہنچ کر میں رک گیا اور آواز لگائی : "بشیرا!"

میں نے کئی بار پکارا، لیکن کوئی جواب نہ ملا ـــــ بشیر کا کہیں پتہ نہ تھا ـــــ میری نظر چھپر کے نیچے کوٹھری کے بھڑے ہوئے کواڑ پر پڑی ـــــ باہر سے کنڈی نہیں لگی تھی ـــــ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ گلشن یا تو کوٹھری میں ہے، یا پھر کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ میں چھپر کے نیچے چلا گیا۔ کواڑ کی کنڈی بجانے کے لئے میں نے اپنا ایک ہاتھ کواڑ پر رکھا ہی تھا۔ کہ وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا، اور پھر کوٹھری کے اندر حسن کے نظارے سے میں ایسا بھونچکا ہو کر کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا۔

دو سال پہلے میں نے گلشن کو محل سرا میں کام کاج کرتے، حویلی میں آتے جاتے دیکھا تھا ـــــ تب وہ ایک دبلی پتلی سی چھوکری تھی ـــــ بالکل معمولی سی لڑکی ـــــ لیکن اب تو سیانی ہو کر اس نے ایسا روپ نکالا تھا جیسے

گمان میں بھی نہ تھا — میں کھڑا اسے تکتا رہا — سامنے چارپائی پر چت لیٹی سو رہی تھی — نیند میں وہ ایسی بے سدھ تھی کہ غرارہ گھٹنوں تک سمٹ گیا تھا۔ اور گوری گداز پنڈلیوں سے سرخ سفید رنگ چھلک رہا تھا — یکایک گلشن نے کروٹ لی اور میرے وجود میں اور بھی ہلچل مچا گئی — میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیسے جگاؤں کہ اچانک وہ خود ہی جاگ پڑی — مجھے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور کچھ دیر مجھے حیرت سے دیکھتی — پھر اس کا چہرہ تمتما کر سرخ ہو گیا اس نے خوف زدہ ہرنی کی مانند چارپائی سے چھلانگ لگائی اور جلدی سے الگنی پر پڑے اپنے دوپٹے کو کھینچ کر سر سے اوڑھ لیا۔

میں گھبرا گیا کہ کہیں گلشن نے مجھے اس طرح تکتے دیکھ کر برا نہ مان گئی ہو — میں نے ہمت کر کے جلدی سے کہہ دیا: "تمہیں بلانے آیا تھا — چچی جان نے تمہیں بلا بھیجا —"

پھر اس کا جواب سنے بغیر میں جلدی سے جانے کے لئے گھوم گیا۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی؟ کسی کو بھیج دیتے — میں حاضر ہو جاتی —" گلشن کے لہجے میں دل کو چھو لینے والا ایسا ترنم تھا، جس کی کشش نے مجھے جاتے جاتے مڑ مڑ کر اسے دیکھنے پر مجبور کر دیا — اور جب میری نگاہ اس پر پڑی تو دل دھک سے ہو گیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی — پھر جیسے وہ گھبرا سی گئی اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا اور وہ مرمریں پتھر کا نازک سا مجسمہ معلوم ہونے لگی۔ میرا دل مچل پڑا — کاش کیمرہ میرے ساتھ ہوتا تو اس الھڑ دوشیزہ کے یہ سارے انداز حسن کی دنیا میں شاہکار ثابت ہوتے! میرے دل میں چھپا ہوا شوق تیزی سے بھڑک اٹھا — میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں آیا — سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے اپنا قیمتی کیمرہ نکال کر بیٹھ گیا — ابھی اس میں آدھی سے زیادہ فلم باقی تھی۔ مگر ابھی تو گلشن کے فوٹو کھینچنے کے لئے موقع تلاش کر رہا تھا۔

چچا جان کے ہاں آئے ہوئے مجھے تیسرا دن ہو گیا، لیکن خوب صورت گلشن کی تصویر اتارنے کا کوئی موقع مجھے نہیں ملا — میں ہر آن اس سوچ میں رہنے لگا کہ دل کی خواہش کیسے پوری ہو —

ایک دوپہر کو میں اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا — اتنے میں میری نظر سامنے کھڑکی اس پار لان کی روش کے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے حوض کے پاس گلشن پر پڑی وہ حوض کے کنارے بیٹھی چچی جان کے نماز والے کپڑوں کو پانی میں صاف کر رہی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور دوپٹے کا آنچل سر سے ڈھلک کر اس کے کاندھوں پر آ رہا تھا — اس کے بیٹھنے کے انداز سے اس کی گوری پنڈلیوں کا زیادہ تر حصہ کھلا ہوا تھا۔ اور جوان گداز جسم حوض پر اس طرح جھکا تھا جیسے چاند حوض پر اتر آیا ہو! گلشن کا یہ انداز مجھے بہت پیارا معلوم ہوا — اس خوبصورت منظر کو کیمرہ میں قید کرنے کے لئے میرا دل بیتاب ہو اٹھا — خوب صورت تصویریں جمع کرنا میری ہابی تھی۔ میں نے لپک کر سوٹ کیس کھولا اور کیمرہ نکالا، لیکن جب میں کیمرہ لے کر کمرے سے باہر گلشن کی طرف بڑھا تو میری رفتار میں لڑکھڑاہٹ تھی، جھجک تھی۔

گلشن اپنے کام میں منہمک تھی — بے خبری میں اس کی تصویر اتارنا بے کار ہی تھا — اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ چاند سے چہرے کا زیادہ حصہ دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اور گلشن کو خبردار کر کے تصویر لینا بڑے حوصلہ کا کام تھا — میں سوچ میں پڑ گیا کہ تصویر لوں یا نہ لوں۔ گلشن سے کچھ کہوں یا نہ کہوں — جوان اور خوبصورت لڑکی جانے کس بات پر ناراض ہو جائے۔ کس لمحہ بجلی بن کر کڑک پڑے — پھر تو بلا وجہ کی بدنامی ہوگی — نہیں، یہ سب ٹھیک نہیں — میرے بڑھتے قدم رک گئے — لگا کہ واپس ہو لوں — لیکن میرا دل اتنا حسین منظر، اتنی دل کش تصویر کھو دینے

پر آمادہ نہ ہو سکا — میرے دل کی مچلتی خواہش نے ہمت بندھائی — اب ایسی بھی بزدلی کیا — تمہارے دل میں کوئی چور نہیں، کوئی کھوٹ نہیں، گلشن سے بات کر کے دیکھو — وہ اتنی سی بات کا برا نہ مانے گی —

میں نے ایک بار پھر نگاہ اٹھا کر گلشن کو دیکھا — وہ کپڑے نچوڑنے میں مصروف تھی۔ چاروں چاروں طرف سناٹا تھا — چچا جان دیر ہوئی سونے کے لئے جا چکے تھے۔ میرے رکے ہوئے قدم پھر گلشن کی طرف اٹھ گئے — قریب ہوتے ہوئے میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا اور مجھے قریب دیکھ کر جیسے سہم گئی — اس نے جلدی سے اپنے ننگے سر کو ڈھلکتے ہوئے دوپٹے سے ڈھانک لیا — پھر کنکھیوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا دی اور گردن جھکا لی — مجھے حوصلہ ملا اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"گلشن!" میں نے اپنی آواز کو مدھر بنانے کی پوری کوشش کی۔

"جی — !" اس کی آواز میں ایک ترنم تھا۔

"تمہاری ایک تصویر اتارنا چاہتا ہوں۔ تمہاری اجازت درکار ہے۔"

"بندی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی۔" اس کے مترنم لہجے میں اس کی ذہانت کی جھلک بھی نمایاں تھی۔

"لیکن، میں تو تمہیں اس قابل سمجھتا ہوں۔"

"ذرہ نوازی — لیکن بندی کو یہ شرف نہ بخشئے — بندی آپ کے گھر کی خادمہ ہے۔" گلشن نے اپنی آواز کا جادو جگا دیا —

"مجھے دکھ ہے کہ تم نے میری بات ٹھکرا دی —"

"کنیز کی یہ مجال کہاں — !" گلشن نے مدھم لہجے میں کہا۔

"پھر تصویر کھنچوانے میں حرج ہی کیا ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"ایسا کر کے بندی کا دماغ خراب نہ کیجئے۔"

"میں سمجھ گیا — تم تصویر کھنچوانے سے

انکار کر رہی ہو، میری بات کو ٹال رہی ہو ــــ" میں واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

"آپ تو ناراض ہو گئے ــــ بندی کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا ــــ"

گلشن کی شکست بھری آواز میرے کانوں میں رس ٹپکا گئی ــــ میں نے گھوم کر دیکھا ــــ گلشن مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا اس کی آنکھوں میں التجا تھی، پکار تھی ــــ خاموش پکار ــــ منانے کا ایک پیارا انداز ــــ میں اس کے پاس چلا آیا: "اچھا تو جلدی سے تیار ہو کر کھڑی ہو جاؤ ــــ"

"لیکن کنیز ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہے گی ــــ"

"تم میرے سامنے یہ 'کنیز' اور 'بندی' کی رٹ چھوڑ دو۔ سمجھیں اور جلدی سے تصویر کھنچوا لو ــــ کوئی آ گیا تو ایک نئی آفت سر آ جائے گی۔"

"کیا کریں گے آپ میری تصویر کھینچ کر؟" گلشن بہت ہی بھولے انداز سے پوچھ بیٹھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا ــــ جلدی سے کیمرے سے جھانک کر دیکھا ــــ اور گلشن کے وجود کو کیمرے کے زاویہ میں لینے لگا ــــ پھر کیمرے کا بٹن دبا دیا ــــ کلک:

"بس شکریہ ــــ" گلشن سے نظریں ملا کر میں مسکرا دیا ــــ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر کوئی جھنجھلاہٹ نہ تھی ــــ اس کا چہرہ ایسا کھلا ہوا گلاب معلوم ہو رہا تھا جس پر ٹوٹ کر بہار آئی ہو ــــ!

ایک روز صبح کو جاگ جانے کے باوجود میں بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔

"چلئے، چائے پی لیجئے ــــ" گلشن نے میرے کمرے میں داخل ہو کر کہا اور ایک طرف چپ چاپ کھڑی ہو گئی ــــ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے ــــ

"کیا بات ہے گلشن؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ــــ آپ نے وہ تصویریں نہیں دکھائی؟" وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

"بننے گئی ہے ــــ آ جانے دو ــــ"

میں نے دیکھا، وہ میرے جواب کے بعد بھی گلنار بنی کھڑی تھی، جیسے ابھی کچھ اور پوچھنا چاہتی ہو۔

"بتاؤ اور کیا بات ہے؟" میں نے اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے بھی اپنی کوئی تصویر دیجئے نا ــــ" یہ کہہ کر گلشن شرما گئی۔

میں سناٹے میں آ گیا ــــ مجھے گلشن سے اتنی جرأت کی اُمید نہ تھی۔

"یہ ٹھیک نہ ہوگا ــــ" میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں ٹھیک نہ ہوگا؟" گلشن حیران آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میری تصویر کسی نے تمہارے پاس دیکھ لی تو؟"

"ہونہہ! کوئی کیسے دیکھے گا بھلا ــــ؟" گلشن اترا کر بولی۔

"پھر کبھی میں اپنی تصویر تمہیں دوں یہ ٹھیک نہیں ــــ"

گلشن نے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔ جیسے پوچھ رہی ہو: آپ نے ہماری تصویر اتار لی، وہ تو ٹھیک تھا ــــ اور یہ ٹھیک ــــ نہ ہوگا؟ پھر وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے چلی گئی ــــ

تین دن بعد گلشن کی تصویر بن کر ملی تو میری نگاہوں کے سامنے جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے ــــ میں تصویر کو بڑی دیر تک تکتا رہا۔ وہ تصویر میں بہت پیاری، بہت دل کش نظر آ رہی تھی۔ میں پہلے سے سوچ رہا تھا کہ اگر تصویر صاف آئی تو میں اسے 'نظارے' میں چھپنے کے لئے بھیج دوں گا ــــ مجھے ایسے اور بھی کئی رسالوں کا پتہ معلوم تھا جن کے صفحات ہر ماہ خوبصورت اور دل کش تصویروں کے لئے مخصوص رہتے ہیں ــــ چنانچہ میں نے گلشن کی تصویر نظارے میں چھپنے کے لئے بھیج دی ــــ میں چاہتا تھا کہ تصویر چھپ کر آ جائے اور اس کا معاوضہ بھی مل جائے تو دونوں چیزیں میں ایک ساتھ گلشن کو دوں ــــ پھر وہ کتنی حیران ہوگی اپنی تصویر دیکھ کر اور ساتھ میں روپے پا کر۔

مجھے چچا جان کے ہاں آتے ہوئے پورا ایک مہینہ ہو رہا تھا ــــ دوپہر کا وقت تھا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ ہاتھ کا پنکھا جھلتے جھلتے میری آنکھ لگ گئی ــــ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ خنک ہوا کے ساتھ، کوئی خوشبو سی بکھر گئی ہے ــــ ایسی لطیف خوشبو جو نہ پھولوں میں ہوتی ہے اور نہ کسی عطر میں ــــ میں نے آنکھیں کھولیں تو مبہوت رہ گیا۔ کبھی کبھی انسان کے اندازے کتنے سچ ثابت ہوتے ہیں! اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا ــــ گلشن معصومیت کے ساتھ میرے پلنگ کے پاس نگاہیں جھکائے کھڑی مجھے تیزی سے

معلومات

- شمس الدین التمش برصغیر کا وہ بادشاہ گزرا ہے جس کے تین بیٹے ایک دوسرے کے بعد بادشاہ بنے اور ایک بیٹی بھی ملکہ بنی۔
- ڈیلاس انٹرنیشنل ائرپورٹ دنیا کا واحد ہوائی اڈہ ہے جو ہوائی جہاز کی شکل کا ہے۔
- دنیا میں سب سے بڑی چھپکلی (موڈو ڈریگون) جس کی لمبائی ساڑھے تین میٹر ہے یہ لیسر سنڈس (انڈونیشیا) میں پائی جاتی ہے۔ اس کا وزن ۲۵ کلو تک ہوتا ہے۔ یہ زمین پر دوڑتی ہے اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ چھپکلی ہرن اور ریچھ جیسے تیز رفتار جانوروں کا شکار کرتی ہے۔
- آسا گرے امریکہ کا ماہر نباتات تھا اس نے ساری زندگی پودوں، جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں صرف کی۔ اس کو پچیس ہزار پودوں کے نام زبانی یاد تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے ان کی خوشبو سونگھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ فلاں پودا ہے۔ خود اس کی خواب گاہ میں سینکڑوں پودے تھے۔

پنکھا جھل رہی تھی۔ میں کچھ دیر بے سدھ پڑا اسے دیکھتا رہا —— اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور گورے مکھڑے سے گلابی رنگ برس رہا تھا —— میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا —— بے اختیار دل میں آیا کہ اسے اپنے اوپر کھینچ لوں —— لیکن دوسرے ہی لمحہ عقل جیسے چیخ پڑی جوانی کے نشے میں اندھے نہ ہو —— اپنے خاندان کی شاندار روایات پہ پانی نہ پھیرو۔ ایک کنیز، ایک باندی کی حوتب صورتی پر فدا ہو کر اپنی خاندانی عزت کو گروی نہ رکھو —— عقل کی اس مکالمہ بازی سے میں گھبرا اٹھا اور میرے مونہہ سے بے اختیار نکل گیا: "ارے تم میرے کمرے میں! یہ کیا کر رہی ہو؟ کسی نے دیکھ تو قیامت آ جائے گی —— میں کسی کو مونہہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا ——"

"میں اس گھر کی کنیز ہوں —— آپ پسینے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں نے پنکھا جھل کر کوئی گناہ نہیں کر دیا" گلشن نے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو —— لیکن دنیا والوں کا مونہہ کون بند کر سکا ہے"

گلشن نے میری طرف عجیب نظروں سے گھورا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی، جیسے میری گھبراہٹ پر طنز کر رہی ہو۔ میری بوکھلاہٹ کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"اچھا جی، آپ پریشان نہ ہوں —— ہم جاتے ہیں ——" وہ ایک ادا کے ساتھ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

مجھے امید تھی کہ گلشن کی تصویر "نظارے" میں چھپ کر میرے جانے سے پہلے ہی آ جائے گی۔ اور ایسا ہی ہوا —— میری روانگی میں صرف تین دن باقی تھے کہ مجھے "نظارے" کا تازہ شمارہ اور پچاس روپے کا منی آرڈر ایک ساتھ وصول ہوئے —— میں نے جلدی سے پرچہ کھول کر دیکھا دوسرے ہی صفحے پر گلشن کی تصویر مسکرا رہی تھی —— ایک باندی نے پرچے میں چھپی ساری مغرور حسیناؤں کو مات دے دی تھی —— اس چراغ کے توسط سے سارے چراغوں کی روشنی پھیکی بنا دی گئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی گلشن کی اس جیت پر —— میں سوچنے لگا گلشن اب پہلی بار اپنی قیمت کا احساس کرے گی، اپنی تصویر دیکھ کر اپنے حسن پر رشک کرے گی —— اور پھر جب اپنی تصویر کے ساتھ پچاس روپے میں ملیں گے تو وہ اور بھی خوشی سے ناچ اٹھے گی۔ میں اپنے کمرے میں گلشن کا انتظار کرنے لگا —— ابھی دن کے دس ہی بجے تھے —— وہ محل سرا سے مجھے دوپہر کے کھانے پر بلانے کے لئے آ سکتی تھی۔ میں لیٹ کر ایک ناول پڑھنے لگا —— نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں کچھ دیر تک سوتا رہا —— پھر کسی کے آنے کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی —— میں چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

"چلئے نا —— کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا"

"کدھر سے چلوں —— راستہ تو تم نے روک رکھا ہے"

میں اس کے اتنا قریب ہو گیا کہ اس کی مہکتی سانسوں کی خوشبو مجھے پھولوں کی خوشبو سے زیادہ لطیف محسوس ہوئی —— وہ جلدی سے دروازے سے نکل گئی۔

"ارے سنو تو ——"

اس کے قدم یکایک رک گئے —— وہ لاج سے گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی، جیسے پوچھ رہی ہو: "فرمایئے، کیا بات ہے؟"

"تم دوپہر کو جب گھر جانے لگو تو ذرا دیر کے لئے میرے پاس آ جانا"

گلشن نے مجھے بڑی بڑی حیران آنکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو: "کیا کہا آپ نے؟" پھر زیر لب مسکرا دی۔

"زہے نصیب! میں تعمیل حکم کی پوری کوشش کروں گی ——" اس کی آواز کے اضطراب میں بھی بلا کی دل کشی تھی —— ایسی دل کشی کہ آدمی سن لے تو کھو جائے۔

"تمہارا اندازِ گفتگو بھی بہت پیارا ہے"

میں اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ آپ کا حسن سماعت ہے ورنہ کنیز اس قابل نہیں ——" اس نے کہا اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مونہہ سے پھول جھڑنے کی تشبیہ میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔

کھانے کے بعد میں محل سرا سے ڈیوڑھی میں لوٹ آیا —— کچھ دیر سے چوڑیوں کی مترنم کھنک کے ساتھ گلشن کی نغمہ بار آواز میرے کانوں میں گونجی ——

"کنیز حاضر ہو گئی"

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں —— تمہاری تصویر بھی چھپ کر آ گئی ہے —— میں نے تمہیں اسے دکھانے کے لئے ہی بلایا ہے —— دیکھو گی تو جھوم اٹھو گی ——"

گلشن کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا —— میں نے جلدی سے وہ صفحہ کھول کر گلشن کی طرف بڑھا دیا: "یہ دیکھو اپنی تصویر!"

گلشن تصویر والے صفحہ پر جھک گئی —— لیکن دوسرے لمحہ وہ چونک گئی: "اس کتاب میں میری تصویر؟"

"ہاں —— میں نے چھپنے کو بھیج دی تھی۔ دیکھو —— کتنی اچھی تمہاری تصویر آئی ہے —— کتنی دل کش —— سب سے پیاری —— اور یہ اس کے ساتھ پچاس روپے بھی آئے ہیں" میں نے روپے اس کی طرف بڑھا دئے۔

لیکن گلشن سنجیدہ ہو گئی —— اس کے شاداب چہرے پر خوشی کی لہر یکایک سمٹ گئی۔ اس نے تصویر اور نوٹ دونوں پر نفرت اور حقارت بھری نگاہ ڈالی —— ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی —— پھر وہ کچھ بھی کہے بغیر تیزی سے مڑی اور جانے لگی —— میرا دل تڑپ گیا —— میں نے چاہا کہ روٹھی ہوئی گلشن کو تھام لوں، بڑھ کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں، لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا، ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا —— مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ خاندان کے وقار کی حفاظت کے لئے بڑی کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے —— میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، لیکن کسی آنسو نے دل کی آگ کو ٹھنڈا نہ کیا ——

●●

کیا بچّوں کو مارنے پیٹنے سے آپ کی پریشانی دُور ہو سکتی ہے

نسرین اختر

ہندوستان میں خاص طور سے روایت پرست گھرانوں میں بچّوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے اور مارنے پیٹنے کا رویّہ بہت عام ہے۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بچّوں کے ساتھ نرمی برتنا انہیں بگاڑ کی راہ پر ڈالنا ہے اور اُنہیں سُدھارنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آیا جائے۔ وہ اس نکتے کو بھُول جاتے ہیں کہ بچپن نام ہے ہنسنے کھیلنے اور اچھی یادگاروں کا۔ عام خیال یہی ہے کہ اگر بچّے کو زیادہ چھوٹ دی گئی تو وہ ہاتھوں سے نکل جائے گا اور اپنی من مانی کرنے لگے گا۔

اکثر گھروں میں بچّوں کو بہت بُری طرح مارا پیٹا جاتا ہے اور ہم شاید یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ سب بچّوں کی بھلائی کے لئے ہو رہا ہے اور اس سے بچّوں کے اندر نظم و نسق پیدا ہوگا۔ اس بات سے قطع نظر کہ کیا مار پیٹ سے بچّوں میں واقعی ڈسپلن پیدا کیا جاسکتا ہے، اصلیت یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں ڈسپلن مقصد نہیں، صرف بہانہ ہوتا ہے۔

جب انسان چاروں طرف سے پریشانیوں میں گھرا ہوتا ہے تو بچّے کی ذرا سی غلطی پر بھی اس پر بُری طرح جھنجھلاہٹ اُتاری جاتی ہے۔ وہ کمزور ہے، اس لئے وہی والدین کے غصّے کا نشانہ بنتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو والدین خود بچپن میں پٹتے رہے ہوں، وہ اپنے بچّوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔ ایسا کر کے گویا وہ اپنا پچھلا انتقام پورا کرتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ بچّے کی ذرا سی بھُول چُوک پر بھی یہ سوچ کر اسے پیٹا جائے کہ اس سے کافی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آخر اس سے غلطی کیوں اور کن حالات میں ہوئی لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جو بچّے کی کسی غلطی پر اس کو دُھن ڈالنے کی جگہ سنجیدگی سے اس کی نفسیات کا جائزہ لیں۔ ہندوستان میں تو پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ۵۰ فی صد ہی ایسے ہوں گے جو بچّوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مشکل یہ ہے کہ اس سلسلے میں ابھی تک نہ کسی قسم کے اعداد و شمار فراہم ہو سکے ہیں نہ دستاویزی ثبوت۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بچّوں کو مارنے پیٹنے کے واقعات کہیں درج نہیں ہوتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم اس معاملے میں بہت بے حس ہیں۔ ہم سمجھ کر بھی اس سچائی کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں بچّوں پر روایت کے بالمقابل کتنا بڑا ستم ہو رہا ہے۔ عموماً ہم بچّے کو صرف اس نیت سے

گیت

ساجن میرے سانجھ سویرے
چاروں اور دکھوں کے پھیرے

سانسوں کی بیکل فریادیں
من میں ہر پل تیری یادیں
ڈر ہے کہ پاگل نہ بنا دیں
بن تیرے دن رین اندھیرے
ساجن میرے ....

مدماتی سی یہ دیوانی
کہہ دو نہ چھیڑے پریم کہانی
مرجھائی ہے مست جوانی
سونے سونے چھت کے منڈیرے
ساجن میرے ....

بھول گئے پردیس میں جا کے
قسمیں وعدے اور دلاسے
جانے کس سنگ نین لڑا کے
میری آشاؤں کے لٹیرے
ساجن میرے ......

آ کے مجھے من میت بلائے
لاکھ جتن سے پریت بھلائے
گھور برہ کا گیت رلائے
ناگن سے بے حال سپیرے
ساجن میرے ....

خورشید اکبر

پیٹتے ہیں کہ ان میں نظم و ضبط پیدا ہو جائے۔ ہمارے یہاں بچوں کو سزا دینا (تشدد) کا ایک جائز طریقہ سمجھا جاتا ہے اور صرف سمجھانا بجھانا ایک غیر مناسب طریقہ۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ بچے کے جرم کے لئے کوئی ایسی کارگر سزا نہیں ہو سکتی جس سے اس کی اصلاح ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سزا اپنے آپ میں کوئی مناسب علاج نہیں ہے۔ بیشتر صورتوں میں سزا کا سرچشمہ خود والدین کی کوئی نفسیاتی گرہ ہوتی ہے۔ والدین جب بہت زیادہ غصے میں ہوتے ہیں تو بچے کی ذرا سی غلطی پر بھی چراغ پا ہو جاتے ہیں اور بچے پلک جھپکنے میں ان کے غصے کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس طرح بچوں پر سے ماں باپ کا رعب تو ختم ہوتا ہی ہے، وہ ڈھیٹ اور اڑیل بھی بن جاتے ہیں۔ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ غلطی چھوٹی ہو یا بڑی، سزا تو ملنی ہی ہے۔ پھر وہ خود کو کیوں سدھاریں۔ دراصل بچوں کو بگاڑنے کے لئے ۹۰ فی صد والدین خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ خود سخت کلامی اور مارپیٹ کرتے ہیں تو بچوں میں بھی وہی عادت پڑ جاتی ہے۔

اونچی سوسائٹی میں بچوں کو عموماً نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ والدین کی بے توجہی کا شکار رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک لڑکا بہت شریر تھا اور کسی طرح بھی نوکروں کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ اس کی ماں اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارتی تھی۔ ایک روز ایک نوکر نے جب بچے کی شکایت ماں سے کی تو ماں کو بہت غصہ آیا اور اس نے سختی سے بیٹے سے پوچھا کہ آخر وہ اتنی شرارتیں کیوں کرتا ہے۔ اس پر لڑکے نے جواب دیا "مجھے سزا سے نہیں ڈر لگتا بلکہ مجھے تو اس وقت خوشی ہوتی ہے جب میں آپ کے ہاتھوں پٹتا ہوں، کیوں کہ اس طرح کم از کم ہم ایک دوسرے سے مل تو لیتے ہیں۔"

مشترکہ خاندانوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی بچوں سے سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ اکثر ان کے درمیان اس سلسلے میں آپس میں مقابلہ سا رہتا ہے۔ مثلاً خاندان میں ایک عورت بے اولاد ہے تو وہ دوسرے کے بچے پر اپنی جھنجھلاہٹ اتارتی ہے۔ یا پھر ایک عورت کے یہاں لڑکی ہے اور وہ یہ محسوس کرکے برا مانتی ہے کہ دوسری کے لڑکے پر خاندان کے لوگ زیادہ پیار نچھاور کر رہے ہیں تو وہ اس بچے سے حسد کی وجہ سے سخت کلامی سے پیش آنے لگتی ہے۔

روایت بچے کو مارنے پیٹنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ باپ چونکہ خاندان کا سرپرست ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنے روایتی انداز میں بچوں کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ اس سخت گیری کو وہ اپنا جائز حق سمجھتا ہے یا پھر اپنے کاروبار اور کام کی زیادتی کی وجہ سے گھر آکر وہ بچوں پر دن بھر کی جھنجھلاہٹ اتارتا ہے، انہیں جھڑکتا ہے اور مارتا پیٹتا ہے۔ شراب اور دوسرے نشوں کے عادی مرد تو گھر کو جہنم بنائے رکھتے ہیں۔

بچوں پر تشدد کرنے کی امکانی وجوہ کے بارے میں مختلف لوگوں کا الگ الگ خیال ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سخت گیری والدین کی عادت میں شامل ہوتی ہے اور وہ اسی لئے ہر وقت اپنے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ سزا ہمیشہ عضو ضعیف پر گرتا ہے۔ اس طرح بچے ہی ان کے غصے کا نشانہ بنتے ہیں۔

کچھ اور لوگوں کی رائے میں غربت اور افلاس کی وجہ سے لوگوں میں پریشانیاں اور الجھنیں بڑھتی ہیں۔ اس لئے ایسے والدین بچوں کے حق میں جابر بن جاتے ہیں۔ جھنجھلاہٹ کی وجہ سے وہ بچوں سے کبھی نرمی سے بات نہیں کرتے۔ کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچوں پر ستم صرف غربت کے مارے ہوئے لوگ ہی کرتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی اور متوسط طبقے میں بھی ایسے مزاج کے لوگ بہت ملتے ہیں۔

کچھ لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سب لوگوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ بچّوں کو بُری باتوں سے روکنے کے لئے مارنا پیٹنا اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ والدین ایسا کرتے وقت صرف اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ وہ خود حالات کا مقابلہ نہیں کر پاتے، اس لئے بچّوں کو مار پیٹ کر اپنی کوتاہیوں کو چھپاتے ہیں اور اس طرح اپنے خیال میں حالات سے انتقام لے لیتے ہیں۔

اکثر بچّے جب چھوٹی عمر میں پٹتے ہیں تو ان کو اس بات کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ لیکن بعد میں جب وہ دوسرے بچّوں کے تعلق میں آتے ہیں تو انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے والدین نے ان کے ساتھ بُرا سلوک روا رکھا ہوا ہے۔ اور ان پر بے جا سختی کی جا رہی ہے۔ اس احساس سے ان کی شخصیت گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ فطری جوہر کھل کر سامنے نہیں آتے۔ احساسِ کمتری انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ اپنے خول میں سکڑ سمٹ کر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں یا پھر وہ بڑے ہو کر دوسروں سے اپنی بے بسی کا انتقام لینے لگتے ہیں اور جرم و تشدد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

بچّوں کو صرف سزا دینے سے ان میں نظم و نسق کا میلان اور کردار کے دوسرے اوصاف پیدا نہیں ہو جاتے۔ سب سے پہلے ان کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بچّوں کو جب نظر انداز کرنا شروع کر دیا جاتا ہے تو وہ من مانی پر اُتر آتے ہیں اور ہٹیلے بن جاتے ہیں جس ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی غریبی کی سطح سے بھی نیچے ہے، وہاں والدین ہی بچّوں کی اس بُرائی کے ذمّہ دار ہوتے ہیں۔ یا پھر جب بچّہ گھر میں کسی دوسرے بچّے کو چاہت کا مرکز بنے دیکھتا ہے تو وہ حسد کی وجہ سے بھی ضدی اور ڈھیٹ بن جاتا ہے۔ اس لئے بچّے کی ضد پر اسے سزا دینے کی جگہ اس کی ضد کے اسباب تلاش کر کے مناسب قدم اٹھانا چاہئے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ والدین کی ہر بات کا اثر بچّوں پر ضرور پڑتا ہے چاہے وہ غلط ہو یا صحیح۔ اگر والدین بچّوں کے ساتھ سخت گیری برتتے ہیں تو بچّے بھی دوسروں کے ساتھ ایسا ہی درشت رویّہ اپنانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعد میں وہ ماں باپ کو بھی نہیں بخشتے۔ اس طرح سخت گیری علاج کی جگہ خود ہی ایک متعدی بیماری بن جاتی ہے۔

اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بچّوں کی نفسیات کو سمجھیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ان کی شرارتوں اور ان کے ستانے، چھیڑنے کے پیچھے ان کا کون سا مقصد چھپا ہوا ہے۔ ایسا کر کے وہ ہمارا دھیان کس بات کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ غلطی پر بھی ہوں تو انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے اور مارنے پیٹنے کی بجائے ہمیں چاہئے کہ ان کو نرمی سے سمجھائیں۔ مار پیٹ سے تو کوئی حل نکل نہیں سکتا، بلکہ اس سے بچّہ اور بھی زیادہ ضدی اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔

ایک عورت کے دو بچّے تھے۔ ایک لڑکا جس کی عمر ۱۰ سال تھی اور دوسری لڑکی جس کی عمر ۶ سال تھی۔ دونوں بچّے اکثر پٹتے رہتے تھے، حالانکہ ان کی کوئی خاص غلطی نہیں ہوتی تھی۔ جب ماں سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے تو اس نے جواب دیا: "اگر بچّے ہر وقت شیطان کے کان کاٹیں اور کسی طرح کہنا نہ مانیں تو میں مار پیٹ کے سوا اور کیا کروں؟ ان کو کسی طرح تو سمجھانا ہی پڑے گا اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کو سمجھانے کے لئے مارنا پیٹنا ہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔"

ہم نے مزید جاننے کی جب کوشش کی تو پتہ چلا کہ بچّوں کو ان کی بہت معمولی غلطی پر پیٹا جاتا تھا۔ بچّوں پر اس کا جو نفسیاتی ردّ عمل ہوا، وہ ان کی عادتوں سے بھی جھلکنے لگا۔ لڑکی اپنا انگوٹھا چوستی تھی۔ لڑکا تھوڑا ہکلاتا تھا، لڑکی کو پٹائی کی اذیت سے انگوٹھا چوسنے میں پناہ ملتی تھی، لڑکے کو کمتری کے احساس نے ہکلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ویسے اس میں اور کوئی جسمانی نقص نہیں تھا۔ عورت کے رویّہ کی چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے ایک بہت عزیز رشتہ دار کی موت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی اور اکثر بچّوں پر اس کے غصّہ اُتارنے کی بھی یہی وجہ تھی، لیکن جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ صرف اس وجہ سے وہ اپنے بچّوں پر ظلم کرتی ہے۔

ایک اور عورت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بچّوں کو اکثر اس لئے پیٹتی تھی کہ گھریلو حالات نے اسے اعصابی تناؤ میں مبتلا کر رکھا تھا اور وہ اپنی جھنجھلاہٹ اتارنے کے لئے بچّوں کو نشانہ بناتی تھی۔ بچّوں کو پیٹتے وقت وہ غصّے سے پاگل ہو جاتی تھی۔

بچّوں پر سختی کرنے سے پہلے ہم سب کو سوچنا چاہئے کہ اپنی کسی نفسیاتی اُلجھن کا بخار ہم اپنے معصوم بچّوں پر کیوں اُتاریں۔

کھنڈر

مقصود اظہر

اسے آواز آتی ہے: "آخر کب تک یہاں بیٹھی رہو گی؟"

وہ چونک پڑتی ہے، مگر آس پاس کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بس شکستہ دیواریں ہیں اور ٹوٹی ہوئی چھت کا ملبہ۔ وہ اکثر شام میں ایک عظیم الشان عمارت کے اس کھنڈر میں کسی پتھر پر بیٹھ کر گزارتی ہے اسے یہاں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ سے ڈھلتا ہوا سُرخ، سُلگتا سورج خاموش خاموش سا لگ رہا ہے۔ ہوائیں آہستہ آہستہ سرسرا رہی ہیں، جیسے اس کے کانوں میں زندگی کی حرارت سے بھری سرگوشیاں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر وہ جانتی ہے کہ اب ان شکستہ دیواروں اور ٹوٹی ہوئی چھت کو صرف رنگ و روغن دے کر نیا اور جاذبِ نظر نہیں بنایا جاسکتا۔ کبھی یہ دیواریں اور چھت شان دار عمارت کی صورت رہے ہوں گے۔

کبھی یہ کھنڈر عمارت بھی جوان رہی ہو گی، جیسے کبھی وہ خود تھی۔ اس عمارت کے مکین بھی رہے ہوں گے۔ بچے، جوان، بوڑھے، ہر عمر کے۔ اس کے اپنے گھر میں بھی تو ممی اور پاپا تھے۔

"لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حویلی ملک زادہ کی ملکیت تھی۔ وہ ڈھلتی ہوئی نوابی کا سورج تھے۔ وہ جب تک رہے، یہ عمارت پرشکوہ اور روشن رہی۔ چوں کہ تنہا تھے، اس لئے ان کی ساری دل چسپی کا مرکز یہی حویلی تھی۔ ہمیشہ اسے سجانے سنوارنے میں لگے رہتے۔"

ممی اور پاپا بھی تو اسے بہت چاہتے تھے وہ بچپن سے ہی ان کی محبت کا موازنہ کرتی آئی تھی مگر آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ پاپا کا پیار زیادہ تھا یا ممی کی چاہت۔

جب ان کا داخلہ کالج میں ہوا تو ممی نے کتنا بجھا بجھا سا احتجاج کیا تھا اور بعد میں وہ پاپا کے سامنے چپ ہو گئی تھیں۔ پاپا نے ان سے صرف اتنا کہا تھا "تم اتنی عجیب و غریب باتیں کیسے سوچ لیتی ہو؟ ارے بھئی بیٹی ہے تو کیا ہوا؟ ذہین اور ہوشیار بھی ہے۔ وہ سے وہ خود آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ تم کہتی ہو کہ جوان ہو گئی ہے ــــ تو کیا ہوا جوانی کے ساتھ اسے سُوجھ بُوجھ بھی تو ملی ہے۔ اپنا اچھا بُرا خود سمجھ سکتی ہے۔ اسے بچوں کی طرح ٹوکنا کیسا؟" یہ کہہ کر پاپا نے اسے اس انداز میں دیکھا جیسے تنبیہہ کرنا چاہتے ہوں کہ تمہیں اپنا اچھا بُرا خود سمجھنا ہے۔
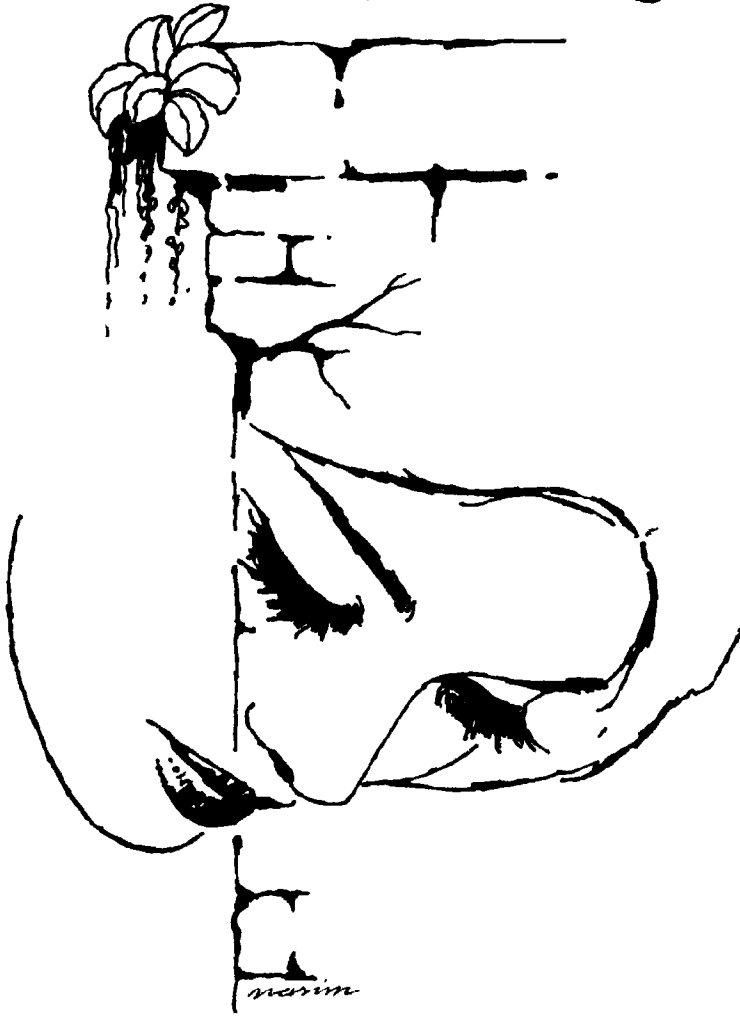
"... حویلی کی رکھوالی کے لئے ہمیشہ باوردی پہرے دار تعینات رہتا تھا، تاکہ کوئی شخص بُری نیت کے ساتھ حویلی میں داخل نہ ہو سکے۔" چونک کر وہ پھر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے، مگر ملبے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

وہ کالج جانے لگی تھی۔ نغمہ رنگین ماحول نغمہ پرور۔ دوستوں کی رفاقتیں اسے زندگی کی تمام پریشانیوں سے دُور رکھتی تھیں۔

ایک دن اس نے ممی کو پاپا سے سرگوشی

کرتے سُنا؟ دیکھو میں کہتی ہوں، پھر سوچ لو۔ لڑکا اچھا ہے اور لوگ بھی خاندانی ہیں۔"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری بیٹی ابھی پڑھ رہی ہے۔ جب تک اس کی پڑھائی مکمل نہیں ہو جاتی، میں اس سلسلے میں چپ ہی رہوں گا۔"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے تھے مگر وہ ساری رات نہ سو سکی تھی۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر عجیب عجیب خیالات اور سوالات یلغار کرتے رہے۔ عمر کی اس منزل پر یہ سب باتیں ایک سنہرے خواب کی طرح ہوتی ہیں جس میں بے پناہ کشش ہوتی ہے، خواہشیں ہوتی ہیں، امنگیں اور ارمان ہوتے ہیں۔

"..... عمارت کا دل بھی تو کبھی چاہتا ہوگا کہ کوئی اس کے آنگن میں کھیلے۔ کسی کی نقرئی ہنسی آوازوں سے شفاف چکنی دیواریں مسرور ہو اٹھیں"

اب کی بار وہ چونکی نہیں۔ اسے یقین تھا کہ ترتیب کوئی بھی نہیں ہوگا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے جب وہ سیکنڈ ایئر میں تھی تو اس کی کلاس فیلو رضیہ کی شادی ہو گئی تھی اور اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا تب اس نے رضیہ کو کتنا سمجھایا تھا۔ لیکن شادی کیا ہوئی، وہ بالکل بدل گئی۔ کہنے لگی "شادی کے بعد پڑھائی اپنے بس کا روگ نہیں۔ تم کیا جانو، جب تیرا بیاہ ہوگا تو تجھے خود معلوم ہو جائے گا۔"

اس واقعہ کے بعد اس کے ذہن میں بھی تجسس اور تلاش نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ وہ اکثر ممی اور پاپا کی سرگوشیوں کو سننے کی کوشش میں کان کھڑے رکھتی، مگر شاید ممی نے پاپا کی یہ بات گرہ باندھ لی تھی کہ جب تک اس کی پڑھائی مکمل نہیں ہو جاتی، وہ اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

گریجویشن کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ پڑھائی ختم۔ وہ سمجھتی تھی اس اظہار کے ساتھ ہی گھر میں کچھ ہلچل ہو گی اور یہی ہوا۔ ایک روز پاپا نے اسے اپنے کمرے میں بلایا "بڑا نشاط، تمہارے رشتے کی بات کچھ لوگ لے کر آئے ہیں۔ لڑکا تعلیم یافتہ ہے۔ اور برسرِ روزگار ہے۔"

پاپا کہتے جا رہے تھے اور اس کا دل سینے کے پنجرے سے نکلا جا رہا تھا۔ دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں۔ اور چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے بکھر گئے تھے۔ "پاپا میں ..." وہ پاپا سے بے تکلف ہونے کے باوجود گھبرا سی گئی تھی۔ لیکن ممی نے اس بارے میں سُنا تو بپھر اٹھیں۔ "تمہاری کیا مت ماری گئی ہے؟ لڑکا پڑھا لکھا ہے، ٹھیک ہے۔ تھوڑا بہت کماتا ہے، سو وہ بھی اچھا ہے۔ مگر اس کے خاندان، رشتہ داروں کا تو کچھ پتہ چلے۔ ہم اپنی بیٹی کسی بھی اجنبی کے پلے تو نہیں باندھ سکتے۔ گویا بیٹی نہ ہوئی گائے ہو گئی۔" اس طرح یہ بات بھی آئی گئی ہو گئی۔

ایک سال اور بیت گیا۔ وہ انتظار کرتی رہی، مگر نہ جانے اس کی قسمت میں کون سا وقت لکھا تھا کہ آتا ہی نہیں تھا۔ کبھی پاپا کے اقرار پر ممی کا انکار اور کبھی ممی کی 'ہاں' پر پاپا کی 'نہیں'، اس 'ہاں' اور 'نہیں' کے پاٹوں تلے پستے پستے جب وہ تھک گئی تو اس نے دوبارہ تعلیم شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بغیر اطلاع کے ایم اے جوائن کر لیا۔ ممی نے لاکھ دہائی دی، مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ پاپا نے صرف اتنا کہا "بغیر پوچھے تم نے فیصلہ کیسے کر لیا؟" اس پر وہ چپ نہ رہ سکی "پاپا، گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی تھی ——— اور پھر میں نے اپنی تعلیم ہی جاری کی ہے، آپ لوگوں کی اجازت کے بغیر شادی تو نہیں کر لی؟" اور اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے اندر ہی بیٹھا کہہ رہا ہے: "حویلی کے گرد کالی اونچی چہار دیواری بنی ہوئی تھی، تاکہ کوئی بغیر اجازت اندر داخل نہ ہو سکے۔"

اس درمیان ممی اپنی سہیلی کی توسط سے اس کے لئے کسی بزنس مین کا رشتہ تلاش کر لائیں مگر اس میں ایک کمی تھی۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ تھی۔ اچھے خاندان سے تھا۔ اچھا کماتا تھا۔ وہ ابھی خود کو اس رشتے کے لئے تیار کر رہی تھی کہ پاپا کا انکار نو تعمیر کردہ شیش محل کو کرچی کرچی کر گیا۔ شان دار اور پُرشکوہ عمارت یک لخت کھنڈر بن گئی۔ بالکل ایسے ان پڑھ گنوار سے بیاہ دوں تو لوگ کیا کہیں گے؟ کیا اسی دن کے لئے بیٹی کو تعلیم دلائی تھی؟" پاپا نے یہ تو سوچ لیا کہ لوگ کیا کہیں گے، مگر یہ نہیں جان سکے کہ اس طرح کی ہر بات کے ساتھ لڑکی اپنے تصور میں ارمانوں کے محل تعمیر کر لیتی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک شبیہ زندہ ہو جاتی ہے جسے وہ اپنا سمجھنے لگتی ہے اور ہر "نہ" کے ساتھ اس کے ذہن سے اس شبیہ کے تحلیل ہونے میں جو اذیت اس کی روح کو برداشت کرنی پڑتی ہے، اسے کوئی نہیں جان سکتا۔

گھر کے اجنبیت بھرے ماحول سے جب وہ ہول گئی تو اس نے ایک کالج میں لیکچرار شپ قبول کر لی۔ جو وقت تنہائیوں میں سوچتے گھلتے برباد ہو رہا تھا وہ کالج کی مصروفیات میں صرف ہونے لگا اور اس طرح اس کا ذہنی تناؤ بھی کم ہو گیا۔

ملازمت کرتے کرتے آج اسے دس سال ہو گئے ہیں۔ چند سال قبل ممی بھی ایک آس اور ایک امید لے کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"..... حویلی کے گرد بنی چہار دیواری کا اب نام و نشان بھی مٹ چکا ہے، مگر عمارت کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اب بھی کھڑی ہیں اور گرنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ مگر خود وہ آج بھی امید اور اس کی قید سے آزاد نہیں ہے۔ بالکل اس پرانی اور شکستہ عمارت کے کھنڈر کی طرح۔ اس ٹوٹی پھوٹی عمارت سے جیسے اس کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ ہو۔ دونوں کی کہانی ایک جیسی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر رونا چاہتے ہیں، مگر مجبور ہیں کہ یہ بھی ممکن نہیں۔ وہ آنکھیں بند کر لے یا باہر سناٹا بکھرا پھیل جائے، اس کھنڈر کو کھلی آنکھوں سے اندر دیکھ سکتی ہے، محسوس کر سکتی ہے۔

اس نے آسمان کی جانب دیکھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سورج کبھی کا ڈوب چکا تھا۔ اس نے سوچا سورج ڈوبا کیا ہے ——— کل پھر نئی روشنیاں لے کر طلوع ہو جائے گا۔

■■

عید اضحیٰ

ہے روایت
کہ براہیم خلیل اللہ نے
ایک دن خواب کے عالم میں کچھ ایسا دیکھا
کہ وہ معبودِ جہاں، ارض و سماں کا خالق
چاہتا یہ ہے کہ قربان کریں ابراہیم"
کوئی چیز ایسی، جو ہو اُن کو زیادہ ہی عزیز!

آزمائش کی گھڑی تھی
کہ تھا اک لمحۂ فکر
کشمکش اور تذبذب کی فضا تھی گویا
غور جب حق کے پیمبر نے کیا، تب سوچا
چاہے شے کوئی ہو، فرزند سی شے کوئی نہیں
شاید اللہ کو مطلوب ہو یہ قربانی!!

مقصدِ خواب
بیاں لختِ جگر سے جو کیا
پایا فرزند کو بھی مستعد و آمادہ
ہو کے بیتاب کہا اُس پسرِ صالح نے
یہی مرضیٔ خدا ہے تو تردد کیا ہے
جاں ہے اِک نذرِ حقیر اُس کی رضا کے آگے
ہائے کیا خوب تھا وہ جذبۂ اسماعیلی
جو ہمیشہ کے لئے بن کے رہا تمثیلی!!!

بس کہ فرزند کو لے کر کسی میداں کی طرف
ذبح کرنے کے ارادے سے چلے ابراہیم
پھر رُکے ایک جگہ پر کہ یہ سب کر گزریں
کوششِ ذبح جو فرمائی، چھُری کند ہوئی
حکمِ اللہ نہیں تھا تو چھُری کیا کرتی
جوش میں رحمتِ حق آئی جو دیکھا یہ عمل
یکبیک گونج اُٹھی پھر یہ صدائے غیبی
"ہم کو خوں بھی ترے فرزند کا منظور نہیں
اور مقبول بھی کی ہم نے تری قربانی"
مختصر یہ کہ جسے کہتے ہیں
عید اضحیٰ
اصل میں دن ہے وہ ایثار کا، قربانی کا!!!!

وقار مانوی

عید کا دن

ہر طرف چھایا ہوا اِک نور ہے
دل مِرا خوشیوں سے لیکن دُور ہے
آنکھ نم، لب پر ہنسی کافور ہے
غم ہزاروں، اِک دلِ مجبور ہے
عید کا دن ہے، جہاں مسرور ہے

عید کے دن بھی میں روتی ہی رہوں
عید کے دن بھی جُدائی کو سہوں
عید کا دن ہے بتاؤ کیا کروں
ہجر کا موسم ہے یا ناسور ہے
عید کا دن ہے، جہاں مسرور ہے

سب گلے مِل مِل کے خوش ہوتے رہے
ہم اکیلے کیا کریں، روتے رہے
آنسوؤں سے اپنا منھ دھوتے رہے
جذبۂ دل تم سے کیا مستور ہے
عید کا دن ہے، جہاں مسرور ہے

آ بھی جاؤ، کب تلک تڑپاؤ گے
خط کے ذریعے کب تلک بہلاؤ گے
کب تک آخر اس طرح ترساؤ گے
آ بھی جاؤ دل غموں سے چوُر ہے
عید کا دن ہے، جہاں مسرور ہے

کیا مناؤں عید کیسے عید ہو
عرض ہے پہلے تمہاری دید ہو
میری خوشیوں کی کہاں تمہید ہو
چاند شاید کچھ مِرا مجبور ہے
عید کا دن ہے جہاں مسرور ہے

سید عباس متقی

اُردو کی مقبول ترین ادیبہ
واجدہ تبسّم
کے مقبول ترین ناول
ساتواں پپیہا
واجدہ تبسم کا تازہ شاہکار
قیمت : بیس روپے
نتھ کی عزّت
ایک حیدر آبادی نواب سے اس کی طوائف محبوبہ کا دردناک انتقام
قیمت تیس روپے
نتھ کا غرور
حیدر آباد کی کہانیاں جس میں غیر مطبوعہ نئے افسانے بھی شامل ہیں۔
قیمت . تیس روپے
نتھ کا زخم
انوکھے انداز کا ناول حیدر آباد، انگلستان اور امریکہ کی داستان
قیمت : تیس روپے
اُترن
حیدر آباد کے رنگین ماحول کی کہانیاں
قیمت تیس روپے
نتھ اُترائی
گیارہ طوائفوں کی بارہ کہانیاں
قیمت تیس روپے
نتھ کا بوجھ
دل چسپ بے باک افسانے
قیمت : تیس روپے
قلم کے جادوگر الیاس سیتاپوری کے شاہ کار
پارسائی کا خمار
قیمت : بیس روپے
آشنا پرست
قیمت : پندرہ روپے
حرم سرا کا محبوب
قیمت : پندرہ روپے
دیوی کے پرستار
قیمت : بیس روپے
کشمیر کی کلی
قیمت : سولہ روپے
داستانِ حور
قیمت : پندرہ روپے
شہزادی کا نیلام
قیمت : پندرہ روپے
بالاخانے کی دلہن
قیمت : پندرہ روپے
حرم سرا
قیمت : پندرہ روپے
چاند کا خدا
قیمت : پندرہ روپے
عجائب خانۂ عشق
قیمت : پندرہ روپے
اندر کا آدمی
قیمت : دس روپے
راگ کا بدن
قیمت : دس روپے
انتباہ :
الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تمام کہانیوں اور کتابوں کے ہندوستان میں اشاعت کے حقوق شمع بک ڈپو کے نام محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

سترھویں قسط

اب تک کی کہانی

آفاق ایک خوب رو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے ایک روز اس سجیلے نوجوان کو دیکھا تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے وہ اس کے دفتر میں ملازم ہوگئی مگر آفاق پر اس کے حسن اور اداؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا

کچھ دن بعد جب آفاق نے فلک ناز کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تو اس کا دل کھِل اُٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر سہاگ رات سے ہی فلک ناز کو احساس ہونے لگا کہ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ دن گزرتے گئے اور فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصّے اور نفرت کی آگ تیز تر ہوگئی۔ ایک دن اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ مگر آفاق نے یہ شرط رکھی کہ آزادی پانے کے لئے پہلے اسے ایک اچھی، سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا

آفاق سے نجات پانے کی دُھن میں فلک ناز نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ اس کے سارے ناز نخرے ہوا ہو گئے۔ پھر ایک نیا احساس اس پر شدت کے ساتھ طاری ہونے لگا۔ آفاق چپکے چپکے اس کے دل میں گھر کر چکا تھا اور اب وہ آفاق کو اپنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دوری کو کیسے ختم کرے جو اس نے خود پیدا کی تھی۔ وہ جی جان سے آفاق کی خدمت کرنے لگی۔ ایک دن وہ آفاق کے سامنے اپنے بیتے دنوں کی کتاب کھول کر بیٹھ گئی جب دولت کے بوتے پر نوکروں کی فوج اس کی خدمت کے لئے حاضر رہتی تھی، لیکن نہ بے پناہ مصروف باپ کی شفقت اسے میسّر تھی، نہ فیشن اور سیر سپاٹے کی دلدادہ ماں کی ممتا۔

بشریٰ رحمٰن (لاہور، پاکستان)

آج اس نے پھر کھانے پر خوب اہتمام کیا تھا۔ اسحاق اس کا دیور تھا اور پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔۔ پھر یہاں کے سب حالات وہ اپنی ماں کو جاکر بتلائے گا فلکی نہیں چاہتی تھی کہ کسی بات میں کوئی کسر رہ جائے

جب سب کھانے کی میز پر بیٹھے۔ تو اسحاق نے کٹلس کی پلیٹ اُٹھا کر کہا تھے سے ایک کٹلس اپنی پلیٹ میں ڈالا اور کہا۔

"بھیا! تم ہر روز اسی اہتمام سے کھانا کھاتے ہو؟"

"نہیں۔" آفاق نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی، بھابی تمہیں ایسے عمدہ عمدہ کھانے ہر روز کھلاتی ہیں؟"

آفاق کچھ نہ بولا۔

"تبھی میں کہوں۔۔۔ آپ گھر میں کیوں مگن ہوگئے ہیں۔ ہر تیسرے مہینے امریکہ کا چکر لگایا کرتے تھے اور امی سے فرمائشیں کر کرکے چیزیں منگواتے تھے۔"

آفاق مُسکراتا رہا کچھ نہیں بولا۔

فلکی بھی زیرِ لب مُسکراتی رہی۔

"بھیا، یہ تو بالکل بھابی نہیں لگتیں۔" اس نے فلکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل چھوٹی سی گڑیا کا کھلونا ہیں۔ اتنی شرمیلی لڑکی کو میں بھابی نہیں کہہ سکتا۔ میں تو فلک ہی کہوں گا۔"

فلکی ایک دم اندر سے تھرا گئی۔

فلک تو اسے آفاق کہتا تھا۔ اب تک ساری دنیا نے اسے فلکی کہا تھا لیکن آفاق نے اسے فلک کہہ کر پیار انداز اختیار کیا تھا۔ اس میں کوئی بیگانگی اور رکھائی تھی۔۔۔۔ مگر یہ اس کے آفاق کا انداز تھا۔ جب وہ فلک کہہ کر بلاتا تو فلکی کا رُواں رُواں آواز بن جاتا۔۔۔ کتنی الگ۔ کتنی جُدا تھی یہ آواز۔۔۔ اس نام سے اسے کوئی اور کیوں بلائے۔

جلدی سے بولی۔

"نہیں، نہیں، اسحاق! تم مجھے بھابی کہہ کر بلاؤ گے۔ کیوں کہ مجھے شوق ہے کہ کوئی مجھے بھابی کہے۔" اس نے جان کر حد کر کے کہا تاکہ رشتے کی شرافت ظاہر کر سکے۔

"امی! بھیا کے سب دوست آپ کو بھابی ہی کہتے ہوں گے!"

"ان میں اور تم میں فرق ہے۔ تم میرے اصلی دیور ہو۔۔۔ اور پھر میرا تو کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔"

"اچھا ابھی فیصلہ کرلیں۔ مجھے بھائی بنانا ہے یا دیور؟"

"دیور۔" فلکی نے بے ساختہ کہا۔

"ذرا روشنی ڈالیں۔ میرا خیال ہے بھائی کا رشتہ زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔"

"بھائی بن کر تم۔ اس گھر میں سے غصہ کھا کر چلے جاؤ گے۔۔۔ اور دیور بن کر اپنی ہر بات منواؤ گے۔"

"واہ وا۔۔۔ واہ وا۔۔۔ بھئی، کمال کی بات کہہ دی بھابی نے۔ بھیا ذرا داد تو دو نا۔۔۔ لوگ کہتے ہیں عورتیں خود غرض ہوتی ہیں۔ صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتی ہیں۔"

آفاق خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

پھر اسحاق بولا۔

"میں تو کہتا تھا کہ یہ بے زبان ہیں۔ ان کی زبان ہی نہیں ہے۔۔۔ یا پھر بولنا نہیں جانتیں۔"

"زبان تمہاری بہت میٹھی تھی میں نے ہی داغ دی۔"

آفاق پہلی بار بولا۔

فلکی کو اس کا جملہ برا نہیں لگا۔ بلکہ اس نے مسکرا کر آفاق کی طرف دیکھا.... پھر پانی کا گھونٹ بھرا اور بولی۔

"دانت ٹوٹنے سے میری زبان زیادہ شائستہ ہو گئی ہے۔"

"اچھا.... تو آپ لوگ آپس میں انگلش بولتے ہیں..؟"

اسحاق نے مسکرا کر کہا۔ "یہ پیٹھا کس نے بنایا ہے؟"

فلکی مسکرائی۔

"شاید میں نے...."

"واہ، اتنے لذیذ شاہی ٹکڑے.... اور پھر زعفران کی خوشبو.... کس کو داد دوں"

"میرے استاد کو"

فلکی نے ہنس کر آفاق کی طرف دیکھا۔

"بھائی، آپ کا استاد کون ہو سکتا ہے.... آپ تو استادوں کے استاد معلوم ہوتے ہیں۔"

فلکی کھڑی ہو گئی۔

"میں ذرا کافی کے لئے کہہ آؤں۔"

پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ان لوگوں نے کافی پی.... تھوڑی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر وہ خالصتاً کاروباری گفتگو کرنے لگے۔

بارہ بجے تک تو فلکی وہاں بیٹھی جمائیاں لیتی رہی۔ پھر معذرت کر کے اٹھ آئی۔ جانے وہ کتنی دیر تک بیٹھے گفتگو کرتے رہے تھے۔

کیونکہ ایک بار جب فلکی کی آنکھ کھلی تو آفاق اپنے بستر پر نہیں تھا اور ان کے کمرے سے باتوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔

اگلا ایک ہفتہ کچھ ایسی ہی مصروفیات میں گزرا۔ اسحاق کے آجانے سے آفاق بہت مصروف ہو گیا تھا۔ صبح کو اسحاق کے ساتھ ہی دفتر چلا جاتا۔

دوپہر کا کھانا وہ لوگ دفتر میں منگوا لیتے۔ رات کا کھانا گھر پر کھاتے.....

اور کھانے کے بعد وہی کہانیاں، وہی فائلیں، وہی چٹھیاں اور بحث و مباحثہ۔

نہ وہ فلکی کو ان باتوں میں شامل کرتے.... نہ فلکی اپنی اہمیت جتاتی۔

وہ ایک بوجھل دل لئے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

نہ جانے رات کے کون سے پہر آفاق آ کر سو جاتا.... اور پھر صبح سویرے اٹھ کر چلا جاتا۔

فلکی ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

اس رات کے بعد، جب اس نے آفاق پر اپنی زندگی کے راز کھولے تھے، آفاق کا رویہ مبہم سا ہو گیا تھا۔ شاید اسحاق کے آجانے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ کاش اسحاق ایک ہفتہ بعد آتا۔ وہ اپنے دل میں سوچتی.... بھلا یہ کیوں آ گیا۔ اسحاق کے آجانے سے آفاق بہت مصروف ہو گیا تھا۔ چوبیس گھنٹے دونوں بھائی ساتھ رہتے۔ فلکی آفاق سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

آفاق کی بے توجہی صرف کاروباری مصروفیت تھی....

وہ ذہنی طور پر اس سے کچھ اور دور ہو گیا ہے۔

یہ سوچ سوچتے وہ گھبرا سی جاتی۔ دل چاہتا، دفتر فون کر کے آفاق کا حال معلوم کرے.... اس سے کھل کر باتیں کرے۔

کیا کہے....؟

یوں ہی ادھیڑبن میں بیٹھی تھی کہ آفاق کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اچھل پڑی۔ آفاق اور اس وقت۔ اس نے کلائی پر نظر ڈالی۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ آفاق تو کھانے کے وقت آیا کرتا تھا۔

آج جلدی کیسے آ گیا.... دل میں عجیب و غریب خیالات سر اٹھانے لگے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اندر آ گیا۔

اس کے ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل تھا۔

فلکی اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"فلک! یہ میں ڈرائی کلینر سے لے آیا ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو میرا سامان پیک کر دیں۔"

"جی.... " فلکی حیرت زدہ کھڑی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

وہ بڑھ کر ڈریسنگ روم میں گیا وہاں سے اپنا ایک ہوائی بکسا اٹھا لایا اسے میز پر رکھ کر کھولا.... پھر مڑ کر حیرت زدہ فلکی کی طرف دیکھا اور بولا

"میں نے کہا تھا.... آپ ذرا میرا سامان پیک کر دیں۔ کیا یہ اتنی اچنبھے کی بات تھی؟"

فلکی چونک گئی۔

بڑھ کر بکسے کے پاس آئی اور بولی

"آپ مجھے بتا دیں.... کیا کیا پیک کرنا ہے؟"

آفاق نے وارڈ روب سے اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں نکال نکال کر پلنگ پر رکھنا شروع کر دیں۔

"مگر.... آپ.... کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں ذرا امریکہ جا رہا ہوں۔"

"ذرا.... " فلکی تڑپتے تڑپتے بچی۔

آفاق نے نہیں دیکھا.... بولنے لگا۔

"میں نے اسحاق کو اسی لئے بلایا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے امریکہ جانا ہے وہاں والے دفتر کو بھی دیکھنا ہے۔ میری عدم موجودگی میں اسحاق یہاں دفتر کا کام سنبھالے گا۔ میں نے اس کو سب سمجھا دیا ہے۔"

فلکی کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ آفاق نے اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ پہلے سے اپنا پروگرام بتاتا۔

"آپ کتنے عرصے کے لئے جا رہے ہیں؟"

"یہی کوئی پانچ چھ مہینے کے لئے۔"

"پانچ چھ مہینے.... " فلکی کا دل جیسے رونے لگا۔ پانچ، چھ مہینے میں چاہے کوئی جان سے گزر جائے۔

"کب جا رہے ہیں؟"

"آج رات دس، نو بجے جہاز روانہ ہوتا ہے۔ میں گھر سے آٹھ بجے چلا جاؤں گا۔ آٹھ بجے تک آپ کھانا کھلا دیں گی؟"

"ضرور.... " فلکی نے مرتے ہوئے دل سے کہا۔

"اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ ابھی دفتر میں کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

آفاق اس کی زرد رنگت کی پرواہ کئے بغیر باہر چلا گیا۔

تقدیر کی گردش کیا کم تھی۔

فلکی نے سارا سامان پیک کر لیا۔ اس کی ضرورت کی اِک اِک چیز رکھ دی.... ....اور پھر صوفے پر جا کر بیٹھ گئی.... غالباً ریڈیو پر پرانے گیت بج رہے تھے۔

تقدیر کی گردش کیا کم تھی، اس پر یہ قیامت کر بیٹھے
بیتابیٔ دل جب حد سے بڑھی گھبرا کے محبت کر بیٹھے

محبت کرنے کو کس نے کہا تھا؟

کیا محبت کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی تھی؟

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔

وہ اس ستمگر کے بغیر اس گھر میں کیسے رہے گی؟

اور پھر جانے کب آئے گا....؟

آئے گا بھی یا نہیں....؟

اسے فلکی کی کیا پرواہ ہے.... اور وہ کس کے لئے جلدی آئے گا؟

اے کاش، وہ فلکی کو بھی ساتھ لے جاتا.... اے کاش....!

رات کا کھانا انہوں نے جلدی کھا لیا۔ فلکی کی آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آفاق نے اپنا سامان موٹر میں رکھوا دیا اور اس کے کمرے میں چلا آیا.... فلکی نے جلدی سے پوچھا

"آپ کس کام سے جا رہے ہیں؟"

"اوہ...." وہ ہنس کر بولا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا نا.... شاید مجھے آپ کا خط پڑھنے کے لئے امریکہ جانا پڑے۔"

فلکی نے اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے.... اس نے چاہا۔ وہ کچھ کہے۔ مگر اس کے دل نے ساتھ نہ دیا۔ کاش! وہ کہہ سکتی کہ بناوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔

"آپ مجھے چھوڑنے ایرپورٹ تک جائیں گی؟.... کیا مجھے خدا حافظ نہ کہیں گی؟"

(کیا تمہارے جانے کا منظر میں دیکھ سکوں گی؟)

"اگر آپ چاہتے ہیں تو چلی جاؤں گی۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ویسے آپ کا دل نہیں چاہتا...."

میرا دل کیا چاہتا ہے.... کاش آپ نے پوچھا ہوتا۔ اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔

"اچھا جلدی چلو۔ دیر نہ ہو جائے۔"

آفاق باہر چلا گیا۔

اپنے آنسو خشک کرتی فلکی باہر آئی اسحاق اسٹیرنگ پر بیٹھ چکا تھا

اس لئے فلکی کو پیچھے بیٹھنا پڑا۔ اس نے دیکھا دوسری طرف سے دروازہ کھول کر آفاق بھی پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا ہے۔

بالکل اس کے قریب۔ آفاق کی خوشبو نے اس کے دل میں ہلچل مچانی شروع کر دی۔

اس کا دل چاہا.... وہ اس خوشبو سے لپٹ لپٹ کر رو دے۔

آفاق کے زانو پر اپنا سر رکھ دے اور کہے۔

آفو ابھی نہ جاؤ.... نہ جاؤ.... اتنی دور نہ جاؤ۔ ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔ ابھی تو ان قدموں کو نہیں چھوا۔ محبت کا پہلا سجدہ بھی نہیں کیا اور تم جا رہے ہو.... جانے کب آؤ گے!

جانے میں اتنا طویل انتظار کر بھی سکوں گی یا نہیں۔

تمہارے ستم کے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔

اس تنہا گھر میں مجھے تمہاری جفائیں یاد آئیں گی.... تمہاری سرد مہری آٹھ آٹھ آنسو رلائے گی.... تمہاری بے پرواہیاں کچوکے لگائیں گی۔

نہ جاؤ.... یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔

جانے کب آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ اندھیرے کا فائدہ

اُٹھا کر فلکی نے جلدی سے وہ آنسو اپنی ہتھیلی میں چھپا لیا۔
وہ دونوں خالص کاروباری گفتگو کر رہے تھے۔
یہ کرنا ..... وہ نہ کرنا
فلاں فرم کو خط لکھوا دینا۔
فلاں آرڈر کو رکوا دینا۔
وہاں سے بل وصول کر لینا۔
اس طرح پےمنٹ کروانا وغیرہ وغیرہ۔
اچانک اسحاق بولا۔
"بھابی بڑی اُداس لگ رہی ہیں۔"
"کیوں فلک ....؟" آفاق نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔
"مجھے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے ابھی رو پڑیں گی .... کیوں بھابی؟" اسحاق نے شیشے میں نگاہ اس پر جما دی۔
فلکی تھر تھر کانپنے لگی۔
"ارے، اس موقع کے لئے بہت سے گیت گائے گئے ہیں۔ اگر زبان سے کچھ کہنا مشکل ہے تو گا کر بھیا پر اپنے جذبات کا اظہار کر دیں .... وہ کیا گانا ہے بھیا! اسحاق لے میں گاتا ہوا بولا۔
"تو جہاں کہیں بھی جائے میرا پیار یاد رکھنا"
فلکی کو ہنسی آ گئی۔ آفاق بھی ہنس پڑا۔
"فلک بہادر لڑکی ہے۔" آفاق نے جانے کس لہجے میں کہا۔ فلکی کو سمجھ نہیں آئی۔
"آپ کی ممی کب آ رہی ہیں فلک؟"
آفاق نے پوچھا۔
"دو مہینے کے بعد۔"
"میں ویسے ان سے ملوں گا وہاں۔"
آفاق نے پھر کہا۔
"کوئی پیغام دینا ہو تو بتائیں۔"
"آپ جو مناسب سمجھیں کہہ دیں۔"
"یعنی کہہ دوں کہ آپ کی بیٹی کے پاس آپ کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا۔"
"اگر یہ جواب آپ کو مناسب لگتا ہے تو یہی کہہ دیں۔"
"تو وہ مجھے بُرا بھلا کہیں گی۔"
"کیوں ....؟"
"وہ کہیں گی کہ تم نے ہم سے ہماری بیٹی چھین لی ہے۔" پھر وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔
فلکی کا دل چاہا، اسے کہے ... اور بھی کہو .... جو کہنا چاہتے ہو کہو .... مگر پھر خاموشی طاری ہو گئی۔
"میں آپ کے لئے کیا لاؤں وہاں سے؟"
"کیا کہوں ...؟" فلکی سوچ میں پڑ گئی اس کی طلب بے قیمت تھی ... مگر پھر بھی انمول تھی۔
"ممی نے بتایا تھا آپ کو چاکلیٹ بہت پسند ہے۔"
فلکی سوگواری سے ہنس پڑی۔
ممی تو ابھی تک اسے بچی سمجھتی ہیں .. مگر اس کے ارادوں کا مالک بھی اسے کم سن سمجھ رہا تھا۔
ایئرپورٹ آ گیا۔
روشنیاں ہی روشنیاں ہر سو بکھری ہوئی تھیں۔ مسافر، سامان .. عزیز و اقارب۔
ایئرپورٹ بھی اسے حشر کا میدان لگا۔
جیسے ہر کوئی اپنا اعمال نامہ اٹھائے کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہو۔
جانا ہے۔ - چلنا ہے ...
وقت ہوا جاتا ہے۔
جلدی کرو ... جلدی کرو ...
یہی زندگی ہے۔ اس نے سوچا ...
کسی کو لانے کی جلدی ... کسی کو جانے کی جلدی ...
کسی کے آنے کی خوشی ... کسی کے جانے کا ملال۔
کوئی پھول پہن رہا ہے .... کوئی آنسو بہا رہا ہے۔
دنیا ایک پگڈنڈی ہی تو ہے۔
جسے آنے والے مسلسل پامال کئے جا رہے ہیں۔
آفاق اپنا سامان چیک اِن کرا کے آ گیا تھا۔
مسافر اندر جانا شروع ہو گئے تھے۔
"اوکے!" اس نے ایک دم اپنا گھڑی والا ہاتھ خالی کر کے فلکی کی طرف بڑھایا۔
اس خوبصورت صحت مند ہاتھ کو فلکی اس طرح دیکھنے لگی .. جیسے اس نے چاند کو قریب سے دیکھ لیا ہو۔
یہ ہاتھ میری امانت ہیں ——
یہ ہاتھ میرے ہیں ——
اس گوشت پوست میں میرا دل دھڑکتا ہے ——
اس نے آہستہ سے اپنا زرد اور ٹھنڈا ہاتھ آگے کر دیا۔
آفاق کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی .... جیسے بچے نے کھیلتے کھیلتے شیشے کی گولی ڈھونڈ لی ہو اور گر جانے کے خوف سے اسے مٹھی میں چھپا لیا ہو۔
آفاق کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر حاوی ہو چکا تھا۔
لمحے جاوداں ہو گئے تھے۔
سارا ایئرپورٹ بقعۂ نور بن گیا تھا۔
اور بس ... فلکی اور آفاق وہاں کھڑے رہ گئے۔
"میں جلدی آ جاؤں گا گھبرائیے گا نہیں ... اسحاق آپ کو اچھی کمپنی دے گا۔"
آفاق نے اسحاق کی طرف دیکھا۔
"اس میں کیا شک ہے۔" اسحاق نے شوخی سے سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔
آفاق نے ہاتھ چھڑا لیا۔
فلکی کا ہاتھ وہیں معلق رہ گیا۔
تھوڑی دیر پہلے اس کا ہاتھ کتنا وزنی تھا۔
اور اب کتنا ہلکا اور بے مول لگ رہا تھا۔
"خدا حافظ!"
آفاق مڑنے لگا۔
"بھیا!" اسحاق ادھر کو لپکا۔
"میرے ساتھ آپ ایکٹنگ کر گئے .. ہاتھ کیوں نہیں ملایا؟"
آفاق ہنسا "اب یہ ہاتھ نہیں۔"
اس نے سیدھے ہاتھ میں ٹکٹ پکڑ لئے اور اُلٹا ہاتھ اسحاق کی طرف بڑھایا۔
"یہ بات ہے۔" اسحاق ایک آنکھ بند کر کے ہنسا۔ پھر آفاق کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں چلنے لگے۔
آفاق نے جاتے جاتے پھر ایک نگاہ فلکی پر ڈالی۔
وہ نگاہ اتنی بھرپور تھی کہ فلکی بُت بن گئی۔ جیسے اس پر مسمریزم کر دیا گیا ہو۔
"اچھا خدا حافظ ...!"
"خدا حافظ۔" فلکی نے زیرِ لب کہا جسے اس کے کانوں نے بھی نہیں سُنا۔
اسحاق اس کا ہوائی بیگ پکڑ کر دروازے تک گیا۔
اور فلکی کھڑی سوچتی رہ گئی ... ؎
تیرے آنے کا تصور، تیرے جانے کا خیال
اِک تصویرِ مسرت اِک تصویرِ ملال

راتیں اور دن بستر کے ہو گئے۔
اس کے دن، رات ہجرت میں بدلے تھے .. شادی کے بعد سے یہی کچھ ہو رہا تھا پہلے ان دونوں میں دُوریاں تھیں۔ پھر آفاق قریب رہتے ہوئے بھی دُور تھا .. اور اب۔
اب وہ ظالم ہزاروں میل دُور بیٹھا ہوا بھی قریب تھا ... رگِ جاں سے بھی قریب اس کی مہک فلکی نے سانسوں میں بسا لی تھی۔
اس کی تصویر اپنے کمرے میں رکھ لی تھی۔
آنکھیں بند کر کے تصور میں بے شمار باتیں کرتی تھی۔
گلے شکوے کرتی تھی۔
مگر ... مگر اسے پیار کرنے کی ہمت تصور میں بھی نہ ہوتی تھی۔
آفاق کو گئے ہوئے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ دفتر میں اس کی ٹیلیکس آ گئی تھی ....
اور اسحاق نے فلکی کو اس کی خیریت سے آگاہ کر دیا تھا۔
فلکی کو اس کے خط کا انتظار تھا مگر جب دفتر میں اطلاع کا اچھا انتظام تھا تو بھلا وہ خط لکھنے میں وقت کیوں ضائع کرتا۔
دن گزرنے میں نہ آتا۔
رات کاٹے نہ کٹتی۔
ایک دن فلکی علی الصباح چہل قدمی کرتی چوکی کوارٹروں کی طرف نکل گئی۔
ایک عورت کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔
باہر چوکیدار بیٹھا مسواک کر رہا تھا۔
فلکی کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"سلام، سر ....!" اس نے سلیوٹ مارا۔
"یہ بچہ کیوں رو رہا ہے، چوکیدار؟"
فلکی نے پوچھا۔
"بیگم صاب جی! یہ آوارہ بچہ ہے۔"
"مگر روتا کیوں ہے؟"
"ہر روز روتا ہے۔" اس وقت چوکیدار نے ہنس کر کہا۔
"مگر کیوں ...؟ اس کی ماں کیوں چلاتی ہے؟"
"بیگم صاب جی! آماں جی روز صبح کو اس کو قرآن پاک پڑھاتا ہے۔ مگر جب یہ ضد کرے تو مار بھی کھاتا ہے۔ بیگم صاب! اس کا ضد تو نہیں دیکھنا۔ آگے جا کر اللہ کو جواب بھی تو دینا ہے۔"
فلکی آگے بڑھ گئی۔
"تمہاری بیوی قرآن شریف پڑھی ہوئی ہے؟"
"اللہ کا فضل ہے ....." پٹھان چوکیدار نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
اس کی بیوی نے فلکی کو دیکھا تو ایک دم کھڑی ہو گئی ... اور سلام کیا۔
"بیٹھو .... بیٹھو۔" فلکی نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔
"جب کلام پاک سامنے رکھا ہو تو کسی کے لئے نہیں کھڑے ہوتے۔ یہ تو دونوں جہانوں کا بادشاہ ہے۔"
یہ کہہ کر فلکی خود اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔
ایک، چار پانچ سال کا صاف ستھرا بچہ زاروقطار رو رہا تھا اور ہل ہل کر پڑھ رہا تھا۔
"وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ..."
فلکی نے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا ..... اور سنتی رہی۔ بچے کا لب و لہجہ اسے بہت پیارا لگا۔
پھر اس کی ماں سے بولی۔
"تمہارا نام کیا ہے؟"
"جی، آماں نام گل چہرہ ہے۔"
"بڑا اچھا نام ہے ... گل چہرہ! کیا تم مجھے بھی قرآن شریف پڑھا دو گی؟"

"جی آپ کو... ؟" اس نے اس طرح چونک کر پوچھا جیسے کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔
"ہاں، ہاں، مجھے!"
"بیگم صاحب! مذاق کرتی ہو... سب مسلمان کا بچہ کلام پاک پڑھا ہوتا ہے۔"
"نہیں گل چہرہ! میں نے نہیں پڑھا اگر میری اماں تمہاری طرح مجھے بھی بچپن میں مار مار کر پڑھاتیں تو میں ضرور پڑھ لیتی... لیکن خیر! اب بھی وقت ہے جب خیال آئے پڑھ لینا چاہئے۔ ٹھیک ہے نا؟"
گل چہرہ نے سر جھکا لیا۔
"تم مجھے پڑھاؤ گی یا نہیں؟"
گل چہرہ نے بے یقینی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔
"ضرور پڑھائے گا بیگم صاحب! یہ تو نوکر ہے آپ کا!"
"اچھا گل چہرہ! تم کب فارغ ہوتی ہو؟"
"یہ تو جی، سارا دن فارغ ہوتی ہے۔"
"نہیں" فلکی نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے بچوں والی ماں کو بہت کام ہوتا ہے۔ اچھا ایسا کرو، دن کے گیارہ بجے تم آ سکتی ہو؟"
"ہاں بیگم صاحب! آغا ناشتہ کر کے ڈیوٹی پر چلا جاتا ہے... تو پھر آ جائے گا"
"اچھا یوں کرتے ہیں۔ دس گیارہ بجے کے درمیان جب میں فارغ ہوں گی، تمہیں بلا بھیجوں گی۔ ٹھیک ہے؟"
"بالکل ٹھیک ہے، بیگم صاحب!"
گل چہرہ نے کہا۔
فلکی اٹھ کر کھڑی ہو گئی
راستہ بھر وہ سوچتی... آفاق کے پیچھے وہ قرآن پڑھے گی... اور پھر اسحاق بھی روزانہ آٹھ بجے دفتر چلا جاتا تھا۔ گھر پر کوئی نہ ہو گا۔
اور وہ اپنی ایک دیرینہ خواہش پوری کر سکے گی۔
اچھا ہوا گھر ہی میں ایک پڑھانے والی مل گئی

اسحاق نے لات مار کر اس کے بیڈروم کا دروازہ کھول دیا۔ فلکی لیٹی پڑھ رہی تھی... ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی۔
پل بھر میں اسحاق اس کے سرہانے پہنچ چکا تھا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے بھابی! تم سرِشام ہی دروازہ بند کر کے سو جاتی ہو۔ مجھے اس اتنے بڑے گھر سے وحشت ہوتی ہے۔"
"تو میں کیا کروں..." فلکی نے ناگواری سے کہا۔
"بھئی! ذرا باہر نکل کر بیٹھو، گپ لگاتیں، میوزک سنیں، ناچیں کودیں..."
فلکی کو اس کا اپنے سر پر کھڑے رہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جلدی سے دوپٹہ اٹھایا اور باہر کو چل دی۔
لاؤنج میں جا کر وہ رک گئی۔
ابھی رات کے نو بجے تھے۔ ٹی وی پروگرام چل رہے تھے۔ سردیوں کی رات جلدی سیاہ اور سنسان ہو جاتی ہے۔ ملازم کھانا کھا کر جا چکے تھے اور فلکی کا دل خواہ مخواہ ڈوبنے لگا تھا۔
اسحاق جب سے آیا تھا اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو اسے رشتے کا احترام ملحوظ تھا... مگر فلکی کو اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی بالکل پسند نہ تھی۔
پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔
وہ بچپن سے ایسے لڑکوں میں رہی تھی اور شرمانے والی لڑکیوں کو احساسِ کمتری کی ماری ہوئی بعض لڑکیاں کہتی تھیں
اب حیا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔
اسحاق نے ٹی وی بند کر دیا اور کیسٹ ریکارڈر پر ایک انگریزی دھن لگا دی۔ فلکی ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔
دھن ایسی ہیجان انگیز تھی کہ اسحاق آپ ہی آپ تھرکنے لگا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے فلکی کی کمر میں بازو ڈال دیا
"چلو، بھابی! رقص کرتے ہیں۔"
فلکی نے اس طرح اپنے آپ کو چھڑوایا جیسے کسی اچھوت کا ہاتھ لگ گیا ہو۔
"نہیں، اسحاق!" وہ ناراضگی سے بولی
"مجھے ڈانس نہیں آتا۔"
"بھیا تو کہتے تھے کہ تم ہر قسم کے رقص کی ماہر ہو۔"
"وہ بہت پرانی بات تھی۔"
"کتنی پرانی...؟"
"بچپن کی۔"
"ہاں تو ایک سال میں ہی تمہارا بچپن بیت گیا۔"
"بچپن کا کیا ہے۔ وہ تو ایک دن میں بھی بیت سکتا ہے۔"
"اچھا، سچ سچ بتاؤ بھابی! تم اتنی سنجیدہ کیوں رہتی ہو؟"
"نہیں تو... میری صورت ہی ایسی ہے۔"
اسحاق قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"یہ چاند سی صورت بغیر وجہ کے اتنی سنجیدہ نہیں ہو سکتی۔ کہیں بھیا تو سختی نہیں کرتے تم پر؟"
"نہیں، آفاق تو آئیڈیل شوہر ہیں۔"
"ہاں... ہاں، جب لڑکیاں دل کی بات چھپانا چاہتی ہیں تو ہمیشہ لفظ "آئیڈیل" کا سہارا لیتی ہیں۔ میں جانتا ہوں دنیا میں کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا۔"
"میں بھی جانتی ہوں کہ آئیڈیل ہوتے نہیں بنائے جاتے ہیں، ڈھالے جاتے ہیں۔"
"تو گویا تم نے بھیا کو ڈھال لیا ہے؟"
"نہیں، میں ڈھل گئی ہوں۔"
"ہائے قربان جاؤں!" اسحاق نے ایک سیٹی بجائی۔
"کاش، ہمیں بھی کوئی ایسی لڑکی مل جائے!"
"ہر لڑکی جو اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے ایسی ہو سکتی ہے!"
"بھابی! آج کل کی لڑکیاں بڑی خبیث ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی ایک آدھ بوائے فرینڈ رکھ چھوڑتی ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔"
"یہ بوقتِ ضرورت کیا ہوتا ہے؟"
فلکی ہنس پڑی۔
"بھئی، ایک سے چھٹکارا حاصل کر کے دوسرا..."
"توبہ... توبہ..." فلکی لرز گئی پھر بالکل اچانک اسے روبی کا خیال آ گیا۔
اس نے روبی کو اسی طرح استعمال کرنا چاہا تھا۔
لیکن اب.....
اب تو وہ آفاق پر ایک سو زندگیاں بھی قربان کر سکتی تھی۔
"میں سونے والی ہوں، اسحاق! جاؤ، سو جاؤ... تم نے صبح دفتر بھی جانا ہے۔"
"میں اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں ہوں۔"
"تو پھر تمہارا کوئی انتظام کیا جائے۔"
"ہاں، ہاں، بھابی! گھر میں ذرا رونق لگاؤ... پلہ گلہ کرو، اپنی سہیلیوں کو اپنی کزنوں کو بلایا کرو نا۔ آخر تمہارا بھی تو حلقۂ احباب ہو گا۔"
"پاگل..." فلکی کھڑی ہو گئی
"میں تو تمہاری شادی کی بات کر رہی تھی شادی کر لو۔ ساری بوریت دور ہو جائے گی۔"
"کیا شادی سے واقعی بوریت دور ہو جائے گی۔"
"ہاں، بھئی! رات کو جو یوں بولائے بولائے پھرتے ہو۔"
"اچھا جی... تو ایک رات کے لئے اپنا سالم دن تباہ کر دوں۔"
فلکی ہنسنے لگی۔
"اچھا بھابی! تم میری شادی کرا ہی دو ہے کوئی لڑکی نظر میں؟"
"یہ تو میں تم سے پوچھنے والی تھی... دل میں کوئی ہو تو بتاؤ۔"
"بھئی، نہ کوئی دل میں ہے، نہ نظر میں۔"
"امریکہ میں تو ویسے بھی..." اس نے ایک آنکھ بند کر کے کہا۔ "لمحوں کا سودا ہوتا ہے لیکن میرے دل میں تو جیسے ہے جو لڑکی دل میں رکھتا ہوں گر جاتی ہے۔"
فلکی ہنستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف لپکی۔
اسحاق، اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔
پھر اس کے منہ کے بالکل قریب چہرہ کرتا ہوا بولا۔
"صورت ایسی ہو جیسی تمہاری ہے — تو میں حاضر ہوں۔"
"بیہودہ۔"
فلکی دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی — اور اندر سے چٹخنی لگا لی۔ کافی دیر تک اسے اسحاق کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

"**بھابی** او بھابی!"
اسحاق چیختا ہوا سیدھا باورچی خانے میں آ گیا اور اس کی پتلی سی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ فلکی چونک کر یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈس لیا۔ چھری اس کے ہاتھ سے گر گیا
"کیوں چلا رہے ہو؟"
اس نے ناگواری سے کہا۔
"تو گانا گا کر بلایا کروں۔"
"افسوس تمہاری آواز بھی بھونڈی ہے اگر کوشش کرو تو محلے کے گدھے بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔"
"اچھا!" اسحاق نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "تو کیا اس محلے میں گدھے بھی رہتے ہیں؟"
فلکی جھلا کر چپ ہو گئی۔ ہنڈیا جلنے لگی تھی۔ جلدی سے اس کے قریب جا کر اس میں چمچہ ہلانے لگی۔
"آج کا کیا پروگرام ہے بھابی!" اسحاق نے چھری اٹھالی اور آلو کاٹنے لگا۔
"کیٹے ہوئے آلو خراب نہ کرو۔" فلکی نے اس کے ہاتھ سے چھری لے لی۔ "جو کام نہ آتا ہو وہ نہیں کرنا چاہئے۔"
"مجھے دنیا کا ہر کام آتا ہے بھابی!"
"ہاں دنیا میں ہر کام مردوں کے کرنے کے نہیں ہوتے۔ کچھ کام خالصتاً عورتوں کے ہوتے ہیں۔"
"مثلاً؟"
"مثلاً کھانا پکانا، بچے... بچوں... بچوں کو پالنا..."
"جہاں تک کھانا پکانے کا تعلق ہے تو میں تم سے اچھا پکا سکتا ہوں، پوچھو تو میری امی سے..."
"ہاں مجھے معلوم ہے" فلکی ایک دم بولنے لگی اور پھر رک گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ آفاق سب کچھ جانتا ہے مگر اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس نے کیسے جانا۔
"ہم دونوں بھائی امورِ خانہ داری میں ماہر ہیں بھابی۔" اس نے اس طرح کہا کہ فلکی کو ہنسی آ گئی۔ "اصل میں ہمارے آبا جی بہت سخت تھے۔ بچپن میں ہی انہوں نے ہمیں گھر سے نکال

دیا تھا۔ اپنے سے دور رکھ کے پڑھایا اور پھر امریکہ میں رہ کر تو ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا تھا۔ تمہیں بھیا نے بتلایا نہیں؟"

"بتایا ہوگا" فلکی نے بے نیازی سے کہا "مجھے اب یاد نہیں۔"

"وہاں جب تم جیسی خدمت گزار اور وفا شعار بیوی مل گئی ہوگی تو بھیا نے جان کو جیب کر سب بتایا۔"

فلکی خاموش رہی۔

"اور وہ دوسری بات جو آپ کہہ رہی تھیں۔"

"کون سی؟"

"وہ نیچے ۔ پالنا وغیرہ ۔ وہ کام ابھی تم نے کر کے تو نہیں دکھایا۔ کیسے مان لیں"

"اسحاق میں تمہارے منہ پر گرم گرم چمچ دے ماروں گی اب تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔"

"بھئی یہ کس کا غصہ نکل رہا ہے؟"

"بس اب خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ"

"چلا جاتا ہوں، مگر پہلے آج کا پروگرام تو بتا دو۔"

"بس وہی جو روز ہوتا ہے۔"

"یعنی کھانا پینا اور سو جانا"

"ہاں ۔ ہاں" فلکی بے زاری سے بولی

"اس قوم کا کیا بنے گا بھابی، جسے صرف کھانے پینے اور سونے سے ہی فرصت نہ ہو۔" پھر وہ بھونڈی آواز بنا کے گانے لگا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

"یہ بیکار قوم کا درد کیوں جاگنے لگا ہے دل میں؟"

"خدا کی قسم بھابی، جب بھی میں یہاں آتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، یہاں زندگی ٹھہر گئی ہے۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا ہے اور لوگ اتنے سست رفتار ہیں کہ اپنی زندگی ضائع کر رہے ہیں"

"ہر آدمی جو امریکہ میں رہ کر آتا ہے اسے ایسا ہی لگتا ہے۔"

"لگتا نہیں ۔ ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تمہیں معلوم ہے کہ لوگ گھڑی کی سوئیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ایک لمحہ بھی کوئی ضائع نہیں کرتا۔ کام ۔ کام ... اور کام۔ یہاں کے لوگ کام کیوں نہیں کرتے۔ دکانوں پر جاؤ تو بیٹھے گپ لگا رہے ہیں۔ دفتر جاتے جاتے راستے میں کوئی مل جائے تو قصے شروع کر دیتے ہیں۔ سڑک پر کوئی حادثہ ہو جائے تو چاروں طرف سے لوگ چیونٹیوں کی مانند نکل آتے ہیں۔ حادثہ کو سانحہ بنا دیتے ہیں۔ پولیس کار زخمی کو اپنی تحویل میں لے کر چل بھی جاتی ہے مگر لوگ تبصرہ کرنے کو وہاں یوں رہ جاتے ہیں جیسے گڑ کے ڈھیر پر مکھیاں۔ ان کو یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ اپنی بیار بیوی کے لئے دوا لینے چلے تھے۔ بچے کو اسکول سے لینا تھا، مالک کا کھانا پہنچانا تھا اور بیوی انتظار کر رہی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ یہاں کے لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لئے بہت وقت ہے اس طرح ہم کب زمانے کی دوڑ میں شامل ہو سکیں گے"

"وہاں صرف پیسے کے لئے کام کرتے ہیں" فلکی بولی "مجھے معلوم ہے امریکن ایک ایک ڈالر کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ یہ سارا ڈالر کا چکر ہے جو انہیں سرگرم رکھے ہے اور پھر جو لوگ ہماری طرح مفلس ملکوں سے وہاں جاتے ہیں وہ بھی ڈالر کی اس دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ بلی چوہے کی دوڑ بھی جاری رہتی ہے۔ وہاں تو پیسہ کمانے کی ایک ریس لگی ہوئی ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"لیکن وہ لوگ جس محنت اور دیانت سے کماتے ہیں۔ اتنی ہی فراخ دلی سے لٹاتے بھی ہیں۔ عیش بھی کرتے ہیں۔ زندگی اچھی طرح بسر کرتے ہیں۔"

"یہاں جب محنت کا پورا پورا صلہ مل رہا ہو اور ہر ہفتے ایک خطیر رقم ہاتھ آ جائے تو ہر آدمی کو زندگی گزارنے کا ڈھنگ آ جاتا ہے اسی لئے تو ہمارے ہاں کے لوگ وہاں جا کر واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔"

"کیا کریں یہاں آ کر نہ ڈھب کا کام نہ اتنا پیسہ۔"

"ہاں، مگر اپنے ملک میں اپنی شناخت تو ہوتی ہے نا۔ ڈالر کی دنیا میں وہ اپنی شناخت کھو بیٹھے ہیں۔"

"شناخت کس کام کی بھابی، زندگی تو آرام سے گزر جاتی ہے۔"

"تو تمہیں کس نے کہا ہے کہ اس رینگتے سسکتے ہوئے ملک میں آ جاؤ۔ تمہارے بغیر بھی یہاں سب امن ہی تھا"

"اُفوہ! بھابی تم تو جذباتی ہو جاتی ہو میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری جیسی لڑکی اتنی حب الوطن بھی ہو سکتی ہے۔"

"کیوں؟ میرے جیسی لڑکی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"بھئی سب ماڈرن لڑکیاں تو امریکہ میں رہنے کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔"

"معاف کرنا میں ماڈرن لڑکی نہیں ہوں" اپنے ان الفاظ پر فلکی کو تعجب ہوا۔

"تو کیا ہو تم، ہمیں بھی بتا دو" اسحاق نے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا

"میں ایک مسلمان لڑکی ہوں اور ایک شریف آدمی کی بیوی ہوں۔"

اسحاق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"قائل ہونا ہی پڑے گا، واقعی"

"لیکن وہ بھیا بھی جو امریکہ گئے ہوئے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ لوٹ کر آئیں گے۔"

"فرض کرو اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو...؟"

"وہ نہ آئے تو..." ٹماٹر کاٹتے ہوئے چھری فلکی کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں بھی یہ وہم آتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ لرز جاتی تھی کہ اگر آفاق اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تو... وہ ظالم پلٹ کر نہ آیا تو ۔ فلکی کا دل ایک دم ڈوبنے لگا۔

"فرض کرو بھابی! بھیا وہیں اپنی دنیا بسا لیں تو..." اسحاق نے پھر ایک کچوکا لگایا "تو کیا ہوگا تم ان کے پیچھے امریکہ نہ جاؤ گی؟"

"میں فرض نہیں کیا کرتی" فلکی نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ تم ایک بزدل لڑکی ہو۔ کمزور ہو۔ آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہو۔"

فلکی کا دل چاہا وہ اسحاق کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ دے اور پوچھے کہ صاف صاف بتاؤ تم دونوں بھائی مل کر کیا سازش کر رہے ہو۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو پی کر کہا "میں زندگی کے حقائق کا سامنا کرتی ہوں۔"

"تبھی بھیا کے ذکر پر تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اتنی سی بات پر نازک دل کو ٹھیس لگ گئی ہے اور اب ان آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو"

"اسحاق اب دفعان ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں مار بیٹھوں گی" فلکی نے کف گیر اُٹھا لیا۔

"بھابی زبان میں اسے کہتے ہیں گدھے کو مقدمہ کہنا ہے۔"

مگر وہ ڈر کے مارے دور جا کھڑا ہوا فلکی ابھی تک اسے غصے سے گھور رہی تھی۔ اُلٹے قدموں دور ہوتا گیا اور ہنس کر بولا۔

"گھبراؤ نہیں۔ اگر بھیا نہ آئے تو... میں جو ہوں یہاں۔ تمہاری خاطر پاکستان میں ٹک جاؤں گا۔"

فلکی کے چہرے پر ناگواری اور غیظ و غضب کی کیفیت نمودار ہوتے دیکھ کر بولا۔

"کچھ ایسا بُرا بھی نہیں ہوں میں بلکہ بھیا سے زیادہ زندہ دل ہوں۔"

جب فلکی اسے مارنے کو دوڑی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور جب موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی آواز آئی تو فلکی کی جان میں جان آئی۔ مگر کم بخت جاتے جاتے اسے سوچوں کے کرب ناک دور اہے پر چھوڑ گیا تھا۔

بارہ بجے فارغ ہو کر فلکی سامنے برآمدے کے بڑے بڑے سیمنٹ کے گملوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دھوپ اور سائے کا حسین امتزاج تھا۔ وہاں پودوں اور پھولوں سے چھن چھن کر گرم گرم دھوپ اس کے ٹھنڈے پاؤں چھو رہی تھی۔ دھوپ کا ہولے ہولے قدم بوسی کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اچھا تو اسے سیڑھیوں پر بیٹھنا بھی لگتا تھا۔ اپنے گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی جما کے وہ سوچوں میں غرق ہو گئی۔ اس ظالم نے عرش اور فرش کی تیز رفتاری سے اس کی ہستی کو خاک کر دیا تھا۔ اسی لئے تو جہاں ان میں آتا، وہیں بیٹھ جاتی۔

ہوا چلتی تو پودے ہلنے لگتے اور ان کا سایہ دھوپ میں سے چھن چھن کر سامنے دیوار پر پڑتا۔ ان پرچھائیوں کے سوا فلکی کے پاس تھا ہی کیا۔ یہی پرچھائیاں اس کی مونس و غم خوار تھیں اور یہی پرچھائیاں رازدار تھیں۔ کسی سے وہ کہہ بھی تو کیا کہے۔ آخر کہنے کو ہے کیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگی۔

یہ اداسی یہ پھیلتے سائے
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے

اسی وقت گھنٹی بجی اور ڈاکیہ اپنی سائیکل پر سوار گیٹ کے اندر نمودار ہوا۔ فلکی کا دل دھڑک کر حلق تک آ گیا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ شاید اسے بھی ڈاکیے کا انتظار تھا۔ اسے معلوم تھا روزانہ اسی وقت ڈاک آتی ہے۔ روزانہ ہی وہ سارا کام کر کے اس وقت یہاں سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک انجانا سا انتظار رہتا تھا۔ کبھی گھنٹی سنائی دیتی کبھی نہیں۔ کبھی کوئی خط آ جاتا کبھی صرف آہٹیں ہوتیں۔ کیا اسے کسی خط کا انتظار تھا۔

خط کا انتظار کیا ہوتا ہے؟ اس درد سے تو وہ آشنا ہی نہ تھی پھر کون ہے بھری دنیا میں اسے خط لکھے۔ ہاں اب کبھی کبھار ممی اور ڈیڈی کا مشترکہ خط آ جاتا تھا۔ ممی کے خط میں ہی ڈیڈی چند لائنیں لکھ دیتے تھے اور بس...

ڈاکیے نے ایک نیلے رنگ کا ہوائی لفافہ تھیلے میں سے نکالا تو فلکی کا سارا خون چہرے پر آ گیا۔ دوڑ کر گئی اور جھپٹ کر خط ڈاکیے کے ہاتھ سے لے لیا۔ ڈاکیہ بھی اس کی اس بے تابی پر حیران و ششدر اسے دیکھتا ہوا مڑ گیا۔

"بیگم صاحبہ نے آج بالکل بچوں والی حرکت کی تھی۔"

فلکی نے اُلٹ پلٹ کر لفافہ دیکھا... پھر دیکھا... پھر دیکھا اور مایوسی سے آ کر بیٹھ گئی۔

یہ ممی کا خط تھا۔

لیکن کاش یہ ممی کا خط نہ ہوتا۔ یہ وہ خط ہوتا جس کا اسے انتظار تھا۔ پل پل گھڑی گھڑی

افسوس جس خط کا انتظار تھا وہ خط جانے کہاں کھو گیا تھا۔

دل میں درد سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں گرم گرم سا پانی جمع ہونے لگا۔ فلکی کے سامنے ہر چیز پر مایوسی سی چھا گئی۔

وہ پھر دھوپ اور سائے میں بیٹھ گئی ایک ٹھنڈی سانس کھینچی تو ہوا کے ساتھ ساتھ لرزنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں —

یہ اداس یہ پھیلتے سائے!
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے
ہم جو آئے تو رہگزر نہ ملی
وہ جو آئے تو منزلیں لائے

پتہ نہیں اس کی منزل کہاں تھی؟ سر راہ بیٹھی تھی۔ نہ آگے کوئی نشان تھا نہ پیچھے کوئی راستہ۔ کسی راستے پر خود اس کے قدموں کے نشان بھی نہیں بنتے تھے۔

اللہ کرے کوئی کتا پتا کوئی پیماسا زبھی نہ ہو۔

اور آفاق اسے کیوں خط لکھتا۔ کیا اس نے وعدہ کیا ہے۔ کیا اس کا رویہ ایسا عاشقانہ تھا اس نے تنہا لکے وقت مشورہ بھی نہ کیا۔ پتہ نہیں کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا! خدا جانے اپنی کسی محبوبہ کو ملنے چلا گیا ہو۔

آخر مرد جو ہے۔

یہ سوچ کر فلکی کے دل میں آہ اٹھی۔

اور بالکل اچانک اسے ڈوری کا خیال آگیا۔ پتہ نہیں کون تھی وہ۔ مگر وہ بھی تو امریکہ میں رہتی ہے ہو سکتا ہے آفاق اس کے لئے امریکہ گیا ہو۔

یہ سوچ کر اسے غصہ آگیا۔ وہ خواہ مخواہ ایک ہرجائی مرد کے لئے ہلکان ہو رہی تھی۔

جلدی سے مٹھی میں پکڑا ہوا خط اس نے آنکھوں کے آگے کر لیا۔ بالوں میں سے ایک پن اتاری اور لفافے کو بڑے سلیقے سے کھولنے لگی۔

ممی کا محبت بھرا خط تھا۔

ممی نے لکھا تھا یہ ان کا آخری خط ہے اور یہ خط پہنچنے تک وہ پاکستان پہنچ جائیں گی۔

پہلے جب ممی کی اطلاع آتی تھی تو وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ کئی دن پہلے تیاریاں شروع کر دیتی تھی۔ جشن مناتی تھی۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی تھی کہ ممی اس کے لئے ملک ملک کی ڈھیر ساری چیزیں لائیں گی جنہیں وہ اترا اترا کر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کو دکھائے گی۔ ممی اس کے خاص خاص دوستوں کے لئے بھی تحفے لایا کرتی تھیں۔ اس لئے اس کے سارے احباب ممی کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔

مگر اب سنہرے جھولے پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ممی اتنی جلدی کیوں آ رہی ہیں بھلا؟

اگر کچھ دن اور رک جاتیں تو کیا تھا یہاں آکر مجھے کس قدر بور کریں گی۔ میری یہ مووّت گوشہ چھن جائے گی۔ میرے انتظار میں خلل ہوں گی

میں جو جنم جنم کا جوگ لئے بیٹھی ہوں۔ ننگے پاؤں تپتا کے جنگل میں۔ آس و نراش کا چیتا بجھاتی چلی جا رہی ہوں۔ کہیں وہ مجھ سے آگہی کا یہ چیتا چھین نہ لیں۔ میری آبلہ پائی کا مذاق نہ اڑائیں۔ میرے جوگ کو بے وقوفی نہ کہیں۔ میرے سنسان بے رنگ صبح و شام میں دخل اندازی نہ کریں۔

کاش یہ صبحیں اور یہ شامیں یوں ہی رہیں۔

میں یوں ہی سلگتی رہوں۔

چپ چاپ...

خاموش...

بھابی او بھابی فلک ناز!" اسحاق نے شور مچایا "کہاں ہو بھئی۔ تیار ہوئی نہیں؟"

کوئی آواز نہیں آئی تو فلکی کے کمرے میں چلا گیا۔ قالین پر سبز جائے نماز بچھائے فلکی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

"اف خدایا۔ اف خدایا۔ میری آنکھیں یہ سب دیکھ رہی ہیں۔ مگر مجھے پھر بھی یقین نہیں آ رہا۔ آخر کیسے یقین کر لوں یعنی....

یعنی یہ فی مجھ باقاعدہ نماز پڑھ رہی ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا کبھی کمرے کے اندر جاتا اور کبھی کمرے کے باہر۔

اتنے میں فلکی نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے

"آمین... آمین..." وہ شیشے کے آگے کھڑا ہو کر اس کا اسپرے اپنے کپڑوں پر چھڑکنے لگا۔

فلکی نے نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز کو تہہ کیا اور اسٹول پر رکھ دیا۔

"تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ تم بغیر اجازت میرے کمرے میں نہ آیا کرو اسحاق۔" فلکی نے ناگواری سے کہا۔

"واہ" وہ مڑ گیا "ذرا اپنی شکل تو دیکھو کیسی خوفناک بنالی ہے۔ کیا میں تمہارے کمرے میں دستک دے کر آیا کروں۔ میں کوئی بدذات آدمی ہوں۔ تمہارا دیور ہوں جب چاہوں گا آؤں گا، جاؤں گا۔ بھیا مجھے سب اختیارات دے کر گئے ہیں!"

"میں نہیں جانتی۔" فلکی اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "تم وقت بے وقت مجھے ڈسٹرب کرتے ہو۔ اب میں نماز پڑھ رہی تھی اور تم مسلسل بک رہے تھے۔ یہ کیا طریقہ ہے؟"

"شاید تم نئی نئی مسلمان ہوئی ہو۔ ورنہ میں نے دیکھا ہے۔ ڈھول بجتے رہتے ہیں

ریڈیو چنگھاڑتے رہتے ہیں اور لوگ نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں دو کام کرتے ہیں۔ گانا بھی سنتے ہیں اور اللہ میاں کو بھی خوش کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔" فلکی نے ناگواری سے کہا "مجھے سکون کے ساتھ نماز پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ تم نے ٹھیک سے دعا بھی نہیں مانگنے دی۔"

"آخر تم دعا میں کیا مانگنا چاہتی تھیں؟" اسحاق بالکل اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ "اب کیا رہ گیا ہے جس کی تمہیں تمنا ہے؟"

"ضروری نہیں کہ آدمی ہمیشہ دنیاوی چیزوں کی خواہش کرے"

"مرحبا، سبحان اللہ" اسحاق نے مصنوعی انداز میں جھوم کر کہا "تو گویا تم دنیا سے ماورا ہو چکی ہو۔ یہ منزلیں کہاں طے کیں۔ کب طے کیں؟"

"جاؤ اسحاق، مجھے تنگ نہ کرو۔"

"سیدھے سیدھے کہو تم بھیا کے لئے اداس ہو گئی ہو اور اب ان کی واپسی کی دعائیں مانگ رہی ہو۔"

"میں ایسی دعائیں نہیں مانگا کرتی۔"

"تو کیا چاند سا منّا مانگنے کے لئے دعا کر رہی تھیں۔"

"چاند سا منّا" فلکی کو ہنسی آ گئی۔ اس کے آنگن میں چاند ہی نہ اترا تھا تو منّا کہاں سے آئے گا؟

"یہ دعا مانگنی ہے تو بھیا کو آنے دو"

فلکی اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی بات نہیں سنی۔ بے خیالی میں بولی۔

"عبادت ہر بندے کا خدا سے ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بن مانگے خود دیتا ہے!"

"بھابی! تم تو واقعی صوفی ہوتی جا رہی ہو" اس چاند سی جبیں پہ عبادت کا تلخ بوجھ

ظالم خیال کر ابھی عہد شباب ہے

جوانی میں ایسی باتیں کر رہی ہو تو بھیا بے چارے کیا کریں گے۔"

"اچھا تم اس وقت جاؤ اسحاق۔"

"کیوں جاؤں؟ میں تو پکچر کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ جلدی چلو دیر ہو جائے گی۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"تم کیوں نہیں جاؤ گی۔ میں زبردستی لے کر جاؤں گا۔"

"اسحاق میرے ساتھ زبردستی نہ کرنا۔ میں طبیعت کی بہت بری ہوں۔"

"میں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ بھیا کی شرافت سے میرا اندازہ مت لگانا۔ زبردستی اٹھاؤں گا اور موٹر میں ڈال دوں گا۔"

"بھیا کی شرافت۔" فلکی ذرا مسکرائی

گویا یہ اپنے بھائی کو بہت شریف سمجھتے ہیں

"دیکھو اسحاق۔" فلکی بہت نرمی سے بولی "مجھے پکچر وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"مانا کہ تمہیں دلچسپی نہیں ہے مجھے تو ہے بعض اوقات دوسروں کی خوشنودی کی خاطر کچھ کرنا چاہئے۔"

"تم ایسا کرو اپنے کسی دوست کو لے جاؤ۔"

"اس وقت میں کون سے دوست کو لے جاؤں۔ جب پکچر شروع ہونے میں دس منٹ ہیں۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔

"بڑی اچھی فلم ہے 'ماڈنی'، دیکھ کر تو جی خوش ہو جائے گا۔"

"'ماڈنی' میں پہلے بھی دو دفعہ دیکھ چکی ہوں اب نہیں دیکھوں گی۔"

"ہاں اگر پنجابی میں اس کی نقل 'پھجو رانی' کے نام سے بنی ہوتی تو تم پانچ دفعہ دیکھتیں۔" فلکی ہنسنے لگی۔

"میں نے کبھی پنجابی فلم بھی نہیں دیکھی"

"کب سے نہیں دیکھی؟"

"جب سے شادی ہوئی ہے۔"

"تمہاری شادی کو ابھی تو سال بھی نہیں ہوا اور اتنے کم عرصہ میں تم بدل گئی ہو؟"

"بس۔ لڑکی اپنے گھر میں مگن ہو جائے تو پھر سب کچھ بھول جاتا ہے۔"

"تم مگن ہو گئی ہو؟"

"ہاں"

"ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو، ہر وقت اداسی اور مایوسی چھائی رہتی ہے۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔ بلکہ اداس ہو گئی۔ یہ کم بخت اس کا بھرم توڑنے کے درپے تھا جانے نہیں کیوں اس کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔

اسے خاموش دیکھ کر اسحاق نے سوچا کہ وہ نیم رضامند ہو گئی ہے۔ ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔

فلکی نے اپنا ہاتھ یوں چھڑایا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو اور ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور ناگواری سے بولی

"اسحاق تم دور سے بات کیا کرو میں اتنی بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔"

"ہاں اگر یہ تکلف اپنی مائیں بہنیں پسند نہیں کریں گی تو کیا باہر کی لڑکیاں پسند کریں گی؟ تم چلتی ہو یا میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں۔"

"اچھا دور رہو۔" فلکی نے ڈرتے ہوئے کہا "میں خود چلتی ہوں۔"

"کیا اسی حلیے میں جاؤ گی؟" "کیوں میرے حلیے کو کیا ہوا ہے؟"

"بالکل ملانی لگ رہی ہو۔ ہلدی زدہ کپڑے، پاؤں میں چپل، سر پر دوپٹہ۔"

"میں تو اسی طرح چلوں گی۔"

"کسی لڑکے کے ساتھ خوب صورت لڑکی جا رہی ہو تو سب مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں، خواہ وہ خوب صورت لڑکی اس کی بہن ہو۔"

اسحاق قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"خواہ وہ خوب صورت لڑکی اس کی بہن ہو۔"

"بے غیرت" فلکی نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا محترمہ غیرت صاحبہ اب آ بھی چکو۔"

اسحاق کمرے سے باہر نکل گیا۔ فلکی اس کے پیچھے پیچھے مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی نکلی۔ اصل میں اسحاق کے ساتھ فلم دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ شادی کے بعد آفاق کے ساتھ ایک ہی فلم دیکھی تھی اور محبوب کے ساتھ اندھیرے میں بیٹھ کر فلم دیکھنا کیا ہوتا ہے اس پر عیاں ہو گیا تھا اور اب وہ کسی کے ساتھ بیٹھ کر بھی فلم نہیں دیکھنا چاہتی تھی چاہے وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

آفاق اور اسحاق میں بہت فرق تھا۔

وہ کچھ کے لگتا تھا۔

اور یہ زخم کریدتا ہے۔

سارا وقت ہنگامہ کرے گا۔ جانے کیا کیا بکے گا اور آفاق سوچے گا کہ میں اتنی سستی لڑکی ہوں کہ مجھے ہر کوئی فلم دکھانے لے جا سکتا ہے۔ باہر نکل کر اس نے اپنی چپل دیکھی اور بولی

"ذرا ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔ جوتا بدل آؤں۔"

جوتا بدلنے کے بجائے وہ غسل خانے میں چلی گئی۔

پورے پندرہ منٹ برباد کر کے جب وہ باہر آئی تو اسحاق غصے سے کھول رہا تھا وہ چپ چاپ موٹر میں بیٹھ گئی۔

"شکر ہے سرکاری باد بہاری آئی تو"

"دیکھو اسحاق مجھے مزہ نہیں آتا۔ اگر پکچر شروع ہو چکی ہو۔"

"نہیں، یہ انگریزی فلم ہے دیر سے شروع ہوتی ہے۔"

"پلیز ایک بات میں کہہ دوں۔ اگر پکچر شروع ہو چکی ہو تو میں اندر ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"آپ نے تو دوبارہ دیکھی ہوئی ہے۔"

"خواہ دیکھی ہوئی ہو، شروع پکچر میں نہیں دیکھوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور فلکی دل میں دعا کرنے لگی کہ پکچر شروع ہو چکی ہو۔

سینما ہال پہنچ کر اسحاق جلدی سے اترا اور اندر چلا گیا۔

اللہ کرے پکچر شروع ہو چکی ہو۔ فلکی دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگی۔

ابھی وہ بیٹھی دعائیں کر رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایک خاتون ہنستی مسکراتی پرس جھلاتی اندر سے آ رہی ہے۔ فلکی نے سرسری نظر سے دیکھا تو وہ چہرہ شناسا لگا۔ پھر غور سے دیکھنے لگی۔ قریب آئی تو فلکی نے اسے پہچان لیا۔

وہ نوری تھی۔

آفاق کی دوست نوری۔

آج بھی نوری نے براؤن رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی اور اتنی سخت سردی میں سلیولیس بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ اس کے گورے گورے بازو گہرے براؤن رنگ میں چمک رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے بھری بہار میں چمن میں چنبیلی کی کلی کھل گئی ہو۔

فلکی کے دل میں ایک دم دو طرح کے جذبات جاگے۔

پہلے تو اسے غصہ آیا اور اس کے دل میں حسد لہریں لینے لگا نوری کا سامنا کرنا بہت برا لگا۔

دوسرے ہی لمحے اس کا تجسس جاگا اور اس کا دل چاہا وہ نوری کو روک کر اس سے باتیں کرے۔ ہاں یہ پوچھے جب آفاق اس کی خاطر امریکہ چلا گیا ہے تو وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟

نوری کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی وہ ہنستی ہوئی، پرس جھلاتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔

کہ فلکی نے ایک دم اپنی کار کا دروازہ کھول دیا اور دوڑ کر نوری کے سامنے کھڑی ہو گئی

"ارے" نوری ایک دم چونکی۔ پھر شناسائی کی روشنی اس کے چہرے پر چمکی۔ اس نے جلدی سے فلکی کا ٹھنڈا برف ہاتھ تھام لیا فلکی نے صاف محسوس کیا باوجود اس کے نوری نے گرم کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ گرم تھے اور فلکی نے گرم شال لپیٹ رکھی تھی، مگر اس کے ہاتھ ٹھنڈے برف تھے۔

زندگی اور محرومی میں کیا فرق ہے اسے فوراً پتہ چل گیا۔

"ارے... فلکی... فلکی تم... وہ چیخی"

یہ کہہ کر اس نے فلکی کو اس طرح لپیٹ لیا کہ فلکی کا ایک رخسار نوری کے رخسار کے ساتھ مس ہوا۔ نوری کے جسم میں ہیجان لیتی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ نوری ایک بھڑکتا ہوا شعلہ لگ رہی تھی۔

اور فلکی بجھی ہوئی آگ

فلکی کے دل میں پھر حسد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس کا جی چاہا وہ نوری کا منہ نوچ لے اس کو لہولہان کر دے۔ اس کا خوب صورت چہرہ بگاڑ دے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری ایک جادوگرنی ہے جس نے اس کے آفاق کو مکھی بنا کر دیوار کے ساتھ چپکا دیا ہے

"کیسی ہو؟" نوری نے لگاوٹ سے پوچھا

"آفو کہاں ہے؟ اچھے ہو تم میاں بیوی، اپنے آپ میں مگن رہتے ہو۔ اس وقت کے بعد صورت ہی نہیں دکھائی۔ پکچر دیکھ چکی ہو یا دیکھنے جا رہی ہو۔؟"

"نہ دیکھ چکی ہوں، نہ دیکھنے جا رہی ہوں بس زبردستی لائی گئی ہوں۔ اسحاق کو آپ جانتی ہی ہیں!"

"ہاں ہاں!" وہ اپنائیت سے بولی "تم کس کا ذکر کر رہی ہو نا؟ آفو کا چھوٹا بھائی۔"

"جی وہ مجھے زبردستی لے آیا تھا... اور"

"ہاں کا کو فلموں کا بڑا شیدائی ہے اور اس کا یہ بچپنا جائے گا نہیں آفو اور کاکو میں زمین آسمان کا فرق ہے"

فلکی کو یوں محسوس ہوا جب بھی نوری آفاق کا ذکر کرتی ہے، اس کے لہجے میں شہد گھل جاتا ہے اور کتنی بے تکلفی سے یہ پورے خاندان کا ذکر کرتی ہے۔ جیسے... جیسے فلکی کے اندر آگ سی جلنے لگی۔

اسی وقت ایک اونچا، لمبا تڑنگا بڑی بڑی گھنی گھنی مونچھوں اور لمبے لمبے بالوں والا ایک آدمی بازو پر ایک سفید کوٹ لٹکائے باہر آ گیا اور ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم دنیا کے کسی خطے میں چلی جاؤ تمہیں کوئی نہ کوئی واقف کار ضرور مل جاتا ہے" اس نے پائپ کا کش لے کر کہا۔

نوری اس طرح ہنسی جس طرح ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔

اس نے ادا سے کہا پھر فلکی سے بولی۔

"پہلے میں تعارف کرا دوں یہ سرمد ہے۔"

"کبھی کچھ آگے بھی کہو۔" سرمد نے اسے ٹہوکا دیا

"میں سوچ رہی تھی۔ الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔"

"میں نے تم سے کہا تھا نا فلکی اگر پاکستان میں میرا دل ہے... تو یہ ہے، وہ دل جس کے لئے میں یہاں آ گئی"

سرمد قہقہہ لگا کر ہنسا۔

فلکی کو جیسے چکر آ گیا۔

"ایک مہینہ ہوا، میری اور سرمد کی شادی ہو گئی ہے۔ مگر تم جانتی ہو نا، مرد بڑا خود پسند ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جس عورت سے اس نے شادی کی ہے، وہ ہر بار، سرِ محفل، سرِ راہ اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے اس آدمی کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں۔ اپنا حسن اور جوانی اس کو خیرات میں دیا ہے... کیوں سری؟" اس نے سرمد کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اوہ... نو... نو... میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ سرمد نے پیار سے نوری کا ہاتھ تھام لیا۔

"مگر مجھے اعتراض نہیں۔" نوری اس کے کندھے سے لگ گئی۔

"ساری زندگی، ساری دنیا کو یوں ہی میرا وہ بیچ کر سکتی ہوں کہ اس آدمی نے میری زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔ اپنی ہر بات منوائی ہے اس نے، اور اب مجھے پاکستان لے آیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

سرمد نے بڑے پیار سے کہا۔

فلکی کھڑی کھڑی تھر تھر کانپنے لگی۔

میاں بیوی کا یہ انداز بھی ہو سکتا ہے اسے اپنی شادی کے دن یاد آ گئے۔

کیسی قیامتیں گزری تھیں اس پر۔

تو یہ ہوتی ہے محبت کی شادی۔

"ڈارلنگ! یہ اظہارِ محبت کا پلیٹ فارم نہیں، سینما ہال کی رہگزر ہے" سرمد نے یاد دلایا۔

"خود ہی باتوں میں الجھا لیتے ہو۔ ابھی تک میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ یہ کون ہیں؟"

"ہوں گی، تمہاری کوئی پرانی دوست۔" سرمد نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں، میری دوست نہیں بلکہ دوست سے کچھ بڑھ کر ہے"

"کیا مطلب...؟"

"یہ میری بھابی ہیں... اور وہ بھابی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے

ع غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

"ہیں... ہیں... دوست... بھابی۔ یہ کیا چکر ہے۔ میں تمہاری سب بھابیوں کو جانتا ہوں۔ کیا کسی بھائی نے چوری چھپے...؟" سرمد نے بائیں آنکھ بند کی۔

"نہیں نہیں..." نوری زور سے ہنسی۔

"تمہیں یاد ہے... آفو... آفاق...؟"

"ہاں ہاں..." سرمد کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔

"فلکی، آفو کی بیوی ہیں... جانتے ہو دونوں کی لو میرج ہوئی ہے؟"

"اچھا..."

"مجھے، آفو نے خود بتایا تھا... اور واقعی فلکی اور آفو کا جوڑ ہے۔"

"منہ پر تعریف جھوٹی ہوتی ہے!"

"اچھا اب بکو نہیں...."

"یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے بھئی؟" اسحاق ایک دم سے بیچ میں کود پڑا۔

"ارے کاکو...!"

"اوہ... نوری آپا...!"

"کیا عجیب ملاقات ہے!..."

"اور کتنی عجیب جگہ پر!" اسحاق نے سینما ہال کی طرف اشارہ کیا۔

سب ہنسنے لگے

(اس سے آگے کے حالات جاننے کے لئے اگلے ماہ کا 'بانو' ملاحظہ فرمائیے۔)

نام : عاقل خاں بھارتی علیگ عمر: ۱۲سال
پتہ : معرفت عبدالسلام خاں سابق چیئرمین بڑھاپور، بجنور، (یوپی)
شوق : قلمی دوستی، جرنلزم، سوشل ورک، ٹریولنگ گیم، ڈبیٹ، ایکٹنگ، غزلیں لکھنا وسننا، پڑھنا، فلمیں دیکھنا۔

نام : سید رسول شاہین عمر: ۲۶ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۹۳۶ مدینہ منورہ، سعودی عرب
شوق : قلمی دوستی۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔

نام : شاہد آصف خان عمر: ۲۲سال
پتہ : مکان نمبر ۳/ ۲۱۸ خان منزل پانی پت، ہریانہ
شوق : قلمی دوستی۔ غالب اور قتیل شفائی کی شاعری دل چسپی سے پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا اور کرکٹ دیکھنا۔ بانو کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنا۔

نام : وفا تبسم عمر: ۲۰۰سال
پتہ : معرفت نہیم صاحب، پوسٹ سوار ضلع رامپور ۲۴۴۹۲۴
شوق : مشاعروں میں شرکت کرنا، شعر وشاعری، با اخلاق اور باکردار بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا۔

نام : نہیم انصاری ساحر عمر: ۲۲سال
پتہ : سدھارتا۔ آئی۔ ٹی۔ آئی۔ بنجاری گڈہ، نرمل ضلع عادل آباد (اے۔ پی) ۵۰۶۱۰۶
شوق : رسائل پڑھنا، شعر کہنا اور شعر سننا۔ دیش ودیش کے بہن بھائیوں سے خط وکتابت کرنا۔ بہن بھائیوں کا خط آئے تو میں انہیں فوراً جواب دوں گا۔

نام : رفعت پروین عمر: ۲۰سال
پتہ : مکان نمبر ۲۵۶۹ بارادری، بلیماران، دہلی، ۱۱۰۰۰۶
شوق : نئے ڈیزائن کے کپڑے پہننا۔ ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنا بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا۔

نام : منظر وحید قریشی عمر: ۲۰سال
پتہ : کمیشن سیلز، ہمدرد، لال کنواں ہمدرد مارگ دہلی ۶
شوق : کرکٹ۔ فوٹوگرافی۔ پھلواری کا شوق، قلمی دوستی۔ رفیع اور مکیش کے درد بھرے گیت سننا۔

نام : ایم احمد، بی اے عمر: ۲۳سال
پتہ : کلینگا ریڈی میڈ اسٹور، نیو مارکیٹ کیونجھر گڑھ، ۷۵۸۰۰۱
شوق : بانو، شمع پڑھنا بھائی بہنوں سے قلمی دوستی کرنا۔ غزل سننا پاکستانی گانا سننا۔ کرکٹ کھیلنا اور کرکٹ میچ دیکھنا۔

نام : سلطان احمد ہاشمی (بی ایس سی) عمر: ۲۵سال
پتہ : گرامین بینک، جیپا کی برانچ۔ پوسٹ۔ بند کھارو، مجوور ضلع گریڈیہہ، بہار۔
شوق : ادبی مطالعہ، افسانے لکھنا، مناظر قدرت میں دل چسپی قلمی دوستی۔

نام : شیلندر کمار اگروال (منٹو) عمر: ۱۵سال
پتہ : ادارہ "کلیم" پوسٹ بکس نمبر ۱۱۔ سندرگڑھ، (اڑیسہ)
شوق : جھوٹ بولنا، چوری کرنا، چغلی کرنا، غیبت کرنا۔ باتوں کا جواب بھی گالیوں سے دینا۔ اردو، ہندی، انگلش میں خط لکھنا۔

نام : عطاء اللہ خاں عمر: ۲۷سال
پتہ : ۱۷/ ۲۸۴ چندر کلاں برہانپور (ایم۔پی) ۴۵۰۳۳۱
شوق : شعر وادب، سرسٹل سردس ادبی کتابوں کا مطالعہ قلمی دوستی ٹکٹ جمع کرنا۔

نام : دیبا ندیم عمر: ۲۲سال
پتہ : معرفت ندیم السلام محلہ آمن شہید، ہمیرپور، یوپی، ۲۱۰۳۰۱
شوق : شعر کہنا، بہن بھائیوں سے دوستی کرنا۔

نام : محمد ابراہیم عمر: ۳۵سال
پتہ : ص۔ب ۱۸۴۲ حائل (سعودی عربیہ)
شوق : اچھی کتابیں پڑھنا۔ قلمی دوستی۔ شعر وشاعری اور اچھے اشعار جمع کرنا۔ معیاری فلم دیکھنا۔

نام : عبدالخلیل کشش عمر: ۲۲سال
پتہ : مکان نمبر سی۔ نیو۔ ۲۱۔ پوسٹ شکر نگر، ضلع نظام آباد (اے پی) ۵۰۳۱۸۰
شوق : ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ افسانے، منی کہانیاں، غزلیں لکھنا، روزناموں، ماہناموں میں سوالات کرنا۔ قلمی دوستی کرنا خطوط کا پابندی سے جواب دینا۔

نام : محمد خالد عبداللہ عمر: ۲۲سال
پتہ : ص ب ۳ الخبر ۳۱۹۵۲۔ سعودیہ عربیہ
شوق : انڈین پرانے گانے سننا لڑکے اور لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا ہر کسی کے کام آنا۔

نام : سعد بن علی عمر: ۳۹سال
پتہ : ۴۹۸-۲-۱۶ ملک پیٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶
شوق : تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا، فلم اور ٹی وی دیکھنا خدمت خلق کرنا۔

نام : پیرزادہ ایس وحید الدین عمر: ۲۸سال

پتہ : سندھی پورہ برہان پور، ایم پی۔ ۴۵۰۳۳۱
شوق : قلمی دوستی، معمہ و پہیلیاں حل کرنا، شطرنج، ٹکٹ و سکے جمع کرنا

نام : مس شہناز عمر : ۱۹ سال
پتہ : معرفت فیض الحسن راہی، "آشیانہ" ہردے پور، بھنیاپہ ضلع غازی آباد، یو پی، ۲۴۵۱۰۱
شوق : اخبار و رسائل کا مطالعہ، شعر و ادب، فلمیں، موسیقی، قلمی دوستی (صرف لڑکیوں سے) شمع، بانو کا مطالعہ، نماز پڑھنا۔ بڑوں کی عزت کرنا وغیرہ۔

نام : ملک عبدالرشید، بی ایس سی عمر : ۲۹ سال
پتہ : ولیج ڈلنگام۔ پوسٹ آفس کوکرناگ، اننت ناگ کشمیر ۱۹۲۲۰۲
شوق : قلمی دوستی۔ بانو کا مطالعہ، سیر و تفریح کرنا۔ کتب بینی، شطرنج کھیلنا۔

نام : محمد جمیل ضمیر عمر : ۲۶ سال
پتہ : آرامکوں البقیق بکس نمبر ۹۰۵، سعودی عربیہ ۳۱۹۳۶
شوق : خطوط لکھنا۔ درد مندوں کے کام آنا قلمی دوستی۔

نام : جاوید اختر عمر : ۲۰ سال
پتہ : معرفت مہاراشٹر میڈیکوز محمد علی روڈ موین پورہ، ناگپور ۱۸
شوق : بہت سے رسالوں کا مطالعہ کرنا شاعروں سے بہت زیادہ دلچسپی رکھنا اور کھیل میں فٹ بال اور کرکٹ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا شاعروں سے آٹوگراف لینا اور جمع کرنا۔

نام : جمیل احمد عمر : ۲۲ سال
پتہ : روم نمبر ۸ اچال ۳ امیر باغ ۱۲ نز دریلوے اسٹیشن جمیپور بمبئی ۸۹، فون : ۵۲۳۷۱۴
شوق : اسٹوری لکھنا اور نئے لکھنے والوں کی اصلاح کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ خط کا جواب فوراً دینا۔

نام : محمد انیس قریشی عمر : ۱۶ سال
پتہ : رحمت نگر ۸/۹۲/۲۲۸-۳-۸ حیدرآباد ۵۰۰۰۴۵
شوق : مطالعہ۔ کرکٹ کھیلنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ ماں باپ کا ادب کرنا۔

نام : حبیب شیدائی عمر : ۲۳ سال
پتہ : ۱۳ جلال روڈ، آمبور ۶۳۵۸۰۲ (تملناڈو)
شوق : شب و روز کتابیں دیکھنا۔ سنجیدہ اور علمی گفتگو کرنا۔ ان ڈور گیمس کھیلنا اور آؤٹ ڈور گیمس سننا

نام : سید ریاض احمد عمر : ۱۹ سال
پتہ : مکان نمبر ۳۱۰-۴-۱- بھولکسا پور، مشیر آباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۸
شوق : کرکٹ کھیلنا، افسانے لکھنا۔ اچھے اشعار و لطیفے اکٹھا کرنا بانو اور دیگر معلوماتی رسائل پڑھنا قلمی دوستی کرنا وغیرہ۔

نام : انصاری آصف علی عبدالحئی عمر : ۱۶ سال
پتہ : انصاری اے اے ۹۲ ۴۸، نانا دتی کتھرڈا نا ملٹ سٹی ۴۲۲۰۰۱
شوق : خطوط کے جواب دینا۔ تقریر اور بحث و مباحثہ میں حصہ لینا۔ ہاکی کھیلنا۔ اخبار و اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا اردو ادب کا ذوق۔

نام : محمد اختر ظہور عمر : ۲۳ سال
پتہ : ۱۲۲ محمد حبیب ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یوپی)
شوق : مضامین لکھنا ڈاک ٹکٹ و سکے جمع کرنا۔ دوستی کرنا۔ تحفے دینا رسالوں کا مطالعہ کرنا۔

نام : محمد یوسف عبدالغفور عمر : ۲۰ سال
پتہ : بی ایل ایچ رو رشنا آدرش نگر روم نمبر ۴، ۹ کرلا ایسٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۴
شوق : شپنگ کرنا۔ مزید تعلیم حاصل کرنا۔ سائنس و ریاضی رسالے پڑھنا پرانے نغمے سننا۔ غزلیں پڑھنا۔ نماز پڑھنا وغیرہ۔

نام : سلمیٰ زیدی عمر : ۲۱ سال
پتہ : ۳۹ کلالان کیرانہ مظفر نگر یوپی ۲۴۷۷۷۴
شوق : ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔ اشعار نوٹ کرنا۔ بانو پڑھنا۔ دوستوں کی مدد کرنا وغیرہ۔

نام : قمر سلطانہ عمر : ۲۰ سال
پتہ : مکان نمبر ۱۷-۴-۳ قاضی محلہ بھونگیر ضلع نلگنڈہ ۵۰۸۱۱۶
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ ادبی کتابیں پڑھنا۔ خدمتِ خلق کرنا نماز پڑھنا۔

نام : عمر دراز خاں افغانی کاندھلوی عمر : ۲۲ سال
پتہ : وارڈ نمبر ۱۱ پانی پت ضلع کرنال، ہریانہ۔ ۱۳۲۱۰۳
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ بانو کا مطالعہ کرنا۔

نام : سید محمد طلحہ عرف وحی عمر : ۲۴ سال
پتہ : 134/B بلاک A نارتھ ناظم آباد کراچی نمبر ۳۳ (پاکستان)
شوق : قلمی دوستوں کے جوابات دینا۔ سیاحت، مطالعہ اور کھیلوں سے دلچسپی۔

○○

نام : عمر :
پتہ :
شوق :

انسانی جسم میں پیروں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ پیروں پر انسان کے پورے جسم کے توازن کا دارومدار ہوتا ہے، لیکن پھر بھی ہندوستان میں زیادہ تر لوگ صرف چہرے اور ہاتھوں کی دیکھ بھال پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور پیروں کی صحت، صفائی اور خوشنمائی پر دھیان نہیں دیتے۔ بعض لوگ تو اس بات کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ پاؤں بھی جسم کا ایک اہم حصہ ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پاؤں بیمار، بدنما اور کھردرے ہو جاتے ہیں۔ یہ پھٹ جاتے ہیں، ان پر گٹے پڑ جاتے ہیں۔ غلط قسم کے جوتے، چپل کے استعمال سے پیروں پر کورن نمودار ہو جاتے ہیں جو بدنما بھی ہوتے ہیں اور تکلیف دہ بھی۔ اور جس کا علاج بھی مشکل سے ہوتا ہے۔

پیروں کی حفاظت کے ضمن میں سب سے خاص نکتہ یہ ہے کہ جوتے، چپل وغیرہ بہت آرام دہ اور نرم ہوں۔ جوتے، چپل کا ناپ پاؤں کے لئے موزوں ہونا چاہئے۔ اگر آپ بہت تنگ یا خراب چمڑے کے جوتے پہنیں گی تو پاؤں کی کھال بہت حساس ہونے کی صورت میں پیروں پر ورم آجائے گا اور ان پر کورن یا BUNIONS یا CALLUSES پیدا ہو جائیں گے۔ جب جسم کا سارا بوجھ کسی ایک جگہ پر پڑتا ہے تو وہ جگہ دبنے لگتی ہے اور وہاں کی کھال موٹی ہو جاتی ہے اس کے بعد وہاں کا لوسا دھیا آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ اس طرح مستقل زور پڑنے سے کورن کے چاروں طرف کے حصے پر اثر ہو جاتا ہے اور بیچ میں ایک کیل سی بن جاتی ہے، دھیرے دھیرے اس میں تکلیف بڑھتی ہی جاتی ہے اور پھر پورے پاؤں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

کورن عام طور سے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ سخت کورن، جو عموماً انگلیوں کے اوپر ہوتے ہیں اور نرم کورن، جو انگلیوں کے بیچ میں ہوتے ہیں۔ نرم کورن چھالے کی طرح ہوتے ہیں۔ انگلی اور انگوٹھے کے درمیانی حصے میں خاص طور سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کورن کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک بار جس جگہ ہوتے ہیں بار بار اسی جگہ نکلتے ہیں۔

کورن اگر باقاعدہ بن گیا ہے اور یہ تکلیف بھی دے رہا ہے تو اس کے لئے فوراً کسی CHIROPODIST (پیروں کے ماہر) یا کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ ایسی حالت میں خود کورن کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ پیروں کا ماہر ڈاکٹر ہی ان کو چاقو اور دوسرے اوزاروں کی مدد سے نکال سکتا ہے۔ اس عمل میں تکلیف بھی ہو سکتی ہے، مگر دوبارہ ان کے نکلنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔

نرم کورن کو دور کرنے کے لئے پہلے اس کی موٹی کھال کو، جو جمی ہوئی ہے نکال دیں۔ اس کے بعد سلور نائٹریٹ کا محلول لگائیں۔ کورن کی صفائی اور دوا لگاتے وقت یہ خیال رکھیں کہ اوزار اور ہاتھ جراثیم سے پاک ہوں۔ اگر آپ ذیابیطس کے مریض ہیں تو کورن کو کبھی نہ کٹوائیں۔

خراب جوتے یا گندے موزے پہننے سے بھی پیروں میں کئی طرح کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پنجوں کا سوراخ ہو جانا، ان پر گٹے پڑ جانا، وغیرہ۔

پیروں کی مناسب دیکھ بھال نہ کرنے سے ایک اور مشکل بھی سامنے آ سکتی ہے، وہ ہے ناخنوں کا نہ بڑھنا۔ اگر جوتے، چپل اس قسم کے ہوں کہ ان کے پہننے سے ناخن دبتے ہوں یا پاؤں

میں چوٹ کے باعث ناخن کے ٹوٹ جانے پر وہ جگہ جوتے سے دبی ہو تو ناخنوں کے کنارے کھال میں گھس کر زخم بن جاتے ہیں۔ اِس لئے ایسے جوتے، چپّل کبھی نہیں پہننے چاہئیں جو پنجے کو دباتے یا کاٹتے ہوں یا چلنے میں تکلیف دیتے ہوں۔ غلط جوتے، چپّل کے پہننے سے چال میں بھی فرق پڑتا ہے۔ جس سے دیکھنے والوں کو آپ کی خوب صورتی اور شخصیت میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔

ناخن ہمیشہ نیل کٹر سے سیدھے کاٹیں۔ ناخنوں کے لئے قینچی استعمال نہ کریں۔

گندے جوتے یا اسپورٹس کے جوتے پہنے رہنے سے کبھی کبھی پیروں میں چھالے پڑجاتے ہیں۔ یہ چھالے پیر بہت زیادہ گیلے رہنے کی وجہ سے یا تیرنے کی وجہ سے بھی ہوجاتے ہیں، پھر ان چھالوں میں مرچیں سے لگنے لگتی ہیں۔ جگہ جگہ سے کھال پھٹ جاتی ہے۔ اِس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنے پیروں کو صاف اور خشک رکھیں۔

اگر آپ اپنے پیروں کو خوب صورت بنانا چاہتی ہیں اور ان سب بیماریوں کو پیدا ہونے سے پہلے روکنا چاہتی ہیں تو آپ کم از کم ہفتے میں ایک بار پیروں کی مکمل صفائی کریں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ٹب میں نیم گرم پانی ڈالیں۔ ٹب اتنا بڑا ہو کہ آپ کے دونوں پاؤں بھیگ جائیں۔ پانی میں تھوڑا سا شیمپو ڈال کر ایک ڈھکنا بھر ہائیڈروجن اور چند قطرے ڈیٹول کے ڈال کر اس میں اپنے پاؤں بھگولیں۔ اگر آپ کے پیروں میں بیماری، زخم یا کوئی کورن وغیرہ ہو تو پہلے اِس جگہ ٹنکچر ضرور لگا لیں اس کے بعد پاؤں بھگوئیں۔ پندرہ منٹ تک پیروں کو ٹب میں رہنے دیں۔ اس کے بعد پیومک اسٹون سے پیروں کو ہلکے ہلکے رگڑیں۔ پھر چھوٹی ریتی سے (SCALPEL) سے ایڑیوں اور ٹخنوں پر پیدا ہونے والے گٹوں کو رگڑیں۔ اس کے بعد پیروں کو پانی سے نکال کر کسی کولڈ کریم سے مالش کریں اور تولئے سے پاؤں صاف کریں۔

اگر آپ پیروں میں مستقل کورن پیدا ہوگیا ہے تو روزانہ نہانے کے بعد پیومس اسٹون یا جھانوے سے "کورن" کو رگڑیں۔ غسل کے بعد "کورن" ملایم ہوجاتا ہے۔

اکثر پاؤں کے گول ناخنوں کو کاٹنے سے ناخن کھال کے اندر ہی اندر بڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ اس سے بھی انگلیوں میں سوجن پیدا ہوجاتی ہے۔ ہمیشہ یہ خیال رکھئے کہ پیروں کے ناخن بالکل سیدھے کاٹیں۔ ان میں گولائی نہ دیں اور غسل کے بعد پیروں پر عرقِ لیموں کی مالش ضرور کریں۔

اگر آپ اِن تمام باتوں کا دھیان رکھیں گی تو آپ کے پیر ہمیشہ صاف ستھرے، گلابی اور خوشنما نظر آئیں گے اور بیماریوں سے پاک رہیں گے۔

■■

گھریلو نسخے

دانتوں کو موتی کی طرح چمکانے کی ترکیب

پہلے برش کو لیموں کے رس میں بھگوئیں اور اس کے بعد سوڈا بائی کاربونیٹ میں ڈبوئیں۔ اب اپنے دانتوں پر برش کریں۔ آپ کے دانت موتی کی طرح چمکنے لگیں گے۔

کڑوے تیل میں نمک ملا کر دانت صاف کیجئے۔ اس طرح بھی دانتوں میں چمک پیدا ہوجائے گی۔ اگر آپ تیل کی وجہ سے کچھ کراہت محسوس کریں تو اس کے بعد کوئی اچھا سا منجن یا ٹوتھ پیسٹ استعمال کریجئے۔

پلکیں لمبی اور گھنی کرنے کی ترکیب

پلکوں کی جڑوں میں رُوئی کی مدد سے صاف شدہ کیسٹر آئل لگائیے۔ اس سے پلکیں لمبی اور گھنی ہوجائیں گی۔

اصلی شہد اور کسٹر آئل (جلاب والا) دونوں برابر لیں اور کسی شیشی میں ملا کر رکھ لیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت اسے پلکوں پر لگائیں۔ پندرہ دن میں پلکیں لمبی ہو جائیں گی اور آنکھیں بے حد حسین اور پُرکشش معلوم ہوں گی۔

بھنویں گھنی کرنے کی ترکیب

رات کو سوتے وقت بھنوؤں پر روغنِ زیتون کی مالش کیجئے۔ اس سے بھنویں چند دن میں ہی گھنی ہوجائیں گی۔ اگر سوتے وقت زیتون کا تیل پلکوں پر لگایا جائے تو پلکیں بھی گھنی اور چمک دار ہوجاتی ہیں۔

جلی ہوئی جلد کو چھالوں سے بچانے کے لئے

جلی ہوئی جگہ پر فوراً گلیسرین لگا دیں۔ اس سے ٹھنڈک پڑ جائے گی اور چھالے بھی نہیں پڑیں گے۔ اگر گلیسرین فوراً نہ مل سکے تو کپڑوں میں ڈالنے والا نیل لگا دیجئے۔

●●

بزمِ بانو

محمد قیصر احمد، مونگیر (بہار)

س: کسی کے بھٹکانے میں انسان اپنے بُرے بھلے کی تمیز بھول جائے تو قصور کس کا ہے؟

ج: اسی کا جس نے بُرے بھلے کی تمیز نہ کرکے نقصان اُٹھایا۔ بھٹک جانے اور اپنے بُرے بھلے کی تمیز کھو دینے والے کا کردہی بھگتے گا۔

س: حُسن کیا خوب صورت آنکھوں، دل کش خدوخال، سنہری رنگت اور گھٹاؤں ایسے بالوں ہی کا نام ہے؟

ج: یہی سُننے میں آیا ہے۔ تلاشِ حسن سے کبھی دلچسپی نہ رہی۔ دل ان کی طرف زیادہ کھنچتا رہا جن کے پاس دل و دماغ تھے۔

محفوظ احمد گرول، دربھنگہ

س: عورت میں سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟

ج: کہ وہ عورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مرد بھی بنا سکتا تھا۔ شکر ہے کہ وہ دونوں جنسوں کے درمیان کی شے نہیں اس لئے پاک پروردگار کی شکر گزار ہے اور احکامِ الہٰی بجالاتی ہے۔

راشد فخر، دلیر نگر، ہزاری باغ

س: انسان نفس کی غلامی سے کیسے چھٹکارا پا سکتا ہے؟

ج: خدا نے پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں بنائیں کچھ ایسے ہیں جو نفس کے غلام نہیں بنتے کچھ کم زور ارادہ کے لوگ حالات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ ہر انسان اپنا آپ نمونہ ہے ماحول نے اس کی جسمانی اور روحانی طبیعت کی ہے۔ عقل ہی اس کی رہ نمائی کرسکتی ہے۔ اس کے عزیز اور دوست مدد کر سکتے ہیں۔

محمد قسمت علی، ایم بشیر، چوڑھلی

س: دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز کیا ہے؟

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں، صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مُدیرہ

بزمِ بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

ج: انسان جو دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ ایک اور بڑ کمہار مٹی کے گولے کو گلزار بنا رہا ہے۔ ایٹم بنا کر اسے بھک سے اُڑا دینے کے منصوبے بھی بنا رہا ہے!

س: دنیا اور دین میں فرق بتائیں؟

ج: خود معلوم کیجئے چند لائنوں میں بتانا مشکل ہے۔ صرف اتنا خیال رہے صرف اپنا یقین ہی دین نہیں۔ اس دنیا میں سکون سے رہنے بسنے کے لئے ہر خطے کے انسانوں میں رہ نمائی کے لئے پیغمبر ظاہر ہوئے تاکہ دنیا میں مل کر رہنے کا طریقہ جانیں۔

س: عورت دنیا میں سب سے زیادہ کس چیز کو پسند کرتی ہے؟

ج: سب عورتیں ایک ہی چیز پسند نہیں کرتیں نہ سب مردوں کی پسند یکساں ہوتی ہے۔ عام طور پر ہر نئی اور خوب صورت چیز وقتی طور پر دل لبھاتی ہے پھر نئی چیز آجاتی ہے۔ یہ تو وقت کے فیشن پر منحصر ہے۔

ارشد محمود، حیدر آباد

س: شادی کے بعد انسان سنجیدہ کیوں ہو جاتا ہے؟

ج: شادی ایک سنجیدہ قدم ہے۔ نئی جیون ساتھی، نیا گھربار اور اولاد کی ذمہ داری کا تصور سنجیدہ بنا دیتا ہے۔

کے۔ ایم حسین، حیدر آباد

س: اپنے آپ پر کب بھروسا کرنا چاہیے؟

ج: ہمیشہ۔ آپ کا سب سے بھروسے کا دوست خود آپ ہیں۔

س: ظالم کو معاف کرنا بہتر ہے کیا انتقام لینا؟

ج: ظالم کا قتل ظلم کا قتل نہیں ہوتا۔ کوئی اور ظالم پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل ظلم، ستم، ناانصافی کی رسم کو ختم کرنا چاہئے۔ ہتھیاروں کی سوداگری جُرم ہے۔

نسیم فرازی فاروقی، میرٹھ

س: اپنے پرائے اور پرائے اپنے کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج: انسانی رشتے تعلقات پر بنتے بگڑتے ہیں۔ کبھی اپنوں سے نفرت اور غیروں

سے بے انتہا پیار ملتا ہے ہر رشتے کی اپنی الگ کہانی ہوتی ہے۔

س: کیا بزم بانو میں اپنے افسانے برائے اشاعت ہو سکتے ہیں؟

ج: ضرور، بھیج کر آزمائیے۔ بشرطیکہ وہ بانو کے معیار کے ہوں۔

سید کلیم الرحمٰن، گھوری گھاٹ

س: دوستوں کی دوستی پر کس طرح بھروسا کرنا چاہیے؟

ج: دوستی بے غرض ہو تب ہی ہمیشہ قائم رہتی ہے بھروسا کرنے میں کیا حرج ہے۔ بہت اہم معاملے میں صرف رائے لیجیے دیکھیے۔ ذمہ داری سے بچ کر۔

س: دوسروں کا مداوا کر ڈالنے اور دل کا گریبان سی ڈالنے والے کا عاقبت کیا رہے گا؟

ج: نہ بُرا نہ اچھا۔ یہ شعر یوں ہے۔

اوروں کا مداوا کر ڈالا
اپنا ہی گریباں سی نہ سکے

سلطانہ اقبال، چھپرہ

س: عورتوں کی سب سے بڑی عبادت؟

ج: اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور احکام الٰہی کی تعمیل۔

س: خوش نصیب عورت کی پہچان کیا ہے؟

ج: جو نہ والدین پہ بار تھی نہ شوہر پر بار ہے والدین سے جہیز میں چار کپڑوں کے علاوہ کچھ نہ لیا۔ میاں بیوی مل کر بچوں کو پڑھا کر قابل بنانے میں مشغول ہیں، تین بچے ہیں جو والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ماں باپ بچوں کو ہوم ورک میں مدد دیتے ہیں۔ سب ہی تن درست اور ہنس مکھ ہیں ایسے میں خوب پہچانتی ہوں کیوں کہ وہ میری پڑوسن ہے۔

شبنم آفاق، علی روسڑہ دستی پور

س: عصمت باجی! انتظار کی دشوار ترین اور صبر آزما گھڑیاں تلخ بھیانک اور بڑی خطرناک ہوتی ہیں ایسا کیوں؟

ج: صبر آزما تلخ بھیانک تو اتنی نہیں جتنی کم زور دل بنا لیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ذہنی پریشانیاں کچھ بڑھ رہی ہیں کچھ لوگ بڑھا بھی لیتے ہیں۔ خود پر قابو پانے کے بجائے بوکھلاتے زیادہ ہیں کام اور بگڑ جاتا ہے۔ جب مصیبت پڑے تو ٹھنڈے دل سے وضو کر کے نفل پڑھنا شروع کر دیجیے۔ لمبی لمبی سانسوں کے ساتھ۔

پیاری سلطانہ، گنٹور

س: تقدیر اور تدبیر اور قسمت ان میں کس پر بھروسا رکھنا چاہیے بتائیے؟

ج: نہ تقدیر نہ قسمت، تدبیر سے بگڑی تقدیریں بنتی ہیں۔ نوجوانوں کو چاہیے اپنی انجمنیں بنائیں۔ جمع ہو کر کوئی منصوبہ بنائیں۔ اپنا ایک وفد دہلی بھیجیں کہ انہیں زمین یا کوئی کام دیا جائے ہر کام کرنے کو تیار ہو جائیں۔ اودھم کے بجائے سکون سے اپنا حق مانگیں ضرور ملے گا نجی طور پر اپنی معلومات بڑھانے کے لئے علم حاصل کریں۔

ایم آفاق مصطفےٰ عمادوی، بیگو سرائے

س: گھریلو زندگی میں کامیابی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟

ج: سب سے پہلے تو مالی حالت سُدھارنے کی کوشش کریں۔ بہار میں بڑی غربت ہے۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں۔ زیادہ تر جھگڑے گھروں میں تنگی ترشی سے بڑھتے ہیں۔ غصہ کسی بات پہ ہوتا ہے اور پُرانے گھڑے مُردے اکھڑنے لگتے ہیں۔ رواداری اور درگزر کے ساتھ زبان پر قابو کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔

س: شوہر گریجویٹ اور بیوی ان پڑھ ہو تو کیا ازدواجی زندگی خوش و خرم گزر سکتی ہے؟

ج: اوّل تو شوہر کو ایسی لڑکی سے شادی ہی نہیں کرنا چاہیے۔ خاندان کے زور زبردستی کو نہیں سہنا چاہیے۔ یہ نہایت بزدلی ہے۔ پھر بیوی کو پڑھایا جا سکتا ہے۔ اُردو، ہندی بالغ عورت بہت جلدی پڑھنے لگتی ہے۔ تعلیم بالغان کا ہر جگہ انتظام ہوتا ہے۔ صرف ہمت چاہیے۔ بیوی کی ہمت بڑھائیں۔ شریف خاندان کی ان پڑھ لڑکی بھی سمجھ بوجھ تو رکھتی ہے۔ مذہبی کتابیں تو پڑھنا چاہے گی۔ قرآن پڑھا ہے تو اُردو بہت جلد پڑھنے لگے گی۔

شیخ عثمان آزاد، نصیر آباد

س: جہالت کا نام و نشان کب ختم ہو گا؟

ج: انگریزوں کی غلامی کا جُوا اُتارے ۴۲ برس ہوئے ہیں۔ صدیوں کے زخم بھرتے وقت لگے گا۔ جہالت تو جب مٹے گی جب ملک کے ہر انسان کے دل میں جہالت مٹانے کا ارادہ پھلے پھولے گا۔ عام انسان خود اپنی حالت سُدھارے گا۔ سرکار کے وعدوں کے بھروسے پہ نہ بیٹھا رہے گا اور کوئی لیڈروں کی چھین جھپٹ ختم کرے گا۔

س: بچہ اگر بچپن سے ہی چور ہو جائے تو تب کیا ہو گا؟

ج: بچوں کو چوری پر سزا دینے کی بجائے شرارت سمجھ کر ٹال دیا جائے۔

ذکی انور انصاری، بمبئی ۳

س: اگر لال رنگ خطرے کی نشانی ہے تو دُلہن شادی کے دن لال ساڑی کیوں پہنتی ہیں؟

ج: لال رنگ خطرے کا نشان اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ نظر کو تیزی سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے دُلہن کی طرف دُولہا کی توجہ بھی درکار ہوتی ہے اور سب کی نظریں بھی متوجہ ہوتی ہیں۔

○○

شمسی ریفریجریٹر

کینیڈا کے ایک انجینئر نے ایک ایسا ریفریجریٹر تیار کیا ہے جو بجلی یا گیس کی بجائے شمسی توانائی سے چلتا ہے۔ یہ دنیا میں شمسی توانائی سے چلنے والا پہلا ریفریجریٹر ہے۔ اس کی تیاری کا منصوبہ روٹری کلب اور کینیڈا کی بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی نے بنایا تھا۔ اس ریفریجریٹر کو تیار کرنے کے بعد آزمائش کے لئے ایک گاؤں سنیٹ ترشیبا میں بھیج دیا گیا ہے۔

بجلی کے جھٹکے سے آنکھیں آرپار دیکھنے لگیں

ماسکو میں ایک کرین ڈرائیور خاتون کو ۳۸۰ وولٹ بجلی کا جھٹکا لگ جانے کے بعد مردہ قرار دے دیا گیا تھا۔ مگر وہ نہ صرف دوبارہ جی اٹھی بلکہ اس کی آنکھوں میں ایکس رے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ اب وہ چند سیکنڈ میں امراض کا پتہ لگا لیتی ہے۔

بجلی کے حادثے کے بعد ۳۷ سالہ جولیا نوربیف کو مردہ گھر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہاں دو دن بعد ایک ڈاکٹر اپنے شاگردوں کے ساتھ اس کے پوسٹ مارٹم کے لئے آیا۔ جیسے ہی آپریشن شروع ہوا جولیا کے جسم سے خون بہنے لگا اور لاش حرکت کرنے لگی۔ چھ مہینے کے علاج کے بعد جولیا ٹھیک ہوگئی۔ ایک دن جب وہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی تو اچانک اس نے محسوس کیا کہ اسے ایک عورت کے جسم کا اندرونی حصہ اس طرح نظر آرہا ہے جیسے ٹیلی ویژن اسکرین پر تصویر نظر آتی ہے۔ پھر جولیا کو سورج کی الٹرا وائلٹ شعاعیں زمین کے اندر کے گڑھے اور بے شمار دیگر ڈھکی چھپی چیزیں نظر آنے لگیں۔

جولیا نوربیف کو آج بھی شدید درد کی شکایت ہے لیکن وہ آنے والے طوفان کی پیش گوئی کرسکتی ہے۔ آج کل وہ اپنی اس صلاحیت سے ان بیماریوں کی تشخیص میں مدد کر رہی ہے جنہیں ڈاکٹر مشکل قرار دے دیتے ہیں، مثلاً تلی اور دیگر اندرونی اعضا کی بیماریاں۔
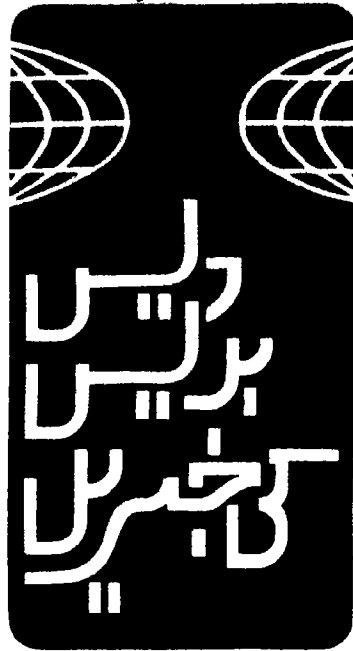
مینڈکوں کا ہار

کوچین میں حال ہی میں کچھ لوگوں نے ایک عجیب قسم کا احتجاجی جلوس نکالا۔ مظاہرین نے اپنے گلے میں پھولوں کا نہیں بلکہ مینڈکوں کا ہار پہن رکھا تھا۔ ان کی مانگ تھی کہ حکومت مینڈکوں کے پیروں کی برآمد پر سے پابندی ہٹائے۔ مینڈکوں کے پکڑنے کو ماہی گیری کے پیشے میں شمار کیا جائے اور اس کے لئے لائسنس لینے کی شرط ہٹا دی جائے۔

ہندوستان میں ایک کروڑ کم سن دلہنیں موجود ہیں۔

ہمارے ملک میں ۱۵ سال سے کم عمر کی شادی شدہ لڑکیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ اس بات کا انکشاف فیملی ویلفیئر فاؤنڈیشن کی ایک رپورٹ میں کیا گیا ہے۔

لڑکوں، لڑکیوں کی شادی سے متعلق مرکز کے قانون کو بنے ہوئے دس سال ہوگئے ہیں، لیکن آج بھی نابالغ لڑکوں، لڑکیوں کی شادی کا رواج عام ہے۔ قانون کے مطابق لڑکے کی عمر شادی کے لئے کم از کم ۲۱ سال اور لڑکیوں کی عمر ۱۸ سال ہونی چاہئے۔ مناسب تعلیم و تربیت سے لڑکوں، لڑکیوں کی شادی کی عمر میں اضافہ تو ہوا ہے مگر کم عمری کی شادی کا چلن ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔

۱۹۸۱ میں دیہی علاقوں میں مڈل تک تعلیم پانے والی لڑکیوں کی شادی کے وقت اوسط عمر ۱۱ر۱۶ سال تھی، جب کہ مڈل سے اوپر اور میٹرک تک کی تعلیم پانے والی لڑکیوں کی اوسط عمر شادی کے وقت ۱۹ر۲ سال تھی۔ دوسری طرف شہری علاقوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی شادی کے وقت اوسط عمر ۱۷ر۲ اور ۱۹ر۷ سال تھی۔ گریجویٹ لڑکیوں کی شادی کے وقت شہر اور دیہات میں اوسط عمر ۲۱ سال تھی۔

کیرل میں اڑنے والی گلہریاں

اڑنے والی گلہریوں کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ یا تو ان کی نسل ختم ہوگئی ہے یا آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ لیکن کیرل میں ایک مقام ٹراون کور پر ہوا سے باتیں کرنے والی یہ گلہری ابھی تک موجود ہے۔ زولوجیکل سروے آف انڈیا کے ایک ماہر اسے پکڑ کر لائے ہیں اور اسے عجائب گھر میں رکھ دیا ہے۔

اس نسل کی گلہری کو سب سے پہلے ایک مشہور ماہر حیوانات بارڈیلون نے ڈھونڈا تھا۔ یہ ۱۸۸۷ سے بھی پہلے کی بات ہے، ان دنوں انگریز بارڈیلون کیرل میں چائے کی کھیتی کرتے تھے۔ اور انہوں نے وہاں اس جانور کو دیکھا تھا۔

چھوٹی نسل کی یہ گلہریاں صرف کیرل میں پائی جاتی ہیں۔ یہ گلہریاں پیڑ کی اونچی چوٹی سے

نیچے تک اڑتی ہیں۔ اڑان بھرتے وقت اپنے جسم کے اعضاء کو یہ پلاسٹک کی طرح پھیلا دیتی ہیں۔

لینن کی گھڑی کی نیلامی

جرمنی کے ایک شہر میونخ میں لینن کی ایک گھڑی ایک لاکھ تین ہزار ڈالر میں نیلام ہوئی۔ ۱۹۱۸ میں لینن نے اسے آخری بار پہنا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۸ میں اس نے ایک جرمن کمیونسٹ لیڈر کارل سینٹ کو تحفے کے طور پر یہ گھڑی دے دی تھی۔ لینن نے اس گھڑی پر ہتھوڑے اور درانتی کا نشان نقش کرایا تھا یہ گھڑی پرانی اشیاء فروخت کرنے والے ایک تاجر کے پاس پہنچی۔ نیلام میں پہلی بولی ۳۲۰۰ ڈالر کی تھی۔

نیلام میں ۱۹۱۸ اور ۱۹۱۹ سے پہلے کے جرمن کمیونسٹ پارٹی کے ۵ خطوط بھی ۲۴۰۰ ڈالر میں نیلام ہوئے۔

مصنوعی جسم میں دل اچھی حالت میں رکھے جاتے ہیں

ایک برطانوی سائنس داں نے ایسا مصنوعی جسم تیار کیا ہے جس میں دل اور دوسرے اندرونی اعضاء کو بالکل صحیح حالت میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔

اس ایجاد سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ جسم کا کوئی بھی عضو اس جسم میں حفاظت سے رکھ دیا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے کسی کے بھی جسم منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اب جسم کے کسی عضو کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے برف میں رکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دل اور دوسرے تمام اندرونی اعضاء ہر وقت اس مصنوعی جسم میں فٹ رہتے ہیں اور اپنا کام صحیح طریقے سے کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر انہیں اس مصنوعی جسم سے علیحدہ کر کے ایک مرتے ہوئے آدمی کی جان بچائی جا سکتی ہے۔

آم پر اللہ کا نام

مہاراشٹر کے شہر بھیونڈی کے رہنے والے ایک خاندان کے رکن ستیہ صدف عبدالواحد کو مہابلیشور میں چھٹیاں گزارنے کے دوران میں آم کھانے پر حیرت اور مسرت کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ آم کی قاشوں پر "اللہ" تحریر تھا۔ یہ دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں فرطِ عقیدت سے نم ہو گئیں۔ اس خبر کے عام ہوتے ہی لوگ اس آم کو دیکھنے کے لئے امڈ پڑے۔

حجاج کی رہنمائی کرنے والے الیکٹرونک معلم ایجاد

حجاج کرام کی سہولت کے لئے جاپان کی ایک کمپنی نے ایک الیکٹرونک آلہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے حجاج کسی معلم کی مدد کے بغیر صحیح طریقے سے حج ادا کر سکتے ہیں۔ اس آلے کو معلم کا نام دیا گیا ہے۔ یہ آلہ حاجی کی رہنمائی کرتا ہے کہ اسے کون سی دعا کب، کس مقام پر اور کس طرح پڑھنی ہے۔ اس الیکٹرونک یونٹ میں کیسٹ پلیئر، ریکارڈر بیٹری اور دوسری چیزیں شامل ہیں۔ یہ آلہ حاجی کو حج کے مختلف مراحل، عمرے، مسجد نبویؐ اور مدینہ منورہ کی دوسری زیارتوں اور مزارات پر پڑھی جانے والی تمام دعائیں حسبِ ضرورت اس طرح سنائے گا کہ حاجی اس کو سن کر بآسانی دوہرا سکے اور اگر کسی وجہ سے کوئی حاجی کوئی کلمہ یا دعا دوبارہ سننا چاہے تو بٹن دبا کر دوبارہ وہی دعا یا کلمہ سن سکتا ہے۔ اس آلے کے ساتھ ایک ہلکی سی خوب صورت پیٹی بھی ہے جسے حاجی احرام کے اوپر اپنی کمر سے باندھ سکتا ہے۔ پیٹی کے ایک طرف حاجی اپنا پاسپورٹ نقد رقم اور دوسری دستاویزات رکھ سکتا ہے اور دوسری جانب الیکٹرونک آلہ معلم رکھا جاتا ہے۔ معلم کی کیسٹ اردو انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی، بنگلہ ترکی، انڈونیشی ملائیشی اور تھائی زبانوں میں تیار کی گئی ہے۔

سابقہ مجرموں کو بینک کی طرف سے قرضہ

شہری کاکولام نام کے ایک ضلع کو آج کل اس لئے فوقیت ملی کہ وہاں آندھرا بینک کے ذریعہ سابقہ مجرموں کو اونچا اٹھانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔

۱۰۳ آدمیوں کے منتخب گروپ کو جن کو موت کی سزا دی گئی تھی کسی نہ کسی وجہ سے وہ بچ گئے۔ بینک سے ۳ لاکھ روپے کا قرضہ عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ اس پیسے سے کوئی کاروبار کر کے اپنی زندگی کو گزارنے کے لئے سمت کا تعین کر سکیں۔ یہ قرضہ آندھرا پردیش کی گورنر مسز کمد بین جوشی نے سب کو برابر تقسیم کیا۔

○○

فراک کے نئے ڈیزائن

فراک کی باقاعدہ پیمائش دی گئی ہے۔ اس سے آپ کو ہر عمر کے بچوں کی پیمائش کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا

سامنے چھ سال کی دو بچیاں ہیں۔ ایک بچی نیلے رنگ کے چیک کا فراک پہنے بیٹھی ہے۔ اس پر بڑا کالر لگایا ہوا ہے۔ کمر میں پیٹی ہے جس کی بو سامنے بندھی ہے۔ آستین اور کالر دونوں پر سفید رنگ کی کنگری لگائی گئی ہے۔ نیچے سے چوڑا ہیم کیا ہوا ہے۔

دوسری بچی

گلابی رنگ کا پرنٹڈ فراک پہنے ہے۔ اس پر سُرخ اور سبز رنگ کے ربن کی لائنیں اگلی باڈی اور آستین پر لگائی ہوئی ہیں۔

فراک سینے سے پیشتر آپ اگلے حصے میں ربن کی لائنیں لگائیں۔ دونوں طرف سبز اور درمیان میں گلابی رنگ لگاکر ایک پٹی بنائی گئی ہے۔ اِس طرح کی تین پٹیاں برابر برابر فاصلے پر لگی ہوئی ہیں۔ آستین پر صرف ایک پٹی لگی ہوئی ہے اور سبز رنگ کے ربن سے بو بندھی ہوئی ہے۔

سامنے بھی سبز ہی رنگ کے ربن سے بو باندھی گئی ہے۔

پہلا انعام: درست حل پر: ۱۰ گرام سونا (۲۲ کیرٹ، زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر: **آٹھ ہزار روپے**

Rs 20,000.00

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں، ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ ۲۹- اگست ۱۹۸۰ء، آٹھ بجے رات تک۔ پیر ۳۱- اگست ۱۹۸۰ء تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لیے جائیں گے۔

شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱

■	■	س		ا		ب
■	■		س			س
	تھ	■	ے	ن	ٹ	ا
	س		■	ی	و	
	و	ط	خ	■	ن	س
س	ا			ب	■	ی
	ا		ت	ع	ا	■

اشارے:

اوپر سے نیچے:

۱- عالمی سیاست میں ــــ کے اصول نہیں چلتے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس

۲- لیکن ــــ کی جا و بیجا حمایت کرنے سے وہ بگڑ بھی سکتے ہیں۔ ہمیشہ

۳- صاحبزادے، ــــ دولت لٹا کر کاروبار کا تجربہ حاصل کرنا حماقت ہے

۴- ایک فوجی سپاہی کو دیکھو، ــــ سوچنے اور سمجھنے کی بجائے حکم کی فوری تعمیل کی تربیت دی جاتی ہے

۵- آئینہ دیکھ، اپنا ــــ منہ لے کے رہ گئے

دائیں سے بائیں:

۶- صاحب کو دل نہ دینے پہ، کتنا غرور ــــ

۷- یہ فلم ایکٹریسیں اداکاری سے زیادہ اپنے ــــ اور بے باکی کے سہارے مقبولیت حاصل کرنا چاہتی ہیں

۸- سرکاری ــــ کی زبان ذاتی خط و کتابت کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح

۹- یہ کیسے ممکن ہے کہ بستی کا ہر شخص ــــ ہو؟ آخر کوئی نہ کوئی تو

۱۰- میں خود تمہارے اس ــــ کو غلط نہیں سمجھتا لیکن آج کی دنیا میں ●●

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱ کا صحیح حل بدھ: ۲- ستمبر ۱۹۸۰ء، کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کیے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات: شمع (نئی دہلی) میں بھی شائع کی جاتی ہیں

بتیس ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام: بالکل درست حل پر

۱۰ گرام سونا

(۲۲ کیرٹ، زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر:

آٹھ ہزار روپے

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف

★ ایک روپیہ

★ صرف دس اشارے انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لیے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کیے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوایئے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

BANO New Delhi 40th Year of Publication ISSUE NO. 485 Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R N. No. 741/57 Regd. No. D-(C) 120

بانو
کی تعریف کرکے اُن کا کردار بنائیے
خاندان اور جدید عورت
کیول دھیر کی
رحمٰن سے بات چیت

جب زُلف تری لہرائی
مجھے ٹریٹ کی یاد آئی
جدید تکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی ... استعمال میں ہے۔
ٹریٹ آملہ شکاکائی ہیئر آئل اور ٹریٹ ... ہیئر سوپ، آملہ، شکاکائی، مہندی اور
دیگر جڑی بوٹیوں سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ جڑی ... بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور
کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں ... مشہور ہیں۔
جی وی انٹرنیشنل پوسٹ بکس ۷۱۸۶، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

انسان کو اپنی زبان پر قدرت حاصل ہونا چاہئے، کیوں کہ دوسری صورت میں اس کا بنایا ہوا جال انسان کو اپنے اندر قید کر کے اسے سزا کے مرحلے تک پہنچا دیتا ہے۔ زبان پر قدرت ہو تو یہ جال کٹ جاتا ہے اور قلب مضبوط رہتا ہے۔ ہر انسان کے الفاظ اس کی ذمہ داری کی نسبت سے ہونے چاہئیں۔ الفاظ کو موہنہ سے باہر نکالنے سے پہلے ان پر غور کرنا چاہئے۔ جو لوگ بغیر سوچے سمجھے بولتے ہیں، ایک نہ ایک دن مشکل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اپنی زبان کے ذریعہ حسد اور کینہ کے بیج بولنے سے اللہ کی محبت کے بیج جل کر خاک ہو جاتے ہیں اور مقام شکر انسان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کی محبت سے دُور ہو جاتا ہے۔

اپنے سے کم تر کو آنکھ کا خوف اور زبان کی طاقت نہیں دکھانا چاہئے، ورنہ کہیں اللہ کے جلال کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ ہر ایک سے شفقت اور نرمی سے پیش آنا چاہئے۔ ہم سب کو ہر وقت صرف اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے۔ دوسروں کی بات غور سے سُن کر اور اچھی طرح سمجھ کر ہی فیصلہ کرنا چاہئے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ اپنی ہی ہلاکت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔

سعدیہ دہلوی

نئی دہلی

ستمبر ۱۹۸۷

اشاعت کا چالیسواں سال، ۴۸۶ واں شمارہ

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارہ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سال بھر کی قیمت: ۵۳ روپے (اس میں سالنامہ کا رجسٹری خرچ شامل ہے)

مقام اشاعت صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی NEW DELHI
ٹیلکس: (031) 61601 SHMA IN
ٹیلی فون: 732668 732667 732666
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزین
طابع وناشر: محمد یونس دہلوی

مطبوعہ: شمع پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲

کہی سنی

محترمہ سعدیہ صاحبہ :

جون کے مہینے میں بانو کا کافی انتظار رہا۔ خدا خدا کر کے جولائی کے ابتدائی ہفتے میں بانو نظر آیا، جو غالباً جون اور جولائی کا مشترکہ شمارہ ہے۔ کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اس سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ قارئین نے بانو کے لئے جو انتظار کی زحمت اٹھائی اس کا پھل نہایت خوبصورت ٹائیٹل کے روپ میں انہیں مل گیا ہے

اس شمارہ میں پروفیسر عبداللہ مہدی کا مزاحیہ مضمون بہت پسند آیا۔ لداخ کی پہلی گریجویٹ خاتون انگمو شا نیہ سے آپ کا انٹرویو کافی دلچسپ رہا۔ مجھے ریڈیو پروگراموں اور ریڈیو کی شخصیتوں سے دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے میں نے ان کا انٹرویو بڑے اشتیاق سے پڑھا۔ لیکن انگمو صاحبہ نے ریڈیو پروڈیوسر ہونے کے باوجود اپنے پیشے اور ریڈیو پروگراموں کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔

"ذہنی ورزش" اور "خیال اپنا اپنا" کالم آپ کب سے شروع کر رہی ہیں ؟

متین صدیقی، حیدرآباد

● دلّی میں مسلسل کرفیو کی وجہ سے ہمیں جون، جولائی کا ایک ہی شمارہ کرنا پڑا۔ اس مجبوری کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

(مدیرہ)

پیاری سعدیہ :

سالنامہ ملتے ہی خط لکھنا چاہ رہی تھی۔ نوبت آج آرہی ہے۔ سالنامہ ابھی پورا نہیں پڑھا ہے، مگر جتنا بھی پڑھا ہے اور دیکھا ہے، اس سے تمہاری محنت کا اندازہ ضرور ہوا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہنا چاہ رہی ہوں کہ آپ سے پہلے بانو کی ہر دل عزیزی کچھ کم تھی، مگر یہ طے ہے کہ جب سے آپ نے اسے سنبھالا ہے، اس کا روپ ضرور کچھ بدلا ہے۔ اب اس میں نیا پن ہے، تازگی ہے۔ یہ ایسا رسالہ ہے جسے پڑھ کر خوشی ہوتی ہے اوّل تو اردو میں عورتوں کے لئے رسالے ہی بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بانو کے ٹکر کے نہیں ہیں۔ جب آپ بانو کو اس مقام پر لے ہی آئی ہیں تو اسے خوب سے خوب تر بنانے کی ذمہ داری بھی آپ کی ہے اور چونکہ ہمارے ملک میں کچھ زیادہ ہی جمہوریت کا زور ہے، اس لئے ہم بھی جو دل چاہے، کسی کو بھی، کچھ بھی کہہ سکتے ہیں لہٰذا بانو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ پہلے کچھ خوبیاں —

سب سے اچھا تو آپ کا اداریہ ہوتا ہے۔ پڑھ کر کبھی کبھی آپ پر بہت پیار آتا ہے۔ بڑی اچھی اچھی باتیں آتی ہیں آپ کو۔ آپ کی تحریر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

کہانیاں اچھی ہوتی ہیں نظمیں عموماً پسند آتی ہیں۔ لطیفوں اور پسندیدہ اشعار کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ "ان سے ملئے" کے تحت ملاقات بھی اچھی لگتی ہے کھانا پکانے کی ترکیبیں، حالانکہ کبھی آزمائی تو نہیں ہیں، مگر شاید کبھی کام آجائیں غرض یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں۔

جو چیز سب سے زیادہ کھلتی ہے اور جسے بانو میں دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے، وہ ہیں رشتے کے اشتہار۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اشتہار کسی کے کام آئیں، مگر اشتہار جب کسی لڑکے کے لئے لڑکی ڈھونڈنے کے بارے میں ہوتا ہے تو بہت لڑکے کے ماں باپ کو خوبصورت، پڑھی لکھی، گوری چٹی، نماز روزے کی پابند، شرمیلی شریف خاندان کی ہی لڑکی درکار ہوتی ہے۔ سانولی اور معمولی شکل و صورت کی لڑکیاں بلا سے گھر بیٹھی رہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم گھر بار کے ہو لئے، ورنہ آج کل کے زمانے میں ہماری شکل و صورت اور خاص طور پر خصلت کی لڑکی کی شادی تو ممکن ہی نہیں تھی !

دوسری بات یہ ہے کہ بانو عموماً مسلمان عورتیں پڑھتی ہیں۔ ان میں سماجی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ کتنی مسلمان عورتیں ہیں جو گھر سے باہر آکر کام کرنا چاہتی ہیں، مگر ان کو موقع نہیں ملتا۔ بہت سے گھروں میں آج بھی عورت مرد سے دب کر رہتی ہے۔ کوئی کام کرنے سے پہلے، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اپنے "اُن" کا حکم سننا چاہتی ہے۔ اگر مرد دیکھتا ہے کہ عورت کے باہر جانے، اس کے کام کرنے سے اس کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچے گی تو وہ اس کو اجازت دے گا، ورنہ نہیں۔ دراصل مردوں کو عورتوں سے ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ وہ ان سے بہتر کارکردگی کی اہل ہیں اور یہی خوف ان کو عورتوں پر اپنی برتری جتانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس رویّہ کو بدلنا ہوگا۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ بانو کے لئے کچھ لکھوں — مگر یہ سوچ کر رہ جاتی ہوں کہ اگر لکھا بھی تو کہیں سارے مرد میرے

خلاف مورچہ نہ جمالیں۔ حالانکہ میں مردوں کے خلاف کچھ نہیں لکھوں گی، مگر عورتوں کے لئے لکھنا ہی مردوں کے خلاف جاتا ہے ہماری پھوپھی (عصمت چغتائی) تو خود ہی اس کے لئے بدنام ہیں۔

نجمی، نئی دہلی

● رشتے کے اشتہاروں میں خوب صورتی کے لئے ناروا ترجیح کی بات اٹھا کر آپ نے سماج کی ایک دکھتی رگ کو چھیڑا ہے۔ کیوں نہ اس رویّے کے خلاف تحریری مہم کی شروعات آپ خود کریں۔

(مدیرہ)

محترمہ:

سال نامہ نظر نواز ہوا۔ سابقہ روایات سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ آپ کی ادارت نے تو بانو کو بالکل نیا رنگ و روپ عطا کیا ہے۔ معیاری اردو ماہ ناموں کی بڑی کمی ہے خصوصاً خواتین کے لئے تو بالکل ہیں ہی نہیں سوائے "بانو" کے سوا۔

جہیز اور شادی بیاہ کی رسوم وغیرہ موضوعات پر لکھنے کے ساتھ میں بچّوں کے لئے بھی لکھتا ہوں۔ بانو کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے علاقوں کی شادی بیاہ کی دل چسپ رسوم اور بچّوں کی کہانیاں مجھے لکھ بھیجیں۔ ممنون ہوں گا

ابرار محسن، پوسٹ بکس ۱۳۲ بریلی

● سال نامہ کی کام یابی میں آپ کا تعاون بھی شامل ہے۔ شکریہ۔ (مدیرہ)

سعدیہ صاحبہ: مبارک ہو!

آپ کی "امن پد یاترا" کا حال پڑھ کر دل کو خوشی بھی ہوئی ٹھیس بھی لگی۔ جمہوری اور گاندھیائی طرز آج ایک فرسودگی اور خام خیالی ہے۔ اس نئی تہذیب اور گم راہ کن دور میں کون کسی کا ہے؟ افسوس کہ آج بھی لوگ وطن پرستی اور جدت پرستی کے نام پر حق و انصاف کا خون کرتے ہیں۔ مظلوموں اور معصوموں کے خون سے پی۔ اے۔ سی والے ہولی کھیلتے ہیں! افسوس کہ آپ نے پی۔ اے۔ سی کے ظلم و ستم کے خلاف ایک حرف بھی لکھنے سے احتراز کیا ہے کیوں؟ جب کہ آپ نے بھوپال میں گیس سے ہلاک ہونے والوں کی روح فرسا تصاویر پیش کر کے اپنے صحافتی فرائض بڑی خوبی و بے باکی سے انجام دئے تھے۔ لیکن اس مرتبہ آپ قتل و غارت گری کی تصاویر پیش نہ کر کے صرف "امن" کا پیغام دے رہی ہیں! بھلا نقار خانے میں طوطے کی آواز کون سنتا ہے؟

(کچھ قارئین بانو)

● بانو، میں مضمون "امن پد یاترا" کے بارے میں تھا۔ میرٹھ کے سانحہ کے بارے میں تو اخباروں میں بھی بہت کچھ چھپ چکا ہے۔ ایسے وحشت خیز حالات میں امن کا پیغام دینا ہم سب کا فرض ہے۔ (مدیرہ)

بہن سعدیہ:

کانگریس (آئی) کے اقلیتی شعبے کے جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالنے پر دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ کاش آپ اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے موثر آواز بلند کر سکیں۔

اپریل کا شمارہ نظر سے گزرا۔ سرور جہاں کی کہانی "تیرا گھر" پسند آئی "گونگے آئینے" بھی بہت اچھی لگی۔ فریدہ جیسے نوجوان اگر اس سماج میں، خاص طور سے مسلم سماج میں پیدا ہونے لگیں تو کیا کہنے۔ خدا کرے کہ مسلم لڑکوں پر یہ کہانی کچھ اثر کر جائے۔ نظموں میں رئیس الدین رئیس کی آزاد نظم بہت اچھی تھی۔ آسان سہل الفاظ میں "اللّٰھم لبیک" نے دل پر اثر کیا۔

میرا بھی دل چاہتا ہے کہ کچھ بانو کے لئے لکھوں۔ بانو یہاں دستیاب نہیں ہوتا۔ میری بہن مجھے ڈاک سے روانہ کرتی ہیں، کیوں کہ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔

صبیحہ موسوی، ایبرڈین (اسکاٹ لینڈ)

● ہمیں خوشی ہے کہ بانو کی کشش اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ بانو کے لئے شوق سے لکھیں۔ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

سال نامہ نظر نواز ہوا۔ بے انتہا پسند آیا کتابت، طباعت خوش نما اور دل فریب ہیں۔ مضامین کہانیاں اور نظمیں بہترین، معیاری اور پسندیدہ ہیں اس اردو کش دور میں سال نامہ نکالنا ایک بہت ہی کٹھن مرحلہ ہے۔ آپ کی ہمت اور لگن دیکھ کر رشک آتا ہے۔ آپ واقعی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ میری نیک خواہشات اور پُر خلوص تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے "بانو" تا حشر آسمانِ ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح جگمگاتا رہے۔ اور ہم جیسے ہزاروں قارئین کو جو تشنۂ ادب ہیں، اپنی کرنوں سے سیراب کرتا رہے۔

محسن یا محسن حسرت، کلکتہ ۲۳

● آپ ایسے کرم فرماؤں کا عملی تعاون ضرور بانو کو اس بلندی تک پہنچائے گا جہاں آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

(مدیرہ)

باجی صاحبہ:

میں بانو کا بڑے شوق اور لگن سے مطالعہ کرتی آ رہی ہوں۔ اس ماہ کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ مجھے اپنے پیارے رسالے بانو کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے اس میں شائع ہونے والے تمام افسانے نظمیں لطیفے وغیرہ قابلِ تعریف ہیں۔ ڈے کے مطہرہ تبسم، آمبور)

● بانو آپ کو پسند ہے تو اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کو بھی اس کے مطالعہ کی ترغیب دلائیں۔ (مدیرہ)

سعدیہ زیدی:

سال نامہ ملا۔ ایک ہی نشست میں ختم کر دیا۔ سال نامہ شروع سے آخر تک لاجواب ہے۔ آپ کو اور تمام قلم کاروں کو میری جانب سے مبارک باد۔

الطاف احمد سہیل، ویلور

● یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سال نامہ آپ کو پسند آیا مگر آپ نے اپنی رائے کے اظہار میں ذرا کنجوسی سے کام لیا ہے آپ کے مفصل خط کا انتظار تھا۔ (مدیرہ)

مشترکہ خاندان اور جدید عورت

شادی کے بعد ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو۔ لیکن کبھی کبھی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی اسے اپنے سسرال میں رہنا پڑتا ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے سسرال میں رہنا ایک عام بات تھی آمدنی کے ذرائع کم تھے۔ مکانوں کے کرائے کم تھے سب سے بڑھ کر یہ عورت معاشی طور پر مرد کی محتاج تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے عورت ڈاکٹر، ٹیچر اور سوشل ورکر بن گئی ہے تعلیم یافتہ عورت گھر میں مرد کی محتاج بن کر بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی تعلیم کو بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ خاوند کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر اسے مشترکہ خاندان میں رہنا پڑے تو اسے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مشترکہ خاندان میں چولہا بھی مشترکہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہر انسان کی پسند کا خیال نہیں رکھا جا سکتا۔ آپ کی ساس کو کریلے پسند ہیں اور آپ کا منہ کریلوں کا نام سن کر ہی کڑوا ہو جاتا ہے۔ آپ کو بھنڈی پسند ہے، لیکن آپ کے خسر بھنڈی کے نام سے چڑتے ہیں۔ اگر گھر میں نند، دیور، دیورانی اور جیٹھانی بھی ہیں تو آپ کا من پسند کھانا پک چکا۔

اگر آپ کے خاوند گھر کے بجٹ میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں تو یہ مرحلہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ ناپسند چیزوں کو نظر انداز کر کے ایسی چیزوں کی فہرست بنائی جائے جو کم از کم دو خاندانوں میں مشترک ہوں۔ ہفتے میں چار دن یہی چیزیں پکائی جائیں۔ دو دن اپنی اپنی پسند کی چیز پکائی جائے۔ اس چیز کو ناپسند کرنے والے باہر کھائیں یا باہر سے کھانا منگالیں۔ ایک روز ایسا رکھیں جس میں کسی کی پسند کا کھانا نہ بنے، بلکہ کھانے میں کوئی نیا تجربہ کیا جائے۔

مشترکہ خاندان جتنا بڑا ہوگا، مسئلے بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ اگر آپ ایسے خاندان میں رہتی ہیں جہاں دیورانیاں اور ان کے بچے بھی ہیں تو آپ کے لئے یہ مسئلہ خاصا صبر آزما ہو سکتا ہے۔ بچے قدرتی طور پر آپس میں لڑتے ہیں۔ ہر ماں قدرتی طور پر اپنے بچے کی طرف داری کرتی ہے، خواہ قصور اپنے بچے کا ہی ہو۔ اس طرح جھگڑے کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ بچے کی شکایت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بچوں کے جھگڑوں میں بڑے کیوں دخل دیں؟ بچے آج لڑیں گے کل پھر مل جائیں گے لیکن بڑوں کے دل میں کدورت بیٹھ جائے تو مشکل سے نہیں نکلتی ہے۔ بچے کل کی بات بھول جاتے ہیں، لیکن بڑوں کا حافظہ اس معاملے میں قوی ہوتا ہے۔

ان جھگڑوں کا دوسرا حل یہ ہے کہ آپ جیٹھانی کے بچے کو اپنا بیٹا بنا لیں ہمیشہ اس کی حمایت لیں۔ اس طرح آپ جیٹھانی کے دل کو موہ لیں گی۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر گزرتا ہے۔ عورت کا پیار حاصل کرنا ہو تو اس کے بچے کو پیار کرو۔ اس مقولے پر عمل کر کے آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ آپ کی جیٹھانی آپ کے بچے کو اپنا بیٹا بنا لے۔ اس طرح آپ ایک دوسرے کے بچے کی حمایت کریں گی اور جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

بانو تمنا دہلی

مشترکہ خاندان میں رہنے کے کئی فائدے ہیں جب آپ کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ بھرے پُرے گھر میں ہر وقت رونق رہتی ہے۔ آپ گھر میں اکیلی ہیں۔ خاوند دفتر میں ہیں اور بچے اسکول میں۔ آپ نے گھر کا کام ختم کر لیا۔ اب کیا کریں؟ ناول پڑھیں تو ناول بھی لگاتار پڑھنا مشکل ہے۔ زیادہ سونے سے بھی طبیعت سُست ہو جاتی ہے۔ آپ پڑوس کے گھر میں چلی جاتی ہیں لیکن پڑوسن کے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ یا ان کے خاوند گھر پر موجود ہیں۔ آپ مایوس ہو کر گھر واپس آجاتی ہیں اس وقت اگر کوئی مہمان آجائے تو آپ خوشی سے کھِل اُٹھتی ہیں۔ مشترکہ خاندان میں ایسا وقت کبھی نہیں آتا۔ یہاں انسانوں کا قحط کبھی نہیں پڑتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشترکہ خاندان میں آپ کو نوکر رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خاص طور پر چوکیدار یا بچوں کی آیا کی قطعی ضرورت نہیں۔ رات کو کھٹکا ہو تو بھی آپ بے کھٹکے سوتی ہیں۔ خسر بوڑھے آدمی ہیں کھانسی کے مریض ہیں۔ بڑھاپے میں یوں بھی نیند کم ہی آتی ہے۔ رات کو کھٹکا ہو تو وہ فوراً کھنکارتے ہیں اور آپ کے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

آپ کو سینما جانا ہے یا کسی تقریب میں شرکت کرنا ہے تو نوکر پر گھر چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ نوکر نہ ہو تو گھر میں تالا لگا کر جانا پڑتا ہے۔ اس طرح چوری کا اندیشہ رہتا ہے چور مقفل گھروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مشترکہ خاندان میں یہ اندیشہ نہیں رہتا۔ آپ مزے سے تقریب میں شرکت کر سکتی ہیں رات کو گھر دیر سے آسکتی ہیں۔

ایک عورت کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی دیکھ بھال ہے۔ یہ کام پورا وقت طلب کرتا ہے۔ بچوں کو نہلانا دھلانا ان کے کپڑوں کا خیال رکھنا، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔ سارا وقت ان پروردہان دھندے میں نکل جاتا ہے۔ بچوں کو اکیلا چھوڑ کر باہر جانا ناممکن ہے۔ آپ نے اکثر سینما ہال میں دیکھا ہوگا کہ ماں باپ بچے کو گود میں لئے بیٹھے ہیں کہ اس نے رونا شروع کر دیا۔ یہ وقت بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ بار بار آپ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں۔ آپ اپنے شوہر سے کہتی ہیں کہ وہ بچے کو ہال سے باہر لے جائے اور بہلا کر واپس لے آئے۔ بیچارہ شوہر بچے کو لے کر باہر جاتا ہے اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ کی پکچر کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ مشترکہ خاندان میں اس کی نوبت نہیں آتی۔ چھوٹا بچہ سب کی آنکھوں کا تارہ ہوتا ہے خصوصاً آپ کے ساس اور خسر پوتے پر جان چھڑکتے ہیں اس طرح آپ کا کام ہلکا ہو جاتا ہے۔ دادی بچے کو کہانیاں سناتی ہیں، اپنے بستر پر سلاتی ہیں۔ آپ خوابِ خرگوش کے مزے لیتی ہیں۔ خسر اگر تعلیم یافتہ ہوں تو بچے کے لئے ٹیوشن رکھنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ بچے کو استاد کی محبت اور باپ کی شفقت دونوں مل جاتی ہیں۔ آپ کو باہر جانا ہو تو بے کھٹکے جا سکتی ہیں بچے کو دادا دادی کے پاس چھوڑ سکتی ہیں۔

اکیلے رہنے میں عورت کو مکمل آزادی میسر ہوتی ہے لیکن اسے اس آزادی کی قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔ دُکھ بیماری میں اکیلے ہی تکلیف کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر سر میں درد ہے تو سر میں پٹی باندھ کر سو جائیے۔ کوئی آپ کا حال نہیں پوچھتا مریض کے پاس بیٹھنے اور اس کا حال چال پوچھنے سے اس کا آدھا علاج ہو جاتا ہے یہ بات اکیلے رہنے میں میسر نہیں۔ مشترکہ خاندان میں آپ کی تکلیف کی خبر آناً فاناً میں پھیل جاتی ہے۔ شرماشرمی ہی سہی، سب لوگ آپ کا حال پوچھنے آتے ہیں۔ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ اکیلی نہیں ہیں۔ آپ پر زکام کا حملہ ہو تو ساس جوشاندہ بنا کر آپ کو پلاتی ہیں۔ سر میں درد ہو تو چھوٹی نند آپ کے سر پر بام ملتی ہیں۔ آپ کو نہ کرائے کی نرس کی ضرورت پڑتی ہے، نہ بار بار ڈاکٹر کو بلانے کی۔

مشترکہ خاندان میں لوگوں کے اُٹھنے بیٹھنے کے اوقات مختلف ہوتے ہیں۔ پھر فرصت کے اوقات گزارنے کے مشاغل الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ کی جٹھانی کو دیر سے اُٹھنے کی عادت ہے۔ آپ سویرے اُٹھتی ہیں اس طرح ناشتہ بنانے کا کام آپ کے ذمہ ہو جاتا ہے۔ صبح سویرے دیور ریڈیو بہت تیز آواز سے سنتے ہیں۔ آپ کو صبح اخبار پڑھنے کی عادت ہے۔ گانوں کی تیز آواز آپ کو اخبار پڑھنے نہیں دیتی اس کا علاج یہ ہے کہ آپ بازار سے ہیڈ فون کے پیڈ خرید لیں۔ آج کل نوجوان لڑکے کانوں میں "واک مین" کے پیڈ لگائے پھرتے ہیں۔ دنیا میں کچھ بھی ہو رہا ہے، انہیں اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ وہ مزے سے موسیقی سنتے رہتے ہیں۔ آپ بھی کانوں کے پیڈ خرید لیں اور مزے سے اخبار پڑھیں۔

مشترکہ خاندان میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کا احساس عام طور پر نہیں ہوتا۔ جو چیز بن مانگے مل جائے اس کی قدر نہیں ہوتی آپ کا کام تقسیم ہو جاتا ہے آپ کے ہاتھ بٹانے والے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اگر گھر میں کوئی بوڑھی خالہ یا پھوپھی ہوتی ہے تو وہ بھی گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہے اس وقت ان عورتوں کا خیال کیجئے جنہیں برتن بھانڈے سے لے کر کپڑے لتے تک سب چیزوں کا خیال خود کرنا پڑتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ مشترکہ خاندان میں فرصت کے اوقات کبھی بور نہیں کرتے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو فرصت ملتی ہی نہیں۔

بغیر عنوان کے

سیف الرحمٰن عباد

اپنی تخلیق کو دنیا میں لاتے وقت عورت بھی اپنے حقیقی خالق سے بہت قریب ہو جاتی ہے، وہ ایک ایسے پل صراط سے گزرتی ہے جس کے ایک طرف زندگی ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتی ہے اور دوسری طرف موت۔ بیشتر حالات میں جیت زندگی کی ہی ہوتی ہے، لیکن کبھی کبھی موت کی بھی بن آتی ہے۔

اور ابھی ابھی اسریٰ کی زندگی اس کبھی کبھی کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کی سماعت سے رونے کی ایک دبی دبی جاں فزا آواز ضرور ٹکرائی تھی، لیکن اپنے پہلو میں ایک نرم ملائم لمس محسوس کرنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے اُجالے گڈمڈ ہونے لگے تھے اور اگلے لمحے نے اسے اپنے حقیقی خالق کے پاس پہنچا دیا تھا۔

دائی نے کمرے سے باہر آ کر یہ جاں سوز خبر سنائی تو برکت میاں خود کو سنبھال نہ سکے۔ ایک تیز خنجر ان کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ قریب تھا کہ وہ نڈھال اور بے جان سے ہو کر گرتی دیوار کی طرح ڈھے جاتے کہ اشرف میاں نے بڑھ کر انہیں سنبھال لیا۔

"صبر کیجئے دُولہا بھائی۔" اشرف میاں کی آواز بھی آنسوؤں میں پھنسی ہوئی تھی۔ لیکن وہ مضبوطی سے برکت میاں کے نڈھال جسم کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔

"یہ سب کیسے ہو گیا، اشرف میاں؟ اسریٰ مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر اس طرح چپ چاپ کیسے چلی گئی ہے؟" غموں کا بوجھ برکت میاں کو اشرف میاں پر گرائے دے رہا تھا۔

"یہی اللہ کی مرضی تھی، دُولہا بھائی! اسریٰ باجی کا بس چلتا تو وہ آپ سے دُور ہی کیوں جاتیں۔ خود کو سنبھالئے دُولہا بھائی صبر کیجئے۔"

اشرف میاں، برکت میاں کو سہارا دیتے ہوئے برآمدے کے تخت تک لے آئے اور انہیں وہاں بٹھاتے ہوئے خود بھی ان سے لگ کر بیٹھ گئے۔

صحن کی فضا آنسوؤں اور سسکیوں سے بوجھل تھی۔ برکت میاں کی اماں اسریٰ کے دونوں لڑکوں فیروز اور شہزاد کو سینے سے لگائے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ دونوں گُم صُم ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔ دونوں کے معصوم ذہن اس سانحہ کے تاثرات کو قبول کرنے سے قاصر تھے۔ ہاں، دونوں اپنی پیاری دادی اماں کو آج پہلی مرتبہ اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر اداس اور ملول ضرور تھے اور بار بار اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کے چہرے پر بہتی آنسوؤں کی لکیروں کو صاف کرتے جا رہے تھے۔ اسریٰ کی نندوں کے دوپٹے مسلسل آنکھوں پر تھے۔ اسریٰ کی اس ناگہانی موت نے ہنستے کھیلتے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا تھا۔

دھیرے دھیرے گھر بھرنے لگا۔ پاس پڑوس کی عورتیں صحن میں جمع ہونے لگیں۔ باہر کی بیٹھک مردوں کے لئے کھول دی گئی تھی۔ ہر

چہرہ سوگوار تھا۔ ہر آنکھ نم تھی۔ پھر سب اپنے اپنے فرائض نبھانے میں لگ گئے۔ کافور کی خوشبو نے اسریٰ کے آخری دیدار کی منادی کی اور شام ہوتے ہوتے اسریٰ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اشرف میاں تو ولادت کے موقع پر یہاں آئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس گھر میں ایک حادثہ سب کا منتظر ہوگا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ایسی ہی ایک آندھی ان کے گھر سے بھی ہو کر گزری تھی۔ ان کی بیوی عذرا جو اسریٰ کی چھوٹی بہن تھی، ماں بن کر بھی اپنی چھاتیوں میں ممتا کے لاوے کی حدت برداشت کر رہی تھی۔ عذرا شادی کے چھ سال بعد ماں بنی تھی۔ لیکن کتنی وقتی تھی اس کی خوشی۔ ممتا کا رس چوسنے والا آیا تو ضرور، لیکن اپنی امانت کو مُنہ لگائے بغیر اس دنیا سے چل بسا۔ عذرا تو جیسے بستر سے لگ کر رہ گئی۔ ادھر ایک ہفتے کے اندر اندر تو وہ بالکل ہی ٹوٹ بکھر کر رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلدی کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اشرف میاں عذرا کے یرقان زدہ چہرے کو تکتے اور دل مسوس کر رہ جاتے۔

رات تک پُرسہ دینے والوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ صرف قریبی لوگ رہ گئے۔ اشرف میاں بھی لوٹنے کی سوچ رہے تھے۔ عذرا کے لئے وہ بہت فکرمند تھے۔ وہ جانے کے لئے اُٹھے تو برکت میاں، ان کی آماں اور بہنیں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اشرف میاں دروازے کی سمت بڑھتے بڑھتے رُک گئے۔ چند لمحے تک وہ ایک چھوٹے سے گول دائرے میں ٹہلتے رہے، پھر برکت میاں کی آماں کے سامنے رُک کر بولے "آماں، اسریٰ باجی کا غم تو بھولتے بھولتے ہی بھولے گا۔ خدا اُنہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ ایک بات میں کہنا چاہتا تھا آماں، اگر آپ مناسب سمجھیں اور بُرا نہ مانیں تو....." اشرف میاں کہتے کہتے اس طرح رُک گئے جیسے جو بات وہ اب کہنے والے تھے اس کے لئے مزید حوصلہ درکار تھا۔

"ہاں ہاں کہو اشرف میاں، کیا بات ہے؟" آماں فوراً، لیکن نحیف آواز میں بولیں۔

اشرف میاں نے ملتجی نظروں سے پہلے آماں کو، پھر برکت میاں کی طرف دیکھا اور سر خم کر کے ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگے "آماں، آپ کو ہمارے گھر کے حالات کا علم ہے۔ عذرا جس غم سے نڈھال ہے، اس کی دوا آپ کے گھر میں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے......"

"ہاں آماں" اشرف میاں جلدی سے بول پڑے۔ شاید انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس درمیان آماں کے مُونہہ سے کہیں انکار کا لفظ نہ نکل جائے۔ "آپ نے ٹھیک سمجھا۔ اسریٰ باجی کی بچّی عذرا کی محرومی دُور کر سکتی ہے۔ خدا ہمیں آگے اولاد ضرور دے گا لیکن عذرا کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر اس کے زخموں کا اس سے بہتر مرہم اور کوئی نہیں۔"

آماں چُپ تھیں۔ برکت میاں بھی چُپ تھے۔ لیکن ان کا ذہن جو صبح سے ماؤف تھا، اب اس طرح چل پڑا تھا جیسے بند گھڑی کو چابی دے دی جائے۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ محرومی کی جس چلچلاتی دھوپ میں ان کی بچّی کو تڑپنا ہوگا، اس سے بچاؤ کے لئے عذرا سے زیادہ مناسب اور محفوظ سائبان اور کون سا ہو سکتا ہے۔ وہ کمرے میں گئے اور خود دائی کو لے کر باہر آ گئے۔ دائی کے ہاتھوں پر کپڑے میں لپٹی ہوئی بچّی پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے آماں اور بہنوں کی طرف دیکھا اور بولے "اشرف میاں، تم ہم پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہو، بلکہ تم ہم سب پر ایک بڑا احسان کر رہے ہو۔ عذرا تو پھر بھی جی لے گی، لیکن اس معصوم کو ایک دُودھ پلانے والی ماں چاہئے، ورنہ یہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گی اور پھر ایک بہن کی بچّی کو دوسری بہن جو پیار اور ممتا دے سکے گی، اس کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ خدا نے ویسے بھی ہمیں دو بیٹے دے رکھے ہیں۔ لو اشرف میاں، آج سے یہ تمہاری بیٹی ہے۔ جو نام چاہو رکھ لینا۔"

برکت میاں کی آماں کے چہرے پر بھی انکار یا مخالفت کا تاثر نہ اُبھرا، بلکہ ایک راحت اور اطمینان کا پرتو لہرا اُٹھا۔

اور پھر اسی وقت برکت میاں نے دائی کو اشرف میاں کے ساتھ کر دیا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر اشرف میاں نے بچّی کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سو کا ایک نوٹ دائی کے ہاتھوں میں پکڑا کر اسے رُخصت کیا۔ پھر وہ اندر آ گئے۔ ایک اندرونی مسرت ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

کمرے میں عذرا آنکھوں پر ہاتھ رکھے بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اشرف میاں دبے قدموں سے آگے بڑھے اور آہستہ سے بچّی کو عذرا کے پہلو میں لٹا دیا۔ چند لمحوں تک وہ بے خودی میں کبھی عذرا کو تکتے رہے اور کبھی بچّی کی چھوٹی چھوٹی بند مٹھیوں کو۔ وہ سوچ رہے تھے جب عذرا اپنے ہاتھوں سے ان بند مٹھیوں کو کھولے گی تو ایک بے پایاں آسودگی اور سُکھ کا خزانہ اس کے دامن میں اُلٹ پڑے گا۔ عذرا کے پہلو میں لیٹی ہوئی بچّی اور عذرا کو بیک وقت دیکھتے ہوئے انہیں عذرا کا ادھورا وجود کتنا مکمل نظر آ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے اشرف میاں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آہستہ سے وہ پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ گئے۔ آہٹ ہوئی تو عذرا نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا۔ اشرف میاں اُدھر ہی تک رہے تھے۔

"ہو آئے آپ! کیا ولادت ہو گئی؟" عذرا شاید آگے کچھ اور پُوچھتی لیکن نہ جانے وہ کون سی خوشبو تھی جو اس کی توجّہ کو اس کے پہلو میں کھینچ لائی۔ ایک لمحہ کو اس کی سُونی آنکھوں میں دھنک کے تمام رنگ ایک ساتھ لہرا اُٹھے، لیکن دوسرے ہی لمحہ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔

"یہ بچّی..... یہ بچّی! کیا یہ میری بچّی ہے؟ کیا یہ بچّی میری ہے؟ کیا وہ زندہ تھی — بولئے بولئے۔ پھر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" عذرا نے اُٹھ کر اشرف میاں کے شانے جھنجھوڑ ڈالے۔

دیر سے اشرف میاں کی آنکھوں کی پُشت پر جو آنسو مچل رہے تھے، وہ پھوٹ پڑے۔ عذرا ان کی یہ کیفیت دیکھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اشرف میاں آخر کو تھے تو مرد۔ جلد ہی سنبھل گئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ابھی انہیں عذرا کو ایک بار اور سنبھالنا ہوگا۔

"یہ بچی اسریٰ باجی کی ہے عذرا۔ لیکن اب یہ ہماری بیٹی ہے۔ میں نے دُولہا بھائی سے اسے تمہارے لئے مانگ لیا ہے۔ اسریٰ باجی زچگی کے وقت انتقال کر گئیں۔"

اکڑوں بیٹھی عذرا اپنے گھٹنوں پر جُھک گئی۔ اشرف میاں کو پورا اندازہ تھا کہ عذرا کی آنکھیں خشک ہوں گی۔ اپنے تمام آنسو وہ گزشتہ ہفتے بہا چکی تھی۔ اب اس کے جسم میں صرف تھوڑا سا خون تھا جو اس کی ہچکیوں سے کھنچ کر اس کی آنکھوں میں چڑھ آیا تھا۔ عذرا کے چہرے پر مختلف جذبات کی لہروں کا ملن ہو رہا تھا اور وہ ایک ٹک بچی کے کپڑے سے باہر نکلے ہاتھ پیروں کی جنبش کو دیکھ رہی تھی۔ اشرف میاں کی نظریں صرف عذرا کی سُرخ سُرخ آنکھوں پر ٹِکی تھیں۔ پھر وہ اپنے لاغر جسم کو گھسیٹ کر بچی کے قریب لے گئی اور جُھک کر پاگلوں کی طرح اس کی پیشانی چومنے لگی۔ عذرا کی اس کیفیت میں مضمر جذبات کی شدت قطرہ قطرہ اشرف میاں کے دل میں اُترتی جا رہی تھی۔ اپنی بہن کے لئے محبت — اپنی بہن کے لئے ممنونیت — اپنی کھوئی ہوئی ممتا کی دریافت۔

بچی کو عذرا نے فاخرہ نام دیا اور پھر اس نام نے عذرا کی زندگی میں مٹھاس ہی مٹھاس گھول دی۔ گھر کے سوگوار ماحول کی چادر پلک جھپکتے میں خود بخود کھنچ کر ہٹ گئی، بالکل اس طرح جیسے بادل کا اُڑتا ہوا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ایک پل کے لئے سورج کے سامنے آئے اور پھر آگے بڑھ جائے۔ عذرا نے اپنی چھاتیوں میں بھرا ممتا کا رس گھونٹ گھونٹ کر کے فاخرہ کو پلانا شروع کر دیا۔ آخر کو اس کی ممتا کا یہ رس اس کے جگر کا ہی خون تو تھا جو خود اسریٰ باجی کے جگر میں تھا۔ اسریٰ باجی کی محبت اور بخششوں کا اس سے گراں قدر خراج وہ اور کیا ادا کر سکتی تھی۔

اشرف میاں عذرا کو فاخرہ کی ناز برداریوں میں مگن اور مست دیکھتے تو ایک طمانیت جزوِ خون بن کر ان کی شریانوں میں گردش کرنے لگتی۔ چند ہی ہفتوں میں عذرا کے جسم کی رعنائیاں لوٹنے لگیں۔ رُخساروں کی زردی گلاب کے رنگ میں بدلنے لگی۔ گھر کے حالات سے اب اشرف میاں پوری طرح مطمئن تھے اور پہلے ہی کی طرح اپنے ذاتی کارخانے کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔

عذرا اور اشرف میاں کی گود میں ہمکتے مچلتے فاخرہ چار سال کی ہو گئی۔ عذرا اس کی معصوم حرکتوں پر ہنستے مسکراتے رات دن گزار دیتی۔ کبھی فاخرہ اپنے مُونہہ سے بے ہنگم آوازیں نکالتے ہوئے اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی۔ کبھی دروازوں اور دیواروں پر کوئلے سے ٹیڑھے میڑھے نقش بنا رہی ہوتی۔ کبھی صحن کی دُھوپ میں اپنے سائے سے باتیں کر رہی ہوتی۔ اشرف میاں صبح کو کارخانے جانے سے پہلے اسے گود میں چڑھائے گھر کے بیسیوں چکّر لگا ڈالتے۔ کبھی اسے گدگداتے، کبھی چُومتے، کبھی اس طرح چھاتی سے لگا لیتے جیسے اب کبھی وہ اسے چھاتی سے جُدا نہ کریں گے۔ کبھی کبھی وہ فاخرہ کو گود میں لئے لئے ہی کارخانے بھی چلے جاتے۔ عذرا لاکھ منع کرتی، لیکن وہ ایک نہ سُنتے۔ وہاں بھی وہ اسے اپنی گود سے نہ اُتارتے یہاں تک کہ وہ تھک کر سو بھی جاتی، لیکن اشرف میاں کے لئے یہ ایک ایسا خوش گوار بوجھ ہوتا جسے وہ نہ تو گھر واپس عذرا کے پاس بھجواتے اور نہ کارخانے کے اپنے آفس میں کہیں لٹاتے۔ شام کو واپس ہوتے تو ایک ہاتھ سے وہ فاخرہ کو اپنی گود میں دبائے ہوئے ہوتے اور دوسرے ہاتھ میں اس کے لئے پھل، مٹھائی اور کھلونوں کے پیکٹ جھول رہے ہوتے۔

جس دن اشرف میاں فاخرہ کو گھر چھوڑ جاتے سارے دن وہ بے چین سی رہتی اور بار بار عذرا سے وقت پُوچھتی رہتی۔ پانچ بج جاتے تو وہ سارے کھیل چھوڑ کر دروازے پر آ کھڑی ہوتی۔ اُدھر اشرف میاں گلی میں مُڑتے اور اِدھر فاخرہ کی باچھیں کھِل اُٹھتیں۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ اُچھل کر اشرف میاں کی گود میں چڑھ جاتی اور اپنی مٹھائی اور کھلونوں کے بارے میں دریافت کرنے لگتی۔ اشرف میاں فاخرہ کے گالوں کو اتنے والہانہ انداز میں چومتے کہ ان پر سُرخ دھبّے اُبھر آتے۔ فاخرہ کے مُونہہ سے پہلے 'سی' نکلتا، پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اشرف میاں مٹھائی اور کھلونوں کے چھوٹے بڑے پیکٹوں سے اس کے دونوں ہاتھ بھر دیتے اور اسے گود میں لئے لئے صحن کی چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتے ان کی گود میں بیٹھے بیٹھے ہی پیکٹوں کو کھول کر فاخرہ اپنی چیزوں کا جائزہ لیتی رہتی اور اشرف میاں اس کی معصوم حرکتوں پر نثار ہو کر اس پر اپنی پدرانہ

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجیے۔
۱۵ دسمبر ۱۹۸۷ تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام، پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔
"بغیر عنوان کے" ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شفقت کی بوچھار کرتے رہتے۔ باورچی خانے میں جانے کی تیاریوں میں مصروف عذرا دروازے کی جالی سے یہ سب کچھ دیکھتی۔ ایک مسرور مسکراہٹ سارا دیپ لے کر اس کے ہونٹوں پر ابھر آتا اور اس کی روح ایک ابدی راحت سے ہم کنار ہو جاتی۔ اس وقت اسری باجی اسے شدت سے یاد آنے لگتیں۔ اگر انہوں نے یہ سوغات اسے نہ بخشی ہوتی تو وہ اشرف میاں سے کیسے نظریں ملاتی کیسے اس احساس جرم کو چھپاتی جو اپنے ازلی قرض کو نہ چکانے کی پاداش میں ہر وقت عورت کی آنکھوں سے جھانکتا رہتا ہے۔

اشرف میاں کا کھلا چہرہ اس کے لئے ایک ایسا خوش رنگ نظارہ ہوتا جس کے آگے جاڑے کی افق کہسار اور بہار کے نظارے بھی ہیچ تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ فاخرہ آٹھ سال کی ہو گئی ان آٹھ برسوں میں کوئی بھی لمحہ عذرا کو یہ احساس نہ دلا سکا تھا کہ فاخرہ اس کے بطن سے نہیں۔ یہ احساس اُسے مجروح یا مایوس کرتا بھی کیوں۔ فاخرہ کے ساتھ تو اس کے ایک چھوڑ دو دو رشتے تھے۔ ایک خون کا اور دوسرا دودھ کا۔ اس گھر کی قسمت کا بھی فاخرہ کی قسمت سے ضرور کوئی قریبی رشتہ تھا۔ اسی لئے تو اشرف میاں کے کارخانے میں مشینوں کی تعداد بڑھتی گئی تھی۔ مصنوعات کی فہرست بھی طویل ہوتی گئی تھی۔ نوکروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا تھا۔ سب ہی کچھ تو ہوا تھا" بس ایک ہی بات نہ ہو سکی تھی۔ عذرا کی تمنا کا دوسرا وارث نہ آ سکا تھا۔ یہ شاید فاخرہ کے لئے اس کا بے پایاں پیار تھا جس نے لاشعوری طور پر اس کی کوکھ کی نمی کو سکھا دیا تھا۔ اس کے اور اشرف میاں کے درمیان کبھی کبھی کوئی ایسا لمحہ ٹھہر بھی جاتا جب وہ اس بات کا ذکر چھیڑنے کو ہوتے، لیکن اس لمحہ فاخرہ کہیں سے آ دھمکتی اور پھر جب دونوں ایک دوسرے کی طرف نگاہ اٹھاتے تو انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ پوچھ رہے ہوں کہ ابھی ابھی تو ہم کیا کوئی غیر اہم اور غیر متعلق سی بات کرنے والے تھے۔

ہوتے ہوتے فاخرہ گیارہ سال کی ہو گئی۔ عذرا اپنی تمام تر توجہ اس کی دیکھ بھال میں صرف کرتی۔ اُدھر اشرف میاں بھی اس کے سامنے نعمتوں کے ڈھیر لگاتے رہتے۔ عذرا اور اشرف میاں کی محبت نے اسے ایک جانور کی طرح سدھا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ آج بھی فاخرہ کی عادتوں میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ آج بھی جب شام کو اشرف میاں کارخانے سے گھر لوٹتے تو وہ اپنی سہیلیوں کو صحن میں کھیلتے چھوڑ کر ان کی طرف دوڑتی۔ اشرف میاں ذرا سا جھک جاتے اور وہ اچھل کر ان کی گردن سے جھول جاتی۔ یہ سچ بھی تھا کہ فاخرہ عذرا سے زیادہ اشرف میاں سے مانوس تھی۔ رات کو بھی جب عذرا کمرے کی روشنی گل کر کے اس کے برابر آ لیٹتی تو جیسے وہ انتظار کر رہی ہوتی۔ اِدھر عذرا کی تیز تیز سانسیں گونجتیں اور اُدھر فاخرہ چپکے سے اٹھ کر رینگتے ہوئے اشرف میاں کے بستر پر پہنچ جاتی۔ آہٹ پا کر اشرف میاں ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے اور فاخرہ اپنا مونہہ ان کے کان کے پاس لے جا کر کوئی نئی فرمائش کر دیتی۔

اشرف میاں بڑے پیار سے "ہاں ہاں ضرور، ہم کل ہی اپنی بیٹی کے لئے لا دیں گے"۔

ایک شام اشرف میاں گھر لوٹے تو تھکے تھکے سے تھے۔ فاخرہ ان کی طرف لپکی تو انہوں نے اپنے گردن سے جھولنے کی شہ بھی نہ دی۔ وہ صحن کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔ آج ان کے ہاتھوں کو خالی دیکھ کر فاخرہ پہلے ہی مونہہ پھلا کر ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ خود ہی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ اشرف میاں کے ہاتھ پھر بھی اس کی طرف نہ بڑھے تو وہ خود ہی چارپائی پر چڑھ کر ان کی گود میں بیٹھ گئی۔ اشرف میاں نے اسے تھاما تو ضرور لیکن آج ان کے اضطراب جیسے نے حس سے ہو رہے تھے۔ عذرا نے اور تی جانے کی چال سے بھانپ کر منٹ کے لیے ہیں ان کا حال دریافت کیا تو زرد کمزور لہجے میں بولے "کوئی بات نہیں عذرا بس ذرا سی طبیعت کچھ بوجھل ہے"۔

[illegible] لیٹے ہوں ابھی [illegible]

لے کر آتی ہوں"۔

پھر وہ فاخرہ سے بولی "بیٹی فاخرہ، ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں چلو یہاں میرے پاس آ جاؤ۔ انہیں آرام کرنے دو بیٹی۔ ہماری بیٹی ہماری گود میں نہیں بیٹھے گی تو پھر کہاں بیٹھے گی"۔

اشرف میاں نے فاخرہ کو گود میں سنبھالا اور کمرے میں چلے آئے۔ مگر اس دن کے بعد اشرف میاں اپنے پلنگ سے نہ اٹھ سکے۔ ڈیڑھ مہینے بعد وہ اسی پلنگ پر جس پر روز عارضی نیند سو یا کرتے تھے، ایک ابدی نیند سو گئے۔ ان کے گردوں نے اچانک کام کرنا بند کر دیا تھا۔ علاج معالجہ میں عذرا نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا خدا کی مرضی کے بعد اسے اپنی تیمارداری پر یقین تھا لیکن موت چونکہ خود بھی ایک زبردست یقین ہے، وہ عذرا کے یقین کو نگل گئی تھی۔

اشرف میاں جدائی کا جو داغ دے گئے تھے، اسے بھی عذرا نے صبر سے جھیل لیا ہوتا اگر وہ اپنے جینے کے آخری سہارے کی طرف سے فکرمند نہ ہوتی۔ اشرف میاں کے ایمان دار منیجر قاضی صاحب نے کارخانے کی تمام دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی تھی اور ہر ہفتے پائی پائی کا حساب عذرا کو دے جاتے تھے۔ لیکن یہ فاخرہ تھی جس نے اسے احساس کی صلیب پر لٹکا دیا تھا۔

ابھی چند دن پہلے اس پر ایک شدید قسم کا دورہ پڑا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک دورہ جو اتنا شدید نہ تھا، فاخرہ پر اشرف میاں کی موت سے ایک ہفتہ پہلے پڑا تھا۔ اس دن وہ بیٹھے بیٹھے اچانک غش کھا کر گر پڑی تھی اور پھر اس کے ہاتھ پیروں میں تشنج ہونے لگا تھا۔ اس وقت تو عذرا نے یہی سمجھا تھا کہ چونکہ اشرف میاں نے ادھر کئی دن سے اُسے گود میں نہیں سمجھایا، پیار نہیں کیا، اس لئے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار اس ڈھنگ سے کر رہی ہے، لیکن اس وقت عذرا کو اپنی رائے بدلنی ہی پڑی تھی۔ جب اس کے دہانے سے کف [illegible] سے جھاگ اُبل اُبل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگا تھا اور پھر عذرا کے لئے یہ سمجھنا مشکل [illegible] کہ فاخرہ کس قسم کے دورے کے شکار [illegible]

مبتلا ہو گئی ہے۔ ابھی حال میں جو دورہ فاخرہ پر پڑا تھا وہ انتہائی شدید تھا۔ اب عذرا کے لئے یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی کیا اشرف میاں کی جدائی کا شدید صدمہ ہے جو اس سے [illegible]

وقت سب سے بڑا مرہم ہے

عذرا نے کبھی یہی سوچا تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا، فاخرہ اشرف میاں کے غم سے دُور ہوتی جائے گی لیکن پھر اس کی اُمید مایوسی میں بدلنے لگی۔ اب تو اشرف میاں کو گزرے ہوئے دو برس کا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن فاخرہ کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہو گئی تھی۔ اب تو اس پر تقریباً ہر ہفتے اسی نوعیت کا شدید دورہ پڑتا۔ فاخرہ کی کیفیت دیکھ کر عذرا کے دل پر آرے سے چلتے۔ اس اثنا میں عذرا نے کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی تھی۔ ڈاکٹروں، حکیموں سے علاج کرایا۔ پیروں فقیروں سے دُعا کرائی۔ کوئی بھی نیا مشورہ دیتا تو اس کی آنکھوں میں اُمیدوں کے جگنو جگمگا اُٹھتے اور وہ فوراً اس پر یقین کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتی کہ اس بار فاخرہ ضرور اچھی ہو جائے گی۔ لیکن اس کے اُمیدوں کے سورج پر مایوسی کے گھنے بادلوں کا تسلط برقرار ہی رہا۔ اپنے اس آخری سہارے کی زندگی کے لئے کبھی کبھی اسے خود بھی ایک اور سہارے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی۔ وہ اکیلے ہی فاخرہ کے علاج معالجے کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرتی رہتی تھی۔ ایسے میں اشرف میاں کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا اور پھر حال، ماضی سے بغل گیر ہونے لگتا۔ نم آنکھوں سے وہ سوچنے لگتی: وہ زندہ ہوتے تو کب اپنی لاڈلی بیٹی کو اس اذیت میں مبتلا دیکھ پاتے۔

تھک ہار کر اب وہ پھر شہر کے ہی حکیم صاحب کے پاس فاخرہ کو دکھانے جایا کرتی تھی۔

ایک شام قاضی صاحب حساب دینے آئے تو کہنے لگے "بیگم صاحبہ، میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ بٹیا کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ ایک ضروری بات آپ سے کہنی تھی۔"

فاخرہ کے ذکر پر عذرا ہمیشہ کی طرح ہمہ تن گوش ہو گئی۔

قاضی صاحب ہاتھ میں لئے رجسٹروں کو یکجا کرتے ہوئے بولے "حاجی عثمان صاحب کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔ شہر کی مشہور اور معزز ہستیوں میں سے ہیں۔ ان کے سب سے چھوٹے صاحب زادے عارف میاں نے شاید بٹیا کو حکیم صاحب کے مطب میں دیکھا تھا۔ حاجی صاحب نے آج مجھے گھر بلوایا تھا۔ وہ عارف میاں کے لئے بٹیا کو آپ سے مانگنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں حاجی صاحب کی بیگم آپ سے ملنے کی خواہاں ہیں۔ آپ کہیں تو....."

"لیکن قاضی صاحب فاخرہ تو ابھی صرف تیرہ کی ہے اور پھر....." عذرا اس مقام پر آتے آتے رُک گئی جہاں پہنچ کر اس کے دل کے پھوڑے میں سوزش ہونے لگتی۔

قاضی صاحب عذرا کی کیفیت سے متاثر ہوتے ہوئے بولے۔ "بیگم صاحبہ، مجھے اس گھر کا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھئے۔ میرا آباد اور خوش حال گھرانہ صرف صاحب کے احسان اور عنایتوں کا ہی مرہونِ منت ہے۔" قاضی صاحب نے رُک کر کمرے کے دروازے سے باہر صحن کی طرف دیکھا، جیسے وہ فاخرہ کے کہیں آس پاس نہ ہونے کا مکمل یقین کر لینا چاہتے ہوں "مجھے آپ کے غم، اُلجھن اور جذبات کا پورا احساس ہے۔ بیگم صاحبہ دراصل بٹیا کی اُٹھان ایسی ہے کہ لوگ تو اسے سولہ سترہ کی سمجھتے ہیں۔ پھر انہیں شادی کی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ کہہ رہے تھے کہ رشتہ طے ہو جائے تو اگلے سال شادی ہو جائے گی۔ میرے خیال میں تو عارف میاں کا رشتہ بٹیا کے لئے بہتر بھی ہے اور بروقت بھی۔ رئیس اور شریف لوگ ہیں۔ ممتاز خاندان ہے۔ بٹیا کی نئی زندگی شروع ہو گی تو پچھلی زندگی سے اس کا ناطہ خود بخود ٹوٹ جائے گا۔ جب صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ مجھے اب تک گھر میں نظر آتا ہے تو بٹیا، جو صاحب کا سایہ تھی، ماضی کے نقوش کو اپنے ذہن سے کھرچنے میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ شادی ہو گئی تو نئے رشتے بنیں گے۔ نئی مصروفیات اور ذمہ داریاں شروع ہوں گی۔ بٹیا کا ذہن بھی بٹے گا اور وقت بھی اچھا کٹے گا۔ عین ممکن ہے کہ نئے ماحول میں اس موذی مرض کی شدت میں کمی آ جائے یا یہ سرے سے ختم ہی ہو جائے۔ حالانکہ ان لوگوں کو بٹیا کی بیماری کا علم نہیں۔ بالفرض شادی کے بعد بھی ایسا ہوا تو اسے ایک اتفاق بھی بتایا جا سکتا ہے۔ صاحب کے گھر کی بھی ایک ساکھ ہے، بیگم صاحبہ ان کے خلوص اور شرافت کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی صاحب اس رشتے پر زور دے رہے ہیں۔ اس گھر کی دیواروں کے اندر رہ کر بٹیا صاحب کو بھولنا چاہے بھی تو نہیں بھول سکتی۔ میں تو اسی بات کو اہمیت دوں گا۔ آپ بھی سوچ لیجئے۔ اگلے ہفتے مجھے بتایئے گا۔"

قاضی صاحب حساب دے کر چلے گئے۔

عذرا دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی۔ وہ شرمیلا شرمیلا نوجوان اب اسے اچھی طرح یاد آ رہا تھا جس کی دُزدیدہ نظریں مطب میں فاخرہ کے حسن کی رعنائیاں چُرانے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔

وہ کمرے سے باہر آئی تو سامنے فاخرہ اپنے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ عذرا نے رُک کر آج پہلی بار اسے بھرپور نظروں سے دیکھا اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ فاخرہ کے صحت مند جسم کے تمام اعضاء جوانی کی سمت مُونہہ اُٹھا چکے ہیں۔ فاخرہ تو کہیں ادھر اُدھر چلی گئی، لیکن عذرا ایک مجسمے کی طرح وہیں کھڑی رہ گئی۔ قاضی صاحب کے مشوروں میں وزن تھا۔ عذرا کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کسی بھی تذبذب کا سامنا نہ کرنا پڑا کہ فاخرہ ایک نئی زندگی کو خوش آمدید کہنے کا پورا شعور رکھتی ہے اور اس کے زخموں کی اس سے کامیاب اور بروقت جراحی دوسری کوئی نہیں۔ وہ فاخرہ سے دُوری برداشت کر کے فاخرہ کو جانے حادثہ سے دُور کرے گی۔

عذرا نے رشتہ طے کر دیا اور پھر ایک سال بعد دُھوم دھام اور پوری تیاریوں کے ساتھ فاخرہ کی ڈولی عارف میاں کے حوالے کر دی۔

عذرا کے دل سے یہ ارمان کبھی نکلا تو اس کا دل گیس کے غبارے کی طرح ہلکا ہو گیا۔ لیکن کبھی کبھی ایک احساس اس کے سکون اور یقین سے سوالیہ نشانات کی پرتیں ادھیڑنے لگتا۔ فاخرہ جہیز میں اپنے ساتھ ایک مرض بھی لے گئی تھی۔ اگر فاخرہ کو سسرال میں کبھی دورے پڑے؟ کیا وہ ان لوگوں کو اسے ایک اتفاق بتا کر مطمئن کر سکے گی؟ فاخرہ کی زندگی میں زہر تو نہ گھل جائے گا؟ ہر ہفتہ وہ ایک احساسِ جرم کو دل میں دبائے فاخرہ سے ملنے جاتی اور حکیم صاحب کی دوائیں بھی بڑے احتیاط سے چھپا کر اپنے ساتھ رکھ لیتی۔ فاخرہ کی شادی کی خبر حکیم صاحب کو دیتے ہوئے جب اس نے اپنی فکر کا اظہار کیا تھا تو انہوں نے دوائیں تبدیل کرتے ہوئے اسے پر الیقین دلایا تھا کہ اس سے فاخرہ کو ضرور افاقہ ہوگا۔ فاخرہ کے گھر پہنچ کر جب وہ اسے خوش و خرم اور مگن دیکھتی تو اس کے دل کا بوجھ پگھلے ہوئے پارے کی طرح ڈھلک کر کہیں ادھر ادھر ہو جاتا۔ موقع نکال کر وہ تنہائی میں فاخرہ کو حکیم صاحب کی دوائیں پکڑاتے ہوئے اس کی حالت ضرور دریافت کرتی۔ فاخرہ اس کے سوچوں میں ڈوبے ہوئے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کہتی "آپ بالکل فکر نہ کریں ممی میں یہاں بہت خوش ہوں۔ ٹھیک ہوں" عذرا کا چہرہ دمک اٹھتا اور اس کے دل میں قاضی صاحب اور حکیم صاحب کے لئے پھر ممنونیت کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔

اب چونکہ پچھلے چند مہینوں میں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی تھی، اس لئے فاخرہ کی طرف سے عذرا بالکل مطمئن ہو گئی تھی۔ حکیم صاحب نے بھی اب کچھ دن کے لئے دوائیں بند کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔

شادی کے سال بھر بعد فاخرہ نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا۔ بچی کا نام فرح رکھا گیا۔ ولادت کے موقع پر عذرا بھی آئی۔ بھرا پرا کنبہ تھا۔ خوب چہل پہل تھی۔ رسموں کے شوق نے سب کو آنا ڈالا کر رکھا تھا۔ عارف میاں تو ایسے کھلے پڑ رہے تھے جیسے انہیں جلد باپ بن جانے کی بڑی تمنا رہی ہو۔ عذرا کو تو اس دن کسی نے جانے ہی نہ دیا۔ وہ چھٹی کے بعد ہی گھر لوٹی۔

عارف میاں اور فاخرہ کے لئے فرح ایک بچے کے اس عزیز کھلونے کی طرح تھی جس سے کھیلتے ہوئے وہ کبھی نہیں تھکتا۔ کم عمری ہی میں ماں بن کر فاخرہ بچپن اور جوانی دونوں کی اداؤں سے فرح کو محظوظ کرتی۔ عارف میاں کی مصروفیات کچھ زیادہ نہ تھیں۔ باپ کا ساڑیوں کا لمبا چوڑا کاروبار تھا۔ چار چار دکانیں تھیں جنہیں چاروں بڑے بھائی دیکھتے تھے۔ ویسے ہر صبح پابندی سے عارف میاں دکانوں پہ جاتے ضرور اور بیٹھ کر کاروباری تجربہ حاصل کرتے رہتے۔

فرح نو سال کی ہو گئی۔ فاخرہ کے دوسرے بچے سرتاج کی عمر بھی پانچ سال ہو گئی تھی۔ ایک دن فاخرہ سرتاج کے لئے سوئیٹر بن رہی تھی، جو وہیں اس کے پاس پلنگ پر سو رہا تھا۔ فرح عارف میاں کے پلنگ پر اپنی کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ عارف میاں صبح سے زمینوں کے معاملے پہ گئے ہوئے تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو فرح بستر پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری چیزیں لائے ابو؟"

عارف میاں ہونٹ پچکا کر رہ گئے۔ آج پہلی بار ان سے یہ چوک ہوئی تھی۔

"جائیے، ہم آپ سے نہیں بولیں گے۔ ہم امی کی بیٹی ہیں۔" فرح اپنی کتابیں سمیٹ کر منہ پھلائے ہوئے پلنگ سے اترنے لگی۔ فاخرہ نے باری باری فرح اور عارف میاں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر رہ گئی۔ عارف میاں سے فرح کو یوں رنجیدہ دیکھا نہیں جا رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ اپنی چپلیں پہنتی، عارف میاں نے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"ہم ابھی جائیں گے اور اپنی بیٹی کی چیزیں لے آئیں گے۔ اب تو میری بیٹی ہو نا۔ چلو اب جلدی سے ہنس دو۔"

فرح کے گال پھر بھی نہ پچکے تو عارف میاں نے اسے گدگدانا شروع کر دیا۔ وہ ان کی گود میں مچلنے لگی اور ہنس ہنس کر نڈھال ہوتے ہوئے بولی "اچھا ابو اچھا۔ بس بس۔ ہم آپ کی بیٹی ہیں۔"

عارف میاں نے فرح کو سینے سے بھینچ لیا۔ پھر وہ اس کے رخساروں کو والہانہ انداز میں چومنے لگے۔ چٹ — چٹ — چٹ۔

فاخرہ کی نگاہیں ادھر گھوم گئیں۔ پھر اچانک ایک سنسناہٹ سی اس کی انگلیوں میں دوڑنے لگی۔ سلائیاں چھوٹ کر بستر پر گر پڑیں۔ اس نے اپنی انگلیوں کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اس کی انگلیاں بالکل چھوٹی چھوٹی ہو گئی ہوں۔ اگلے ہی لمحے جیسے اس کا جسم بھی اسی تناسب سے چھوٹا ہو گیا ہو۔ انگلیوں کی سنسناہٹ وہ اپنے تمام جسم میں محسوس کرنے لگی۔ سنسناہٹ — سنسناہٹ — شدید سنسناہٹ — ایک لذت آمیز سنسناہٹ — اور پھر دماغ کی رگوں کے شدت سے کھنچنے کا احساس۔

ایک جھٹکے سے وہ پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز تیز قدموں سے چل کر ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح عارف میاں کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ فرح کا ہاتھ پکڑ کر عارف میاں کی گود سے کھینچتے ہوئے وہ چیخ کر بولی "آپ اس کے باپ ہیں یا دشمن!"

عارف میاں گڑبڑائے اور ہونقوں کی طرح فاخرہ کے چہرے کو تکنے لگے۔

فرح ماں باپ کی کیفیت بھانپ کر سہمے سہمے انداز میں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

فاخرہ نے بڑھ کر دروازہ اچھی طرح بند کیا اور پھر لوٹ کر عارف میاں کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ پہلے اس نے اپنا ایک ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا اور پھر دوسرے ہاتھ سے ان کے جھکے ہوئے چہرے کو اٹھاتے ہوئے پیار سے مسکراتے ہوئے بولی "آپ خفا ہو گئے کیا؟ دیکھئے میرا مطلب تھا کہ زیادہ لاڈ پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر کیول دھیر کی

بُشریٰ رحمٰن سے بات چیت

پاکستان کے ادبی اُفق پر جو ستارے سب سے زیادہ جگمگا رہے ہیں، ان میں بشریٰ رحمٰن بھی شامل ہیں۔ بشریٰ رحمٰن کی شہرت ان کے وطن کی سرحدوں سے نکل کر ساری اُردو دنیا میں پھیل رہی ہے۔ دھرتی کے جس حصّے پر بھی اُردو والے بسے ہوئے ہیں، وہاں بشریٰ رحمٰن ایک جانا پہچانا نام ہے۔

پچھلے برس میرا لاہور جانا ہوا تو بشریٰ رحمٰن سے تفصیلی گفتگو رہی۔ اس بات چیت کے کچھ حصّے بانو بہنوں بھائیوں کی نذر کر رہا ہوں۔ آخر وہ بھی تو بشریٰ رحمٰن کے پرستار ہیں۔

"آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق کب اور کہاں پیدا ہوا؟"

"ہمارے گھر کا ماحول مذہبی ہونے کے ساتھ شاعرانہ اور ادیبانہ بھی تھا۔ ہم چھ بھائی بہن ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو اباجی اکثر شام کو ہمارے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کرتے تھے۔ انہیں یہی ارمان تھا کہ ان کے بچے علم حاصل کریں، خطیب بنیں، ادیب اور شاعر بنیں اور دنیا میں نام پیدا کریں۔ میری بہن نزہت شاعرہ ہیں۔ اباجی ان سے باقاعدہ ترنّم سے شعر سنتے اور اچھے شعر پر انعام بھی دیتے۔ میری امّی بھی شاعرہ تھیں۔ اباجی ان سے بھی ان کا کلام سنتے۔ وہ سالانہ مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے۔ ان کا ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں دنیا بھر کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ وہیں سے بہت چھوٹی سی عمر میں مجھے پڑھنے کی لت لگ گئی تھی اور اباجی میری اس عادت کو بے حد پسند کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ پڑھے لکھے لوگوں سے راہ و رسم رکھا کرو۔ مشہور لوگوں کو قریب سے دیکھو اور عظیم انسانوں سے خط و کتابت کیا کرو۔ اس طرح تم بہت کچھ سیکھو گے۔ اباجی علم اور تجربے کا سمندر تھے مگر افسوس جب پیاس بجھانے کا وقت آیا تو وہ چشمہ ہی سوکھ گیا اور پھر امّی جان تو واقعی اللہ کے نور کا ٹکڑا تھیں۔ ایثار و محبت میں گندھی ہوئی۔ اگر کبھی میں ان کے بارے میں لکھنا چاہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی رگوں کا خون نچوڑ کر اس کی سیاہی بناؤں اور دونوں آنکھوں کو قلم کی نوک پر رکھ دوں پھر بھی میں ان کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ آج میں جو کچھ ہوں ان ہی کی وجہ سے ہوں۔ میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔ دماغ میں نے اپنے باپ سے لیا اور سوز و گداز کا خزانہ میری ماں نے دے دیا — بھلا صرف قلم چلانے سے کوئی ادیب بن سکتا ہے؟"

ماضی میں کھوئی ہوئی بشریٰ کی نم آنکھوں میں عقیدت اور محبت تھی۔ میں نے بات کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے افسانوں اور ناولوں میں محبت کرنے والے، ظلم کرنے اور ظلم سہنے والے سب ہی طرح کے کردار ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر مرد ظالم اور عورت مظلوم نظر آتی ہے — ایسا کیوں ہے؟"

"ظالم اور مظلوم کے علاوہ بھی تو بہت کچھ میرے کرداروں میں ہوتا ہے تاہم جہاں تک عورت کی بات ہے، اسے مقابلہ کرنے کی تربیت ملنا چاہئے — مگر حالات کا مقابلہ کرنے کی تربیت ملنا چاہئے، شوہر کا نہیں۔"

"کیا شوہر مرد نہیں ہوتا؟"

"یقیناً ہوتا ہے، لیکن وہ پہلے شوہر ہوتا ہے۔ عورت کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے، مگر شوہر کی برابری نہیں کرنی چاہئے۔ جہاں تک عورت کے صبر اور برداشت کرنے کا تعلق ہے، یہ تو عین عبادت ہے۔ دنیا میں سب سے بڑا کرب تخلیق کا کرب ہے اور اسے بھی عورت ہی سہتی ہے۔ یہاں سہنے یا برداشت کرنے کا مطلب تحمّل بُردباری اور فراست ہے۔ انکسار اور علم تو

عورت کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اور وہ اپنی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ظالم مرد کو بھی جیت لیتی ہے۔"

"عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب مرد محبت کرتا ہے تو یہ اس کی زندگی کا محض ایک واقعہ ہوتا ہے، لیکن عورت کی بات اس کے برعکس ہوتی ہے، لیکن عورت کی محبت اس کی پوری زندگی کی داستان بن جاتی ہے ـــ اس سلسلے میں آپ کیا کہتی ہیں؟"

"سچ بات کہوں؟ مردوں کے بارے میں لکھتے وقت کسی بھی خاتون ادیبہ کو عصبیت نہیں برتنا چاہئے۔ مرد بھی عورتوں کی طرح انسان ہوتے ہیں۔ ان کا دل بھی ہے اور دل میں جذبات بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرد نے اپنے اوپر بہادری کا خول چڑھا رکھا ہے۔ محبت دونوں پر ایک جیسا اثر کرتی ہے۔ جس طرح عورت اپنی زندگی کے پہلے مرد کو نہیں بھول سکتی، اسی طرح مرد اپنی زندگی کی آخری عورت کو نہیں بھول سکتا۔ یہ آخری عورت وہی ہوتی ہے جس سے اسے سچ مچ محبت ہو جاتی ہے ـــ چاہے یہ محبت شادی سے پہلے ہو یا شادی کے بعد۔ سچ مچ کی محبت سے پہلے وہ جتنے کھیل کھیلتا ہے، وہ اس کو مرد بننے میں مدد دیتے ہیں اور وہ مرد کے لئے ضروری بھی ہوتے ہیں۔ اس کی راہ گزر تجربوں سے اٹی پڑی ہے۔ جب تک وہ خود اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہو جاتا، تجربوں سے گزرتا رہتا ہے۔ یہیں کہیں اسے وہ اصل عورت نظر آجاتی ہے جو اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ خواہ وہ اسے بیوی بنا کر گھر میں ڈال لے یا دیوی بنا کر خیالوں میں بسا لے۔ اگر عورت کی طرح مرد اپنے زخموں کو ہرا رکھے تو وہ دنیا کے لئے ناکارہ ہو جاتا ہے اس لئے وہ بظاہر اتنا وفادار اور نرم خو نظر نہیں آتا، مگر حقیقت میں جو مرد محبت کی اصل کو جان لیتا ہے وہ محبت کے لئے اپنی جان تک دے دیتا ہے۔"

"اپنے افسانوں اور ناولوں میں آپ مردوں سے کوئی رعایت نہیں کرتیں یعنی ان کی خوب دھجیاں اڑاتی ہیں۔ آپ کے شوہر میاں رحمٰن صاحب کا اس پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟"

"رحمٰن تو میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہیں۔ ان ہی کے آسرے پر تو میں بے دھڑک لکھتی چلی جا رہی ہوں۔ اگر وہ تنگ نظر اور کوتاہ ظرف ہوتے تو کیا میں اس طرح بے باکی سے لکھ سکتی تھی؟ میں اپنے شوہر کے جذبات اور احساسات کا احترام کرتی ہوں، مگر میرے قلم کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کا وہ احترام کرتے ہیں اور بعض اوقات اچھے مشوروں سے بھی نوازتے ہیں۔ دو بالغ انسانوں کی طرح ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے راستے پر جانے دیتے ہیں۔ نظریاتی اختلاف زندگی اور حرارت کی دلیل ہے، مگر ہم ایک دوسرے کو عاجز کر کے قائل نہیں کرتے، بلکہ جب میں کسی کہانی میں مرد کی فطرت کو بے نقاب کرتی ہوں تو وہ حیران ہو جاتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ذہین بیوی بہت خطرناک ہوتی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سب کچھ لکھنے سے پہلے میں نے اس مرد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو دن رات میرے ساتھ رہتا ہے۔ یوں بھی دنیا میں ہر قسم کے مرد ہیں اور ہر قسم کے مرد پر لکھنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں اور نہ میرے شوہر کسی احساسِ کمتری کا شکار ہیں کہ خواہ مخواہ الجھتے رہیں۔ کبھی کوئی افسانہ پسند نہ آئے تو صاف کہہ دیتے ہیں مگر خدا کا شکر کہ ایسی باتیں جھگڑے کا باعث نہیں بنتیں۔ پھر بھی جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں"۔

بشریٰ رحمٰن برصغیر کی مقبول اردو ادیبہ ہیں اور میاں رحمٰن صاحب ایک مصروف اور بڑے کاروباری انسان۔ یعنی میاں بیوی دونوں ہی اپنی الگ پہچان اور الگ مقام کے مالک ہیں۔ تاہم زیادہ شہرت بشریٰ کے حصے میں آئی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک سوال کیا:

"عام طور پر مرد یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی کی اپنی الگ شخصیت ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ بیوی جہاں اور جب بھی پہچانی جائے، اسی کے حوالے سے پہچانی جائے اور جہاں کہیں اس کے برعکس صورت حال ہو تو گھر اکھاڑا بن جاتے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟"

"ہاں ـــ ہمارا گھر بھی اکھاڑا بن سکتا تھا اگر میں چند باتوں کا دھیان نہ تو۔ میرے خیال میں ان باتوں کا دھیان ہر اس عورت کو رکھنا پڑتا ہے جو گھر میں مرد کی برتری کو تسلیم کرتی ہے۔ اسی لئے میں گھر میں ادیبہ بشریٰ رحمٰن نہیں ہوتی، صرف ایک بیوی اور ایک ماں ہوتی ہوں اور گھر میں مجھ پر صرف میرے بچوں اور میرے شوہر کا حق ہوتا ہے۔ اگر بیوی گھر کے تمام فرائض باقاعدگی سے ادا کرتی رہے، بچوں کو وقت دے، شوہر اور بچوں کا کام اپنے ہاتھ سے کرے تو شکوے کی گنجائش نہیں رہتی ـــ بس اسی لئے سکون سے گزر رہی ہے"۔ بشریٰ نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"میاں رحمٰن صاحب اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ایسے میں سارے گھر کی ڈھیر سی ذمہ داریوں کا بوجھ آپ پر رہتا ہے۔ بچے بھی چھوٹے ہیں۔ اس پر بھی آپ برابر لکھ رہی ہیں۔ پنجاب اسمبلی کی رکن کی حیثیت سے سیاسی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ 'وطن دوست لمیٹڈ' کے نام سے اپنا ایک اشاعتی ادارہ بھی چلا رہی ہیں۔ ایک ماہ نامہ کی اشاعت کی تجویز بھی ہے۔ یہ تمام کام نہ صرف توجہ چاہتے ہیں بلکہ سخت محنت طلب ہیں۔ ان تمام جھمیلوں سے آپ کبھی اوب تو نہیں جاتیں؟"

"کبھی کبھی ضرور تنگ آجاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے عام عورتوں کی طرح بس نئے نئے کپڑے پہن کر بازاروں میں خاک پھانکا کرتی بیگمات کی طرح فضول گپوں میں وقت ضائع کرتی رہتی۔ مگر نہیں، میں تو مشکل راستوں کی مسافر ہوں۔ بھلا بے مقصد زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ لاکھوں عورتیں بے مقصد زندگی گزارتی ہیں۔ دنیا میں کچھ نہ کچھ کر کے جانا چاہئے۔ بس یہی سوچ کر پھر اسی رفتار سے کام میں جٹ جاتی ہوں۔ میری ماں جی عظیم ہندوستانی خاتون سروجنی نائیڈو

کا اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ جاننا اور پڑھنا چاہتی ہوں۔ جب آپ بھارت واپس جائیں تو مجھے ان کی سوانح حیات ضرور بھجوائیں۔"

میں نے وعدہ کیا اور اپنے موضوع کو پھر آگے بڑھایا۔ "آپ نے سیاست میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس پر رحمٰن صاحب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوا؟"

"رحمٰن صاحب کی رضامندی کے بغیر میں کوئی کام نہیں کرتی۔ جہاں تک سیاست میں حصّہ لینے کا سوال ہے میں پنجاب اسمبلی میں خواتین کی نمائندگی کرتی ہوں۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک اہم اور بامقصد حصّہ ہے۔"

سیاست پر میں نے زیادہ بات نہیں کی۔ میری دلچسپی تو بشریٰ کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ جاننے پہچاننے میں تھی۔ "آپ کی تخلیقات، تجربات اور مشاہدات گواہ ہیں کہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ کام آپ نے کیا ہے۔ اس کا کیا راز ہے؟"

"میں کبھی خالی نہیں بیٹھ سکتی اور پھر جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے ایک ایک پل زیادہ قیمتی لگ رہا ہے۔ شادی سے پہلے کا وقت تو تعلیم حاصل کرتے ہوئے گزرا۔ شادی کے فوراً بعد ایک جمود کا زمانہ آیا تھا۔ میرے شوہر صبح کو دفتر چلے جاتے۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب لڑکی حقائق کی دنیا میں قدم رکھتی ہے۔ خواب ٹوٹتے پھوٹتے ہیں تمنائیں چولے بدل بدل کر سامنے آتی ہیں۔ ہم کچھ اور سوچے بیٹھے ہوتے ہیں اور حالات کچھ اور پیش آجاتے ہیں۔ شادی سے پہلے کسی بھی لڑکی کو مرد کی فطرت کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔ وہ بوکھلا جاتی ہے ایسے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حسین بندوبست رکھ چھوڑا ہے کہ بچّہ ہو جاتا ہے۔ توڑ پھوڑ کے ساتھ تخلیق کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یوں عورت کو سختیوں کے ساتھ جینے کا جواز مل جاتا ہے۔ پہلا بچّہ پالنا مشکل بھی ہے اور روح پرور بھی۔ یہ بھید ان ہی دنوں مجھ پر کھلا کہ عورت کا بنیادی کام بچّے پیدا کرنا اور انہیں پالنا ہے۔ میں نے اپنے بچّوں کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ میں نے کبھی آیا نہیں رکھی کیوں کہ میرا خیال ہے کہ ماں کے ہاتھوں کا لمس بچّوں کی نمو میں بڑا کام کرتا ہے اور پھر گھر کا کام کرنے سے زندگی کے تجربات میں عجیب و غریب قسم کا اضافہ ہوتا ہے۔ شادی کے پہلے دس برس میں میرے چار بچّے پیدا ہوئے اور میں ان میں کھو گئی۔ مگر طرفہ تماشا یہ بھی تو ہے کہ حسّاس لوگوں کی زندگی میں دو لہریں متوازی چلتی رہتی ہیں۔ اندر کا عمل جاری رہتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کسی صورت باہر آتی رہتی ہے۔ اس لئے سوچنے اور لکھنے کا عمل جاری رہا۔ حالاں کہ اس کربناک کیفیت کو ختم کرنے کے میں نے لاکھ جتن کئے سگدل میں جلنے والا دیا کبھی نہ بجھا اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ حسّاس لوگوں کی زندگیوں میں بڑے کڑے موڑ آتے ہیں اور ایسا لگتا ہے قدرت ہمارے ساتھ بڑا ظلم کر رہی ہے مگر جب ان کڑے اور کٹھن راستوں سے گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہے کیوں کہ کٹھن مرحلوں سے گزرے بغیر نہ سوچ میں پختگی آتی ہے، نہ قلم میں روانی۔ مشاہدے اور تجربے کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد ہی عرفان و آگہی حاصل ہوتے ہیں۔"

"اچھا بشریٰ، یہ بتائیں کہ آپ کو اتنی شہرت ملی ہے تو اس پر آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

جواب میں بشریٰ نے یہ شعر پڑھ دیا:

"جو اہلِ دل ہیں بڑھاتی ہے آبرو ان کی
جو بے شعور ہیں ان کو خراب کرتی ہے

مجھے شہرت سے ایک ہی تجربہ ہوا ہے کہ کم ظرف دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور عالی ظرف دشمن دوست بن جاتے ہیں۔"

"بہت خوب!" اب میں نے ادب کے حوالے سے چند باتیں کرنے کی خواہش محسوس کی اور پوچھ لیا "آپ نے پہلا افسانہ کب لکھا؟"

"شاید ۱۹۵۵ میں ـــ عنوان تھا: "پھر یادوں کے دیپ جلے۔"

"اب تک آپ کتنا لکھ چکی ہیں؟"

"ڈھائی تین سو افسانے، چند ناولٹ، ایک سفرنامہ اور پانچ ناول۔"

"کچھ ماضی اور حال کے بارے میں بتائیں۔"

"۱۹۶۲ میں جرنلزم میں ایم اے کیا۔ صوبائی اسمبلی پنجاب، پنجاب یونیورسٹی سینیٹ، پنجاب کونسل آف آرٹس اور ڈویژنل کونسل، بھاول پور کی ممبر رہی یا ہوں۔ سعودی عرب، امریکہ، کنیڈا، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، جاپان، فرانس، ملیشیا، انڈونیشیا، بھارت وغیرہ بہت سے ملکوں کا سفر کیا ـــ میرا خیال ہے کہ اتنا ہی کافی ہے۔"

"آپ 'وطن دوست لمیٹڈ' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی چلا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں میں نے خاص طور سے نوٹ کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس ادارے سے صرف آپ کی اپنی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کتابوں کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟"

"یہ صحیح ہے کہ اس ادارے سے ابھی تک میری اپنی ہی کتابیں ہی شائع ہوئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو یہ ادارہ دوسروں کی کتابیں بھی شائع کرے گا ـــ لیکن آپ کا اشارہ شاید اس طرف ہے کہ میری کتابیں دوسرے اشاعتی اداروں سے شائع کیوں نہیں ہوئیں؟ وجہ صرف اتنی سی ہے کہ میں اشاعت کے معیار، سلیقے اور خوب صورتی کے سلسلے میں کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتی۔ میں بہت حسّاس ہوں اور میری اپنی ایک خاص پسند ہے، ورنہ ایسے پبلشر کی کمی نہیں جو میرے ناول شائع کر کے فخر محسوس کرتے۔ دوسری بات آپ نے کتابوں کی قیمت کے بارے میں کہی ہے۔ کتابوں کی اشاعت میرے لئے کوئی کاروبار

نہیں، لیکن معیاری پیش کاری کے لئے خرچ بھی تو اتنا ہی ہوتا ہے۔" بشریٰ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ شادی بیاہ اور دیگر ایسے مواقع پر ہزاروں، لاکھوں روپے کے تحفے دینے کی عیاشی تو کر سکتے ہیں، لیکن کتابیں جو علم کا خزانہ ہوتی ہیں، اگر ذرا سی مہنگی ہیں تو ہم شور مچاتے ہیں۔"

"ادب کے بارے میں ایک سوال اور ——— پاکستان میں بہت سے ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں اور ان میں خواتین کے لئے جو ڈائجسٹ ہیں، ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ خالص ادبی پرچے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ادب کے حوالے سے ناقد حضرات ڈائجسٹ قسم کے پرچوں کو اہمیت نہیں دیتے یا یوں کہہ لیں کہ انہیں وہ دوسرے درجے کے پرچے تسلیم کرتے ہیں۔ ناقدوں کے نقطۂ نظر سے ایسے پرچوں میں چھپنا کیا آپ کی ادبی حیثیت اور مقام کو کم نہیں کرتا؟"

بشریٰ لمحہ بھر کے لئے خاموش اور سنجیدہ ہو گئیں اور پھر کہنے لگیں "اگر میں یہاں کے ناقدوں ایوانِ ادب کے چند بڑے بڑے ناموں یا دوسرے ایسے لوگوں کے بارے میں کچھ کہہ دوں تو مجھے ادبی گروہ بندی میں گھسیٹ لیا جائے گا جس سے میں ہمیشہ اپنا دامن بچاتی آئی ہوں۔ یہ بزرگ لوگ ہیں میں ان کا احترام کرتی ہوں۔ لیکن میں یہ تسلیم نہیں کرتی کہ ڈائجسٹ دوسرے درجے کے پرچے ہوتے ہیں ——— خاص طور سے وہ جن میں، میں چھپتی ہوں۔ ان پرچوں کی فائلیں دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ بہت بڑے ادبی نام بھی ان میں چھپے مل جائیں گے کیا وہ بھی دوسرے درجے کے ادیب ہو گئے؟ میری ادبی حیثیت اور مقام کیا ہے ——— اس سوال کا جواب میرے لاکھوں قارئین کے پاس ہے، جن کے لئے میں لکھتی ہوں اور جو مجھے احترام اور محبت سے نوازتے ہیں۔"

میں اور بشریٰ رحمٰن باتیں کر رہے تھے تو تھوڑی دیر کے لئے میاں رحمٰن صاحب بھی

> "اگر میں یہاں کے ناقدوں ایوانِ ادب کے چند بڑے بڑے ناموں یا دوسرے ایسے لوگوں کے بارے میں کچھ کہہ دوں تو مجھے ادبی گروہ بندی میں گھسیٹ لیا جائے گا۔"

تشریف لے آئے۔ ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جان بوجھ کر بشریٰ سے میں نے پوچھ لیا "رحمٰن صاحب سے آپ کی شادی مرضی سے ہوئی تھی یا والدین کی طرف سے طے کی گئی تھی؟"

بشریٰ نے رحمٰن صاحب کی طرف دیکھا اور رحمٰن صاحب کی نگاہیں بشریٰ کی جانب اٹھ گئیں اور پھر دونوں ساتھ ساتھ مسکرا دیئے۔

"یہ سوال رحمٰن صاحب ہی سے پوچھئے۔" بشریٰ نے کہا اور میری نگاہیں رحمٰن صاحب کی طرف مڑ گئیں۔

"ایک طویل داستان ہے جناب!" کہتے ہوئے رحمٰن صاحب نے اپنی یک طرفہ محبت کی ساری کہانی سنا دی۔ اس کہانی کی مکمل تفصیلات کا اندازہ بشریٰ کے چند الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں: "رحمٰن صاحب نے دھمکی دی تھی کہ اگر ان کی شادی مجھ سے نہیں کی گئی تو وہ مجھے (بشریٰ رحمٰن کو) زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"یعنی آپ نے رحمٰن صاحب کی دھمکی سے ڈر کر ان سے شادی کی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب، ایسا قطعی نہیں ہے ہمیں تو ان کا یہ انداز بڑا پیارا لگا۔ اس دھمکی میں پیار کی شدت تھی، کسی مرد کی مکمل مردانگی کا اظہار تھا ——— اور ہمیں خوشی ہوئی۔" ساتھ ہی بشریٰ نے ایک دلچسپ واقعہ بھی سنا ڈالا۔ "ہمارے لئے بہت جگہوں سے رشتے آ رہے تھے۔ ایک صاحب جو بہت تعلیم یافتہ اور مال دار تھے اور کسی غیر ملک میں سکونت پذیر تھے، ہم سے شادی کرنے کے خواہاں ہوئے۔ بات چیت چلی تو امی جی سے کہنے لگے کہ وہ ان کی لاڈلی بیٹی کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دیں گے، اس کی ہر خواہش کو پورا کریں گے ——— وغیرہ۔ کہنے لگے کہ اگر وہ چاہیں تو ہم کھانا تک ان کے لئے تیار کریں گے۔ ہمیں تمام سالن، سبزیاں، ترکاریاں بنانا آتی ہیں۔ صرف ایک بھنڈی بنانا نہیں آتی لیکن وہ بھی ہم سیکھ لیں گے ——— ان کی عاجزی پر ہمیں بہت ترس آیا، لیکن حیرانی بھی ہوئی کہ یا اللہ دنیا میں ایسے مرد بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے صاف کہہ دیا کہ ہم کسی مرد سے شادی کریں گے، کسی ایسے زنانہ قسم کے آدمی سے نہیں۔"

پھر بشریٰ، رحمٰن صاحب کی تعریف کرنے لگیں تو وہ اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے، لیکن بشریٰ کہتی گئیں، "عشق کرنا ہماری کمزوری ہے ——— بلکہ عشق ہماری روح ہے۔ پہلا عشق میں نے اپنی ماں سے کیا، پھر حسن سے کیا، نیکی سے کیا، سچائی سے کیا اور پھر رحمٰن سے کیا۔ رحمٰن میرا من چاہا مرد ہے۔ مجھے اس کے اکھڑپن سے پیار ہے۔ وہ بڑا ضدی ہے اس کی ضدیں مجھے پیاری ہیں۔ وہ جتنا چاہتا ہے، جتنا جانتا ہے، میں اس کے آگے مٹ گئی ہوں، ——— لیکن اس مٹنے میں مجھے بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ وہ انتظار کراتا ہے تو میں اس انتظار سے افسانے بنتی ہوں۔ وہ جدا ہوتا ہے تو میں جدائی کے لمحوں کو گھڑیوں کے قلم سے چن چن کر کاغذ پر سجاتی چلی جاتی ہوں اور اس کا وصل میرے لئے بہاروں کے وصل سے کم نہیں ہوتا۔ اور میرا قلم پھول اگلنے لگتا ہے۔ اور ابھی دامن پھولوں سے بھرتا بھی نہیں کہ وہ چلا جاتا ہے۔ اور پھر انتظار کی رت آ جاتی ہے۔ جدائی کے موسم جوان ہو جاتے ہیں اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جدائی نہ ہو تو ملن کے مزے نہیں آتے۔"

تمہارا کبھی جو تھا

عشرت راشدی

شنو! تمہیں یقیناً یاد ہوگا —

وہ دن، وہ منحوس گھڑی جس کے بعد ہم تم ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے تھے۔ تم اپنے ننھی کو لے کر اسٹیشن کی جانب مجھ سے کچھ کہے بغیر چل پڑی تھیں۔ میں پھر بھی تمہیں سمجھا رہا تھا، منا رہا تھا، مگر تم کیا مانتیں، تم نے تو بات تک کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ پھر گاڑی آ گئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی کی ایک دردناک چیخ فضا میں گونجی تھی اور مجھے اب لگا تھا جیسے یہ میرے دل سے نکلی ہوئی دردبھری آواز ہے۔ اس کے بعد گاڑی دندناتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی اور میں بس دیکھ رہا تھا — تمہیں، اپنے بیٹے ننھی کو۔ پھر نہ جانے کس طرح میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ اور تمہیں خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ خود بخود فضا میں لہرا گیا تھا۔ مگر تم مخالف سمت کو تک رہی تھیں اور میں ہارے ہوئے جواری کی طرح خالی ہاتھ اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ مگر تمہارا نہ کوئی پیغام آیا نہ سندیسہ۔ تمہاری اور ننھی کی یاد مجھے خون کے آنسو رُلا چکی تھی۔ آخر میں نے مقامی اسکول سے، جہاں تم پڑھایا کرتی تھیں، معلومات حاصل کیں اور جب مجھے معلوم ہوا کہ تم اپنا تبادلہ اپنے میکے کے شہر میں کرا چکی ہو تو جیسے آن واحد میں دس بیس تیر میرے جسم میں پیوست ہو گئے۔ مجھے چاروں طرف دھرتی پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ جانتی ہو وہ خون کس کا تھا؟ وہ خون تھا میرا — میرے ارمانوں کا، میرے اعتماد کا، میری محبت کا، میری وفا کا اور میں تڑپتا رہ گیا تھا — جل بن مچھلی کی طرح۔

تم جانتی ہو کہ شادی سے پہلے تم برسرِ روزگار تھیں اور میں نوکری کا طالب۔ میں لاکھ انکار کرتا رہا کہ شادی نوکری سے پہلے مناسب نہیں، مگر تمہارے والد کی بیماری اور ان کی آخری تمنا کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دئے۔ اور تم نے بھی تو مجھ سے کہا تھا "جاوید! تمہیں اس قدر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو ہوں۔ خدا نے ہماری روزی روٹی کا انتظام کر رکھا ہے۔ جب تک تمہیں نوکری نہیں مل جاتی کھائیں گے مل بانٹ کر۔" مگر شادی ہوئے کچھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ تم نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا، مگر نوکری نہ مل سکی تھی۔ تمہاری کمائی سے بنا ہوا کھانا مجھے زہر آلود نظر آتا تھا مگر میں کھا رہا تھا اور جی رہا تھا۔ اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر بکھر کر۔

شنو، تم کیا سمجھتی ہو؟ کیا مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ساجد سے محبت کرتی تھیں اور اسی سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ مگر اس نے تمہیں دھوکا دیا اور ایک مالدار لڑکی سے شادی کر لی۔ بڑھاپے کے ایام اور تمہاری شادی کی فکر تمہارے والد کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھی شاید اسی لئے تم نے مجھ سے منسلک ہو جانا مناسب سمجھا تھا۔ لیکن میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ ساجد کی بے وفائی کے بعد تمہاری آنکھیں کھل گئی ہیں اب تم مجھے اِدھر سے ٹوٹ کر چاہو گی۔ زندگی بھر میرا ساتھ نبھاؤ گی، ایک مثالی بیوی بن کر دکھاؤ گی اور تم نے ایسا کر بھی دکھایا مگر شنو، میں نے ساجد کا وہ خط دیکھ لیا تھا

اس نے تمہیں لکھا تھا اور تم نے بڑے احتیاط سے اسے ساڑی میں چھپا دیا تھا لیکن میں پھر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ تم اسے خاطر میں نہ لاؤ گی۔ مگر تم نے اسے آنکھوں سے لگایا، چوما۔ ہاں سنو، اس خط نے تمہیں بے وفائی پر اکسایا اور ایک بسا بسایا گھر اجاڑ دیا۔ تم اس کے بہکانے میں آکر مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میری ارمانوں بھری دنیا اجاڑ کر میرا بیٹی مجھ سے چھین کر—

یاد کرو وہ اپنا آخری خط، جسے پڑھ کر مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ تم نے مجھ سے خلع چاہا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں نے خون برسا دیا تھا مگر میں نے انہیں زمین پر گرنے نہ دیا تھا، بلکہ اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔

اور پھر ایک دن مجھے نوکری مل گئی تھی اور رضیہ کا ساتھ بھی۔ وہ میرے ہی ساتھ کام کرتی تھی۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے ہو گئے۔ خدا نے اس کی سن لی اور ہمارا گھر ایک معصوم کی فرحت بخش کلکاریوں سے گونج اٹھا۔ میرے زخم بھرتے چلے گئے، مگر میں تمہیں بھلا نہ سکا۔

ذرا سوچو تو، تمہارا وہ جلد بازی میں اٹھا ہوا قدم جس نے تمہیں ناکامی اور بدنامی کے عمیق غار میں پہنچا دیا۔ ساجد تمہیں صرف شطرنج کے مہرے کی طرح استعمال کر رہا تھا بازی جیتنے کے لئے، اپنی سسرال سے موٹی رقم بٹورنے کے لئے، تم سے دوسرے نکاح کی دھمکی دے کر ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے اور وہ اپنی چال میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے تمہیں پوچھا تک نہیں۔ تم ہی بتاؤ اس سودے میں تمہیں کیا ملا؟ لامتناہی تنہائی، سارے جہان کی رسوائی، ایک ایسی زندگی جو موت سے بدتر ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم مکمل خطاوار نہیں، دوش ساجد کا زیادہ ہے اس نے پہلے تمہیں محبت کے دام میں پھانسا پھر مالدار لڑکی سے شادی کر لی۔ اور بعد میں تمہارے بھولپن سے فائدہ اٹھا کر اپنے سسرال سے موٹی رقم اینٹھ لی اور تم اسے سمجھ ہی نہ سکیں۔ محبت جرم نہیں، مگر وہ محبت، محبت نہیں عیاشی ہے، گناہ ہے، جو عورت کو اس قدر اندھا کر دے کہ اسے احساس تک نہ ہو کہ کس راستے پر چل رہی ہے۔

خیر چھوڑو، جو گزر گئی سو گزر گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ تمہارے ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔ اپنے بیٹی کا خیال رکھنا اور پھر ان آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے ہیں— اسی خط پر۔ انہیں بطور نذرانہ قبول کر لو— اور ہو سکے تو اپنا گھر بسا لو۔ اور اگر ایسا ممکن نہیں تو آج بھی میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں، کیوں کہ تم نے مجھ سے خلع لیا تھا میں نے تمہیں طلاق نہیں دی تھی۔ رضیہ بڑے دل کی مالک ہے۔ ہماری اس سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہے فقط—

تمہارا جو کبھی تھا ○

گھریلو

نسخے

سر درد کے لئے : اگر سر میں شدت کا درد ہو رہا ہو تو ماتھے پر ورکس کا لیپ کریں۔ تھوڑی ہی دیر میں درد دور ہو جائے گا

آنکھ سے کنکر، تنکا وغیرہ نکالنے کی ترکیب : اگر آنکھ میں کنکر یا تنکا وغیرہ پڑ جائے تو ایک پیالے میں پانی لبالب بھر لیں بعد میں آنکھ کو ڈبو کر بار بار جھپکائیں ذرا سی دیر میں تنکا وغیرہ نکل جائے گا۔ ایسی صورت میں آنکھ کو ملنا نقصان دہ ہے۔

مچھروں سے بچنے اور جلد میں نرمی پیدا کرنے کی ترکیب :
لیموں کا رس اور گلیسرین، دونوں کو ملا کر جسم پر ملنے سے مچھر نہیں کاٹتے اور جلد بھی ملائم ہو جاتی ہے۔

گرم تیل سے ہاتھ پاؤں جل جانے پر فوری علاج :
اگر ہاتھ پاؤں گرم تیل یا گھی یا چربی وغیرہ سے جل جائیں تو جس عضو کی جلد جلی ہو، اسے ٹھنڈے پانی میں ڈبو دینا چاہئے۔ اس طرح آبلے نہیں پڑیں گے۔ اور جلن بھی نہیں ہو گی۔ کھال پر ٹماٹر، گھی یا مرہم وغیرہ قسم کی کوئی چیز نہ لگائیے۔

جلے ہوئے مقام پر ٹھنڈک پیدا کرنے کی ترکیب :
جلے ہوئے مقام پر فوری طور پر کیسٹر آئل لگا لینے سے ٹھنڈک پڑ جاتی ہے اور جلنے کا نشان باقی نہیں رہتا۔

بھاپ کی جلن ختم کرنے کی ترکیب :
اگر ہاتھ یا جسم کا کوئی حصہ بھاپ سے جل جائے تو کچا آلو پیس کر لگا دیجئے۔ چند منٹوں میں ہی آپ کافی آرام محسوس کریں گے

کانچ کے برتن صاف کرنے کی ترکیب :
کانچ کے برتن صاف کرنے کے لئے آلو کے گول ٹکڑے کاٹ کر گرم پانی میں ڈال دیں اور اس پانی میں کپڑے کو تر کر کے برتنوں کو رگڑیں برتنوں کو صاف کرنے کے بعد سرکے کے پانی میں یا لیموں کے عرق سے ایک بار دھو ڈالیں تو ان میں چمک پیدا ہو جائے گی۔

بچوں کی تعریف کر کے ان کا کردار بنایئے

احمد علی

نفسیاتی ماہرین کا قول ہے کہ انسان کے کردار کی بنیاد بچپن میں ہی رکھی جاتی ہے بچپن کے بنے ہوئے نقش زندگی بھر قائم رہتے ہیں۔ زندگی میں ایک خصوصیت جو سب سے زیادہ انسان کے کام آتی ہے، وہ عزتِ نفس ہے جسے اپنی قابلیت، ذہانت اور استعداد کا بخوبی علم ہے، اس کی زندگی خود اعتمادی کا ایک بے مثال نمونہ ہو گی۔ اس وصف کو پیدا کرنے اور آگے بڑھانے میں ماں باپ اور استاد ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ نپولین کی ماں بچپن میں اسے بہادری کے قصے سنایا کرتی تھی شیواجی کی ماں کا بھی یہی معمول تھا۔ اسی لئے دونوں اپنے اپنے طور پر عہد ساز ہستی بنے۔

اگر بچے نے اسکول کا کام ڈھنگ سے کیا تو ماں باپ کا فرض ہے کہ اس کی پیٹھ ٹھونکیں۔ اس کے لکھے ہوئے مضمون میں غلطیاں نہ نکالیں۔ ہم جب بچے کا معائنہ کرتے ہیں تو اس میں بچے اور گرامر کی غلطیاں تلاش کرتے ہیں۔ بچے کو اپنی قابلیت کے معیار سے ناپنا غلط ہے۔ ایک بچے کو سائنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول میں اسے ایک سائنسی موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا۔ ماں باپ نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے بچے سے کہا کہ ”تم تمام دن سائیکل چلاتے ہو، گلی ڈنڈا کھیلتے ہو، بھلا تم سائنس پر کیا خاک لکھ سکو گے؟“ بچے نے اس بات کو ایک چیلنج سمجھا۔ اس نے کوشش کر کے تین صفحے کا ایک مضمون لکھا اور ٹیچر کے سامنے پیش کر دیا۔ جب بچہ یہ مضمون لے کر واپس گھر آیا تو ماں باپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ٹیچر نے اس پر اپنا تبصرہ دیا: ”مضمون اچھا ہے کوشش جاری رکھو۔“ دوسرے دن بچے کی ماں ٹیچر سے ملی اور اس سے اس بارے میں سوال کیا۔ ٹیچر نے کہا: ”مضمون تو معمولی تھا، لیکن میں نے تعریف کر کے بچے کا دل بڑھا دیا مجھے اس سے بہتر کام کی امید ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔“ بچے کے کام کی تعریف واقعی اس کے ذہن میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔

اگر بچے کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ اسے اس کی محنت کا صلہ ضرور ملے گا تو اس کے دل میں کام کی لگن پیدا ہو جاتی ہے اکثر والدین اس معاملے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ وہ اس کے کام میں عیب ڈھونڈتے ہیں۔ بچہ اس طرزِ عمل سے مایوس ہو جاتا ہے اس کی خود اعتمادی کو دھکا پہنچتا ہے۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ بعض والدین بچے کو صرف اس لئے اسکول بھیجتے ہیں کہ چند گھنٹے گھر میں امن و امان رہے گا انہیں یہ بھی معلوم نہیں رہتا کہ ان کا بچہ کون سے درجے میں پڑھتا ہے۔ ماں باپ کا یہ طرزِ عمل خواہ جہالت کی وجہ سے ہو یا بے پرواہی کے باعث دونوں صورتوں میں نقصان دہ ہوتا ہے۔

یہ نفسیات کا اصول ہے کہ کسی انسان سے اچھی امید رکھی جائے تو وہ انسان مایوس نہیں کرتا۔ بچے کے معاملے میں یہ بات اور بھی اہم ہے لیکن اس میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ اگر ماں باپ بچے کی استعداد سے بڑھ کر امید لگا لیں تو بچے کے لئے یہ

اُمید مصیبت کا پہاڑ بن جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں اخبار میں ایک بھیانک خبر شائع ہوئی تھی۔ یہ خبر جاپانی بچوں کے متعلق تھی وہاں بچوں کی خودکشی کی تعداد بڑھ رہی ہے یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ان بچوں کی عمر سات آٹھ سال ہوتی ہے۔ یہ بچے اسکول میں اچھے نمبر نہیں لاتے یا فیل ہو جاتے ہیں تو ماں باپ کو اپنا منہ نہیں دکھا سکتے۔ ماں باپ ان سے غیر معمولی کام کی توقع رکھتے ہیں جب بچے امتحان میں ناکام ہوتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ والدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ وہ ان کی کوتاہی پر انھیں بُرا بھلا کہیں گے۔ کوئی جائے فرار نہ دیکھ کر وہ خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی کبھی کبھی ایسی خبر شائع ہوتی ہے کہ ایک لڑکے نے میٹرک کا امتحان دیا اور فیل ہو جانے پر خودکشی کرلی۔

اس میں شک نہیں کہ تعریف بچے کا دل بڑھاتی ہے، لیکن بے معنی اور بے جا تعریف کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ بچے کا کام معمولی ہے تو تعریف میں مبالغہ سے کام لینا مناسب نہیں۔ بچے کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کا کام معمولی ہے۔ ماں باپ خواہ مخواہ اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ اس طرح بچہ اپنے کام کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب والدین اس کام سے ہی خوش ہیں تو اسے زیادہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ بچہ اس طرح سوچے "میرے والدین اس سے زیادہ کی اُمید نہیں رکھتے۔ شاید مجھ میں اس سے بہتر کارکردگی کی قابلیت ہی نہیں ہے۔" بچے کے دل میں اس بات کا شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ماں باپ جھوٹ موٹ اس کا دل بڑھا رہے ہیں یا اس کام کی نوعیت کو ہی نہیں سمجھتے۔ بچہ تعریف سے خوش ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ جاتا ہے کہ ایک دن اس کی ساکھ بگڑ جائے گی اس وقت تو کام چل گیا، لیکن ایسا بار بار نہیں ہو سکتا۔ ماں باپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ تعریف کا مستحق نہیں ہے۔ یہ خوف اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔

ماں باپ کو بچے کے کام پر تبصرہ کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ وہ کام کے انجام سے زیادہ اس کی کوشش کو سراہیں اس طرح وہ بچے کو اس کی تعلیم دیتے ہیں کہ کام کا انجام خدا کے ہاتھ ہے اس کا فرض تو کوشش کرنا ہے۔ ہمارے سماج میں کام کی اچھائی یا بُرائی اس کے انجام پر منحصر ہے کوشش کی داد نہیں ملتی۔ اچھا کیا تو خدا نے، بُرا کیا تو بندے نے۔ اچھے کام کا بُرا نتیجہ نکلے تو لوگ بُرائی کرتے ہیں بُرے کام کا اچھا نتیجہ نکلے تو لوگ اسے سراہتے ہیں۔ یہ ایک سماجی بُرائی ہے جس کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔

"تعریف میں مبالغہ سے کام لینا کسی طور مناسب نہیں۔ تعریف کی مقدار کام کی بہتری کے مطابق ہونی چاہئے۔ ایک لڑکی کو کھانا پکانے کا شوق تھا ماں اس کا دل بڑھاتی تھی۔ اگر کھانے میں کوئی عیب رہ جائے تو وہ اسے ظاہر نہیں کرتی تھی۔ ایک بار لڑکی نے قورمہ بنایا تو وہ بہت اچھا نہیں تھا، لیکن ماں نے اسے سمجھانے کی بجائے اس کی تعریف شروع کردی: "قورمہ بہت اچھا بنا ہے۔ اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ دراصل گھی اچھا نہیں تھا۔ گوشت بھی باسی تھا۔ مسالوں میں آج کل ملاوٹ اتنی بڑھ گئی ہے کہ اچھا قورمہ بنانا مشکل ہے۔" ماں کو لازم تھا کہ وہ اسے سمجھاتی کہ اس سے کہاں کوتاہی ہوئی ہے۔ اس طرح لڑکی اچھا کھانا پکانا سیکھ جاتی۔ ماں نے بے جا تعریف کرکے لڑکی کی تعلیم میں رخنہ ڈال دیا اور وہ کھانا پکانے میں مہارت حاصل نہ کرسکی۔

یہ درست ہے کہ والدین کو بچے کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہئے، لیکن اس میں ضرورت سے زیادہ فیاضی دکھانا بھی ٹھیک نہیں۔ بچے کے ہر کام کی تعریف کی جائے تو اسے اس بات کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کا کون سا کام قابل تعریف ہے۔ اس طرح بچے کی ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ اسے تعریف سننے کی عادت ہو جاتی ہے وہ تعریف سننے کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ نہ ملے تو اس کا دل کام میں نہیں لگتا۔ والدین بچے کو اس بات کی عادت ڈال دیتے ہیں جو آئندہ زندگی میں اسے نہیں مل سکتی۔ تعریف سننے کا عادی بچہ نکتہ چینی اور تبصرے سے گھبراتا ہے۔ وہ ہر اس کام سے جی چُراتا ہے جس میں اسے نکتہ چینی کا شبہ ہو۔ اس طرح اس کی کارکردگی کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ یہ بچے پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن بہاؤ کے ساتھ مُردہ مچھلیاں ہی تیرتی ہیں۔ بہاؤ کے مخالف تیرنا خود اعتمادی کی نشانی ہے۔ ہمیشہ تعریف سننے کے عادی بچے اس خود اعتمادی سے محروم رہتے ہیں۔

تعریف بچے کا دل ضرور بڑھاتی ہے لیکن بچہ تعریف سے کچھ نہیں سیکھتا۔ وہ نکتہ چینی سے سیکھتا، اپنی ناکامی سے سیکھتا ہے مثل مشہور ہے کہ ناکامی کامیابی کی کنجی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے کی تربیت میں تعریف کا کتنا حصہ ہو؟ کیا ماں باپ کو جان بوجھ کر تعریف سے گریز کرنا چاہئے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اگر آپ کا بچہ دکاندار سے اچھی طرح چُکا کر سودا خریدتا ہے یا آپ کی بچی سلائی یا کتائی میں آپ کی مدد کرتی ہے تو آپ کو اپنی خوشی کا اظہار کرنے میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ خوشی کا اظہار فخر کے اظہار سے بہتر ہے۔ اگر آپ اپنی بیٹی سے یہ کہیں کہ "کھڑا قورمہ تم اچھا پکا لیتی ہو۔" تو اس سچی تعریف سے بیٹی کا دل بڑھ جائے گا۔ بس اتنی ہی تعریف کافی ہے یہ کہنا کہ "بیٹی تم تو غضب کا کھانا پکاتی ہو، تمہارا جواب نہیں!" سچی تعریف نہ ہوگی۔ کسی کام کو دیکھ کر ماں کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ جائیں، اس سے بڑھ کر بچے کے لئے کیا انعام ہو سکتا ہے؟

انور کمال انور

مظلوم لڑکیاں

بڑھتا ہی جا رہا ہے طریقہ جہیز کا
دن رات ہے ترقی پہ دھندا جہیز کا
رشتے سے پہلے آ رہا ہے پرچہ جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

انسانیت کے نام پہ تہمت جہیز ہے
ننگِ وطن بدنامِ شرافت جہیز ہے
یہ بات ہے درست کہ لعنت جہیز ہے
دامن سے اب مٹا دو یہ دھبا جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

لڑکی غریب باپ پہ اک بوجھ بن گئی
کس طرح ہاتھ پیلے کرے فکر ہے یہی
درد و الم میں ڈوبی ہے تصویرِ زندگی
پیشِ نگاہ رہتا ہے نقشہ جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

شعلوں کی سیج پہ حسیں پیکر سلا دیا
پایا نہ جب جہیز تو زندہ جلا دیا
زر کی ہوس نے انساں کو حیواں بنا دیا
لایا ہے رنگ سینکڑوں جذبہ جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

تصویرِ بےکسی ہیں یہ مغموم لڑکیاں
حسرت سے دیکھتی ہیں یہ معصوم لڑکیاں
انصاف مانگتی ہیں یہ مظلوم لڑکیاں
تکتی ہیں بےبسی آنکھوں سے چہرا جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

جیسے بھی ہو مٹا دو تشدد کے راج کو
ٹھکرا دو پائے عزم سے تم اس رواج کو
اس گندگی سے پاک کر دو اب سماج کو
پورا کرو نہ کوئی تقاضہ جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

اس رسم سے ضروری ہے اس وقت اختلاف
بیباک ہو کے بولو تم اس رسم کے خلاف
سرمایہ کے غلاموں سے کہہ دو یہ صاف صاف
اب بند کر دو دیکھنا سپنا جہیز کا
اٹھو کہ اب دبا دو یہ فتنہ جہیز کا

اسے آج اپنے اردگرد کا ماحول کیسا اُداس اُداس سا لگ رہا ہے!

کیاریوں میں لگے ہوئے پودوں میں طرح طرح کے خوش نما پھول اپنی مہک سے فضا کو معطر کر دیتے تھے، لیکن اب ان کی تازگی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ نہ خوش گوار ہوا کے جھونکے اسے فرحت بخش رہے تھے اور نہ وہ سورج کی کرنوں میں نرمی محسوس کر رہا تھا — کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا اسے — کچھ بھی تو نہیں۔

یہ گھر اب پہلا سا گھر نہیں رہا۔ مٹی کی دیواروں والا سادہ سا گھر اب سیمنٹ اور چونے کی مضبوط دیواروں والی دو منزلہ عمارت میں تبدیل ہو چکا ہے، جس میں آرام و آسائش کے تمام لوازم موجود ہیں۔ لیکن آج.....

آج وہ یہاں آرام اور سکھ چین کے لئے ترس رہا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہے، ان پختہ دیواروں کو ڈھا دے مسمار کر دے اس خوش نما عمارت کو اور وہ پہلا سا مٹی کا گھر بنوا لے۔ اس کا جی یہ بھی چاہ رہا ہے کہ ان دیواروں سے لپٹ کر ایک بچے کی طرح روئے۔ یہاں کی ہر شے کو اپنی باہوں میں اتنے زور سے دبوچے کہ اس کا سینہ شق ہو جائے۔ یہ کیسے متضاد جذبے اس کے دل میں

بیوہ کی آواز

چھن گئی وقت کے ہاتھوں مرے ہونٹوں کی ہنسی
روٹھ کر مجھ سے مسرت بھی کہیں دور گئی　　جانتی ہوں کہ بہت ہو کے وہ مجبور گئی
قہقہے اب نہ لگا پاؤں گی میں جیتے جی

کتنی بے نور مری مانگ ہے افشاں کے بغیر
پونچھ ڈالی مرے ہاتھوں کی یہ مہندی کس نے　　توڑ دی مری کلائی کی یہ چوڑی کس نے
زندگی کیسے کٹے گی کسی امکاں کے بغیر

کوئی شے اپنی طرف کھینچ نہ پائے گی مجھے
میں کہ زندہ ہوں مگر دور ہوں ہستی سے بہت　　ہوں میں بستی میں مگر بُعد ہے بستی سے بہت
لاکھ میں چاہوں مگر موت نہ آئے گی مجھے

لوٹ کر میرا سہاگ آئے یہ ممکن ہی نہیں
جانے والا کبھی آ جائے یہ ممکن ہی نہیں

کون سا کام قابلِ تعریف ہے۔ اس طرح بچّے
کی ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ اسے تعریف سُننے
کی عادت ہو جاتی ہے وہ تعریف سُننے کے
لئے کام کرتا ہے۔ یہ نہ ملے تو اس کا دل کام
میں نہیں لگتا۔ والدین بچّے کو اس بات کی
عادت ڈال دیتے ہیں جو آئندہ زندگی میں اسے
نہیں مل سکتی۔ تعریف سننے کا عادی بچّہ
نکتہ چینی اور تبصرے سے گھبراتا ہے۔ وہ ہر
اس کام سے جی چُراتا ہے جس میں اسے نکتہ چینی
کا شبہ ہو۔ اس طرح اس کی کارکردگی کا دائرہ
محدود ہو جاتا ہے۔ یہ بچّے پانی کے بہاؤ کے
ساتھ تیرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن بہاؤ
کے ساتھ مُردہ مچھلیاں ہی تیرتی ہیں۔ بہاؤ کے
مخالف تیرنا خود اعتمادی کی نشانی ہے۔
ہمیشہ تعریف سننے کے عادی بچّے اس
خود اعتمادی سے محروم رہتے ہیں۔
تعریف بچّے کا دل ضرور بڑھاتی ہے
لیکن بچّہ تعریف سے کچھ نہیں سیکھتا۔ وہ نکتہ چینی
سے سیکھتا، اپنی ناکامی سے سیکھتا ہے مثل
مشہور ہے کہ ناکامی کامیابی کی کنجی ہے۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچّے کی
تربیت میں تعریف کا کتنا حصّہ ہو؟ کیا ماں
باپ کو جان بُوجھ کر تعریف سے گریز کرنا چا۔

وفا یا جبر

محمد طارق

اسے آج اپنے اردگرد کا ماحول کیسا اُداس اُداس سا لگ رہا ہے!

کیاریوں میں لگے ہوئے پودوں میں طرح طرح کے خوش نما پھول اپنی مہک سے فضا کو معطر کردیتے تھے، لیکن اب ان کی تازگی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ نہ خوش گوار ہوا کے جھونکے اسے فرحت بخش رہے تھے اور نہ وہ سورج کی کرنوں میں نرمی محسوس کر رہا تھا — کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا اسے — کچھ بھی تو نہیں۔

یہ گھر اب پہلا سا گھر نہیں رہا۔ مٹی کی دیواروں والا سادہ سا گھر اب سیمنٹ اور چونے کی مضبوط دیواروں والی دو منزلہ عمارت میں تبدیل ہو چکا ہے، جس میں آرام و آسائش کے تمام لوازم موجود ہیں۔ لیکن آج.....

آج وہ یہاں آرام اور سکھ چین کے لئے ترس رہا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہے، ان پختہ دیواروں کو ڈھا دے مسمار کردے اس خوش نما عمارت کو اور وہ پہلا سا مٹی کا گھر بنوا لے۔ اس کا جی یہ بھی چاہ رہا ہے کہ ان دیواروں سے لپٹ کر ایک بچے کی طرح روئے۔ یہاں کی ہر شے کو اپنی بانہوں میں اتنے زور سے دبوچے کہ اس کا سینہ شق ہو جائے۔

یہ کیسے متضاد جذبے اس کے دل میں بیک وقت جنم لے رہے ہیں۔

وہ سوچے جا رہا تھا چھپر کھٹ پر بچھے ہوئے نرم مخملی بستر پر چت لیٹے ہتھیلیوں کو سر کے نیچے رکھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" وہ اپنی بیوی کی آواز پر چونکا، جو اس کے پاس نہ جانے کب سے بیٹھی اسے خاموش تک رہی تھی۔

"کہاں —؟ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں!" اسے اپنی ہی آواز بالکل اجنبی سی لگی۔

یہ جھوٹ اس کے لبوں سے کیوں نکلا؟ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بیوی پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کر کے اسے بھی رنجیدہ اور افسردہ بنا دے اس کا جی یہ بھی چاہ رہا تھا کہ اپنے دل کے سمندر میں طوفانی لہروں کی طرح اٹھتے ہوئے غمگین جذبات کے جوار بھاٹا میں تنہا ہی مبتلا ہے نہ کوئی غم کا شریک ہو، نہ کوئی دردِ دل کا آشنا۔ حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کی بیوی اس کے غم سے واقف ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے۔ مگر وہ اسے بچانا چاہتا ہے، اسے بہلانا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا

"کہاں؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں!"

"اچھا تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"وہی جو آپ سوچ رہے ہیں۔"

"بتاؤ تو بھلا میں کیا سوچ رہا تھا" اس نے اپنی بیوی کے بازو میں ہلکی سی چٹکی لے کر لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کہا۔

وہ بڑی گہری تنقیدی نگاہوں سے اس کے مسکراتے ہوئے لبوں کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "آج کہہ کر بتانے کا نہیں صرف محسوس کرنے کا وقت ہے۔" اس نے اپنے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک لب شوہر کے مسکراتے لبوں پر رکھ دئے اور اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں...

شوہر کے کانوں پر اپنی بیوی کے دل کی دھڑکنوں کی آواز ہولے ہولے دستک دے رہی تھی ہوا سے بالکل اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز لگ رہی تھی۔ ایک ہی جیسی دھک دھک — دھک دھک...

ہمیشہ اسی طرح لپٹ کر رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نرم گرم مخملی رضائی کے اندر اس سرد رات کی ٹھٹھرتی تنہائیوں میں، برسات کی بھیگی راتوں میں تمہارے چوڑے چکلے بھرے بھرے سینے پر سر رکھ کر تمہاری بانہوں کی گرفت میں اپنا تمام وجود سونپ کر۔ بے خبر ہو کر سونے کو جی چاہتا ہے — وہ اپنے شوہر کے لبوں کا ایک طویل

- قلم کی کاٹ تلوار سے کاری ہے۔ اور زبان کے زخم کا کوئی مرہم نہیں۔
- لیکن دن اگر مطالعہ نہ کیا جائے تو گفتگو کی چاشنی اور وزن ختم ہونے لگتا ہے۔
- زندگی کا ہر دکھ لالچ اور حرص کی پیداوار ہے۔
- کم زور طاقتوں سے تیز دوڑنے کا انجام برا ہوتا ہے۔

رحیم النساء بخش
(بلگام۔ کرناٹک)

جو سمجھتے وقت سوچ رہی تھی۔
اور وہ ــــ ؟

اس کا سارا جسم بیوی کے بوسے کی لذت سے محروم رہا تھا۔ نہ اس کی شریانوں میں لہو کی رفتار تیز ہوئی تھی، نہ دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوا تھا۔ بس ایک سناٹا۔ ایک عجیب قسم کے جمود کا تسلط تھا، کیوں کہ وہ اپنے دل کے قبرستان میں اپنی ہی تمناؤں کی لاشوں کے کفن نوچ رہا تھا اور سوچ رہا تھا "کاش! یہاں کلرکی میں جو مجھے آٹھ، نو سو روپے مل رہے تھے، اس پر ہی قناعت کر کے زندگی بسر کر لیتا تو شاید مجھے اس قدر روحانی اذیت نہ ہوتی مگر میرے بھائی بہنوں کا کیا بنتا؟

وہ ایک بھائی کو انجینیرنگ میں داخلہ دلانے کے لئے چار ہزار روپے ڈونیشن کے کہاں سے لاتا؟ والدین کی خواہش کے مطابق دوسرے بھائی کو ڈاکٹری پڑھانے کے لئے پیسے کہاں سے آتے؟ بہنوں کے بیاہ کے لئے جہیز اور شادی کرنے کے لئے کثیر رقم کی بھی تو ضرورت ہے۔ وہ والدین، جن پہ اب نہ جانے کتنے امراض کا حملہ ہو گیا ہے، اپنا علاج کہاں اور کیسے کرتے؟ والد صاحب کا بلڈ پریشر نارمل کیسے ہوتا؟ کتنی مہنگی مہنگی دوائیاں ہیں، ان کی۔ اگر میں پردیس نہ جاتا اور نو سو روپے کی بجائے نو ہزار نہ کماتا تو یہ سب کام دھرے کے دھرے رہ جاتے۔

"یہ گھر بھی ٹھیک ہی رہتا۔ سادہ سا تھوڑا۔ سب کی زندگیاں کس قدر بے کیف، بے رنگ ہو کر رہ جاتیں ــــ مگر کتنی اذیت ہو رہی ہے مجھے! زندگی کا ہر لمحہ درد بھرا ہو گیا ہے۔ اپنوں سے جدائی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے۔ رہ رہ کر تڑپاتی ہے، رُلاتی ہے یہ درد ناک سناٹے سے بھری ہوئی جدائی ــــ کاش میں یہیں رہتا، ہمیشہ اپنوں کے ساتھ۔

"مجھ سے اچھے تو میرے وطن کے مزدور ہیں۔ دن بھر کڑی محنت کرنے والے گرمیوں کی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں تپنے والے شدید سردیوں میں ننگے بدن ٹھٹھرنے والے موسلادھار برسات میں بھیگنے والے مزدور اپنے جھونپڑوں میں ماں باپ، بیوی بچوں، بھائی بہنوں کے ہمراہ رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر چین کی بانسری بجاتے ہیں۔

"میں وہاں ایسی کڑی محنت نہیں کرتا۔ ایر کنڈیشنڈ آفس میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے فائل کالے کرتا ہوں۔ لیکن کتنا تھک جاتا ہوں۔ جب اپنے فلیٹ میں آتا ہوں تو نڈھال ہو کر نرم بستر پر پڑ جاتا ہوں۔ بدن کا عضو عضو ٹوٹنے لگتا ہے۔ بیوی کے نرم نرم ہاتھوں کی یاد آتی ہے۔ اس کا چہرہ نگاہوں میں ڈولنے لگتا ہے "کیوں؟ آج آپ بہت تھکے تھکے سے لگ رہے ہیں۔ میں ہاتھ پاؤں دبائے دیتی ہوں۔ لایئے میں سر میں آنولے کا تیل ڈال کر مالش کئے دیتی ہوں۔" بیوی کی آواز رگ رگ میں سماتی چلی جاتی ہے ــــ اور میں ــــ میرے اندر زلزلہ سا آ جاتا ہے، میں اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھرتا چلا جاتا ہوں۔ پھر بہت سی آوازوں کے ہتھوڑے میرے ٹوٹے پھوٹے وجود کو کوٹ پیٹ کر اور بھی ریزہ ریزہ بنا دیتے ہیں۔ میرے بچوں کی آوازیں ان کی معصوم ہنسی ان کی پیاری پیاری باتیں۔

"میرے والدین کی شفقت اور ممتا بھری باتیں۔"

"بھائی بہنوں کی محبت بھری آوازیں۔"

"صرف آوازیں۔"

"میں چور، چور ہو جاتا ہوں۔ شان دار فلیٹ میں آرام دہ بستر پر اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹنے کی ناکام کوشش میں ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جاتا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ صرف میرا سینہ پھول کر آہستہ آہستہ پچک جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے بھرے غبارے کی طرح جس میں باریک سی سوئی سے معمولی سا سوراخ ہو گیا ہو۔ نتھنے پھڑک کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ بالکل بے آب مچھلی کے گل پھڑوں کی طرح آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہیں۔ پھر میں جیسے مر جاتا ہوں لیکن صبح کو پھر زندہ ہو جاتا ہوں ــــ مرنے کے لئے۔ یہ بار بار مرنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے!"

وہ خاموش اپنی بیوی کے افسردہ چہرے کو تکتے ہوئے سوچے جا رہا تھا، جو نہ معلوم کب سے اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اسے تو کچھ احساس ہی نہیں ہوا تھا، جیسے اس کا تمام جسم اندر سے مر چکا تھا، کیسی قابلِ رحم بے حسی اس پر چھا گئی تھی! صرف اس کا شعور زندہ تھا، جو اس کی بیوی سے مخاطب تھا، ایک کرب ناک احساس کے ساتھ خاموش مخاطب۔

"کاش! مجھے اپنی فیملی کا ویزا مل جاتا اور میں تمہیں اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ لیکن نہیں! میں تمہیں اور دونوں بچوں کو ویزا ملنے پر بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ معلوم ہے کیوں؟

"میرے بچوں سے میرے والدین کو بے حد پیار ہے۔ وہ انہیں بھی بے حد چاہتے ہیں میری بہنیں بھی تم پر جان چھڑکتی ہیں، میرے بیٹوں پر واری جاتی ہیں۔ ان سب کی پیار کی گہرائی دیکھ کر میں انہیں ان سے دور کیسے کر سکتا تھا؟ ان کے کھلے ہوئے چہرے مرجھا جاتے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ ان کے لب سسکیوں سے تھرتھرا اٹھتے ــــ اور میں یہ سب نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس

لئے میں تمہیں نہیں لے جا سکتا تھا۔

"مجھے احساس ہے کہ میرے بغیر تمہاری زندگی کتنی ادھوری اور کس قدر سونی رہتی ہوگی۔ زندگی کے اس جان لیوا سناٹے میں تم اکثر میری یاد میں کھو جاتی ہو گی۔ میری یاد تمہیں اتنی ہی تڑپاتی ہوگی جتنی تمہاری یاد مجھے تڑپاتی ہے۔ مجھے احساس ہے اس اذیت کا جو میرے خاندان کی تعمیر کے لئے تم خاموشی سے سہے جا رہی ہو، تم کتنی عظیم ہو! کتنی مقدس!"

جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اپنی بیوی سے لپٹ گیا۔ بیوی نے چہرہ اٹھا کر اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ اس کی پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ پڑے۔

"کیوں، تم رو رہی ہو!" وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

"یوں ہی آنسو نکل گئے۔ آپ کل صبح جا رہے ہیں نا — اس لئے۔"

"تو میں نہ جاؤں؟"

"نہیں نہیں، میں نے یہ کب کہا ہے۔ آپ ضرور جائیے۔ آپ کے کندھوں پر بہت ساری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے، جنہیں پورا کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ بالکل رنجیدہ نہ ہوں۔ یہ آنسو تو یوں ہی ....."

اس نے بے اختیار اپنی بیوی کو سینے سے لگا لیا "تم ایک عظیم عورت ہو — ایک مقدس دیوی!"

"نہیں نہیں، صرف تمہاری شریکِ حیات۔"

بیوی کی بات نے اس کے کانوں میں جیسے آبِ حیات ٹپکا دیا — وہ تمام وجود میں تازگی سی محسوس کرنے لگا ایک عجیب قسم کی فرحت۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی بیوی کو اتنا پیار کرے کہ آج تک کسی مرد نے کسی عورت کو دکیا ہو۔ اسی چاہت کے زیرِ احساس وہ اپنی بیوی کو دیوانہ وار چومنے لگا۔

رات ہولے ہولے ڈھل رہی تھی....

اس کے کمرے کے سامنے دالان میں لٹکے ہوئے پنجرے میں بند طوطا سیر پھڑ پھڑا کر خاموش ہو گیا تھا شاید وہ نیند سے کچھ دیر کے لئے بیدار ہوا ہوگا۔

عرصہ ہوا، یہ طوطا بن بلائے مہمان کی طرح اس کے گھر کی دیوار پر آیا تھا اور اس کے بھائیوں بہنوں اور بیوی نے اسے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے کچھ جملے طوطے کو رٹا دیئے تھے۔ جن کا وہ دن بھر اعادہ کرتا رہتا تھا اور سب سُن سُن کر خوش ہوتے تھے۔ صرف وہی ایک تھا جسے پنجرے میں طوطے کو دیکھ کر دکھ ہوا کرتا تھا اس لئے اس نے بار ہا پنجرے کے پٹ کھولے تھے لیکن طوطا جیسے اڑنا بھول گیا تھا — بالکل اس طرح جیسے وہ رات کو اپنی بیوی کا ایک شہد بھرا جملہ سُن کر یہ بھول گیا تھا کہ اسے صبح کو جانا ہے۔

صبح کو وہ پردیس چلا گیا — اپنے دونوں بیٹوں کو پیار کر کے، اپنی بیوی کو نظر بھر دیکھ کر، اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں سے مل کر، سب کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سنبھالے وہ سمندر پار چلا گیا — حسبِ معمول سال میں ایک بار دو ماہ کی چھٹی لے کر آنے کے لئے۔

وہ کئی برس تک سال میں ایک بار دو ماہ کی چھٹی لے کر آتا رہا۔ لیکن وہ اپنی ماں کے انتقال پر نہ آسکا اور نہ اپنے باپ کی وفات پر۔ اس کا اسے بے حد قلق تھا۔

آج جب اس کی بہنوں کی اچھے گھرانوں میں شادیاں ہو چکی تھیں، بھائی برسرِ روزگار ہو گئے تھے اور اپنی اپنی شادیاں کر کے الگ الگ گھر بسا چکے تھے، اور اس کے دونوں بیٹے ڈاکٹر بن گئے تھے تو وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر ہمیشہ کے لئے اپنے وطن آ گیا۔

اپنی جوانی پردیس میں گزار کر وہ بوڑھا آنگن میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور سامنے دالان میں آویزاں طوطے کے پنجرے کو چشمے کے پیچھے سے گھور رہا تھا۔

پنجرہ خالی تھا، کیوں کہ اس میں بند طوطا مر چکا تھا۔

سامنے دوسری آرام دہ کرسی پر اس کی بوڑھی بیوی چشمہ لگائے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی —

اسی درمیان ان کا بڑا بیٹا آیا۔

"ابو، دیکھئے میں نے پاس پورٹ بنوالیا ہے۔"

"کیوں؟" باپ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ابو، میں باہر کسی دوسرے ملک میں سروس کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں وہاں کچھ سال میں آدمی اتنا کما لیتا ہے کہ یہاں تمام زندگی ایڑیاں رگڑ کے تو نہیں کما سکتا۔"

باپ کچھ دیر خاموشی سے اپنے بیٹے کو تکتا رہا پھر بولا "بیٹا، پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں، پردیس کے کیک سے وطن کی سوکھی روٹی بہتر ہوتی ہے۔"

اس نے فوراً اپنے بیٹے سے پاس پورٹ لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

بیوی بُری طرح چونک کر چشمے کی اوٹ سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔

بیوی کے لبوں پر ایک عجیب سی [illegible] مسکراہٹ تھی۔

نتیجہ: بغیر عنوان کے

بانو اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں ذکیہ مشہدی کا افسانہ بغیر عنوان کے شائع ہوا تھا جس کا عنوان ہماری بہنوں / بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔ تمام عنوانات غور سے پڑھنے کے بعد شمع محمد (سہارنپور) کے بھیجے ہوئے عنوان "گیلی ریت کا بوجھ" کو پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پروین عثمانی شمس (مراد آباد) کے بھیجے ہوئے عنوان "سوکھے شجر کا سایہ" کو دوسرے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے انہیں تیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی فرح ضمیر (میرٹھ) کے عنوان "کھولوں کی چبھن" کو تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے انہیں بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جا رہی ہیں۔ پسند آنے والے کچھ عنوانات یہ ہیں "سہمی سہمی روحیں" آصف خان (دہلی گر دہ ہ) "ڈھلتے سورج کی مایا" بالو ریاض (بریلی) "ریت کی دیوار" ثاقب حسین (بریلی) خود مصنفہ نے اپنی کہانی کا عنوان "سپنوں کا گھر وندا" تجویز کیا تھا جو ہمارے چند قارئین نے بھی بھیجا ہے۔

الیاس سیتاپوری کی دوسری کتابیں

حرم سرا کا محبوب
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

دیوی کے پرستار
قیمت: بیس روپے
(ڈاک خرچ الگ)

کشمیر کی کلی
قیمت: سولہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

داستانِ حور
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

الیاس سیتاپوری کے دیگر شاہ کار جو شمع بک ڈپو نے عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے شائع کئے ہیں۔

شہزادی کا نیلام
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

بالاخانے کی دلہن
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

حرم سرا
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

چاند کا خدا
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

عجائب خانۂ عشق
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

اندر کا آدمی
قیمت: دس روپے
(ڈاک خرچ الگ)

راگ کا بدن
قیمت دس روپے
(ڈاک خرچ الگ)

آج ہی ایک پوسٹ کارڈ بھیج کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگوا لیجئے یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجئے۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں
غیر ملکی بردانے اپنے ایجنٹ کے لئے قیمت اور صلاحیت معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں یا پھر ڈرافٹ بھیجیں۔

آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجئے۔ غیر ممالک میں شہر شہر نئے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں

انتباہ:
الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تمام کہانیوں اور کتابوں کے ہندوستان میں اشاعت کے حقوق شمع بک ڈپو کے نام محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

بچّے کی تربیت

سہیل جامعی

نپولین نے ایک مرتبہ کہا تھا "تم مجھے ایک اچھی ماں دے دو۔ میں تمہیں ایک اچھی قوم دے دوں گا۔"

نپولین کا اشارہ ایک ایسی ماں کی طرف تھا جو اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر تربیت دیتی ہے ایک قوم کے اچھے اور بڑے ہونے کا دارومدار بڑی حد تک ماں پر ہی ہے۔ اگر کوئی قوم اچھی ہے تو یہ ان کی ماؤں کی تربیت کی دین ہے، کیوں کہ ماں ہی گھر میں رہ کر بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا اہتمام کرسکتی ہے۔

بچوں کی صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے کہ ماں اس کے سامنے کسی بھی حالت میں سنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرے، کیوں کہ اس کا بچے پر دو طرح سے بُرا اثر پڑتا ہے۔ ایک تو بچّے کے دل سے امن و سلامتی کا احساس ختم ہو کر خوف و ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے ایسے ماحول میں تربیت پانے والے بچوں کے دلوں میں محبت کا غلط مفہوم بیٹھ جاتا ہے، جس کی وجہ سے بچے بڑے ہونے پر شخصی تعلقات قائم کرنے میں دشواریاں محسوس کرنے لگتے ہیں اور پھر وہ محبت کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

مائیں کس طرح سنگ دلی کا مظاہرہ کرتی ہیں، اس کی ایک مثال سُن لیں۔ اکثر مائیں بچوں کو اچھے سے اچھا کھلاتی اور پہناتی ہیں، اس کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتی ہیں، لیکن کمی اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیار کا غلط انداز سے اظہار کرتی ہیں آپ نے اکثر ماؤں کو یہ کہتے سنا ہوگا: کہ "اگر تم نے یہ کام کیا تو تمہارا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔" دراصل ایسا نہیں ہے کہ اگر بچہ وہ کام کرے گا تو ماں کی محبت سے محروم ہو جائے گا۔ بچہ ماں کو خوش رکھے یا ناراض، ماں اس کی جانب سے کبھی مُنھ نہیں موڑ سکتی لیکن ذرا آپ سوچیے کہ آپ کے کہے ہوئے الفاظ کا سادہ لوح کم سن بچے پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ تو آپ کے مُنھ سے نکلے ہوئے جملوں کا ظاہری مطلب ہی سمجھ سکے گا۔

اسی طرح کچھ مائیں بچے کے کسی حرکت سے خفا ہو کر گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیتی رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی کپڑے بدل کر پڑوسی کے یہاں جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ دراصل وہ بچے کو ڈرانا چاہتی ہیں کہ اگر اس نے ان کا کہنا نہیں مانا تو وہ اسے اکیلا گھر میں چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ اس طرح کی دھمکی وقتی طور پر کافی کارگر ثابت ہوتی ہے، مگر حقیقت میں اس کا بچے کے دل پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اگر اس نے ماں کا کہنا نہیں مانا تو وہ اس سے رُوٹھ جائے گی اور گھر چھوڑ کر چلی جائے گی اور پھر وہ اس دنیا میں تنہا رہ جائے گا۔ اس طرح کے ماحول میں پلنے والا بچہ اپنے چاروں طرف ساری زندگی خوف و ہراس کا جال محسوس کرے گا۔ ایسے بچوں میں کبھی خود اعتمادی پیدا نہیں ہوگی۔ ایسے بچے ہر کام انجام دیتے وقت تردد سے کام لیں گے ان میں اپنے تئیں صحیح فیصلہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی۔ اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ سے محروم شخص دنیا میں کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔

اوپر لکھی ہوئی باتوں سے یہ نتیجہ نکالیں کہ بچوں کو کبھی کچھ کہا ہی نہ جائے اور ان کی ساری حرکات کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر آپ ایسا کریں گی تو آپ کا بچہ بگڑ جائے گا اور اس میں غیر ذمہ داری، آوارگی، عیش پرستی اور دوسری تمام بُرائیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس لئے وقتاً فوقتاً اسے تنبیہ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ بُرے راستوں کو چھوڑ کر اچھے راستوں پر چلنا سیکھے۔ پہلے بچے کو آپ نرمی کے ساتھ سمجھائیں اور اسے اچھے بُرے کام میں فرق بتائیں۔ اگر اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ بُرے کاموں کو چھوڑ دے تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر آپ سختی سے کام لیں اور اس پر غصے اور ناراضگی کا اظہار کریں، لیکن یہ دھیان رکھ کر کہ آپ کے مُنھ سے نکلے ہوئے الفاظ معصوم بچے کی قوتِ برداشت سے باہر نہ ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اس کے والدین اس سے نہیں اس کے بُرے کاموں سے خفا ہیں۔ ماں کو چاہئے کہ وہ بچے کو بتائیں کہ کون سا کام بُرا ہے اور کون سا اچھا ہے۔

کیوں کہ جیسے جیسے بچے کو بھلے بُرے کی تمیز ہوتی جائے گی وہ بُرے کاموں کو چھوڑتا جائے گا۔

اس طرح اگر بچے کی تربیت کی گئی تو بچے کو اچھی طرح احساس ہو جائے گا کہ اس کے والدین اس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور اس احساس کے نتیجے میں بچے میں بے انتہا قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ پیدا ہوگی۔

بچّے کی اچھی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ اس پر جبر نہ کیا جائے۔ آپ نے اکثر ماؤں سے یہ کہتے سُنا ہوگا: "بیٹے، باہر نہ جاؤ سردی لگ جائے گی — پیڑ پر نہ چڑھو ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی — پانی میں نہ بھیگو، بخار آجائے گا" وغیرہ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو بچے پر جبر اور ظلم کے مترادف ہیں، کیوں کہ اس سے بچہ بزدلی کا سبق سیکھتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ

ماں کو اپنے بچّے کی جان پیاری ہوتی ہے، لیکن ان کے یہ خیالات بچّے کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر پڑھا اور سُنا ہوگا کہ یورپ کی کسی عورت نے سمندر تیر کر پار کر لیا، کوئی عورت بلندی سے پیراشوٹ کے ذریعہ نیچے آتری، کسی عورت نے ایورسٹ کی چوٹی سر کر لی، کسی نے ٹرک ڈرائیوری کا ریکارڈ قائم کیا۔ یہ سب ان کی ماؤں کی تربیت کی دین ہے۔ وہ کبھی اس طرح کے غلط طریقوں کو نہیں اپناتی، بلکہ بچّوں کے حوصلوں کو ہوا دیتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کا بچّہ زندگی سے خود سبق سیکھے وہ اپنے بچّوں پر نصیحتوں اور مشوروں کا انبار نہیں لادتیں، بلکہ انہیں اپنی من مانی کرنے دیتی ہیں۔ ان کے یہاں سلامتی اور تحفظ کا نظریہ ہی مختلف ہے۔ ان کے بچّوں کو اگر کھیل میں چوٹ آجائے تو وہ انہیں کھیلنے سے نہیں روکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بچّوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑے ہو کر حوصلہ مند اور بہادر بن جاتے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ملک میں بچّوں کو ہر طرح ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ اگر بچّہ گھر میں کسی وجہ سے دیر سے واپس آتا ہے تو مائیں اپنی شدید پریشانیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ ذرا سا بیمار ہو جاتا ہے تو ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہیں۔ بچّے کی سردی، کھانسی یا اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مائیں اس قدر پریشان ہو جاتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہے پھر وہ وقتاً فوقتاً بچّوں کو بھوت پریت، یہاں تک کہ بلّی کے نام سے بھی ڈراتی ہیں۔ یہ ایسی غلط حرکتیں ہیں جو بچّے کے دل میں اس طرح بیٹھ جاتی ہیں کہ وہ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ سلامتی اور تحفظ اسے صرف گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی معلوم دیتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ گھر سے زیادہ محفوظ کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایسے ماحول میں پلنے والے بچّوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، ان کی جرأت دم توڑ دیتی ہے۔ ہمارے یہاں بچّوں کو نصیحتوں اور مشوروں کی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ بچّوں کی صحیح پرورش کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اپنی خواہش اور اپنی مرضی کے مطابق کاموں کو انجام دینے دیں تاکہ وہ زندگی کے تقاضوں کو اپنی عقل اور فکر کے سہارے پورا کریں اور اپنا اچھا بُرا خود سوچیں۔

جن بچّوں کی پرورش خوف و ہراس اور نصیحتوں اور مشوروں سے بھرے ماحول میں ہوتی ہے، ان بچّوں میں خود اعتمادی کی کمی رہتی ہے۔ وہ ڈرپوک اور پست حوصلہ ہوتے ہیں اور ساری زندگی احساسِ کم تری کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ بچّے کو ایسے آزاد ماحول میں رکھا جائے جہاں وہ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکے۔ اس طرح کے ماحول میں پلنے والا بچّہ دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیتا ہے۔

والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچّے کے مُوڈ کا بھی خیال رکھیں، کیوں کہ موڈ کا زندگی سے بہت گہرا لگاؤ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین جب مُوڈ میں ہوتے ہیں تو بچّے سے بہت لاڈ پیار کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کا مُوڈ خراب ہوتا ہے تو وہ اسے بُری طرح جھڑک دیتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اس طرح بچّہ موڈی بن جائے گا۔ بھلا آپ ہی سوچئے کہ اگر آپ کا مُوڈ خراب ہے تو اس میں بچّے کا کیا قصور ہے جو آپ اس کو اس کے حق سے محروم کر رہی ہیں؟ والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ جب بھی کہیں سے گھر آئیں تو اپنے بچّوں کے سامنے بھرپور محبّت کا مظاہرہ کریں۔ اپنی پریشانیاں ان پر ظاہر نہ ہونے دیں، کیوں کہ آپ کی پریشانیاں اسے سنجیدہ رہنے پر مجبور کر دیں گی۔ اسے یہ ڈر لگا رہے گا کہ آپ پریشان ہیں۔ اس حالت میں اگر اس نے کوئی شرارت کی تو آپ کا مُوڈ خراب ہو جائے گا اور آپ کے مُوڈ خراب ہونے کا پورا ملبہ اس پر اُتر جائے گا۔

اس طرح کے ماحول میں پلنے والے بچّوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر جاتی ہے کہ زندگی میں پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔ خوشیاں ان کو صرف گھر کے اندر ہی دیکھنے کو ملیں گی۔ اس طرح ان میں جینے کی تمنّا کم ہوتی جائے گی، حوصلے پست ہوتے جائیں گے اور قوّتِ ارادی میں کمی آتی جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ والدین بچّوں کو ہمیشہ ہنسی خوشی اور محبّت بھرے ماحول میں پرورش پانے دیں، تاکہ ان کی قوّتِ ارادی میں کمی نہ آنے پائے۔

ماؤں کو چاہئے کہ وہ بچّوں میں نفرت اور حسد کا جذبہ نہ پنپنے دیں۔ اکثر مائیں اپنے ایک بچّے کا مقابلہ اپنے دوسرے بچّے سے کرتی ہیں اور ان میں ایک کو کم تر ثابت کرتی رہتی ہیں۔ اس سے بچّے میں نفرت اور حسد کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ پہلے گھر میں ہی اپنے بھائی بہنوں سے نفرت اور حسد کرتا ہے جس کی ذمّہ داری ماں پر ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ماں ان باتوں سے احتیاط برتے جن سے بچّے میں نفرت کا جذبہ بیدار ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی کسی بچّے سے ماں کو زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسے چاہئے کہ وہ اپنی محبّت کا مظاہرہ اپنے دوسرے بچّوں کی غیر موجودگی میں کرے، تاکہ اس کا غلط اثر دوسرے بچّوں پر نہ پڑے۔

اوپر کی تمام باتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور اچھا ماحول اچھا انسان بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان کے اچھے ہونے کا سہرا دراصل اچھی اور باصلاحیت ماں کے سر جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ماں کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ان کے بچّوں کے دلوں میں نفرت، خوف، حسد اور احساسِ کم تری وغیرہ جیسے منفی جذبے نہ جگہ پا سکیں اور قوّتِ ارادی، خود اعتمادی اور رواداری جیسے جذبے جگہ پائیں تاکہ بچّے ہنس مُکھ، خوش مزاج، باہمّت، جرأت مند، ایمان دار اور پروقار بن کر آپ کا نام دنیا میں روشن کریں۔

○○

زہریلا سایہ

جمیل ارشد

چچی جان اپنی ضد سے ہٹنے کو قطعی تیار نہیں تھیں۔ کسی کے سمجھانے بجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری بہو لانے کا بھوت ان پر اس طرح سوار تھا کہ جگہ جگہ لڑکی کی تلاش بھی شروع کر دی گئی تھی۔ حالانکہ شمشاد بھائی کے علاوہ گھر کا کوئی فرد ان کی رائے سے متفق نہیں تھا، چچا جان کی مخالفت تو عروج پر تھی مگر گھر کے معاملے میں مداخلت کرنے کا حق تو کئی سال پہلے ان سے چھین لیا گیا تھا۔

سب لوگوں کی ہمدردیاں نجمہ بھابی کے ساتھ ہونے کے باوجود ان کی قسمت کا فیصلہ بدل چکا تھا۔ صبح کو اگر ان کا سامنا ہو جاتا تو ایسا لگتا کہ رات بھر جاگتی رہی ہوں۔ کئی بار ان سے پوچھا بھی کہ بھابی آپ کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی کیوں ہیں، لیکن وہ خاموش ہی رہتیں، کوئی جواب نہ دیتیں۔

شمشاد بھائی نئی بیوی کے تصور میں اس طرح کھوئے رہتے کہ نجمہ بھابی کے معصوم چہرے پر لکھی ہوئی دردناک کہانی کا ان پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

یہی نجمہ بھابی جب نئی نئی آئی تھیں تو شمشاد بھائی ان کے مجنوں بن گئے تھے ہر وقت بھابی کے کمرے میں رہتے۔ ان دنوں انہوں نے کام کاج میں بھی بڑی کوتاہی کی تھی جس کی وجہ سے چچا جان کئی بار خفا ہوئے تھے کہ اسی لئے اس لفنگے کی شادی نہیں کر رہا تھا۔ سارا کاروبار چوپٹ رکھا ہوا ہے۔ اس پر چچا کو چچی کی ڈانٹ سننی پڑتی: "نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ انہیں ہنسنے کھیلنے کا وقت تو دینا پڑے گا — تم تو لکیر کے فقیر بنے رہ گئے۔ بیٹے بہو کے بارے میں ایسا سوچتے ہو۔ اگر بہو سنے گی تو کیا کہے گی؟"

چچی بھی بہو کو دن بھر نہارتی رہتیں اور سارے محلے میں گھوم گھوم کر ان کی صورت اور سیرت کی تعریف کرتیں۔ گھر کا سارا کام کاج بھی خود کرتیں۔ اگر بھابی باورچی خانے میں جاتیں تو انہیں فوراً باہر بھیج دیتیں اور کہتیں "ایک دن تو تمہیں یہ سب کرنا ہی ہے۔ ابھی سے کیوں جان کھپاتی ہو۔" پھر بڑے پیار سے پیشانی چوم کر کہتیں "دیکھو تو کتنا گورا رنگ ہے۔ ابھی سے باورچی خانہ سنبھالوگی تو کالی نہ ہو جاؤگی۔"

ان دنوں گھر کا ماحول بڑا خوش گوار تھا۔ ہم سارے بھائی بہن دن بھر بھابی کے ارد گرد گھومتے رہتے۔ ان کا پیارا اور ہنستا ہوا پھول سا چہرہ ایک دن دیکھنے کو نہ ملتا تو ہم سب اپنے اندر بے چینی محسوس کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ بھابی جب بھی میکے جاتیں، ہم میں سے دو ایک کو ضرور ساتھ لے جاتیں۔ اور بہت جلد واپس آجاتیں۔ جب تک وہ میکے رہتیں، گھر میں سارے دن ان کا چرچا رہتا۔ رات کو سونے سے پہلے تو خاص طور سے وہ موضوع گفتگو بنتیں۔

ایسے دنوں میں شمشاد بھائی بالکل خاموش اور خشک ہو جاتے کھانا کھا کر اپنے کمرے میں بند ہوتے تو صبح سے پہلے نہ نکلتے۔ لیکن چاہت کا وہ دل کش پیراہن اتنا کمزور تھا کہ خود غرضی اور ہوس کے ہاتھوں تار تار ہو گیا۔ اب بھابی کے میکے جانے پر شمشاد بھائی اطمینان کا سانس لیتے اور پہلے سے زیادہ خوش دکھائی دیتے اور چچی تو ان کو دیکھنا بھی ناپسند کرتیں۔ طعنوں سے

دوسری جنگِ عظیم

دوسری جنگِ عظیم اتوار ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہوئی۔ اسے دنیا میں سب سے زیادہ خوفناک اور خونریز جنگ سمجھا جاتا ہے اس میں اسّی لاکھ چونتیس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد دنیا کی سابقہ عظیم الشان جنگوں میں ہلاک ہونے والوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔

ان کو سرشار کر دیتیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ شادی کے بعد ایک ایک کر کے تین بیٹیاں ان کے یہاں ہوئی تھیں۔ چچی کا پارہ اسی لئے چڑھ گیا تھا۔ تیسری بار تو انہیں پورا یقین تھا کہ پوتا ہی ہوگا مگر جب نرس نے بتایا لڑکی ہوئی ہے تو چچی کا غصہ چڑھتے فلک پر پہنچ گیا اور وہ اُلٹے قدم گھر لوٹ آئیں۔

شمشاد بھائی نے پہلے تو اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا کہ ان کے یہاں مسلسل تین بیٹیاں ہوئی ہیں لیکن رفتہ رفتہ چچی نے ان کا دماغ بھی خراب کر دیا اور وہ بھی بھابی سے الگ تھلگ رہنے لگے۔ ماں بیٹے، دونوں کی بے رُخی روز بروز بڑھنے لگی۔ شروع میں تو بھابی صرف اُداس رہا کرتی تھیں، پھر ایسا وقت بھی آیا کہ دن بھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی لیکن دھیرے دھیرے وہ بھی ساس کے طعنوں اور شوہر کی بے توجہی کی عادی ہو گئیں یا یوں کہئے کہ انہوں نے صبر کا دامن مضبوطی سے تھام لیا اور پھر روزمرہ کی زندگی سے جُڑ گئیں۔

بہت جلد شمشاد بھائی کا رشتہ طے پا گیا اور زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چچی کے پاؤں تو ایک جگہ رُکتے ہی نہیں تھے۔ دن بھر چکّی کی طرح اِدھر سے اُدھر اہتمام کی مصروفیت میں دوڑتی رہتیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نئی بہو کے آنے کی خوشی میں پھر جوان ہو گئی ہوں۔

شمشاد بھائی کے چہرے پر بھی خوشی کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ کوئی بھی جہاں دیدہ ان کی آنکھوں میں نئی بھابی کی تصویر دیکھ سکتا تھا۔

شادی کے بعد نئی بھابی کی آؤ بھگت

نجمہ بھابی سے کہیں زیادہ ہوئی۔ شمشاد بھائی نے ان کا دامن تحفوں سے بھر دیا۔ چچی نے اپنے زیورات بھابی کی گود میں ڈال دئے۔ اور اس طرح انہیں یقین دلایا کہ تمہارے سامنے بڑی بہو کی کوئی حیثیت نہیں۔ انہیں ہر طرح کا سکھ اور آرام دیا گیا۔ وہ دن بھر پلنگ پر پڑی رہتیں جب شمشاد بھائی نہ ہوتے تو چچی ان کے پاس ہوتیں۔ یا پھر وقت گزارنے کے لئے کوئی جاسوسی یا رومانی ناول پڑھتی رہتیں۔

ان دنوں نجمہ بھابی کے پاس صرف ہم دو بھائی بہن نظر آتے۔ گھر کے باقی سب لوگ نئی بھابی کی خوشامد میں لگے رہتے۔

کچھ ہی دن بعد گھر میں ایک ایسی خبر پھیلی جو چچی کے سارے وجود کو سرشار کر گئی۔ پورا گھر خوشیوں سے بھر گیا۔ بات یہ تھی کہ نئی بھابی کے پاؤں بھاری تھے۔

پاس پڑوس میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ رشتہ داروں کو بلا کر یہ خوش خبری سُنائی گئی۔ چچی اسی وقت سے اپنے تصور میں پوتے کا خیال بسانے لگیں اور اس کے لئے طرح طرح کے جوڑے اپنے ہاتھوں سے تیار کرنے لگیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت کھلونے بازار سے منگوا کر رکھے گئے۔ یہ سارا سامان وہ اپنے قبضے میں رکھتیں۔ اسے ہاتھ لگانا قیامت کو دعوت دینے سے کم نہیں ہوتا اگر ان چیزوں کو دیکھنے یا چھونے کی اجازت تھی تو صرف نئی بھابی کو۔

چچی روز دن گن گن کر حساب لگاتیں اور کتنے دن باقی ہیں۔ ایک دن کا گزرنا ان کے سر سے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کے اُتر جانے کے برابر ہوتا۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی جب نئی بھابی کو نرسنگ ہوم میں داخل کرایا گیا۔ رات بھر چچی وہیں رہیں اور ایک لمحہ کو بھی ان کی آنکھوں نے پلکوں کا لحاف نہ اوڑھا۔ پوتے کو دیکھنے کے لئے وہ اس وقت بے تاب ہو گئیں جب نرس نے کہا "مبارک ہو۔ آپ کے پوتا ہوا ہے۔" چچی نے اسی وقت اپنے ایک ہاتھ کی سونے کی چوڑیاں اُتار کر اسے دے دیں اور پوتے کو جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد ہی انہیں قرار آیا۔

نرسنگ ہوم سے نئی بھابی کے لوٹنے کے بعد سارے محلے میں مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ ان کے صدقے اُتارے گئے۔ اس کے بعد تو نئی بھابی کی قدر اور بھی بڑھ گئی۔ منّا دن دن بھر لوگوں کی گود میں رہنے لگا۔ چچی تو ہر وقت اس طرح اس کے پاس رہتیں جیسے وہی اس کی ماں ہوں۔

ان دنوں نجمہ بھابی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا پڑی رہتیں۔ ان کے پاس کوئی نہیں آتا جاتا تھا۔ شمشاد بھائی ہفتے دو ہفتے میں ان کے کمرے میں جاتے وہ بھی غم بانٹنے یا دلاسا دینے کو نہیں بلکہ مُونہہ کا مزہ بدلنے کے لئے۔

وقت اپنے محور میں گردش کرتا رہا۔ نئی بھابی کو آئے ہوئے اس گھر میں کئی سال ہو گئے تھے اور خدا نے انہیں دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ اِدھر نجمہ بھابی پر بھی قدرت مہربان ہوئی اور ان کے بھی ایک کے بعد ایک — دو بیٹے ہوئے۔ اور چچی اور دوسرے لوگوں کی توجہ ان کی طرف بھی ہونے لگی۔

لیکن چچی جان نے برسوں پہلے صندل کا جو پیڑ اپنے آنگن میں لگایا تھا وہ اتنا گھنا اور تناور نکلا کہ اس کے سائے تلے شمشاد بھائی پھر اپنے مُونہہ کا مزہ بدلنے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور چچی جان کے گھر اب تیسری بہو آنے والی تھی۔

○○

ہڈیوں کا کم زور ہو جانا اور خود بخود ٹوٹ جانا

ہڈی کئی وجہوں سے ٹوٹ سکتی ہے گرنے سے، مار لگنے سے جھگڑاوں میں کسی سواری کے اوپر سے گزر جانے پر' خون میں شکر کی بہت کمی یا بہت زیادتی سے یا پھر

PATHOLOGICAL FRACTURE

سے۔ اس طرح ہڈی کے ٹوٹنے کے واقعات میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ سب سے اہم اور خطرناک ایسے فریکچر ہوتے ہیں جو کسی ظاہری وجہ کے بغیر (یعنی کسی حادثے کے بغیر) ہوتے ہیں۔ ایسے فریکچر عام طور پر عمر رسیدہ لوگوں اور عورتوں کو چند بیماریوں کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں فریکچر سے کیسے بچاؤ ہو سکتا ہے اس پر بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے، کہ ہڈی کیا ہے اور اس میں کون کون سے اجزا ہوتے ہیں، جن کی کمی یا خرابی سے ہڈی کم زور ہو کر خود بخود ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسی حالت کو

OSTEOPOROSIS

کہا جاتا ہے۔ جب

OSTEOPOROSIS

زیادہ ہو جاتے ہیں تو ہڈی میں خلا پیدا ہو جاتا ہے ایسی صورت میں پہلے ہڈی ٹوٹتی ہے' بعد میں انسان گر جاتا ہے۔ یہ کیفیت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے اور عام طور پر

MENOPAUSE

(ماہواری کے بند ہونے کے بعد) یہ کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ بعض بیماریوں میں ہڈی خود بخود یا معمولی رگڑنے سے بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

SUDUEB'S OSTEOPOROSIS

اس میں عام طور سے

COLLESS FRACTURE

ہو جاتا ہے اور بعض اوقات پیر کی ہڈیاں بھی خود بخود ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس میں پہنچے کی ہڈیاں بھی کسی وجہ کے بغیر متاثر ہو جاتی ہیں۔ شدت کا درد رہتا ہے۔ عضلات میں کم زوری اور انحطاط ہو جاتا ہے۔

RENAL GLYCOSURIA

THYROTOXICOSIS

(گردے کی وجہ سے ذیابیطس) میں بھی ہڈیاں کم زور ہو جاتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں۔

OSTEOPORSIS

کی وجہ سے کیلشیم کی بہت کمی ہو جاتی ہے اور

THYROTOXICOSIS

میں کیلشیم زیادہ خارج ہوتا رہتا ہے۔

RENAL GLYCOSURIA

میں فاسفورس کی کمی ہو جاتی ہے اور اس حالت میں فاسفورس کی کمی کی وجہ سے

RENAL THRESHOULD

کم ہو جاتا ہے جس کے باعث

OSTEOPOROSIS

بے حد نمایاں ہو جاتا ہے

OSTEOPORSIS

کی وجہ سے ہڈیاں کم زور ہو جاتی ہیں اور ہڈیوں کا مادہ بہت کم ہو جاتا ہے نتیجے میں ہڈیاں فریکچر ہو کر اپاہج ہو جاتی ہیں۔ یہ مرض عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم احتیاط کی جائے تو اپاہج پن مفقود ہو جاتا ہے یا مرض نمودار ہی نہیں ہوتا شرط یہ ہے کہ بتائی ہوئی تدابیر پر عمل کریں۔

اگر کوئی خاتون اگلی گاڑی میں بیٹھی ہو اور پیچھے سے کوئی گاڑی دھکا دے تو پیٹھ میں انتہائی درد رہتا ہے اور یہ درد بڑھتا ہی جاتا ہے ایکس رے میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا مہینوں بیت جاتے ہیں اور تشخیص نہیں ہو پاتی۔ یہ کیفیت عام طور سے پچاس سال کی عمر کی عورتوں میں ہوتی ہے۔ اس کی تشخیص کافی مشکل ہے لیکن اگر تکا لگ جائے تو آسان بھی ہے۔ اگر خاتون کے قد کو ناپا جائے اور اس کا مقابلہ پندرہ بیس سال پہلے کے قد سے کیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اب تن کم ہو گیا ہے اور درد بڑھتا رہتا ہے، اس طرح تشخیص ہو جانے پر مرض پر قابو پانا ممکن ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ

OSTEOPORSIS

ہی ہے۔ اگر مریض کو فاسفورس دیا جائے تو درد کم ہونے لگتا ہے اور ہڈیوں کے کم زور پڑنے

BONE LOSS

کا عمل کم ہو جاتا ہے لیکن ہڈی اصلی حالت میں نہیں آ سکتی اور یہ مرض بتدریج بڑھتا ہی جاتا ہے۔ شروع شروع میں کوئی علامات نمودار نہیں ہوتیں۔ جب مرض بڑھ جائے تو مرض اپنی کرامات دکھاتا ہے۔

اس مرض کی پہلی علامت ہڈی کا خود بخود ٹوٹ جانا یا تھوڑی سی ضرب سے ٹوٹ جانا ہے۔ عام طور پر منکوں کی ہڈی، کولہے

HIP

یا پہنچے

WRIST

کی ہڈی ٹوٹتی ہے۔ بعض صورتوں میں صبح کو بستر سے اٹھنے سے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ یعنی ہڈیاں اس قدر کم زور

FRAGILE

ہو جاتی ہیں کہ ذرا سی حرکت بھی فریکچر کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ مرض عام طور سے مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں پانچ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس مرض کو

"خاتون کا مرض" کہا جاتا ہے جس کی شدت ماہواری کے بند ہونے کے بعد نمایاں رہتی ہے یوں تو عورتوں میں BONE LOSS پہلے سے ہی رہتا ہے۔ [illegible] کی تعداد میں فریکچر اس موذی مرض کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ پہلے ہڈیاں خود بخود ٹوٹ جاتی ہیں اور بعد میں انسان گر جاتا ہے۔ یہ مرض عام طور سے چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ہوتا ہے۔ منکوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے شدت کا درد ہوتا ہے قد کم ہو جاتا ہے اور انسان کبڑا ہو جاتا ہے۔

عموماً ۳۵ سال کی عمر تک ہڈی کی ساخت مکمل ہو جاتی ہے۔ ہڈی میں کیلشیم اور فاسفورس نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ عام طور سے ان ہی کی کمی سے OSTEOPOROSIS ہو جاتا ہے

ہمارا یہ تصور کہ ہڈی سخت پتھر کے مانند ہے، غلط ہے۔ ہڈیوں کے اجزاء خارج ہوتے رہتے ہیں اور بنتے رہتے ہیں اور اس طرح REMODELLING ہوتی رہتی ہے اس طرح مضبوط ہڈیاں اپنی ساخت قائم رکھتی ہیں۔ عورتوں میں ہڈیوں کے اجزاء کی کمی بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن ۷۰ سال کی عمر کے بعد مرد اور عورت میں ہڈیوں کے اجزاء کی کمی کا تناسب برابر ہو جاتا ہے۔ ہڈی کے اندر کیلشیم اور دوسرے اہم اجزاء جمع رہتے ہیں۔ دورانِ خون میں کیلشیم موجود رہتا ہے اور اہم کردار ادا کرتا ہے قلب کو تحریک پہنچاتا ہے اور عضلات کے انقباض کا بھی سبب ہے جو بے حد اہم ہے اگر خون میں کیلشیم کی بہت کمی ہو جائے تو خون ہڈیوں سے کیلشیم کھینچ لیتا ہے اور ہڈی کو اندر سے کھوکھلا اور کمزور کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے ہڈی اسفنج جیسی ہو جاتی ہے۔ اسی کو OSTEOPORSIS * کہتے ہیں پہلے اس کی کوئی مکمل تشخیص ممکن نہیں تھی، لیکن اب STANDARD X-RAY سے معلومات ہو جاتی ہیں، لیکن اس وقت جب مرض کافی بڑھ چکا ہوتا ہے یا تقریباً پچیس فی صد سے زیادہ ہو جاتا ہے

تشخیص کے دوسرے ذرائع یہ ہیں: (۱)

SINGLE PHOTON ABSORPTIONMENTRY

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی کی کتنی کمی BONE LOSS پہنچے اور WRIST اور پاؤں میں واقع ہوئی ہے

(۲) ABSORPTIONMETRY

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کولہے (HIP) اور منکوں کی ہڈیوں کے اجزاء میں کتنی کمی واقع ہو گئی ہے۔

ان طریقوں سے (X-RAY) ہڈی میں گزرنے وقت ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ ہڈی کی کثافت میں کتنی کمی آئی ہے اور معدنیات کی کتنی کمی واقع ہوئی ہے۔ ان دونوں طریقوں سے X-RAY کے مہلک اثرات زیادہ نہیں ہوتے۔

تیسرے طریقے سے یعنی COMPUTERISED ABSORPTIONMENTRY (CAT) سے SPINAL BONE LOSS کی کمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ بے حد اہم اور صحیح ہے۔ لیکن غالباً یہاں یہ طریقہ ابھی تک عام طور پر رائج نہیں ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہڈیوں کی کمی کے عمل سے دبلی اور لمبی خواتین کے زیادہ متاثر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ سیاہ فام عورتوں میں یہ مرض کم ہے۔ ایسی عورتیں بھی اس مرض سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں جن کے بچے نہیں ہوتے۔ بعض امراض کی وجہ سے یہ مرض شدید ہو جاتا ہے اور کافی BONBLOSS ہوتا ہے بعض ادویات سے بھی مرض میں زیادہ ہوتی ہے، مثلاً CORTISONE وغیرہ

CORTISONE بعض افراد کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے، لیکن ہر مرض کے دوا کے طور پر نہیں۔ خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے زہریلے اثرات بھی ہیں۔ بیرونی ممالک میں اس کو الماری بند کر کے رکھا جاتا ہے اور یہ خالص صورتوں میں ہی استعمال ہوتی ہے۔ تمباکو اور شراب بھی مضر ہیں۔ اس مرض کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس مرض کا علاج بہت مشکل ہے اور جو BONE LOSS ہوا ہے وہ ٹھیک نہیں ہو سکتا ہے لیکن اس مرض کی روک تھام حفظ ماتقدم سے ہو سکتی ہے۔ اچھی غذا، یعنی ایسی غذا جس میں پوری غذائیت ہو اور ہڈی کی نشوونما کے لئے ضروری اجزاء موجود ہوں استعمال کریں۔ OSTEOPOF

BONE LO... ہونے ہی نہیں دیا جائے تو ... پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے اس کے لئے حسب ذیل ضروری احتیاطیں کی جائیں۔

کیلشیم کا استعمال کرایا جائے جو ہڈی اور خون کی تولید کا انتہائی اہم جزو ہے۔ عورتوں میں ۳۵ سال کی عمر سے پہلے ہی کیلشیم کا استعمال کرانا ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے بعد میں ایسی بیماریاں تقریباً مفقود ہو جاتی ہیں اور بڑی عمر میں اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ ایک ہزار ملی گرام کیلشیم روزانہ عورتوں کو دیا جانا چاہئے۔ ایک ہزار ملی گرام کیلشیم تین گلاس دودھ سے بھی مل جاتا ہے جو بہت کافی اور بے حد مفید ہے۔ ایسا دودھ جس میں چکنائی کم ہو یعنی LOW FAT MILK * زیادہ مفید ہے۔

ماہواری بند ہونے کے بعد صرف کیلشیم زیادہ مفید نہیں، بلکہ ڈاکٹر کے مشورہ سے اسے
OESTROGEN
کے ساتھ دینا بہتر ہے۔ ایسی صورت میں اچھی غذا استعمال کرنا اور خطرات سے محفوظ رہنا ہی اچھا ہے۔ کیلشیم کا بہتر استعمال غذا سے ہی ہو سکتا ہے۔ غذا استعمال کرنے سے جو کیلشیم ملتا ہے، اس کا انجذاب بھی بہتر طور پر ہوتا ہے۔ غذا میں دودھ کا پاؤڈر بغیر چکنائی کا
NON FAT DRY MILK
ڈال کر استعمال کیا جائے۔ بادام، مچھلی، کھوپرا، گہرے ہرے رنگ کی ترکاری، دہی وغیرہ سے بھی کافی کیلشیم مل جاتا ہے اگر غذا سے کیلشیم کی کمی پوری نہ ہو تو کسی اچھی کمپنی کا کیلشیم دوا کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کو غذا کے ساتھ کیلشیم لینا چاہئے لیکن جس کو بولی نظام
URINARY SYSTEM
میں پتھری کی شکایت ہو یا اس مرض کی خاندانی شکایت ہو تو اسے کیلشیم نہیں لینا چاہئے اگر گردوں میں کیلشیم کا پتھر ہو تو دودھ بھی لینا نہیں چاہئے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزیں بھی جن میں کیلشیم زیادہ ہو نہیں لینا چاہئے

وٹامن ڈی کے استعمال سے کیلشیم اچھی طرح جذب ہو جاتا ہے لیکن زیادہ وٹامن ڈی سے خون میں کیلشیم کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وٹامن ڈی ڈاکٹر کے مشورہ سے لینا چاہئے۔ صبح کی ابتدائی دھوپ میں کچھ دیر بیٹھنے سے وٹامن ڈی مل جاتا ہے۔

شراب کے استعمال سے کیلشیم جسم سے خارج ہو جاتا ہے اور وٹامن ڈی کے تحول کو
METABOLISM
بھی متاثر کرتا ہے۔ شراب جس طرح جگر کے لئے بے حد مضر ہے، اسی طرح ہڈیوں کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔

کیفین اور نکوٹین محرک ضرور ہیں، لیکن جسم سے کیلشیم خارج کر دیتے ہیں اور جلد ماہواری بند ہونے کا زمانہ آ جاتا ہے۔ اس لئے سگریٹ، کافی وغیرہ سے پرہیز بہتر ہے۔

معمولی قسم کی ورزش سود مند رہتی ہے ایسی ورزش جس سے ہڈیاں متحرک رہیں اور کام ضرور کریں جیسے ٹینس، گالف وغیرہ۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلنا بھی مفید ہے۔

جب ماہواری بند ہو جاتی ہے تو
OESTROGEN
کی مقدار بھی بہت کم ہو جاتی ہے اس طرح کیلشیم جو ہڈی کا لازمی جز ہے، کم ہو جاتا ہے جس کی بنا پر
BONE LOSS
زیادہ ہوتا ہے۔
بہتر ہے کہ ماہواری بند ہوتے ہی
OESTROGEN
کا بدل شروع کر دیا جائے، اسی طرح اگر کسی خاتون کی بیضہ دانی نکال دی گئی ہو تو بھی اسے
OESTROGEN
دیا جانا چاہئے تاکہ BONE LOSS نہ ہو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ ایسی صورت میں
ENDOMETRIAL CANCER
کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن ایسی خاتون جس کا
UTERUS
(رحم) پہلے ہی نکال دیا گیا ہو، اس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ اگر OESTRONE کے ساتھ
PROGESTRONE
بھی دیا جائے تو
ENDOMETRIAL CANCER
کا اندیشہ کم رہتا ہے
OESTRONE
دینے سے ایک فی صد
ENDOMETRIAL CANCER
ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اور اگر یہ نہ دیا جائے تو کولہے کی ہڈی ٹوٹنے کا تقریباً دس گنا اندیشہ زیادہ رہتا ہے۔ بہر حال اگر احتیاط کی جائے تو اپاہج کر دینے والے اس موذی مرض سے بچا جا سکتا ہے۔

ذیل میں کچھ غذائی اشیاء سے کیلشیم زیادہ بہتر ہے۔

اشیاء (۱۰۰ گرام) کیلشیم کی مقدار ملی گرام میں

(۱) چولائی کا ساگ : ۸۰۰ ملی گرام
(۲) پھول گوبھی پتوں کے ساتھ : ۶۲۶ ملی گرام
(۳) میتھی کا ساگ : ۳۹۵ ملی گرام
(۴) مولی کا ساگ : ۲۶۵ ملی گرام
(۵) کھویا : ۶۵۰ ملی گرام
(۶) بھینس کا دودھ : ۲۱۰ ملی گرام
(۷) دہی : ۱۴۹ ملی گرام
(۸) کھوپرا : ۴۰۰ ملی گرام
(۹) بادام : ۲۳۰ ملی گرام
(۱۰) ہینگ : ۶۹۰ ملی گرام
(۱۱) زیرہ : ۱۰۰۰ ملی گرام
(۱۲) رائی : ۴۴۳ ملی گرام
(۱۳) کلونجی : ۲۸۷ ملی گرام
(۱۴) چنا : ۲۰۲ ملی گرام
(۱۵) سوکھی مچھلی : ۴۲۸۴ ملی گرام
(۱۶) بمبئی مچھلی : ۱۳۸۹ ملی گرام
(۱۷) روہو مچھلی : ۶۵۰ ملی گرام
(۱۸) جھینگے : ۳۲۳ ملی گرام

ذیل کے چارٹ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عمر کے اعتبار سے عورتوں کو روزانہ کتنا کیلشیم درکار ہوتا ہے۔

عمر — کیلشیم کی روزانہ ضرورت ملی گرام میں

(۱) ۶ ماہ کی عمر میں : ۳۶۰ ملی گرام
(۲) ایک سال کی عمر تک : ۵۴۰ ملی گرام
(۳) ۱ سے ۱۰ سال کی عمر تک : ۸۰۰ ملی گرام
(۴) ۱۰ سے ۲۰ سال کی عمر تک : ۱۲۰۰ ملی گرام
(۵) ماہواری کے ابتدائی زمانے میں : ۱۰۰۰ ملی گرام
(۶) وہ عورتیں جو OESTROGEN نہ لیتی ہوں، لیکن ماہواری بند ہو جائے : ۱۵۰۰ ملی گرام
(۷) ایسی عورتیں جو OESTROGEN لیتی ہوں : ۱۰۰۰ ملی گرام

OO

جنگ اور شادی میں سب کچھ جائز ہے"
یہ قول چھوٹے خاں نے اُس وقت دُہرایا جب اُن
کے پاس اور کوئی حربہ باقی نہیں رہا تھا۔

چھوٹے خاں بڑی نایاب چیز تھے۔ والدین
کی نگاہ واقعی دُور بین تھی۔ بڑا مناسب نام رکھا
تھا۔ قد ان کا پاکٹ ایڈیشن قسم کا تھا۔ بدن میں
ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ نہ تھا۔ سیاہ فام،
دبیز ہونٹ، جن میں سے دو دانت کافی آگے کو
نکلے ہوئے تھے۔ تعلیم بھی بس واجبی ہی سی تھی۔ کسی
دفتر میں کلرکی کرتے تھے۔ معمولی تنخواہ تھی مگر گزارے
کے لئے کافی تھی کیونکہ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں پینتیس
چالیس کے پیٹے میں تھے، مگر شادی اب تک نہیں
ہوئی تھی۔ ہوتی بھی کیسے؟ ان کی دو سخت قسم کی شرطیں
تھیں۔ لڑکی حسین ہو اور اعلیٰ قسم کا جہیز لائے۔ یہ
کوئی ایسی عجیب بات نہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں
بھوتوں کو پریوں کی خواہش ہوتی ہے اور ان کی
خواہش پوری بھی ہو جاتی ہے۔

ایک دن چھوٹے خاں دانتوں ہی دانتوں
میں بے حد مسکراتے ہوئے آئے اور اخبار مجھے تھما کر
ایک اِشتہار سامنے کر دیا۔ ضرورت ہے ایک کم عمر
حسین دوشیزہ کی ایک خوبرو، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان
کے لئے جو عنقریب نہایت اونچی ملازمت حاصل
کرنے والا ہے اور کئی لاکھ کا مالک بھی بننے کا امکان
ہے۔ شادی اعلیٰ پیمانے پر ہونی چاہیے۔"

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"کس نے دیا ہے یہ اشتہار؟"

"میں نے" انہوں نے دانت نکال کر
فرمایا۔ "کاروباری زمانہ ہے۔ اشتہاروں کے
ذریعے بڑے بڑے کام نکل رہے ہیں۔ اس لئے
میں نے بھی اِشتہار دے دیا۔

"مگر یہ تو جھوٹ ہے" میں برجستہ کہہ
اُٹھا۔ "فریب ہے۔ جعل سازی ہے۔ اشتہاری
دھوکہ بازی ہے۔ خوب رو۔ اعلیٰ تعلیم، اونچی
ملازمت۔ کئی لاکھ کا امکان۔ آخر یہ کیا طلسم
ہوش رُبا ہے؟"

چھوٹے خاں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دنیا میں
کوئی بھی چیز نہ جھوٹ ہے نہ سچ۔ ایک کا جھوٹ
دوسرے کا سچ ہو سکتا ہے۔ میں تمہاری نظروں
میں کچھ بھی سہی، مگر اپنی نظروں میں مکمل قائم ہوں،
اور تعلیم ڈگری سے نہیں، بلکہ احساس سے ہوتی
ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں سقراط ہوں، تو
کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اونچی ملازمت
بھی مل سکتی ہے کیوں کہ میں ہر چھوٹی بڑی جگہ کے
لئے درخواست داغ دیتا ہوں۔ اور درخواست
تو گورنری کے لئے بھی دی جا سکتی ہے۔ کوئی قانون
نہیں روکے گا۔ رہا کئی لاکھ کا مالک بننے کا امکان
تو یہ رہا پانچ لاکھ کی لاٹری کا دو روپے والا ٹکٹ۔
لاٹری کھلنے تک ہر ٹکٹ خریدنے والے کا لکھ پتی بننے
کا امکان ہے۔ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ کیا سمجھے
اور اعلیٰ پیمانے پر شادی ایک اصطلاح ہے جسے
اِشتہار دینے والا اور اشتہار پڑھنے والے خوب
سمجھتے ہیں۔ یہ ایک 'کوڈ' ہے۔ سرکار کو الو بنانے کے
لئے جو جہیز کے خلاف قانون بناتی رہتی ہے۔"

"میں کھوپڑی سہلانے لگا۔ چھوٹے خاں
کی نہیں بلکہ اپنی۔

"کیا حقیقت کبھی معلوم نہ ہو گی؟" میں نے پوچھا
انہوں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "لیکن
ترکیب کی جائے گی کہ نکاح کے وقت کسی کو کچھ معلوم
نہ ہو۔ نکاح کے بعد تو بیٹی والا غلام بن جاتا ہے۔
پھر کوئی پروا نہیں۔"

"چھوٹے خاں صاحب۔ میں بھڑک کر بولا
"جس شادی کی بنیاد ہی فریب پر ہو، کیا وہ کامیاب
ثابت ہو سکتی ہے؟ آخر آپ کسی غریب اور معمولی
شکل و صورت والی لڑکی سے ایمان دارانہ طریقے
سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کیا ضرورت ہے
اِس ڈرامے بازی کی؟"

انہوں نے چہرے پر افلاطونیت طاری کرکے
وضاحت کی: "جس فریب یا بُرائی کو معاشرہ قبول
کر لیتا ہے نہ وہ فریب رہتا ہے نہ برائی۔ ہمارے
معاشرہ میں سب سے اہم کام لڑکی کی شادی ہوتا
ہے۔ بیٹی کی شادی کے لئے آدمی جیتا ہے۔ اس کے
جہیز کے لئے وہ رشوت لیتا ہے۔ دوسروں کے گلے کاٹتا
ہے۔ اِس سماج میں بغیر جہیز کی شادیوں کو معیوب
سمجھا جاتا ہے۔ لڑکے کے لئے شادی زندگی بنانے کا
ایک سنہری موقع ہوتی ہے، اسی وقت جو مل گیا سو مل گیا
ہاتھ آیا مال کسے بُرا لگتا ہے؟ اور پھر جب خود ہی
بنی ہوں تو معمولی شکل و صورت والی لڑکی کی
تمنا کرنا دماغ کا خلل ہی تو ہے۔ دوسری بات

سادگی

ڈاکٹر عطیہ سعید (حیدرآباد)

سادگی ایک ایسی روش ہے جس پر چل کر طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ آج معاشرے میں جو عدم توازن پایا جاتا ہے؛ وہ اخلاقی زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔ اس عدم توازن کو کافی حد تک سادگی اختیار کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔ احساس کم تری یا احساسِ برتری بھی سادگی کو نہ اپنانے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی فطرت میں خود نمائی ہوتی ہے وہ ہمیشہ احساسِ محرومی اور کم مائیگی کا شکار رہتے ہیں۔ نمود و نمائش کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے وہ دن اور رات کا چین و سکون برباد کرتے ہیں۔ موجودہ ٹکنیکل دَور میں جہاں انسان اختصار پسند ہو گیا ہے۔ اس طرح کا اندازِ فکر اور اسراف کسی بھی طور صحت مند نہیں ہے۔ مصروف زندگی میں گھنٹوں میک اپ اور دوسری لغویاتوں میں وقت برباد کرنا دانش مندی نہیں ہے۔

مقابلے کا رجحان اگر صحت مند بنیادوں پر ہو تو ملک و قوم کی ترقی میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس مقابلہ صرف دولت کی نمائش کے لئے ہو تو یہ معاشرے اور قوم کے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔ نمود و نمائش دوسروں پر برتری جتانے کی کوشش ہے، جس سے معاشرے میں ہم آہنگی کی بجائے گوناگوں معاشرتی برائیاں پھیلتی ہیں۔

آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا اونچا کرے تو جسم کی آسائشوں کا فقدان اُس کو پریشان نہ کر سکے گا۔ ضرورت سے زیادہ جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ یہی سادگی ہے۔

عورتیں عموماً سوسائٹی میں اپنے لئے نام نہاد اونچا مقام حاصل کرنے کی غرض سے بہت تگ و دو کرتی ہیں۔ نمود و نمائش میں وہ اس قدر آگے بڑھ جاتی ہیں کہ اُن کو فخر اور غرور کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اُن کے ذہن سے اعتدال کا خیال نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ نیاز مندی، عاجزی اور انکساری سے عاری ہوتے ہیں۔ اپنی فضیلت اور برتری کا احساس انہیں اخلاقی پستی کی طرف دھکیلتا ہے۔

جس گھر میں سادگی ہوگی، وہ جنت کا ٹکڑا کہلائے گا۔ ایسے گھر میں پراگندگی اور انتشار نہ ہوگا۔ رحمت ہوگی، زحمت اور کلفت نہ ہوگی۔ سادگی کا فقدان خیر و برکت سے محرومی، ذلت اور نامرادی کا باعث ہے۔ اولاد کی تربیت [illegible] اس تصنع کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں گھر میں امن ہوگا نہ سکون اور خیر و برکت۔ یہ زندگی نہ ہوگی، بلکہ لعنت ہوگی۔ مستقل لعنت، دوامی لعنت، جس سے خدا ہر ایک کو بچائے۔

یہ کہ اشتہار دینے والا اپنے مال کو بڑھا چڑھا کر ہی تو بیان کرتا ہے۔ دیکھو تو ضرورتِ رشتہ کے اشتہاروں پر نظر دوڑاؤ، ہر لڑکا نیک نام، ماہانہ آمدنی شرافت کا مجسمہ، انسانیت کی تصویر اور ہر لڑکی کوہ قاف کی پری، اعلیٰ تعلیم یافتہ، سلیقے کی دولت سے مالا مال۔ وغیرہ وغیرہ۔ ذرا نظر آئے تو جی چاہے سزا دے دینا۔ سب چلتا ہے۔ کھوٹے سکے بھی خوب چل جاتے ہیں۔"

چھوٹے خاں تو جھومتے ہوئے چلے گئے۔

اور میں بدستور ذہنی طور پر سر پیٹتا رہا۔

ایک ہفتے بعد ہی چھوٹے خاں بے حد نہال، خوشی میں سرشار سیٹی بجاتے ہوئے آئے اور ایک خط مجھے پکڑا دیا۔ مضمون تھا: "اشتہار نظر سے گزرا۔ ہماری لڑکی ہزاروں میں ایک ہے مگر ہے سخت پردہ نشین۔ کسی پرندے نے اس کا پلّو نہیں دیکھا ہوگا۔ ہم انتہائی بھاری جہیز دیں گے"

"دیکھا، کیسا ہاتھ مارا ہے!"۔ وہ مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے ہوئے بولے: "اجی ذرا غور سے پڑھو۔ ہزاروں میں ایک! انتہائی بھاری جہیز! اور کیا چاہئے؟"

اور وہ قدِ آدم آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنے جھینگر نما جسم کا جائزہ لینے لگے۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد سرِ راہ وہ نظر آ گئے۔ میری نگاہوں سے چھپ کر کھسک جانے کی فکر میں تھے کہ میں سر پر جا پہنچا۔

"کیوں جناب!" میں نے کہا۔ "چپکے چپکے کہاں نکل چلے؟ کہاں ہیں آپ؟ شادی ہو گئی؟ کیسی گزر رہی ہے؟ اب تو مزہ آ رہا ہوگا!"

انہوں نے نگاہیں اُٹھائیں اور میں چونک پڑا۔ ستا ہوا چہرہ۔ ہڈیاں اور زیادہ اُبھری ہوئی، وحشت زدہ آنکھیں۔

وہ پھوٹ پڑے۔ "میں لٹ گیا! برباد ہو گیا!"

"کیا مطلب؟" میں نے سوال کیا۔ "ہزاروں میں ایک اور بھاری جہیز والی حاصل ہونے کے باوجود!"

"اُن کا بیڑہ غرق ہو!" وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ "ارے وہ دیوانی ہے۔ اِتنی خطرناک کہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے اس قدر خوف ناک پھڑا دُکرتی ہے کہ ایک ایک فرلانگ دُور کے پرندے تک اڑ جاتے ہیں۔ پورے علاقے کے لوگ پریشان تھے۔ اِسی لئے چھٹکارا پانے کی خاطر میرے اِشتہار کے جواب میں مجھے سبز باغ دکھائے۔"

"اور بھاری جہیز؟" میرا اگلا سوال تھا۔

"پورے علاقے کا کاٹھ کباڑ اکٹھا کیا گیا۔ غدر کے زمانے کا ایک ہاتھی نما پلنگ، لکڑی کا دیمک زدہ صندوق، مسالہ پیسنے کی سل، آٹا پیسنے کی ہاتھ کی چکی۔ یہ تھا وہ بھاری جہیز کیا زمانہ آ گیا ہے۔ جھوٹے دعوے کر کے شریف لڑکوں کو پھانستے ہیں، بے ایمان۔ تم ہی کہو کیا یہی انسانیت ہے؟ کیا اِسی جعل سازی، دھوکا [illegible] کا نام شرافت ہے؟ یہ کیا معاشرہ ہے [illegible]

چیختے چیختے انہوں [illegible] ۱۱۰۰ [illegible] گریبان پکڑ لیا۔ گویا میں [illegible] وہ دھجیاں اُڑا دینا چا[illegible]

تبسم

باغ میں ایک لنگڑا آدمی بنچ پر بیٹھے ایک شخص کی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "کتنی اچھی انگوٹھی ہے دکھانا تو ذرا!"

اس شخص نے برہم ہوکر ڈانٹ دیا۔ وہ چلا گیا تو اس کے پاس بیٹھے ایک اور شخص نے کہا "دکھا دیتے بیچارے کو انگوٹھی۔ بڑا ناامید ہوکر گیا ہے"! اس پر انگوٹھی والے شخص نے جواب دیا۔

"کیوں دکھا دیتا؟ اسی طرح باتوں میں آکر میں نے اپنی انگوٹھی ایک آدمی کو دکھادی تھی، انگوٹھی ہاتھ میں آتے ہی وہ تڑاٹ بھاگ گیا تھا اور مجھے اپنی سونے کی انگوٹھی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا!"

جواب سن کر اس شخص نے لنگڑے آدمی کی طرف نظر ڈالی۔ وہ اپنی بیساکھیوں کے سہارے رینگتا ہوا چلا جارہا تھا۔

طلحہ اقبال، فیروزآباد

●

بیٹا : ممی، میں سمندر میں تیرنے جارہا ہوں

ممی : نہیں بیٹا، اس میں جان کا خطرہ ہے۔

بیٹا : لیکن ممی، ڈیڈی تو روز وہاں تیرنے جاتے ہیں۔

ممی : بیٹے، ڈیڈی نے تو انشورنس کرا رکھا ہے۔ (بی۔ دلناز درناز، آمبور)

●

ایک صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا "جو آدمی غلطی کرکے اسے تسلیم کرے، اسے کیا کہیں گے؟"

دوست نے جواب دیا "راست باز"

"اور اس آدمی کو کیا کہیں گے جو غلطی نہ کرتے ہوئے بھی اسے تسلیم کرلے؟"

دوست نے فوراً کہا "شوہر"۔

ایس شاداب احمد، آمبور، تمل ناڈو

●

ایک سنیما ہال میں ایک لڑکی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ایک فلم دیکھ رہی تھی فلم کے ایک سین میں ہیرو نے ہیروئن کے اتنی زور کا تھپڑ رسید کیا کہ ہیروئن زمین پر گر کر سسکنے لگی۔ اچانک ہال میں اس لڑکی کی تیز اور باریک آواز ابھری: "ممی! یہ جوابی تھپڑ کیوں نہیں مارتی، جس طرح آپ ڈیڈی کے مارتی ہیں۔"

عظمیٰ صدیقی، دہلی

●

جج نے فیصلہ سناتے ہوئے ملزم سے کہا "چونکہ تمہارے اوپر گھڑی کی چوری کا الزام کسی طرح ثابت نہ ہوسکا، اس لئے عدالت تمہیں باعزت طور پر بری کرتی ہے"

ملزم نے ہاتھ جوڑ کر جج سے کہا "تو حضور! اب میں اس گھڑی کو استعمال کرسکتا ہوں نا؟" (ایم یونس خان، راونڈ کیلا)

ایک عورت نے اپنے شوہر سے ناراض ہوتے ہوئے کہا "بلاوجہ ریڈیو آن کرکے کیوں بجلی کا بل بڑھاتے ہو؟"

شوہر نے ہنس کر کہا "بیگم! اسی لئے تو میں ریڈیو سیلون سنتا ہوں تاکہ وہاں کی بجلی خرچ ہو۔"

ایک سنیما گھر میں گیٹ کیپر کی جگہ خالی تھی۔ ایک شخص نے ملازمت کے لئے اپنی درخواست دی۔ منیجر نے اس سے مختلف سوالات کئے اور آخر میں اس سے پوچھا۔ "اگر سنیما گھر میں اچانک آگ لگ جائے تو تم کیا کروگے؟"

اس شخص نے جواب دیا "جناب، میری فکر نہ کریں۔ میں تو پل جھپکتے ہی سنیما گھر سے باہر بھاگ جاؤں گا۔"

محمد خورشید اقبال جھکولیا (بہار)

●

ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا "یار، شراب تو چھوٹ گئی، مگر سگریٹ پینے کی عادت کسی طرح بھی نہیں چھوٹ رہی ہے"۔

دوسرے دوست نے پوچھا "یہ بتاؤ، شراب پینے کی عادت کیسے چھوٹی؟"

پہلے دوست نے جواب دیا "وہ تو بیوی نے بچے کی قسم دلا دی تھی"۔

دوسرا دوست بولا "تو پھر اپنی بیوی سے کہو کہ پھر تمہیں کسی کی قسم دلا دے"

پہلے دوست نے کہا "قسم تو دلائی تھی لیکن سگریٹ کے لئے اس نے اپنے سسر کی قسم دلائی تھی۔"

سید ریاض احمد حیدرآباد

●●

اپنے لطیفے اس پتے پر بھیجئے: "تبسم" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بشریٰ رحمٰن (لاہور، پاکستان)

تھوڑی سی علیک سلیک اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اسحاق نے فلکی کی طرف مُونہہ کر کے کہا۔

"بسورتا ہوا مُونہہ لے کر نکل رہا تھا۔ آدھی فلم چل چکی ہے۔ کھڑے کھڑے دو تین سین دیکھ کر نکل آیا ہوں۔"

"تم فلم دیکھنے آئے تھے؟" نُوری نے پُوچھا۔

"ہاں آپا!"

"تو پھر دیر کیوں کی؟"

"یہ محترمہ نہیں آ رہی تھیں۔ ان کا مُوڈ نہیں تھا... شوہر صاحب یاد آ رہے تھے۔"

"ارے ہاں... آخر کہاں ہے؟"

"چلے گئے امریکہ۔ وہ ایک جگہ ٹک کر وہیں رہ سکتے نا!" اسحاق نے اسی لہجے میں کہا

"آپ پکچر دیکھ کر جا رہی ہیں؟" فلکی نے بات بدلنے کے لئے پُوچھا۔

"نہیں، اس سنیما کا مالک سرمد کا دوست ہے۔ ہم اسے ایک پیغام دینے آئے تھے اس نے ہمیں چائے پر بٹھا لیا۔ ورنہ ہمیں فلم دیکھنے کی فرصت کہاں۔"

"ہاں، ہنی مُون کے دنوں میں تو اپنے گھر میں فلم چلتی ہے؟" اسحاق نے لاپرواہی سے کہا۔

"کمینہ..." نُوری نے اس کے مُونہہ پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"یہ کبھی نہیں بدل سکتا، بہنا فلکی؟"

"ہاں..." فلکی ہنس پڑی۔

"یعنی آپ ہی لگا نا ہے تو کسی جگہ مل کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے بھی کافی بوریت ہو رہی ہے۔" اسحاق نے کہا۔

"چلو کسی ریستوران میں بیٹھیں!" سرمد بولا

"نہیں۔ اس طرح کریں کہ ہمارے گھر چلیں۔ وہیں گپ شپ ہوگی۔" فلکی نے ذرا جرأت کر کے کہا۔

نوری نے اجازت طلب نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔

سرمد نے مُونہہ سے پائپ نکال کر کہا "صرف آدھا گھنٹہ۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ لوگ اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ گئے اتفاق سے سرمد اور نُوری کی موٹر آگے تھی

اٹھارھویں قسط

اب تک کی کہانی

آفاق ایک خوبرو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے ایک روز اس سجیلے نوجوان کو دیکھا تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے وہ اس کے دفتر میں ملازم ہو گئی۔ مگر آفاق پر اس کے حسن اور اداؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُلٹا اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا۔

کچھ دن بعد جب آفاق نے فلک ناز کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تو اس کا دل کھل اُٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر سہاگ رات سے ہی فلک ناز کو احساس ہونے لگا کہ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اُڑانے پر تُلا ہوا ہے۔ دن گزرتے گئے اور فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصے اور نفرت کی آگ تیز تر ہو گئی۔ ایک دن اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ مگر آفاق نے یہ شرط رکھی کہ آزادی پانے کے لئے پہلے اسے ایک اچھی، سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا

آفاق سے نجات پانے کی دُھن میں فلک ناز نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ اس کے سارے ناز نخرے ہوا ہو گئے۔ پھر ایک نیا احساس اس پر شدت کے ساتھ طاری ہونے لگا۔ آفاق چپکے چپکے اس کے دل میں گھر کر چکا تھا اور اب وہ آفاق کو اپنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس دوری کو کیسے ختم کرے جو اس نے خود پیدا کی تھی۔ وہ جی جان سے آفاق کی خدمت کرنے لگی۔ ایک دن وہ آفاق کے سامنے اپنے بیتے دنوں کی کتاب کھول کر بیٹھ گئی جب دولت کے بوتے پر نوکروں کی فوج اس کی خدمت کے لئے حاضر رہتی تھی، لیکن بے پناہ مصروف باپ کی شفقت اسے میسر تھی، نہ فیشن اور سیر سپاٹے کی دلدادہ ماں کی ممتا۔

فلکی دیکھ رہی تھی کہ سرمد کا ایک ہاتھ نوری کے کندھے پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مفلر ٹھیک کر رہا تھا۔ ابھی جب وہ ہال سے باہر آیا تھا تو اس نے اپنے بازو پر نوری کا فر کوٹ ڈال رکھا تھا۔ اب وہ کوٹ اس نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔

کیا سرمد مرد نہیں تھا۔ ؟

کیا نوری عورت نہیں تھی ۔ !

لیکن ایک قدر مشترک تھی ان میں۔

وہ ایک دوسرے سے عشق کرتے تھے، محبت کرتے تھے۔

۔۔۔ اور بس ۔۔۔

"مور لاز دال" میں دونوں موٹریں آگے پیچھے داخل ہوئیں۔

فلکی جلدی سے کافی کا کہہ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"فلکی! میں تم سے خفا ہوں" نوری نے پیار سے کہا "تم سے بھی اور آفو سے بھی!"

"کیوں ۔۔۔ ؟" فلکی نے معصومیت سے پوچھا۔

"تم دونوں میری شادی پر کیوں نہیں آئے؟"

"آفاق یہاں نہیں تھے۔"

"لیکن تم تو آ سکتی تھیں۔"

فلکی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اسے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ ان کی شادی کب ہوئی۔ آفاق نے اسے کارڈ بھی نہیں لا کر دیا تھا۔

فلکی تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی "میں آپ کو مناؤں گی۔"

"آفو نے تمہیں بالکل اپنے جیسا کر دیا ہے۔"

"بس ۔۔ بس ۔۔۔" اسحاق کھڑا ہو گیا "یہ تو تمام تر آفاق بن چکی ہیں۔ انتہائی بور قسم کی خاتون ہیں۔ ان کا بس چلے تو بھیا کے آنے تک برت رکھ لیں۔ فلم دیکھنا ان کو برا لگتا ہے۔ ہنسنے بولنے سے یہ پرہیز کرتی ہیں۔ پینسار سے انہیں چڑ ہو گئی ہے۔ ہر ایک کو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔"

"اسحاق جھوٹ نہ بولو" فلکی ہنس کر کھڑی ہو گئی۔ عبدالکریم کافی لے آیا تھا۔ وہ اٹھ کر کافی بنانے لگی۔ "آج یہ زبردستی مجھے فلم دکھانے لے جانا چاہتا تھا اور میرا موڈ نہیں تھا" فلکی نے نوری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے آپ کو اپنے شوہر سے بہت محبت ہے" سرمد نے اٹھ کر کافی کی پیالی خود ہی پکڑ لی۔ پھر شکر دان میں سے کی تھوڑی بھری اور اپنے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"آفو بہت خوش نصیب ہے" نوری نے کہا "یہ تو میں نے اسے اس دن بھی کہا تھا۔"

نوری نے بھی اپنی پیالی لے لی۔ "تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں فلکی! ہم تینوں کا بچپن اکٹھا گزرا ہے۔"

فلکی نے استفہامیہ انداز میں پلکیں اٹھائیں۔

"میں، آفو اور سرمد ایک ہی بلڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ تینوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور اکثر مل کر کھیلا کرتے تھے۔ دل سے تو مجھے سرمد پسند تھا لیکن میں اسے جلانے کے لئے عام طور پر آفو کا سہارا لیا کرتی تھی۔ جب کسی بات سے سرمد انکار کرتا تو میں آفو کے پاس چلی جاتی۔ اس طرح سرمد بہت جلا کرتا تھا۔"

"اور جلانے کا یہ سلسلہ اس نے اب تک جاری رکھا تھا۔"

سرمد ہنس پڑا

"اب نہیں سرمد! انہیں پتہ چل گیا تھا۔"

"پتہ ہے کتنا عرصہ سرمد اور آفو کی لڑائی رہی۔"

"یعنی وہی فلمی سین" اسحاق منہ میں مونگ پھلی ڈال کر بولا "فلمی مثلث بن گئی تھی۔"

"یہ سراسر سرمد کی زیادتی تھی" نوری بولی۔

"اچھا، یہ بات تھی!" سرمد نے تہدیدی انداز میں اسے گھورا۔

"اور میں تمہیں کس طرح اپنی طرف ملتفت کرتی۔ اصل میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ تمہارے دل میں کیا ہے ۔۔۔ تو ہم نے یہ چکر چلایا۔"

"ویسے میں بھیا کی جگہ ہوتا تو کاٹی مار لیتا" اسحاق نے کہا۔

سب ہنسنے لگے۔

"آفاق ایسا نہیں ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے" نوری بولی "ویسے ایک بات اور بھی ہے۔ آفاق اچھا دوست ہو سکتا ہے مگر اچھا شوہر ۔۔۔" پھر وہ ایک دم رک گئی اور فلکی کی طرف دیکھ کر بولی

"کوئی بات نہیں" فلکی ہنس پڑی "میں ان کے بارے میں زیادہ جانتی ہوں۔"

"دراصل آفو بچپن ہی سے بہت سنجیدہ تھا۔ جوان ہو کر بعض معاملوں کو بڑی سنجیدگی سے لیتا تھا۔ کہتا تھا عورت کا مقام گھر ہے عورتیں بے مہار کیوں پھرتی ہیں۔ اوچھا پن اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ زندگی کو اسی پرانے زاویے سے دیکھتا تھا۔ اسی واسطے کوئی لڑکی زیادہ دن تک اس کی دوست نہیں رہتی تھی ۔۔۔ میں تو اسے کہا کرتی تھی کہ تم اپنی بیوی پر بہت سختی کرو گے۔ پتہ نہیں کوئی لڑکی تمہارے ساتھ خوش رہ سکے گی یا نہیں ۔۔۔ کیا تم خوش ہو فلکی؟" نوری نے ایک دم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"جی میں تو بہت خوش ہوں" فلکی نے خوش دلی سے کہا "شروع شروع میں ذرا مشکل پیش آئی تھی بس زمانہ دوسرے طور سے مختلف ہے۔ میں ان کا مزاج پا گئی تھی۔ ایسے لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"ہاں ۔۔۔" نوری ایک دم بولی "آفو کا دل بہت اچھا ہے۔ یہ مجھے بھی معلوم ہے بہت ہمدرد اور غم گسار ہے۔ ہر مشکل میں مدد کرتا ہے مگر اپنے اصول نہیں توڑتا۔ زندگی میں کوئی بے اصولی پسند نہیں کرتا اور ۔۔۔" وہ رک کر بولی "میں شہری ازل سے بے اصول اور لاپرواہ ۔۔۔ تو خدانخواستہ جو میری شادی آفو سے ہو جاتی تو دوسرے ہی دن معاملہ ۔۔۔ ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتا۔ تم بڑی بہادر ہو فلکی!" نوری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ان کی بہادری کی تو میں بھی داد دیتا ہوں" اسحاق بولا "اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتی ہیں اور ان کو ڈر نہیں لگتا۔"

"اچھی عورت وہی ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی رضا میں ڈھل جائے" سرمد جو لگاتار چلغوزے کھا رہا تھا بول اٹھا۔

"اچھا، اب تم مجھ پر طنز کر رہے ہو" نوری بولی۔

"بھئی میں تم پر کیوں طنز کروں گا؟ صنم نے گھر سے نکلتے وقت کہا تھا نا کہ کوٹ پہن لو ۔۔۔ اور میں نے تمہاری بات نہیں مانی۔ کیوں کہ مجھے سردی میں اس طرح پھرنا اچھا لگتا ہے۔"

"اور پھر یہ تو خلق کی بھلائی کے لئے ایسا کرتی ہیں۔ اب دیکھیں نا ۔ اتنی سخت سردی میں جس نے بھی یہ خوبصورت سڈول بازو اور یہ سراپا دیکھا ہوگا گرم تو ہو ہی گیا ہوگا" اسحاق بولا۔

"کمینہ ۔۔" نوری نے اسے گھورا۔

"کاکو! تو ہمیشہ کمینہ رہے گا۔ تو اسی طرح ہمیں بچپن میں بھی جلایا کرتا تھا۔"

"جی ہاں۔ آپ بھی کوئی ماچس کی تیلی ہیں"

"تمہیں پتہ ہے نوری۔ ایک بار اس نے ہمارے اسکول میں جا کر مشہور کر دیا تھا کہ آفاق اور نوری کی انگیجمنٹ ہو گئی ہے اس پر کچھ مت پوچھو، کتنا شور مچا۔ گھر پر مبارکباد کے فون آنے لگے ۔۔۔ اور ماما اور پاپا سے ہمیں مار بھی خوب پڑی۔"

"لیکن یہ بھی تو مانیے سرمد بھائی سے آپ کی صلح ہو گئی تھی" وہ بولا

"ہاں، سرمد کے دماغ کا بھوت فوراً اتر گیا تھا۔"

پھر وہ سب اپنے بچپن کی باتیں یاد کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد سرمد گھڑی دیکھتا ہوا بولا "میری آنکھوں کا نور اٹھو۔ آج ایک ڈنر پر بھی جانا ہے۔"

نوری ایک دم کھڑی ہو گئی "اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

"اچھا فلکی، اب اجازت دو!"

فلکی بھی کھڑی ہو گئی۔

"آپ اور سرمد بھائی کل ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔"

"ہاں ہاں" اسحاق آگے آ گیا "پلیز ان کو ہم کچھ لوگوں کو بلائیں۔ بڑا اکیلا کیا۔ میں تو اس گھر کی یکسانیت سے تنگ آ گیا ہوں۔"

"نہیں فلکی ۔۔۔ آفو کے بغیر اچھا نہیں لگے گا۔ آفو کو آ لینے دو" نوری بولی۔

"ان کے آنے پر پھر بلا لیں گے" فلکی نے کہا

"ابھی مجھے فرصت بھی نہیں۔ یہ سارا مہینہ بک ہے ۔۔۔ اور میں آفو پر زبردست رعب بھی ڈالنا چاہتی ہوں کہ میں اس سے خفا ہوں۔"

نوری باہر آ گئی۔ اس کے پیچھے سب نکل آئے گرم کمرے سے باہر آتے ہی نوری کو ایک چھینک آئی۔ سرمد نے آگے بڑھ کر کوٹ اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔

"کیا تمہارے نازک کندھے اس کوٹ کا بوجھ برداشت کر لیں گے؟"

نوری نے ایک پیارا سا قہقہہ لگایا "یہ نازک کندھے صرف محبت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔"

"مگر اس وقت کوٹ زیادہ ضروری ہے" سرمد نے اس کے کندھوں پر کوٹ ڈال دیا۔

"اچھا فلکی ڈیئر ۔۔۔" نوری نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"آفو کے آتے ہی مجھے اطلاع دینا"

تھوڑی دور جا کر پھر واپس مڑ آئی اور فلکی کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولی۔

"جو عورت آفو کا دل جیت لے گی وہ اس دنیا کی خوش قسمت ترین اور عظیم عورت ہو گی۔"

"یہ کیا سیاسی نکتے بگھار رہی ہو انہیں؟" اسحاق نے خواہ مخواہ اپنا منہ بھی فلکی کے کان کے قریب کر لیا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے" نوری نے اسے چپت ماری۔

"بھئی تم واپس کب جا رہے ہو کاکو!"

"میں تو جانے کے لئے پر تولے بیٹھا ہوں۔ اب وہ حضرت رانجھا صاحب اپنی ہیر سیال کے پاس تشریف لے آئیں تو میری خلاصی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے شیر پنجرے میں بند ہو گیا ہے۔"

"واہ رے میرے لڑکی کے شیر...." — جز یرے سے نکال لیا۔
سرمد نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا
"یہ بھی کوئی زندگی ہے میاں...
کوئی من موہنی صورت ہی نظر نہیں آتی۔"
"اس کا کچھ کرو بھابی!" سرمد نے کہا۔
"بھئی! میں نے تو اسے کہا ہے کہ
یہ اپنی گرل فرینڈز کو بلا لیا کرے۔ اس
کے علاوہ میں اور کیا کر سکتی ہوں۔"
"ہاں ہاں؟"
نوسی بے ہنس کر کہا "تمہاری تقدیر
میں مایوسیاں ہی لکھی ہیں۔"
وہ لوگ ہنستے ہوئے موٹر میں بیٹھ گئے۔
فلکی جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی
اسے معلوم تھا کہ اب فلم کا سارا غصہ اسحاق
اس پر نکالے گا۔
رات کو سوتے وقت فلکی کا دل بہت
مطمئن تھا
وہ خواہ مخواہ نوری پر شک کرتی رہی۔
نوری تو بہت اچھی لڑکی تھی۔ بڑی صاف گو
اور صاف ستھری۔
یہ تو اسے پتہ چل گیا تھا کہ عورت
آفاق کی کمزوری نہیں ہے۔ مگر آفاق کی
کمزوری کیا ہے اس بات کا اسے پتہ نہیں
چل رہا تھا آفاق کا دل جیتنا بہت بڑی
بات تھی۔
کاش! وہ آفاق کا دل جیت سکے...
ایک دن علی الصباح جب وہ نماز
پڑھ کر اپنا کل کا سبق دُہرا رہی تھی، فون کی
گھنٹی بجی۔ فلکی کا دل دھڑک اُٹھا۔
اتنی صبح کون فون کر سکتا ہے..؟
ہاں۔ بے وقت کالیں دُور دیس سے
آیا کرتی ہیں..
شاید.. شاید اس بے درد کو میرا
خیال آ گیا ہو۔
میں حورات بھر بے قرار رہی ہوں۔
شاید دل کی پکار اس نے سُن لی ہو۔
گھنٹی مسلسل بجتی جا رہی تھی...
دوری کی کال لگ رہی تھی یہ
ایک دم فلکی کھڑی ہو گئی اور پھر
ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی فون کے قریب
گئی اور دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ
ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو...."
"جی آپ لاہور سے بول رہی ہیں؟"
"جی ہاں..."
"کراچی بات کریں۔"
کراچی.... کراچی۔ وہ دشمن جاں
کراچی کے راستے ہی تو گیا تھا۔
ابھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ
مانوس سی آواز نے اسے خوابوں کے

"ہیلو.. ہیلو.. فلکی۔ ملکی ڈارلنگ۔"
یہ وہ مانوس آواز تھی جیسے وہ بچپن سے
سنتی آ رہی تھی۔ مگر اب کیسے اجنبی بنی
کھڑی تھی۔ جیسے پہچاننے سے انکار
کرنا چاہتی ہو خود فریبی کا پردہ چاک نہ
کرنا چاہتی ہو۔
"ممی۔ ممی... یہ آپ ہیں"
بالآخر اس نے گلے میں سے آواز کھینچ کر
کہا۔
"ہاں ڈارلنگ۔"
اُف کیسی مایوسی ہوئی! کاش!
ممی نے یوں فون نہ کیا ہوتا۔ ان کے آنے
کی خوشی تو غارت نہ ہوتی۔
"فلکی کیسی ہو جان؟"
"اچھی ہوں ممی... آپ کب آئیں؟"
"میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ کراچی
ایئرپورٹ سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔
تمہارے لئے دل بیتاب تھا"
"ڈیڈی کہاں ہیں؟"
"وہ بھی آئے ہیں۔ سامان کے
بکھیڑے نمٹا رہے ہیں۔ میں یہاں انتظار
میں کھڑی تھی۔ سوچا اتنے میں اپنی فلکی سے
بات کر لوں"
"آپ لوگ لاہور کب آ رہے ہیں؟"
فلکی نے اپنے لرزتے ہوئے وجود پر
قابو پا کر پوچھا۔
"نو بجے والے جہاز میں ہماری بکنگ
ہو گئی ہے۔ اب یہاں ایک پل بھی رُکنے کو
جی نہیں چاہتا۔ تم ایئرپورٹ پر آؤ گی!"
"آ جاؤں گی ممی۔"
"ضرور آنا، تمہاری صورت دیکھنے کو
ترس رہی ہوں!"
ممی کو ہمیشہ پانچ چھ مہینے بعد صورت
دیکھنے کا خیال آتا تھا۔
"خدا حافظ ڈیئر، آ کر باتیں کریں گی۔"
"خدا حافظ ممی۔"
آوازیں بند ہو گئیں۔ فلکی نے فون
واپس رکھ دیا۔
ناشتے کے بعد ایئرپورٹ انکوائری
پر فون کر کے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ ممی کا جہاز
دس پچاس پر آئے گا۔
فلکی نے جلدی جلدی دوپہر کے
اور رات کے کھانے کے بارے میں عبدالکریم
کو سمجھایا۔ اسحاق کو بھی دفتر جانے سے
پہلے بتا دیا کہ آج وہ ممی کے ساتھ چلی جائے گی۔
"میں تمہیں لینے آ جاؤں بھابی؟"
"نہیں اسحاق... پتہ نہیں میں کب
فارغ ہوں گی۔ آج تم اپنے دوستوں
کے ساتھ کوئی باہر کا پروگرام بنا لینا۔"

"ظاہر ہے جب دشمن ساتھ چھوڑ
جائیں تو دوست ڈھونڈنے پڑیں گے۔"
اسحاق نے سنجیدگی سے کہا۔
فلکی کو ہنسی آ گئی۔
دل ایک دم بجھ گیا تھا۔
"میں رات کو واپس آ جاؤں گی"
"ہاں" وہ موٹر میں بیٹھتا ہوا بولا۔ "رات
کو واپس ضرور آ جانا۔ میں گھر میں اکیلا نہیں
رہوں گا۔"
"باتیں اس طرح کرتا ہے جیسے ننھا
بچہ ہو۔"
"ننھا بچہ ہی تو ہوں۔ مجھے بھی ممی یاد
آتی ہیں مگر تم ٹھیک ٹھیک کر نہیں سُلاتیں۔"
"اچھا، اب بکواس بند کرو اور جاؤ۔"
"آج تمہاری ممی آ رہی ہیں بھابی!
آج تو تمہارا لب و لہجہ ہی بدلا ہوا لگ رہا ہے"
فلکی سوگوار انداز میں ہنس پڑی۔
اسحاق کیا جان سکتا ہے کہ فلکی
کے دل پر کیا گزر گئی ہے۔
آہٹیں سُنتی سُنتی وہ دیوانی ہو گئی
ہے۔ اور آہٹوں کا فریب کھا کھا کر تھک
گئی ہے....
ایئرپورٹ جانے سے پہلے فلکی بڑے
اہتمام سے تیار ہوئی۔ اس نے موتیوں کے
کام کی ایک فیروزی رنگ کی ساڑی پہنی۔
خوب اچھا میک اپ کیا۔ بڑے پیارے
بال بنائے ایک ہلکا سا فیروزے کا سیٹ
پہنا تاکہ ممی پر اس کی اُداسی اور سوگواری
ظاہر نہ ہو۔ ممی کو یہ لیسے بھی بنی سنوری عورتیں
اچھی لگتی تھیں اور پھر وہ ممی کو اپنی گزشتہ
زندگی کا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتی تھی۔
یہ وہی فلکی تھی جو چھ ماہ پہلے ممی کو ایک
ایک بات بتا دینا چاہتی تھی اور اب ایک
ایک بات چھپانے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔
لاؤنج سے باہر آتے ہی ممی اسے
خوب خوب گلے لگا کر ملیں۔ بار بار اس کا
مُنہ چومتی رہیں۔ ہاتھ پکڑ پکڑ کر اس کی خیریت
دریافت کرتی رہیں۔
"تم ذرا کم زور لگ رہی ہو... یا یہ میرا
وہم ہے"
"رنگ بھی ویسا چمک دار نہیں"
"ٹھیک تو ہو۔"
"ٹھیک تو ہوں۔"
ممی کے ایسے جملوں پر فلکی کو رونا آ رہا
تھا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔
سچ پوچھا کس نے حال تو آنسو نکل پڑے
ڈیڈی کے بیٹھنے کے وقت تو
بچ بچ اس کے آنسو نکل پڑے جنہیں اس
نے بڑی نفاست سے صاف کر لیا۔ ڈیڈی
ہمیشہ کی طرح تھے۔ سنجیدہ اور مطمئن.. اسی

طرح دیکھے دیکھے مُسکراتے ہوئے... البتہ
مانگ کے کچھ اور بال سفید ہو گئے تھے جس
سے ڈیڈی اور بھی گریس فل لگ رہے تھے۔
لیکن ممی پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور
تازہ دم لگ رہی تھیں۔ چہرے کی سلوٹیں
بھی حیرت انگیز طور پر کم ہو گئی تھیں۔ ممی
حسبِ معمول فیشل ٹریٹ منٹ لے کر آئی
تھیں۔ یا فیس لفٹنگ کروا کر آئی تھیں۔
بہرحال لمبے سیاہ کوٹ میں زیادہ اچھی
لگ رہی تھیں۔
فلکی اپنی تمام ترمیک اپ کے باوجود
ان کے سامنے مُرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔
"تمہاری صحت تو ٹھیک ہے ڈارلنگ!"
موٹر میں بیٹھتے ہی ممی نے گفتگو شروع
کر دی جس سے فلکی گھبرا رہی تھی۔
"میں تو بالکل ٹھیک ہوں ممی!" پھر
وہ بات کا رُخ بدلنے کے لئے بولی "اور
آپ ماشاء اللہ پہلے سے بھی خوب صورت
لگ رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے۔ اس مرتبہ
آپ کا ٹرپ بہت اچھا رہا ہے۔"
"سویٹ...." ممی نے بے اختیار
اس کا مُنہ چوم لیا۔
"اس بار تمہارے ڈیڈی نے میرا ساتھ
دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے
اِدھر اُدھر گھومتی رہی ہوں۔ بہت انجوائے
کیا ہے میں نے.... تمہاری طرف سے بے
فکری تھی۔ اس لئے....."
"ہاں میری طرف سے تو آپ ہمیشہ
بے فکر ہی رہیں۔"
"ہاں.... آفو مجھے ملا تھا" ممی اچانک
بولیں.... "میں ان دنوں کینیڈا میں تھی۔
جب اس نے مجھے نیویارک سے فون کیا تو
میں دو دن کے لئے نیویارک آ گئی تھی۔ اس کی
ممی کے پاس ٹھہری تھی۔ بہت لطف آیا۔ آفو
نے ہمیں نیویارک کے وہ علاقے دکھائے
جو ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے اور تم
جانتی ہو.... آفو انسان ہے.... اس کی کمپنی میں
کوئی بور نہیں ہو سکتا۔ بہت خوب صورت
پرسنیلٹی ہے اس کی...."
فلکی اس مرتبہ صرف مسکراتی رہی اور سوچتی
رہی۔
آفاق نے ممی کو کیسے کیسے نہ شیشے میں
اُتارا ہو گا۔
"تمہارے لئے اس نے ایک چاکلیٹ
کا ڈبا گفٹ کر دیا تھا۔ وہ میرے بیگ میں
ہے۔"
ممی ذرا جھک کر پاؤں میں پڑا شاپنگ
بیگ ٹٹولنے لگیں۔ فلکی چپ بیٹھی رہی اس
نے بالکل نہیں کہا.... شکریہ کہنے لگی
ممی اسے دیں۔ پلیز....."

ممی نے خوبصورت سا ڈبہ کے ایک
خوبصورت سا ڈبہ اور سرخ کاغذ میں والا
ممی نکال ہی لیا۔ اور پھر فلکی کی گود میں رکھ دیا۔
فلکی نے جلدی سے پکڑ لیا۔
اتنا خوبصورت تھا کہ حد نہیں۔
جس کاغذ میں لپٹا ہوا تھا اس پر جا بجا
الف.... الف لکھا ہوا تھا اور الف کے
ساتھ کہیں کہیں پر شوخ رنگ کے دل کے نشان
بنے ہوئے تھے۔ اوپر سنہری رنگ کا ربن لپٹا
ہوا تھا
فلکی کا دل چاہا وہ اس ڈبے کو سینے سے
لگالے۔ اس کے محبوب نے پہلا سندیس بھیجا
تھا۔ مگر اس نے وہ ڈبہ اپنی گود میں رکھ لیا
بھلا اتنا خوبصورت پیکٹ کھول کر کہیں
برباد کیا جا سکتا ہے ...؟
"بس...." فلکی نے بے اختیار انہ ممی سے
پوچھ ڈالا۔
"بس...." ممی نے ہنس کر جواب دیا۔
وہ کہہ رہا تھا۔ اصل تحفہ میں خود لاؤں گا اور
یہ بھی کہہ رہا تھا فلکی کو میرا پیار دے دیں۔"
"مگر ڈارلنگ!! اپنے آفاق کا پیار تو لو۔"
انہوں نے آگے بڑھ کر فلکی کے رخسار کو
پھر چوم لیا۔
اتنی سی بات سے فلکی کو نشہ آ گیا۔
وہ ستم کش تیر چلانے خوب جانتا ہے
اس کو معلوم ہے کہاں کہاں پر ٹھیک نشانہ
لگے گا۔
آفاق کی ہر ادائگی میں بھی ایک ادا تھی اور
اب فلکی ادا شناس ہو گئی تھی۔
فلکی رات تک ممی کے ہاں رہی....
ممی کے ہاں وہی عالم تھا....
دوست واحباب، مبارکبادیاں۔
... چائے، پھل، دعوتیں....
"فلک بوس" میں پھر سے قہقہے امڈ
رہے تھے۔
ممی اپنے سفر کی داستان خوب چٹخارے
لے لے کر سنا رہی تھیں ڈیڈی حسبِ معمول
اوور بیٹھے پائپ پی رہے تھے اور بات بے بات
مسکرا رہے تھے۔
"ڈیڈی! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ
پائپ کیوں پیتے ہیں۔ آپ پائپ نہیں پیتے۔
غصہ پیتے ہیں۔ آپ صبر کے گھونٹ بھرتے ہیں
غضب ہے کہ ممی تمام عمر تمام تر شوہری نبھا رہی ہیں
... اور آپ.... آپ اور آپ کی فلکی کو یہ سب
بھگتنا پڑا)
ممی اس کے لئے بے شمار چیزیں لائی تھیں
پورے دو بکس بھرے ہوئے تھے جو
صرف فلکی کے لئے ہی تھے۔
ممی جس ملک سے جو جو چیزیں خریدیں
تھیں اس کی تفصیل بتاتی رہیں پہلے پہلی

ایسی چیزیں لے کر بے حد خوش ہو جایا کرتی
تھی جب سے پیدا ہوئی تھی، اس کو ایسی
سوغاتیں مل رہی تھیں۔ یہی انمول چیزیں اس
کی زندگی تھیں۔ ممی کے آتے ہی وہ اپنی
چیزیں اٹھا کر اپنے دوستوں کے پاس لے جایا
کرتی تھی۔ پھر وہ باقاعدہ اپنے ملبوسات
دکھانے کے لئے پارٹیاں کرتی اور دوستوں
سے خوب خوب داد لیا کرتی تھی۔
مگر آج اس نے ان چیزوں کو زیادہ
دلچسپی سے نہیں دیکھا۔ اس کے اندر جیسے
کوئی کہہ رہا تھا۔ دنیا میں اور بھی بہت
کچھ ہے ان چیزوں سے بہت ضروری ہے
.... زندگی صرف ملبوسات اور زیورات
کے سہارے نہیں گزر سکتی .. فانی چیزیں
لافانی جذبوں کا مول نہیں ہو سکتیں۔ پھر
اس نے بڑے قرینے سے ساری چیزیں
بکسوں میں بند کر دیں اور بڑے خلوص سے
ممی کا شکریہ ادا کیا۔
پھر ممی سے بولی۔
"ممی! ابھی آپ ان چیزوں کو اپنے
پاس ہی رکھیں جب آفاق آئیں گے میں تب
یہ چیزیں لے کر جاؤں گی ...."
اس کا خیال تھا اگر آفاق پسند کرے
گا تو فلکی یہ چیزیں ممی سے لے لے گی ورنہ
نہیں۔ اور ممی اس خیال سے چپ ہو گئیں
کہ غالباً یہ اپنے شوہر پر رعب ڈالنا چاہتی
ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد فلکی نے
ممی سے اجازت مانگی۔
"کیوں لو (LOVE) اتنی
جلدی کیوں جا رہی ہو؟ میں اتنے دنوں
بعد آئی ہوں۔ اب میرے پاس رہو...."
"ابھی آپ آرام کریں ممی.... پیچھے
گھر بھی اکیلا ہوگا۔"
"کیا نوکر نہیں ہیں گھر میں....؟"
"وہ ہیں تو.... مگر نوکروں پہ گھر
تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"
"نان سینس.... میں نوکروں پر گھر
چھوڑ کر ساری دنیا گھوم آئی ہوں اور تم...."
"ممی آپ کی بات اور ہے...." (آپ
کے گھر میں اور میرے گھر میں بہت فرق ہے
آپ کے گھر کو کوئی گھر تو نہیں کہہ سکتا نا؟)
"وہ اسحاق بھی تو آج کل یہیں ہے
اور میں نوکروں سے کہہ کر بھی نہیں آئی۔"
"یوں کرو، سب کو بتا کر آ جاؤ۔"
"ممی میں رات کو یہاں نہیں رہوں گی۔"
"اب آفاق بھی یہاں نہیں ہے وہاں
جانے کی کیا مجبوری ہے؟"

WHAT A CHANGE

ممی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر

کہا۔
"جان جی! کہاں ہو؟" اس نے
صدرالدین کو آواز دی۔ "ذرا اپنی لاڈلی کی
شاندار بات سنو آ کر...."
ڈیڈی پل میں بوتل کے جن کی طرح
نمودار ہو گئے۔
"تمہاری لاڈلی سال کے اندر اندر
بدل گئی ہے۔ جس گھر میں ہمیشہ رہی اب
اسے وہ گھر اچھا نہیں لگتا۔ کہتی ہے
اب میں ایک رات بھی اپنے گھر سے باہر
نہیں رہ سکتی"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے" ڈیڈی
نے منہ سے پائپ نکال کر کہا۔ "ایک
دم ٹھیک ٹھاک...." پھر وہ پائپ کا
دھواں چھوڑتے ہوئے یوں چلے گئے جیسے
انہیں فلکی سے یہی امید ہو۔
فلکی اپنے اقدام پر شرمندہ نہیں تھی۔
اس نے جو محسوس کیا تھا، صاف صاف
کہہ دیا تھا۔
"اس کو جانے دو نا زلی۔ کل پھر
آ جائے گی۔"
جاتے جاتے ڈیڈی اتنا کہہ گئے۔
"تھینک یو ڈیڈی!".... وہ دوڑتی
ہوئی گئی اور ڈیڈی کے کندھے پر سر رکھ دیا
ڈیڈی تو بن کہے دل کی بات جان لیتے تھے۔
مگر ممی کو اس کا یہ لگاؤ پسند نہیں آیا
.... بس خاموش ہو گئیں....
"او کے ممی...." فلکی نے اپنا
پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی....
ممی کو کیا معلوم....؟
انتظار کیا ہوتا ہے....؟
محبت کسے کہتے ہیں....؟
ممی وہ خوبصورت موم بتی ہیں جو
کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے
کے لئے ڈرائنگ روم کے وسط میں رکھ
دی جاتی ہے۔ وہ موم بتی ڈیکوریشن پیس
ہوتی ہے جو کبھی جلائی نہیں جاتی، کبھی
کمرے کو روشنی نہیں بخش سکتی۔ ہاں
نگاہوں کو بھلی ضرور لگتی ہے....
لیکن یہ تو جلنے والے جانتے ہیں کہ
ادھ جلی موم بتی کس قدر خوبصورت ہوتی
ہے جل جل کر پگھلتی جاتی ہے مگر ایک
دلکش شکل اختیار کرتی جاتی ہے....
دل میں اتر جاتی ہے.... کسی کے کام آ جاتی
ہے.... اپنا آپ جلا دیتی ہے.... موم کا
وہ ڈھیر بھی جو میز پر پڑا رہ جاتا ہے....
مصور کی کسی مورتی سے کم نہیں ہوتا۔
ہاتھ میں اٹھا لینے کو جی چاہتا ہے....
ممی کیا جانیں....؟
کیا جانیں ممی....؟

صرف محبت کروانا ہی زندگی نہیں
ہے!
محبت کرنا اور نثار ہو جانا ابدی زندگی
ہے۔
محبت طلب نہیں کرتی۔ محبت دینا
چاہتی ہے۔
محبت سودا نہیں کرتی۔ محبت بے مول
ہوتی ہے۔
محبت خریدی نہیں جاتی بلکہ وہ تو نس
نس میں خون کی طرح اتر جاتی ہے۔ سانس
کی طرح بس جاتی ہے... جذبے آنسوؤں
کی طرح آپ ہی آپ ابھر آتے ہیں۔
ممی کیا جانیں....
کہ وہ پل پل اس جفا جو کا انتظار کرنا
چاہتی ہے....
ہر آہٹ پر چونک جاتی ہے...
ہوا چلے تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔
کوئی دروازہ کھولے تو کھڑی ہو
جاتی ہے....
فون کی گھنٹی بجے تو دوڑ پڑتی ہے۔
ڈاک آئے تو دل دھک دھک کرنے
لگتا ہے....
موٹر کا ہارن بجے تو خون شریانوں میں
تیز تیز دوڑنے لگتا ہے....
پچھلے پہر پھولوں والی روش پر
ہوا کے سنگ سنگ پتے کھڑکیں
تو وہ دوڑ پڑتی ہے۔ بہک اٹھتی ہے۔
جانے آفاق کس وقت آ جائے۔
آس کا ایک دیا اس نے اپنی منڈیر
پر رکھ دیا تھا۔
مسافروں کو اپنا گھر ضرور یاد آتا ہے
وہ دل بھی یاد آتا ہے جو اس کے
لئے دھڑک رہا ہو....
ظالم کو اپنا ظلم یاد آتا ہے۔
مبادا.... وہ اچانک.... بالکل
اچانک آ جائے.... اپنی ہر غیر یقینی عادت
کی طرح.... اور اسے گھر میں نہ پا کر کتنا
مایوس ہو....؟
اس کا کھٹکا ضائع ہو جائے..
اس کی آہ بے اثر ہو جائے...
وہ ہر وقت گھر میں رہنا چاہتی تھی
انتظار کرنا چاہتی تھی۔
جو کھٹکے سے نہ اٹھنا چاہتی تھی

"ممی! آفاق نے آنے کے بارے
میں کیا کہا تھا....؟"
دوسرے دن جب وہ ممی سے ملنے
گئی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔
"کیا اس کا خط نہیں آیا تمہیں...."
ممی نے اپنی حیران نظریں اس کے چہرے

پچکا دیں۔

"کون سا خط۔۔۔؟" پھر فلکی بوکھلا گئی۔۔۔ "ہاں وہ ۔۔۔ وہ پہلا خط۔ جو انہوں نے جاتے ہی لکھا تھا۔"

"ارے ابھی ایک ہفتہ ہوا وہ مجھے ملا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں مفصل خط میں اپنا آئندہ کا سارا پروگرام لکھ دیا ہے۔"

"مل جائے گا۔۔۔" وہ جلدی سے بولی "بس آج کل میں مل جائے گا۔"

"اور تمہارا خط بھی اسے مل گیا تھا۔"

"کون سا۔۔۔ اچھا ۔۔۔ اچھا۔۔۔"

فلکی کا مونہہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ اس سے جھوٹ بھی سلیقے سے نہ اپنایا گیا۔

"ڈارلنگ! میں خط و کتابت کو بُرا نہیں سمجھتی۔ تم مجھ سے کیوں چھپانا چاہتی ہو۔"

AFTER ALL HE IS
YOUR HUSBAND

(کتنا اچھا ہے ممی کہ آپ ذہین بالکل نہیں ہیں۔ فلکی نے دل میں سوچا)

"مگر مجھے تم نے صرف دو تین خط لکھے۔۔۔" ممی نے شکوہ کر ہی دیا۔

"ان دنوں آفاق یہیں تھے ممی۔ مجھے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔"

"ہاں ڈارلنگ میں جانتی ہوں۔ اب اس گھر اور اس گھر میں بہت فرق پیدا ہو گیا ہے۔"

"سویٹ ممی!" فلکی نے ہنس کر ممی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"اچھا ذرا پرے ہٹو۔ میرے رولرز ڈھلک جائیں گے۔"

ممی جلدی جلدی اپنے رولرز ٹھیک کرنے لگیں۔

ممی چاہتی تھیں کہ فلکی روز صبح کو "فلک بوس" آجایا کرے۔ سارا دن ممی کے پاس رہا کرے اور رات کو "زنداں" میں لوٹ جایا کرے۔ لوگ دھڑا دھڑ ممی کی دعوتیں اور پارٹیاں کر رہے تھے۔ ممی اسے مجبور کرتی تھیں کہ وہ ہر پارٹی اور ہر دعوت میں ان کے ساتھ جایا کرے۔ فلکی کو ان پارٹیوں سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ کب کی ان کھوکھلی دعوتوں اور بناوٹی قہقہوں سے دُور ہو گئی تھی۔ نہ اسے فضول باتوں پر ہنسی آتی اور نہ خواہ مخواہ بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کو دل کرتا۔

اور پھر اسے ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا۔

اگر آفاق کسی روز اچانک آجائے اور اسے ڈھونڈتا ہوا ممی کے گھر پہنچے۔۔۔ اور اسے پتہ چلے کہ فلکی تو ممی کے ساتھ فلاں پارٹی میں گئی ہوئی ہے تو۔۔۔

تو۔۔۔ کیا ہو۔۔۔؟

وہ گھبرا جاتی۔

آفاق تو یہی سمجھے گا کہ اس کی عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر فلکی واپس اپنی دنیا میں لوٹ گئی ہے۔ نہیں نہیں۔۔۔ وہ گھبرا جاتی۔ سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے۔ کہیں جیتی ہوئی بازی وہ ہار ہی نہ جائے۔

وہ ممی کو طرح طرح سے ٹال کر جھک گئی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ درد کا عذر، کبھی بے خوابی کی شکایت۔۔۔ اور ممی حیران ہو کر پوچھتیں۔

"فلکو، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اس قدر بور بھی ہو سکتی ہو؟ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ تمہیں انسانوں سے وحشت ہوتی ہے اور اپنا ویران گھر اچھا لگتا ہے۔ آخر تم اتنی بدل کیوں گئی ہو۔ یہی تو عمر ہے لائف انجوائے کرنے کی۔"

ممی وہ ماں نہیں تھی جسے دردِ دل میں شریک کیا جاتا ہے۔

جو وہ ممی کو داستانِ غم سُنا بھی دیتی تو انہیں کہاں سمجھ آتی۔ بلکہ وہ تو یہی کہتیں کہ آفاق کے خلاف محاذ کھول دو۔۔۔ اس کی ایسی تیسی۔۔۔

"درمیانِ قعرِ دریا، تختہ بندم کردہ ای" والا معاملہ تھا۔

اسے اپنی انّا سے سُنی ہوئی بچپن کی ایک کہانی یاد آجاتی۔

دُور پار سیاہ پتھروں والی اس وادی کے دوسری طرف ایک کالے دیو نے ایک خوب صورت شہزادے کو پتھر میں تبدیل کر دیا تھا۔

ایک دن ایک حسین و جمیل سیم تن شہزادی اپنی ملازمہ کے ساتھ سیر کو نکلی اور راستہ بھول گئی۔ بھٹکتے بھٹکتے وہ سیاہ پتھروں کی اس وادی میں جا نکلی۔ وہاں جو اس نے پتھر کا شہزادہ دیکھا تو اسے بڑا رنج پہنچا۔ شہزادے کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کا ایک غبار اُٹھا جو رفتہ رفتہ محبت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا اے کاش! وہ اس شہزادے میں جان ڈال سکتی۔۔۔ اسی وقت اسے اپنے بچپن کی سہیلی سبز پری کا خیال آگیا جسے اس نے بچپن میں ایک بوتل کی قید سے رہائی دلائی تھی۔۔۔ جوں ہی اس نے سبز پری کو یاد کیا۔ وہ اپنے سبز پنکھ ہلاتی نمودار ہو گئی۔

میرے بچپن کی سکھی شہزادی نے بے تابانہ اس کے ہاتھ تھام لئے۔

"خدا کے واسطے اس خوبرو شہزادے کو انسانی صورت میں بدل دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔"

"اے نیک دل شہزادی اگر تو اس شہزادے کے سر میں چبھی ہوئی جادو کی ساری سوئیاں نکال دے تو یہ اپنی اصلی صورت میں آجائے گا۔۔۔ یاد رہے سوئیاں ایک ہی نشست میں نکالنی ہوں گی۔" شہزادی نے سوئیاں نکالنی شروع کر دیں۔

اس کے نازک ہاتھ لہولہان ہو گئے۔۔۔ تھکن سے شہزادی نڈھال ہو گئی جب چند سوئیاں باقی رہ گئیں تو شہزادی کو نیند نے آگھیرا۔

اس نے اپنی کنیز سے کہا۔

"تم یہاں پتوں کا بستر بچھا دو۔ میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ذرا سستا کر میں تازہ دم ہو جاؤں گی اور باقی کی سوئیاں بعد ازاں نکال دوں گی تاکہ بیدار ہونے کے بعد میں شہزادے سے گفتگو کرنے کے قابل ہو جاؤں۔"

سو وہیں ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں نیند کی ماری تھکی ہاری شہزادی سو گئی۔ کئی راتوں کی جاگی تھی۔ نیند نے سحر طاری کر دیا۔ ٹھنڈی ہوا اسے لوریاں دینے لگی اور پتے اس کے نصیب کا ماتم کرنے لگے۔

اسے مدہوش دیکھ کر اس کی خادمہ نے باقی کی چند سوئیاں بھی نکال دیں۔

شہزادہ انسانی پیکر میں آتے ہی اس خادمہ کے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔۔۔

"اے نیک دل دوشیزہ۔۔۔ تُو نے مجھے پتھر سے انسان بنا دیا ہے۔ میں کس مونہہ سے تیرا شکریہ ادا کروں، میں تو اپنے نصیب پر رو بیٹھا تھا کہ کون اس ویرانے میں مجھے چھڑانے آئے گا۔ اللہ نے تجھے رحمت کا فرشتہ اور میری زندگی کی نوید بنا کر بھیجا ہے۔ تیرے احسان کا بدلہ میں زندگی بھر نہیں چکا سکوں گا پھر بھی مجھے بتا میں تیری کیا خدمت کر سکتا ہوں میں سراندیپ کے بادشاہ کا اکلوتا شاہزادہ ہوں۔"

کنیز نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"مجھے صرف تیری رفاقت چاہئے کہ میں پہلی نظر میں تیری اسیر ہو چکی ہوں۔ جتنی بھی جلدی ہو سکے مجھے یہاں سے نکال کر اپنے دیس میں لے جا۔"

جب شہزادی کی آنکھ کھلی۔۔۔

تو۔۔۔ وہاں نہ شہزادہ تھا۔۔۔ نہ اس کی کنیز۔۔۔

یہ سوچ کر فلکی بے چین ہو جاتی۔

"بھلا شہزادی کی آنکھ اتنی دیر بعد کیوں کھلی۔۔۔؟"

"بیٹی وہ کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔"

"بھلا اسے سونے کی کیا ضرورت تھی؟ جب صرف دو چار سوئیاں باقی رہ گئی تھیں؟"

وہ بار بار انّا سے پوچھتی

"یہاں یہ بات پوچھی جا چکی۔۔۔ بس اس سے بے وقوفی ہو گئی۔"

"کیوں ہو گئی بے وقوفی۔۔۔؟ جب وہ شہزادی تھی؟"

"تو کیا شہزادیوں سے بے وقوفیاں نہیں ہونی چاہئیں؟"

"نہیں تو۔۔۔" وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ لیتی "شہزادیاں تو خوب صورت ہوتی ہیں۔ عقل مند ہوتی ہیں ۔۔۔ اور بہادر ہوتی ہیں۔۔۔" وہ اپنی لال لال آنکھیں میچ لیتی "مگر بے وقوف نہیں ہوتیں۔"

انّا زور سے ہنس پڑتی۔

"ایسی شہزادی تو میری فلکو ہے۔۔۔ ہے نا؟۔۔۔ تو شہزادی فلک ناز ہے۔۔۔ اور شہزادی فلک سیر ہے۔ سچ ہے تجھے۔۔۔"

"اچھا انّا، اب دوسری شہزادی کی کہانی سُناؤ جو سونے والی شہزادی نہیں تھی۔"

"ہاں۔ جو سوتا ہے، وہ کھوتا ہے۔" انّا لہک لہک کر گانے لگی۔۔۔

"اور جب شہزادی کی آنکھ کھلی۔۔۔"

ابھی تک یہ کہانی فلکی کے لاشعور میں تھی۔

اس کا اس کہانی سے کیا تعلق ہے بھی۔۔۔؟

وہ کئی بار اپنے دل سے پوچھتی۔۔۔

اس کے نصیب کی سوئیاں نہ جانے کہاں کہاں کھبی ہیں؟

پھر بھی جانے کیوں وہ اپنے گھر سے باہر نہ رہنا چاہتی تھی۔۔۔ کہیں جانا نہ چاہتی تھی۔۔۔ خصوصاً رات کو۔۔۔

رات اس پہاڑ کا قبر بن کر گزرتی۔

پر اسی گھر میں اس کی بقا تھی اور وہ چاہتی تھیں، وہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آجائے۔

ممی کے گھر میں زندگی کی ہر آسائش تھی مگر دل کا سکون نہیں تھا۔

اس خالی پلنگ پر ۔۔۔ جو اس کی مانگ کی طرح ویران تھا۔۔۔ وہاں محبت کے پھول نہیں بکھرے تھے۔۔۔

مگر تلخ یادوں کے انگارے تھے اور کبھی کبھی انگاروں کو کلیجہ میں بھر کے سو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ادھر اسحاق بھی اب اس سے اُلجھنے لگا تھا۔

"بھابی.... تمہاری محبت سے عاجز آکر میں نے دوستوں کو گھر پر بلانا شروع کر دیا ہے۔ اب تم تو گھر سے باہر رہنے لگی ہو۔"

"تم جانتے ہو نا اسحاق، ممی آگئی ہیں۔ اس مرتبہ وہ کافی عرصے کے بعد آئی ہیں، اس لئے اگر میں نہ بھی جاؤں تو وہ ڈرائیور کو بھیج کر مجھے بلوا لیتی ہیں۔"

"واہ، میرے بھائی کہتے ہیں، وہ حسین میزبان کہاں ہے جس کو دیکھتے ہی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں؟"

"اچھا تم ہر وقت بکواس مت کیا کرو۔ آج میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"پکنک کا پروگرام بنا لیں کہیں دور دراز علاقے میں جائیں گے کل چھٹی بھی ہے۔"

"نہیں، بھئی۔ میں پکنک پر نہ جا سکوں گی.... اور پھر تمہاری اودھم پارٹی کے ساتھ..."

"کیوں، بھابی! آپ نے کبھی شور نہیں مچایا؟ کبھی نہیں اچھلیں، کودیں؟"

"ضرور ایسا کیا ہوگا؟ مگر اب نہیں۔"

"اب کیوں نہیں؟"

"اب میں ایک ذمّے دار عورت ہوں"

"اور ذمّے دار عورت کا بس یہی کام ہے کہ دنیا کی رنگینیوں سے مُونہہ موڑ کر بیٹھ جائے؟"

"دنیا کی ساری رنگینیاں اگر گھر میں موجود ہوں تو پھر کون کافر گھر سے نکلتا ہے۔"

"کہاں ہیں اس گھر میں دنیا کی رنگینیاں؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتیں.... ایک خاموش اور سنسان سا گھر ہے چاروں اطراف وحشت ٹپکتی ہے۔ اتنے بڑے گھر کے صرف دو مکین... اور خود گھر کا مالک بھی نہیں لگتا۔ میرا تو اس گھر میں ذرا بھی دل نہیں لگتا۔"

"تو تم گھر سے باہر دل لگالو۔ تمہیں کون روکتا ہے۔ میرا تو یہ گھر ہے مجھے یہاں عمر بھر رہنا ہے۔"

"ایسی بُری بات نہ کرو بھابی! پتہ نہیں کل کیا ہو جائے اور تم اس گھر کو لات مار کر چلی جاؤ۔"

"اللہ نہ کرے۔" فلکی کا دل واقعی دھڑک اُٹھا۔

جب سے اسحاق آیا تھا، بدشگونی کی باتیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے اپنے بھائی پر اعتبار کیوں نہیں تھا؟

"چلو گی یا نہیں؟" اسحاق نے قریب آکر اسے ٹہوکا دیا۔

"تمہیں کتنی بار کہہ چکی ہوں اسحاق، کہ مجھ سے ذرا دور رہ کر بات کیا کرو۔"

"میں جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔"

"کل میں نہیں جا سکوں گی۔"

"کیوں....؟"

"مجھے گھر پہ کچھ ضروری کام ہیں۔"

"مثلاً...؟"

"ہیں نا.... کہہ جو دیا۔"

"اپنے 'سرتاج من' کو 'سلامت باشند' والا خط لکھنا ہوگا؟"

فلکی بے اختیار ہنس پڑی۔

"یہ 'سرتاجِ من' اور 'سلامت باشند' کیا ہوتا ہے؟"

"ہماری امّی، ہمارے ابّا کو اسی طرح خط لکھا کرتی تھیں۔"

"نہیں ممّی.... میری ممّی ایسے خط نہیں لکھتیں۔" فلکی بولی

"تمہاری ممّی کیا لکھتی ہیں، مائی ڈیر، ڈارلنگ، سویٹ ہارٹ، ہنی، مائی لو، مائی ہارٹ، یا پھر یہ کہ میرا جگر، دل گردہ، پھیپھڑا! کیوں؟" سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ کر اسحاق اس کے پاس ہی دھپ سے بیٹھ گیا۔

"بس، ووکیبولری

VOCABULARY

ختم ہوگئی یا سانس پھُول گئی ہے؟ اچھا تم بتاؤ، تم کیا لکھو گے اپنی فیانسی کو؟"

"توبہ، میں کیوں خط لکھوں گا۔ آخر خط کی نوبت ہی کیوں آئے گی وہ مجھ سے دُور جانے کی جرأت کیسے کرے گی؟... ہاں"

اس نے بال کو ذرا لمبا کر کے کہا۔ "اگر کبھی ایسا موقع آ ہی گیا تو صرف ایک فقرہ لکھ دیا کروں گا، بندے کی بُری عمر کس کے آجا۔"

اس پر فلکی بے تحاشا ہنسنے لگی۔

"بھابی! تم ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔ مگر تم اتنا کم کیوں ہنستی ہو؟"

"زیادہ ہنسنے سے دل مُردہ ہو جاتا ہے۔"

"ہیں... یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"میں نے حدیث کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔"

"یعنی، اس عمر میں حدیث، فقہ، فلسفہ، گیان۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کس کے لئے یہ سارا جوگ لے رہی ہو؟"

فلکی نے سر جھکا لیا اور خاموش ہوگئی۔

"وہ تو مُورکھ ہے اس کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔ بُڈھی رُوح کے واسطے تم اپنی ہستی پر پہرے لگا کر بیٹھی ہو... اور اب بھیّا کہاں دیکھ رہے ہیں کہ تم سجا کر رہی ہو؟ ہزاروں میل دور بیٹھے عیش کر رہے ہوں گے۔"

"وہ نہیں دیکھ سکتے، میں تو انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ دل کی آنکھ بہت تیز ہوتی ہے اسحاق!"

"اچھا، دل کی بھی آنکھ ہوتی ہے؟"

"ملکہ دل سراسر آنکھ ہوتا ہے۔"

"یہ ماہ نیک آنکھ' والا معاملہ تو نہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" فلکی ہنسنے لگی۔

"یہ آنکھ ہمیشہ فاصلوں سے ہی بہتر دیکھ سکتی ہے۔"

"لیکن تم کس وقت دیکھ لیتی ہو؟ جس کی جان ہوگذری ہیں، ساری رات رہ جاگے ہو۔"

"خدا کے واسطے۔ ایسی مشکل مشکل باتیں نہ کرو بھابی! کچھ ہنسنے کی باتیں کرو۔"

"اچھا ذرا میرے ساتھ بازار چلتے ہو؟"

"وہ کس خوشی میں بھابی؟"

"مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔"

"میں سمجھا تم مجھے کوئی تحفۂ محبت خریدکر دو گی۔"

"تم بھی خرید لینا کچھ... مگر چلتے ہو؟"

"کیوں نہیں چلوں گا؟ ظالم حسینہ نے پہلی بار فرمائش کی ہے۔ میں اس کی فرمائش کیسے ٹال سکتا ہوں؟... بس ایک سیکنڈ میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں تاکہ میرے آنے تک تمہارا ارادہ ہی نہ بدل جائے۔"

فلکی ہنستی ہوئی جاکر موٹر میں بیٹھ گئی۔

"شکر ہے، تم روایتی خاتون کی طرح پیچھے نہیں بیٹھی ہو۔" اس نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو اب اپنے بھائیوں کے ساتھ بیٹھنا بھی معیوب ہو گیا ہے؟"

فلکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال درست کئے۔

"بھابی! تمہاری عمر کیا ہے؟"

اسحاق نے گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا۔

"کیوں... یہ تمہیں یکایک میری عمر سے دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟"

"ذرا یونہی، اپنی تسلّی کی خاطر پوچھ رہا ہوں"

"اگر تمہاری تسلّی نہ بھی ہو تو مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا... میری شادی ہو چکی ہے۔"

"اُف، بھابی! اب تم بالکل عورتوں کی طرح اپنی عمر چھپا رہی ہو"

"عورت جو ہوئی میں۔"

"مجھے معلوم ہے زیادہ سے زیادہ تمہاری عمر اٹھارہ سال کی ہوگی۔"

"جی نہیں، تم مجھے خوش کرنے کے لئے مبالغے سے کام لے رہے ہو۔ اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے بی اے کیا تھا۔"

"پھر کیا کیا تھا؟"

"ایم۔ اے۔ پھر ایک سال بعد میری شادی ہوگئی۔"

"اٹھارہ میں دو جمع کئے، بیس ہوگئے۔ بیس میں ایک ڈالو تو اکیس.... تم اکیس یا بائیس برس کی تھیں جب تمہاری شادی ہوئی تھی... اور شادی کو ابھی پورا سال نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ تم تیئس چوبیس برس کی ہوں گی۔"

"چلو، اچھا ہوا... تمہارا حساب تو صحیح نکل آیا۔"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم مجھ سے عمر میں چھوٹی ہو مجھ پر رعب نہ جمایا کرو"

"عمر میں چھوٹی ہوں عقل میں نہیں۔"

"عقل میں بھی چھوٹی ہو، اسی لئے تو صحیح انتخاب نہ کر سکیں۔"

فلکی ایک دم خاموش ہوگئی۔

"بھیّا اس وقت چھتیس سال کے ہیں میں ان سے پانچ سال چھوٹا ہوں یعنی ستائیس برس کا گبرو جوان۔ تمہارا، میرا جوڑ..."

"اسحاق! مجھ سے پٹ جاؤ گے، یہیں سڑک پر.. تم جانتے ہو، میں اتنی خاموش اور بزدل نہیں ہوں، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ تم نے ابھی میرا جلال دیکھا ہی نہیں۔"

"بس یہی دیکھنا چاہتا تھا۔" اسحاق نے قہقہہ لگایا "مزہ آیا تمہارے مُونہہ سے یہ بات سُن کر۔"

"بس بس... وہاں سامنے صُوفہ کلاتھ پر گاڑی روک لو۔" فلکی نے جلدی سے اسے ٹوکا۔

فلکی کو ممی کی ہر روز کی دعوتوں اور پارٹیوں نے ہلکان کر دیا تھا۔ گھر میں سارا وقت اسحاق اس کی جان کھائے رکھتا تھا وہ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ وہ وقت بے وقت ان دونوں کی نوازشوں سے بچ جائے۔

بہت دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد اسے خیال آیا... کیوں نہ وہ اپنا گھر سنوارنا شروع کر دے۔ سارے کمروں کے پردے اور قالین میلے ہو رہے تھے۔ جانے کب سے نہیں دُھلوائے گئے۔

بعض کمروں کی کلر اسکیم ہی اسے پسند نہیں آئی تھی... پھر اس کی شادی اتنی جلدی میں ہوئی تھی کہ کمروں کو نئے سرے سے سنوارا نہیں گیا تھا۔

ہاں، یہ کام ٹھیک ہے.... اس نے دل میں سوچا۔

گو سردی کا موسم شروع ہوگیا تھا

دن چھوٹے چھوٹے تھے... مگر آفاق کے
سر پر مصروفیت کی وجہ سے کوئی مصروفیت ہی
نہ تھی۔ وہ صرف ہر شام ہوٹلوں کا تماشا دیکھتا رہتا
تھا۔ اس نے سوچا، موقع اچھا ہے۔ آفاق کے
آنے سے پہلے وہ گھر کو دلہن کی طرح سنوار سکتی
تو داد وصول کرنے کا ایک اور موقع مل جائے گا
— بلکہ آفاق کو اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اس
میں جمالیاتی حس کس قدر ہے۔

یہی سوچ کر کل وہ کچھ نئے پردے خریدنے
نکل گئی...

اور پھر خرید و فروخت کا یہ سلسلہ چل نکلا
روزانہ شام کو اسے کسی نہ کسی دکان پر جانا
پڑتا۔ اسحاق ساتھ ہوتا۔ کبھی وہ ڈرائی کلیننگ
کی دکان پر جاتی جہاں اس نے قالین اور پردے
دھلنے کو دیے تھے... کبھی پردوں والے
درزی کے پاس جاتی... کبھی صوفے والے
کے ہاں، کہ بعض صوفے اس قدر میلے ہو گئے
تھے کہ ان کے کپڑے بدلوا لینا ہی بہتر تھا۔

سب سے زیادہ مشکل اسے اپنے بیڈروم
کے لئے پیش آ رہی تھی۔ وہ اس کی ساری کلر اسکیم
بدل دینا چاہتی تھی۔ پہلے اس کی دیواریں گلابی
تھیں اور سرخ ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔
صوفے سنہری رنگ کے تھے۔

سرخ رنگ اسے راس نہیں آیا تھا۔ یہ
پردے اور صوفے اس نے گیسٹ روم
کی نذر کر دیے۔

کئی روز تک سوچ سوچ کر اس نے
گولڈن اور سفید رنگ اپنے بیڈروم کے
لئے پسند کئے۔ سفید رنگ کے کٹہرے گولڈن
کروائے۔ فرش پر گہرا گولڈن قالین بچھا دیا۔
سفید سلک کے ملائم پردے دیواروں پہ
ڈلوائے جن کے اوپر گولڈن رنگ کی دھاری
دار جھالریں لٹک رہی تھیں۔

صوفے پر جو کپڑا تھا، اس کا پرنٹ ہلکا
کاسنی اور گولڈن تھا۔ غرض وہاں کی ہر شے
بدل ڈالی تھی۔ اپنی شادی کی ایک تصویر بڑی
کروا کر دیوار پر آویزاں کر دی تھی۔ کمرے میں
کشادگی اور پاکیزگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

اسی کمرے میں آفاق کا پلنگ پڑا تھا
جس پر میلی چادر اور میلے تکیے کے غلاف
چڑھا کر، اس نے کاسنی بیڈ کور ڈال دیا تھا۔
اپنے بستر پر سفید جھالر والا بیڈ کور
ڈالا تھا۔

سفید رنگ پاکیزگی اور معصومیت
کی علامت ہے۔

سب سے زیادہ محنت اس نے اپنے
بیڈروم اور ڈرائنگ روم پر کی تھی جتنے ہلکے
رنگ اپنے بیڈروم میں استعمال کئے تھے اتنے
ہی شوخ رنگوں کا انتخاب ڈرائنگ روم میں
کیا تھا کہ رات کو جب آتش دان میں آگ
جلے تو اس کی روشنی میں سب رنگ زندہ ہو
جائیں۔

اس نے اپنا بیڈروم سب سے پہلے
ٹھیک کرایا تھا۔ مبادا کسی روز تھکا ہوا
مسافر اچانک لوٹ آئے۔

... مگر باقی سارے گھر میں ہر وقت
سامان پھیلا رہتا۔ کسی کمرے میں رنگ و روغن
ہو رہا ہوتا... کسی کمرے میں درزی بیٹھے
کھٹا کھٹ مشین چلا رہے ہوتے... کہیں
کوئی کاریگر کرسیاں بُن رہا ہوتا۔

ایسے میں اسحاق ہر جگہ چیختا چلاتا نظر
آتا۔

"یہ گھر ہے یا سرائے... صبح کو کوئی چیز
مشرق کی طرف رکھیں تو شام کو مغرب کی طرف
ملے گی... بھئی، یہ سارا سلسلہ کس لئے ہو رہا ہے،
کچھ پتہ بھی تو چلے؟ یوں معلوم ہوتا ہے اس
گھر میں بارات آنے والی ہے۔"

"تمہاری بارات آنے والی ہے اسحاق۔"
وہ ہنس کر کہتی۔

"خدا کی پناہ! ایک خاوند کے لئے زر کو
آگ لگائی جا رہی ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم، خاوند کیا ہوتا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں، کیا ہر بار جب وہ
باہر جایا کریں گے، تم اسی طرح دولت لٹایا
کرو گی؟ وہ تو بنجارہ ہے گھومنا پھرنا اس کا
شغل ہے۔"

"ارے... ان پر نہ لٹاؤں تو اور کس
پر لٹاؤں...؟ ان ہی کی دولت ہے، ان ہی
پر نچھاور کر رہی ہوں۔"

"خدا نہ کرے! یہ شوہر پرست لڑکیاں
... بس کیا کہوں؟ اپنی ساری دلکشی ختم
کر لیتی ہیں۔"

"اچھا اب زیادہ جلو نہیں۔ جب تمہاری
بیوی آئے گی تو میری مثالیں دیا کرو گے۔"

"واقعی...!"

وہ فلکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
ڈھٹائی سے ہنسا۔

"کمینہ...!" فلکی زیر لب بڑبڑائی۔

کبھی کبھی فلکی سوچتی کہ وہ یہ کیا
کر رہی ہے؟ کیا وہ فضول خرچ ہے؟ یا
احمق ہے؟

وقتاً فوقتاً آفاق اسے خرچ کے لئے
پیسے دیتا رہتا تھا مگر وہ اس نے خرچ نہیں کئے
تھے، رکھ لئے تھے۔ اس کی خواہشات آپ ہی
آپ محدود ہو گئی تھیں۔ اب کی جاتے وقت
آفاق اس کی میز پر دس ہزار روپے کا چیک
رکھ گیا تھا جسے اس نے پیار سے اٹھا کر
اپنی ڈائری میں رکھ لیا تھا۔

اس سے آگے کے حالات جاننے کے
لئے اگلے ماہ کا بانو ملاحظہ کیجیے۔

شمع کہانی نمبر کی زبردست مقبولیت کے بعد

ادارہ

کا

ایک اور بے مثال، باوقار خاص نمبر

تاریخ اشاعت
کا انتظار
فرمایئے

• فلم اور ٹی وی کی شخصیتوں پر دلچسپ مضامین، ستاروں کی رنگین تصویریں، ممتاز افسانہ نگاروں کے قلم سے فلم اور ٹی وی کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانیاں، خصوصی نظمیں اور وہ سب کچھ جس کی آپ شمع سے توقع رکھتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس خاص نمبر کی قیمت صرف پندرہ روپے ہوگی۔ شمع کے کہانی نمبر کی طرح یہ فلم + ٹی وی نمبر" بھی شمع کے عام شماروں سے الگ، ایک خصوصی اشاعت کے طور سے پیش کیا جائے گا۔

ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قلمی دوستی

نام : شیخ - این - رحمٰن عمر : ۲۶ سال
پتہ : 13/14-A پنڈت روڈ - چوہان بانگر ، نیو سیلم پور ، دہلی ۵۳
شوق : قلمی دوستی - تاریخ کی کتابیں پڑھنا ، سیر و تفریح - خطوط کا پابندی سے جواب دینا - سب سے دوستی -

نام : طاہر عزیز عمر : ۱۲ سال
پتہ : نزد ایم ایل بی کالج کوارٹرز مسجد حسن باغ ، بھوپال ، ۱ - ۴۶۲۰۰
شوق : اشعار جمع کرنا ، اچھی کتابوں کا مطالعہ ، خط و کتابت کرنا - سیمنار اور مقابلوں میں حصہ لینا - کہانی لکھنا - وغیرہ

نام : عشرت بانو (منی) معرفت محمد فیاض - عمر : ۱۷ سال
پتہ : ہندوستان جنرل اسٹور ، اردو ل موڑ ، جہاں آباد بہار ، ۸۰۴۴۰۸
شوق : ناول پڑھنا - ریڈیو پر فلمی گانے سننا - کھانا پکانا ، گھر کی صفائی کرنا - قلمی دوستی کرنا صرف بہنوں سے خط و کتابت کرنا -

نام : محمد زاہد اختر تبسم عمر : ۱۸ سال
پتہ : ریلوے چاندماری کوارٹر نمبر 649/D آسنسول - ۲
شوق : ہندوستان کے اہم رسالوں کا پابندی سے مطالعہ کرنا - کرکٹ میں دلچسپی لینا - اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے جد و جہد کرنا - ہر بھائی بہنوں کے خطوط کا جواب دینا -

نام : محمد صالح معرفت عمر : ۲۳ سال
پتہ : ال بین - پوسٹ بکس نمبر 531 تبوک - کے ایس اے
شوق : رسالے پڑھنا اچھے دوستوں سے دوستی کرنا پرانی فلم دیکھنا اور پرانے گانے سننا - شعر و شاعری سے لگاؤ -

نام : محمد حسین فریدی عمر : ۲۲ سال
پتہ : مکۃ المکرمہ - پی - او - 6569
شوق : شاعری کرنا ، فوٹو گرافی کرنا ، تنقیدی ، تخلیقی ، اصلاحی مضامین کا مطالعہ کرنا قلمی دوستی کرنا -

نام : انجم عارفی عمر : ۲۵ سال
پتہ : ۱۰۴ نیم سرائے - پوسٹ بیگم سرائے - الٰہ آباد — ۱۵
شوق : مضامین لکھنا ، اخبار و رسائل کا مطالعہ کرنا ، بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا -

نام : ساجد قاضی (بی - ای) عمر : ۱۸ سال
پتہ : معرفت انجمن خیال لائبریری ناگپوری گیٹ امراؤتی ، مہاراشٹر ۴۴۴۶۰۱
شوق : کالج کی پڑھائی کرنا ، قلمی دوستی کرنا - کرکٹ کمنٹری سننا

نام : نثار علی عمر : ۱۹ سال
پتہ : ۷/۴۳ کھجور والا کمپاؤنڈ - ار - بی - مارگ ، بمبئی ۱۰
شوق : قلمی دوستی کرنا ، لکھنا پڑھنا - دوستی بڑھانا ، اچھے لوگوں سے خطوط لکھنا ، زندگی میں کچھ بن جانا ، سیاحت ، کرکٹ ، بچوں کو پڑھانا -

نام : سید ظفر حسین ظفر عمر : ۳۳ سال
پتہ : ٹیچر گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول ، پوسٹ سوار ضلع رامپور ، یوپی
شوق : اردو زبان کی خدمت کرنا - دوستوں کو شاعری سکھانا - ادبی رسائل پڑھنا ، قلمی دوستی ، سیر و سیاحت وغیرہ

نام : الحسینی محمد عمر : ۳۲ سال
پتہ : پوسٹ بکس 7044 کسب لینا ، مراکو
شوق : عربی ، اردو ، ہندی رسائل اور کتابوں کا تبادلہ ، پرانی فلمیں دیکھنا ، فوٹو گرافی ، محمد رفیع کے گانے سننا -

نام : سلطانہ بانو (فاطمہ) شنو ، عمر : ۱۹ سال
پتہ : ببلو جنرل اسٹور ، بی جی روڈ جہاں آباد ۸۰۴۴۰۸
شوق : بانو ، خاتونِ مشرق ، آج کی خاتون ، گلابی کرن ، سرپاہ پڑھنا ، گھر کا کام کرنا ، بنائی ، کٹائی میں دلچسپی رکھنا - ریڈیو سننا - خطوں کے جواب دینا صرف بہنوں سے قلمی دوستی کرنا -

نام : سرفراز خاں عمر : ۲۹ سال
پتہ : محلہ شیام پور روڈ قصبہ کٹھور ضلع میرٹھ (یو پی) ۲۵۰۱۰۴
شوق : قلمی دوستی کرنا - بزرگوں کا احترام کرنا - اپا ہجوں سے ہمدردی مضمون لکھنا ، درد بھرے گیت سننا -

نام : پروین بانو عمر : ۱۹ سال

ہم مسکراتے ہیں تو چہرے پر لکیریں نمودار ہو جاتی ہیں لیکن دوسرے اعصاب چہرے کا توازن برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں - اور یہ لکیریں مستقل شکل اختیار نہیں کرتیں - جب مسکرانے کی عادت مستقل ہو جاتی ہے تو ان اعصاب کا توازن بگڑ جاتا ہے - اور ہونٹوں کے دونوں طرف نیم دائرے بن جاتے ہیں - اس کا علاج یہ ہے کہ منہ بند کر کے گال پھلائیں - دو منٹ انتظار کرنے کے بعد سانس

بات عمر کی ہے - عمر زیادہ ہو جائے تو اعصاب اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں - کھال ڈھیلی ہو جاتی ہے ، اس کے علاوہ بعض اوقات چہرے کی کھال سخت اور کھنچی ہوئی ہوتی ہے - اس میں لچک نہیں ہوتی اس لئے لکیریں مستقل شکل اختیار کر لیتی ہیں -

نیچے بیان کئے ہوئے علاج سے چہرے کے اعصاب کا توازن دوبارہ قائم ہو جاتا ہے ،

کہ یہ شادابی زیادہ عرصہ تک ... جوانی کے مختصر عرصے کے ختم ہوتے ہی یہ شادابی رخصت ہو جاتی ہے - اس لئے اگر خشک کھال والی عورتیں موائسچرائزر کا استعمال جاری رکھیں تو اس علاج کا خاطر خواہ فائدہ ہوگا - موائسچرائزر ویسے تو بازار میں انگریزی دوا فروشوں کے یہاں عام ملتے ہیں ، لیکن یہ مہنگے ہوتے ہیں - ایک گھریلو موائسچرائزر کھیرے کا گودا ہے - کھیرے کو

پتہ : نامانن نگر بل نمبر ۲ روم نمبر ۶۰ گھاٹ کوپر بمبئی ۸۶
شوق : قلمی دوستی سے ایک بھائی کی تلاش، انگریزی فلم دیکھنا۔
نام : محمد اسمٰعیل قادری چشتی، عمر: ۲۴ سال
پتہ : پرتاپ نگر نزدیک آر ٹی او۔ آفس۔ وردھا۔ مہاراشٹر ۴۴۲۰۰۱
شوق : قلمی دوستی پیدا کرنا۔ بھائی اور بہنوں کے خطوط کے جواب پابندی کے ساتھ دینا۔ کاسوہار ہی ترقی کے لئے دن رات محنت کرنا۔ اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا، غریب طالب علم کو کتابیں فیس پڑھنے روانہ کرنا غریب بہنا اور لڑکیوں کی شادی کروانا، مسجد، عیدگاہ۔ قبرستانوں کی تعمیر کے لئے چندہ دینا۔

نام : ایم۔ ندیم۔ اف... عمر: ۱۲ سال
پتہ : کاشانۂ ندیم، ہردے پور، پوسٹ سیھٹیا، ضلع غازی آباد (یوپی) ۲۴۵۱۰۱
شوق : قلمی دوستی ملکی و غیر ملکی بہن بھائیوں سے، شمع، بانو کا مطالعہ، میوزک، شطرنج، مصوری، شاعری۔ جرنلزم، خدمتِ خلق، پرانے نغمے سننا اور خود ترنم سے گانا وغیرہ

نام : سراج الحق عمر: ۲۵ سال
پتہ : پوسٹ بکس ۱۳۳۹ ابہا۔ سعودی عربیہ
شوق : قلمی دوستی کرنا۔ پرانی فلمیں دیکھنا۔

نام : زکریا۔ ایم عمر: ۲۷ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر 5954 ریاض، سعودی عربیہ
شوق : مطالعہ کرنا۔ فوٹو گرافی، سکے جمع کرنا

نام : سید ریاض احمد، عمر: ۱۹ سال
پتہ : مکان نمبر ۳۱-۴-۱ بھولک پور، مشیرآباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۸
شوق : بانو اور مختلف رسالے پڑھنا، قلمی دوستی کرنا، افسانے پڑھنا، غزلیں سُننا۔

نام : محمد شمیم انصاری عمر: ۲۴ سال
پتہ : ۵/۲ مرا کٹر جی ایم حسن ڈرگواڑ بیہ نمبر ۱۰، دھنباد ۸۲۸۱۱۰
شوق : کرکٹ کھیلنا اور دیکھنا، قلمی دوستی، فلم بینی، اور کتب بینی

نام : محمد علی مصباح عمر: ۲۸ سال
پتہ : مصباح ٹیکسٹائل محمد علی روڈ، منگلور، کرناٹک ۵۷۵۰۰۱

پتہ : علی منزل گرد ٹیا کھنڈ جہاں آباد، بہار، ۸۰۴۴۰۸
شوق : ادبی کتابوں کا جمع کرنا، اور بانو کا مطالعہ کرنا۔ اچھے دوستوں کو تلاش کرنا۔ خدمتِ خلق میں پیش پیش رہنا۔ آتے ہوئے خطوط کا جواب دینا۔ بلا تفریق، بے غرض محبت کرنے والوں کی مدد کرنا تعلیم نسواں کے فروغ میں ہر ممکن کوشش کرنا۔ بے غرض سیاست دانوں کی عزت کرنا۔ ذات پات و جہیز کے مخالفین کا ذل سے ساتھ دینا۔ اسلامی اداروں کو آگے بڑھانا۔

نام : خالد اختر عمر: ۱۷ سال
پتہ : ۲۱۔ ایم۔ حالی ہوسٹل، ایم۔ ایم ہال، اے ایم یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
شوق : اردو کی کتابیں پڑھنا۔ شطرنج، کرکٹ کھیلنا، خط پڑھتے ہی جواب دینا۔ گھیا ... کم

نام : عشرت امیر عمر: ۱۷ سال
پتہ : محلہ کوٹھا ٹولی، پوسٹ سہسرام، ضلع روہتاس۔ ۸۲۱۱۱۵
شوق : بہن اور بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا، خطوں کا جواب پابندی سے دینا۔ رفیع کے درد بھرے گیت سُننا۔ نئی نئی جگہ گھومنا۔ دوستوں کے جنم دن پر تحفہ بھیجنا۔

نام : مسعود اختر انصاری عمر: ۲۵ سال
پتہ : پاپولر آٹو انجینیرنگ ورکس بائی پاس روڈ گھریا، ستونا تھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱
شوق : قلمی دوستی کرنا، خطوں کا جواب پابندی سے دینا۔ غزلیں جمع کرنا۔ دوسروں کے کام آنا۔ مزاحیہ باتیں کرنا۔

نام : محمد عطاء اللہ الخطیب عمر: ۳۲ سال
پتہ : بقالہ فلاح۔ ہجرۃ زبیر۔ سراۃ عبیدۃ۔ ابہا۔ السعودیہ
شوق : قلمی دوستی

نام : محمد عامر خان عمر: ۲۲ سال
پتہ : معرفت ظفر خاں صاحب محلہ سادھو فیصل شاہ جہاں پور تحصیل ضلع میرٹھ، ۲۵۰۱۰۴
شوق : بھائی بہنوں سے دوستی کرنا۔ سچے دوستوں کے لئے جان کی بازی لگانا۔ خط کا فوراً جواب دینا۔ باڈی بلڈنگ کرنا۔ بوکسنگ لڑنا۔ اور شعر سُننا اور سُنانا جو زبان سے کہا اثر ...

ان تبدیلیوں کے باوجود اس خاص نمبر کی قیمت صرف پندرہ روپے ہوگی۔ شمع کے کہانی نمبر کی طرح یہ فلم + ٹی وی نمبر" بھی شمع کے عام شماروں سے الگ، ایک خصوصی اشاعت کے طور سے پیش کیا جائے گا۔

ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیوٹی کالج

چہرے کو جھریوں سے پاک رکھنے کی ترکیبیں

شہناز حسین

جب ہم مسکراتے ہیں تو ہماری باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اگر ہم بات بے بات مسکرانے کی عادت ڈال لیں تو یہ عادت ہمیں مہنگی پڑتی ہے۔ ہمیشہ مسکرانے والی عورتوں کے ہونٹوں کے دونوں طرف لکیریں پڑجاتی ہیں جو نیم دائرے کی شکل بنالیتی ہیں۔ یہ خوش مزاجی کی قیمت ہے۔ قدرت نے اعصاب اور پٹھوں میں توازن رکھا ہے۔ انسان کے جسم میں ہزاروں پٹھے ہیں جو ایک دوسرے کا توازن قائم رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ مثلاً جب ہم مسکراتے ہیں تو چہرے پر لکیریں نمودار ہوجاتی ہیں لیکن دوسرے اعصاب چہرے کا توازن برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ اور یہ لکیریں مستقل شکل اختیار نہیں کرتیں۔ جب مسکرانے کی عادت مستقل ہوجاتی ہے تو ان اعصاب کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اور ہونٹوں کے دونوں طرف نیم دائرے بن جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ منہ بند کرکے گال پھلائیں۔ دو منٹ انتظار کرنے کے بعد سانس باہر نکال دیں۔ گال پھلانے کے دوران میں یہ نیم دائرے غائب ہوجاتے ہیں۔ دن میں دو چار بار ورزش کرنے سے لکیروں میں کمی ہوجاتی ہے۔

ہونٹوں کے دونوں طرف نیم دائروں کے علاوہ چہرے پر کئی جگہ لکیریں نمودار ہوسکتی ہیں۔ ان میں آنکھوں کے بیرونی حصے بھی شامل ہیں۔ ان لکیروں کو 'کوے کے پنجے' بھی کہتے ہیں۔ یہ لکیریں بھی زیادہ ہنسنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اصل بات عمر کی ہے۔ عمر زیادہ ہوجائے تو اعصاب اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں۔ کھال ڈھیلی ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ بعض اوقات چہرے کی کھال سخت اور کھنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں لچک نہیں ہوتی اس لئے لکیریں مستقل شکل اختیار کرلیتی ہیں۔

نیچے بیان کئے ہوئے علاج سے چہرے کے اعصاب کا توازن دوبارہ قائم ہوجاتا ہے، جھریاں غائب ہوجاتی ہیں اور ڈھیلی کھال سکڑ کر نارمل ہوجاتی ہے۔

اس علاج کو آزمانے سے پہلے ایک بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ اگر آپ کی کھال خشک ہے تو گویا جھریوں کے لئے میدان صاف ہے۔ خشک کھال پر جھریاں سب سے پہلے نمایاں ہوتی ہیں۔ خشک کھال سب سے زیادہ شگفتہ اور تروتازہ ہوتی ہے۔ جوانی میں اس کی شادابی کا جواب نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس کہ یہ شادابی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ جوانی کے مختصر عرصے کے ختم ہوتے ہی یہ شادابی رخصت ہوجاتی ہے۔ اس لئے اگر خشک کھال والی عورتیں موائسچرائزر کا استعمال جاری رکھیں تو اس علاج کا خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ موائسچرائزر ویسے تو بازار میں انگریزی دوا فروشوں کے یہاں عام ملتے ہیں، لیکن یہ مہنگے ہوتے ہیں۔ ایک گھریلو موائسچرائزر کھیرے کا گودا ہے۔ کھیرے کو

کچل کر یا اس کی قاشیں بنا کر چہرے پر رکھیں۔ کھیرے کی نمی جلد میں سرایت کر جاتی ہے۔ دس منٹ بعد انہیں ہٹا دیں۔ دن میں ایک بار یہ عمل ضرور دُہرائیں۔ دن میں کئی بار سادے پانی سے مونہہ دھونا مفید ہوتا ہے۔

اس علاج کو اکثر حسن کاروں نے آزمایا ہے۔ اس کا تجربہ کرنے کے بعد ان کا دعویٰ ہے کہ اس علاج کے بعد انسان کی عمر دس سال کم معلوم ہوتی ہے۔ جھریاں غائب ہو جاتی ہیں اور گہری لکیریں کم ہو جاتی ہیں۔

اس علاج میں انگلیوں کی مدد سے چہرے کی خاص خاص جگہوں پر تھپتھپایا جاتا ہے۔ وقت کی میعاد بھی مقرر ہے۔ اس علاج کو ہفتے میں تین بار دہرانا چاہئے۔ جب پانچ ہفتے گزر جائیں تو اگلے تین ہفتوں تک ہفتے میں دو بار اور اس کے بعد دو ہفتوں تک ہفتے میں ایک بار اسے دُہرایا جائے۔ اس کے بعد دو ہفتے میں صرف ایک بار مستقل دہرانا چاہئے۔

اس علاج میں دونوں ہاتھوں کا استعمال ضروری ہے، تاکہ ایک ہی وقت میں چہرے کے دونوں جانب کی کھال زیرِ علاج رہے۔ سب سے پہلے چہرے کی اُن جگہوں کو ڈھیلا چھوڑنا ضروری ہے جہاں جھریاں نمودار ہو رہی ہیں تو اس کی ترکیب یہ ہے کہ اُس جگہ کو دس سیکنڈ تک زور سے دبائیں۔ اتنا زور لگائیں کہ معمولی سی تکلیف محسوس ہو، پھر آہستہ آہستہ انگلیوں کا دباؤ کم کر دیں۔ تین بار اس عمل کو دہرائیں۔ اس طرح ان جگہوں پر اعصاب کا تناؤ کم ہو جائے گا

دوسرا قدم یہ ہے کہ ان جگہوں کو انگلیوں سے تھپتھپائیں۔ دس سیکنڈ انتظار کر کے پھر آہستہ آہستہ تھپتھپائیں۔ تین منٹ تک یہ عمل دُہرائیں۔ تمام جگہوں پر یہ دونوں عمل دہرانے کے لئے اور باقی ورزش کے لئے ایک گھنٹہ درکار ہے۔ لیکن اس لمبے عمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک وقت میں پورا فیس لفٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کے چہرے کے ایک یا دو مقامات پر ہی جھریاں ہیں تو اس ورزش میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ مثلاً اگر صرف پیشانی پر لکیریں ہیں تو پوری ورزش کے لئے چند منٹ ہی درکار ہوں گے۔ ایک وقت میں ایک مقام پر ہی محنت کرنا کافی ہے۔ اگر آپ کا دائرۂ عمل سارے مقامات ہیں تو بہتر ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں چند منٹ تک انتظار کریں۔ مثلاً آپ پیشانی سے فارغ ہو کر آنکھوں کے نچلے حصے کی طرف آتی ہیں تو دونوں ورزشوں کے درمیان ایک منٹ کا وقفہ ہونا ضروری ہے۔

ورزش کا انحصار ان ہی دو باتوں پر ہے یعنی ایک بار انگلیوں سے دبانا اور چھوڑ دینا۔ اس کے بعد ان مقامات کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ تھپتھپانا۔

(۱) یہ پیشانی کے لئے ہے۔ پیشانی کے دونوں طرف اور دونوں بھوؤں کو پہلے تین منٹ تک ڈھیلا چھوڑنے کی مشق کریں، پھر دونوں بھوؤں کے درمیانی مقام کو تیس سیکنڈ تک تھپتھپائیں۔ اس عمل سے پیشانی کی لکیریں صاف ہو جاتی ہیں۔

(۲) ناک کے اوپر آنکھوں کے درمیان لکیریں دُور کرنے کے لئے دو تین منٹ تک ان دو جگہوں کو ڈھیلا چھوڑنے کی مشق کریں پھر دونوں ابروؤں کے درمیانی حصے کو ایک منٹ تک تھپتھپائیں

(۳) آنکھوں کے بالائی پپوٹوں اور بھوؤں کے پاس کی جگہ کے لئے بھوؤں اور پپوٹوں کو دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ ڈھائی منٹ تک یہ عمل جاری رکھیں۔

(۴) آنکھوں کے بیرونی حصے اور کنپٹی کے درمیان کے مقام کے لئے بھوؤں کے درمیانی حصے، آنکھوں کا نچلا حصہ اور ہونٹوں کے کنارے دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ عمل تین منٹ تک جاری رکھیں اس کے بعد ڈیڑھ منٹ تک دونوں بھوؤں کو تھپتھپائیں۔

(۵) آنکھوں کے نیچے کی لکیروں کے لئے آنکھوں کے نچلے بیرونی حصے کو دبائیں۔ اس جگہ کو تھپتھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۶) آنکھوں کے بیرونی کونوں سے جبڑوں تک کے لئے۔ رخسار کی ہڈیوں اور ہونٹوں کے بیرونی نیم دائروں کو دبا دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ حصہ چاہِ ذقن کہلاتا ہے۔

(۷) ان لکیروں کے لئے جو ناک سے شروع ہو کر آنکھوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی جبڑوں تک پہنچتی ہیں۔ ہونٹوں کے بیرونی نیم دائروں کو دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ مونچھوں والی جگہ کے دونوں طرف اور ٹھوڑی کے بالائی حصے کو ایک ایک منٹ تک تھپتھپائیں۔

(۸) ان لکیروں کے لئے جو نتھنوں سے شروع ہو کر ہونٹوں کے بیرونی حصے کے پاس سے گزرتی ہیں اور نیم دائرہ بناتی ہوئی ٹھوڑی تک پہنچتی ہیں۔ ان نیم دائروں کو اور نتھنوں کی بالائی جگہ کو دبا دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ عمل تین منٹ تک جاری رکھیں پھر مونچھوں والی جگہ کے دونوں طرف اور ٹھوڑی کے بالائی حصے کو ایک ایک منٹ تک تھپتھپائیں۔

(۹) مونہہ کے دونوں طرف کی لکیروں کے لئے نچلے ہونٹ کے نیچے دونوں طرف مونچھوں والی جگہ اور ٹھوڑی کے بالائی حصے کو تین منٹ تک دبا کر چھوڑ دیں، پھر نتھنوں کے دونوں طرف ایک انچ چھوڑ کر رخسار کو ایک ایک منٹ تک تھپتھپائیں۔

(۱۰) بالائی ہونٹ اور ناک کے درمیان کی لکیروں کے لئے۔ مونچھوں والی جگہ کے دونوں طرف اور درمیانی حصے کو تین منٹ تک دبا دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں، پھر دونوں نتھنوں کے نچلے حصے دونوں نتھنوں سے ایک انچ کا فاصلہ چھوڑ کر رخسار اور ٹھوڑی کے درمیانی بالائی حصے کو تیس سیکنڈ تک تھپتھپائیں۔

(۱۱) زیریں ہونٹ اور ٹھوڑی کے درمیان کی لکیروں کے لئے نچلے ہونٹ کے زیریں حصے کے دونوں طرف اور ٹھوڑی کے درمیانی بالائی حصے کو تین تین منٹ تک دبا کر ڈھیلا چھوڑ دیں، پھر مونچھوں والی جگہ کے دونوں طرف ایک منٹ تک تھپتھپائیں۔

بزم بانو

پرویز عالم، اعظم گڑھ

س: مرد ہمیشہ اپنی ہونے والی محبوبہ کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اس کی یادوں میں کھویا رہتا ہے اور کبھی کبھی اپنے ذہن کے پردے پر اس کی تصویر بنایا کرتا ہے۔ کبھی مسکراتا ہے کبھی مایوس رہتا ہے۔ کیا لڑکیاں بھی ایسا کرتی ہیں؟

ج: ضرور کرتی ہوں گی، مگر اب شاید اتنی فرصت نہ ملتی ہوگی۔ تعلیم اور نوکری کے پیچھے بہت دوڑنا پڑتا ہے۔ پھر بہت سے مشغلے بڑھ گئے ہیں۔ فلم ٹی۔وی عشق بازی کی زیادہ فرصت نہیں ملتی ہوگی۔

سید عبدالرحمٰن، اگواری، ضلع بیڑ

س: عریانی کی طرف جاتی ہوئی تہذیب کا مستقبل کیا ہوگا؟

ج: کپڑوں کے کارخانوں کا بیڑہ ہو جائے گا۔

س: دنیا میں عبرت حاصل ہونے کا موقع کب آتا ہے؟

ج: اسی دنیا میں زندگی کے ہر موڑ پر موقع ہی موقع ہے۔

سرور عالم۔ ملکی چک (پربیگھہ)

س: صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی انسان اتنا بے صبر کیوں ہو جاتا ہے

ج: ظلم اور ناانصافی پر اگر صبر کر لیا جائے تو سخت حماقت ہوگی۔ جھوٹ کی حمایت کرنا اور صبر کر کے خاموش رہنا تو گناہ ہے۔

عبدالمنان خاں سعیدی، سہرام بہار

س: لوگ شرافت کو کمزوری کا نام دیتے ہیں کیوں؟

ج: حکومت طاقت ور کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو وہ کم زور کا حق جھوٹ اور بے ایمانی سے مار لیتا ہے۔ "جس کا ڈنڈا اس کی بھینس" والا اصول لاگو کر دیتا ہے۔ وہ اتنا طاقت ور ہو جاتا ہے کہ کم زور کو جھوٹ بھی سچ ماننا پڑتا ہے۔

حامد مرزا، ضلع بیکر

س: اگر عورت مرد کا لباس ہے تو کیا اُسے داغدار ہونے پر بدلا جا سکتا ہے۔

ج: اگر عورت مرد کا لباس ہے تو مرد عورت کا لباس ہے، دونوں کو بدلا جا سکتا ہے۔

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دل چسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزم بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

س: انسان کی سب سے بڑی متاع کیا ہے؟

ج: اس خالقِ دو جہاں کا شکر ادا کرنا، دل و دماغ اور عمل سے۔ ہر جان دار کو اُس کا شکر ادا کرنا ہے۔

س: زہر آبِ حیات کب بن جاتا ہے؟

ج: سانپ کے کاٹے کا علاج سانپ کے زہر سے بنتا ہے۔

شگفتہ پروین، دہلی

س: جب خوشیاں مونہہ موڑ لیں تو؟

ج: بھلا پھسلا کر انہیں منا لینا چاہئے۔ خوشی انسان تعمیر کرتا ہے، آسمان سے نہیں ٹپکتی۔

عین الورع، رام پور

س: کہانی اور افسانہ۔ یہ دو نام ہیں دونوں میں بنیادی فرق ہے؟ اگر ہے تو کیا کچھ فرمائیں؟

ج: فارسی میں کہانی کو افسانہ کہتے ہیں۔ کہانی کتابوں میں چھپنے سے پہلے کہی جاتی تھی۔ علم عام انسانوں تک نہیں پہنچا تھا۔ دانش مند اسی بات کو دل چسپ بنانے کے لئے اسے داستان یا کہانی کا روپ دیتے تھے۔

محمد الطاف الدین، نرمل (اے۔پی)

س: انسان شہرت پاکر مغرور ہوتا ہے یا دولت پاکر؟

ج: وہ کچھ بھی پاکر مغرور ہو جائے احمق ہی ہوگا۔

شیخ محمد ساجد حیدر۔ شیولپور (بہار)

س: وہ کون سی چیز ہے جب انسان اس دنیا میں آتا ہے تو ساتھ لاتا ہے، جاتا ہے تو ساتھ لے جاتا ہے۔

ج: خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ جاتا ہے، خوشیاں یا دکھ دے جاتا ہے۔

شکیل احمد چاند، مونگیر

س: کامیاب زندگی گزارنے کے لئے کس چیز کی ضرورت پڑتی ہے؟

ج: سب سے پہلے علم، پھر اس کا صحیح استعمال

رقیہ رحمان، حیدر آباد (اے۔پی)

س : شادی میں مرد کی جیت ہوتی ہے یا عورت کی؟

ج : شادی مرد اور عورت کے ملاپ کا اعلان ہے، کرکٹ کا میچ یا پہلوان کا اکھاڑہ نہیں کہ ہار جیت ہو۔

س : سپنوں کے سہارے اگر عورت زندگی گزارنا چاہے تو؟

ج : عورت نہیں مرد بھی سپنوں کے سہارے صرف پاگل خانہ بساتا ہے۔

محمد رفعت علی جناح، مظفر پور

س : نفس پر قابو پانے کا آسان طریقہ کیا ہے؟

ج : خود پر قابو پاکر ہی نفس کی غلامی سے بچا جا سکتا ہے۔

سیما، نئی دہلی

س : مہر کی رقم کو لڑکے کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے یا لڑکی کے؟

ج : ہونا تو لڑکے کی حیثیت سے ہی بہتر ہے کہ لڑکی تو جہیز لاتی ہے جو برت لیا جاتا ہے۔ یہ بیٹی کو دے دیتی ہے۔ اگر میاں سے نباہ نہ ہو یا بیوہ ہو جائے تو بھیک یا جسم فروشی پر مجبور نہ ہو۔

محمد گلزار احمد، چمپا نگر، بہار

س : مسلمان کیا ہے؟

ج : جو سارے عالم کی سلامتی پر یقین رکھتا ہے۔ ہر جاندار کو جینے، پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے۔ مگر آج کیا مسلمان اپنا فرض ادا کر رہا ہے؟ یا صرف اپنی ذات کی فکر میں غرق ہے۔

شیخ جلیل احمد آتش، کھم

س : کسی کی نفرت جب پلٹ کر محبت بنتی ہے تو کون سی شکل اختیار کر لیتی ہے؟

ج : اچھی شکل ہی اختیار کرتی ہوگی۔ اور غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

محمد عظمت علی، اسلامیہ تولہ، چوڑھی

س : اگر دنیا میں ایک دل بھی محبت کرنے والا باقی نہ رہے تو؟

ج : کروڑوں انسان محبت سے محروم ہو کر بھی جی رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ایک دل بھی محبت کرنے والا باقی نہ رہے گا تو بغیر محبت کے بھی جینا آ جائے گا۔

س : عورت کی قیمت مرد سے کم ہے یا برابر؟

ج : کبھی خریدنے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے عورت زیادہ مہنگی پڑتی ہے۔ ماں، بہن بیٹی کو دینا ہی پڑتا ہے۔ باپ، بھائی اور بیٹوں سے وصولی کا حق ہوتا ہے۔

محمد ندیم خاں، شاہجہاں پور

س : میری پریشانی یہ ہے کہ میرا قد چھ فٹ دو انچ ہے اور عمر ۱۷ سال ہے۔ مجھے دیکھ کر لوگ ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابھی اور بڑھے گا۔ اس لئے مہربانی کر کے کوئی اچھی رائے تجویز کریں۔

ج : آپ کے قد و قامت سے ڈرتے ہیں مذاق اڑا کر احساس کمتری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پڑھائی پر زیادہ توجہ دیجئے۔ قد کے ساتھ علم اور عقل کو بھی بڑھائیے۔

اکبر علی، حسن رائے پور

س : پیار سے کیا فائدہ ہے، اگر کوئی فائدہ نہیں تو مت لکھئے گا۔

ج : پیار پر سارا نظام زندگی قائم ہے۔ والدین کا پیار، بھائی بہن کا، دوستوں کا بلکہ ساری دنیا کا پیار ہی خدا کو بھی پسند ہے اور نبیوں کو بھی۔ ادیبوں، شاعروں کو بھی۔ سب کو پیار ہی سے پیار ہوتا ہے۔

عرفان احمد خاں، شکر نگر

س : انسان کا ضمیر کب جاگ اٹھتا ہے؟

ج : ضمیر بے چارا تو ہر وقت جاگتے رہنے کو تیار رہتا ہے۔ انسان ہی اسے تھپک کر سلا دیتا ہے۔ ورنہ ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔

رضیہ سلطانہ جلیلی کھم پور (اے۔پی)

س : عصمت چغتائی صاحبہ! جہیز سے بچنے کا کوئی طریقہ بتائیں؟

ج : صرف امیر اور اچھی نوکری والے جہیز مانگتے ہیں۔ کسی تعلیم یافتہ غریب لڑکے سے شادی کیجئے، جہیز نہیں مانگے گا۔

س : کیا یہ سچ ہے کہ ہر جہان میں آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے!

ج : بالکل، ہر انسان کو عورت ہی جنم دیتی ہے، پالتی پوستی ہے۔ پڑھاتی لکھاتی ہے۔ اس میں باپ کی کمائی لگتی ہے۔ اگر اس عورت کے پیچھے مرد کا ہاتھ نہ ہو تو اتنا آسان نہ ہوگا۔ دونوں کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

مس عالیہ پروین، شکرانوں، ضلع مونگیر

س : انسان زندگی سے کب بیزار ہو جاتا ہے؟

ج : لاعلاج مرض لاحق ہو جائے۔ مالی مشکلات قابو سے باہر ہو جائیں۔ اکثر گھریلو جھگڑے بیوی بچوں کی ناآسودگی کا الزام، اور تنگ دستی بیزاری کا باعث ہوتی ہے۔

س : چاہتے ہوئے بھی انسان کسی کو بھلانے سے کیوں قاصر رہتا ہے؟

ج : صرف بے وقوف اور بھولنے والے ہوتے ہیں۔ کسی کو بھولنے کی بجائے دل کے ایک کونے میں قید کر لیجئے۔ کہاں جائے گا بھاگ کر۔ اطمینان سے زندگی کی ڈگر پر قدم بڑھاتے جائیں۔

س : ایک سچے ہمسفر میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔

ج : اس کے پاس ٹکٹ ضرور ہو، ورنہ ٹکٹ چیکر بہت مٹی پلید کرے گا، آپ کو جرمانہ بھرنی پڑے گی۔ علاوہ ازیں وہ خوش اخلاق ہونا چاہئے بدمزاج نہ ہو، تو سفر اچھا رہے گا۔

محمد شفیق پریمی، جمشید پور

س : حالات سے کب سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے؟

ج : قدم قدم پر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، لیکن ناانصافی سے سمجھوتہ صرف بزدل کرتے ہیں۔

بلڈ پریشر کا علاج
گھوڑی کے دودھ کی چھاچھ

منگولیا کے ڈاکٹروں کو یقین ہے کہ گھوڑی کے دودھ کی چھاچھ سے دل کی بیماریوں سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ منگولیا کے پانچ سو مریضوں پر تجربے سے پتہ چلا ہے کہ اگر دل کی بیماری سے متاثر شخص کو باقاعدگی سے گھوڑی کے دودھ کی چھاچھ پلائی جائے تو اس کے خون کا دباؤ کم رہتا ہے اور خون کا گاڑھا پن دور ہوجاتا ہے۔ دل اچھی طرح کام کرتا ہے اور جسم ہر بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

منگولیا کے قبائلی صدیوں سے گھوڑی کا دودھ پیتے آرہے ہیں اور مہمانوں کی بھی اسی سے تواضع کرتے ہیں۔

مچھلیاں کتوں سے زیادہ عقل مند!

سوویت یونین کے ایک سائنس داں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ ڈولفن مچھلیاں کتوں کے مقابلے میں زیادہ عقل مند ہوتی ہیں، یہاں تک وہ تھوڑے بہت حساب کے سوال بھی حل کرسکتی ہیں۔

ماسکو یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈیمٹری قلیش ڈولفن مچھلیوں کا کئی سال سے مشاہدہ کررہے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ڈولفن مچھلیاں سمندر کے دوسرے جانداروں کے برتاؤ کا پہلے سے ہی اندازہ لگا سکتی ہیں اور دلیل کے ساتھ سوچ بھی سکتی ہیں۔

گدھوں کی برات

اس سال تقریباً سارے ملک میں بارش کی کمی کی وجہ سے خشک سالی کا دور دورہ ہے، کرناٹک کے شموگا ضلع کے گوروپور گاؤں کے کسانوں نے ورن دیوتا (ہندو عقیدے کے مطابق بارش برسانے والا دیوتا) کو خوش کرنے کے لئے گاؤں کے سب گدھوں کو اکٹھا کیا اور انہیں

پھولوں کے ہار پہنا کر جلوس نکالا۔ گاؤں کی چوپال میں دو گدھوں کی دو گدھیوں سے شادی کرائی۔ برات کا جلوس آخر میں دیوتا سے بارش کی دعا مانگ کر منتشر ہوگیا۔

مُردہ بدست زندہ

الہ آباد کے ایس۔ آر۔ این اسپتال کے قریب ایک اخبار رپورٹر نے عجیب تماشا دیکھا۔ شہر میں پینے کے پانی کی قلت ہے۔ کارپوریشن نے بیل گاڑیوں اور ٹرکوں میں ٹینکر رکھ کر پانی بانٹنے کے لئے عام لوگوں کو اجازت دے دی تو کچھ لالچی لوگ پانی بیچ کر روپیہ حاصل کرنے کی دھن میں مذکورہ ہسپتال کے مردوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے رکھا ہوا برف چوری کرکے پانی کے ٹینکروں میں ڈالنے لگے۔ اس طرح انہوں نے عوام کو ٹھنڈا پانی سستے داموں پر مہیا کرنے کا ڈراما کیا اور اپنے نفع کے لئے مردوں کو بھی نہیں بخشا۔

مُلک میں ایک کروڑ بیس لاکھ لوگ اپاہج!

۱۹۸۶ کے نیشنل سیمپل سروے کے مطابق ملک کے تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ لوگ اپاہج ہیں۔

سروے کرنے والے سرفراز احمد اور سروج کمار نے بتایا کہ اگر حاملہ عورتوں کی ٹھیک طرح سے دیکھ بھال کی جائے اور بچے کی پیدائش کے وقت صحیح انتظام ہو تو کافی حد تک اپاہج پن میں کمی آسکتی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ ۱۹۸۲ اور ۱۹۸۳ کے مقابلے میں پولیو کی واردات میں تھوڑا سا سدھار ہوا ہے۔ ۱۹۸۲ میں ۴۶۹ و ۲۱ بچے پولیو کا شکار تھے، ۱۹۸۳ میں ۳۱۰، ۲۱، ۱۹۸۴ میں ۴۰ و ۱۸ اور ۱۹۸۶ میں ۳۲ و ۱۹

بیش قیمت ورثہ

حال ہی میں بنگلور کے ایک پھل فروش کے مکان میں مغلیہ دور کا سونے سے حاشیہ کیا ہوا قرآن مجید کا ایک نایاب مسودہ دریافت ہوا ہے۔ لیکن یہ نسخہ مالک کے ہاتھوں سے نکل کر اب سی۔ بی۔ آئی کی تحویل میں چلا گیا ہے۔

سونے کے حاشیوں سے مزین نہایت نفیس نسخے کا وزن تقریباً ۵ کلوگرام ہے۔ ضخامت ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور سائز ۳۰×۴۵ سینٹی میٹر ہے۔ اس نادر نسخے کے ہر صفحہ کا کنارہ خالص سونے سے بنایا گیا ہے۔ اس مسودے کو اورنگ زیب کے دربار کے مشہور کاتب حفیظ حبیب اللہ نے ۱۶۶۸ میں لکھا تھا۔

یہ بیش بہا خزانہ ابراہیم خاں کی ملکیت تھا، جو اپنی والدہ، بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک کرائے کی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ مسودہ اتنا قیمتی ہے۔ یہ موروثی جائیداد منقولہ کی صورت میں مجھ تک پہنچا تھا۔ جسے میں نے محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔

قدرتی طریقے سے سفید داغ کا علاج

آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر پی۔ سی۔ اگروال نے بتایا کہ کھانے کے پرہیز کے

ساتھ اگر ریڑھ کی ہڈی اور متاثرہ مقام پر کچھ جڑی بوٹیوں کا لیپ کیا جائے تو سفید داغ سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ مکمل علاج میں تین سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔

ایربس کی پہلی عورت پائلٹ

کیپٹن مس ڈربا بینرجی کو دُنیا کی برسرِکار پائلیٹ بننے کا شرف حاصل ہے۔ ڈربا آج کل انڈین ایرلائنز کے بوئنگ ۷۳۷ کی مددگار پائلیٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس قابل ثابت کرنے کے کئی امتحان کے ٹیسٹ دیئے ہیں۔ انہوں نے مددگار پائلیٹ کے طور پر پہلی اڑان ۱۴ مئی ۱۹۸۷ کو بھری تھی مگر اب وہ کلکتہ، بمبئی، دہلی اور بنگلور تک جہاز اڑانے میں مدد کر چکی ہیں۔

مہرباں کیسے کیسے

پونے کے مشہور زمانہ کالج ایس۔ این ڈی۔ ٹی نے پچھلے دنوں اخباروں میں عامی دھوم مچائی۔ یہاں کی پچاس لڑکیوں نے اپنے اپنے نیل کٹر لے کر کالج کے پیچھے اور آس پاس بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہنے والے پانچ چھ سال کی لڑکیوں اور لڑکوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے بڑھے ہوئے ناخنوں کو کاٹا اور ان کے والدین کو سمجھایا کہ صحت کے نقطۂ نظر سے ناخنوں کو کاٹنا ضروری ہے۔ اب یہاں کی جھونپڑیوں میں بچے اپنے ناخن صاف رکھ رہے ہیں۔ کالج کے پرنسپل بھی اس مہم میں لڑکیوں کے ساتھ تھے۔

جان لیوا مذاق

گذشتہ ہفتہ نونی پورم (ضلع مدولائی، آندھرا پردیش) گاؤں میں دو نوجوانوں نے ایک دوسرے کو چھرا گھونپ کر ہلاک کیا۔ ہوا یوں کہ بارش سے بھیگی سڑک پر ایک نوجوان پھسل کر گر پڑا یہ منظر دیکھ کر وہاں سے گزر رہا دوسرا نوجوان اس پر زور سے ہنسنے لگا تو گرنے والا غصہ سے بے قابو ہو کر نزدیک ہی میں واقع اپنے مکان میں گیا اور بڑا سا چھرا لا کر ہنسنے والے شخص کو گھونپ دیا۔ اس شخص نے تڑپتی حالت میں اپنے پیٹ میں دھنسے چھرے کو کسی بھی طرح نکالا اور وار کرنے والے کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں دونوں ہلاک ہو گئے۔

بھیڑ کا گوشت غریبوں کے لئے

اسلامی ترقیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق اس سال سعودی عرب سے ۵،۰۰،۰۰۰ بھیڑوں کا گوشت دُنیا کے ۲۰ ملکوں کو بھیجا گیا ہے، تاکہ وہاں بسے ہوئے مُسلمان پناہ گزین اور غریب لوگ اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ حج کے موقع پر سعودی عرب میں لاکھوں بھیڑوں کی قربانی ہوتی ہے اور پچھلے چار برس سے سعودی حکومت مختلف ملکوں کے ضرورت مندوں کو ان کا گوشت فراہم کر رہی ہے۔

زندہ رہنے کی سزا

سپریم کورٹ میں اپنی قسم کا ایک انوکھا مقدمہ زیر سماعت ہے۔ مقدمہ یہ ہے کہ ڈاک اور تار کے محکمے نے بے چارے ڈی۔ این۔ رام چندرن کی زندگی کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا وہ غلط تھا۔ رام چندرن کو محکمے کے اندازے کے مطابق ۱۹۶۵ میں ہی مر جانا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک زندہ ہے۔

معاملہ یہ ہے کہ رام چندرن نے آندھرا کے ایک ڈاک گھر میں ۴۲ سال ملازمت کے بعد پنشن لے لی تھی۔ چونکہ اُسے یک مُشت ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی اس لئے پنشن قانون کے حساب سے محکمے نے اُسے ۲،۹۹۹ روپے ایک ساتھ ادا کر دیئے اور یک مشت ادائیگی کے بدلے میں اس کی طے شدہ پنشن سے ہر ماہ ۲۵ روپے کی کٹوتی شروع ہو گئی۔ رام چندرن ۱۹۵۵ میں ریٹائر ہوا تھا اور آج تک اس کی پنشن سے ہر ماہ ۲۵ روپے کاٹے جا رہے ہیں اس طرح کاٹی ہوئی رقم اب تک ۹،۶۰۰ روپے ہو گئی ہے جب کہ اُس نے صرف ۲،۹۹۹ روپے لئے تھے۔

محکمے کا اندازہ تھا کہ وہ ریٹائر ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ دس سال زندہ رہے گا۔ اس حساب سے ہر مہینے ۲۵ روپے کی کٹوتی ۱۲۰ قسطوں میں طے ہوئی تھی۔ لیکن رام چندرن کو ریٹائر ہوئے ۳۲ سال ہو گئے ہیں اور ابھی تک یہ کٹوتی جاری ہے۔ اب رام چندرن نے یہ معاملہ سپریم کورٹ میں پیش کیا ہے۔

بانو، نئی دہلی

اپنے بھائی کی قبر میں زندہ دفن ہو گیا

شمالی آئرلینڈ میں چارلس راجر نام کا ایک شخص قبر کھودنے میں گورکنوں کی مدد کر رہا تھا۔ یہ قبر اس کے خاندانی قبرستان میں کھودی جا رہی تھی۔ جب قبر کھودی جا چکی تو جس جگہ پر کھڑا تھا وہاں سے مٹی کھسک گئی اور وہ قبر میں جا گرا۔ اس کا سر اپنے بھائی کے تابوت سے جا ٹکرایا اور فوراً ہی اس کی موت واقع ہو گئی جب اُسے قبر سے نکالا گیا تو وہ مر چکا تھا۔

خوب صورت گلے

تین نئی
کشیدہ کاریاں
فرح کشیدہ کاری
(اُردو ہندی میں) قیمت : ۲۵ روپے
(علاوہ محصول)
بانو کشیدہ کاری
(اُردو ہندی میں) قیمت : ۲۰ روپے (علاوہ محصول)
سارہ کشیدہ کاری
(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۶ روپے (علاوہ محصول)

پہلا انعام: درست حل پر (۲۲ کیرٹ زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام، ایک غلطی والے حل پر: آٹھ ہزار روپے

20,000.00

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ، ہفتہ ۲۶۔ ستمبر ۱۹۸۷، آٹھ بجے رات تک۔ پیر ۲۸۔ ستمبر ۱۹۸۷ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱

ب (۱)	(۲)	ا (۳)	ج (۴)	س (۵)	■	■
ر		پ	س	ا	■	■
ا	ٹ	ل	ے	■	تھ (۶)	ا
ب	و	ی	■	(۷)	س	
ر	ن	■	خ (۸)	ط	و	ط
ی	■	ب (۹)	ی	م	ا	ر
■	ا (۱۰)	ع	ت	('	ا	د

اشارے:

اوپر سے نیچے:

۱۔ عالمی سیاست میں ۔۔۔۔ کے اصول نہیں چلتے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس

۲۔ لیکن ۔۔۔۔ کی جا و بیجا حمایت کرنے سے وہ بگڑ بھی سکتے ہیں۔ ہمیشہ

۳۔ صاحبزادے، ۔۔۔۔ دولت گنوا کر کاروبار کا تجربہ حاصل کرنا حماقت ہے

۴۔ ایک فوجی سپاہی کو دیکھو، ۔۔۔۔ سوچنے اور سمجھنے کی بجائے حکم کی فوری تعمیل کی تربیت دی جاتی ہے

۵۔ آئینہ دیکھ، اپنا ۔۔۔۔ منہ لے کے رہ گئے

دائیں سے بائیں:

۶۔ صاحب کو دل نہ دینے پہ، کتنا غرور ۔۔۔۔

۷۔ یہ فلم ایکٹریسیں اداکاری سے زیادہ اپنے ۔۔۔۔ اور بے باکی کے سہارے مقبولیت حاصل کرنا چاہتی ہیں

۸۔ سرکاری ۔۔۔۔ کی زبان ذاتی خط و کتابت کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔

۹۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بستی کا ہر شخص اسی طرح ۔۔۔۔ ہو؟ آخر کوئی نہ کوئی تو

۱۰۔ میں خود تمہارے اس ۔۔۔۔ کو غلط نہیں سمجھتا لیکن آج کی دنیا میں ●●

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف

★ ایک روپیہ

★ صرف دس اشارے

انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

شمع منی معمہ نمبر ۱۴۱ کا صحیح حل ۳۰۔ ستمبر کو اشٹمی کی تعطیل کے سبب جمعرات، یکم اکتوبر ۱۹۸۷ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات، شمع (نئی دہلی) میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

پہلا انعام درست حل پر : (۲۲ کیرٹ، زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر: **آٹھ ہزار روپے**

Rs 20,000.00

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر، یا شمع ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعے ادا کی جاسکتی ہے۔ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مِنی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

> دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ، ۳۱ اکتوبر، ۱۹۸۱ آٹھ بجے رات تک
> پیر، ۲۔ نومبر، ۱۹۸۱ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۲

■	■	۱ی	۲ک	۳ط	۴ا	۵ب
■	■	ا	و	و	ہ	ل
۶تھ		■	ن	ک	م	ا
۷		ن	■	ا	ی	و
۸ج	ا	د	ی	■	ت	گ
۹ل	ز	س	ہ	ا	■	ے
۱۰ت	ع	م	ی	ر	ی	■

اشارے :

اوپر سے نیچے :

۱۔ ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
ـــــ رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

۲۔ سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن خون کا رشتہ ـــــ توڑ سکتا ہے؟

۳۔ ہزار بار کہا ہے صبح صبح گھر سے نکلتے وقت نہ ـــــ کرو

۴۔ اپنی "ـــــ" کا مجھے خوب احساس ہے۔ بہرحال آپ کی ذرہ نوازی

۵۔ مجھے اگر پہلے سے علم ہوتا کہ اتنی دور ـــــ تو میں تمہاری دعوت قبول ہی نہ کرتا

دائیں سے بائیں :

۶۔ دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا، ولے طالب تاثیر بھی ـــــ

۷۔ ان کے اشعار میں جو ـــــ ہے وہ اس دور میں شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں مل سکے

۸۔ عبادت اور تجارت میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ یہ نہ سوچو کہ تم عبادت ـــــ کروگے اس کا نفع تمہیں حساب سے ملے گا

۹۔ محاذِ جنگ پر ایک سپاہی کو یہ سوچنے کی کبھی اجازت نہیں کہ جس وطن کے لئے وہ ـــــ ہے وہاں اس کے اپنے بیوی بچوں کی جان مال اور عزت محفوظ ہے یا نہیں؟

۱۰۔ یہ لوگ ـــــ فنڈ کیلئے چندہ جمع کرتے ہیں مگر اسکا بیشتر حصہ انہی کی جیبوں میں رہجاتا ہے

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر، یا نقدناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف

★ ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے
انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کئے جاسکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھئے۔

★ شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۲ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۲) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۲ کا صحیح حل بدھ : ۴۔ نومبر ۱۹۸۱ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع (نئی دہلی) میں بھی شائع کی جاسکتی ہیں۔

BANO New Delhi 40th Year of Publication ISSUE NO 486 Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 741/57 Regd No D-(C) 120

عنوان کے :
سنگھ کی کہانی
خوف کو پہچانیے :
کی کوئی ضرورت نہیں
بچے کی
اُبھاریئے
RS SR 4/-

جب اُلجھی تری لٹ
مجھے ٹریٹ کی یاد آئی
جدید تکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی بوٹیوں کے استعمال میں ہے۔
ٹریٹ آملہ شکاکائی ہیر آئل اور ٹریٹ ہربل ہیر سوپ، آملہ، شکاکائی، مہندی اور
دیگر جڑی بوٹیوں سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور
کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں سے مشہور رہیں۔
جی وی انٹرنیشنل پوسٹ بکس ۷۱۸۶، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ربیع الاوّل حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا مہینہ ہے۔ ۱۲ ربیع الاوّل کو صبح صادق کے وقت حضورؐ کی دُنیا میں تشریف آوری ہوئی۔ آپ رحمت اللعالمین ہیں، یعنی تمام عالموں کے لئے رحمت۔ حضورؐ ہمارے لئے رحمت بن کر آئے۔ حضورؐ کے وسیلے سے ہی اللہ کی وحدت کا پیغام عام ہوا، اس کی شان وعظمت کا نشان بلند ہوا، جنّت ودوزخ کی حقیقت معلوم ہوئی، زندگی گزارنے کا اللہ کا پسندیدہ طریقہ انسان پر کھُلا۔ غرض حضورؐ کے وسیلے سے ہی ہم کو اچھّے اور بُرے کی تمیز ہوئی۔ ہمیں حضورؐ نے صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کا سلیقہ سِکھایا۔ حضورؐ نے ایثار ومحبّت، عاجزی وانکسار، وسیع الاخلاقی، تواضع خدمتِ خلق اور دوسروں کا دِل خوش کرنے کو بہترین عبادت قرار دیا۔ حسد وکینہ، بغض وعداوت، غرور وتکبّر، اپنے آپ کو شمار میں لانا اور دوسروں کا دِل دُکھانے کو بدترین گناہ کا درجہ دیا۔

حضورؐ نے اپنے مثالی کردار وعمل سے ہم کو بتایا کہ صحیح معنوں میں اسلام ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ حضورؐ کے کردار وعمل کو اپنا کر ہی حضور کو راضی اور خوش کر سکتے ہیں، کیوں کہ اللہ کے اِرشاد کے مطابق حضورؐ کی خوشنودی اللہ کی خوشنودی اور حضورؐ کی رضا اللہ کی رضا ہے۔

آیئے، آج ہم اس مبارک مہینے میں اپنے اخلاق وکردار اور اعمال کا جائزہ لیں اور اپنی عادتوں کا، اپنے کردار وعمل کا کڑا محاسبہ کریں، تاکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی توجّہ اور قرب حاصل ہو، جو دونوں جہاں کی کامیابی کی کنجی ہے۔

سعدیہ دہلوی

نومبر ۱۹۸۷

اشاعت کا چالیسواں سال، ۴۸۸ واں شمارہ

بہ یادگار : **یوسف دہلوی مرحوم**
مدیرہ اعزازی : زینت کوثر دہلوی
مدیرہ : سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر : شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

عام شمارے کی قیمت : چار روپے
سال بھر کی قیمت : ۵۳ روپے (اس میں سالنامہ کا رجسٹری خرچ شامل ہے)

مقام اشاعت وصدر دفاتر : آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ : شمع نئی دہلی NEW DELHI
ٹیلکس : (031) 61601 SHMA IN
ٹیلی فون : 732668 732667 732666
دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان : شمع میگزین
طابع وناشر : محمد یونس دہلوی

مطبوعہ : شمع پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲

سعدیہ صاحبہ:

سالنامے کے بارے میں بہت پہلے لکھنا چاہتا تھا مگر مصروفیت آڑے آئی اب لکھے بغیر رہا نہیں جا رہا ہے۔ واہ کیا شاندار نمبر نکالا ہے آپ نے سچ تو یہ ہے کہ 'بانو' جو پہلے خوب تھا، اب خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ اور یہ سب آپ کی جدت طراز صلاحیتوں کا ثمر ہے۔ سالنامے میں مضامین اور کہانیوں کا معیار اتنا بلند ہے کہ یہ خواتین کے کسی رسالے کے بجائے کسی ادبی پرچے کا خصوصی نمبر محسوس ہوتا ہے مجھے تقریباً سب ہی افسانے بہت پسند آئے۔

صلاح الدین پرویز کی نعت منفرد ہے رام پال کا مضمون اگر کہیں مل جائے تو بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ ان سے کہیئے کہ 'بانو' کے لئے ذرا جلدی جلدی لکھا کریں۔ سال نامے میں ان کا مضمون "بیماریاں" بہت اچھا ہے۔

ش۔ صغیر ادیب بلیک برن
(یو کے)

■ تعریف کا شکریہ۔ جب آپ جیسے ادیب تعریف کرتے ہیں تو واقعی حوصلہ بہت بڑھتا ہے۔ امید ہے آپ بھی بانو کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔

(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

'بانو' برابر نگاہ سے گزرتا رہتا ہے اور ہمارے گھر کی خواتین کا تو محبوب ترین رسالہ ہے۔ اس اردو کش اور اردو بیزار فضا میں جہاں چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے آپ چند لوگوں کے دم سے ہی روشنی کی لکیر باقی ہے۔ گو 'بانو' اپنے نام کی رعایت سے تھوڑا متعصب ضرور ہے لیکن، پھر بھی ادھر کچھ عرصہ سے اس کی طباعت اور گیٹ اپ وغیرہ کے علاوہ نگارشات میں بھی خاصا توازن نظر آتا ہے۔ اسے ایک معیاری پرچہ بنانے کے لئے آپ کی کوششیں یقیناً داد کی مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے خلوص اور حوصلوں کو اور فروغ دے

ضیاء الرحمٰن اعظمی، اعظم گڑھ

■ آمین

(مدیرہ)

سعدیہ بہن:

ستمبر کا بانو ملا۔ ہر ماہ کی طرح اس ماہ کا اداریہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ بانو میری جان ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ جس روز میرے شوہر مجھے حد سے زیادہ خوش دیکھتے ہیں، پوچھتے ہیں: کیا آج نیا بانو آگیا ہے؟

"ہیلتھ کلب" اس بار خاص طور سے میرے لئے بے حد مفید رہا۔ کیونکہ گزشتہ دو ماہ سے میرے سیدھے پاؤں کی ہڈی میں درد کی وجہ سے علاج جاری ہے۔ آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں کہ آپ اس قدر مفید معلوماتی مضامین شائع کرتی ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ آپ کی باوقار، ناقابل فراموش قیادت کے باعث بانو اب زیادہ معیاری ہوتا جا رہا ہے۔

رحیم النساء بخشی، بلگام (کرناٹک)

■ آپ کے شوہر کی سوجھ بوجھ اور قیافہ شناسی کی داد دینا پڑے گی۔

(مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

اکتوبر کا بانو اپنی تمام رعنائیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ افتتاحیہ کے بعد آپ کے سوویت یونین کے سفرنامہ کو پڑھ کر ہمیں ایسا لگا کہ ہم بھی شریکِ سفر ہیں۔ 'فیسٹیول آف انڈیا' کے افتتاحی تقریب کی راست کارروائی ٹی۔ وی کے اسکرین پر ہم دیکھ چکے تھے، لیکن وہاں کے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات ہمیں آپ کے سفرنامہ سے ملیں اس کی دوسری قسط کا ہمیں بے چینی سے انتظار رہے گا۔ ریڈیو ماسکو کی اردو سروس اور روسی ٹیلی ویژن کے بارے میں بھی کچھ تحریر کریں تو ہماری دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ایک بات اور آپ سے عرض کرنی ہے غزلوں کے لئے ایک علیحدہ صفحہ کی گنجائش فراہم کریں۔ جن میں ممتاز اور ابھرتی ہوئی شاعرات کی تخلیقات کو شائع کریں۔

اس شمارے میں 'بغیر عنوان' کہانی کے علاوہ "کڑوی دھوپ" کے بعد "رقصِ تاریک کا ماتم" بے حد پسند آئے۔ خود سر لڑکیوں کے لئے شہناز عرفان کی کہانی ایک سبق کا درجہ رکھتی ہے۔

متین صدیقی حیدرآباد

■ اب روس کے سفرنامے کا دوسرا حصہ پڑھ کر لکھیں کہ آپ کو کیسا لگا

(مدیرہ)

سعدیہ صاحبہ :
بشریٰ رحمٰن کے قسط وار ناول "لگن"
میں آفاق کا کردار اب برداشت سے باہر
ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفاق انسان
تو کیا، پیغمبروں سے بھی بلند کردار کے مالک
ہیں، اسی لئے سُنّت کو بھی بھول گئے۔ بشریٰ
صاحبہ سے عرض کر دیجئے گا کہ اس قسم کے لغو
ناول صرف پاکستان میں چل سکتے ہیں۔
سائرہ احمد، علی گڑھ

■ قاصد کا منصب ہم نے ادا کر دیا اب
بشریٰ رحمٰن آپ کا پیغام خود ہی پڑھ لیں گی
(مدیرہ)

محترمہ :
بانو اُردو میں خواتین کے لئے بہترین
رسالہ شمار کیا جاتا ہے۔ نئی نسل تو بانو کو اپنا
رہنما تسلیم کرتی ہے۔ "کہنی سُننی" (بانو ستمبر)
میں متین صدیقی نے ہمارے دل کی بات کہہ دی
ہے۔ بانو میں اب "خیال اپنا اپنا" اور "ذہنی ورزش"
ضرور دوبارہ شروع کرنا چاہئے۔ بانو جیسے معیاری
رسالے میں انگریزی، ہندی رسالوں کے مقابلے
میں ایسے کالم کم ہیں جن میں پڑھنے والے حصہ لیں۔
مثلاً "آپ کے مسائل" "آپ بیتی" خواتین پر
کارٹون وغیرہ۔
فاروق جی۔ شیخ، بمبئی۔ ۹۰

■ قارئین کی فرمائش پر "ذہنی ورزش" کا
سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا گیا ہے۔
آپ نے جن دوسرے کالموں کے
لئے لکھا ہے ان پر غور کریں گے۔
(مدیرہ)

محترمہ مدیرہ صاحبہ:
بانو آپ کی کاوشوں کا منہ بولتا
ثبوت اور کوزے میں دریا بند کرنے کی روشن
مثال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بانو کی موجودگی ہی
دراصل ہندوستان میں اُردو کی زندگی کی
علامت ہے۔ جب تک آپ جیسی ہستیاں موجود
ہیں ہندوستان میں کوئی اُردو کو نقصان نہیں
پہنچا سکتا۔ میری تمام تر عقیدتیں۔ آپ کی اعلیٰ
خدمات کے خراج کے طور پر حاضر ہیں۔ خدا بزرگ و
برتر آپ کو رہتی دنیا تک سلامت اور "بانو"
کو قائم و دائم رکھے۔
محمد عبدالسلام گوہر، حیدرآباد

■ ذرہ نوازی کا شکریہ (مدیرہ)

باجی صاحبہ،
ہر ماہ کی طرح نئی آب و تاب کے ساتھ
میرا من پسند ماہ نامہ بانو پڑھنے کو ملا۔
ماشاء اللہ خوب ہے۔ سب ہی مضامین اچھے
لگے۔ خاص طور سے آپ کا سفرنامہ بہت
پسند آیا۔ بانو کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ بانو
جیسے ہی گھر میں آتا ہے ہمارے یہاں ایک
جنگ سی چھڑ جاتی ہے۔ ہر شخص بانو پہلے
پڑھنا چاہتا ہے۔ ساری تحریریں اتنی اچھی
ہوتی ہیں کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ دعا ہے کہ
خدا اسے اور ترقی دے۔
مجھے پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا جنون کی
حد تک شوق ہے۔ اگر کچھ ارسال کروں تو کیا
شائع ہوگا؟ یہ بھی بتائیے کہ کیا سرورق کے
لئے فوٹو بھیج سکتا ہوں؟
مظفر خاں، دہلی ۶

■ آپ ہمیں اپنی تحریریں ڈاک سے بھیج دیں
اشاعت کا فیصلہ انہیں دیکھنے کے
بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ فیصلے کی اطلاع
آپ کو ڈاک سے مل جائے گی۔
سرورق پر ہم صرف ٹرانس پیرنسی
چھاپتے ہیں جو ہم پروفیشنل فوٹوگرافر
سے خریدتے ہیں۔ (مدیرہ)

مدیرہ صاحبہ :
اکتوبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ تمام شمارے
بہت پسند آتے ہیں۔ مستقل کالم (میرا
پسندیدہ شعر، تبسم، بزم بانو، بیوٹی کالج،
سلیقہ کلب وغیرہ) کافی دلچسپ اور معلوماتی
ہیں۔ اس بار "بغیر عنوان کے" کہانی (سعید سہروردی
کے قلم سے) بہت پُر اثر لگی۔ مصنف تک
مبارک باد پہنچا دیجئے۔
ناز ضیاء الدین احمد بنڈکوٹک

■ یقیناً سعید سہروردی صاحب آپ کے
تاثرات پڑھ کر بہت خوش ہوں گے
کہانی واقعی بہت اچھی ہے (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ :
بانو ہر ماہ مطالعہ میں آتا ہے اس کے
ذریعہ آپ اُردو زبان و ادب کی جو بیش بہا
خدمت انجام دے رہی ہیں، اس کے لئے
مبارک باد کی مستحق ہیں۔
آپ کے افتتاحیے مجھے بہت پسند ہیں
زیادہ سے زیادہ بات کو کم سے کم الفاظ
میں سمونے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔
اندازِ تحریر انتہائی دلنشیں اور موثر ہوتا ہے
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ یہ افتتاحیے اگر
کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو ان کی افادیت
کئی گنا بڑھ جائے گی۔
ذاکرہ انجم آرا انجم، علی گڑھ

■ تعریف کا شکریہ۔ انشاء اللہ وقت
آنے پر افتتاحیہ کو ضرور کتابی شکل
دیں گے۔ (مدیرہ)

محترمہ سعدیہ صاحبہ :
بانو اکتوبر ملا۔ شروعات حسب عادت
آپ کے پُر اثر افتتاحیے سے کی۔ اللہ تعالیٰ
سے دعا ہے کہ زورِ قلم اور زیادہ دے۔ اس
شمارے میں کیا ہر کالم کو مکمل کرنا ضروری ہے
اور "کڑوی دھوپ کے بعد" بے حد پسند
آئے۔ مستقل کالم جیسے سلیقہ کلب،
بیوٹی کالج، دلچسپ بدیس کی خبریں معلوماتی
ہیں اور کار آمد بھی۔
سید حسین، دیورکنڈہ

■ ہمیں خوشی ہوتی ہے جب آپ
ایسے باشعور پڑھنے والے اپنی
رائے سے ہمیں نوازتے ہیں
(مدیرہ)

اعلیٰ خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ برسرِ روزگار، امورِ خانہ داری میں ماہر نیک اور دین دار لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔

BOX NO. 139
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

سُنّی مسلم ڈاکٹر (ایم۔ایس) عمر ۳۲ سال، قد ۵ فٹ ۳ انچ کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی شریف خاندان کی، ایم۔بی۔بی۔ایس یا ایم۔ایس ہو۔ خط کے ساتھ پوری تفصیل اور فوٹو روانہ کریں

BOX NO. 140
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

مسلم سُنّی، صوم صلوٰۃ کی پابند، دنیا میں تنہا، پرائیویٹ ادارے میں ملازم۔ ایسا رشتہ درکار ہے جس کے ساتھ رہائش کی سہولت میسّر ہو۔

BOX NO. 141
BANO URDU MONTHLY
ASAF ALI ROAD
NEW DELHI - 110002

پیغام

موزوں ترین رشتے کی تلاش میں مدد کرنے کے لئے "بانو" کی پیش کش

آج کے دور میں مناسب رشتے کی تلاش ایک دشوار اور صبر آزما مرحلہ بنا ہوا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بیٹے، بیٹی، بھائی یا بہن کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے تو "بانو" کے ذریعے ہزاروں گھروں تک پیغام پہنچایئے اور بہترین رشتے کا انتخاب کیجئے۔

آپ کے پیغام کی اشاعت کی اُجرت دو روپے فی لفظ کے حساب سے لی جائے گی۔ کم از کم اُجرت پچاس روپے ہوگی، خواہ پیغام ۲۵ الفاظ سے کم ہی پر کیوں نہ مشتمل ہو۔

رازداری اور سہولت کے خیال سے باکس نمبر کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی۔ باکس نمبر کی معرفت وصول ہونے والے جوابات ہم پیغام شائع کرانے والوں کو رجسٹرڈ پیکٹ کے ذریعے بھیج دیں گے۔ اس خدمت کے لئے برائے نام معاوضہ دس روپے لیا جائے گا۔ اُجرت کا حساب لگاتے وقت باکس نمبر کے ساتھ "بانو" کے پتے کے الفاظ بھی پیغام میں شمار کئے جائیں گے۔

پیغام کے ساتھ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعے پوری اُجرت ضرور ارسال کیجئے۔ اُجرت وصول نہ ہونے کی صورت میں پیغام کی اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی۔

اُجرت کے ساتھ پیغام اس پتہ پر بھیجئے: "پیغام" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بغیر عنوان کے

تحریر: خوشونت سنگھ
ترجمہ: سعدیہ دہلوی

بہار کا موسم، جھٹ پٹے کا وقت۔ شہر کی فضا پُرسکون تھی۔ گر دوکانیں بند تھیں اور گھروں کے اندر تالے پڑے تھے۔ سنسان سڑکوں پر دھیمی روشنی تھی۔ چند پولیس والے سر پر ہیلمٹ رکھے اور کمر پر بندوقیں لٹکائے اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ ان کے جوتوں کی آوازیں شہر کے سناٹوں کو چیر رہی تھیں۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ نئے چاند کی باریک قوس کی مدھم روشنی سڑکوں پر پھیل گئی۔ ہلکی ہوا سے اخبار کے ٹکڑے پٹری سے سڑک پر اور سڑک سے پٹری پر اُڑ رہے تھے۔ بہار کی خوش گوار تازگی اور مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔ چند وحشت زدہ کتے اندھیری گلی سے نکل کر کھمبے کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ کچھ پولیس والے مسکراتے ہوئے اِدھر سے گزرے۔ ان میں سے ایک نے ایک بے ہودہ بات زبان سے نکالی۔ دوسرے نے پٹری سے پتھر اُٹھایا اور یہ ظاہر کیا جیسے وہ کتوں پر مارنا چاہتا ہے۔ کتے فوراً سڑک پر مخالف سمت میں بھاگنے لگے۔ پھر وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ کر آپس میں دھینگا مشتی کرنے لگے۔ ان میں سڑک کی آوارہ کتیا رانی بھی تھی۔ اس کی نسل شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

شہر کے دوسرے آوارہ کتوں کی طرح رانی بھی پتلی دُبلی تھی اور اس کی ہڈیاں بھی اُبھری ہوئی تھیں۔ اُس کے سفید بال جگہ جگہ سے اڑے ہوئے تھے اور وہاں سے گوشت دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے سوکھے تھن پسلیوں سے لٹکتے نظر آتے تھے۔ جب وہ ڈری اور سہمی ہوئی اِدھر سے اُدھر بھاگتی تو اُس کی دُم پچھلی دو ٹانگوں کے درمیان دبکی رہتی تھی۔

رانی نے جب اپنے پہلے آٹھ پلّوں کو جنم دیا تھا تو شاید اُس وقت وہ بھوک سے مر گئی ہوتی لیکن ہندو دکان دار رام جوایا کو اس پر ترس آگیا۔ رام جوایا کی فیاضی اور فراخ دلی رانی کے لیے جینے کا سہارا بن گئی۔ رام جوایا کے آنگن میں ہی رانی نے اپنے پہلے آٹھ پلّوں کو جنم رام جوایا کے گھر والے اسے کھانا دیتے تھے اور بدلے میں پلّوں سے کھیل لیتے تھے۔ پھر پلّے بڑے ہو گئے۔ سڑکوں پر بھاگنے دوڑنے لگے اور اپنے لیے خود خوراک چرانے لگے۔ مگر رام جوایا کی ایک بار کی مہربانی نے رانی کو مفت خور بنا دیا۔ ہر سال بہار کے موسم میں وہ مسلمان سبزی والے رمضان کی دکان کے گرد منڈلانے لگتی۔ ان لکڑی کے تختوں کے نیچے جن پر سبزیاں بچی رہتی تھیں ہوتا تازہ، طاقت ور اور تن درست کتا موتی رہتا تھا۔ جب خزاں کا موسم شروع ہوتا تو رانی ایک بار پھر رام جوایا کو آدھے درجن یا زیادہ پلّے پیش کر دیتی جو موتی کی اولاد ہوتے۔

موتی نیوفاؤنڈلینڈ اور اسپینیل کی مخلوط نسل سے تھا۔ اُس کے بال دار جسم اور سنجیدہ تیوروں پر رمضان کو فخر تھا۔ رمضان نے موتی کی دُم اور کانوں کے بال تراش دیئے تھے۔ اس نے موتی کو اتنا کھلایا پلایا تھا کہ موتی بہت قد آور اور طاقت ور بن گیا تھا۔

نتیجہ

بغیر عنوان کے

بانو، اکتوبر ۱۹۸۷ کے شمارے میں سعید سہروردی صاحب کا افسانہ بغیر عنوان کے شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان ہماری بہنوں بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔

تمام عنوانات غور سے پڑھنے کے بعد نجم السحر عثمانیہ کالج (کرنول) کے بھیجے ہوئے عنوان "گھروندے کچی مٹی کے" کو پہلا انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں پچاس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

رفعت جہاں (بھوپال) کے عنوان "کچے گھڑے کا نقش" کو دوسرے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ انہیں تیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جا رہی ہیں۔

محمد عثمان (مہاراشٹر) کے بھیجے ہوئے عنوان "راکھ کی چنگاری" کو تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ انہیں بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جا رہی ہیں۔

پسند آنے والے کچھ عنوانات یہ ہیں۔
"ارمان جذبے" نکہت بانو (جہلم)
"قرب کی آنچ" خوالہ صدیقی (لکھنو) "سلگتی کونپل" (جالندھر)۔

خود مصنف نے اپنی کہانی کا عنوان "ایک رشتے کی" رکھا تھا۔

شہر کے کتوں کی آبادی بڑھانے میں وہ سارے کتوں کا سردار بن گیا تھا۔ رانی کے اور بھی بہت سے چاہنے والے تھے، مگر جب بہار کا موسم آتا تو رانی کو موتی کا ہی خیال آتا اور وہ گشت کرتے ہوئے رمضان کی دکان تک پہنچ جاتی تھی۔

اس سال بھی بہار آئی لیکن شہر کی زندگی فرقہ وارانہ فسادات اور کرفیو کے نفاذ کی وجہ سے مفلوج تھی۔ دن میں لوگ سڑکوں کے نکڑ پر دس بیس کی تعداد میں جمع ہو کر باتیں کرتے تھے اور چوکنا ہو کر ادھر اُدھر بھی دیکھتے رہتے تھے۔ دکانیں بند تھیں اور کرفیو کے وقت سے پہلے سڑکیں سنسان ہو جاتی تھیں۔ اُس کے بعد سڑکوں پر صرف آوارہ کتے اور پولس والے نظر آتے تھے۔

اس رات رانی کو موتی کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ جب سے کرفیو لگا تھا رمضان نے موتی کو گھر کے اندر باندھ رکھا تھا۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرنے سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ گھر کی حفاظت کرے۔ رانی رمضان کی دکان پر آکر سونگھتی ہوئی منڈلاتی رہتی۔ لیکن موتی کئی دن سے وہاں نہیں آیا تھا۔ رانی مایوس ہو گئی۔ بہار کا موسم تو سال میں ایک بار ہی آتا ہے اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ سارا شہر خالی خالی نظر آتا ہو اور دلچسپی سے کتوں کو دیکھنے، انہیں چھیڑنے، ستانے والے بچے بھی سڑکوں پر دکھائی نہ دیں اور ان کے پریشان ماں، باپ کتوں کے بھونکنے پر پتھر نہ پھینکیں۔ مگر اب کی بار تو بہار کا موسم رائیگاں جا رہا تھا۔ رانی نے موتی کا خیال چھوڑ دیا اور اس سڑک پر چلنے لگی جو رام جوایا کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اس کے چاہنے والے کتے فوراً اس کے پیچھے لگ گئے۔

رام جوایا کے گھر کی دہلیز پر پہنچ کر رانی کو احساس ہوا کہ وہ اپنے بہت سے چاہنے والوں کے غول میں گھری ہے۔ وہ سب غرا رہے تھے، ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے، لڑ رہے تھے۔ رانی الگ کھڑی فیصلے کا انتظار کر رہی تھی، تھوڑی دیر بعد ایک لمبا کتا جو رانی کی نسل سے تھا فاتحانہ شان سے رانی کے پاس آکھڑا ہوا۔ اس نے یہ مقابلہ جیت لیا تھا باقی سب کتے خاموشی سے سرک گئے۔

رمضان کے گھر میں چارپائی کے نیچے موتی متفکر اور پریشان اپنے مالک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دن سے بہار کی ہوا نے اس کو بے قرار کر رکھا تھا۔ اُس نے سڑک پر کتوں کے غرانے کی آواز سنی۔ ہوا میں اُسے رانی کے قرب کی مہک محسوس ہوئی۔ لیکن رمضان نے اس کو جانے نہیں دیا۔ اُس نے رسی توڑنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس کام یاب نہیں ہوا تو دردناک آواز میں فریاد کرنے لگا۔ رمضان نے اپنے تگڑے ہاتھ سے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ذرا دیر تو وہ خاموش رہا، پھر اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے اور شور کرنے کی وجہ سے رمضان پچھلی کئی راتوں سے ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا تھا۔ نیند سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ بہت جلد وہ خراٹے لینے لگا۔ موتی نے اور بھی اونچی آواز میں فریاد کی۔ وہ اپنی بے وفا محبوبہ تک اپنی دُکھ بھری آواز پہنچانا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ رسی کھینچنے اور اپنی گردن کو پھندے سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ رمضان کی نیند میں خلل پڑا تو وہ غصہ میں اپنی چارپائی سے اٹھا اور موتی کو مارنے کے لیے دوڑا۔ موتی دروازے کی طرف بھاگا اور اس کے پیچھے بانس اور بان سے بنی ہوئی ہلکی

اس کہانی کا عنوان آپ کو تجویز کرنا ہے جس پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ پانچ موزوں عنوانات سوچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجیے۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۸ تک ملنے والے تمام عنوانات میں سب سے اچھے عنوان پر پچاس روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر تیس روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوان پر بیس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ پوسٹ کارڈ پر اپنا پورا نام، پتہ ضرور لکھیں۔ تمام عنوانات اس پتے پر بھیجیں۔

بغیر عنوان کے' ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی [illegible]

چارپائی بھی گھسٹتی چلی گئی۔ موتی نے اپنے پنجوں سے دروازہ کھول لیا اور باہر نکل گیا مگر چارپائی دروازے میں پھنس گئی اور موتی کی گردن پر رسّی کسنے لگی۔ اُس نے وحشت ناک انداز سے زور سے جھٹکا دیا تو رسّی ٹوٹ گئی۔ وہ چھلانگ لگا کر سڑک پار کر گیا۔ رمضان اپنے کمرے میں گیا اور اپنی قمیص میں ایک چھری چھپا کر موتی کے پیچھے پیچھے دوڑا۔

رام جوایا کے گھر کے باہر رانی اور کالا آوارہ کتا ملن کے نشے سے سرشار تھے، اچانک طاقت ور موتی وہاں آدھمکا اور غرّاتے ہوئے رانی کے عاشق کی طرف جھپٹ پڑا۔ چند لمحوں میں اِس ہنگامے میں دوسرے کتّے بھی شامل ہو گئے۔ وہ سب غرّا غرّا کر ایک دوسرے پر جھپٹے، نوچنے کھسوٹنے لگے۔

رام جوایا بھی کئی راتوں سے نہیں سو سکا تھا۔ وہ رات کو پہرا دیتا تھا اور مسلمانوں کے جنگ جویانہ جواب میں زوردار نعرے لگاتا تھا۔ لیکن بہادری کا یہ جذبہ زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہ دے سکا اور نیند اور تھکن نے اُس پر قابو پانا شروع کر دیا۔ اُس کی چارپائی کے نیچے پتھروں کا ڈھیر موجود تھا۔ اس کے قریب تیزاب سے بھری سوڈا واٹر کی بوتلیں رکھی تھیں۔ وہ اس رات بے خبر سو گیا۔ لیکن باہر کے بے پناہ شور نے اس کو جگا دیا۔ اُس نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر دروازہ کھولا اور اونچی آواز میں ایک زوردار گالی دیتے ہوئے اُس نے کتّوں پر پتھر پھینکا۔

اچانک گلی کے سرے سے رمضان آنکلا اور پتھر اُس کے لگ گیا۔ پتھر سے رمضان کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی لیکن اچانک وار سے وہ گھبرا گیا۔ اور وہ زور سے چلّایا۔ "مار ڈالا"۔ اگلے ہی پل اُس نے قمیص سے چاقو نکال لیا۔

[illegible] اور سبزی فروش نے ایک دوسرے کو لمحہ بھر گھورا۔ پھر دونوں پلٹتے ہوئے اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔ ان کے شور سے سہمے شہر کی خاموش فضا میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ گردوارے میں زور زور سے ڈھول بجنے لگا۔ چاروں طرف اشتعال انگیز نعرے اور جوابی نعرے بلند ہونے لگے۔ گھروں سے مرد ہڑبڑا کر باہر نکل آئے اور پوچھنے لگے حملہ کس پر ہوا؟ ہندو پر یا مسلمان پر؟ افواہیں اُڑنے لگیں کہ کوئی مارا گیا ہے یا کسی کو اغوا کیا گیا ہے۔ غنڈوں کا ہجوم حملہ کرنے کے لیے نکل آیا۔

لیکن کتّوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ غنڈوں نے انہیں دُور بھگا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے: "انہوں نے ایک عورت پر حملہ کر کے اس کے بچّوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا کرارا جواب دینا چاہیئے۔" تیاری شروع ہو گئی۔ پانچ آدمی دس سے ملے اور دس سے بیس۔ اِس طرح کئی سو لوگ چھریاں، چاقو اور مٹی کے تیل کے ڈبے لے کر رام جوایا کے گھر پہنچ گئے۔ ان پر پتھروں، سوڈے اور تیزاب کی بوتلوں کی بوچھار ہوئی۔ جواب میں بھی اندھا دھند وار ہوئے۔ مٹی کے تیل کے ڈبے بغیر سوچے سمجھے خالی کر دیئے گئے اور آگ لگا دی گئی۔ شعلے اٹھے اور رام جوایا کے گھر، سارے محلے پر پھیل گئے محلّے میں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سب ہی رہتے تھے۔

پولیس موقع واردات پر پہنچتے ہی گولیاں برسانے لگی، فائر بریگیڈ کے انجن گھنٹے بجاتے شور کرتے ہوئے پہنچ گئے اور انہوں نے آسمان پر لپکتے ہوئے شعلوں پر پانی پھینکنا شروع کر دیا لیکن آگ شہر کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل چکی تھی اور ہر جگہ آگ بجھانے کے لئے فائر بریگیڈ کے پاس گاڑیاں نہیں تھیں۔

ساری رات اور سارا دن آگ بھڑکتی رہی مکان گرے اور لوگ ملبے کے نیچے دب کر مر گئے۔ رام جوایا کا گھر جل کر راکھ ہو گیا اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچی۔ کئی دن تک جلتے ہوئے مکانوں سے دھواں اٹھتا رہا۔ ایک بارونق شہر جلے ہوئے مکانوں کا ڈھیر بن گیا۔

کئی مہینے بعد جب امن قائم ہوا تو رام جوایا اپنے پرانے گھر کی جگہ دیکھنے آیا تھا۔ وہاں ابھی تک ملبہ پڑا تھا۔ ایک طرف اینٹوں کا اونچا ڈھیر تھا۔ جہاں پہلے اس کے گھر کا آنگن تھا وہ جگہ نسبتاً صاف تھی۔ وہاں رانی لیٹی ہوئی تھی اور اُس کے پلے سوکھے ہوئے تھنوں کو چوس رہے تھے اور اس کے قریب کھڑا ہوا موتی حال ہی میں پیدا ہونے والے اپنے حرامی پلّوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ ■■

رینا اُجیاری

آم کے پیڑوں پر جب کوئل
گیتوں کی لے بھرتی ہے
اُس دم تیری یاد کا ساون
من کی آگ بجھاتا ہے
رم جھم رم جھم برکھا رُت میں
اونچی اونچی شاخوں پہ کاگا
جب بھی شور مچاتا ہے
تیرے میرے پیار کا سپنا
آنکھوں میں بھر جاتا ہے
پھول کھلے ہیں جنگل جنگل
کھیتوں میں ہریالی ہے
آنگن آنگن دھوپ بھی ہے
کیسی رُت البیلی ہے
ایسے میں گھر آؤ سجنوا
رینا بھی اُجیاری ہے
پلکوں پر اب نیند سہانا
سو راتوں پر بھاری ہے

احمد کلیم فیض پوری

رسول اللہ ؐ کی صاحب زادیاں

حضرت زینب رضؓ

مختار احمد

حضرت زینب رضؓ رسول اللہ ؐ کی سب سے بڑی صاحب زادی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت قاسمؓ پہلے پیدا ہوئے اور اس کے بعد زینبؓ۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت زینب پہلے پیدا ہوئیں۔ بہرحال سب صاحب زادیوں میں حضرت زینب رضؓ سب سے بڑی ہیں۔ ان کے بچپن کے حالات تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ لیکن ان کی شادی کے بعد کے سوانح کتابوں میں ملتے ہیں۔

حضرت زینب رضؓ کی شادی بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ ان کے شوہر ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کا نام ابوالعاص تھا۔ حضرت خدیجہ رضؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں۔ ابوالعاص ان ہی کے بیٹے تھے۔ حضرت زینب رضؓ کے جہیز میں دیگر سامان کے علاوہ ایک عقیق کا ہار بھی تھا۔ یہ ہار حضرت خدیجہ رضؓ نے دیا تھا۔ جب حضرت خدیجہ رضؓ اسلام لے آئیں تو زینبؓ بھی اسلام سے مشرف ہو گئیں لیکن ان کے خاوند ابوالعاص اسلام نہیں لائے۔ رسول اللہ ؐ پر بعثت کے ابتدائی سال بہت کٹھن گزرے۔ مشرکین مکہ ان کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے۔ ان پر طعن و تشنیع کرتے۔ صحابہ کو کھلے بندوں عبادت کی اجازت نہیں تھی۔ اس مصیبت کے دور میں یہ ممکن نہ تھا کہ زینبؓ اور ابوالعاص میں تفریق کرا دی جاتی۔ مشرکین مکہ نے رسول اللہ ؐ کی مخالفت کے جوش میں ابوالعاص کو مجبور کیا کہ وہ زینبؓ کو چھوڑ دیں۔ لیکن ابوالعاص نے اس مصیبت کے دور میں رسول اللہ ؐ کی مشکلات میں اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ کو اپنے داماد کی یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔ وہ اکثر ان کی شرافت اور وضع داری کی تعریف کرتے تھے۔

نبوت کے تیرہویں سال میں رسول اللہ ؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ حضرت زینب رضؓ مکہ میں رہ گئیں۔ اس کے بعد جنگ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ ابوالعاص مکہ کی فوج میں شامل تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ جو قیدی مدینہ لائے گئے، ان میں ابوالعاص بھی شامل تھے۔ رسول اللہ ؐ نے فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا ارادہ کیا تو حضرت زینب رضؓ نے اپنے شوہر کی آزادی کے لئے مکہ سے عقیق یمنی کا وہی ہار حضور ؐ کی خدمت میں بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے ان کو جہیز میں دیا تھا۔ ہار کو دیکھتے ہی رسول اللہ ؐ کے دل میں حضرت خدیجہ رضؓ کی یاد تازہ ہو گئی انہوں نے صحابہ سے کہا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو یہ ہار زینبؓ کو واپس کر دو اور ابوالعاص کو رہا کر دو۔ صحابہ کو انکار کی مجال کہاں تھی وہ فوراً تیار ہو گئے لیکن یہ بات انصاف کے خلاف تھی کہ باقی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے اور ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کر دیا جائے۔ اس لئے ابوالعاص کا فدیہ یہ قرار پایا کہ وہ مکہ پہنچ کر حضرت زینب رضؓ کو مدینہ بھیج دیں۔

جب ابوالعاص قید سے رہا ہو کر مکہ کے لئے رہا ہوتے تو ان کے ساتھ ایک صحابی زید بن حارث رضؓ کو بھی روانہ کیا گیا تا کہ وہ مکہ سے کچھ فاصلے پر حضرت زینب رضؓ کا انتظار کریں اور انہیں اپنے ساتھ لے آئیں۔

ابوالعاص جب مکہ پہنچے تو انہوں نے حضرت زینب رضؓ کو اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینہ بھیجنے کی تیاری شروع کر دی۔ اسی دوران ابوسفیان کی بیوی ہند ان کے گھر آ گئی۔ اس نے حضرت زینب رضؓ سے پوچھا کیا تم مدینہ جا رہی ہو۔ حضرت زینب رضؓ نے جواب دیا کہ ابھی کچھ پتہ نہیں۔ آگے جو خدا کو منظور ہو۔ ہند نے کہا کہ اس بات میں رازداری کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم جا رہی ہو تو جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف کہہ دو۔ میں اسے پورا کر دوں گی۔ ممکن تھا کہ ہند اپنی بات کو نبھاتی، مگر حضرت زینبؓ نے وقت کی مصلحت کو دیکھ کر انکار کر دیا۔

جب سفر کی تیاری مکمل ہو گئی تو حضرت زینبؓ اپنے دیور کنانہ کے ساتھ اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہو گئیں۔ اس وقت مکہ میں مشرکین کا زور تھا۔ اس لئے احتیاط کے طور پر کنانہ نے تیر کمان بھی ساتھ رکھ لئے۔ لیکن جس بات کا اندیشہ تھا وہی ظہور میں آئی۔ مکہ والوں نے ان کا پیچھا کیا اور راستے میں ہی جا لیا۔ ان میں سے دو آدمی آگے بڑھے اور حضرت زینبؓ پر حملہ کیا۔ وہ اونٹ سے زمین پر گر پڑیں۔ وہ حاملہ تھیں۔ ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ چوٹ بھی زیادہ آئی۔ کنانہ نے جب اپنی بھاوج کی یہ حالت دیکھی تو ترکش سے تیر نکال کر کمان میں جوڑ لیا اور کہا "اب کوئی سامنے آیا تو وہ میرے تیر کا نشانہ بنے گا۔"

اقوالِ زریں

گناہ دلوں میں کھٹکنے والا ہے

"بیہقی"

"آدمی متقی نہیں ہوتا جب تک اس چیز کو نہ چھوڑ دے جس میں مضائقہ نہیں اس چیز کے خوف میں مضائقہ ہے" (ترمذی)

○

حسد اچھائیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو چاٹ جاتی ہے۔

(ترمذی) ○

جو شخص تکبر کرتا ہے اللہ اسے پستی دیتا ہے اور جو شخص انکساری اختیار کرتا ہے اللہ اسے بلندی دیتا ہے۔ (ترمذی)

○

جو کچھ سیکھنا چاہو سیکھ لو اللہ تعالیٰ تمہیں اس وقت تک اس کا اجر و ثواب عطا نہ کرے گا جب تک تم عمل نہ کرو گے۔ (بیہقی)

ان لوگوں کو چھوڑ دو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا ہے (بیہقی)

○

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیقین ہیں۔ (مسلم)

مرسلہ: شیخ کاکوروی۔

ابو سفیان، جو قریش کے سرداروں میں تھا سامنے آیا اور کہا، "تیر اندازی نہ کرو۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" کنانہ نے اپنے تیر ترکش میں رکھ لئے اور کہا، "جو کچھ کہنا ہے جلد کہو" ابو سفیان نے کہا "ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ تم حضرت زینبؓ کو مکّہ سے لے جاؤ۔ مگر دن دہاڑے ایسا نہ کرو۔ لوگ اسے ہماری بزدلی اور کمزوری کہیں گے کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے سے انہیں لے گئے اور ہم کچھ نہ کر سکے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہماری بات رکھنے کے لئے تم اب مکّہ واپس چلے جاؤ۔ بعد میں انہیں رازداری کے ساتھ لے جانا۔" کنانہ نے اس بات کو منظور کر لیا اور مکّہ واپس چلے گئے۔

کچھ دن بعد جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا پڑ گیا تو کنانہ رازداری کے ساتھ حضرت زینبؓ کو لے کر چلے اور مقررہ مقام پر انہیں زید بن حارثؓ کے سپرد کر دیا، جو انہیں ہمراہ لے کر مدینہ پہنچ گئے۔

اُدھر حضرت زینبؓ کی جدائی سے ابو العاص کا بُرا حال تھا۔ انہیں زینبؓ سے محبت تھی وہ ان کو یاد کر کے اُداس ہو جاتے۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ سنہ ۶ھ میں ابو العاص ایک قافلے کے ساتھ شام سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک ایک اسلامی لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی اسلامی لشکر نے قافلے کے مال و ۱۷۰ ... پر قبضہ کر لیا اور قافلے والوں کو قیدی بنا کر مدینے لے گئے ان میں ابو العاص بھی شامل تھے۔

ابو العاص جب گرفتار ہو کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے حضرت زینبؓ سے پناہ طلب کی چنانچہ حضرت زینبؓ نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔

جب رسول اللہ نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر تشریف لائے تو حضرت زینبؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ ابو العاص کا مال و متاع واپس کر دیا جائے۔ رسول اللہؐ نے یہ سُن کر لوگوں سے کہا کہ تم میرے اور ابو العاص کے رشتے سے واقف ہو۔ اگر تم اس کا مال و متاع واپس کر دو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ سب نے کہا کہ ہمیں منظور ہے اور تمام چیزیں واپس کر دیں۔

ابو العاص اپنے مال و اسباب کو لے کر مکّہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر سب کا حساب صاف کیا اور لوگوں سے پوچھا: "اب میرے ذمّہ کسی کا مطالبہ تو باقی نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا: "نہیں۔ اب کوئی مطالبہ نہیں ہے۔" ابو العاص نے کہا: "اب میں کلمہ پڑھتا ہوں مجھے صرف تمہارے حساب کا خیال تھا اب سب کا حساب بے باق ہو گیا تو میں اسلام قبول کرتا ہوں۔"

ابو العاص سنہ ۷ھ کے پہلے مہینے میں مکّہ سے مدینہ روانہ ہو گئے۔

جب وہ مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ پہنچے تو رسول اللہؐ نے تجدیدِ نکاح کے بغیر ان کو حضرت زینبؓ کی طرف رجوع کر دیا۔ چوں کہ اس وقت تک سورۃ برأت نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے مسلمان عورتیں شوہروں کے اسلام لانے کے بعد بلا تجدیدِ نکاح ان کی زوجیت میں آجاتی تھیں۔

حضرت ابو العاصؓ سے حضرت زینبؓ کے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک فرزند علی اور ایک بیٹی امامہ۔ فرزند ہجرت سے پہلے پیدا ہوئے۔ رسول اللہؐ نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا تھا۔ فتح مکّہ کے روز وہ رسول اللہؐ کے ساتھ آپ کے اونٹ پر سوار تھے۔ ان کا انتقال سنِ بلوغ میں ہی ہو گیا۔ لیکن امامہ زندہ رہیں۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کا عقدِ ثانی حضرت امامہ سے ہوا حضرت امامہ عرصہ تک حیات رہیں۔

حضرت زینبؓ حضرت ابو العاصؓ کے مدینہ پہنچنے کے سال بھر بعد تک حیات رہیں۔ ان کا انتقال رسول اللہؐ کی حیات کے دوران ہی ہو گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۸ھ کا ہے رسول اللہؐ خود قبر میں اُترے اور اپنی نورِ چشم کو سپردِ خاک کیا۔ اس وقت آپؐ کے چہرے پر رنج و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ آپؐ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی: "اے اللہ تو زینبؓ کی قبر کی تنگی کو کشادگی میں بدل دے۔ ان کی مشکلات کو آسان کر دے۔"

حضرت زینبؓ کے انتقال کے تھوڑے دن بعد حضرت ابو العاصؓ کا بھی انتقال ہو گیا۔

●
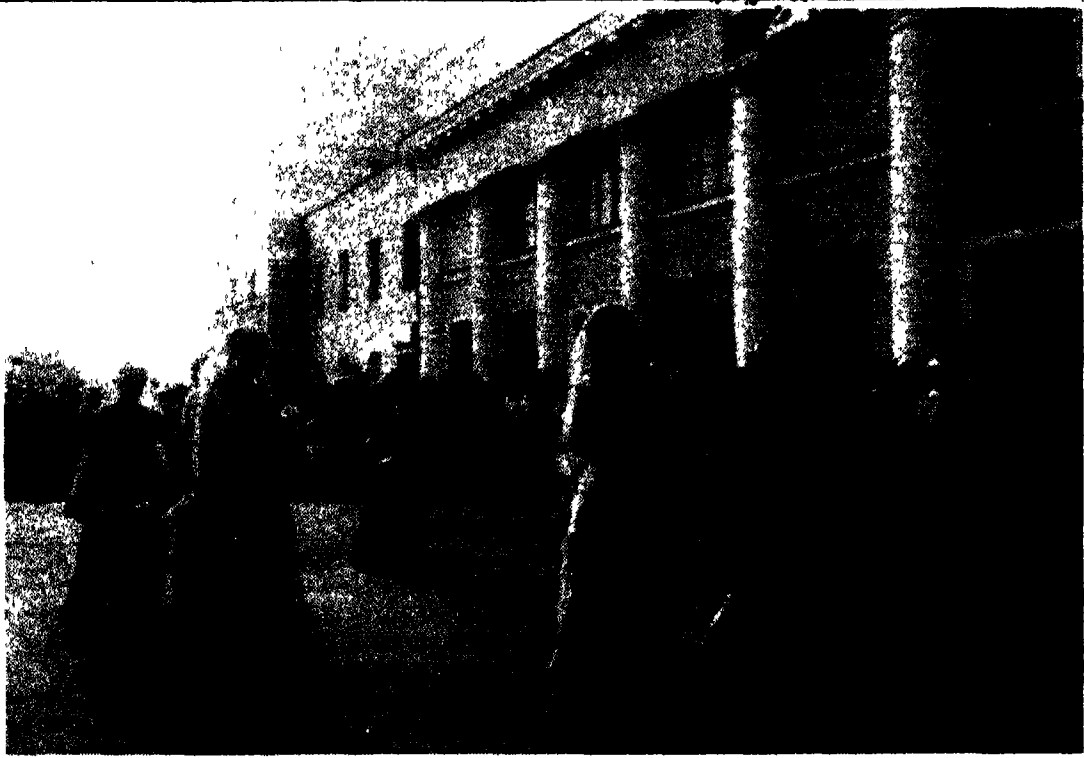
سوویت یونین کی سڑکوں پر رقص کرتی ہوئی ہندوستانی ثقافت۔

سفرنامہ

میرا جوتا ہے جاپانی...

آخری قسط

سعدیہ دہلوی

ماسکو سے ہم دیگر شہروں کے لئے ریل سے روانہ ہوگئے۔ ہمارے گروپ میں راجستھان کی بیس پچیس لڑکیاں تھیں۔ یہ کالج کی لڑکیاں روایتی گھومر، رقص کی ماہر تھیں۔ ایک لڑکوں کا گروپ بھی ساتھ تھا، جو جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی کالج کے نوجوان لڑکے تھے اور برنگا کرڈگم رقص پیش کرتے تھے۔

صبح کو ہم کلوکا شہر پہنچے۔ ہمارے استقبال کے لیے کئی سو روسی، جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے پھول لئے کھڑے تھے روس میں پھول بہت مہنگے ہیں اور ہمارے پاس اتنے پھول اکٹھے ہو جاتے کہ سمجھ میں

نہیں آتا تھا ان کا کیا کریں۔ اس طرح دو ہفتے تک ہمارا مختلف شہروں میں پورے بینڈ باجے کے ساتھ استقبال ہوتا رہا پہلے وہاں کے شہری لیڈر تقریر کرتے، پھر ہم تقریر کرتے۔ روزانہ سوویت یونین اور ہندوستان کی دوستی کے نعرے لگتے۔ اس کے بعد پلیٹ فارم سے ہی ناچ گانا شروع ہو جاتا ڈھول اور بانسری کی تال پر لڑکیاں ناچتیں اور پھر لڑکے بھی تھوڑا سا اپنے رقص کا نمونہ پیش کرتے۔ لڑکوں کا ناچ بہت مقبول

ہوا، کیوں کہ اس میں سرکس کی جھلکیاں تھیں اور روسیوں کو سرکس کا بڑا شوق ہے۔ کالے لڑکے جھلمل کرتی زعفرانی اور جامنی رنگ کی صدری اور پتلون پہنے، سر پر ایک بھاری سا تانبے کا مٹکا رکھے رہتے۔ اس مٹکے کو سر پر سنبھالتے ہوئے وہ ناچتے اور ناچتے ناچتے ہی ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر تکون سا بنا لیتے ہیں۔

لڑکے، لڑکیاں، دونوں سارے دن اپنا یہی لباس پہنے رہتے۔ جب [illegible] جب زیادہ [illegible] ہوتی، [illegible] بعض اوقات تو ان پر ترس آتا کیونکہ اکثر موسم بہت [illegible] ہو جاتا۔ اس طرح

○ سوویت یونین اور ہندوستانی دوستی کا ایک رنگین پہلو۔

موسم کی شدت کی پروا کئے بغیر روس کی سڑکوں پر ہندوستانی ثقافت رقص کرتی، دوستی کا پرچم لہراتی گھومتی پھرتی۔ کلوکا کے بعد ہم بازما گئے۔ پھر اسمولینسک اسکوف، تالین، نووگراد اور استاروسا گئے۔ یہ سب شہر قدیم ہیں۔ ان کی سیر کرنے میں ہمیں بڑا لطف آیا۔ ہر شہر میں ایک کریملین تھا۔ کئی پرانے گرجے بھی دیکھے، جن میں مشہورِ زمانہ روسی پچی کاری اور نقاشی کے نمونے موجود تھے۔ ایک

گرجا گھر میں عبادت ہوتی بھی دیکھی۔ اس 'ماس' میں ہم بھی شریک ہوئے۔ وہاں کا سماں دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی کہ ہمارا خیال تھا کہ سب روسی دہریے ہیں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ البتہ حکومت مذہبی اداروں کو پیسہ نہیں دیتی اور نہ ان کی سرپرستی کرتی ہے۔ عبادت گاہیں چندے سے چلتی ہیں۔ چونکہ سوویت یونین کا سیاسی مسلک کمیونزم ہے، اس لئے کوئی سیاسی لیڈر گرجا یا مسجد

نہیں جاتا۔ ایک نوجوان شہری سے اس سلسلے میں بحث ہوئی تو اس نے بتایا کہ سیاسی لیڈر کو سیاسی جماعت یا مذہب میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے: روس میں مسلمان کافی ہیں اور ہر سال بڑی تعداد میں حج کرنے بھی جاتے ہیں۔ عام طور پر لوگ روس کو اتنی شک کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ ان کو یقین ہے کہ یہ حاجیوں کی ٹیمیں صرف دکھاوے کے لئے ہے۔ کوئی مسلمان ملتا تو ہم اس سے یہ باتیں پوچھتے۔ مگر ایسا اتفاق پیش ہی نہیں آیا۔ ہاں، ایک مسلمان کا بیٹا ضرور ملا تھا جو ہمارا مترجم تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے باپ کا نام حنیف ہے، لیکن وہ مذہب چھوڑ کر سیاسی جماعت میں شامل ہو گیا ہے۔

تاشقند کی طرف سنا ہے کہ کافی مسلمان ہیں۔ وہاں کا تو کھانا پینا بھی ہم لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور سمرقند، بخارا میں تو بڑی بڑی زیارتیں ... علاقہ دیکھنے کو بڑا دل چاہتا ہے۔ دیکھئے، کب یہ مراد بر آتی ہے۔

ہم نے روسی شہروں میں کئی فیکٹریاں بھی دیکھیں، جن میں کراکری اور جوتے کی فیکٹریاں شامل ہیں۔ ان فیکٹریوں میں خاص بات یہ تھی کہ یہاں بڑا ڈسپلن نظر آیا۔ سب خاموشی سے محنت کر رہے تھے۔ دوسری خاص بات یہ کہ ان فیکٹریوں میں صرف عورتیں ہی عورتیں نظر آ رہی تھیں اور وہی ان فیکٹریوں کی سربراہ تھیں۔ ہر فیکٹری میں ایک پیلس آف کلچر (یعنی ثقافت کا محل) تھا۔ یہ ثقافتی ادارہ صرف ایک چاردیواری پر مشتمل ہو یا خوب صورت سے آڈیٹوریم پر، ہر جگہ روسی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ یہاں ہندوستانی لڑکے لڑکیاں ناچتے اور ساتھ ہی روسی لڑکے لڑکیاں بھی اپنا روایتی رقص پیش کرتے۔ ہم جہاں جاتے، روسی ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔ وہ ہمیں تحفوں سے لاد دیتے۔ کتابیں، ڈاک ٹکٹ، پوسٹ کارڈ اور دیگر چھوٹے

○ ریلوے اسٹیشن پر روٹی کے ساتھ روایتی استقبال کی ایک جھلک
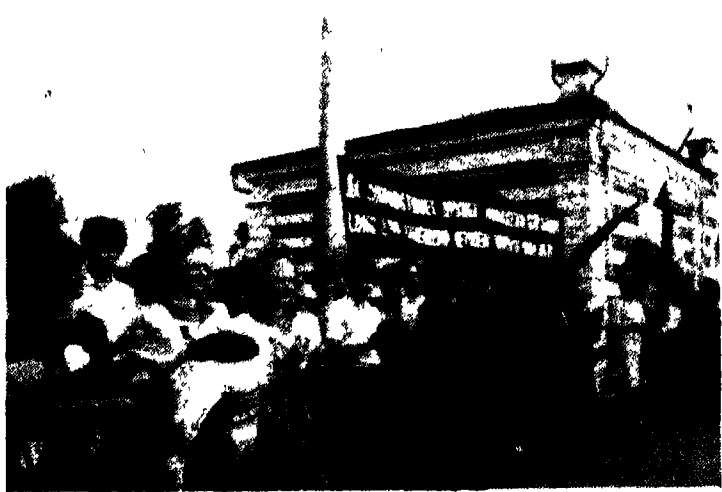
چھوٹے تحفے ریل کے روانہ ہونے تک جالیوں میں سے دیتے رہتے۔ ایک بار ہم عجائب گھر کے باہر کھڑے تھے۔ ایک لڑکی سامنے سے جا کر دو میوزک ریکارڈ خرید کر ہمارے ہاتھوں میں پکڑا کر چلی گئی۔ ایک دفعہ جب ہم روسیوں کے ساتھ ناچ گا رہے تھے تو کسی عورت نے اپنی انگوٹھی اتار کر ہمارے ہاتھ میں پہنا دی۔ ہمیں کسی نے بتایا کہ یہ چاندی کی انگوٹھی جس میں جڑے پتھر پر رنگوں کا نقش بنا ہوا ہے کافی قیمتی ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، یہ انگوٹھی ابھی تک ہمارے ہاتھ سے الگ نہیں ہوئی۔

ہم نے بھی اپنی طرف سے چھوٹے چھوٹے تحفے دئے۔ سب سے مقبول ہندوستانی تحفہ چائے ہے۔ اگر آپ چائے لئے بغیر وہاں پہنچ گئے تو آپ کے میزبان آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ہندوستانی چائے وہاں پر سر آنکھوں سے لگا کر پیتے ہیں۔ روسی چائے میں دودھ نہیں ملاتے اور چائے ہر وقت پیتے ہیں۔ ویسے تو سوویت یونین میں شراب بھی بہت پی جاتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ شرابی اسی ملک میں ہیں۔ یہاں کی مشہور شراب ووڈکا ہے۔ تاہم اب کچھ فضا بدل رہی ہے اور شراب کی دکانیں کم کر دی گئی ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ ریاستی محفلوں میں بھی شراب بند کر دی گئی ہے۔ یہ گورباچیف کا قدم تھا، جو کافی کامیاب ثابت ہوا۔ مجموعی قومی پیداوار شراب پر پابندیوں کے بعد کئی فی صد بڑھ گئی ہے۔

روسی آئس کریم کے بھی بہت شوقین ہوتے ہیں ہمیں بھی انہوں نے آئس کریم کھلا کھلا کر ہمارا وزن بڑھا دیا۔ یوں تو روسی کھانا ٹھنڈا اور بے رونق ہوتا ہے، مگر ہمیں انہوں نے خاص کھانے کھلائے تھے روسی کیویار بھی کھانے کو ملا، جو دنیا کی بہت قیمتی ڈشوں میں سے ایک ہے۔ کیویار دراصل مچھلی کے انڈے ہوتے ہیں اور روسی اسے بے حد پسند کرتے ہیں۔ لیکن روس کا سارا کیویار ان کے سرکس اور بیلے کی طرح ایکسپورٹ ہو جاتا ہے۔ بے چارے روسیوں کو تو نہ کیویار کھانے کو ملتا ہے نہ سرکس یا بیلے دیکھنے کو۔

روسیوں کی خوراک بھی اچھی ہوتی ہے اور وہاں کے عام لوگ عام طور سے موٹے اور تن درست ہوتے ہیں۔ وہاں کی عورتوں کا مٹاپا مشہور ہے جسے روسی مرد پسند کرتے ہیں۔ اب وہاں کے نوجوان میں بھی دیگر ملکوں کی طرح تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ سنا ہے وہاں بھی دبلے پن اور ڈائٹنگ کا زور چل رہا ہے۔ ہم جب ان کے ڈسکوز میں گئے تو وہاں تازہ ترین گانے بج رہے تھے مائیکل جیکسن اور میڈونا بے انتہا مشہور ہیں، حالانکہ انگریزی زبان وہاں نہیں سمجھی جاتی ہمیں امریکن دھنوں پر روس میں ڈانس کر کے بڑا مزہ آیا۔

سوویت یونین میں ہم جس شہر میں بھی گئے، ہمیں لینن کی یادگار پر پہنچا دیا جاتا

○روس کے ایک قدیم شہر میں گرجا گھر

● انڈین گروپ لیڈرز جناب ایس، این مشرا اور جناب حمزہ لینن کی یادگار پر

تھا۔ یہاں ہمیں عقیدت کے پھول رکھنے ہوتے۔ لینن سوویت یونین کا خدا ہے۔ ہر دفتر، ہر فیکٹری، ہر جگہ لینن کے مجسّمے اور تصویریں نظر آتی ہیں۔ ہر شہر میں ہم فوجیوں کی یادگاروں پر بھی جاتے تھے۔

ہم نے جتنے بھی شہر دیکھے، تقریباً سب ہی جنگ میں برباد ہو گئے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد روس کی 'سپر پاور' رہنے کی خواہش سمجھ میں آتی ہے۔ اتنی بربادی کے بعد وہ اب کبھی نہیں پٹنا چاہیں گے۔ مگر سوویت یونین میں رہن سہن دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے

قدیم روسی کسان کے لکڑی کے گھر کی ایک جھلک۔

اپنا سارا سرمایہ 'سپر پاور' بننے میں لگا دیا ہے۔ عام بازار میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کو آپ خریدنا چاہیں۔ ہمیں جو روبل خرچ کرنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ ان ہی کو ختم کرنا مشکل ہو گیا۔ روسی ہر چیز سیدھی بناتے ہیں۔ وہاں ہر چیز سرکاری ہے اور جو ہے وہی خریدنی پڑتی ہے۔

وہاں کی استری نانی اماں کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں، وہاں کے تکیے بہت نرم اور آرام دہ ہوتے ہیں۔ نہ جانے کس پرندے کے پَر اندر بھرے ہوتے ہیں۔ ہم دنیا بھر میں طرح طرح کے تکیوں پر سر رکھ کر سوتے ہیں، لیکن اتنے مزے کا تکیہ کہیں نہیں ملا۔ پندرہ دن میں ایسی لت لگی کہ دو بڑے بڑے تکیے ہم خرید کر ساتھ لے بھی آئے، حالانکہ ان کی وجہ سے وہاں چیک اِن میں اور یہاں کسٹم پر اچھی خاصی

جھینپ بھی سوار ہوئی۔ لیکن بھئی ہم ہندوستانیوں کو تو روس کا تکیہ ہی راس آتا ہے۔ کٹ گلاس کی چیزیں بھی وہاں اچھی بننے لگی ہیں۔ ہم نے بھی کچھ فروٹ باؤل خریدے اور اس طرح فروٹ باؤلز پر باقی پیسہ خرچ کر دیا۔

غیر ملکوں کے لئے سوویت یونین میں الگ دُکانیں ہیں۔ جہاں وہ ڈالر دے کر بھی باہر کی سب چیزیں خرید سکتے ہیں۔ مگر یہ دُکانیں بہت مہنگی پڑتی ہیں، کیوں کہ ڈالر کی سرکاری شرح تبادلہ بہت کم ہے۔

ہم نے سوویت یونین کے جتنے شہروں کی سیر کی، ان میں تالین شہر ہمیں بہت خوب صورت لگا۔ تالین استونیہ ری پبلک کا دارالخلافہ ہے۔ یہاں ہم ایک رات ہوٹل میں بھی رہے۔ تالین کی زبان استونین ہے، جو شاید جرمن زبان سے قریب ہے۔ یہاں سڑکوں پر زیادہ فیشن نظر آیا۔ یہ چونکہ یورپ کی سرحد سے ملا ہوا ہے، اس لئے یہاں زیادہ مغربیت نظر آتی ہے۔

سوویت یونین ایک ایسا ملک ہے جہاں ہندوستانیوں کو بے تحاشا پسند کیا جاتا ہے۔ اپنی گرم جوش محبت کا اظہار وہ اشاروں کی بے باکی اور اپنے رویّے سے کرتے ہیں۔

جب ہماری واپسی شروع ہوئی تو سب کے دل اُداس ہو گئے۔ خاص طور سے یہ احساس ہمارے دلوں میں کسک پیدا کر رہا تھا کہ یہاں آکر جو ہمارے دوست بنے تھے، ان سے نہ جانے پھر کب ملنا ہو گا جو لوگ ہمارے ساتھ ریل میں سفر کر رہے تھے اور جنہوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا تھا، ان سے بچھڑنے کا خیال ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ نہ ہمارا پھر سوویت یونین جانا اتنا آسان ہو گا اور ان کا ہمارے یہاں آنا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ اس ملک میں آپ جہاں اور جب جی چاہے اُٹھ کر نہیں جا سکتے۔ بڑی پابندیاں ہیں۔ سوویت یونین کے لوگ صرف دیگر کمیونسٹ ملکوں میں اپنی مرضی سے آجا سکتے ہیں۔ باقی ملکوں میں یا تو خاص مقصد سے یا صرف ڈیلی گیشن میں جا سکتے ہیں۔ وہاں رہ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں کتنی آزادی ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہاں کے نوجوان ایسے قوانین کو کس طرح قبول کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے وہاں کا پورا نظام اور سیاسی نظریات کی پرورش کا انداز سمجھنا پڑتا ہے۔

جب جانے کا دن آیا تو عجیب منظر تھا۔ سویرے سے ہی رونا دھونا مچ گیا۔ سب اپنے روسی دوستوں کے گلے لگ لگ کر ایک دوسرے کو دلاسا دیتے رہے ہماری بھی عجیب کیفیت ہو گئی۔ ضبط کے باوجود ہماری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ شاید صرف ہمارے گروپ کا حال ایسا تھا، لیکن جب ہم ایرپورٹ پر پہنچے تو وہاں الگ الگ علاقوں میں جانے والے گروپوں کا بھی اپنے گروپ جیسا حال دیکھا۔ ایرپورٹ پر سب دعاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بڑی جذباتی الوداع کا منظر تھا۔ یہ نوجوان ہندوستان اور روس کی نئی دوستی کا ایک نیا پیج تھا۔

او دُور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے...

ایم۔ کے۔ رانا

آج میری پتنی کا دیہانت ہو گیا اس کی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا۔ اس کے ساتھ میری زندگی کے چراغ کی روشنی بھی مدھم پڑ گئی۔ اس مدھم روشنی میں زندگی کس طرح گزاروں گا؟ اپنی شریکِ حیات، اپنی رُوح کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا؟ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس کی چِتا میں بیٹھ کر خود کو اگنی کے حوالے کر دوں گا۔ ہم نے محبت کے زمانے میں ساتھ جینے، ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ہماری شادی کے راستے میں کتنی رُکاوٹیں آئیں، لیکن محبت کی شکتی نے سارے کانٹے دور کر دئے ہم ایک ہو گئے اور کبھی الگ نہ ہونے کی قسم کھائی۔ افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیں الگ کر دیا۔ لیکن اب موت بھی نہیں الگ نہیں کر سکتی۔ چِتا کے شعلوں میں ہم ساتھ ساتھ جلیں گے۔

رادھا جب بیاہ کر ہمارے گھر آئی تو میں نے اس کا نام سیتا رکھ دیا میرا نام رام تھا' اس کی مناسبت سے اس کا نام سیتا ہی جچتا تھا۔ سیتا اتنی خوب صورت تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میری طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی، لیکن مجھے طبع آزمائی کے لئے کوئی موضوع نہیں سوجھتا تھا۔ میرا گاؤں راجستھان میں ہے۔ ہم راج پُوت ہیں ہمارا کام جنگ میں لڑنا تھا۔ پُرکھوں سے یہی ریت چلی آرہی ہے لیکن اب راجاؤں کی آپس کی لڑائیاں ختم ہو گئیں تو ہم نے تلوار کی بجائے پھاؤڑا سنبھال لیا اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ میں کھیت کھلیان پر نظمیں لکھنے لگا لیکن سیتا سے شادی کے بعد مجھے اپنا من پسند موضوع مل گیا میں نے سیتا کی خوب صورتی پر نظمیں لکھنی شروع کر دیں اور ساری نادر تشبیہیں اس کے حسن کی نذر کر دیں چیتے کی کمر، تلوار سی ناک۔ بادام سی آنکھیں گلاب سے رُخسار۔ موتیوں سے دانت۔ غرض سیتا نے میری شاعری میں چار چاند لگا دئے۔ میرے دوست میری نظمیں سُن کر خُوب خُوب داد دیتے۔ انہیں یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ داد کے قابل تو سیتا تھی جس کے حُسن اور سب سے بڑھ کر حُسنِ سلوک نے میری شاعری کو اُبھرنے کا موقع دیا۔ اس

طرح سیتا کی جدائی میرے لئے دوہرا نقصان ہے۔ سیتا کی ناوقت موت نے نہ صرف میرے دل کی بستی کو ویران کر دیا، بلکہ ہندوستان کو بھی ایک ابھرتے ہوئے شاعر سے محروم کر دیا
میں اس کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا
اس کے بغیر جینے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔

سیتا ایک عورت نہیں، دیوی تھی اس سے شادی کرنے کے بعد مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال اس کے بغیر کیسے گزار دئے۔ اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا اتنا لذیذ ہوتا تھا کہ زبان اس کا ذائقہ کبھی نہیں بھول سکتی۔ جب وہ مونگ کی دال میں اصلی گھی کا تڑکا لگاکر میرے سامنے رکھتی تو اس کے سامنے ہرن کے کباب بھی بے مزہ نظر آتے۔ جتنی دیر میں کھانا کھاتا، وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ میرے کھانے کے بعد کھانے کو ہاتھ لگاتی۔ میرے بہت اصرار کے بعد اس نے میرے ساتھ کھانا شروع کیا تو میری بھوک آدھی رہ گئی۔ میں آدھا پیٹ کھانے سے بھرتا اور آدھا پیٹ اس کے حسن کے نظارے سے۔ ہاتھ میں نوالہ ہوتا اور نگاہیں اس کے چہرے پر۔ اس طرح نوالہ کبھی ناک تک پہنچتا اور کبھی ہاتھ میں ہی رہ جاتا۔ وہ میری یہ حالت دیکھتی تو مسکراتی اور اپنے ہاتھ سے نوالہ بناکر کھلاتی۔ میں اس کے حسن کا نظارہ کرتے نہ تھکتا
افسوس اب مجھے کون اپنے نازک اور خوبصورت ہاتھوں سے کھانا کھلائے گا۔ اس کے بغیر کھانا مجھے زہر لگے گا۔ مجھے ساری بستی اُجاڑ لگتی ہے جب دل گلستان تھا تو ہر شے سے بہار ٹپکتی تھی۔ اب دل بیابان ہو گیا تو سارا عالم بیابان لگتا ہے۔ مگر یہ جوانی عارضی ہے میں اسے اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اپنے آپ کو چتا کے حوالے کر دوں گا۔

ہائے! وہ نظارہ کتنا حسین ہوگا جب میری رادھا سرخ کپڑوں میں سجی 'دلہن' تھی، مانگ میں سیندور بھرے میری گود میں لیٹی ہوگی اور میرا بھائی ہماری چتا کو آگ دے گا۔ خالص گھی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بس جائے گی۔ دھوئیں کے مرغولے اٹھیں گے آگ کے سرخ شعلے سیتا کے سرخ لباس میں مل جائیں گے۔ میں آخری بار اپنی سیتا کو چوم لوں گا اور اس سے کہوں گا: دیکھو، میں نے اپنا وچن نبھا دیا۔

رگھوکل ریت سدا چلی آئے
پران جائے پر وچن نہ جائے

ہم راج پوت ہیں ہر حال میں اپنا وعدہ نبھاتے ہیں۔ میں نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسم پوری کر دی۔ آگ ہمارے جسم کو جلاکر خاک کر دے گی، لیکن ہماری محبت زندہ رہے گی۔ بس میری ایک ہی آرزو ہے۔ اگلے جنم میں بھی میری سیتا مجھ کو مل جائے۔ اگلے جنم پر ہی کیا موقوف ہے' میں تو چاہتا ہوں کہ میری سیتا مجھ کو جنم جنم تک ملتی رہے۔

میں نے اپنی سیتا کے ساتھ جل مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لوگوں میں میرے اس فیصلے سے کھلبلی مچ گئی ہے۔ میرے ماں باپ' بہن بھائی، دوست رشتہ دار' سب مجھے سمجھا رہے ہیں کہ یہ خودکشی ہے۔ ایسا کرنا پاپ ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ شوہر کے مرنے پر بیوی ستی ہو سکتی ہے تو بیوی کے مرنے پر شوہر کیوں ستی نہیں ہو سکتا؟ بیوی اس کی اردھانگنی ہے، اس کا آدھا جسم ہے۔ پھر آدھے جسم کے ساتھ کوئی کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟ میں اپاہج بن کر جینا نہیں چاہتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ پُرکھوں کی ریت یہی ہے۔ بیوی میاں کے ساتھ جل کر مر جائے تو نہ صرف اس کے اپنے خاندان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بلکہ خاوند کے گھر والے بھی پاک ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بیوہ بن کر جینے سے اسے پھر عورت کا جنم ملتا ہے پھر بیوہ بن کر جینا بڑا کٹھن ہے۔ بیوہ منحوس سمجھی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ سفید کپڑے پہنتی ہے۔ سادہ کھانا کھاتی ہے۔ سب سے ملنا جلنا بند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بند رہتی ہے۔ شادی بیاہ میں شرکت نہیں کرتی۔ سسرال کا کوئی مرد اگر اسے اپنی ہوس کا شکار بنا لے تو بھی وہ زبان نہیں کھول سکتی۔ اس کی زندگی دکھوں کا بھنڈار بن جاتی ہے ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ گھٹ گھٹ کر مرنے سے چند منٹ میں جل کر مر جانا اچھا ہے۔
مرد رنڈوا ہو جاتے تو اسے ان مصیبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پھر تمہیں کیا پڑی ہے کہ تم بیوی کے ساتھ جان دینے پر تلے ہوئے ہو؟

میں لوگوں سے کہتا ہوں تم اپنی تاریخ بھول گئے ہو۔ مہاستی نے شیوجی کو پسند کر لیا تھا۔ یہ رشتہ اس کے باپ داکشا کو پسند نہیں تھا۔ اس نے سوئمبر میں شیوجی کو نہیں بلایا۔ ستی نے جب شیو کو نہیں دیکھا تو سوئمبر کا ہار ہوا میں پھینک دیا۔ شیوا اپنی شکتی کے بل پر وہاں پہنچ گئے اور ستی کا ہار ان کے گلے کا ہار بن گیا
داکشا کو اپنی لڑکی کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے ایک ہون کرنے کا ارادہ کیا تو جان بوجھ کر اپنے داماد شیو کو نہیں بلایا۔ ستی سے اپنے شوہر کی ہتک برداشت نہ ہو سکی۔ وہ احتجاج کے طور پر ہون کنڈ میں کود پڑی اور جل کر بھسم ہو گئی۔ بعد میں یہ رسم راجاؤں نے اختیار کر لی جب ایک راجہ دوسرے راجہ کا ملک فتح کرتا تو رانیوں کو باندی بنا لیتا ان پر طرح طرح کے ظلم ہوتے۔ ان مصیبتوں سے بچنے کے لئے رانیوں کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ وہ بھی اپنے راجہ کے ساتھ ستی ہو جاتیں۔ بعد میں یہ رسم برہمنوں نے بھی اختیار کر لی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر بیوی خاوند کی موت کے بعد اپنی دکھ بھری زندگی سے بچنے کے لئے اس کے ساتھ جل کر مر جاتی ہے تو خاوند یہ راستہ کیوں نہیں اپنا تا؟
میں سیتا کے بغیر ادھورا ہوں، نہتا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی میں دکھ ہی دکھ ہوگا میں بھی ان دکھوں سے بچنے کے لئے اس کے ساتھ جل مروں تو اس میں کیا برائی ہے؟
میری اس دلیل کو سن کر لوگ کہتے

ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میں کہنا ہوں کہ پُرکھوں نے ہوائی جہاز کا سفر بھی نہیں کیا تھا سات سمندر اور تیرہ ندی پار جانا پاپ تھا گاندھی جی کو بھی اپنی ولایت یاترا کے بعد اپنے پاپ کی تلافی کرنا پڑی تھی تو کیا اس سے سمندر پار کا سفر بند ہو گیا؟ پُرکھوں نے بجلی کا استعمال نہیں کیا بجلی کے شمشان میں مردہ نہیں جلایا۔ آج برہمن اور اچھوت ریل کی سیٹ پر ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں۔ کیا یہ بات پُرکھوں کی روایت کے خلاف نہیں ہے؟ کیا پچاس سال پہلے یہ ممکن تھا! یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ لوگ ہر نئے کام کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ کنویں کے مینڈک ہوتے ہیں۔ ہر رشی منی، پیر پیغمبر کو اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ کوئی نئی بات نہ کرو۔ پرانی روایت میں نئی روایت کا پیوند نہ لگاؤ۔ لیکن انہوں نے لوگوں کی ایک نہ سنی۔ دھیرے دھیرے لوگ ان کی بات مان گئے۔

میں بھی ایک نئی روایت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی میری ملکیت ہے میں جو جی چاہے اس کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میری زندگی سیتا کی ملکیت تھی۔ وہ میرے دل و جان کی مالک تھی۔ جب مالک ہی چلا گیا تو دل و جان بھی اسی کے ساتھ جانے چاہئیں۔ وہ میرے کپڑے سیتی تھی جب کہ میں کرتے کا ایک بٹن بھی نہیں ٹانک سکتا۔ وہ طرح طرح کے کھانے پکاتی تھی، میں چائے بھی نہیں بنا سکتا۔ وہ رات کو مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی تو مجھے نیند آجاتی تھی۔ اس سے پہلے مجھے ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی تھی۔

اب میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ مجھے امید ہے کہ میری موت کے بعد ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑے گی اور عورتوں کی طرح مردوں کا ستی ہونا بھی شروع ہو جائے گا۔ لوگ رام لال چوہان کا نام عزت سے لیں گے جس نے اپنی اردھانگی سیتا کی چتا میں بیٹھ کر اس کے ساتھ جان دے دی۔

میری وصیت ہے کہ جہاں ہماری چتا جلے وہاں ایک ستی استھل بنایا جائے تاکہ لوگ ہمیں یاد رکھیں۔ حکومت اس معاملے میں ضرور مداخلت کرے گی، لیکن میں سرکار کے قدم اٹھانے سے پہلے ہی اس مقام پر پہنچ چکا ہوں گا جہاں قانون کے لمبے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ ہندوستان کے مردوں سے میری درخواست ہے کہ میری قربانی پر سوچ بچار کریں۔ اگر انہیں میرا راستہ سچا راستہ معلوم ہو تو اسے اپنائیں۔ اس طرح ہندوستان میں مردوں کے ستی ہونے کی رسم شروع ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ عورت اور مرد کی برابری بھی قائم ہو جائے گی۔ ☐

سوچ

چھوٹی سی اک لڑکی تھی میں
کتنی بھولی بھالی تھی میں
گڈے کی بارات سجاتی تھی
اور گڑیا کا بیاہ رچاتے
آنگن آنگن پھرتی تھی میں
ہنستی گاتی رہتی تھی میں
ہمسائے تھے کتنے اچھے
دیکھ کے مجھ کو یہ کہتے تھے
بالکل گڑیا جیسی ہو تم
ننھی دُلہن لگتی ہو تم
سن کر ان کی باتیں میٹھی
اکثر میں یہ سوچا کرتی
جانے کب ہاتھوں میں میرے
مہندی کے گل بوٹے ہوں گے
دلہن کیسے بن پاؤں گی!
مارے شرم کے مرجاؤں گی
بنتی اور سنورتی تھی میں
پھندنے بنایا کرتی تھی میں
چندا اور پریوں کے سپنے
انجانی خوشیوں کے سپنے
عہدِ جوانی کاٹ چکی ہوں
آج مگر یہ سوچ رہی ہوں
میری گیارہ سالہ بچی
ٹی وی کا دم بھرنے والی
جانے کیا کیا سوچتی ہوگی
کیسے سپنے دیکھتی ہوگی

مڈٹیل ویژن

شہا رومانی

سپنے بکھر گئے

اے مرے آنگن کی مینا
گیت تیرے گونجتے ہیں
آج بھی میرے چمن میں
اے مرے گھر کی چنبیلی
تیری خوشبو سے معطر ہیں در و دیوار اب تک
میں نے چاہا تھا شفق کی سب گلابی
ماہِ تاباں کے رُخِ روشن کی چاندنی
آبشاروں کا ترنم
کھلتی کلیوں کا تبسم
زیست میں تیری رچا دوں
میں نے چاہا تھا کہ پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں سے
میں ترا آنچل سجا دوں
میں نے چاہا تری صبحِ زندگی میں
لا کے سب قوسِ قزح کے رنگ بھر دوں
میں نے چاہا تھا کہ تیری زیست ہو ایسی مثالی
تاکہ تجھ کو دیکھ کر یاد آئیں
رضیہ، چاند بی بی، سیتا
یہ مگر کس کو خبر تھی
میری ان اونچی اڑانوں کا تصور
جاگتی آنکھوں کے سپنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
کوئی بھی اُجلی سحر تیرے مقدر میں نہیں ہے
تیرے حصے میں
شبِ سخت دلگراں کی اک سیاہی آگئی ہے
کیونکہ میں علم و ہنر تہذیب و حکمت گراں مایہ خزانے دے کے تجھ کو
کار، بنگلہ، ریفریجریٹر
چیک، نقدی، سونے کے زیور
دے نہ پایا
میں کہ اک نادار شاعر
ایک بے بس باپ
اپنی مجبوری کے قفس سے نکل پایا نہ باہر

مہدی پرتاپ گڈھی

تبسم

دو چوہے شراب کے نشے میں دُھت ایک پہاڑی پر بیٹھے تھے۔ اتنے میں پہاڑ کے نیچے سے ایک ہاتھی گزرا۔ اچانک ایک چوہے کا پاؤں پھسلا اور وہ ہاتھی پر جا گرا۔
دوسرا چوہا جوش میں چلّایا :
"دبادے کم بخت کو!"

سیدہ رحمانی، دہلی

●

مکان کے دروازے پر ایک بچہ اُچک اُچک کر کال بیل کا بٹن دبانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ہر مرتبہ ناکام ہو جاتا۔ ایک بزرگوار کچھ فاصلے پر کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور قریب آکر انہوں نے تین چار مرتبہ زور زور سے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ پھر بچے سے کہا۔ "بس بیٹے، اب تو تمہارا کام ہو گیا اور کوئی کام ہو تو بتاؤ۔"
بچہ بولا "اب تیزی سے میرے پیچھے بھاگیے، ورنہ پٹائی ہو جائے گی۔"

سیّد ریاض احمد، مشیرآباد

●

ایک صاحب جن کا جدید شاعری میں بڑا نام تھا، ایک محفل میں اپنا کلام سنانے لگے۔
"دو قمیص، دو پینٹ"
محفل سے آواز آئی : "واہ وا"
"تین بنیان، ایک ساڑی"
محفل سے ایک اور آواز آئی : "واہ وا دوبارہ ارشاد ہو!"
شاعر صاحب کچھ جھینپتے ہوئے بولے
"ارے کیا خاک ارشاد ہو غلطی سے شاعری کی بیاض کی جگہ دھوبی کی کاپی اُٹھا لایا۔"

●

ایک بے وقوف نے دوسرے بے وقوف سے کہا، "سنا تم نے؟ ایک آدمی کنویں میں گرا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"
دوسرا بے وقوف بولا "جب وہ کنویں میں گرا ہی تھا تو جان سے ہاتھ کیوں دھوئے؟ پانی سے دھو لیتا۔"

وحیدہ خاتون، رام گنڈم، دہلی

●

دو گدھے سرِ راہ ملے تو ایک دوسرے کا حال چال معلوم کرنے لگے۔
پہلا گدھا بولا : "یار، تم آج کل بہت تگڑے دکھائی دے رہے ہو۔"
دوسرے نے کہا "ہاں۔ آزادی کی زندگی گزارتا ہوں خوب کھاتا پیتا ہوں اور مگن رہتا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ اتنے دُبلے کیوں ہو رہے ہو؟"
پہلے گدھے نے جواب دیا "میرا مالک مجھے مارتا پیٹتا ہے اور کھانے کو بھی کچھ زیادہ نہیں دیتا۔ اوپر سے میرے اوپر وزن بھی بہت لادتا ہے۔"
دوسرے گدھے نے کہا "تو تم وہاں کیوں رُکے ہوئے ہو؟ وہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتے؟"
پہلے گدھے نے وضاحت کی: "اُمید پر رُکا ہوا ہوں۔ وہاں میرا مستقبل بہت شاندار ہے میرا مالک جب کبھی اپنی بیٹی کو ڈانٹا ہے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ میں تیری شادی گدھے سے کروں گا۔"

تسنیم فاروقی، میرٹھ

●

ایک باپ نے اپنے بیٹے سے کہا "آج سے تم اپنا ہوم ورک خود کرو گے۔ میں نہیں کروں گا یہ صحیح نہیں ہے۔"
بیٹا بولا "مجھے معلوم ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن آپ صحیح ہوم ورک کرنے کی کم سے کم کوشش تو کر سکتے ہیں!"

سیّد ذو الفقار علی، دارانگی

●

سمندر کے ساحل پر ایک بچی نے اپنی ماں سے کہا۔ "کیا میں سمندر میں تیرنے چلی جاؤں، ممی؟"
ماں بولی "نہیں، تم نہیں جاؤ گی۔ وہاں بہت سی شارک مچھلیاں ہیں۔"
لڑکی نے دلیل پیش کی: "لیکن ڈیڈی تو تیر رہے ہیں۔"
ماں نے کہا "ان کا بیمہ ہو چکا ہے۔"

مختار احمد، دہلی

●

ایک نوجوان کے ہونٹوں پر لگی سیاہی دیکھ کر اس کے ساتھی نے پوچھا "یہ تمہارے ہونٹوں پر سیاہی کس نے مل دی ہے؟"
نوجوان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا "دراصل بات یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو رخصت کرنے اسٹیشن گیا تھا جب ٹرین چھوٹنے لگی تو میں نے خوشی کے مارے انجن کو چوم لیا۔"

ایم یونس خان، راؤرکیلا

○

اپنے لطیفے اس پتے پر لکھیے :
"تبسم" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ستی

پھر ایک نیا سوال؟

سعدیہ دہلوی

۴ ستمبر کو روپ کنور اپنے شوہر کے ساتھ چتا میں جل مری اور ستی ہو گئی۔ اس وقت اُسے کسی نے نہیں روکا بلکہ اُس کی خودسوزی کو عقیدت بھرے نعروں سے سراہا گیا۔ ہزاروں لوگوں کا مجمع "ستی ماتا کی جے" کا نعرہ لگا رہا تھا۔ آج اس حادثے نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ہر طرف برہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ احتجاج ہو رہا ہے۔ مظاہرے کئے جا رہے ہیں لیکن ہندوستانی تاریخ عورتوں کی کبھی اندھے عقیدے کے تحت رضاکارانہ، کبھی دھرم کے نام پر جبری قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کچھ عورتیں بیوہ کی ذلت آمیز زندگی سے بچنا چاہتی تھیں۔ کچھ اپنی عزت بچانا چاہتی تھیں، کچھ بیوہ کی موت کو پُرعظمت سمجھتی تھیں، اس لئے شوہر کے ساتھ ہی آخری سفر پر روانہ ہو جاتی تھیں۔ مذہب کے لبادے میں عورت کا استحصال ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہ چلن جاری ہے۔

ستی کی رسم مرد کے عورت پر مکمل اختیار کا ایک اظہار ہے۔ پرانے زمانے میں بیواؤں کو جلانے کی رسم ہندوستان تک ہی محدود نہ تھی۔ امریکہ اور افریقہ کے قبیلوں میں جب قبائلی سردار مرتا تھا تو اس کی بیویوں کی ٹانگیں توڑ کر ساتھ دفنا دیا جاتا تھا۔ یوگنڈا میں قبیلے کے سردار کی موت پر چاروں طرف ایک دیوار بنائی جاتی تھی جس کے اندر اس کی بیویوں کو بھوکا مارا جاتا تھا۔ چین میں بھی بیوائیں خودکشی کرتی تھیں۔ مصر اور یونان میں بھی مرد کے ساتھ قبر میں اس کی بیویاں زندہ گاڑی جاتی تھیں۔ وسط ایشیا میں بھی جب مرد مرتا تو اس کی ایک بیوی کو سولی پر چڑھا کر قربانی دینی پڑتی۔

جیسے جیسے انسانی سماج آگے بڑھا یہ رسمیں ختم ہوتی گئیں۔ لیکن ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں لارڈ ولیم بینٹنک کو ۱۸۲۹ء میں سخت مخالفت کے درمیان ستی کی وحشیانہ رسم کو قانونی طور پر ممنوع قرار دینا پڑا۔ اِس اقدام کے پیچھے راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی مہم کا ہاتھ تھا۔

راجہ رام موہن رائے کے بڑے بھائی کا جب انتقال ہوا تو ان کی بھاوج کو ستی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اس بات سے راجہ رام موہن رائے کے دل کو گہری چوٹ پہنچی اور انہوں نے ستی کی رسم کے خلاف لڑنے کا عہد کیا۔ انجام کار اس مہم میں وہ کامیاب ہوئے اور ستی کی رسم خلاف قانون قرار دی گئی۔ لیکن راجستھان کے گاؤں میں ظاہر ہے یہ ۱۵۰ سال پرانا قانون کوئی معنی نہیں رکھتا۔ روپ کنور پہلی عورت ہے جو اس گاؤں میں ستی ہوئی۔ گاؤں میں ان چھ ستیوں کی یادگاریں بنی ہوئی ہیں جہاں لوگ پوجا کرنے جاتے ہیں۔

روپ کنور خود بھی پڑھی لکھی تھی اور اس کا سسر بھی اسکول میں استاد ہے۔ لیکن جدید تعلیم نے بھی انہیں یہ نہیں سکھایا کہ عورت کی زندگی کا مقصد صرف شادی ہی نہیں ہوتا۔ پھر جس طرح ہجوم اکٹھا ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ گاؤں والے "ستی" کو جرم نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے ایک قابل تعریف عمل تصور کرتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ تعلیم اور قانون دونوں مل کر بھی سماج میں عورت کے رتبے سے متعلق پرانے، فرسودہ تصورات کو بدل نہیں سکے ہیں۔

یہی سنگین حقیقت جہیز کے جنازوں میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہے جن کی تعداد قانون نافذ ہونے کے بعد بھی کم نہیں ہوتی۔ روپ کنور سارے سماج کے لئے ایک عبرت خیز داستان بن گئی ہے۔ اس کی موت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہندوستان ابھی اکیسویں صدی سے بہت دور ہے۔ ابھی تو عورتوں کے بنیادی مسئلے بھی پوری طرح حل نہیں ہوئے ہیں۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ عورتیں پھر اس سلسلے میں پوری قوت کے ساتھ سوال کریں۔ سوال اگر صحیح ہوں گے تو جواب بھی صحیح ہوں گے۔ مردوں کا روایتی اندازِ فکر نہیں بدلے گا۔ عورت کو برابری کی عزت حاصل نہ ہو سکے گی۔ شعور بیداری کی لہر پیدا کرنے کے لئے ہندوستانی عورتوں کو صرف سوال کرنا کافی نہیں ہے اور بھی بہت کچھ کرنا ہوگا تاکہ عوامی شعور پوری طرح جاگ جائے اور عورت کو وحشیانہ رسموں کی بھینٹ چڑھنے کا موقع نہ دے۔

ممتا بے بی ٹانک

بچّے کی تندرستی کے لئے ماں کی ممتا

آپ اپنے بچّے کے لئے جو کچھ بھی اب کریں گے وہ
اس کی نشوونما میں تمام زندگی مددگار ثابت ہوگا۔

اپنے بچّے کو ممتا بے بی ٹانک دینا شروع کریں
یہ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کرتا ہے اور ہڈیوں اور دانتوں
کو مضبوط بناتا ہے
ممتا بے بی ٹانک آپ کے بچّے کو قبض اور بدہضمی سے
بھی راحت دلاتا ہے۔

معین الدین عثمانی

حقیقت سے قریب

کمرے میں عطر اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو کے ساتھ مسکراہٹوں اور مسرتوں کی مہک بھی رچی تھی۔ چند شوخ آوازیں کبھی بلند ہو جاتیں تو کبھی ڈوبنے لگتیں، جیسے روشن چاند کی کرنیں ندی کی شوخ چنچل لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں بچوں کے بلند قہقہوں سے ماحول میں زندگی بھی کیف تھا۔

"بار بار دن یہ آئے۔ تم جیو ہزاروں سال"

پھر ایک زوردار قہقہے کے ساتھ گیت ختم ہو گیا۔ ڈھولک اور دوسرے سازوں پر سکوت چھا گیا۔ کام سے فراغت پانے کے بعد میں کمرے میں آئی تو کمرے میں کوئی نہ تھا صرف برابر کے کمرے سے منّے اور اس کے دادا جان کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوئچ آن کیا تو نظریں دیوار پر لگی گھڑی پر جا پہنچیں پورے بارہ بج رہے تھے۔ باہر سردی اپنے شباب پر تھی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے کھڑکی کے پٹ رہ رہ کر آوازیں کر رہے تھے اور پردوں کی پھڑپھڑاہٹ سے ماحول پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہو رہی تھی۔

دوسرے کمرے میں منّے کے پاپا نیند کی وادی میں پہنچ چکے تھے۔ میز پر سالگرہ کے مصارف اور احباب و رشتہ داروں کی فہرست کے کاغذات بڑی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ منّے کے روشن مستقبل کی امید کی ہلکی سی مسکراہٹ کی شکل میں زرد گلاب کی طرح ان کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

میں نے جب انہیں غور سے دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ کل شام یہاں کتنا ہنگامہ ہوگا۔ منّے کی دسویں سالگرہ تھی۔ منّے کے دوستوں رشتہ داروں سے گھر بھر جائے گا۔ کتنا پیار کرتے ہیں شاہد میاں منّے سے۔ بڑی دھوم دھام سے یہ دن مناتے ہیں میرے ساتھ بھی ان کا سلوک کتنا رفیقانہ ہے۔ زندگی میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات میرے لئے ایک عزیز سرمایہ ہے۔

شادی سے پہلے بھی شاہد ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ کتنی جاذبِ نظر شخصیت تھی ان کی، جس روز سے اُن کی شادی کی بات طے ہوئی تھی میں تو ان پر مرمٹی تھی۔ آج ہر طرح میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔

شاہد میاں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے ذہن کے پردے پر منڈلانے لگے۔ دیر تک میں اسی طرح ماضی کے حسین خوابوں میں کھوئی رہی۔

شاہد نے اچانک کروٹ بدلی تو ایک نوٹ بک اُن کے تکئے سے نیچے آ گری۔ جس میں سے ایک رقعہ الگ جا گرا۔ میں نے یوں ہی اُسے اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر دو سطروں سے آگے پڑھنے کے بعد میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ ذہن پر رقصاں خوشیاں دامن سمیٹے بھاگنے لگیں۔ اُس تحریر کا ایک ایک لفظ دل و دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ اگر خود کو دھوکا دے کر خوش فہمی میں مبتلا کرنا ہوتا تو ضرور کہہ دیتی یہ تحریر ہرگز ان کی نہیں ہے۔ مگر تحریر کا ایک ایک لفظ چیخ چیخ کر اعلان بغاوت کر رہا تھا

زندگی میں کبھی کبھی ایسے موڑ بھی آتے ہیں کہ ہمیشہ خوشیاں لٹانے والی قسمت ہم سے ناراض ہو جاتی ہے اور ہم جو چاہتے ہیں اس کے عین برخلاف تمام واقعات ہونے لگتے ہیں۔ خواب ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ہم نے تو دائمی محبت کی ہے۔ زندگی کے دس سال تو کیا ہزاروں سال میرے ذہن سے تمہارے تصور کو مٹا نہ سکیں گے والدین کی مرضی کے آگے میں نے اپنی مرضی کے

عِلم

عِلم ایک ایسی نعمت ہے جس سے انسان خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ علم ہی ایک ایسی دولت ہے جو کبھی چُرائی نہیں جا سکتی اور نہ چھینی جا سکتی ہے۔ علم حاصل کرنے کا مقصد ایسا راستہ اختیار کرنا ہے جس پر چل کر آدمی ہنسی خوشی پُرسکون زندگی بسر کر سکے۔ تعلیم کا مقصد اچھے بُرے میں تمیز کرنا ہے۔ تعلیم انسان میں انتخاب کی صلاحیت اور قوت پیدا کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص علم حاصل کرنے کے بعد بھی نیکی اور بھلائی کے بجائے برائی کو اپنائے تو یہ گلشن سے دامن پھولوں کی جگہ کانٹوں سے بھر کر لوٹنے کی مانند ہے۔ اگر انسان زندگی کی حقیقی مسرتیں حاصل کرنے کے بجائے اُلجھنوں میں جا پھنسے تو یہ اُس کی تعلیم کا قصور نہیں، اُس کی تربیت اور ماحول کی خامی ہے۔ اُس سماج کا قصور ہے جس میں وہ پرورش پاتا رہا ہے۔ ایسے ہی تعلیم کے مقصد سے بے خبر پڑھے لکھے افراد کے لئے علامہ اقبال نے کہا ہے،

عِلم دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، قوت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اُس کا سُراغ

عِلم حاصل کر کے اُس پر عمل کرنا، زمین میں ہل جوتنے بیج بونے کی طرح ہے۔ لہٰذا زندگی کو بار آور بنانے کے لئے علم حاصل کرنے کے ساتھ اُس پر عمل پیرا بھی ہونا چاہئے۔ آیئے آج سے ہم بھی اپنے نصب العین میں درج کر لیں کہ علم حاصل کرنے سے ہمارا مقصد اپنے اندر انسانیت اور شائستگی پیدا کرنا ہے۔

فاطمہ ذی شان (نرل)

ساتھ اِس جسم کو بھی خاک میں ملانا چاہا تھا مگر تم نے میرے ڈگمگاتے قدموں کو خودکشی سے روکا تھا۔ میرے اندر جینے کا عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ قدم قدم پر میری رہ نمائی کرتا ہے۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنے حواس یکجا کئے۔ اور خالی خالی نظروں سے شاہد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ان کے چہرے پر اب بھی گہرا سکون تھا۔ آخر یہ کیا ہو گیا تھا آپ کو شادی سے پہلے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتا دیا تھا مجھے؟ سوالات کا سمندر میرے وجود میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"آپ کے بابا تو اتنے سخت نہ تھے اور گھر میں تو آپ کی بات کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی آخر کیوں آپ نے میرے لئے اپنی خواہشات کو قربان کر دیا۔ اِس طویل عرصے میں بھی کبھی آپ نے مجھ سے تذکرہ نہ کیا۔ ہمیشہ خاموشی سے گھٹن کا بہاؤ سہتے رہے۔ لیکن اب معلوم ہوا اِس گہری خاموشی میں کتنی قیامتیں پوشیدہ تھیں۔ اپنے افسانوں میں آپ نے ہمیشہ روایتوں سے بغاوتوں کا درس دیا۔ مگر خود اِس معمولی سی روایت سے بغاوت نہ کر سکے اور افسانوں کے کم زور ترین کردار میں گم ہو گئے۔"

اچانک ایک اور سوال نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ کون ہے وہ جو ان کی خوشیوں کی ملکہ ہے؟ ایک ایک کر کے کئی تصویریں میرے سامنے بن کر بگڑتی چلی گئیں۔ کس کا ذکر ہوگا۔ اِس خط میں کوئی کالج کی ساتھی یا آفس کی، محلّے میں تو کوئی ایسی نہیں ہے جو اُن کی منظورِ نظر بن سکے۔

کسی طرح بھی میرا ذہن سوچ کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور آنکھوں کے سیلاب میں روانی آتی گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے رقعہ اُٹھایا تو ذہن میں پھر صبح کا واقعہ گھوم گیا جب الماری کی تمام کتابیں اور سامان بڑی طرح پھیلا کر نہ معلوم کس چیز کی تلاش کر رہے تھے اور میرے پوچھنے کے باوجود بھی نہ بتایا تھا۔

ماؤف ذہن کے ساتھ میں اُٹھی اور بوجھل قدموں کے ساتھ بابا کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میری اِس اچانک آمد سے وہ حیران رہ گئے۔ پھر میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تو وہ اور بھی پریشان ہو گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد بولے۔ "کیا بات ہے بیٹی کیوں رو رہی ہو۔"

میں نے وہ خط اُن کی طرف بڑھایا تو میرے منجمد آنسو جیسے پگھل اُٹھے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بابا نے گھبرا کر وہ خط میرے ہاتھوں سے لے لیا اور اس پر نظر ڈال کر اچانک چیخ پڑے۔

"کہاں ہے شاہد؟ کیا ان ہی دنوں کے لئے میں نے اس کی پرورش کی تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی اِس طرح گُل کھِلائے۔ آخر کیا کمی ہے میری اِس چاندنی میں؟" انہوں نے میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں نئی نسل کو کیا ہو گیا ہے۔ بغاوت اس کی فطرت میں رچتی جا رہی ہے۔"

سرد ہوا کا ایک زوردار جھونکا میرے وجود میں کپکپی پیدا کر کے گزر گیا۔ ایک انجانے سے خوف نے مجھے آگھیرا۔

جب بابا اور میں شاہد کے پاس گئے تو وہ پہلے کی طرح پُرسکون نیند میں کھوئے ہوئے تھے اور اِدھر ہمارے دلوں میں ایک قیامت برپا تھی۔ بابا نے ذرا چیخ کر انہیں جگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے خمار آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے نرم لہجے میں کہا میں جواب دیئے بغیر خاموشی سے آنسو پی گئی۔

"بات کیا ہے، یہ ہم سے پوچھتے ہو۔ یہ بتاؤ کیا یہ شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟"

شاہد اچانک اِس طرح کے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ پھٹی پھٹی نظروں سے بابا کی طرف دیکھنے لگے۔

بابا نے تیز نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور مارے غصّے کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

شاہد نے پہلے مجھ پر نظر ڈالی، پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے ہاتھ میں دبے ہوئے خط کو دیکھ کر وہ چیخ پڑے۔ "یہ تمہیں کہاں سے مل گیا؟ میں آج صبح سے اِس کے لئے پریشان تھا۔ یہ میرے ادھورے افسانے کا حصّہ ہے۔ معلوم نہیں کہاں کھو گیا تھا"

ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں کاغذ کے اس پُرزے کو پا کر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا جیسے دونوں جہاں کی دولت انہیں میسّر آگئی ہو۔

اِدھر غم اور خوشی کے ملے جلے آنسو میرے چہرے پر آڑی ترچھی لکیریں بنا رہے تھے۔ ■

رفعت شاہین

میری چھوٹی بہن یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ وہ امتحان میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہے۔ کھیلوں میں بھی حصہ لیتی ہے۔ تقریری مقابلوں میں کئی بار انعام حاصل کر چکی ہے۔ ان تمام صلاحیتوں کے باوجود اس میں ایک کمزوری ہے وہ بند کمرے میں ایک منٹ بھی نہیں گزار سکتی۔ اگر کسی کمرے میں کھڑکیاں، دروازے کھلے نہ ہوں تو وہاں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لئے وہ ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتی۔

ماہرین نفسیات اس بیماری کو "بند کمروں کا خوف" کہتے ہیں۔ جو لوگ اس خوف کا شکار ہوتے ہیں، انہیں بند کمروں سے وحشت ہوتی ہے۔ ایک بار ایسا ہی ایک شخص اپنے دوست کے گھر گیا۔ وہاں باتیں کرتے کرتے دیر ہو گئی تو میزبان نے اسے وہیں رات بسر کرنے کی دعوت دی۔ رات کو اس کی آنکھ کھلی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے جاڑے کا موسم تھا کھڑکیاں، روشن دان سب بند تھے۔ یہ شخص فوراً بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی تو اسے چٹخنی نہ ملی۔ اس نے جھنجھلا کر کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا اور پھر آرام سے بستر پر دراز ہو گیا۔ صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نے کھڑکی کی بجائے کتابوں کی الماری کا شیشہ توڑ ڈالا تھا۔ اسے رات کو شیشہ توڑنے کے بعد ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی محسوس ہوا تھا، جب کہ کھڑکی کا شیشہ صحیح سالم تھا۔ دراصل اس نے شیشہ توڑ کر اپنے خوف سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اس کا ذہن مطمئن ہو گیا تھا۔ گو اس اطمینان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بند کمروں کے خوف کے برعکس کھلی جگہ کا خوف بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ یہ خوف اکثر عورتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ عورتیں اپنا زیادہ وقت گھر کی چار دیواری میں گزارتی ہیں۔ اگر انہیں بازار جانا پڑے تو وہ لوگوں کی گہما گہمی اور کھلی جگہ دیکھ کر نروس ہو جاتی ہیں انہیں گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ گھر کے محفوظ ماحول میں پہنچ کر انہیں اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اگر ان سے اس سلسلے میں سوال کیا جائے تو وہ جواب دیتی ہیں کہ بازار میں چلتے چلتے تھک گئی ہیں۔ یہ ایک بہانہ ہے۔ دراصل وہ خود بھی اپنے خوف کو نہیں پہچانتیں۔ اگر انہیں اس کا شعور حاصل ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ اس پر قابو پا لیں۔

بچے اکثر اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ خوف ساری عمر برقرار رہتا ہے۔ کچھ عورتیں گھپ اندھیرے میں نہیں سو سکتیں۔ تیز روشنی کا بلب دوسروں کی نیند میں خلل ڈالتا ہے اس لئے وہ زیرو پاور کا بلب استعمال کرتی ہیں اگر کسی وجہ سے بجلی فیل ہو جائے تو وہ رات بھر بستر میں کروٹیں بدلتی رہتی ہیں۔

بچے تنہائی سے بھی ڈرتے ہیں اس لئے شیرخوار بچے کو کبھی تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کچھ لوگوں میں یہ خوف بھی ساری عمر قائم رہتا ہے۔

نفسیاتی خوف کا تعلق بچپن کے کسی واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک بچے کو کتے نے کاٹ لیا۔ وہ تمام عمر کتوں سے ڈرتا رہا۔ بڑا ہو کر وہ پائلٹ بن گیا۔ اس نے ساری دنیا کا سفر کیا، لیکن وہ ننھے منے کتوں سے بھی ڈرتا تھا۔ کوئی شخص اس کو اپنے گھر بلاتا تو اس کا پہلا سوال ہوتا: تمہارے گھر میں کتا تو نہیں ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہوتا تو وہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔

ایک بچے کو بھڑ نے کاٹ لیا۔ وہ بھی تمام عمر بھڑ سے ڈرتا رہا۔ اگر کمرے میں بھڑ اڑتی ہوئی آ جائے تو وہ کمرہ چھوڑ کر باہر آ جاتا۔ کچھ عورتیں چھپکلی سے ڈرتی ہیں۔ چھپکلی کے متعلق بے بنیاد باتیں مشہور ہیں۔ کچھ عورتیں کہتی ہیں کہ چھپکلی میں اتنا زہر ہوتا ہے کہ وہ اگر سانپ کو کاٹ لے

تو وہ مر جاتا ہے۔ یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ یورپ میں بچے چھپکلی کو پالتے ہیں، اسے جیب میں رکھ کر اسکول جاتے ہیں، رات کو اپنے پاس سلاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مائیں چھپکلی سے ڈرتی ہیں۔ قدرتی طور پر یہ ڈر بچوں میں بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

اُونچائی کے ڈر میں مبتلا لوگ پہاڑ پر جانے سے گھبراتے ہیں۔ وہ قطب مینار کی بلندی سے نیچے نہیں دیکھ سکتے۔ اُونچی عمارتوں میں انہیں رہنا پڑے تو پہلی یا دوسری منزل کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو بہت اُونچائی سے نیچے دیکھنا پڑے تو چکّر آ جاتا ہے۔ یا آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس بیماری کو 'ورٹیگو' کہتے ہیں۔

نفسیاتی خوف کے تانے بانے بچپن کے ماحول سے جا ملتے ہیں۔ فرائیڈ کا قول ہے کہ اس کا سبب کوئی لاشعوری ذہنی اُلجھن ہے جو حل نہ ہو سکی۔ اس نے ایک بچّے کی مثال دی۔ یہ بچّہ گھوڑوں سے ڈرتا تھا۔ فرائیڈ کے قول کے مطابق یہ بچّہ دراصل اپنے باپ سے ڈرتا تھا۔ گھوڑا طاقت اور توانائی کی نشانی ہے اس معاملے میں گھوڑا باپ کی علامت بن گیا اور بچّہ گھوڑے سے ڈرنے لگا۔ ممکن ہے کہ اس انکشاف میں کچھ صداقت ہو، لیکن یہ دُور از کار باتیں ہیں جو عام انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

کچھ عورتیں بارش کے طوفان اور بجلی کی گرج سے ڈرتی ہیں۔ ایک شاعر نے عورت کے اس خوف سے استفادہ کیا ہے:

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

کچھ لوگ دریا اور سمندر کے پانی سے ڈرتے ہیں۔ وہ سمندر کے کنارے کھڑے ہوں تو حدِ نظر تک پانی کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھ کر انہیں چکّر آ جاتا ہے۔ یہ لوگ سمندر کی سیر سے جی چُراتے ہیں۔

کچھ لوگ راستہ کھو جانے سے ڈرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ غالباً انہوں نے بچپن میں ایسی کوئی کہانی پڑھی ہو یا ماں نے ان کو باہر نکلنے سے منع کیا ہو اور راستہ بھول جانے سے ڈرایا ہو۔

کچھ لوگ پولیس کی وردی سے ڈرتے ہیں۔ اس کا سبب بھی بچپن کے واقعات ہیں۔ مائیں اکثر بچّوں کو ڈرانے کے لئے پولیس یا سپاہی کا نام لیتی ہیں "سو جاؤ نہیں تو سپاہی اُٹھا کر لے جائے گا"۔ بچّہ ڈر کر سو جاتا ہے۔ لیکن ماں کی جہالت کی وجہ سے یہ خوف اس کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔

سب سے انوکھا، مگر بے بنیاد خوف جن بھوت کا خوف ہے۔ اس کے لئے بھی مائیں ذمّہ دار ہیں "ارے دونوں وقت مل رہے ہیں۔ آسمان میں بلائیں بکھر رہی ہیں۔ باہر نہ نکلو!" رات کو جیسے ہی بچّے نے آواز نکالی تو ماں نے اپنی نیند میں خلل پڑتے دیکھ کر فوراً جن بھوت کا سہارا لیا۔ سوجا، نہیں تو ہیّا آ جائے گا۔ ہَوّا آ جائے گا۔ بھوت پکڑ لے گا۔ بچّے کا کم زور ذہن اس خوف کو قبول کر لیتا ہے وہ عمر بھر ان غیر مرئی چیزوں سے ڈرتا رہتا ہے۔ رات کو کسی سنسان جگہ جانا پڑے تو درخت بھوت بن جاتے ہیں۔ اور کھسوٹر کی آواز جن کی پکار بن جاتی ہے۔ ماؤں کو ان باتوں سے پرہیز کرنا چاہئیے۔ بچّہ خواہ کتنا ہی روئے کتنی ہی ضد کرے، صبر سے کام لے کر اسے سمجھائیں جن بھوت کو مدد کے لئے نہ پکاریں۔

ذہنی خوف کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو گا جو کسی نہ کسی ڈر میں مبتلا نہ ہو۔ اپنے ڈر سے انکار کرنا ناسمجھی ہے۔ اس کو چھپانے کے لئے بہانے بنانا بھی غلط ہے۔ کتّے سے ڈرنے والے اپنے خوف کو یہ کہہ کر ٹال سکتے ہیں کہ کتّا نجس ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن دراصل انسان اپنے خوف کو چھپا رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے ڈر کو تسلیم کر لیا جائے، اس کے متعلق بات چیت کی جائے، یہاں تک کہ اپنے خوف پر فخر کرنا بھی جائز ہے۔ یہاں ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔ جب آپ خوف بیان کریں گی تو آپ کی سہیلی بھی ہمت کر کے اپنا خوف بیان کر دے گی۔ ممکن ہے کہ اس کا خوف آپ کے خوف سے زیادہ بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہو۔

ایک عام خوف انجکشن کا خوف ہے۔ خود کو انجکشن لگنا تو دُور کی بات ہے، بہت سے لوگ انجکشن لگتے دیکھنے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ اکثر اس خوف کے باعث لوگ انجکشن لگتے دیکھ کر بے ہوش تک ہو جاتے ہیں۔ ایک لڑکی کے والدین اسے دھوکے سے انجکشن لگوانے کے لئے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ جب اس پر یہ بات ظاہر ہوئی تو اس نے رونا دھونا مچا دیا۔ ڈاکٹر نے اسے بہلانے کے لئے کہا کہ وہ انجکشن نہیں بلکہ صرف دوا لگائیں گے۔ لڑکی آنکھیں چھپا کر روتی رہی اور ڈاکٹر نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب لڑکی اکھڑ کر جانے لگی تو ڈاکٹر نے ہنس کر بتایا "تمہارے انجکشن لگ چکا ہے"۔ بچّی فوراً بے ہوش ہو گئی۔

اپنے خوف سے نجات پانے کے لئے اس کو پہچاننا اور قبول کرنا ضروری ہے۔ جب انسان اپنی کم زوری کو جان لیتا ہے تو وہ اسے دُور بھی کر سکتا ہے اور اگر پھر بھی خوف دُور نہ ہو تو کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کر کے خوف سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ □

جامن - ایک قدرتی دوا

جامن ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ پیدا ہوتی ہے۔ برسات کا موسم شروع ہوتے ہی جامن کے درخت پر پھل آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پھل بہت سستا ہے۔ ہر خاص و عام اسے خرید سکتا ہے۔ طبیبوں کا خیال ہے کہ آم کھانے کے بعد جامن کا استعمال پیٹ کے لئے مفید ہے۔ جامن کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا گودا، گٹھلی، یہاں تک کہ اس کی چھال اور پتے بھی کئی بیماریوں میں کام آتے ہیں۔

جامن میں ایک خرابی یہ ہے کہ یہ قبض پیدا کرتی ہے۔ اس کے کھانے سے فضلے کا رنگ بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔

لیکن ان باتوں کے باوجود جامن ایک مفید پھل ہے۔ جامن کا سرکہ پیٹ کی خرابی کے لئے اکسیر ہے۔ کھانے کے ساتھ دو تین چمچے جامن کا سرکہ استعمال کریں تو چند روز میں ہی ہاضمے کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے۔

پیشاب میں جلن، خونی بواسیر اور پیچش، تینوں بیماریوں میں جامن کے گودے کا عرق فائدہ مند ہے۔ پکی ہوئی جامن سے گٹھلیاں الگ کریں اور پھر جامنوں کو دبا کر عرق نکال لیں۔ اس کے بعد اس عرق میں چار گنا کھانڈ ملالیں۔ (سفید چینی نہ ملائیں۔ بازار سے بورا خرید لیں) اس محلول کو دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب خوب پک جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرنے کے لئے رکھ دیں۔ اگر اس نسخے کو دس گرام روزانہ استعمال کریں تو اس سے نہ صرف خونی بواسیر اور پیشاب کی جلن کے مریضوں کو فائدہ ہوگا بلکہ ان لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا جن کے بال کثرت سے گرتے ہیں۔ اس نسخے کو تازہ بھی استعمال کر سکتے ہیں اور کئی روز تک رکھ کر بھی۔ بلکہ کئی روز تک رکھنے کے بعد یہ زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔

جامن کی گٹھلیوں کا سفوف ذیابیطس کے لئے مفید ہے۔ پہلے جامن کی گٹھلیوں کو دھوپ میں سکھائیں۔ اس کے بعد انہیں پیس کر پاؤڈر بنائیں۔ اس پاؤڈر کو روزانہ پانچ گرام کی مقدار میں کھائیں۔ یہ مقدار معمولی ذیابیطس کے لئے ہے۔ اگر ذیابیطس شدید ہو تو اس سفوف میں کریلے کا پاؤڈر بھی ملالیں اور پانچ گرام روزانہ استعمال کریں۔ اگر مریض کے پیشاب میں البومین بڑھ جائے تو اس نسخے کا استعمال کر دیں۔ اس کے استعمال سے بعض اوقات قبض کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر قبض ہو جائے تو کوئی قبض کشا دوا استعمال کریں۔

جامن کے درخت کی چھال بھی کام کی چیز ہے۔ یہ مسوڑھوں کی بیماریوں اور زبان کے چھالوں میں کام آتی ہے۔ جامن کے درخت کی چھال اتار لیں اور اسے پانی میں پکائیں۔ اگر چھال سو گرام ہے تو پانی ایک کیلو ہونا چاہئے۔ یعنی پانی اور چھال میں ایک اور دس کا تناسب ہونا چاہئے۔ اس محلول کو اتنا پکائیں کہ یہ آدھا رہ جائے۔ پھر اس سے کلی اور غرارے کریں۔ مسوڑھوں سے خون آتا ہو یا مسوڑھے پھولے ہوئے ہوں تو اس دوا کے استعمال سے یہ شکایت رفع ہو جاتی ہے۔

جامن کے درخت کی چھال کو جلا کر اس کا پاؤڈر بنالیں۔ یہ کھانسی اور خونی بواسیر کے لئے مفید ہے۔ کھانسی کی شکایت ہو تو ایک گرام پاؤڈر مکھن میں ملا کر روزانہ کھائیں۔ خونی بواسیر کی شکایت ہو تو ایک گرام پاؤڈر شہد میں ملا کر کھائیں۔ ایک ہفتے تک یہ نسخہ استعمال کریں۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

جامن کے درخت کی چھال سکھا کر اس کا پاؤڈر بنالیں اسے پانی میں ملا کر گاڑھا لیپ تیار کرلیں جسم میں جہاں زخم ہو یا چوٹ کا اثر ہو وہاں یہ لیپ لگائیں۔ دو تین روز کے استعمال کے بعد ہی زخم بھر جاتا ہے اور کچھ دن بعد مکمل آرام آجاتا ہے۔

اگر جامن کے استعمال کے دوران میں فضلے کا رنگ سیاہ ہو جائے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہونا قدرتی امر ہے ○

اسلامی کتب
فیوض و برکات کے لئے
شمع کے ادارے سے منگائیے

عورت تیرے کتنے روپ

شبین مظفر پوری

جوان ہونے تک تو ربیعہ محض ایک خوب صورت اور ذہین لڑکی رہی، مگر شادی کے کچھ دن بعد وہ ایک پراسرار کردار اور بالآخر ایک افسانہ بن گئی۔

ہوا یوں کہ چند سال کی نہایت خوش گوار ازدواجی زندگی کے بعد کسی جھگڑے اور تلخی کے بغیر ربیعہ اور ناصر کے درمیان طلاق ہو گئی۔ شادی کے ابتدائی چند سال تو مسرت و شادمانی کے گزرے، مگر اس کے بعد ازدواجی زندگی پر کچھ اداسی چھانے لگی۔ بظاہر تو ایسی کوئی خاص بات نہ تھی، پھر بھی ربیعہ کے سلوک کی گرم جوشی کچھ سرد پڑنے لگی تھی۔ اور اس کے برعکس ناصر کی چاہت میں زن مردانہ جوش و خروش آ گیا تھا وہ مبالغہ کی حد تک ربیعہ کی دل جوئی میں لگا رہتا پھر بھی اداسیوں کے سائے لمبے ہوتے گئے۔ زبان پر کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ دل میں تھا اور چہرہ تو دل کا آئینہ ہوتا ہی ہے۔ دل کی اداسیوں کا اثر روزمرہ کے معمولات پر بھی پڑا۔

پانچ سال تک بھی جب ربیعہ کی گود ہری نہ ہوئی تو دونوں طرف کے رشتہ داروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میاں بیوی تو نہایت صحت مند تھے، پھر یہ محرومی کیوں؟ باتوں باتوں میں کوئی بے تکلف رشتہ دار کچھ اشارہ کر دیتا تو میاں بیوی کا ایک ہی جواب ہوتا "ایسی جلدی بھی کیا ہے؟"

لیکن بار بار کی تکرار کے بعد یہ جواب بڑا رسمی سا ہو کر رہ گیا۔ پھر میاں بیوی کے دل میں بھی کھد بد ہونے لگی کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کہیں دیر میں اندھیر نہ ہو جائے۔ ان کے ازدواجی مراسم میں تو کوئی تشنگی تھی نہیں۔ پھر ایسا کیوں؟ اور اس "کیوں" نے انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میاں بیوی میں اس "کیوں" پر کبھی کبھی بات بھی ہونے لگی اور جب اس "کیوں" پر ربیعہ کی بے تابی بڑھی تو فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر سے بھی رجوع کر کے دیکھنا چاہئے۔ پھر بھی ناصر نے کہا "ایسی بے صبری بھی کیا۔ بعض کے ہاں تو دس دس سال بعد بچہ پیدا ہوتے سنا ہے۔"

"مگر ہم اطمینان تو کر لیں۔ مضائقہ ہی کیا ہے؟ شاید کوئی بات نکل آئے۔"

"چلو ٹھیک ہی ہے۔ یہ کیا بڑی بات ہے۔"

یوں تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، مگر طبی معائنے کے بعد ضرور ایک بڑی بات سامنے آئی۔ ربیعہ تو ہر طرح ٹھیک ٹھاک نکلی، مگر ناصر کے ساتھ ایک گڑبڑ معلوم ہوئی۔ ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ ناصر کے افزائشی جوہر میں قدرتی نقص تھا جس کے سبب بچہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا نقص اگر بیوی میں ہو تو اس کی اصلاح غیر ممکن نہیں۔ لیکن معاملہ اگر مرد کا ہو تو گویا اندھیرے میں تیر چلانے والی بات ہوتی ہے۔ پھر بھی تقدیر مہربان ہو تو تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔

ادھر سے مایوسی ہوئی تو دعاؤں تعویذوں اور ٹونکوں کو آزمایا گیا۔ مگر دعائیں ہوں یا دوائیں تاثیر دینے والا تو ہی ایک ہے — خدا۔ قدرت مہربان ہو تو ایک چٹکی خاک بھی اکسیر کا کام کر جاتی ہے۔ آخر ناصر نے اس محرومی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کر لیا۔

[illegible] مایوسی کے کرب سے تو دونوں ہی گزر رہے تھے، مگر ناصر کو کچھ شرمندگی بھی تھی۔ اس بات نے اس کو احساسِ کمتری میں مبتلا مبتلا کر دیا۔ عورت ہو یا مرد، اولاد کی تمنا کس کو نہیں ہوتی۔ مگر عورت کی تمنا میں ذرا شدت بھی ہوتی ہے۔ ماں بنے بغیر اس کو اپنا وجود ہی ادھورا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایسا پودا بن کر جینا برداشت نہیں کر پاتی جس میں صرف پھول کھلتے ہوں، پھل نہ آتے ہوں۔

یہ المیہ ربیعہ اور ناصر کی ازدواجی زندگی کے لئے ایک موڑ ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ دن بھی آ گئے جب ناصر کی باتوں میں خواہ مخواہ کی خوشامد اور چاپلوسی اور ربیعہ کے برتاؤ میں بے رضا و رغبت نبھانے والی بیوی کی اداکاری جھلکنے لگی۔ ناصر نے بیوی کی خوشنودی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا حالانکہ ایسی مبالغہ آمیز چاہت سے ربیعہ کو چڑ سی ہونے لگی تھی وہ بہت ذہین بھی تھی ناصر کے سلوک میں جو غیر معمولی والہانہ انداز پیدا ہو گیا تھا اس کا مقصد وہ تاڑ گئی تھی۔ جس خوشی سے وہ محروم تھی، اس کی تلافی ان باتوں سے کہاں ممکن تھی۔ اس کے اندر ایک بیزاری سی پیدا ہو چکی تھی۔ اور جب ربیعہ اکثر تھکی تھکی اور بجھی بجھی نظر آنے لگی تو ناصر کو کسی خطرے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ شک صحیح تھا۔ وہ اُوب چکی تھی۔

ربیعہ کو بہلانے کے لئے ناصر کو ایک بات سُوجھی۔ کیوں نہ رشتہ داروں میں سے کوئی ننھا سا بچہ لے پالک بنا لیا جائے۔ مگر جب اس نے سہمے سہمے لہجے میں یہ بات ربیعہ کو بتائی تو وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ یہ کوئی سادہ سی عام مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس میں وہ سارا کرب تھا جو وہ جھیل رہی تھی۔

ناصر نے پھر بھی خواہ مخواہ اس کو کریدا۔ "کیوں کیسا رہے گا؟ ذرا چہل پہل ہو جائے گی۔"

"پلاسٹک کا پھول کتنا ہی دل کش ہو، مگر خوشبودار نہیں ہوتا۔"

ناصر اپنا سا مُونہہ لے کر رہ گیا۔

پھر خطرے کا کھٹک اس دن اور بڑھ گیا جب ربیعہ نے یکا یک میکے کا قصد کر لیا۔ ناصر کے پُوچھنے پر اس نے صرف اتنا کہا "زندگی کچھ بوجھل بوجھل سی لگتی ہے۔ ذرا ماحول بدل کر دیکھوں۔"

اس بات سے ناصر ذرا چونکا۔ اس نے بدحواس ہو کر التجا کی "ایسے نہ جاؤ ربیعہ۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں اتنے دن میں بہت کُوٹ چکا ہوں۔ یہ جُدائی مجھے باؤلا بنا دے گی"

ربیعہ نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا "ہمیں کچھ دن تنہا رہنے کا بھی تجربہ کرنا چاہئے"

یہ پُراسرار بات تیر کی طرح ناصر کے دل میں اُتر گئی۔ گویا ربیعہ ناقابلِ تسخیر ہو چکی تھی۔ وہ میکے چلی گئی۔ کئی ہفتے گزر گئے تو ناصر کی بے چینی بڑھنے لگی اور آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ربیعہ واپس آنے میں ٹال مٹول کرتی رہی اور پھر اس نے انکار ہی کر دیا۔ ناصر اس پر دباؤ ڈالنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ربیعہ کے گریز کا سبب کیا تھا۔ بلکہ یہ سبب تو سارے رشتہ داروں پر بھی کھل چکا تھا۔ کسی عورت کے ماں بننے کی شدید تمنا کو بے رحمانہ اور غیر شریفانہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ جب ربیعہ نے ناصر کو روبرو گفتگو تک کا موقع نہ دیا تو والدین سے والدین کی گفتگو ہوئی۔ ربیعہ کے والدین نے اظہارِ افسوس کے بعد بتایا "لڑکی نے اپنا راستہ الگ کر لیا ہے۔ ہم مجبور بھی تو نہیں کر سکتے۔ شریعت اور قانون بھی آڑے نہیں آتے۔ پھر تو ہمیں اس اُلجھن کا ناگزیر شریفانہ حل ہی قبول کر لینا چاہئے۔"

کسی حیل و حجت کی گنجائش نہ پا کر ناصر کے والدین ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ اور چار و ناچار ناصر نے بھی دل پہ جبر کر کے اس اذیت ناک شریفانہ حل کو قبول کر لیا اور ربیعہ کو طلاق دے دی۔ اس کے دل نے ربیعہ کو قصوروار قرار نہیں دیا، بلکہ اس سانحہ کو اس نے اپنی بدبختی پر محمول کیا۔ ربیعہ سے محروم ہونے کے بعد اس کی دنیا ویران ہو گئی — ایک سکتہ — ایک سنّاٹا۔

مگر کب تک؟ وقت تو بہرحال گزرتا ہی گیا — اور وقت کے پاس ہر درد کی دوا اور ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے روزمرّہ کے معمولات میں ناصر کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ دفع الوقتی کے لئے اس نے کچھ نئے مشغلے بھی شروع کر دئے۔ ایک سال گزرتے گزرتے بات پُرانی ہو گئی اور ربیعہ کی یادوں پر گرد جمنے لگی۔ دوسرے سال اس کو معلوم ہوا کہ دو بچے والے ایک جوان رنڈوے سے ربیعہ کی دوسری شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس واقعہ نے ناصر کو کئی دن تک سوگوار رکھا۔ پھر یہ بات بھی جلد ہی پرانی ہو گئی۔

ناصر کی بھی دوسری شادی کے لئے موزوں رشتے کی تلاش جاری تھی۔ بڑی جستجو کے بعد ایک جوان تعلیم یافتہ خاتون کا پتہ چلا جو مطلقہ تھی اور دوسری شادی کی خواہاں بھی۔ نام عائشہ تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے بانجھ ثابت ہونے کے باعث اس کے میاں نے ایک اور شادی کر لی تو وہ سوت کو برداشت نہ کر سکی۔ ایک نیام میں دو تلواروں کی گنجائش نہ پا کر اس نے طلاق لے لینے ہی میں عافیت سمجھی۔ ناصر کے لئے دراصل ایسے ہی معقول رشتہ کی تلاش تھی۔ سلسلہ جنبانی کی گئی تو عائشہ کے سرپرست کو بھی مونہہ مانگی مراد ملی اس طرح ربیعہ ہی جیسی عائشہ ناصر کی نئی شریکِ حیات بن کر آ گئی۔ ناصر کے دل و دماغ سے احساسِ کمتری کا غبار دُھل گیا اور وہ ماضی پر خاک ڈال کر نئے سرے سے نئی زندگی جینے لگا۔ اس کی زندگی معمول پر آ گئی۔ ربیعہ کی صرف دُھندلی سی یاد رہ گئی تھی۔ ایسے میں ایک دن اچانک اس کو ربیعہ کی موت کی خبر ملی۔ دل کو دھچکا لگا۔ ساری یادیں، ساری باتیں ذرا دیر کے لئے تازہ ہو گئیں۔ دل بھر آیا۔

عائشہ پر بھی اس کی موت کا اثر ہوا۔ بچپن
گئی بے چاری مراد کو پہنچ کر بھی دنیا سے پیاسی ہی
گئی۔"

معلوم یہ ہوا کہ پہلے بچے کا درد زہ شروع
ہوا تو ربیعہ کو نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ درد
کی شدت نے اتنا طول کھینچا کہ جان جانے کا
خطرہ محسوس ہوا اور فطری فراغت کی بجائے
آپریشن کی ضرورت پڑ گئی۔ بچہ تو ٹھیک ٹھاک
پیدا ہو گیا، مگر زچگی کے عمل میں کچھ ایسا عارضہ
لاحق ہوا کہ ساری احتیاط اور تدبیر کے باوجود
تیسرے دن ربیعہ چل بسی۔

ناصر نے عائشہ سے کہا "چل کر پرسہ
دے دینا چاہیے۔"

"ہاں ۔۔۔ یہ ہمارا اخلاقی اور انسانی فرض
بھی ہے۔" عائشہ تیار ہو گئی۔

انہیں شہر کے دوسرے کنارے
مضافات میں جانا تھا۔ دونوں پرسہ کے لئے
پہنچے تو لوگ قبرستان سے واپس آچکے تھے۔ ہر
آنکھ اشک بار تھی۔ عائشہ اور ناصر کی آنکھوں
میں بھی آنسو آ گئے۔ وہاں پہلی بار ناصر ربیعہ کے
نئے شوہر سے متعارف ہوا ۔۔۔ ایک خوب رو،
باوقار اور مہذب انسان۔ اظہار تعزیت کے لئے
اس کو مناسب الفاظ نہ مل سکے پھر بھی اس
نے کہا "بڑا دردناک سانحہ ہے۔ آپ کے دکھ
کا ازالہ مشکل ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ
آپ کی کیا شے کھو گئی ہے۔"

ذرا دیر بعد ربیعہ کے شوہر نے ناصر اور
عائشہ کو الگ لے جا کر کہا "ناصر صاحب آپ
کی ایک امانت ہے۔"

ناصر چونکا۔ عائشہ بھی مرحومہ کے شوہر
کا مونہہ تکنے لگی۔

وہ بولا "کل جب مرحومہ کو جینے کی امید
نہ رہی تو مجھ سے انہوں نے درخواست کی کہ میری
یہ بچی میرے پہلے شوہر کو دے دیجئے گا۔ میری
دلی خواہش ہے۔"

ناصر کا جی بھر آیا۔ اس کے دل نے کہا:
"شاید یہ اس دکھ کی تلافی کے لئے ہو جو اس
کی مفارقت سے مجھے پہنچا تھا۔" اس کو یہ بھی
یاد آیا کہ ربیعہ نے اپنے جہیز کا سامان واپس
لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مہر کی رقم اداکرنے
کی پیش کش کو بھی اس نے قبول نہیں کیا تھا
اور آج یہ اچانک اور عجیب بات اس کے فہم
و ادراک میں سما نہیں رہی تھی۔ حیرت اور سبھی میں
کے اسی عالم میں وہ سوگوار شوہر سے پوچھ بیٹھا
"اور آپ؟"

"میں اس قربانی کا قول دے چکا ہوں
مرحومہ کی روح سے میں شرمندہ ہونا نہیں
چاہتا۔ ویسے اللہ نے مجھے دو بچے اور بھی دے
رکھے ہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے۔"

ناصر کی نگاہ عائشہ پر اٹھی تو اس کی
آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ فوراً بول اٹھی
"ہاں!"

■ اونی کپڑوں کو دھوتے وقت پانی میں ایک چائے کا چمچہ بھر زیتون کا تیل ملا دیجئے۔ اس سے کپڑے حیرت انگیز طور پر نرم و گرم محسوس ہوں گے۔

■ اونی کپڑوں پر پھٹکری (خوب باریک پیس کر) چھڑک دینے سے کپڑے برساتی ہوا اور کیڑوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

■ سردیوں میں ہاتھ پاؤں پھٹ جائیں تو انہیں بورک ملے پانی سے دھو لیا کریں۔ تھوڑے سے نیم گرم پانی میں بورک پاؤڈر ملا کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو کچھ دیر کے لئے اس پانی میں پڑے رہنے دیں پھر باہر نکال کر تولئے سے خشک کر لیں۔

■ اکثر سردیوں میں ہونٹ پھٹ جاتے ہیں اور کافی بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے لئے گائے کا کچا دودھ لے کر ہونٹوں پر لگائیے۔ ہونٹ نہیں پھٹیں گے۔

■ جاڑے کے موسم میں چہرہ بہت خشک ہو جاتا ہے بادام پانی میں بھگو کر ان کو باریک پیس کر چہرے پر لگائیں۔ سوکھنے پر ہلکے ہلکے رگڑ کر لیپ اتار دیں پھر چہرے کو پانی سے دھو ڈالیں۔ چہرے کی خشکی دور ہو جائے گی۔

■ گیہوں کا آٹا ۱۲۵ گرام، ہلدی دس گرام، سنگترے کے خشک چھلکے، صندل سفید، ان سب اشیاء کو باریک پیس کر آٹے میں ملا کر ابٹن تیار کر لیجئے روزانہ تھوڑا سا ابٹن دودھ یا عرق گلاب میں بھگو کر چہرے پر لگا لیجئے دو ہفتہ میں ہی آپ کے چہرے کی جلد شاداب ہو جائے گی اور جاڑوں میں کسی چکنی کریم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

■ سردیوں میں روزانہ رات کو سونے سے پہلے ایک چمچہ بالائی لے کر چہرے پر آہستہ آہستہ ملتی رہیں۔ ایک گھنٹہ بعد چہرے کو دھو لیں۔ تقریباً ایک ماہ یہ عمل دہرانے سے چہرے کی خشکی دور ہو جائے گی۔

یاسمین اختر، مغلی ٹولہ، مراد آباد
میں کیا بتاؤں عشق میں خود دار کون ہے
میناؔ ہو تو دیکھو اسیر دار کون ہے
گوہر عثمانی

ناظمہ خان، سرونج (ایم پی)
ہوا کچھ ایسی چلی لے گئی مہک کتنا
چمن چمن اُسے ڈھونڈیں نگر نگر جائیں
نامعلوم

ارشد حسین، چمپارن
غم دل کو لب تک آہیں نکالوں کو تشنگی
میری وفا کا آپ سے اچھا صلہ دیا
نامعلوم

ایم۔ اے۔ ماجد، حیدرآباد
ہم میں خوشبو تیری آئی ہے تو حیرت کیوں ہے
ہم یقیناً تیری خوشبو سے گزرے ہوں گے
رحمٰن جامی

زیب النساء، حیدرآباد
جب چیزیں سمیٹ کر سارے جہاں کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا
نامعلوم

شریف خان، کھرگون (ایم پی)
اللہ سے بارش کی دعا مانگنے والے
تو نے مرا ٹوٹا ہوا چھپر نہیں دیکھا
راز ساغری

سعیدہ انجم، کلاپہ (اے پی)
لبوں پہ جھوٹے تبسم کو سب نے دیکھ لیا
پڑی نہ زخمِ جگر پر نظر زمانے کی
نامعلوم

شفیق ناز، عبداللہ بال، علی گڑھ
جس پہ ناز تھا ہم کو ضبط وہ ہوا رسوا
ہم نے حالِ دل کہہ کر خود کو کر لیا رسوا
ڈاکٹر وزیر نفیس

ارشاد رشید، سلطان آباد
ہزاروں عظمتیں قربان اس دامن کی عظمت پر
جو مجبوری کے عالم میں بھی پھیلایا نہیں جاتا
محمود دہلوی

سید مسعود قادری، پربھنی
حسن سے لیجے تنظیم دو عالم کا سبق
بیچ ہوتی ہے تو گیسو بھی سنور جاتے ہیں
شکیل بدایونی

یونس ندیم، کھامگاؤں، مہاراشٹر
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی
فراق گورکھپوری

معین نیازی، آنولہ (بریلی)
وہ اٹھا کے میرے سوال پر گڑ اٹھ کے نہ جھکا کے سر
اڑی رنگ چہرے پہ اس طرح کہ ضمیر کے راز کھل گئے
محروح سلطانپوری

ملکہ بانو، انسدا بار (دھولیا)
چمن کا راگ ہیں کچھ اہلِ باغ ایسے بھی
چلے گا بس تو گلستاں کو بیچ ڈالیں گے
نامعلوم

نسرین فاطمہ، خیر نگر (میرٹھ)
دل اگر پھول نہ تھا کانچ کا ٹکڑا ہوتا
توڑنے والے کو اک زخم تو آیا ہوتا
نامعلوم

نعیم اللہ خاں، نرمل (اے پی)
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھوں میں نقشہ تری انگڑائی کا
نامعلوم

شیخ جلیل احمد آتش، کھم
جفا پہ ناز ستم پر تمہارے خوش ہیں ہم
مگر یہ کیا ہے وفاؤں کی پاسداری ہے
خیال

ضیاء نواز انصاری، رحمٰن الدین نگر، بستی پور
نہ گل اپنا نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا
نظیر اکبرآبادی

مس شگفتہ ظفر، رانچی (بہار)
تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
فیض احمد فیض

عطاء اللہ خاں، برہان پور
سلگتی یاد، دہکتا خیال، تپتا بدن
جہاں پہ چھوڑ گیا کارواں بہار دکا
نامعلوم

ذکائی زبیر، آمبور
دکھا بھی وہ اگر اعجاز شانِ مصطفائی کا
بدل جائے ذرا سی دیر میں نقشہ خدائی کا
جوہر بجنوری

الیاس احمد عابد، نرمل
حاصل نہ کر سکو گے کتابوں سے کوئی فن
اللہ گر نہ صحبتِ اہلِ کمال دے
یوسف نرملی

شمسی راشد کاشانی، مراد آباد
ہم لوگ ذرا بھی ہیں سمجھدار تو جاگیں
جو اپنا سپاہی سے حفاظت نہیں ہوتی
نامعلوم

ڈی ایس شاہین، صدف
جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
علامہ اقبال

حسنہ تسنیم، اکولہ
شریک کارواں رہتے مگر اس شان سے رہیے
کہ مر کے بھی تو مڑ کر کارواں کا کارواں دیکھے
نذیر بنارسی

ایم اے حکیم، نرمل (عادل آباد)
بک رہا تھا وقت کے بازار میں میرا ضمیر
میں نے دیکھا پھر ہمسایہ خریداروں میں تھا
نامعلوم

ایس شاداب احمد، آمبور
تو مجھے زمانے سے تو یہ تیرا کرم ہے ورنہ
تری رقیبوں کا بدلہ مری بندگی نہیں ہے
نامعلوم

زریدہ حبیب، چتور
برائے سیر چمن کون گل بدن آیا
کہ ماند پڑنے لگی ہے گلوں کی رعنائی
نثار ناوری

عقیل گدری، جگدھر پور
دل کا ناطہ اُڑ چکا ہے سب ناطوں سے
یہ مت پوچھو وہ میرا کیا لگتا ہے
نامعلوم

سعیدہ اختر، کلاپہ (راسلی)
خورش سے سجا گتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقدیر کو فدا ہو
علامہ اقبال

حامد مرزا، بیڑ، مہاراشٹر
جن کے چہرے ہوں چاند کی صورت
ان کے دل میں بھی داغ ہوتے ہیں
نامعلوم

صاحب وٹیٹو لبنٰی نشاط، آمبور
حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
اداس کیوں ہو جو کچھ خواب رائیگاں نکلے
ساحر

عالیہ شیخ، نیو سیلم پور، دہلی
تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے مرا
تو مری سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح
مسرور احمد کاشف

عبدالخالق کاوش، ایلور
تمہیں دانستہ محفل میں جو دیکھا ہو تو مجرم ہوں
نظر آخر نظر ہے بے ارادہ اٹھ گئی ہوگی
نامعلوم

شمسی کلیم کاشانی، مراد آباد
میں دل کی بات بھی کہتا نہیں ہوں آنکھوں سے
شکستہ پاکی کو میری کہیں خبر نہ لگے
شمیم امروہوی

رضیہ سلطانہ جلیلی، کھم
سب کے چہرے پہ ہیں اخلاق و مروت کے نقاب
کس کو اپنا یہاں اور کس کو پرایا کہیے
فیض الحسن خیال

بے بی روبینہ حکیم، بھیونڈی
آؤ اس شہر کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دو
میں ہوں اک تنہا مسافر تم ہی میرا ساتھ دو
نامعلوم

سید اکرم نیاز، حیدرآباد
ہم اگر سایوں کے پیچھے بھاگتے رہ جائیں گے
راستے کٹ بھی گئے تو فاصلے رہ جائیں گے
نامعلوم

عرب شیخ ابراہیم، کرناٹک
اک نام کیا لکھا ترا ساحل کی ریت پر
پھر عمر بھر ہوا سے مری دشمنی رہی
شکیل اختر

محمد جاوید شاہ، جانپور
لفظوں کی جستجو سے جھلسا نے اشکوں تک
سانحہ جو گزرا ہے وہ کہا جائے گا
ساقبہ خیرآبادی

نوٹ: اشعار کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھئے

اپنے اشعار اس پتے پر لکھئے: "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ذہنی ورزش

ذرا دیکھئے، آپ کس حد تک باخبر ہیں، آپ کا مطالعہ کتنا وسیع اور یادداشت کتنی تیز ہے۔ دس سوالوں کے درست جوابات بھیجنے پر آپ کو انعام میں زُلفی ہیئر آئل کی تین شیشیاں، زُلفی پاؤڈر کے دو پیکٹ اور دو زلفی صابن دئے جائیں گے۔ ان سب کی قیمت ۱۰/۷ روپے ہے۔ اگر درست جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ اگر سب سوالوں کے درست جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ درست جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۷ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۱" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ علامہ اقبال نے کس شاعر کو 'حکیم حیات' کہا تھا؟

۲۔ اقوام متحدہ کے پرچم میں دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے بتائیے اسے کس پودے کی دو شاخوں نے سہارا دے رکھا ہے؟

۳۔ بحر ہند میں ایک اسلامی ریاست ہے۔ اس کا نام بتائیے؟

۴۔ ہندوستان میں سونے کی کانیں کہاں واقع ہیں؟

۵۔ حضرت آدمؑ کے تین بیٹے تھے۔ دو کا نام ہابیل اور قابیل تھا۔ تیسرے بیٹے کا نام بتائیے؟

۶۔ اُردو کا پہلا باقاعدہ ناول کس نے لکھا؟

۷۔ تھامس ہارڈی نے اپنے اکثر ناولوں کا نام برطانیہ کے ایک مشہور شاعر کے مصرعوں پر رکھا ہے۔ اس شاعر کا نام بتائیے؟

۸۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے اپنے مقبرے کا ڈیزائن خود بنایا تھا۔ بتائیے اس کی تعمیر کس نے کی؟

۹۔ دنیا کی سب سے وزنی دھات کون سی ہے؟

۱۰۔ دنیا میں ہیروں کی سب سے بڑی منڈی کس ملک میں ہے؟

کوپن

ذہنی ورزش نمبر ۱

۱	------------------------
۲	------------------------
۳	------------------------
۴	------------------------
۵	------------------------
۶	------------------------
۷	------------------------
۸	------------------------
۹	------------------------
۱۰	------------------------

اُردو کی مقبول ترین ادیبہ
واجدہ تبسم
کے مقبول ترین ناول
ساتواں پھیرا
واجدہ تبسم کا تازہ شاہکار
قیمت: تیس روپے
نتھ کی عزت
ایک حیدرآبادی نواب سے ان کی طوائف محبوبہ کا دردناک انتقام
قیمت: تیس روپے
نتھ کا غرور
حیدرآباد کی کہانیاں جس میں غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل ہیں۔
قیمت: تیس روپے
نتھ کا زخم
انوکھے انداز کا ناول حیدرآباد، انگلستان اور امریکہ کی داستان
قیمت: تیس روپے
اُترن
حیدرآباد کے رنگین ماحول کی کہانیاں
قیمت: تیس روپے
نتھ اُترائی
گیارہ طوائفوں کی تیرہ کہانیاں
قیمت: تیس روپے
نتھ کا بوجھ
دل چسپ بے باک افسانے
قیمت: تیس روپے
قلم کے جادوگر الیاس سیتاپوری کے شاہکار
اُن انسانوں کی کہانیاں جو بادشاہ تھے، وزیر تھے، مصاحب تھے، امیر تھے، فن کار تھے، پرستار تھے، عاشق تھے، محبوب تھے، رقیب تھے، دوست تھے، دشمن تھے، جھوٹے تھے، سچے تھے۔ انسانوں کے وہ تمام روپ جو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے گرفت، نشہ، سحر، سوز و گداز... وہ سب جو آپ چاہتے ہیں
پارسائی کا خمار
قیمت: بیس روپے
آشنا پرست
قیمت: پندرہ روپے
حرم سرا کا محبوب
قیمت: پندرہ روپے
دیوی کے پرستار
قیمت: بیس روپے
کشمیر کی کلی
قیمت: سولہ روپے
داستانِ حوُر
قیمت: پندرہ روپے
شہزادی کا نیلام
قیمت: پندرہ روپے
بالاخانے کی دلہن
قیمت: پندرہ روپے
حرم سرا
قیمت: پندرہ روپے
چاند کا خدا
قیمت: پندرہ روپے
عجائب خانۂ عشق
قیمت: پندرہ روپے
اندر کا آدمی
قیمت: دس روپے
راگ کا بدن
قیمت: دس روپے
انتباہ:
الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تمام کہانیاں اور کتابیں کے ہندوستان میں اشاعت کے حقوق شمع بک ڈپو کے نام محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱
ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں

ہیلتھ کلب

ککرے — آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری

ہندوستان اور دوسرے گرم ملکوں میں ککروں کا مرض بہت عام ہے۔ یہ روگ تکلیف دہ ہونے کے ساتھ خطرناک بھی ہے۔

غریب لوگ بروقت علاج نہ کرانے کے باعث اس کی وجہ سے اپنی بینائی کھو دیتے ہیں اور اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو اندھے نہیں ہوتے۔ ان کی نظر بہت کمزور ہو جاتی ہے اور وہ تمام عمر کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔

ککروں کا مرض دونوں آنکھوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس میں آنکھ اور پپوٹے کے اندرونی استر (CONJUNCTIVA) میں سوزش پیدا ہو جاتی ہے اور دانے نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ دانے پپوٹے کے اندرونی استر پر خصوصیت سے زیادہ پھیلتے ہیں۔ اس مرض کی صحیح تشخیص کے لئے اس کے مختلف درجات کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے۔ عموماً کھاتے پیتے خوش حال اور صاف ستھرے رہنے والے والدین کے بچوں میں یہ مرض کم پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ مرض انتہائی متعدی ہے اور بہت جلد ایک سے دوسرے کو لگ جاتا ہے۔ اس کا سرچشمہ کبھی بیکٹیریا ہوتے ہیں۔ کبھی وائرس اس روگ میں آنکھ اور پپوٹے کے استر کے اوپر والے حصے میں دو قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہے۔ ایک تو سوزش کی وجہ سے یہ کھال لال ہو جاتی ہے اور پھر لالی ساری آنکھ میں پھیل جاتی ہے اور یہ دانے آنکھ کے پردے پر خراشیں ڈالنے لگتے ہیں۔ یہ اس مرض کی انتہائی صورت ہے۔ جو بصارت کو کمزور، یہاں تک کہ زائل بھی کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں پپوٹے اندر کی طرف مڑنے لگتے ہیں اور پلکیں ڈھیلوں سے رگڑ کھانے لگتی ہے۔

چھوٹے دانوں کا قطرہ ۱ یا ۲ ملی میٹر ہوتا ہے۔ یہ نیم شفاف اور ابلے ہوئے ساگودانے کے مانند ہوتے ہیں۔ عام طور پر نیچے والے پپوٹوں کی اندرونی جھلی کی جیب سے ان دانوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ پھر بہت جلد یہ بالائی پپوٹے کے اوپر والے کنارے پر پیدا ہو جاتے ہیں اور وہاں سے پپوٹے کی جھلی کے اندر پھیلنا شروع کر دیتے ہیں مگر اس مقام پر دانوں کی تعداد کم ہوتی ہے بعض اوقات صرف اندرونی اور بیرونی پپوٹوں کے زاویہ کے پاس دانے پائے جاتے ہیں لیکن آنکھ کی سفیدی والے پردے پر دانے شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ اگر اس مقام پر دانے پائے جائیں تو یقیناً وہ ککروں کا مرض نہیں ہے

ککروں کے مرض میں آنکھوں میں خارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چکاچوند زیادہ لگتی ہے اور آنسو بھی بہت زیادہ بہتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ مخاطی ہوتی پیپ دار رطوبت کا اخراج ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر یہ بیماری وبا کی صورت میں پھیلتی ہے۔ بعض اوقات آنکھ کے اندر دانوں کے چاروں طرف دھاگوں کا غلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دھاگوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ یہ دھاگوں کا غلاف پردے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور قرنیے کو ڈھک لیتا ہے جس سے بینائی ختم ہونے لگتی ہے

ککروں کا روگ اکثر گرم ملکوں میں پایا جاتا ہے مگر یہ مرض قومی پھیلنے کا نہیں ہے اور نہ کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہے۔ تاہم خاص قسم کے بود و باش والے لوگوں میں یہ اکثر پایا جاتا ہے۔ حبشیوں میں یہ مرض کم ضرور ہوتا ہے۔ مگر مبتلا وہ بھی ہوتے ہیں۔ عموماً

لوگ گندے ماحول اور گھنی آبادی میں رہتے ہیں وہی اِس بیماری کا شکار زیادہ ہوتے ہیں۔ بچے، غریب اور کم زور لوگ اِس بیماری میں جلدی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ مرض انگلیوں، تولیوں اور دوسرے کپڑوں کے ذریعے منتقل ہو جاتا ہے۔ انتہائی صفائی اور احتیاط برتنے پر یہ مرض شروع میں ہی رُک سکتا ہے۔

ککروں کا حملہ آنکھ کی سفید جھلی پر تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ پپوٹوں کی بیرونی جھلی میں جو ککروں کا غلاف (TRACHOMATOUS PANNUS) ملتا ہے حقیقت میں ملنی خلیات کا مقامی اجتماع ہے۔ جس کے اندر خون کی سُرخ باریک نالیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور شروع شروع میں قرینہ کے نصف بالائی حصّے میں سفیدی نمودار ہو جاتی ہے، قرینہ کی سفیدی اور خون کی باریک سُرخ نالیوں کا رقبہ جس قدر پُرانا ہوتا جاتا ہے اسی قدر زخم بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ زخم بہت کم گہرے ہوتے ہیں لیکن تکلیف دہ بہت ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آنکھوں میں بہت چکاچوند محسوس ہوتی ہے۔ اِن سے پانی بہتا ہے اور مرکزی زخم بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو مدّت کے بعد اچھّے ہوتے ہیں۔

ککروں کا روگ پُرانا ہو جائے تو بالائی پپوٹے ڈھیلے پڑ کر لٹک پڑتے ہیں اور اوپر کا پلک نیچے جھک کر آنکھوں کے ڈھیلوں کو چھونے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں آنکھ ایسی معلوم ہوتی ہے گویا اس میں نیند کا کافی خمار بھرا ہوا ہو۔ پپوٹوں کے اندرونی استر میں دھاگوں کی ساخت بننے سے بالائی پپوٹا ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور پلکوں کے بال بجائے سامنے اور اوپر رہنے کے اندر کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ ایسے پپوٹوں کو جب ہم پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ان مقامات پر عروق کے دب جانے سے سفیدی نظر آتی ہے۔

ککروں کا علاج سرسری مشاہدات کے بعد لیبارٹری کے معائنے کے بغیر شروع کر دینا چاہئے۔ اس بیماری سے عام طور پر ٹیٹرا سائکلین کیپسول ہر چھ گھنٹے بعد مریض کو دیں۔ کم از کم پانچ ہفتے تک مریض یہ کیپسول کھائے۔ مقامی علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ حمل کے دوران یہ کیپسول نہ دیں۔ چھوٹے بچوں کو کبھی ٹیٹرا سائکلین نہ دیں۔ پُرانی دوا کبھی استعمال نہ کریں۔

بہتر ہے اِس بیماری کے نمودار ہوتے ہی کسی آنکھوں کے ماہر کو دکھائیں اور اس کی تجویز کردہ دوا استعمال کریں۔ اِس درمیان اپنی آنکھوں کو زیادہ سے زیادہ صاف رکھیں۔

■■

مُحبّت

محبت وہ قابلِ احترام جذبہ ہے جو پہاڑی جھرنوں کی طرح دِل کی گہرائیوں سے اُبھرتا ہے۔ یہ رُوح کے ساز پر دھیرے دھیرے جل ترنگ کی مانند بجتا ہے اور زندگی کو حسین امنگوں سے آشنا کرتا ہے۔ یہ پُرخلوص دعائیں بن کر لبوں پر آتا ہے اور آنسو بن کر بہہ جاتا ہے۔ یہ پرستش کی حدوں کو چھوتا ہے تو امر بن جاتا ہے۔ اور اگر گھٹے تو کائنات ٹھکرا جاتی ہے۔

نہ جانے کیوں لوگوں نے اس عظیم جذبہ سے مونہہ موڑ کر خود غرضی اور مطلب پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ شاید ایسا کرتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ محبّت، چاہت اور خلوص ہی تو وہ پھول ہیں جن کی مہک سے زندگی کا کاروبار چل رہا ہے۔ آیئے ان پھولوں کی مہک کو، اِن چراغوں کی لو کو کچھ اور تیز کر دیں کیونکہ عالم انسانیت میں اِتّحاد، میل جول اور بھائی چارے کو بڑھانے کے لئے ہمیں خلوص کی فضا، پیار کی ہوا اور محبّت کی حدّت چاہئے پھر ہم یقیناً حیات کی اونچی نیچی، دُشوار گزار پگڈنڈیوں کو ہنستے گاتے طے کر سکتے ہیں۔

حامد مرزا (بیڑ)

خودکشی کرنا گناہ کبیرہ ہے

چونکہ زندگی اور موت حکمِ خداوندی کے تابع ہے۔ اس لئے اسلام خودکشی کو بدترین گناہ تصوّر کرتا ہے۔ جو شخص مایوس ہو کر یا کسی اور وجہ سے اپنی زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں سے کسی بھی طریقے سے ختم کرتا ہے، ایک بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کا یہ فعل ظاہر کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہے۔ (جو بجائے خود ایک گناہِ عظیم ہے) اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو کوئی اپنا گلا گھونٹ کر مر جاتا ہے وہ اپنے آپ کو اپنا گلا گھونٹ کر دوزخ کی آگ میں ڈالتا ہے اور جو کوئی اپنے آپ کو خنجر سے ہلاک کرتا ہے وہ ایسا کر کے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ میں جھونکتا ہے۔" (صحیح بخاری)

اِس حدیث میں اگرچہ خودکشی کے صرف دو طریقے بیان کئے گئے ہیں لیکن نثار حسین کہتے ہیں کہ خودکشی خواہ کسی طریقے سے کی جائے حرام ہے زہر کھا کر مرنا، ڈوب کر مرنا، کسی اونچی جگہ سے چھلانگ لگا کر مرنا، اپنے آپ کو آگ لگا کر مرنا، غرض کہ جان بوجھ کر کسی بھی ڈھنگ سے اپنے آپ کو ہلاک کرنا گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔ ایک سچا مسلمان خودکشی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

محمد ارشاد حسین (طائف، سعودی عرب)

راشد علی

ذہانت قدرت کا عطیہ ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ذہین آدمی دُنیا میں نام پیدا کر سکے۔ اس کے لئے ہمت افزائی اور ذہانت کی نشوونما کی ضرورت ہے۔ ہر بچے میں ذہانت موجود ہوتی ہے۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ بچہ اپنی ذہانت کو بروئے کار لانے کے لئے زندگی کے کسی شعبے کا انتخاب کرتا ہے۔ کبھی وہ دیواروں پر تصویریں بنا کر اپنی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے۔ اور کبھی کھلونوں کے انجر پنجر نکال کر اپنے انجنیئر ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی بچہ نہ پیدائشی انجنیئر ہوتا ہے اور نہ شاعر، دراصل وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، والدین اور اُستاد رجحان گر ہوتے ہیں۔ ہر لڑکے کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ باپ جیسا بن کر دکھائے۔ لڑکی میں یہ خواہش ماں جیسی بننے کے لئے ہوتی ہے۔ لاشعوری طور پر بچہ باپ کی نقل کرتا ہے اور بچی اپنی ماں کی۔ والدین کے بعد اُستاد کا نمبر آتا ہے۔ اگر والدین بچے کے ذہن کو متاثر نہ کر سکے تو یہ ذمہ داری استاد کے سر آجاتی ہے۔

نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ بچوں کی صلاحیت کو اُبھارنے کے لئے بہت زیادہ تگ ودو کی ضرورت نہیں۔ اگر بچے میں تصویریں بنانے یا نقاشی کرنے کی صلاحیت دکھائی دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ چاک اور کاغذ لے کر بیٹھ جائیں اور اسے مستقل نقاشی کرنے پر مجبور کریں۔ ہنٹر لے کر اس کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ ذہانت پیدائشی حادثہ نہیں ہے بلکہ ذہانت پیدا کی جا سکتی ہے یا اُس کی نشوونما کر کے اُسے ترقی کی آخری سیڑھی تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ تربیت پیدائش کے دن سے شروع کی جا سکتی ہے۔

یہ بات معلوم کرنے کے لئے کہ بچے میں کون سی صلاحیت کار فرما ہے اسے مختلف چیزوں کو دیکھنے، سننے اور چھونے دیا جائے۔ بعض اوقات انسان کو ساری عمر اپنی صلاحیت کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک لڑکی جس نے اسکول اور کالج میں اردو، ہندی اور انگریزی پڑھی تھی اتفاقاً سعودی عرب گئی۔ وہ وہاں چار مہینے

محرومی

قاضی انصار

کسی کسی کے
قدم
کامیابی چومے ہے
یہ ایک سوال ؟
مری فکر پر مسلط ہے
مگر
ہاتھ آئے محرومی !
یہ ایک فرق
پرانا بہت پرانا ہے
نصیبوں نے

چاند ستاروں کی
آرزو
کی ہے
نہ میں نے دولت وثروت کی جستجو کی ہے
بس ! ایک لفظ محبت کا
آسرا چاہا !
بضد ہوں میں بھی
بہرحال ! ادھر !!
بارہائے محرومی
تمام عمر مجھے آزمائے محرومی !

لی- اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان چار مہینوں میں اُسے عربی کی خاصی شد بد ہوگئی۔ اس نے عربی کا قاعدا خریدا۔ تھوڑے عرصے میں وہ عربی کی گرامر بھی سیکھنے لگی۔ اس کے رشتے دار یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ وہاں برسوں سے رہ رہے تھے۔ انہیں عربی میں شد بد حاصل کرنے میں کئی سال لگے تھے۔ مگر اس لڑکی نے کمال کر دکھایا۔ اب لڑکی کو احساس ہوا کہ اس میں زبانیں سیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہندوستان واپس آکر اس نے ایک ایک کر کے جرمن، فرنچ، اور اٹالین زبانیں سیکھ لیں۔ اس کے شہر میں ان تینوں زبانوں کے اسکول موجود تھے۔ اگر یہ لڑکی سعودی عرب نہ جاتی تو اُسے کبھی نہ معلوم ہوتا کہ اُس دوسری زبانیں سیکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔

اگر بچے کو مختلف چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے تو عین ممکن ہے کہ اس لڑکی کی طرح وہ اپنی صلاحیت پہچان لے۔ اگر والدین کو بچے کی صلاحیت معلوم کرنے میں دشواری پیش آئے تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے شوق کا مظاہرہ کریں۔ ماں باپ اگر رجحان رکھیں تو بچے کا رجحان اپنی پسندیدہ چیز کی طرف مبذول کرنا مشکل نہیں۔

ہر بچہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو خوش کرے۔ ماں اس کی پوری دیکھ بھال کرتی ہے۔ اُسے وقت پر دودھ پلاتی ہے۔ بستر گیلا ہوجائے تو اُسے فوراً بدل دیتی ہے۔ اس کے بدن کو سہلاتی ہے۔ اُسے چومتی ہے۔ بچہ ماں کا احسان مند ہے۔ وہ چاہتا ہے وہ بھی اُسے خوش دیکھے۔ اگر ماں اُس کی کسی حرکت سے خوش ہوتی ہے تو وہ اس حرکت کو بار بار دہراتا ہے۔ باپ سے اُس کا تعلق اتنا گہرا نہیں ہوتا۔ لیکن باپ کی شفقت دیکھ کر وہ اس کو بھی خوش کرنا چاہتا ہے۔ ماں باپ اگر اس کے سامنے اخبار اور کتابیں پڑھیں تو اُسے بھی مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا۔ والدین کو اپنی پسند بچے پر نہیں تھوپنی چاہئے۔ بچے کو یہ یقین ہوجائے کہ ماں باپ کون سی چیز پسند کرتے ہیں تو وہ انہیں خوش کرنے کے لئے اُس چیز کو خود بھی اختیار کرے گا۔

کچھ عرصہ ہوا مختلف شعبوں کے ممتاز لوگوں کا ایک سروے کیا گیا۔ یہ سب اپنے اپنے میدان کے شہسوار تھے۔ کوئی شاعر تھا، کوئی افسانہ نویس، کوئی مصور تھا، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی سائنس دان۔ ان سب کے ماں باپ زندہ تھے۔ ان سے ان کی ذہانت اور قابلیت کے متعلق سوال پوچھے گئے۔ تقریباً سب کا ایک ہی جواب تھا۔ سب کے گھروں میں والدین اور بچوں کے شوق مشترک تھے۔ والدین اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ بچے بھی ان کے کام میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس طرح والدین کی صلاحیتیں بچوں میں ابھر آئیں۔ ان لوگوں نے بچوں پر اپنا شوق ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اُن کو اپنا پیشہ چننے کی پوری آزادی دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے باپ کے پیشے کو دوسرے پیشوں پر ترجیح دی۔

یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ بچے کی دلچسپی کس چیز میں ہے ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بچے کی دلچسپی ابتدا میں ظاہر ہوجاتی ہے مثلاً وہ کتابوں سے زیادہ کھیل کود میں دلچسپی لیتا ہے تو اِس صلاحیت کی نشوونما کرنی چاہئے۔ کھیل کود میں دلچسپی لینا برا نہیں۔ موجودہ زمانے میں تیراکی، کرکٹ، ٹینس، فٹ بال اور بیڈمنٹن کے کھلاڑی خوب نام پیدا کرتے ہیں، بے شمار روپیہ کماتے ہیں اور ساری دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ انھوں نے اُس پُرانے مقولے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ کھیلو گے کودو گے ہوگے خراب۔

نواب پٹودی، کپل دیو اور گاواسکر دولت میں کسی صنعت کار سے کم نہیں، ان کی

شہرت اور ہر دل عزیزی کسی فلم اسٹار یا لیڈر سے کم نہیں۔ جہاں جاتے ہیں لوگ ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ یہ موجودہ زمانے کی دین ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے انہیں اس آمدنی کا ایک فی صد بھی نہیں ملتا تھا۔

اگر آپ اچھے والدین ہیں تو بچے کے شوق کا گلا نہیں گھونٹیں گے۔ اگر آپ کی بچی سلائی کی مشین کے پاس بیٹھنا چاہتی ہے یا اون کی سلائیوں سے کھیلتی ہے تو اس کے شوق کو بڑھنے دیں۔ اگر وہ سبزی ترکاری چھیلنے یا بنانے میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہے تو اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے، یہ کہنا غلط ہوگا کہ جاؤ اپنا کام کرو یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ اِس طرح بچے کا نازک دِل ٹوٹ جاتا ہے۔

آپ اپنے بچے کے شوق کو بڑھاوا دیں لیکن مبالغے سے کام نہ لیں۔ اگر بچے کا شوق کیمرے کی جانب ہے تو اُسے کوئی معمولی سا کیمرہ دیں۔ اگر وہ ان چیزوں کا صحیح استعمال نہ کرے تو آپ اس سے یہ چیزیں واپس لے لیں۔ بچہ اپنے شوق کی چیزیں سنبھال کر رکھتا ہے، اس کی بے پروائی اس بات کی مظہر ہے کہ اسے ان چیزوں میں بس سرسری دِلچسپی ہے۔

بچے کی صلاحیت کی نشوونما میں ایک خاص عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس دوران میں اس کی ہمت افزائی ضروری ہے۔ اگر آپ نے بیچ میں ہی اُسے ٹوکنا شروع کر دیا، اس کے کام میں کیڑے نکالے تو وہ اپنے کام کو بہتر طور پر انجام نہ دے سکے گا۔

اگر آپ کو بچے کا ذوق معلوم ہو جائے تو چوبیس گھنٹے اس کے سر پر سوار نہ ہوں۔ اگر اُسے پڑھنے کا شوق ہے تو اُسے کھیلنے بھی دیں۔ ہانڈی کے نیچے دھیمی آگ رہے تو کھانا بہتر ہوگا۔ بہت تیز آگ کھانے کو جلا دیتی ہے۔

والدین کے لئے بچے کو یہ جتانا غلط ہوگا کہ ان کی ناکامی ہماری ناکامی ہے۔ یہ بلیک میل ہے۔ اس سے بچے کے ذہن پر بوجھ رہتا ہے۔ اگر بچہ آپ کی توقع کے مطابق اپنے شوق کے میدان میں آگے نہ بڑھے تو عقل مندی اسی میں ہے کہ آپ بھی پیچھے ہٹ جائیں۔ اس کی بے توجہی کے باوجود آپ کا اصرار قائم رہے تو بچہ آپ کی خاطر وہ کام انجام دے گا لیکن خود مختار ہونے کے بعد وہ اس کے نزدیک بھی نہیں جائے گا۔

عام صلاحیت اور خاص صلاحیت والے بچوں میں یہ فرق ہے کہ خاص صلاحیت والے بچے مستقل مزاجی سے اپنے کام میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اسکول جانے والا بچہ بے حد مشغول انسان ہوتا ہے۔ سارا دِن اسکول کی پڑھائی، شام کو کھیل کود اور اسکول کا ہوم ورک۔ اس کے باوجود بچہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے وقت نکال لیتا ہے۔ سب سے اہم چیز لگن اور مستقل مزاجی ہے۔ کم زور صلاحیت والے بچے بھی ان دو چیزوں کی مدد سے شہرت کے آسمان تک پہنچ سکتے ہیں۔ ■■

اُداس لمحے

نسیم اختر

رادھا یونی ورسٹی کی طالبہ تھی سیدھی سادی، خوش مزاج۔ بھولا بھالا، جاذبِ نظر چہرہ۔ لباس سادہ، مگر اس میں ایک ایسی پُروقار شان کہ بار بار دیکھنے کی تمنا دل میں جنم لے۔ سنبل بھی اسی یونی ورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ دونوں کی ملاقاتیں پہلے رسمی رہیں پھر دل کی گہرائی تک پہنچ گئیں۔ محبت کا ننھا سا پودا اُچھوٹا اور سایہ دار شجر کی طرح بڑھتا چلتا پھیلتا گیا۔ سنبل اور رادھا ایک دوسرے کے لیے زندگی کی حرارت بن گئے۔ مگر دنیا کی نظروں سے دونوں کی محبت ابھی ڈھکی چھپی تھی۔ دونوں تنہائی میں ملتے۔ پہروں باتیں ہوتیں۔ پیار کے گیت گنگنائے جاتے۔ جیون ساتھی بننے کے سپنے دیکھے جاتے۔

ایک دن نہرو ہاسٹل کے پاس باغ میں رادھا نے اپنی سہیلی کملا کو سنبل کے ساتھ دیکھا۔ رادھا درخت کی آڑ سے انہیں دیکھتی رہی۔ دیر تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ رادھا کھڑے کھڑے تھک گئی اور سوچنے لگی کہ اسے کیا، شوق سے دونوں باتیں کرتے رہیں، مگر دل کے تالاب میں شک کی ایک کنکری آگری، اور اندر بہت اندر سے آواز آرہی تھی "کہیں کملا اور سنبل بھی ——— ؟" اس خیال سے وہ اور مضمحل ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر لوٹ آئی۔ اس کی نگاہوں میں رہ رہ کر برج کا وہ منظر گھوم جاتا جہاں برہا کی ماری رادھا عالمِ دیوانگی میں درختوں، پھولوں اور پرندوں سے اپنے دل بر کنہیا کی خیریت دریافت کرتی پھرتی ہے۔ تصورات کے بادل تھے کہ ذہن پر چھاتے ہی جا رہے تھے۔

بہت دیر تک وہ سوچ میں گم رہی۔

اس دن کے بعد رادھا نے کئی جگہ، کئی بار سنبل اور کملا، دونوں کو یکجا دیکھا سنیما، پارک، سنٹرل لائبریری میں گنگا کے دل کش ساحل پر ——— ہنستے مسکراتے دوڑتے بھاگتے۔ رادھا نے بہت شک و شبہ کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن رفتہ رفتہ اسے یقین ہو گیا کہ کملا بھی اس کی طرح سنبل کو چاہتی ہے۔ اور سنبل ؟ سنبل بھی ضرور اس سے پیار کرتا ہوگا۔

پھر ایک دن رادھا نے سنبل اور کملا کی تصویریں دیکھیں ——— کتنے منظر تھے، کتنے روپ رنگ۔ کہیں ہاتھ میں ہاتھ دیے، کہیں مہکتی ہوئی امرائیوں کے درمیان۔ اور ایک روز سنبل کے نام لکھا ہوا کملا کا محبت نامہ بھی رادھا کے ہاتھ لگ گیا۔ "جانِ من ——— آؤ ہم دونوں

مل کر اپنی چھوٹی سی دنیا بسائیں جس میں ہم
ہوں اور ایک خوب صورت پھول کی دل نواز
مسکراہٹ۔ ساتھ دو گے نا؟" بس وہ
اتنا ہی پڑھ سکی اور اس کا سارا وجود کانپ
گیا۔ دل گھائل کی پرندے کی طرح تڑپ
اٹھا۔ ہر لمحہ چہکنے والی رادھا گم صم رہنے
لگی۔ سنیل سے اب بھی ملاقات ہوتی،
لیکن اب پہلی جیسی رنگ کہاں؟ وہ
خاموشی اور اداسی کا سبب پوچھتا، مگر
رادھا زبان نہ کھولتی۔ کیا کہتی؟ یہی نا کہ
کملا سے نہ ملا کرو۔ گلہ شکوہ کرنا اسے قبول
نہ تھا۔ وہ اپنے سکھ کی خاطر کملا کا سکھ
نہیں چھیننا چاہتی تھی۔ محبت تیاگ چاہتی
ہے اور وہ تیاگ کے لئے بہرصورت
آمادہ تھی۔

یونی ورسٹی میں سہیلیاں، گھر پر
پاپا ممی رادھا کا اترا اترا چہرہ اور سرخ آنکھیں
دیکھ کر پوچھتے "بخار تو نہیں ہے؟ سر میں
درد تو نہیں ہو رہا ہے؟" وہ ہاں کہہ
دیتی! اور کیا جواب دیتی؟ یہ تو نہیں
بتا سکتی تھی کہ اس کے دل کو روگ
لگ گیا ہے؟
دوا علاج ہوتا رہا، لیکن رادھا
روز بروز نڈھال ہی ہوتی گئی۔ کلاس
میں بھی کم ہی حاضر ہوتی۔ پڑھائی میں سے
طبیعت بیزار ہوتی جا رہی تھی۔
رادھا اور کملا دونوں ایک دوسرے
پر جان چھڑکتی تھیں۔ آپس میں سگی بہنوں
جیسی محبت تھی۔ رادھا کی عیادت کے لئے
کملا ہر روز آتی۔ وہ اس کی گرتی ہوئی حالت
کو دیکھ کر غم گین رہنے لگی تھی ——
"کیوں رادھا، کیا بات ہے، روز بروز تو
دبلی ہوتی جا رہی ہے؟ کس بیرن کی
نظر تجھے لگ گئی ہے؟ بتا تو سہی، میں
اس کی خبر لوں!" کملا حقیقت سے
بے خبر تھی۔ اسے کیا معلوم کہ انجانے میں
وہ اپنی پیاری سہیلی کی دشمن بن گئی ہے۔
رادھا نے کملا کی باتیں سنیں۔ دل
کے ساگر میں درد کی لہریں اٹھیں اور
آنکھوں سے دو موتی ڈھلک کر خزاں رسیدہ
رخساروں پر پھیل گئے۔ کملا کی آنکھیں
بھی ڈبڈبا آئیں۔ دونوں دیر تک دکھی
من لئے بت بنی رہیں۔ کملا پر رادھا اور
سنیل کا پیار تو نہ کھل سکا، پھر بھی وہ
را[illegible]ے سے فکر مند رہنے لگی۔
رادھا کی اداسی دیکھ کر اس کے
پاپا ممی بھی غم کے سمندر میں ڈوبے رہتے۔
سنیل بھی ان دنوں الجھنوں میں گھرا ہوا
تھا۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑا تھا اور
فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کون سی راہ اختیار
کرے، کسے اپنی منزل بنائے؟ راہیں تو
دونوں پیاری تھیں۔ پھر خوشیاں حاصل
کرنے کا وسیلہ کسے بنائے؟ کسے نظر انداز
کرے؟ وہ شب و روز اسی کشمکش میں
مبتلا رہتا۔ ذہن میں ردّ و قبول کا سلسلہ
جاری تھا۔ کوئی ایک بات دل میں بیٹھ
نہیں رہی تھی۔ آخر اس نے رادھا پر ساری
باتیں ظاہر کر دیں اور اس سے مشورہ چاہا۔
لیکن رادھا خاموش رہی۔ بولتی بھی کیا؟
اس نے تو اپنی سہیلی کے لئے اپنی محبت
کا گلا گھونٹ دینے کا قطعی ارادہ کر لیا تھا۔
کملا کی زندگی کے چمن کی شادابی کے لئے
وہ اپنے لہو کا آخری قطرہ تک نثار کرنے
کے لئے تیار تھی۔ سنیل واپس چلا گیا
اس کے دل کا بوجھ جوں کا توں بنا رہا
ان ہی دنوں رادھا کے پاپا نے
یہ سوچ کر کہ شاید اسی طرح بیٹی کی صحت
اچھی ہو جائے، اپنا تبادلہ مینی تال کرا لیا
جاتے وقت رادھا سنیل اور کملا سے
نہیں ملی۔ ملنے سے زخم اور گہرا ہو جانے
کا خوف تھا۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ
جا رہی ہے —— کبھی نہ ملنے کے لئے
جدائی کی گھڑی میں آنسوؤں کو روکنا محال
ہو جاتا۔ اس لئے اس نے دونوں کو صرف
خطوں کے ذریعہ ہی آگاہ کر دینا مناسب
سمجھا۔

کئی برس بیت گئے۔ نئے ماحول میں
نئی جگہ پر رادھا پہلے سے اچھی ہو گئی۔
زخم کچھ مندمل ہو گیا۔ لیکن پیار اور جدائی
کا زخم بھر کر بھی نہیں بھرتا۔ رہ رہ کر ٹیس
اٹھتی۔ یادیں ستاتیں —— سنیل کی، کملا
کی یادیں۔ رات کے سناٹے میں سنیل
سپنوں میں آتا —— پریشان، اداس،
مجنوں صفت، دراز ریش، منتشر بال،
برہنہ پاؤں اور بے نور آنکھیں ——
"رادھا! آخر تم نے ساتھ چھوڑ دیا نا؟
میری اجڑی زندگی کا کیا ہوگا؟" رادھا
کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اشکوں سے
گال تر ہو جاتے۔ "ایسا نہ کہو، سنیل۔
میں نے کملا کے لئے یہ قربانی دی ہے۔
وہ بہن کے سمان ہے۔" رادھا نیند میں
ہی تڑپ اٹھتی۔ اور جب اس کی آنکھ
کھلتی تو وہ گھنٹوں خیالوں میں کھوئی
رہتی۔
ایک جگہ رشتہ طے کرنے سے
پہلے پاپا، ممی نے رادھا سے رائے مانگی
"جو آپ بہتر سمجھیں۔" رادھا نے
اتنا ہی کہا۔ پھر ایک ملٹری افسر سے
اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے شوہر
راکیش اسے بہت چاہتے تھے۔ اس کے
ہر سکھ کا خیال رکھتے تھے۔ "کھانا کھا لو۔
چلو شاپنگ کرا لائیں —— بھئی! آج
'نکاح' دیکھنے چلیں۔ سنا ہے بہت اچھی
پکچر ہے۔"
لیکن یہ خوشی بھی رادھا کی زندگی
کے لئے چار دن کی چاندنی ثابت ہوئی۔
ابھی ننھا آشیش پانچ برس کا ہی تھا کہ
راکیش پنجاب میں دہشت گردوں کے
ستم کا نشانہ بن گئے۔ فوجی اعزاز کے

ساتھ ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔
اس حادثے نے رادھا کو پاگل بنا دیا۔ وہ خلاؤں میں گھورتی۔ دروازے پر بیٹھی گھنٹوں نہ جانے کس کی راہ دیکھتی سُریش کو سینے سے چپٹا کر بار بار چومتی۔

ایک دن رادھا کے پاپا ممی آئے۔ بولے "بیٹی، کچھ دن کے لئے گھر چلی چلو۔ ساتھ رہو گی تو غم ہلکا ہوگا۔ یہاں تنہائی میں دل گھبراتا ہوگا۔"

خوشیاں تو چار دن کی ہوتی ہیں اور غم جیون ساتھی ہے۔ مجھ ابھاگن کی قسمت میں سُکھ کے دن کہاں؟ مجھے میرے حال ...." اتنا کہتے کہتے رادھا کا گلا بھر آیا۔ وہ سُبک پڑی۔

بیٹی کے آنسو دیکھ کر اس کے پاپا ممی بھی بے چین ہوگئے۔ مگر رادھا ان کے ساتھ نہیں گئی۔ والدین کے جانے کے بعد سچ مچ رادھا خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اب اسے رہ رہ کر کملا کی یاد ستاتی ــــ کیسی ہوگی کملا؟ بھگوان کرے اچھی ہو۔ پیار بھرے گھر سنسار میں سنیل اور کملا کتنے خوش ہوں گے۔ اور پھر یادوں کی برات سجنے لگی ــ سنیل کی بے پناہ چاہتیں۔ کملا کا بہناپا، خلوص، محبت، وفا۔ اور ــــ اور ـــ اس کے آگے زخم ہرا ہونے کے خوف سے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔

ایک دن سُریش کو ساتھ لے کر رادھا سنیل کے ہاں پہنچ گئی۔ سنیل نے ہی اس کا استقبال کیا۔

سنیل کے کمرے میں چیزیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ فضا بوجھل اور سوگواری محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے کارنس پر کملا کی تصویر تھی۔ لبوں پر وہی مسکراہٹ، آنکھوں میں وہی شوخی۔ جیسے اب بول ہی تو دے گی!

"کہاں ہے کملا؟ خاموش کیوں ہو سنیل؟" رادھا تقریباً چیخ پڑی۔

سنیل بچّوں کی طرح بلک اُٹھا۔
"رادھا! تمہارا تیاگ ہم پر شادی کے بعد ظاہر ہو گیا تھا۔ اسی لئے کملا اداس رہنے لگی تھی۔ میں بھی تمہاری جُدائی سے غمگین تھا۔ لیکن مرد ہونے کے ناطے جی کڑا کرنا پڑا۔ مگر کملا گھلتی رہی اور پچھلے دنوں تمہارے بیوہ ہونے کے بعد اس ننھی سی کرن کو چھوڑ کر سورگ سدھار گئی۔ آخر دم تک وہ تمہیں یاد کرتی رہی۔ بس یہی رٹ لگائے رہتی کہ تم پر رادھا کا حق ہے۔ اگر ممکن ہو تو ہاتھ پکڑ لینا۔"

رادھا نے ننھی کرن کو ماں جیسا پیار دیا تو چند دن میں ہی کرن اس سے ہل گئی۔ سُریش بھی اس موہنی سی چنچل گڑیا سے جلد ہی مانوس ہو گیا۔ دونوں بچے اکثر ساتھ ساتھ کھیلتے اور لان میں تتلیاں پکڑتے نظر آتے۔

رادھا کے آنے سے گھر کی سوگواری میں کافی کمی آگئی تھی۔ سنیل بھی کچھ مطمئن سا نظر آنے لگا تھا۔ صبح و شام دونوں دو گھڑی کو ہنس بول بھی لیتے۔ اس طرح انہیں کچھ دیر ہی کے لئے سہی غم و فکر سے نجات مل جاتی۔ موسم میں تبدیلی واقع ہوتی ہی ہے۔ خزاں کے بعد موسم گل اپنی رعنائیوں اور شادابیوں کی بدولت باعثِ کیف و نشاط ہوتا ہے لہو کو منجمد کر دینے والی سردی کی رات کے سینے سے پھوٹنے والی سنہری دھوپ کی تمازت دنیا کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہی کیفیت انسان کی ہے۔ زندگی میں سکون اور راحت ہو تو وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ سنیل، رادھا اور دونوں بچوں کی زندگیاں بھی وقت کی روانی کے ساتھ نور اور نکہت سے معمور ہو رہی تھیں۔ سنیل گھر کی ساری فکریں چھوڑ کر آفس کی فائلوں میں مشغول رہتا۔ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کرنا، ضرورت پڑنے پر اسکول کی مسٹریس سے ملاقات اور دیگر خانگی ذمہ داریاں رادھا نے اپنے سر لے لی تھیں۔ اور وقت ـــــ وقت تیز رفتاری سے اپنے طور پر رقص کر رہا تھا کہ یکایک ایک دن رادھا واپس جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ وہ دیر تک سنیل کے سامنے سر جھکائے گُم صُم کھڑی رہی۔ پھر ڈوبتی آواز میں بولی "سنیل ــــ سنیل میں ـــ"

"جا رہی ہوں۔" رادھا کی ادھوری بات سنیل نے پوری کی۔

پھر دونوں کی اشک بار نگاہیں چار ہوئیں تو آنسوؤں کی برسات کچھ اور تیز ہو گئی۔ اس دل خراش کیفیت نے دونوں کو اور بھی نڈھال کر دیا۔ لیکن اسی درمیان سنیل نے خود کو قابو میں کیا اور محبت اور اپنائیت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنا ہاتھ رادھا کے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ "پلیز رادھا! مت جاؤ۔ میرا نہ سہی کرن کے مستقبل کا تو خیال کرو۔ اس ننھی سی کلی کو تمہاری پُرخلوص مسکراہٹ اور ممتا کی جاں بخش خوشبو چاہئے۔

"آنٹی جی، پاپا کی بات مان جائیے نا!" کرن کی درد بھری معصوم التجا نے رادھا کی راہ روک لی۔ اس نے دیکھا کرن کی آنکھیں گویا اسے 'ماں اماں!' پکار رہی ہیں۔ اس کے دل میں ممتا کا سمندر اُمڈ پڑا اور بے اختیار ہو کر کرن کو اس نے بھینچ لیا۔ اُدھر سُریش بھی سنیل کی گود میں دُبکا جا رہا تھا۔ پھر وہ سب کارنس کے پاس لوٹ آئے، جہاں کملا کی تصویر والہانہ انداز میں مسکرا رہی تھی!

□□

لمحۂ گم گشتہ؟

تیرے در پہ مقدر آزمایا تھا کبھی میں نے
ادا سے پیار کا نغمہ سنایا تھا کبھی میں نے
محبت کو محبت جانِ جاں بخشی تھی تو نے بھی
مری خاموش چاہت کو زباں بخشی تھی تو نے بھی

محبت کی قسم کھا کر مجھے اپنا بنایا تھا
چمن سے توڑ کر گل میری زلفوں میں سجایا تھا
میری تصویر رہتی تھی سدا تیرے خیالوں میں
نہ تھا جانباز کوئی تجھ سا مجھ پہ مرنے والوں میں

مجھے نزدیک پا کر تو جہاں کو بھول جاتا تھا
فلک سے توڑ کر تارے میرا دامن سجاتا تھا
تجھے کچھ یاد ہے جب میں تری تقدیر ٹھیری تھی
چمن کا حسنِ رنگیں چاند کی تنویر ٹھیری تھی

مگر اب حال یہ ہے آئینہ سے بھی ہراساں ہوں
مسلسل غم کے جھونکے ہیں لرزتی شمعِ طوفاں ہوں
نہ وہ دلکش ترانے ہیں نہ وہ رنگیں نظارے ہیں
لبوں پر آہِ سوزاں ہے نگاہوں میں شرارے ہیں

مقدر کا نوشتہ جب یہی ٹھیرا تو کیا کہنا
خلافِ رسمِ الفت ہے کسی کو بے وفا کہنا
مجھے غیروں سے شکوہ ہے نہ کچھ تجھ سے شکایت ہے
محبت میں گلہ کیسا محبت پھر محبت ہے

مگر اتنا بتا تو نے کبھی سوچا وفا کیا ہے
جہاں میں بے وفائی ہی وفاؤں کا صلہ کیا ہے
نہ دیتا کاش تو ہنس کر فریبِ زندگی مجھ کو
نہ کرتا پیار تو مجھ سے نہ کہتا زندگی مجھ کو

گلنار آفریں

چکّی

ایک مرُدہ کل
جسے اب دفن ہوئے عرصہ ہوا ہے
رات دن آنکھوں پہ پھر زندہ ہے
یوں لگتا ہے جیسے
موت کا سایہ سروں پر ہر گھڑی منڈلا رہا ہو
اک مرُدہ کل کا سایہ، موت کے آنچل کا سایہ

ایک کل ہے
جو ابھی پیدا نہیں ہو پایا
لیکن اُس کا سایہ بھی
بشر کی فکر کے انداز اس کی سوچ کی پرواز پہ
پڑتا ہی رہتا ہے

یہ دو "کل"
فردا و دیروز
پڑ ہیں ایک چکّی کے
جو مل کر پیستے ہیں آدمی کا "آج"
اُس کی زیست کا امروز
ادھر اندھے اندھیروں میں اُدھر مبہم سویروں میں

یہ چکّی تھم نہ پائے گی
ازل سے چل رہی ہے تا ابد چلتی ہی جائے گی
وگرنہ وقت کو رُکنا پڑے گا!
خود اپنے سامنے جھکنا پڑے گا!

ڈاکٹر حقیر آستانی

بیسویں قسط

اب تک کی کہانی

آفاق ایک خوب رو، دولت مند، اصول پسند نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور رئیس صدرالدین کی بیٹی فلک ناز نے اس سجیلے نوجوان کو دیکھا تو اس کو اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کے ارادے سے اس کے دفتر میں ملازم ہو گئی۔ مگر آفاق پر اس کے حسن اور اداؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ الٹا اسے ملازمت سے علیحدگی کا پروانہ مل گیا۔

کچھ دن بعد جب آفاق نے فلک ناز کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تو اس کا دل کھل اٹھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی مگر سہاگ رات سے ہی فلک ناز کو احساس ہونے لگا کہ آفاق حسن کے قدموں میں سجدے کرنے کی جگہ حسن کا مذاق اڑانے پر تلا ہوا ہے۔ دن گزرتے گئے اور فلک ناز کے دل میں آفاق کے خلاف غصے اور نفرت کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ ایک روز اس نے آفاق سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ لیکن آفاق نے یہ شرط رکھی کہ آزادی پانے کے لئے پہلے اسے ایک اچھی، سلیقہ مند بیوی بن کر دکھانا ہوگا۔

آفاق سے نجات پانے کی دھن میں فلک ناز نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ اس کے سارے ناز نخرے ہوا ہو گئے۔ اس تبدیلی کے ساتھ اسے یہ احساس بھی ہونے لگا کہ آفاق چپکے چپکے اس کے دل میں گھر کر چکا ہے۔ ان ہی دنوں آفاق کا چھوٹا بھائی اسحاق امریکہ سے وطن واپس آگیا۔ کچھ دن بعد آفاق کو غیر ممالک کے کاروباری دورے پر جانا پڑا۔ فلک ناز نے سارے گھر کو نئے سرے سے سجایا سنوارا۔ دورے سے واپس آنے کے بعد آفاق نے فلک ناز کے سلیقے کی داد تو دی، مگر اس کی بے نیازی کا وہی عالم رہا۔ پھر آفاق دو روز کے لئے کراچی گیا تو فلک ناز نے تہیہ کر لیا کہ آفاق کی محبت کو جگانے کے لئے وہ ایک اور حربہ آزمائے گی۔

پھولوں کو اپنے قدموں میں رکھنے والے
میرے پھولوں کو بھی اپنے قدموں
میں جگہ دینا۔
میرے پھولوں کو انگارے نہ بنا
دینا۔۔۔
میرے پھولوں کو، میری سانسوں کو۔۔۔
میری آسوں کو۔۔۔
میرے ارمانوں کو۔۔۔
مجھے۔۔۔!
مجھے۔۔۔!
اسی وقت باہر کار کا ہارن سنائی دیا۔

ڈرائیور آفاق کو لینے ایئرپورٹ گیا تھا۔

فلکی جان بوجھ کر نہیں گئی تھی۔ وہ نئی نویلی دلہن بن کر گھر پر انتظار کرنا چاہتی تھی۔ یوں سرخ کپڑے پہن کر، ماتھے پر ٹیکا لگا کر ایئرپورٹ جانا اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ سارے لوگ اسی کو دیکھنے لگ جاتے اور شاید فلکی کا اس طرح جانا آفاق کو بھی برا لگتا۔

فلکی اب بالکل تیار تھی۔

جب باہر کار کا ہارن سنائی دیا تو اس نے اپنا سرخ جالی والا دوپٹہ اٹھا کر اپنے سر پر اوڑھ لیا۔

فلکی ہی کیا، سارا کمرہ ہی حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا۔ پلنگ پر سرخ بیڈ کور بچھا ہوا تھا۔ سینٹر ٹیبل پر سرخ گلاب مسکرا رہے تھے۔ آتش دان میں سرخ رنگ کا ہیٹر جل رہا تھا۔۔۔ اور فلکی شعلہ بنی کھڑی تھی۔

کمرے میں خوشبو ہی خوشبو تھی۔
خوشبو۔۔۔
تنہائی۔۔۔
دلہن ۔۔۔ اور۔۔۔ حسن
جیب چاروں محاذوں پر صف آرائی ہو تو پھر جیتے آدمی کے لئے جائے فرار نہیں رہتی۔
فلکی کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔۔۔
جیسے وہ آج کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں کھڑی تھی۔
بس طبلِ جنگ بجنے والا ہے۔
مگر عجیب بات ہے۔۔ آج کی جنگ میں ہارنے والا ہی فاتح ہوگا۔ اس واسطے جیتنے کے سارے سامان کے ساتھ فلکی ہارنے کو تیار کھڑی تھی۔
آج اسے اس محاورے پر یقین آ رہا تھا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔
فلکی ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اسے پذیرائی کے لئے باہر جانا چاہئے۔۔۔ یا اندر رہ کر آفاق کا انتظار کرنا چاہئے۔۔۔
کہ ایک دم بھاری بوٹوں کی آواز آئی اور پھر آفاق اندر آ گیا۔
فلکی نے اس کی غیر متوقع آمد سے گھبرا کر سر کو یوں جھکا لیا جیسے آج پہلے پہل پریم کے دوار سے آئی ہو۔
آفاق نے یوں ہی سرسری نظر سے فلکی کی طرف دیکھا جیسے کوئی دیوار کو پودے کو یا کسی پرندے کو دیکھتا ہے۔۔۔ اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔
فلکی کا دل دھک دھک کر رہا تھا لیکن کھڑی کانپ رہی تھی۔
آج اس کے جذبات اس کے چہرے پر لکھے ہوئے تھے۔۔۔ اور اس کے اوسان خراب گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانک رہے تھے جانے اب اگلے لمحے کیا ہو؟
آفاق کا چہرہ سپاٹ تھا نیلے آسمان کی مانند جس پر بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا نہیں ہوتا
سگریٹ سلگا کر آفاق نے ہونٹوں میں دبا لیا اور پھر فلکی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔
"فلک۔۔۔ آپ جانتی ہیں آج کیا تاریخ ہے؟"
فلکی نے بولنے کی بجائے نگاہ اٹھا کر سامنے دیوار پر لگے سوئٹزرلینڈ کے کیلنڈر کی طرف دیکھا جو برف باری کے براق آسا منظر کے ساتھ نئے مہینے کی تاریخ بھی دکھا رہا تھا۔
"آج ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا ہے نا؟"
فلکی کی نگاہ یکم جنوری پر اٹکی ہوئی تھی واقعی۔۔۔ لیکن یہ تاریخ اس کے ذہن سے کیسے نکل گئی جب کہ دس دن پہلے اس نے اس تاریخ کے بارے میں اچھا خاصا سوچ لیا تھا۔۔۔ اور یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ آفاق کو

SURPRISE

دینے کے لئے وہ شادی کی سالگرہ کا اہتمام کرے گی۔۔۔ اور آفاق کو کوئی انوکھا سا نرالا سا تحفہ بھی دے گی
مگر۔۔۔ پھر۔۔۔ شاید پچھلے ہفتے کی جذباتی کشمکش کے باعث وہ سب کچھ بھول گئی تھی، حالانکہ بھولنا نہیں چاہئے تھا۔۔۔ یہ دن اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔۔۔ اور اس دن اس کی سالگرہ بھی ہوتی تھی۔
کیسا اتفاق تھا؟ آج پھر وہ دلہن بنی کھڑی تھی اور آفاق خود اس کے کمرے میں آ گیا تھا۔
اور یہ دن خود بخود یادگار ہوا جا رہا تھا۔
"آج۔۔۔" آفاق اسی سپاٹ لہجے میں گویا ہوا "آج میں نے سوچا ہے کہ اس یادگار دن۔۔۔ آپ کو کوئی انوکھا اور نرالا تحفہ دیا جائے۔"
فلکی کا سارا خون چہرے پر آ گیا۔
اس کا دھیان، اس سیاہ مخملیں ڈبیا کی طرف چلا گیا۔
اس نے سوچا۔۔۔ وہ کہہ دے۔ تم۔۔۔ تم مجھے قبول کر لو۔
"آج سجن موہے انگ لگا لو جیون سپھل ہو جائے"
یہی۔۔۔ یہی سب سے بڑا انعام اور سب سے عظیم تحفہ ہوگا۔
آفاق ایک دم کھڑا ہو گیا جیسے وہ بھی کسی کشمکش کا شکار ہو۔ اس نے فلکی کی طرف پیٹھ کر لی اور بولا۔
"ایک بار آپ نے مجھ سے اپنی آزادی مانگی تھی اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب آپ بہترین خاتون بن کر دکھائیں گی تو میں آپ کو آزاد کر دوں گا۔
یہ۔۔۔ یہ کون سا موقع ہے اس بات کے یاد دلانے کا۔۔۔ فلکی کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔
اس نے مڑ کر دیکھا۔ فلکی گم صم کھڑی تھی۔
"۔۔۔ اور میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اپنا عزم بھول جائیں گی مگر میں اپنا وعدہ یاد رکھوں گا۔ میں بات کا دھنی ہوں، وعدے کا پکا ہوں، میری یادداشت بھی بلا کی ہے۔۔۔ ہے نا؟"
اس نے طنزیہ انداز میں فلکی کی طرف دیکھا۔ اتنے میک اپ کے باوجود فلکی کے چہرے کا رنگ لمحہ بہ لمحہ متغیر ہو رہا تھا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔ وہ کہاں ہے؟۔۔۔ وہ کیا سن رہی ہے؟۔۔۔ کیا دیکھ رہی ہے؟۔۔۔ اسے کیا کرنا چاہئے
"تو آج۔۔۔" وہ ڈرامائی انداز میں بولا
"اس یادگار دن میں آپ کو آپ کی آزادی لوٹا رہا ہوں۔ آپ نے واقعی ایک مثالی خاتون بن کر دکھایا ہے اور بڑی لگن کے ساتھ زندگی کا قرینہ سیکھا ہے۔۔۔۔۔۔ اسی دن میں نے آپ کو نکاح کے زندان میں قید کیا تھا۔۔۔ اگر آپ میرے ساتھ نہ رہنا چاہیں تو آپ جا سکتی ہیں۔۔ ابھی۔۔۔ اسی وقت۔۔ ایک لمحہ توقف کے بغیر۔"
فلکی نے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا لرزتا ہوا تکیہ اس کی ہتھیلی پر آ گیا۔
"میں نے ایک مہربانی آپ کے ساتھ کی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی جسمانی تعلق قائم نہیں کیا۔ جسمانی رشتے محبتوں کو مضبوط کرنے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، محض حیوانی جذبوں کے اظہار کے لئے نہیں۔ بعض اوقات جسم کا تعلق جذباتی وابستگی کا سبب بن جاتا ہے۔
"میں نے آپ کو کبھی بھی مالِ غنیمت نہیں سمجھا۔ کبھی پامال نہیں کیا حالانکہ میں ایک مرد ہوں۔۔۔ اور آپ جانتی ہیں کہ میرے لئے ایسا کرنا بہت کٹھن تھا۔۔۔ اگر میں زبردستی کرتا تو اپنی نظروں میں بھی گر جاتا۔"
اس نے جیب سے ایک چیک نکالا اور اس کو ایش ٹرے کے نیچے رکھ دیا۔
"میں نے کچھ رقم بینک میں آپ کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ باقی اس گھر میں جو کچھ ہے، آپ ہی کا ہے۔ جو بھی لے جانا چاہیں لے جا سکتی ہیں۔ آپ کی اپنی گاڑی باہر کھڑی ہے۔ اب اس پر آپ کا اختیار ہوگا۔۔۔۔ خدا حافظ!۔"
اس نے کہا اور زن سے دروازے سے نکل گیا۔ جس طرح بندوق کی گولی نکل جاتی ہے۔
پھر یہ گولی خواہ جس کے لگے۔۔۔ کہیں لگے۔۔۔ کسی کا ماتھا پھوٹ جاتا ہے؛ کسی کے نصیب۔۔۔ کسی کا دل زخمی ہو جاتا ہے، کسی کی آن۔۔۔ کسی کی روح نکل جاتی ہے کسی کی جان۔۔۔
فلکی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی جان نکال دی ہو۔
وہ ایک خالی خول کی صورت میں فضا میں معلق ہو۔
جب باہر آفاق کے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ ہوش میں آ گئی۔
ہوش میں آتے ہی معاملے کی تہہ تک پہنچی۔ تصدیق کرنے کے لئے چلتی ہوئی اس چیک کے پاس گئی۔
اتنی زیادہ رقم، صرف کھیل ختم کرنے کے لئے۔
اس نے چیک ہاتھوں میں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ چیک کیا ٹکڑے ہوا ایسا لگا جیسے فلکی کو آسیب آ گیا ہو۔
یک وقت تہذیب یافتہ، بنی سنوری حلیم الطبع فلکی کے اندر سے وہی وحشی جنگلی اور تخریب پسند فلکی نکل آئی۔
اس نے نوچ نوچ کر اپنے سارے زیور اتار پھینکے، زرتار دوپٹہ تار تار کر دیا۔ چوڑیاں اتار کر پھینک دیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ساری شیشیاں اٹھا کر آئینے پر دے ماریں۔ آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں اس کے شکست خوردہ چہرے کے مختلف حصے نظر آ رہے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر وہ چیخنے اور چلانے لگی۔
کمینے۔۔۔
بے حس۔۔۔
سنگ دل۔۔۔
الو کا پٹھا۔۔۔۔
حیوان۔۔۔۔۔۔
میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی انسان اس قدر پیچ بھی ہو سکتا ہے۔
اتنا گرا ہوا۔۔۔
اتنا گھمنڈی۔۔۔۔
اتنا مغرور۔۔۔۔۔۔
یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔۔۔ اس کے اشاروں پر چلتی رہی۔۔۔ اس کے ظلم سہتی رہی۔۔۔ اس کے لئے خاک ہو گئی۔۔۔
اور یوں مجھے ٹھکرا کر چلتا بنا۔
اس ساری تپسیا کا یہ صلہ ہے۔
اب جو میں زندگی بھر اس منحوس کی شکل دیکھوں۔۔۔
چیخ چیخ کر روئی، جی بھر کر روئی۔ جتنے کپڑے تار تار ہو سکتے تھے، کئے۔۔۔ جتنے شیشے اور گلدان ٹوٹ سکتے تھے توڑ دیئے۔
جتنی گالیاں یاد تھیں، وہ دے ڈالیں۔ جتنے کوسنے زبان پر آئے وہ ادا کئے
اس وقت اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچا ہوا تھا۔ اس وقت اگر آفاق بھی اس کے سامنے ہوتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔
کیا کیا نہ کر دیتی وہ۔
اور جب تھک ہار گئی تو اٹھ کر اپنے کپڑے سمیٹنے لگی۔ فقط صرف وہی سامان لے کر جانا چاہتی تھی جو وہ گھر سے لائی تھی چن چن کر ایک ایک چیز جمع کی۔ اس وقت غصے میں یاد بھی نہیں آ رہا تھا کہ کون سا سامان کہاں پڑا ہے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا

کر یوں اُٹھ کر جانا پڑے گا۔

سامان اکٹھا کر لینے کے بعد اس نے آئینے میں دیکھا۔ سارا کاجل بہہ گیا تھا۔ چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔

دُلہن کی بجائے وہ چڑیل لگ رہی تھی۔

اس نے غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے پانی سے مُنہ دھویا، تولیے سے صاف کیا اور ایک ہلکی سی کریم لگا لی۔

شرٹ شوٹ اتار کر ایک سادہ سُوٹ پہن لیا۔ اپنا کالا فر والا کوٹ اُٹھا کر کندھوں پر ڈالا۔

وہ اس قابل نہیں کہ اس کے گھر میں ایک پل بھی رہا جائے۔

کم ظرف...

تنگ نظر...

کور نگاہ...

گھٹیا... کمینہ...

عبد الکریم کو آواز دی۔ سامان اُٹھوا کر اپنی گاڑی میں رکھا۔ سوجی سوجی آنکھوں پر کالی عینک لگا کر باہر آ گئی۔

سارے ملازم آ کر لان میں کھڑے ہو گئے۔

ایک ایک کی نگاہ میں تاسف اور تعجب تھا۔

ہر ایک کا چہرہ سوال کر رہا تھا۔

بی بی! تم کہاں جا رہی ہو؟

مگر فلکی نے کسی کی طرف نہیں دیکھا

... وہ سب اس کے کیا لگتے تھے؟...

جو آدمی دل میں نہ رہ سکے، اسے قدموں میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔

گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی۔

فلکی نے دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

گیٹ کا چوکیدار پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔

حسبِ عادت اس نے گاڑی کو جاتا دیکھ کر ہاتھ سے سلیوٹ مارا مگر آج فلکی نے سر کی جنبش سے اسے جواب نہیں دیا۔

اور تو اور... گل چہو نے بھی بالا کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ کیونکہ فلکی نے آج کا سبق پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہا تھا کل... گل کتنا پڑھ لے گی... اور فلکی کا خیال تھا کہ چند دنوں میں قرآن ختم ہو جائے گا تو وہ ایک جشن کا اہتمام کرے گی۔

اس کا جشن چراغاں، گریۂ غم میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر کسی شناسا چہرے کی طرف نہیں دیکھا... یہ چہرے نہیں دیو تھے، عفریت تھے، جن کی طرف پلٹ کر دیکھنے والا خود سیاہ پتھر میں بدل جاتا ہے۔ وہ تیز رفتاری سے یوں رازدار "

سے نکل آئی جس طرح کوئی راز دل سے نکل جاتا ہے۔

"فلک بوس" میں فلکی کی آمد سے سب چھوٹے بڑے بے حد مسرور ہوئے۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ لوٹ رہنے کے لئے آئی تھی۔ نوکر چاکر بے حد خوش ہوئے ہر کوئی ملنے کو چلا آ رہا ہے... اور امی تو اسے اتنے ساز و سامان کے ساتھ دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ تیرا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟ آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں... اور آفاق ساتھ کیوں نہیں آیا؟

انسیں ماں کبھی کبھی کتنی بڑی

BLESSING

بن جاتی ہے۔ فلکی نے دل میں سوچا۔

ممی کی نگاہ کبھی اتنی گہری نہیں ہو سکتی کہ زندگی کے معاملوں میں دُور تک جائے۔

شاید لاشعوری طور پر ممی آفاق سے حسد کرنے لگی تھیں۔ آفاق نے فلکی کو ممی سے چھین لیا تھا۔

مگر فلکی نے تو کبھی کلب، میک اپ، رولز اور بیرونی ملکوں سے حسد نہیں کیا تھا۔ ممی ہمیشہ ان چیزوں کو فلکی پر ترجیح دیتی رہی تھیں۔

"کچھ دن آرام کرو میری جان... تمہارے نازک کندھوں پر بہت بڑا بوجھ پڑ گیا تھا ابھی واپس جانے کی ضرورت نہیں" ممی نے رات کو اس کے رُخسار چوم کر کہا۔

واپس کون کافر جا رہا ہے... اور وہ بھی دوبارہ اس جہنم میں۔ بڑی مشکل سے تو رہائی ملی ہے...

... کیا واقعی...؟

رات بھر وہ روتی رہی اور اپنے دل سے پوچھتی رہی۔

اب زندہ رہنے کا طریقہ یہی تھا کہ بھول کر بھی آفاق کے بارے میں نہ سوچے... سب روزن، دروازے بند کر دے اور میٹھی نیند سو جائے۔

دو چار دن تک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ روز رات کو نیند کی گولی ضرور کھا کر سوتی تھی۔ اور صبح اُٹھ کر روبوٹ کی طرح دو چار کام کر کے پھر سو جاتی تھی۔

مسلسل نیند کی گولیاں کھانے سے اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اب گولی نہ کھاتی تو رات بھر نیند نہ آتی۔

تب وہ بیٹھی بھولے بسرے نغمے سُنا کرتی۔

بھولے بسرے نغمے اسے کبھی بھی اچھے نہ لگتے تھے۔ یہ بالکل ایسا تھا جیسے جوانی میں کوئی دنیا ترک کر دے۔

لیکن اب پُرانے اور درد بھرے گیت سُن کر اس کے دل میں ہوک اُٹھتی تھی۔ بھلا پُرانے نغموں میں اتنا درد کیوں ہوتا ہے؟

اتنی بے چارگی اور اتنا سوز کیوں ہوتا ہے؟

کیا یہ گزرے ہوئے وقت کا نوحہ کرتے ہیں... یا گزری ہوئی عمر کو صدا دیتے ہیں۔

یا ان شکلوں کی یاد دلاتے ہیں جو کبھی زندگی میں آئی تھیں اور ہم نے انہیں حاصلِ زندگی کہا تھا۔

کمرے کے پردے گرا کر، دروازے بند کئے، دونوں تکیوں میں مُنہ چھپائے کئی روز سے فلکی ایک ہی گیت سُنتی جا رہی تھی۔ ممی کے زمانے کا گیت تھا اور ممی کی کبرڈ سے ہی وہ اُٹھا کر لائی تھی۔

اک دل کا لگانا باقی تھا، سو دل بھی لگا کے دیکھ لیا
تقدیر کا رونا کم نہ ہوا، آنسو بھی بہا کے دیکھ لیا

وہ بار بار سوچتی، آخر وہ یہ گیت کیوں سُنتی ہے، جب اسے گزرے زمانے کا ملال ہی نہیں تو... مگر پھر ہر بات کے جواب میں آنسو نکل آتے جو اس کی نرم پلکوں کو بھگو جاتے۔

اک بار بُھلانا چاہا تھا، سو بار وہ ہم کو یاد آیا
اک بُھولنے والے کو ہم نے سو بار بُھلا کے دیکھ لیا

....

اب تک تو ہمیں معلوم نہیں اس دل کی تمنا کیا ہے!
.... اس دل کی تمنائیں کیا ہیں!
.... اس دل کی تمنائیں کیا ہیں!
سو بار منا کر دیکھ لیا، سو بار مِٹا کر دیکھ لیا!

اور پھر فلکی دُھواں دھار رونے لگتی گیت ختم ہوتا تو نئے سرے سے لگا دیتی۔

وہ اتنا رو چکی تھی کہ اگر گیت کے الفاظ اس کے سامنے رکھے ہوئے ہوتے تو اب تک مِٹ گئے ہوتے۔

وہ آفاق کے لئے ہرگز نہیں روتی وہ بار بار اپنے دل کو تسلی دیتی۔

آفاق جیسے آدمی پر کیا رونا... رونا تو اسے اپنی تقدیر پر آ رہا تھا۔

اس نے آفاق کے دونوں رُخ دیکھ لئے تھے۔ اگر اس کے دل میں فلکی کا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو وہ اب فلکی کو قبول کر لیتا۔

لیکن وہ تو محض ایک کھیل رچا رہا تھا

... کیا اسے کھیل کہا جا سکتا ہے... اگر یہ کھیل تھا تو یہ فلکی نے شروع کیا تھا۔

وہ تو ہمیشہ فلکی سے دُور رہا... ہمیشہ متنفر۔ خیر... دُور رہنے کی تو بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

پھر بھی اس نے شرافت تو برتی۔

تو نے خود ہی اس سے آزادی مانگی تھی فلکی بیگم... ہر قیمت پر آزادی۔

وہ تو نفرتوں کے زمانے کی بات تھی اب وہ زمانہ گزر گیا تھا۔

لیکن اس نے وعدہ جو کر رکھا تھا۔

اگر وہ نہ نبھاتا تو تو اسے عہد شکن اور خود غرض کہتی۔

کاش وہ عہد شکن ہوتا۔ دل شکن نہ ہوتا...

وعدہ توڑ دیتا... میرا دل نہ توڑتا۔ وہ ایفائے عہد ہی کیا جو کسی کی زندگی ختم کر دے یہ سب باتیں تو اس کے سامنے بھی کہہ سکتی تھی۔

میں کیوں کہتی... اس کٹھور سنگ دل سے بھیک مانگتی۔ ہاں، اب تو بھیک مانگنا ہی رہ گیا تھا۔

بھیک ہی مانگ کر دیکھ لیتی۔ یہ ذرا سی انا بچا کر کیوں لے آئی ہو؟

میں بھی آخر گوشت پوست کا انسان ہوں۔ فٹ بال نہیں ہوں کہ ہر وقت ٹھوکر ماری جائے۔ وہ اتنا تو کہہ سکتا تھا کہ بھئی میں اپنے وعدے پر قائم ہوں... اب آگے تمہاری مرضی۔

اس نے تو حکم صادر کر دیا جیسے کہ وہ خدا ہو اور لوگوں کی تقدیر پر قدرت رکھتا ہو۔

اپنی ذات پر اسے کس قدر گھمنڈ ہے۔

ٹھیک ہے، پہلے میں بُری لڑکی تھی۔ میں نے بہت سی بُری حرکتیں کی تھیں۔

مگر بعد میں اسے اس کی پسندیدہ لڑکی بن کر تو دکھایا تھا۔ اسے میری نفرت اور رعونت کا پتہ چل گیا تھا... میری محبت کو کیوں نہ پہچان سکا؟

کیا وہ عقل کا بھی اندھا ہے؟

زندگی بھر اس کا نام نہیں لوں گی۔

اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔

اس نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟

اب میں اس کے چنگل سے آزاد ہوں، جو جی چاہے گا، کروں گی اور جہاں جی چاہے گا، جاؤں گی۔ میں نے اپنی آزادی کی پوری پوری قیمت ادا کی ہے۔

ایک شام کو ممی بن ٹھن کر اس

کے کمرے میں آگئیں اور بولیں۔

"آج کلب میں ایک میوزیکل کنسرٹ ہے۔ کیا تم چلو گی؟"

"نہیں ممی! میرا دل نہیں چاہ رہا، پلیز..." فلکی نے بیزاری سے کہا۔ "میں تھک گئی ہوں۔ یہاں آرام کرنے کے لئے آئی ہوں۔"

"اوہ، ڈیر... ذہنی سکون کے لئے موسیقی اور تفریح دونوں کی بہت ضرورت ہے گھر پر پڑی پڑی مرجھا جاؤ گی۔"

"ممی... مجھے ساتھ جانے پر مجبور نہ کریں۔ میرے پاس سننے کو بہت سے ریکارڈ ہیں۔"

"بے وقوف... زندہ موسیقی چیز ہی مختلف ہوتی ہے... اور یہ کیا تم سارا وقت بوڑھے بوڑھے ریکارڈ سنتی رہتی ہو۔ ہمیشہ جوان رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ترنگ سے بھری ہوئی موسیقی سنی جائے۔"

"ممی! آپ یقین کریں کہ مجھے آپ کی کلب پارٹیوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے فلکی... مائی ڈیئر تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو۔"

"ہر لڑکی شادی کے بعد بدل جاتی ہے ممی۔" اس نے جل کر جواب دیا۔

"مگر تم تو بالکل ہی مردہ دل ہو گئی ہو... ذرا اپنی شکل دیکھو، آئینے میں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، رنگ زرد اور میلا ہو گیا ہے آنکھوں کے گرد لائنیں پڑ گئی ہیں جسم ڈھیلا ہو گیا ہے.... مائی گاڈ! اس عمر میں تمہارا یہ حلیہ ہو گیا ہے ابھی تو بچہ بھی نہیں ہوا۔ ذرا دیکھو میں تم سے زیادہ فریش لگتی ہوں۔"

فلکی نے نظر اٹھا کر ممی کے چہرے کو دیکھا۔

ممی واقعی بہت جوان اور تر و تازہ لگ رہی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ فلکی کی بڑی بہن معلوم ہو رہی تھیں.... سال کے تین سو پینسٹھ دن وہ اپنے نخرے اور اپنی کارصیاں رکھنے میں گزارتی تھیں۔ احساس جیسی کوئی شے ان کے پاس نہیں تھی کسی کی خاطر جینا انہیں آتا ہی نہیں تھا۔

دوسروں کو اپنے لئے مارنے کے عادی تھیں۔

وہ صرف اپنے لئے جیتی تھیں اس لئے خوش باش تھیں۔

کاش! مجھے بھی ممی جیسا ملا ہوتا.... فلکی نے آہ بھر کر سوچا۔

کچھ جانے بنا ہی جیون گزر جاتا۔

"تم کل تیار رہنا۔ میں تمہیں سوزانہ بیوٹی کلب میں لے چلوں گی۔ فیشل کراؤں گی۔ صبح صبح ایکسرسائز کیا کرو، جسم کا کساؤ ہونا چاہئے۔ زیادہ تر جوس پیا کرو۔ بہتر ہو گا اگر نہار منہ ایک لیموں پانی میں نچوڑ کر پیو۔"

"توبہ ہے۔"

فلکی، ممی کے لیکچر سے عاجز آ گئی۔ ممی کو تو "بیوٹی کلینک" کھول لینا چاہئے۔ یہ ممی کا دل پسند موضوع ہے۔

"اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے"

"آج کل شہد کا ماسک بھی تمہارے لئے ٹھیک رہے گا۔"

"ممی پلیز... آپ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

عاجز آ کر فلکی نے کہا۔

"ہاں، میں چلی جاتی ہوں۔ میں بھی لیٹ نہیں ہونا چاہتی مگر تم اپنا دھیان رکھو۔ تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتیں (اور جیسے آپ تو جانتی ہیں) مرد بڑا ہرجائی بھونرا ہے۔ پھول میں رس نہ رہے تو فوراً اڑ جاتا ہے (اور بعض اوقات رس دار پھول پر بیٹھتا ہی نہیں)۔ مجھے دیکھو... میں نے اپنے سدا بہار حسن اور تر و تازگی کی وجہ سے تمہارے ڈیڈی کو اپنا... یعنی تم سمجھ رہی ہو نا؟ آج تک انہوں نے کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔" (مگر ان کی نگاہ میں کیسی بے چارگی ہے)

وہ ہنس پڑیں "یہ سب عورت کی مجبوریاں ہیں۔ جان، تم ان باتوں کا خیال رکھو۔ نازلی صدر الدین کی بیٹی کو بھی سدا بہار ہونا چاہئے۔ ایک تو تم نے اتنی جلدی شادی کر لی... اوپر سے بالکل روایتی عورت بن گئی ہو۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"

فلکی چپ بیٹھی رہی۔

ممی اداسے کھڑی ہو گئیں۔

"وہ تمہاری دوست ٹینا بھی امریکہ سے آئی ہوئی ہے۔ روز تمہیں پوچھتی ہے جب سے پاکستان آئی ہے، ہر شام کلب آتی ہے۔ کسی دن اس سے ملنے کے لئے ہی چلو۔"

"چلوں گی ضرور چلوں گی... مگر آج نہیں... ابھی کچھ دن آرام کروں گی۔"

"اوہ یس..." ممی جاتے جاتے مسکرا گئیں۔

توبہ ہے۔ فلکی نے دل میں سوچا ممی چاہیں نہیں تھکتیں۔

"مگر ڈارلنگ! تمہارے بال کتنے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک چٹیا کے ساتھ تم کافی سوبر اور افسردہ لگتی ہو۔ پامیلا کے پاس بہت سے نئے اسٹائل آئے ہیں جا کر اپنا نیا ہیئر کٹ کراؤ۔ کیا واہیات شکل بنا رکھی ہے۔ جیسے کوئی بڑھیا آئی ہو۔"

"اچھا... ممی، اچھا..."

بڑی مشکل سے ممی نے پیچھا چھوڑا ممی نے کبھی وہ نصیحت نہ کی جو زندگی کے لئے ضروری تھی۔

یہ بال....

یہ بال کیوں زندگی کے معاملوں کے بیچ میں آ گئے۔

اس نے اپنی لمبی چٹیا ہاتھ میں پکڑ لی... اور اپنے رخساروں کے ساتھ لگا لی اب بھی اس میں مہک آ رہی تھی۔

ممی سمجھتی ہیں، ایک چٹیا بنانے سے میری شکل افسردہ لگتی ہے۔

واہ میری ممی.... زندہ باد۔

افسردگی کا کوئی جواز بھی تو ممی کے پاس نہیں ہے۔

ایک عورت حسین ہو.... دولت مند ہو، دنیا کی کسی نعمت کی کمی نہ ہو تو اسے ہمیشہ خوش رہنا چاہئے... ہے نا ممی؟

مگر آپ جیسی بے حس خاتون کی بیٹی اتنی حساس کیوں ہوئی؟ آپ اپنی ساری دولت دے کر اس سے احساس کی یہ سلگتی ہوئی بھٹی چھین لیں نا۔

تبھی تو سب کچھ ہوتے ہوئے سر راہ یوں لٹ لٹا کر بیٹھی ہے جیسے سفر کے پہلے پڑاؤ ہی پر کوئی راہزن، آخری پونجی تک لوٹ کر لے گیا ہو۔

ہاں، اب اس کے پاس ہے کیا؟ ان لمبے بالوں کے سوا۔

یہ بال تو اس نے اس دشمن جاں کے لئے بڑھائے تھے جس نے ایک دن ذرا کی ذرا بالوں کو چھو لیا تھا۔

بالوں کو چھو لیا تھا...

آسمان کو تو نہیں چھو لیا تھا۔

مگر وہ اس آسمان پر ضرور پہنچ گئی تھی جس پر کہکشاں چمکتی ہیں اور نظارے جنم لیتے ہیں۔

ایک چیز تو اسے اس کی پسند آئی تھی۔ وہ اپنی چٹیا کلیجے سے لگائے بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم اسے غصہ آ گیا۔ کیوں.... کیوں آخر؟

اس کی خاطر کیوں؟ وہ میرا کون ہوتا ہے؟ اسے میری کس بات کا احترام تھا؟ میں اپنی زندگی سے اس کا نشان تک مٹا دوں گی۔

کوئی ایسی یادگار نہیں رکھوں گی۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

دراز کھول کر کار کی چابی نکالی اور باہر آ گئی۔

سیدھی "پامیلا ہیئر فیشن" پہنچی۔ وہ ایک عرصے سے پامیلا سے بال کٹوا رہی تھی وہ اس کی پسند اور ناپسند کو جانتی تھی وہ جانتی تھی کہ فلکی کو چٹیا سخت ناپسند ہے وہ فلکی کے اتنے لمبے بال دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔

اس نے جب فلکی کے کندھوں پر تولیہ بچھا کر اس کے سنہری بال پھیلائے تو فلکی جی جان سے لرز گئی۔

اتنے خوبصورت بال پورا ایک سال لگا تھا انہیں بڑھانے میں.... کس کس مرحلے سے نہ گزرے تھے یہ بال۔ انہوں نے معطر بستر پر محبت کی چھاؤں میں کر اس ستمگر کے کندھوں پر بکھر جانا چاہا تھا...

مگر ان کے مقدر میں یہ گندہ فرش تھا جس پر پامیلا انہیں کاٹ کاٹ کر پھینک رہی تھی۔

ہر بار، جب وہ قینچی سے لٹ کاٹ کر نیچے پھینکتی فلکی کو یوں محسوس ہوتا قینچی اس کے دل پر چلی ہے۔

اس کا دل چاہتا کہ وہ پامیلا کا ہاتھ روک لے اور اسے کہے۔

خدا کے واسطے...

خدا کے واسطے، ان بالوں کو اس طرح پامال نہ کرو۔

یہ تو بڑے مقدس بال ہیں....

اور بڑے معطر جذبوں کے ساتھ پالے گئے ہیں۔

یہ بال، میری آبرو ہیں۔

اور اس قدر ناشناس کی آنکھ ڈھیل ان کو کاٹ کر... گندی زمین پر قدموں تلے نہ پھینکو۔

یہ رات بھر میرے ساتھ خوبصورت بستروں پر سوئے ہیں۔

مگر اس نے اپنی ہر چیز اپنے سینے میں دبا لی۔ یوں بیٹھی رہی جیسے کوئی اپنا قتل اپنے ذبح ہونے کا تماشا دیکھتا ہے۔

سارے بال کٹ گئے تھے اور ان کا ڈھیر زمین پر پڑا تھا آج اسے اس ڈھیر پر بے حد پیار آ رہا تھا۔

وہ آئینے کے آگے بیٹھی اپنا نیا اسٹائل نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ کرسی کے پیچھے پڑے ہوئے سنہری ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو کسی ٹوٹے ہوئے دل کی طرح مردہ پڑا ہوا تھا۔

جب صفائی والا لڑکا برش لے کر فرش سے وہ بال صاف کرنے کے لئے آگے بڑھا تو فلکی چیخ اٹھی۔

"پاسیلا، پلیز... میرے سارے بال اکٹھے کر کے مجھے دے دو۔"

"کیوں....؟ پہلے تو تم نے کبھی نہیں مانگے تھے؟"

"اب دے دو پلیز... مجھے ان کی ضرورت ہے۔"

"مجھے بتاؤ، میں خود تمہیں ان کا اچھا سا ہیئر پیس بنوا دوں گی۔"

"نہیں نہیں، مجھے اسی طرح میرے سارے بال دے دو۔"

پاسیلا نے سارے بال جمع کئے اور پھر انہیں پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کر فلکی کو تھما دیا۔

وہ لفافہ گود میں رکھ کر فلکی یوں موٹر چلاتی رہی جیسے اس کا ننھا بچہ گود میں سویا ہوا ہو۔

گھر آ کر وہ جھپ سے اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

لفافہ کھول کر وہ سارے بال اپنے آگے پھیلا لئے۔

فلکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اب اس کے پاس آفاق کی کوئی بھی نشانی نہیں رہ گئی۔

آج آفاق، اس کے وجود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا ہے۔

اس نے آئینے میں چہرہ دیکھا۔

کیسی اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔

یہ وہ فلکی تو نہ تھی۔

یہ لڑکی کون تھی۔

اف.... میں اب اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتی۔

فلکی نے کٹے ہوئے بالوں پر چہرہ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہاں "فلک بوس" میں رہنا تو اور بھی کٹھن لگ رہا تھا۔ خصوصاً پہلا ہفتہ تو بڑا صبر آزما تھا۔ سارا دن کمرے میں پڑی چائے پیتی رہتی یا درد بھرے گیت سنتی رہتی۔ نہ منہ دھونے کو دل چاہتا نہ کپڑے بدلنے کو۔

ممی آتے جاتے اسے کوئی نہ کوئی لیکچر ضرور دے جاتیں۔

.... اور پھر اسے اپنے گھر میں کام کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

گو وہاں ملازم بھی آ گئے تھے مگر علی الصباح ہی آفاق کے دفتر جاتے ہی وہ کام میں لگ جاتی۔ سلیمہ کے ساتھ مل کر خود صفائی کرواتی پھر باورچی خانے میں جا کر عبدالکریم کو سارے دن کا مینو سمجھاتی آفاق کے لئے کوئی چیز اپنے ہاتھ سے بنا کر رکھ دیتی۔ کبھی پھول توڑ کر کمروں میں سجاتی۔ کبھی مشین لے کر کپڑے سینے بیٹھ جاتی

کبھی نئی کتابیں خرید کر لائبریری میں سجایا کرتی۔

غرض شام تک وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتی تھی۔ جب آفاق گھر میں ہوتا تو کئی چکر باورچی خانے کے لگا لیتی۔

اور اب یہاں جب سے آئی تھی اپاہج پڑی ہوئی تھی۔ یوں تو وقت نہیں گزرے گا۔

اس نے سوچا کہ وہ یہاں بھی گھر کا کام شروع کر دے۔

پہلے دن جب وہ باورچی خانے میں گئی تو سارے نوکر اس کے پیچھے پڑ گئے

"ننی بی بی! آپ کیوں یہاں آ گئی ہیں۔ جی، ہم کس لئے ہیں جی؟"

"رمضو! باورچی خانے کی حالت دیکھی ہے؟"

ایک دن وہ باقاعدہ رمضو کے سر پر سوار ہو گئی۔

"یہ باورچی خانہ ہے یا کباڑ خانہ.... اگر کوئی یہ باورچی خانہ دیکھ لے تو ہمارے گھر سے کچھ کھائے بغیر اٹھ کر چلا جائے گا۔"

رمضو حیرت سے فلکی کی صورت دیکھنے لگا۔

یہ وہی باورچی خانہ ہے جس کا پکا کھا کر فلکی بی بی اتنی بڑی ہوئی تھی اور آج وہی باورچی خانہ برا لگ رہا تھا۔

"میری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟ اس باورچی خانے کو دیکھو۔

دیکھو فرش کتنا گندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے صدیوں سے اس چولہے اور اوون کو صاف نہیں کیا گیا اور چولہے کے پیچھے کیا ہے کالا کالا... نکالو، اسے... اف اللہ! میلے جھاڑن.... اچھا تو انہیں سیاہ کر کے چولہے کے پیچھے ڈھیر کرتے جاتے ہو۔ دھونے کی بجائے یہیں اور یہ جل جاتے ہیں...."

"اور ذرا الماریاں اندر سے دیکھو۔"

اس نے باری باری ساری الماریاں کھول دیں۔ کتنا عرصہ ہوا، انہیں صاف کئے.... اور یہ کیا ہے؟.... ٹوٹے ہوئے برتنوں کا ڈھیر.... اچھا تو جو برتن ٹوٹ جاتے ہیں انہیں اس طرح چھپا دیا جاتا ہے۔ چلو جی، برتن تو ٹوٹ ہی جاتے ہیں کیوں کہ ملازموں کے ہاتھ ہمیشہ لوہے کے ہوتے ہیں۔ مگر کیا ٹوٹے ہوئے برتن باہر پھینکنے میں بھی پیسے لگتے ہیں؟

ذرا اپنی دیگچیاں دیکھو۔ مجھے معلوم ہے تم ایک سو روپے کلینزر

CLEANSERS

کے کھاتے میں دکھایا کرتے ہو تو کیا ان دیگچیوں کے تلے صاف نہیں رکھ سکتے کبھی کسی نے اسٹیل کی دیگچیاں بھی سیاہ کی ہیں۔ ظاہر ہے جب تم اسٹیل کو زیادہ آنچ دیتے ہو تو وہ جل جاتا ہے تو پھر تمہیں ان دیگچیوں کو مانجھ کر صاف بھی کرنا چاہئے..... اور اس بیسن کو دیکھو۔ اس میں سے بو آ رہی ہے۔ برتن دھونے کے بعد اسے گرم پانی سے مانجھتے ہو؟ اس کی نالیوں پر گرم پانی کی دھار مارتے ہو؟ اگر ایسا نہیں کرتے تو برتنوں کا جمع ہوا گھی کس طرح نالیوں سے نکلے گا؟ ایک دن گٹر بند ہو جائے گا اور تم صرف کھلوانے کے دو سو روپے مانگ لو گے۔

"پیسے جو جلدی مل جاتے ہیں اس گھر میں...."

"میں کہتی ہوں جلدی یہ سارا باورچی خانہ صاف کرو۔ اس طرح چمکا دو جیسے ابھی نیا بنایا ہے۔ کل سے میں خود ہی باورچی خانے میں آ کر کام کیا کروں گی۔ یاد رکھو، اگر باورچی خانہ گندہ ہو تو کھانے میں لذت نہیں ہوتی۔"

رمضو کو ہدایت دے کر وہ لان میں نکل گئی۔

آج دھوپ کافی چمک دار تھی۔

مالی دھوپ میں آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ اس کا ٹرانسسٹر ریڈیو دور پودوں کی آڑ میں پڑا پوری آواز میں بج رہا تھا۔

"میرے سجناں نوں ڈولی بدامی رنگ دی"

فلکی نے مالی کو دو تین آوازیں دیں مگر ریڈیو اتنی اونچی آواز میں چنگھاڑ رہا تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔ فلکی خود چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

مالی نے جب فلکی کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سگریٹ دور پودوں میں پھینک دیا اور ہاتھ ملتے پہلے جا کر سلام کیا۔

"آج کل کیا کر رہے ہو قادر بخش؟"

"جی...." مالی سمجھ نہیں سکا اور بے وقوفوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"پہلے اس مصیبت کو بند کر کے آؤ۔" فلکی نے ریڈیو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ مالی دوڑتا ہوا گیا اور ریڈیو بند کر دیا۔

"تم سارا دن ریڈیو سنتے ہو یا کوئی کام بھی کرتے ہو؟"

"ریڈیو تو آن جی، ایسے ہی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے لگا لیا ہے۔ کام کر رہا ہوں جی...."

"کیا کام کر رہے ہو؟"

"ابھی یہ گراؤنڈ صاف کیا ہے جی۔"

"یہ گراؤنڈ صاف کیا ہے تم نے؟ ہر طرف کہر سے جلے ہوئے پتے بکھرے پڑے ہیں۔ گھاس کی رنگت تو دیکھو۔"

"کیا کریں بی بی جی؟ اتنا کہر پڑ رہا ہے کہ پودے اور گھاس آپ ہی آپ جل جاتے ہیں"

"تم مالی ہو، تم جانتے ہو، پودوں کو کس طرح کہر سے محفوظ رکھنا چاہئے؟"

"جی... جی...."

"یہ جو تم نے نئے پودے لگائے تھے، ان پر سرکنڈوں کی جھاڑیاں کیوں نہیں لگائیں؟ آڑو، الوچے سب جل جائیں گے۔ بہاروں میں ان میں شگوفے کیسے پھوٹیں گے"

"جی لگا دوں گا جی"

"تمہیں معلوم ہے اس موسم میں کون سے پھول لگائے جاتے ہیں؟"

"جی کیا فائدہ لگانے سے، سردی سے سب جل جائیں گے۔"

"سب نہیں جلتے، اس موسم کے خاص پھول ہوتے ہیں۔ میں تمہیں پرچے پر نام لکھ دوں گی۔ کل نرسری میں جانا اور نئی پنیری لے کر آنا۔"

"اچھا جی۔"

"اس موسم میں مختلف قسم کی گھاس لگائی جاتی ہے۔ وہ تو سارا سال رہتی ہے سدا سہاگن کے پودے لگاؤ۔"

"اچھا جی۔"

"وہ دیسی گلاب کیا ہوئے؟"

"وہ تو جی... بس جی... بیگم صاحب باہر تھیں نا... تو جی، جل گئے۔"

"بیگم صاحب باہر تھیں تم تو باہر نہیں تھے نا؟ بس بیٹھے رہتے ہو گے ریڈیو کے قریب... سب کو تم نے بگاڑ دیا ہے.... اب جاؤ، نرسری سے دیسی گلاب کی قلمیں لاؤ۔ یہی موسم ہے لگانے کا اور ہاں گلابوں کا ایک تختہ بھی لگا دینا۔"

"جی اچھا حضور۔"

"اور اب ہر روز میں آ کر کام کی جانچ پڑتال کیا کروں گی.... سمجھے۔"

"اچھا جناب۔" مالی نے سر جھکا لیا۔

اور دل میں سوچنے لگا جب چھوٹی بی بی، اس گھر میں ہوا کرتی تھی تو اسے اس وقت گراؤنڈ کا اتنا خیال نہیں تھا۔ اب یکایک یہ پودوں میں دلچسپی کیسے لینے لگی ہے؟

"گراؤنڈ میں روز مشین چلایا کرو۔"

"اچھا حضور..."

"درختوں کے نیچے جتنے پتے گرے ہوئے ہیں، ایک گڑھا کھود کر ان کو اس میں جمع کرتے رہو اور ان کی کھاد بناؤ موسم بہار میں کام آئے گی۔"

"بہت اچھا جناب...!"

"اور..." فلکی جانے جانے رک گئی۔ "کام کے وقت ریڈیو مت لگایا کرو... اور ہر روز شام کو مجھے کام کی رپورٹ دیا کرو۔"

"بہت اچھا حضور!"

اس کے جاتے ہی مالی نے سکون کا سانس لیا۔

گیٹ پر سے گزرتے ہوئے وہ رک کر ڈرائیور کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگی۔

ان کے گھر میں دو بڑے گیراج تھے جن میں بیک وقت چار موٹریں آگے پیچھے کھڑی ہو سکتی تھیں مگر وہاں اب تین موٹریں کھڑی تھیں۔

ایک ڈیڈی کی سیاہ مرسیڈیز تھی دوسری ممی کی کتھئی رنگ کی شیورلیٹ امپالا تھی اور تیسری ہلکے سبز رنگ کی ٹیوٹا کرولا جو انہوں نے فلکی کو جہیز میں دی تھی... اور جسے فلکی اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔

ڈرائیور نے ممی کی کار کا کیسٹ ریکارڈر چلایا ہوا تھا اور مزے سے اندر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

وہ سب موٹریں صاف ہو چکی ہیں مکھن خان!" اس نے آگے بڑھ کر بلند آواز سے پوچھا۔

مکھن خان نے آواز فوراً آہستہ کر دی اور کار سے نکل آیا۔

"جی سر...!"

"وہیل کیپ تو ساری گاڑیوں کے گندے نظر آ رہے ہیں۔ ذرا میری موٹر کا اندرونی حصہ دیکھو۔ جب میں آئی تھی تو میری موٹر چم چم کر رہی تھی۔ تم نے کبھی محنت سے صاف نہیں کیا۔ کھڑی کھڑی ہی گندی ہو گئی ہے۔"

"یہ دیکھو ڈیڈی کی موٹر کی اسٹیل کے کور کس قدر میلے ہو رہے ہیں۔ انہیں ڈرائی کلین کیوں نہیں کرواتے؟"

"بیگم صاحبہ جب آرڈر کریں گی تو دھلوا دوں گا جناب۔"

"تمہیں خود نظر نہیں آتا کہ جب کور میلے ہو جائیں تو اتار کر دھلنے کو دے دو اور ممی سے پیسے لے لو۔"

"اور ادھر دیکھو ممی کی گاڑی کے پیچھے جو گلدستہ رکھا ہوا ہے اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے... کیسے ٹوٹی یہ؟"

"یہ گاڑی تو کسی نے شادی پر مانگی تھی۔ واپسی پر گلدستے کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ شاید ان کے بچوں نے توڑ دی۔"

"اس ٹوٹے ہوئے گلدستے کو نکال کر باہر پھینک دو۔"

"جی، آرڈر کے بغیر میں ایسی حرکت کیسے کر سکتا ہوں!"

"اسے آرڈر ہی سمجھو۔"

"کام کے وقت ریڈیو مت لگایا کرو۔ صبح صبح آ کر سب سے پہلے گاڑیاں دھویا کرو۔"

"جی بہت اچھا۔"

تمام ملازمین حیران تھے کہ فلکی بی بی کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر بات میں نقص نکالنے لگی ہے خود ممی پریشان تھیں انہیں فلکی کے چڑچڑے پن کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کبھی کھانے کی میز پر بیٹھی خود ہی پھلکا لینے چل دیتی...

...اور ممی کو آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ اونچی آواز میں خانساماں کو ڈانٹ رہی ہوتی "ذرا دیکھو یہ روٹی پکائی ہے تم نے پھلکے پر کبھی کالے پھول نہیں ہونے چاہئیں۔ تمہیں پھلانے کا طریقہ نہیں آتا کہیں سے کچا ہے کہیں سے جلا ہوا ہے"

ایک روز ڈیڈی نے فرمائش کر کے کھیر پکوائی تھی۔

ممی تو ایک چمچ کھاتے ہی واہ واہ کرنے لگیں۔

فلکی نے جب کھیر کھائی تو رمضو کو بلایا اور پوچھنے لگی

"کیا یہ کھیر ہے؟ ایسا لگتا ہے چاول ابال کر دودھ میں ملا دئیے ہوں۔ نہ خوشبو ہے، نہ ذائقہ کیا الائچیاں ڈالی تھیں۔ اس میں تم نے؟"

"نہیں سرکار..."

"کھیر اور کسٹرڈ میں الائچی ہی سے امتیاز ہوتا ہے اتنے بڈھے ہو گئے ہو اور ابھی تک تمہیں پتہ نہیں چلا..."

"کل میں خود کھیر پکاؤں گی۔" فلکی نے کہا۔

"جانی، تم کیا ترد کرتی پھرو گی۔ پھر کبھی سہی" ممی نے جلدی سے کہا۔

"نہیں ممی! میں ان خانساماں لوگوں کو کھانا پکانا ضرور سکھاؤں گی"

ممی نے ماتھے پہ بل ڈال لئے...

اب ان کی اکلوتی بیٹی خانساماں گیری کرے گی...

اور... فلکی مسکراتے ہوئے میز سے اٹھ گئی۔

کبھی دوپہر کے کھانے پر وہ کہتی۔

"رمضو... یہ سالن کا رنگ اتنا کالا کیوں ہے؟"

"کالا تو نہیں ہے سرکار!"

"تو پھر کیا ہے؟ اس میں کون سی سبزی ڈالی ہے؟"

"سرکار گوبھی ہے۔"

"اور گوبھی کی تم پیشکش بنا کر لائے ہو! گوبھی ہی تو ایک ایسی سبزی ہے جب تک اس کے پھول اور رنگت اصلی حالت میں نہ رہیں تو اسے کھانے کا مزہ نہیں آتا۔"

کسی دن شامی کباب میں نقص نکال دیتی۔

"دیکھو رمضو... جب تک قیمہ اچھی طرح پک نہ جائے اسے پیسا نہ کرو ورنہ کچے قیمے کی باس آتی رہتی ہے اور کباب کے اندر مصالحہ بھرا کرو۔"

"میاں کیسی بدھوؤں والی باتیں کرنے لگی ہو تم" ممی چڑ کر کہتیں "تم میں سے مرچ مصالحے کی بو آنے لگی ہے... اوہ، سویٹ ہارٹ! خوشبوؤں کی بات کرو پھولوں کی بات کرو۔"

"ممی! کھانے کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ جب تک کھانے کی رنگت اور خوشبو ٹھیک نہ ہو، کھانے کا مزہ نہیں آتا۔ ویسے تو دنیا کے سب لوگ کھانا کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں۔ مگر کھانے کا بھی اپنا اپنا سلیقہ ہوتا ہے۔"

"اوہ، ڈارلنگ! تم ہمیشہ اس گھر کا کھانا کھاتی رہی ہو۔ اب تمہیں اس میں نقص نظر آنے لگے ہیں۔ کیا تم نے

COOKING

کا کوئی خاص کورس پاس کر لیا ہے۔ پوچھوں گی اس آفاق کے بچے سے... اس نے میری بیٹی کو باورچن بنا دیا ہے۔"

"کوئی کسی کو کچھ نہیں بنا سکتا ممی!" فلکی نے چڑ کر کہا۔ "یہ تو اپنے شوق کی بات ہوتی ہے۔"

"میں نے گھرداری پر بے شمار کتابیں پڑھی ہیں... اور پریکٹیکل بھی کیا ہے۔ جو بات دل کو اچھی لگے، قبول کر لینی چاہئے۔"

حقیقتاً اسے اس وقت آفاق کا تذکرہ ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

دن میں ایک بار وہ کچن میں ضرور جاتی۔ پھر سارے نوکروں کی شامت آ جاتی۔

"اسٹین لیس اسٹیل کی کشتری کو دھوتے ہی فوراً کپڑے سے خشک کرنا چاہئے، ورنہ اس پر پانی کے داغ رہ جاتے ہیں۔"

"شراب کا کور روز بدلا کرو۔ کبھی کبھی اس کے پیچھے بھی صاف کیا کرو۔"

"تم چائے کس طرح دم دیتے ہو رمضو؟"

"جس طرح ہمیشہ دم دیتا رہا ہوں۔" وہ سر جھکا کر کہتا۔

"نہیں وہ طریقہ غلط ہے" رمضو حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگ جاتا۔

"پہلے چائے دانی کو اچھی طرح صاف کرو۔ پھر کھولتا ہوا پانی ڈال کر چائے دانی کو اندر سے گرم کر لو اسی طرح گرم گرم چائے دانی میں دو چمچ چائے کی پتی کے ڈالو اور اس پر ڈھکنا لگا دو تا کہ پتی کو دم آ جائے۔ اس کے بعد کھولتا ہوا پانی ڈال کر اوپر ٹی کوزی لگا دو... اور ہاں، ایک اور بات یاد رکھو چائے کا پانی نہ تو کچا ہو اور نہ بہت زیادہ ابلنے پائے۔ سمجھ گئے؟"

"جی سمجھ گیا سرکار...!"

"ذرا اس چاندی کی چائے دانی کو دیکھو... کس طرح سیاہ ہو رہی ہے... کتنے خوبصورت برتن ہیں، اس گھر میں۔ مگر سب تباہ ہو چکے ہیں۔"

"بی بی... کیا کریں! یہ تو چاندی ہے، کالی ہو جاتی ہے۔"

"تو کیا تم ہر ہفتے اسے چمکا نہیں سکتے؟... اتنا خرچ ہوتا ہے اس گھر میں۔ سلاد کے لئے روز لیموں آتے ہیں۔ ایک لیموں کاٹ کر اس پر ملو دیکھو کس طرح سفید ہوتی ہے۔"

"اچھا، سرکار!"

رمضو منہ لٹکا کر چلا جاتا بعد میں ضرور سوچتا کہ ممی بی بی کی شادی تو ایک بہت بڑے آدمی کے ساتھ ہوئی تھی مگر یوں لگتا ہے جیسے کسی خاندانی خانساماں کے ساتھ رہ کر آئی ہو۔

یہی حال سارے ملازموں کا تھا کوئی اس سے خوش نہیں تھا۔

ایک روز ممی اپنے چہرے پر شہد کا ماسک لگائے، سر پر بجلی کے بیوٹی لگائے، اس روم میں بیٹھی اپنی ٹانگوں پر زیتون کے تیل کا مساج کر رہی تھیں کہ فلکی آ گئی۔

"کیا بات ہے زندگی؟"

[illegible]

چلے گئے ہیں۔"

"ان کا دل نہیں چاہ رہا ہوگا۔"

"یہ بات نہیں ہے ممی!"

"تو کیا بات ہے؟"

"رمضو سے انڈے ٹھیک سے نہیں بنائے گئے، چائے بھی بہت پہلے دم دے دی تھی۔ ٹھنڈی ہو چکی تھی رات کو مکھن اس نے ڈیپ فریزر میں رکھ دیا تھا۔ صبح کو پتھر ہوا پڑا تھا۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے جان؟... نوکروں سے اس قسم کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔"

"ممی پلیز... آپ ڈیڈی کا خود خیال رکھا کریں۔"

"تو کیا تمہارے ڈیڈی بچے ہیں؟"

"یہ بات نہیں ممی... آخر بیوی کس لئے ہوتی ہے؟"

"بیوی اور نوکرانی میں بہت فرق ہوتا ہے ڈارلنگ... تمہارے ڈیڈی کی ایسی ہی عادتیں ہیں وہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔"

"ممی، آپ کے کسی تو کچھ فرائض ہوں گے؟"

"ہماری شادی کو پچیس سال ہو گئے ہیں اور ہم اسی طرح خوش ہیں۔ اب تم ہماری زندگی میں بے سکونی پیدا کرنا چاہتی ہو۔"

"ممی... ممی، پلیز! سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"اوہ ڈیئر" ممی نے تیل کا ڈبا اٹھا کر اپنے ہاتھ پر تیل ڈالا۔

"پتہ نہیں کیوں آج کل تم BITCHY ہو رہی ہو؟ یہ FRUSTRATION کیوں پیدا ہو گئی ہے تم میں؟... ہر نوکر کو ڈانٹ دیتی ہو۔ جانتی ہو آج کل نوکروں کا ملنا کتنا مشکل ہے... اور یہ سارے پرانے ملازم ہیں۔ یہ اتنے عرصے سے ٹکے ہوئے ہیں۔ اب تم انہیں نکالنے کے درپے ہو۔ آخر تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"ممی، میں کسی کے رزق پر لات مارنا نہیں چاہتی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ سب لوگ سلیقے سے کام کریں۔ نمک حرامی نہ کریں جتنے پیسے لیتے ہیں، اتنی محنت بھی کریں۔"

"ملکی سب ٹھیک چل رہا ہے تمہیں ہی کچھ ہو گیا ہے۔"

"ممی... آپ کو سب ٹھیک لگتا ہے... تعجب ہے... نوکر آپ کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے"

"تو پیسہ کس لئے ہوتا ہے جان... اپنے آرام کے لئے ہوتا ہے نا؟"

"ممی، محنت کے بغیر آرام کب اچھا لگتا ہے۔"

"میں تو کم از کم آرام سے ہوں..." ممی نے پھر اپنے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔

"آپ ذرا گھر کے کاموں میں دلچسپی لے کر دیکھیں ڈیڈی کی خدمت کر کے دیکھیں۔ آپ کو ایک نیا سرور محسوس ہوگا۔"

"یہ باتیں میں نے تو تمہیں نہیں سکھائی تھیں۔ کہاں سے سُن کر آئی ہو؟"

"ممی... زندگی نے سکھائی ہیں۔"

"ارے واہ... جمعہ جمعہ آٹھ دن ابھی تم نے زندگی کو کہاں دیکھا ہے؟"

"بہر حال، زندگی بے حسی کا نام نہیں ہے ممی!"

"خوش باش کہ تم بے حسی کہتی ہو، میں خوش رہتی ہوں... خوش رہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا آپ نے سوچا ہے کبھی کہ آپ کے اس رویے سے ڈیڈی کبھی خوش ہیں یا نہیں۔"

"ان کو بھی خوش ہونا چاہیے۔"

"یہ تو آپ نے فرض کر لیا ہے۔"

"نہیں، میں جانتی ہوں، مجھ جیسی بیوی پا کر وہ خود کو ہمیشہ خوش قسمت سمجھتے رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ملکی ہار گئی۔

"آپ کو معلوم ہے، آج صبح ڈیڈی چلا رہے تھے۔ ان کے کوٹ کا بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔"

"غلام رسول کو بٹن لگانا آتا ہے وہ ایسے چھوٹے موٹے سب کام جانتا ہے اسی لئے تو میں نے اسے تمہارے ڈیڈی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔"

"تو ممی... ایسا کریں... کہ غلام رسول کا نکاح ڈیڈی کے ساتھ پڑھا دیں۔"

"ملکو... ملکو..." ممی ایک دم پریشان ہو اٹھیں۔ ملکی نے اپنی پوری زندگی میں ایسی بے ہودہ بات نہ کہی تھی۔

"میں کئی دنوں سے سیریسلی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کسی ماہر نفسیات کو دکھا دوں۔ بیٹی! تمہاری حالت بڑی تشویشناک ہے۔ میرا خیال ہے تم ابھی بیوٹی کلینک جاؤ بلکہ ڈاکٹر مالک کے پاس چلو سُنا ہے، ابھی ابھی امریکہ سے آیا ہے اور بہت ماہر ڈاکٹر ہے۔"

"اُفوہ... !"

"ممی... آپ..."

اور پھر ملکی وہاں سے اٹھ گئی۔

اس سے آگے کے حالات جاننے کے لئے اگلے ماہ کا بانو ملاحظہ فرمائیے۔

نام : فاروق صدیقی — عمر : ۱۸ سال
پتہ : متصب منزل، کربلا روڈ (بھوپال)
شوق : اشعار جمع کرنا، غزلیں لکھنا، دینی معلومات حاصل کرنا، خط و کتابت کا شوق۔ ادبی دنیا میں شہرت حاصل کرنا

نام : عالیہ شیخ — عمر : ۲۰ سال
پتہ : ۱۲/۱۴ اپنڈت روڈ، چوہان بانگر، نیو سیلم پور، دہلی ۱۱۰۰۵۳
شوق : ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ نئے ڈیزائن کے کپڑے سینا اور پہننا افسانے پڑھنا اور لکھنا۔ شاعری سے دل چسپی، اچھے اشعار جمع کرنا قلمی دوستی صرف بہنوں سے۔

نام : سیف الدین، صدیقی — عمر : ۱۶ سال
پتہ : ۵۱۳۹، بلیماران دہلی ۱۱۰۰۰۶
شوق : بریک ڈانس، کرکٹ کھیلنا۔ ویڈیو ریل بنانا، کہانیاں لکھنا

نام : ایم۔ ایس انجانا — عمر : ۲۵ سال
پتہ : ۷۶۱، شاہ آباد، معرفت : ایم۔ ابرار احمد، پوسٹ مین بریلی
شوق : پرانے گیتوں سے لگاؤ، غریبوں کی مدد، اچھے اشعار لکھنا، مشاعرہ سننا

نام : محمد یوسف خاں — عمر : ۲۶ سال
پتہ : پی۔ او۔ بکس نمبر ۱۳۳۲، ابہا، سعودی عربیہ
شوق : لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا۔ فلمیں دیکھنا، مطالعہ کرنا، کرکٹ کھیلنا، خطوط کا پابندی سے جواب دینا

نام : محمد عامر خاں — عمر : ۲۱ سال
پتہ : جناب ظفر محمد خاں صاحب، محلہ سادھو خیل، شاہجہاں پور مواز ضلع میرٹھ ۲۵۰۱۰۴
شوق : قلمی دوستی، تیراکی، باغبانی، شاعری، باڈی بلڈنگ، مطالعہ درد بھرے گانے سننا، تیز ڈرائیونگ، خطرات سے کھیلنا۔ سبھی بہن بھائیوں کے خطوط کے پابندی سے جواب دینا۔

نام : اشفاق احمد خاں جاوید — عمر : ۲۷ سال
پتہ : مکان نمبر ۶-۲۶۶۲، متصل پوسٹ آفس، کیوڑی اسٹریٹ نرمل ۱۵۰۴۱۰۶
شوق : قلمی دوستی کرنا، کرکٹ کا منٹری سننا، کتابیں پڑھنا، سینما دیکھنا

نام : جہانگیر امام — عمر : ۲۴ سال
پتہ : ۸۷۔ لبرن اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶
شوق : قلمی دوستی کرنا خاص کر بہنوں سے، خط کا جواب فوراً دینا، ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ اچھے اشعار اور لطیفہ اکٹھے کرنا تحفے دینا۔

نام : شاہد خاں — عمر : ۲۴ سال
پتہ : پوسٹ بکس ۲۷۴، کانپور ۲۰۸۰۰۱ (یوپی)
شوق : ناول پڑھنا، معیاری شعر جمع کرنا، گاہے گاہے افسانے لکھنا، بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا۔

نام : نعیم قیصر — عمر : ۲۵ سال
پتہ : دی۔ واچ ہاسپٹل۔ آنولہ ۲۴۳۳۰۱ (یو۔پی)
شوق : لکھنا پڑھنا، قلمی دوستی۔ بہن بھائیوں کے خطوط کا خلوص سے جواب دینا۔

نام : محمد ابراہیم پٹیل — عمر : ۲۱ سال
پتہ : پٹیل ہاؤس، ۶، شمس الدین روڈ، نوائط کالونی، بھٹکل (این کے) ۵۸۱۳۲۰
شوق : جاسوسی ناول پڑھنا، گانے سننا، تیرنا، مذہبی سرگرمیاں، قلمی دوستی وغیرہ

نام : فیض الحسن راہی — عمر : ۲۵ سال
پتہ : "کاشانہ ندیم" ہردے پور، بھٹیانہ، ضلع غازی آباد ۲۴۵۱۰۱ (یوپی)
شوق : لڑکے لڑکیوں سے بے لوث دوستی، قلمی دوستی، اخبار و رسائل کا مطالعہ، شمع معمے حل کرنا، شاعری، موسیقی، فلمیں، جرنلزم، گولف کھیلنا، خطوط کو باعث مسرت سمجھنا اور پابندی سے جواب دینا وغیرہ

نام : ایس۔ ایم۔ نیاز — عمر : ۱۹ سال

نام : .... عمر : ....
پتہ : ....
شوق : ....

پتہ : ۵۴۴، داؤد منزل، نیو ملک پیٹ، حیدرآباد ۳۶
شوق : رومانی، جاسوسی اور تاریخی ناولیں پڑھنا، پرانی فلمیں و نغمے، شعر و شاعری اور قلمی دوستی

نام : محمد عبدالمتین (الیکٹریشن) عمر: ۲۵ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶۹، مدینہ منورہ، سعودی عرب
شوق : قلمی دوستی کرنا، شعر و ادب میں دلچسپی

نام : اشتیاق احمد ہاشمی عمر: ۳۰ سال
پتہ : ٹیچر جامعہ اسلامیہ، سوز ساگر، جودھ پور، راجستھان
شوق : دوستی کرنا، اخبارات و رسائل کا مطالعہ، سیر و تفریح، اشعار جمع کرنا، پینٹنگ کرنا، سکّے جمع کرنا

نام : قاسم احمد عمر: ۲۰ سال
پتہ : ای ۵۹۵، مسجد گلی نمبر ۲، بابرپور، شاہدرہ دلّی۔ ۳۲ - ۱۱ (بھارت)
شوق : ایکٹنگ کرنا، فوٹوگرافی، ملکی اور غیر ملکی لڑکے و لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا، سیر و تفریح کرنا وغیرہ
نوٹ : خطوط اردو، ہندی اور انگریزی میں بھی بھیج سکتے ہیں

نام : ابوذر انصاری عمر: ۱۴ سال
پتہ : ابوذر انصاری ولد اعجاز احمد، محلّہ دکھن، پوسٹ جیرآباد ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی)
شوق : فٹ بال کھیلنا، تعلیم حاصل کرنا، خط کا جواب مستعدی سے دینا، سعدیہ دہلوی کی تحریروں کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا۔

نام : نسیم گلشن عمر: ۱۴ سال
پتہ : نسیم گلشن، جامع مسجد، قصبہ بھوجپور، مرادآباد
شوق : رسالے پڑھنا، اور قلمی دوستی کرنا۔

نام : محمد مجاہد علی۔ ڈی۔ ایم۔ بی
پتہ : محمد عبدالغفور، پیش امام دیچ لال وارڈی، ڈسٹرکٹ بیدر، کرناٹک (۵۸۵۴۰۱)
شوق : مطالعہ کرنا، نئی نئی قسم کی تصویریں اتارنا، قلمی دوستی کرنا۔ خطوط کا فوراً جواب دینا

نام : سیّد اسمٰعیل ذبیح اللہ عرف حاجی میاں عمر: ۲۷ سال
اصل نام : سید اسمٰعیل بن ابراہیم ال پھرکی
پتہ : حافظ بابا نگر ۲۰/ ۳۰۹/ ۱۹۴-۱۲-۱۴، حیدرآباد ۱۔ بی
شوق : دلیپ کمار کی فلمیں دیکھنا، مشاعروں میں شریک ہونا، بالخصوص شاعر معین فیاضی کا کلام پسند ہے۔

نام : مرزا خیرالدین بیگ جھکّی عمر: ۱۶ سال
پتہ : مکان نمبر ۱/۲۶۴- ۲۳۰۵ سیدعلی چبوترہ حیدرآباد (اے۔پی) ۲۶۵-۵

شوق : افسانے لکھنا، کامیڈی کرنا، مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا، ریڈیو اور ٹی۔ وی پروگراموں میں حصّہ لینا

نام : عقیل احمد عمر: ۲۵ سال
پتہ : عقیل احمد مشیر سٹل ریپرنگ، انوری بلیل کمپاونڈ، دھامنکر ناکہ تھانہ بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲
شوق : تاریخی ناول پڑھنا، شعر و سخن سے دلچسپی، منی افسانے لکھنا۔ ادبی جرائد کا مطالعہ کرنا۔

نام : ابوالحسن، شیخ علی اکبر عمر: ۲۳ سال
پتہ : مجاور چال، روم نمبر۱۔ شیخ مصری، درگا اسٹاپ ہل ایس۔ ایم روڈ۔ بمبئی نمبر ۳۷، فون نمبر ۴۰۲۲۱۶۴
شوق : محمد رفیع کے پرانے گیت سننا اور گیت گانا، کرکٹ کھیلنا۔ دینی اور سوشل کام کرنا، اخباروں اور اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔

نام : سیّد محی الدین قادری جاوید۔ عمر: ۲۱ سال
پتہ : معرفت آنند کیمکلز کارپوریشن نمبر ۲/۲۹ ـ۳ ـ۲ حیدرآباد
شوق : قلمی دوستی کرنا، ادبی کتابیں پڑھنا، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا، بیرونی سکّے جمع کرنا وغیرہ۔

نام : محمد اختر ظہور عمر: ۲۳ سال
پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)
شوق : مضامین لکھنا، ڈاک ٹکٹ و سکّے جمع کرنا۔ تحفے دینا۔ دوستی کرنا۔ اسلامک و سائنسی رسالوں کا مطالعہ کرنا۔

نام : سیّد معراج عمر: ۱۹ سال
پتہ : روشن گیٹ، اعظم کالونی، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر)
شوق : بانو، شمع و ادبی رسائل کا مطالعہ کرنا، اچھے اشعار جمع کرنا، معیاری فلمیں دیکھنا، قلمی دوستی کے بھائی بہنوں کے خطوط کا پابندی سے جواب دینا۔

نام : شمیم ریحان عمر: ۲۷ سال
پتہ : معرفت، یونی سیف ۱/ ۲۶ مارکیٹ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۸۷
شوق : فوٹوگرافی، سیاحت، کتب بینی، غزل اور قلمی دوستی

نام : محمد اطہر عمر: ۳۲ سال
پتہ : اطہر منزل ۲۵۴، پھول باغ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱
شوق : قلمی دوستی، مطالعہ، اشعار جمع کرنا، دین کے لئے جدّوجہد کرنا

نام : محمد رفیق، ابنِ عبدالرزاق عمر: ۱۹ سال
پتہ : ایس کے۔ فورجنگ ورکس، لوہار کھاتہ، گالہ نمبر ۲۰۲۳ مجگاؤں ڈاکیہ روڈ، بمبئی نمبر۱۰
شوق : مضامین، افسانے لکھنا، ادبی کتابیں پڑھنا، قلمی دوستی کے جوابات دینا۔

بیوٹی کارنر

شہناز حسین

بالوں کا حُسن کیسے قائم رہے؟

بال عورت کی خوب صورتی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ شاعروں نے گیسوؤں کی طلسماتی گھٹا پر مختلف انداز میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسی لئے خوب صورت بال ہر عورت کی تمنا ہوتی ہیں۔ اگر بال کٹے پھٹے، بے رنگ، خشک اور اُلجھے اُلجھے ہوں تو دیکھنے والوں پر اچھا اثر نہیں ڈالیں گے اور شخصیت بے کشش ہو کر رہ جائے گی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں آپ اپنے چہرے پر توجہ دیتی ہیں، وہاں بالوں کو بھی نہ بھولیے۔

بالوں کی حفاظت کے لئے غذا کی طرف خاص طور سے دھیان دینا ضروری ہے۔ سر کو ٹھنڈے پانی سے دھونا اور دھوتے ہوئے انگلیوں سے سر کی جلد کو خوب ملنا اور رگڑنا بالوں کی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک منٹ تک اپنے بالوں اور سر کو ٹھنڈے پانی میں بھگوئے رکھیں۔ اس کے بعد بالوں کو تازہ ہوا میں خشک کر لیں۔ بالوں کو خشک کرتے ہوئے بالوں کو ہلکے ہلکے کھینچتی بھی رہیں۔ اس طرح سر میں دورانِ خون تیز ہو جائے گا۔ اگر آپ نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو آپ خود محسوس کریں گی کہ آپ کے سر کو سکون اور بالوں کو ایک نئی زندگی مل رہی ہے۔

بالوں کی صفائی کے لئے ہمیشہ چھوٹے دندانوں کی کنگھی استعمال کریں۔ اس سے بالوں میں جمع شدہ میل اور گرد دُور ہو جاتی ہے، بالوں کی اچھی طرح صفائی ہو جاتی ہے اور بالوں کو بار بار دھونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

کنگھی صاف اور اعلیٰ کوالٹی کی ہونی چاہئے۔ گندی کنگھی سر میں جراثیم اور انفیکشن پھیلاتی ہے۔

تیز دندانوں والی کنگھی استعمال نہ کی جائے اس سے سر کی جلد کے زخمی ہونے اور بالوں کی ساخت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ خاص طور سے جب بال اُلجھے ہوئے ہوں تو ان میں آہستہ آہستہ کنگھی کریں۔ اگر بال بہت زیادہ اُلجھے ہوئے ہوں تو ان کو گیلا کر کے سلجھائیں۔ خشک بالوں میں کنگھی کرنے سے بالوں کے سرے پھٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بالوں میں صرف اس وقت کنگھی یا برش کریں جب ان کو ضرورت ہو۔ ہر وقت برش یا کنگھی کرنے سے بالوں کی ساخت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور ان کے سرے دو حصوں میں پھٹ سکتے ہیں۔

کنگھی کرتے وقت کچھ بال اتر کر کنگھی میں آجائیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ مُردہ بال ہیں ان کی جگہ نئے بال آجائیں گے۔ بالوں کے گرنے اور دوبارہ پیدا ہونے کا عمل زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ تمام حالات میں سر کی جلد سے روزانہ تیس سے سو تک بال نکلتے ہیں۔

یوں تو کنگھی کرنے سے بھی بالوں کی ورزش ہو جاتی ہے، لیکن بالوں کو پوری طرح صحت مند رکھنے کے لئے مزید ورزش بھی درکار ہے۔ جب ہم تن درست ہوتے ہیں اور ہم پر کوئی خاص جذباتی دباؤ نہیں ہوتا تو سر کی جلد لچک دار رہتی ہے اور اپنے نیچے واقع بافتوں اور ریشوں پر آسانی سے حرکت کر سکتی

ہے۔ عام حالات میں سر کی جلد کو اتنا لچک دار ہونا چاہیئے کہ اسے کھوپڑی کی ہڈی سے اوپر اٹھایا جاسکے۔ جلد کی سختی بالوں کو خون کی فراہمی اور بہاؤ میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور بالوں کی نشوونما کو روکتی ہے۔ بعض ورزشوں کے ذریعہ سر کی جلد میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر سر کی جلد میں چربی کی غیر معمولی کمی ہو تو پہلے متوازن غذا کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ جلد کے سخت پڑجانے کی بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یہ سختی اعصابی تناؤ کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ جو موجودہ دور کا ایک عام مرض ہے۔ بہرحال جلد کچھ بھی ہو مگر نیچے بیان کی ہوئی ورزشوں سے سر کی جلد میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۱) دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیاں سر کے دونوں طرف رکھیں اور ان کو ایک دوسرے کی طرف اس طرح دبا دبا کر لے جائیں کہ جلد پر بل پڑ جائیں پھر انگلیوں سے دھیرے دھیرے یہ بل کانوں کے اوپر سر کے مرکز کی طرف دبا کر لے جائیں شروع میں یہ ورزش مشکل محسوس ہوگی، مگر تھوڑی سی مشق کے بعد یہ دشوار نہیں رہے گی۔

(۲) اوپر بتائی ہوئی ورزش کے نتیجے میں جب سر کی جلد میں حرکت کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہوئی محسوس ہو تو اگلے مرحلے میں بالوں کو کھینچ کر انہیں کھوپڑی کی ہڈی سے اوپر اٹھائیں۔ کھینچنے سے جو بال اتریں ان کی پرواہ نہ کریں، کیونکہ وہ تقریباً مردہ ہوچکے ہیں۔ ایسے کمزور بال نئے بالوں کی جڑیں پیدا ہونے میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے دور ہونے پر نئے بال جلد نکل آتے ہیں۔

اگر بال لمبے ہوں تو بالوں کی دوسری ورزش کرتے وقت سر کے چاروں جانب ترتیب سے اس ورزش کو دہرائیں۔ بالوں کو مٹھیوں میں مضبوطی سے پکڑ کر ان کو سر سے دور کھینچیں۔ اس طرح بعض اوقات مردہ بال اکھڑ کر ہاتھوں میں آجائیں گے، لیکن صحت مند بال نہیں اکھڑیں گے۔ بالوں کو کھینچ کر ان کو جھٹکا دیں اور جلد کو کھوپڑی سے جتنا اوپر ہوسکے اٹھائیں۔

مالش سے بھی بالوں کی مناسب ورزش ہوجاتی ہے۔ سر کی جلد کی مالش انگلیوں کے سروں سے کرنی چاہیئے۔ اس طرح مالش کرنے سے سر کی طرف دوران خون میں اضافہ ہوتا ہے، بالوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، خون میں موجود اجزا تیزی سے بالوں کی جڑوں کی طرف پہنچتے ہیں اور ان کی افزائش میں مدد دیتے ہیں۔

سر میں مالش کرتے وقت خیال رکھنا چاہیئے کہ پوری انگلیاں جلد کو مس کرتی ہوئی نہ گزریں، کیونکہ اس طرح بالوں پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے اور وہ ضائع ہوتے ہیں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں کے اندر ڈال کر پہلے آہستہ آہستہ سر پر مالش کریں اور پھر اپنے ہاتھوں کو تیزی سے حرکت دیں۔ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ مالش پورے سر میں ہو۔ اور پھر اپنے سارے بالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ دبا کر سروں پر لا کر مالش کو ختم کردیں۔ مالش کرنے سے پہلے اس بات کا بھی دھیان رکھیں کہ بال الجھے ہوئے نہ ہوں۔ اگر بال الجھے ہوئے ہوں گے تو انگلیاں بالوں میں ٹھیک طرح سے حرکت نہیں کرسکیں گی اور بال بھی جھڑیں گے سر کی مالش ہمیشہ کنپٹی کے اوپر سے شروع کریں۔

بالوں کی دیکھ بھال میں ان کو بیماریوں سے بچانا بھی شامل ہے۔ بالوں میں خشکی ایک عام مرض ہے۔ اس بیماری میں سر کی جلد پر چھوٹے چھوٹے سفید رنگ کے چھلکے سے پیدا ہوجاتے ہیں جو بالوں کے لئے بہت نقصان دہ ہوتے ہیں۔ خشکی پیدا ہونے کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اگر بہت عرصے تک جذباتی تناؤ میں مبتلا ہونا، مناسب غذا کا جسم کے اندر نہ پہنچنا، بالوں کو ٹھیک خوراک کا فراہم نہ ہونا وغیرہ۔ اس لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ سر میں خشکی کس وجہ سے ہے اور اسی مناسبت سے علاج کریں۔

سب سے پہلے غذا پر دھیان دینا چاہیئے۔ غذا میں زیادہ سے زیادہ دودھ دہی اور ہری سبزیوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ سر کی جلد اور بالوں کی صفائی کی طرف بھی خاص دھیان دیں۔

سر میں روزانہ رات کو گرم تیل سے مالش کریں۔ صبح کو بالوں کو بھاپ دیں۔ دو تین تولیے لے کر ان کو گرم پانی میں بھگو کر باری باری سر پر رکھیں۔ پندرہ منٹ تک ایسا کرتے رہیں۔ ایسا کرنے سے سر کی جلد کے مسام کھل جائیں گے۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے سر کو دھولیں اور پھر بالوں کو اچھی طرح سکھا کر کنگھا کریں۔ یہ عمل پندرہ دن تک روزانہ کریں۔ جب خشکی کم ہوجاتے تو ہفتے میں ایک دن سر میں دہی لگا کر ایک گھنٹے کے لئے چھوڑ دیں۔ ایک گھنٹے بعد بالوں کو ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ اگر شیمپو استعمال کرنا چاہیں تو کرلیں۔

اگر اس نسخے سے فائدہ نہ ہو تو ایک اور ترکیب کو عمل میں لائیں۔ دو بڑے چمچے کاسمیٹک سرکہ لے کر چھ بڑے چمچے پھر گرم پانی میں ملالیں۔ پھر روئی کے ٹکڑے اس محلول کو دوبارہ استعمال کریں۔ آدھے کپ گرم پانی میں تین بڑے چمچے کاسمیٹک سرکہ ملالیں اور سر میں ڈالیں۔ اب سر دھونے کی ضرورت نہیں۔ اس عمل سے بال نرم اور چمکدار بھی ہوجائیں گے۔

انڈے کی زردی کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں ایک لیموں کا عرق ڈال کر بالوں میں اچھی طرح لگائیں اور ایک گھنٹے تک لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد بالوں کو نیم گرم پانی سے دھو دیں۔ اس سے بھی خشکی دور ہوجاتی ہے اس کے علاوہ خشخش پیس کر دودھ میں بھگو کر سر دھونے سے بھی خشکی دور ہوسکتی ہے۔

آج کل بالوں کا گرنا بھی بہت عام بیماری ہے۔ اگر بال زیادہ گرنے لگیں تو یہ گنج کی نشانی ہے اس لئے خاص طور سے مردوں کو) ایسی صورت میں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ اگر گنج کا خطرہ نہیں ہے تو بالوں

کو گرنے سے روکنے کے لئے نیچے بیان کی ہوئی ترکیبیں استعمال کریں۔

ہڑ بہیڑ، ریٹھے اور آملے برابر مقدار میں لے کر الگ الگ کوٹ لیں اور ملا کر کسی برتن میں محفوظ کر کے رکھ لیں۔ استعمال کے وقت بیری کے سبز پتوں کو کچل کر پسی ہوئی ان اشیا کے ساتھ ملا دیں پتیلی میں پانی ڈال کر پسی ہوئی تمام اشیاء اور بیری کے پتے ڈال دیں۔ اور جوش دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس پانی سے مل مل کر سر کو دھوئیں۔ بعد میں سادہ پانی سے سر کو دھو لیں ہفتے میں تین مرتبہ یہ عمل کرنے سے بالوں کا گرنا رک جائے گا اور بال لمبے ہونے لگیں گے۔

نہانے کے پانی میں دو بڑے چمچے بورکیس پاؤڈر ملا کر بالوں پر ڈالیں۔ یہ بالوں کے لئے بہت مفید ہے اور بالوں کو گرنے سے روکتا ہے۔

سمندری نمک دو بڑے چمچے بھر ایک لیٹر ابلتے پانی میں ملا دیں پھر اسے ٹھنڈا کر کے محفوظ کر لیں۔ ہر روز سر کی جلد پر اس سے مالش کیا کریں۔ بالوں کو حسب معمول دھوئیں بہتر یہ ہو گا کہ بالوں کو دھونے کے لئے صابن سے پرہیز کریں۔ شیمپو کا استعمال مفید ہو گا۔

ایک پاؤ مسور کی دال میں ایک انڈا ملا کر سایہ میں خشک کر لیں۔ سوکھ جانے پر اس کو باریک پیس کر رکھ لیں اور اس سے سر کو دھوئیں۔

اگر بال بہت زیادہ گرتے ہیں اور بہت ہی پتلے ہیں تو وٹامن 'اے' اور 'ڈی' کا استعمال کریں ہفتے میں تین دن سرسوں کے تیل میں کیسٹر آئل ملا کر استعمال کریں نیز گرم پانی سے سر کو کبھی نہ دھوئیں۔ اگر سردی کی وجہ سے گرم پانی استعمال کریں تو بہت ہلکا گرم پانی لیں۔

بالوں کا پھٹنا بھی ایک پریشان کن بیماری ہے۔ اگر بالوں کی مناسب حفاظت کی جائے تو بالوں کی نوکیں نہیں پھٹتیں۔ لیکن بالوں کو پرم کرنے سے اور کیمیاوی اجزا کے ذریعہ بالوں کا رنگ تبدیل کرنے یا بلیچ کرنے سے ان کی نوکیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں اور بالوں کی رنگت اور خوب صورتی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

بالوں کی نوکیں پھٹنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بالوں کو مناسب غذا نہیں مل رہی ہے۔ ایسی صورت میں بالوں کی جلد کو زیادہ چکنائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سر کی جلد پر بہت زیادہ مالش کرنی چاہئے۔

بالوں کی چمک سے ان کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بالوں کے حسن میں اضافہ کرنے کے لئے گیلے بالوں کو ہمیشہ ہوا میں خشک کرنا چاہئے۔ اس سے بال نرم رہتے ہیں۔

رات کے وقت لیموں کا رس اور گلیسرین برابر مقدار میں لے کر اچھی طرح ملا کر بالوں میں مالش کریں اور صبح کو اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے سر کو دھو ڈالیں۔ ایک ہفتے تک روزانہ یہ عمل کریں۔

نہانے سے پہلے چنبیلی کے تیل میں لیموں کا عرق ڈال کر بالوں میں لگائیں اس کے بعد پانی میں لیمو کا رس ملا کر سر کو دھو ڈالیں

اگر بال چکنے ہیں تو بیسن میں انڈا ملا کر بالوں میں خوب رگڑیں اس کے بعد شیمپو سے سر کو دھو ڈالیں۔

روزانہ رات کو سونے سے پہلے بالوں میں برش کریں۔ اس سے بالوں میں چمک پیدا ہو گی اور بال لمبے اور گھنے بھی ہو جائیں گے

بالوں کو لمبا کرنے اور ان کی افزائش کے لئے کچھ گھریلو آزمودہ نسخے بھی بہت کارگر ہیں۔

بیری کے پتے کوٹ کر کچھ دیر تک سر میں ملتی رہیں۔ آدھے گھنٹے بعد سر کو ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ چالیس دن میں ہی بالوں کی لمبائی میں خاصا اضافہ ہو جائے گا۔

اڑد کی کالے چھلکے والی دال کو پیس کر رکھ دیں۔ روزانہ رات کو مٹھی بھر دال نکال کر برتن میں بھگو دیں۔ سورج نکلنے سے پہلے اس سے سر دھوئیں۔ یہ نسخہ بھی چالیس دن تک آزمائیں۔

مٹھی بھر آملے کوٹ کر کسی لوہے کے برتن میں ڈال دیں اور برتن میں پانی بھر دیں۔ دوسرے دن پانی سیاہی مائل ہو جائے گا۔ اس سے سر کو دھوئیں۔ آملے برتن میں رہ جائیں گے ان میں اور پانی بھر دیں۔ اور اس پانی کو اگلے دن استعمال کریں بیس پچیس روز تک اسی طرح آملے کا پانی استعمال کریں۔

کم از کم دو ماہ تک روزانہ دہی سے سر دھو کر ناریل کے تیل سے سر کی مالش کریں

بالوں کو گھنا اور لمبا کرنے کے لئے

شیکاکائی ایک کیلو، میسن آدھا کیلو، چائے کی پتی ۱۲۵ گرام، میتھی کے بیج ۱۲۵ گرام، بہیڑ ۱۲۵ گرام، آملہ ۱۲۵ گرام لیں، ان ساری چیزوں کو کوٹ کر پیس لیں اور کسی کپڑے میں چھان کر رکھ لیں۔ نہانے سے دو تین گھنٹے پہلے اس سفوف کو بھگو دیں اور جب یہ پھول جائے تو بالوں میں خوب ملیں۔ تھوڑی دیر بعد سادہ پانی سے سر کو دھو لیں۔

بادام کی گٹھلی کر پانی میں بھگو دیں اور پھر اس سے سر کو دھوئیں۔ اس سے بھی بال چمکیلے، گھنے اور لمبے ہو جائیں گے۔

دھوپ کی تمازت، بالوں میں غذائیت کی کمی یا دماغ کی کمزوری کی وجہ سے بال جلد سفید ہو جاتے ہیں جن لڑکیوں اور عورتوں کے بال عمر سے پہلے سفید ہو گئے ہوں انہیں خالص سرسوں کے تیل کی مالش کرنی چاہئے اگر زیتون کا خالص تیل مل جائے تو زیتون کے تیل کی مالش کریں۔ یہ سفید بالوں کے لئے اکسیر ہے۔

سفید بالوں کو دھونے کے لئے شیکاکائی بال چھڑ اور آملوں کو کوٹ کر رات کو کسی لوہے کے برتن میں بھگو دیں صبح کو ان چیزوں کو رگڑ دیں۔ گاڑھا سیاہ پانی بچے گا اس پانی سے سر کی جلد کو اچھی طرح رگڑ دیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد سر کو دھو لیں۔ چالیس دن تک یہ عمل روزانہ کریں۔ بالوں کا سفید ہونا بند ہو جائے گا۔

بانو نجمی دہلی

باورچی خانہ

جھینگا اسٹو

تازہ جھینگے : دو پیالی (صاف کرلیں)
پیاز (درمیانہ سائز کی) : ۴ عدد
شملہ مرچ : ۲ عدد
لہسن : ۲۰ جوے
ادرک : پون انچ کا ٹکڑا
ٹماٹر : ۲ عدد
بند گوبھی : ۱۰۰ گرام
مٹر کے دانے : آدھی پیالی
گاجر (چھوٹا سائز کی) : ایک عدد
مکئی کا آٹا : ایک میز کا چمچہ
ہلدی : پاؤ چائے کا چمچہ
گھی : ۲ میز کے چمچے
ہرا دھنیا، لال مرچ، نمک : ضرورت کے مطابق

ادرک اور لہسن کو سِل یا مکسی میں باریک پیس لیں۔ پیاز کے باریک لچھے کرلیں۔ ایک دیگچی میں گھی گرم کرلیں اور اس میں پیاز کو لال کرلیں۔ پیاز لال ہونے پر اس میں پسی ہوئی ادرک اور لہسن شامل کردیں۔ خوب اچھی طرح بھونیں۔ بھننے پر جھینگے ڈال دیں اور تھوڑی دیر چمچہ چلائیں۔ پھر اس میں شملہ مرچ، گاجر اور بند گوبھی کو کاٹ کر ڈال دیں اور دوبارہ بھونیں۔ چند سیکنڈ بعد مٹر کے دانے اور ٹماٹر بھی شامل کرلیں۔ نمک، ہلدی، لال مرچ اور مکئی کا آٹا بھی ڈال دیں۔ ایک پیالی پانی ڈال کر پکنے کے لئے درمیانی آنچ پر رکھ دیں۔ جب تمام چیزیں گل جائیں تو ایک بار اور چند منٹ تک بھونیں۔ جب شوربا گاڑھا ہوجائے تو چولہے سے اتار کر اس میں ہرا دھنیا کاٹ کر چھڑک دیں اور گرم گرم کھائیں۔

سیب پسندے

پسندے والا گوشت : ۲۵۰ گرام
سیب (درمیانے سائز کا) : ایک عدد
مکھن : ۲½ میز کے چمچے
دہی : ۲ میز کے چمچے
ادرک (پسی ہوئی) : ایک چائے کا چمچہ
کچا پپیتا (پسا ہوا) : ۱½ چائے کا چمچہ
نمک : ذائقے کے مطابق
گرم مسالہ (پسا ہوا) : ½ چائے کا چمچہ
تازہ ملائی : ایک میز کا چمچہ
بادام (پسے ہوئے) : ½ چائے کا چمچہ
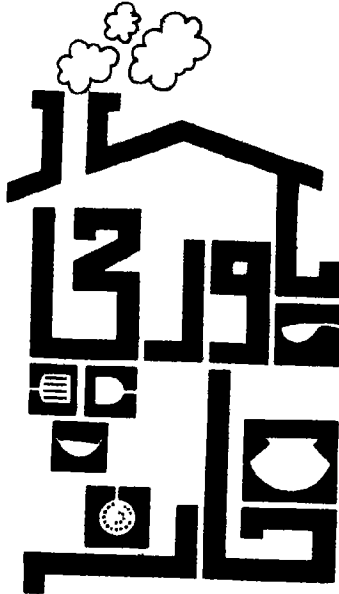
ایک برتن میں پسندوں پر دہی، پسی ہوئی ادرک اور کچا پپیتا ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ پھر ڈھکنا ڈھک کر ایک گھنٹے کے لئے الگ رکھ دیں۔ گوشت کے ٹکڑوں میں مسالہ اچھی طرح جذب ہوجانا چاہیئے۔

ایک دیگچی میں مکھن گرم کریں۔ پھر اس میں گوشت ڈال دیں۔ آنچ ہلکی رکھیں۔ پانی کے چھینٹے دے دے کر گوشت کو خوب اچھی طرح بھون لیں۔ جب گوشت نرم پڑنے لگے تو سیب کے دو ٹکڑے کرکے بیج نکال کر اس کے موٹے موٹے گول قتلے کاٹ کر دیگچی میں ڈال دیں ساتھ میں نمک بھی ڈال دیں۔ دو بڑے چمچے پانی کے ڈال کر بہت دھیمی آنچ پر گلنے کے لئے چھوڑ دیں۔ جب پانی سوکھنے لگے اور سیب کے ٹکڑے ہلکے نرم پڑ جائیں تو گرم مسالہ، پسے ہوئے بادام اور ملائی ڈال کر دو تین منٹ اور ہلکی آنچ پر بھونیں۔ پھر چولہے سے اتار لیں۔

چاٹ پاپڑی

بیسن : ۲۵۰ گرام
میدہ : ۲۵۰ گرام
املی : ۲۵ گرام
ادرک : تھوڑی سی
آلو : ۲۵۰ گرام
دہی : آدھا کلو
زیرہ : دو چائے کے چمچے
سونف : آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ : ۳ چائے کے چمچے
چینی : ۳ میز کے چمچے
نمک : ذائقے کے مطابق
میٹھا سوڈا : ایک چائے کا چمچہ
کالا نمک : ایک چائے کا چمچہ

میدہ میں تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر سخت گوندھ لیں۔ اب اسے بیلن سے پھیلا کر چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑے کاٹ لیں اور انہیں چاقو سے گود لیں۔ اس کے بعد تل لیں اور انہیں کسی بڑے برتن میں نمک ملے پانی میں بھگو دیں۔ کچھ دیر بعد جب نرم ہوجائیں تو احتیاط سے پانی سے نچوڑ کر باہر نکال لیں۔

سونٹھ بنانے کے لئے املی کو پانی میں بھگو کر چھان لیں۔ اب اس میں ½ چمچہ چینی، ½ چمچہ نمک، ½ چمچہ کالا نمک، ½ چمچہ زیرہ (بھنا ہوا اور پسا ہوا)، ½ چمچہ سونٹھ اور ½ چمچہ لال مرچ ڈال کر تھوڑی دیر آنچ پر رکھ کر پکائیں۔

دہی کو پھینٹ کر تھوڑا سا پانی ملا کر پتلا کرلیں۔

آلو ابال لیں۔ پھر انہیں چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔
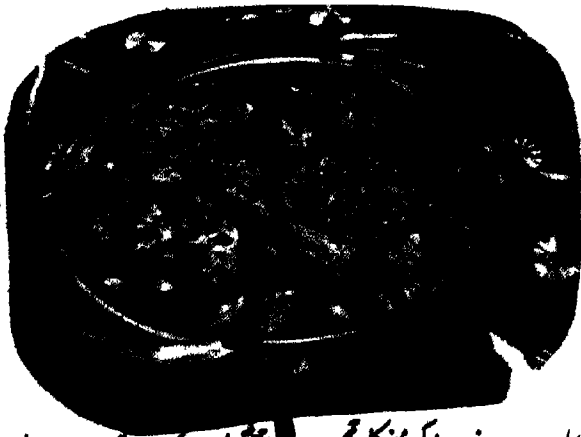
ایک پلیٹ میں پہلے پاپڑی سجائیں اوپر پکوڑیاں اور آلو رکھیں۔ پھر اس پر بہت سا دہی اور سونٹھ ڈال کر اوپر سے تھوڑا سا کالا نمک، لال مرچ اور گرم مسالہ چھڑک دیں۔ لیجیے، چاٹ پاپڑی تیار ہے۔

ناریل کی چٹنی

ناریل : آدھا
چنے کی دال : پیالی
میٹھا نیم : ½ چائے کا چمچہ
رائی : ½ چائے کا چمچہ
لال مرچ (ثابت) : ۲، ۳ عدد
ہری مرچیں : ۳، ۴ عدد
املی (تھوڑی سی) : یا ۲ عدد نیبو کا رس
نمک : ذائقے کے مطابق
گھی : ضرورت کے مطابق

چنے کی دال کو بھون لیں اور ناریل کو کس لیں۔ اب اس میں ہری مرچیں، املی اور نمک ملا کر پیس لیں۔ پھر ایک برتن میں گھی گرم کر کے رائی اور میٹھے نیم کو تل لیں۔ لال مرچوں کو کاٹ کر ان کو بھی تل لیں۔ پھر اسی گھی میں ناریل اور چنے کی دال کی پسی ہوئی چٹنی ڈال کر چند منٹ بھون لیں چٹنی تیار ہو جائے گی۔

چکن نوڈلز کی بریانی

مرغ (بڑے بڑے ٹکڑے کر لیں) : تقریباً ۵۰۰ گرام کا
مرغ کے مزے والے نوڈلز : ۳ پیکٹ
گھی : ایک پیالی
پیاز (درمیانے سائز کی) : ۲ عدد
لہسن : ۴ جوے
ادرک : ایک انچ کا ٹکڑا
خشخاش : ایک بڑا چمچہ
الائچی (چھوٹی) : ۴ عدد
لونگیں : ۴ عدد
دارچینی : ۲ انچ کا ٹکڑا
ہرا دھنیا : ایک گچھا
پودینہ : ۱۰، ۱۲ پتیاں
[illegible] : ایک میز کا چمچہ
کالی مرچ : ۸، ۱۰ دانے
ہری مرچ : ۴، ۵ عدد
نمک : ذائقے کے مطابق
ٹماٹر اور ہری مرچ : سجانے کے لئے

مرغ کو اچھی طرح دھولیں کھٹے دہی کو اس پر خوب اچھی طرح لتھیڑ دیں اور ایک طرف رکھ دیں۔

پیاز اور ہری مرچوں کو باریک پیس لیں کڑھائی میں گھی گرم کر لیں۔ اب اس میں تمام مسالہ ڈال کر بھونیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ مسالہ بھن جانے پر مرغ کے ٹکڑے ڈال دیں۔ تین پیالی پانی ڈال کر پکنے کے لئے رکھ دیں۔ تھوڑا سا پانی رہ جانے پر چولہے سے اتار لیں۔

اوون ہو تو اس کی ڈش میں، نہیں تو ایک پھیلے ہوئے برتن میں گھی چپڑ لیں۔ نوڈلز کو توڑ کر اس میں پھیلا دیں اور مرغ کا شوربا انڈیل دیں۔ اس پر آدھا ٹیسٹ میکر (مرغ کے ذائقے والا مسالہ) چھڑک دیں جو نوڈلز کے پیکٹ کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ اب اس پر مرغ کے آدھے ٹکڑے بھی سجا دیں پھر دوبارہ نوڈلز کی تہہ بچھا دیں اور باقی شوربا اس کے اوپر ڈال دیں۔ دوبارہ بچا ہوا آدھا ٹیسٹ میکر چھڑک دیں۔ باقی مرغ کے ٹکڑے بھی ڈال دیں اور گرم اوون میں تقریباً پندرہ منٹ کے لئے رکھ دیں۔ اگر اوون نہ ہو تو بالکل معمولی آنچ پر رکھ کر الٹتے پلٹتے رہیں۔ تاکہ بریانی لگنے نہ پائے۔ جب مرغ کے ٹکڑے اور نوڈلز اچھی طرح سینک جائیں تو اوپر سے ٹماٹر اور ہری مرچ کاٹ کر سجا دیں۔

کروندے کا اچار تیل میں

تازہ کروندے : ۲۵۰ گرام
سرخ مرچ (سالم) : ۱۰، ۱۲ عدد
سونف : ۲۵ گرام
زیرہ : ۱۵ گرام
میتھی کے بیج : ۱۵ گرام
کلونجی : ایک چائے کا چمچہ
سرسوں کا تیل : حسب ضرورت (اتنا کہ پورا مسالہ ڈوب جائے)
نمک : ایک میز کا چمچہ

کروندوں کو دھو کر تھوڑے سے تیل میں نیم بریاں کر کے تیل چھان کر نکال لیں پھر سرخ مرچ، سونف، زیرہ، میتھی کے بیج اور نمک کو تل کر موٹا موٹا پیس کر کروندوں میں اچھی طرح ملائیں کلونجی سالم شامل کریں۔

ایک گہری کڑھائی میں تیل ڈال کر ہلکی آنچ پہ گرم کریں۔ جب تیل خوب گرم ہو جائے تو چھوٹی سی آٹے کی ٹکیہ تیل میں تل کر نکال کر پھینک دیں اس سے تیل کی جھل دور ہو جائے گی اب تیل کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب تیل ٹھنڈا ہو جائے تو کروندے مسالوں کے ساتھ تیل میں ڈالیں اور اچھی طرح ملا جلا کر مرتبان میں بھر دیں۔ پانی سے اور ہاتھ لگنے سے محفوظ رکھنے پر یہ اچار لمبے عرصے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

انگریزوں کے آباؤ اجداد آدم خور تھے!

جنوبی مغربی برطانیہ کے غاروں سے نکلی ہوئی ہڈیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے انکشاف کیا ہے کہ برطانیہ میں آباد لوگوں کے آباؤ اجداد پتھر کے دور میں (یعنی دو ہزار قبل مسیح میں) انسانوں کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ لندن سے فرانس کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے کہ مذکورہ غاروں میں جو ہڈیاں ہاتھ لگی ہیں، ان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہڈیاں قطع شدہ ہیں اور ان کے پاس خالی کھوپڑیاں پڑی ملی ہیں، جن کے ساتھ دوسرے جانوروں کی ہڈیاں اور انڈوں کی جھلکی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان میں بہت سے انسانوں کی پکی ہوئی ہڈیاں بھی ہیں۔

لندن کے آثارِ قدیمہ کے تحقیق کے سربراہ کا کہنا ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھے کہ یہ ہڈیاں عام مُردوں کی ہیں، لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا استعمال غذا کے طور پر ہوا تھا۔

جسم کو چھریرا بنانے کی شوقین عورتیں مہلک بیماری بولیمیا کا شکار

فیشن ایبل عورتیں جہاں تھوڑی سی موٹی ہوئیں، ان پر دُبلا ہونے کا خبط سوار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ دُبلا ہونے کا خبط ان کو موت کے مُونہہ میں پہنچا دیتا ہے۔

مغربی جرمنی کے کچھ نفسیاتی ماہرین نے اس نئی بیماری کا تجزیہ کیا ہے۔ جو عورتوں کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈائٹنگ کی وجہ سے غذا غیر متوازن ہو جاتی ہے، جس سے جسم میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہری طور
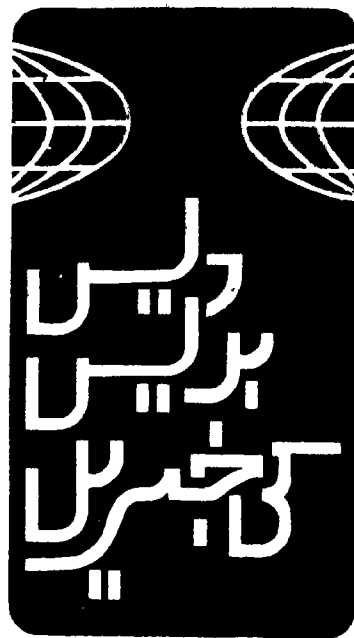
پر تو عورتیں اپنے آپ کو پُرکشش اور خوب صورت دکھانا چاہتی ہیں، مگر اس دُھن میں اندرونی طور پر وہ بالکل کھوکھلی ہو چکی ہوتی ہیں۔

مشاہدے سے پتہ چلا ہے کہ عموماً ایسی عورتوں کو اُلٹیاں لگ جاتی ہیں جس سے جسم سے پوٹاشیم خارج ہونے لگتا ہے اور نتیجہ کے طور پر موت ان کے نزدیک پہنچنے لگتی ہے۔

ٹماٹروں سے لڑائی میں ۶۰ ٹن ٹماٹر استعمال ہوئے

حال ہی میں جونل (اسپین) نام کے ایک قصبے میں ٹماٹروں کی جنگ لڑی گئی۔ اس انوکھی لڑائی میں تقریباً دس ہزار شہریوں نے حصہ لیا۔ یہ مقابلہ قصبے کے مرکزی میدان میں ہوا۔ مقامی بلدیہ نے ۶۰ ٹن ٹماٹر خرید کر دونوں گروپوں میں تقسیم کئے۔ ان میں سے ایک گروپ کا نام 'بدصورت' اور دوسرے کا نام 'خوب صورت' رکھا گیا۔ اس مقابلے کی روایت گزشتہ ۳۰ برس سے ہر سال دہرائی جاتی ہے اور ہر سال میلہ لگایا جاتا ہے۔ اس علاقے میں ٹماٹروں کی پیداوار ملک میں سب سے زیادہ ہے۔

رعایتی قیمتوں پر دُولہا کی بکری

آپ نے نہ کبھی دُولہا کی نیلامی دیکھی ہوگی اور نہ سستے داموں پر دُولہا کو بکتے دیکھا ہوگا۔ مگر چنڈی گڑھ کے ایک گرلز کالج میں یہ انہونی ہو چکی ہے۔

'نان سینس کلب' میں تین ہزار لڑکیوں نے اس نیلامی میں حصہ لیا۔ آئی۔ اے۔ ایس سے لے کر کلرک تک کے عہدے کے دُولہا کے گلے میں اس بازار میں مناسب اور رعایتی داموں پر بکری کی پرچی بندھی تھی۔ جسے جو دُولہا پسند آئے لے لے۔ ہر دُولہا کے ساتھ مٹی کے تیل سے جلنے والا چُولہا مفت تحفہ کے طور پر دیا جا رہا تھا۔

'نان سینس کلب' کے صدر چپال کھٹی نے بتایا کہ کلب نے اپنی سستے غلّے کی دُکانوں پر اس وجہ سے مناسب داموں پر دُولہا بکری کے لئے پیش کئے کہ جہیز کی بھاری مانگ کی وجہ سے لڑکیوں کے ماں باپ کو زبردست تناؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بازار میں ایک دُکان پر تختی لگی تھی: "ہم کنٹرول کی قیمتوں پر مال بیچتے ہیں۔ اور اپنی پیداوار کی گارنٹی دیتے ہیں۔" دُکانوں کے باہر شادی کی شہنائی کی دُھن پر لڑکیاں بھنگڑا ناچ رہی تھیں۔

گُردوں کو دان میں دینے کی مہم

سنگاپور میں مسلم طبقے کے کچھ لیڈروں اور کچھ قانون دانوں نے عہد کیا ہے کہ وہ اپنے گُردے مرنے کے بعد دان کریں گے۔ اس طرح انہوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے جسم کے حصے

دان کر سکتا ہے۔ مفتی سید عیلی، جو کابینہ کے وزیر بھی ہیں، اس مہم کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام میں اس بات کی ممانعت نہیں ہے۔

شیر خوار بچیاں آج بھی ماردی جاتی ہیں!

لڑکیوں کو قتل [illegible] کا وحشیانہ چلن آج بھی راجستھان میں کہیں کہیں موجود ہے۔ وہاں لڑکیوں کے پیدا ہوتے ہی دائی ریت کی ایک چھوٹی سی پوٹلی بچی کے منہ میں ٹھونس دیتی ہے اور اس طرح دم گھٹنے سے بچی مرجاتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے واقعات وہاں ہو چکے ہیں اور اس برائی روایت پر بیسیوں لڑکیاں قربان ہو چکی ہیں۔ لیکن وہاں کے لوگوں کے ساتھ پولیس اور حکومت نے بھی آنکھیں موند رکھی ہیں۔ وہاں کے ایک پولیس افسر کا کہنا ہے کہ پچھلے سو سال میں ایک بھی برات دیورا گاؤں کے ایک راجپوت خاندان میں نہیں آئی ہے، کیونکہ وہاں کسی لڑکی کو اس بات کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ دلہن بننے تک زندہ رہے۔

"زندہ ستی" ــــ دیورالا گاؤں میں نفع بخش تجارت

جب راجستھان میں کچھ لوگوں نے ستی روپ کنور کی یاد میں ایک مندر بنانے کا ارادہ کیا تو ملک بھر میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھید بھی کھلا کہ راجستھان میں ستی کی روایت ایک تجارت بن گئی ہے اور مال دار لوگ اس وحشیانہ عمل سے اور بھی زیادہ مالا مال ہو رہے ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے زیادہ تکلیف دہ حقیقت یہ سامنے آئی ہے کہ شاہ پور میں 'زندہ ستی' موجود ہے۔ اس گاؤں کے لوگ بیواؤں کے جلانے سے کچھ تھک سے گئے تھے اس لئے انھوں نے ایک اور انسانیت سوز کام کیا۔ انھوں نے مندر بنوا کر اس میں ایک عورت کو بھوکا پیاسا صبح سے شام تک کے لئے بند کر دیا۔

روزانہ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے یہ عورت مندر جاتی اور رات گئے صرف سونے کے لئے گھر واپس آتی۔ اس کو دیوی بنا کر پوجا جانے لگا۔ اس کے پاس بیمار بچے لائے جاتے تاکہ وہ اس کے آشیرواد سے ٹھیک ہو جائیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اب اس دنیا کی مخلوق نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی دنیاوی خواہش ستاتی ہے۔ وہ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے اور نہ اس کی کوئی اور دنیاوی ضرورت ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ صرف ایک زندہ ستی ہے اور وہ اپنے 'ست' کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس کے مندر میں جو چڑھاوا اور روپیہ پیسہ آتا ہے وہ سب تجارت کے نفع کی طرح ان لوگوں کے پاس جاتا ہے جنھوں نے اسے زندہ ستی کا درجہ دیا ہے۔

ایک ساتھ پیدائش اور ایک ساتھ شادی!

انگلینڈ کی ایک عورت کے یہاں ۲۲ سال پہلے ایک ساتھ تین لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔ حال ہی میں ان تینوں بہنوں اینڈریا، جیکی اور لسلی کی شادی بھی ایک ساتھ ہوئی۔ تینوں کی شادی کے موقع پر ایک ساتھ دعوت بھی ہوئی۔ اس دعوت پر لڑکیوں کے والد کو ۱½ لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے۔ لیکن لڑکیوں کے ماں باپ اپنی تگنی مسرت سے، بہت خوش تھے۔

جیب میں پٹی رکھ کر جگر کی بیماری کو پہچانئے۔

بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر میں ایک ایسی پٹی تیار ہوئی ہے جس کی مدد سے آدمی بھی صرف ایک منٹ میں جگر کی بیماری (ہیپاٹائٹس) کا پتہ لگا سکتا ہے۔

مرکز کے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ پٹی تقریباً ۳۰ سیکنڈ میں 'بلی روبن' نام کے خون کے ذرات کا پتہ لگا سکتی ہے جن کو ہیپاٹائٹس کا مرکز مانا جاتا ہے۔

یہ پٹی ملک کے دور دراز کے گاؤں والے علاقوں کے لئے کافی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ■■

بزم بانو

شیخ عثمان آزاد، نصیر آباد، جلگاؤں

س: تجارت کس کام میں آگے ہے، نقل کرنے میں یا مہنگائی بڑھانے میں؟

ج: نقل اُتارنے کے لئے کپڑے، میک اپ فرنیچر، مکان بہت کچھ بنانا پڑتا ہے۔ سامان کی مانگ بڑھتی ہے تو بنانے والے دام بڑھاتے ہیں۔ مال کی قیمت بھی بڑھتی ہے کہ زیادہ مزدور اور مشینیں درکار ہوتی ہیں۔ پھر اشتہار بازی میں خرچ بڑھتا ہے مانگ بھی بڑھتی ہے۔ مانگ پر مہنگائی بڑھتی ہے۔

س: روپیہ انسان کو کون سا سبق سکھاتا ہے؟

ج: کہ جتنا بھی حاصل کر سکتے ہو کرو۔ سیدھی اُنگلی گھی نہ نکلے تو ٹیڑھی کرنے میں تکلف نہ کرو۔

ایس کے۔ برہان الدین ورنگل

س: صحبت کا اثر کب پڑتا ہے؟

ج: وقت کون پکڑ سکتا ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا بے خبری میں ہی متاثر ہو جاتا ہے انسان۔

س: انسان اپنی تعریف اور دوسروں کی برائی سُن کر کیوں خوش ہوتا ہے؟

ج: بڑا بے وقوف سا ہوگا وہ انسان اور تنگ دل بھی!

عبدالخلیل کشش، شکر نگر

س: عورت کیسی تخلیق ہے؟

ج: مجبور رلنے لے کر نہیں ہوئی تخلیق، پھر بھی کام چلا لیتی ہے۔ ورنہ مرد بچے کہاں سے لاتے۔

ایس ایم نوراللہ نورعین سمتی پور

س: آدمی غم میں ڈوب کر شراب کا سہارا کیوں لیتا ہے؟

ج: شراب سے احساس کُند ہو جاتا ہے۔ بڑی غلط سی حرکت ہے۔ غم سے مقابلہ کرنے کی طاقت بھی نیم مُردہ ہو جاتی ہے غم کو باہوش وحواس حالت میں صبر

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مُدیرہ

بزم بانو
ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

سے جھیلنا چاہیے۔

س: کیا عورت کا رتبہ مرد سے کم تر ہے؟

ج: عورت اگر اپنی ماں ہے تو زیادہ ہے بڑی بہن بھی ماں کے بعد ہوتی ہے چھوٹی بہن رتبہ میں کم مگر پیار کی زیادہ حق دار ہوتی ہے۔ بیوی میاں ایک جان ہوتے ہیں مگر جب حاملہ ہوتی ہے تو سوائی ہو جاتی ہے۔

شیخ ابراہیم عرب، کرناٹک

س: عورت پہلے کی نسبت ترقی یا پستی کی طرف گئی ہے؟

ج: امیر عورت نے ترقی کی ہے تعلیم حاصل کی ہے جیسے امیر مرد نے بھی ولایتی تعلیم سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن کسان اور مزدور انگریز کی حکومت سے ہندوستانی آزادی میں زیادہ دُکھی اور مظلوم ہے انگریز دولت ولایت لے جاتے تھے ہندوستان کا طاقتور اسی ملک میں دھونس جماتا ہے اور انگریز سے زیادہ بے مروت ہے۔ عورت کچھ مرد سے زیادہ ہی دُکھ جھیلتی ہے۔ سب ہی سرمایہ داری نظام کے حامی ملکوں میں عورت کی مٹی پلید ہے۔ مگر ہندوستان ایک پچھڑا ہوا ملک ہے یہاں کی عورت بڑے بھیانک دور سے گزر رہی ہے۔

شاہین، حیدر آباد،

س: ذہنی اُلجھنوں کا حل کیا ہے؟

ج: ذہنی اُلجھنوں کی وجہ اقتصادی اُلجھنیں اور محرومیاں ہیں۔ اپنا حق لینے کا طریقہ جو فلموں میں دکھایا جاتا ہے وہ بالکل خیالی ہے۔ عام آدمی فلمی کہانی نہیں اپنی زندگی جیتا ہے جو موجودہ نظام میں آسان نہیں۔

زینت محفوظ، گرول، دربھنگہ

س: زندگی میں کس وقت انسان زیادہ خوش ہوتا ہے؟

ج: کبھی اچھا موڈ ہو تو بندر کا تماشا دیکھ کر بھی خوش ہو جاتا ہے جو بزنس پارٹنر نے غچہ دیا ہو تو دجینتی مالا کا رقص بھی جی جلاتا ہے۔ خوشی اور غم موڈ پر ہو تو منحصر کرتے ہیں۔

فرحت نشاط، بربھیجہ

س: کیا علم کی دولت کے ساتھ دنیاوی

دولت بھی ضروری ہے؟

ج: اپنی اپنی رائے ہے۔ کوئی زبردستی نہیں ویسے کتابوں سے اچھی آمدنی ہو سکتی ہے

مس عالیہ پروین، نالندہ

س: سچے دوست کی کیا پہچان ہے جس پر مکمل بھروسا کیا جاسکے؟

ج: آپ سچی دوست ہیں تو آپ کو سچے دوست بھی ملیں گے۔ دوستوں کے سچ اور جھوٹ کو پرکھنا بہت چھچھوراپن ہے اور رہی بھروسے کی بات تو خود اپنے فیصلہ پر بھی بہت سوچ بچار کے بعد بھروسا کرنا چاہئے وہ مکمل نہیں۔ خود پر بھی سنسر بٹھا دیجئے کہ آپ سے بھول نہ ہو پائے پھر اگر بات بگڑ جائے تو پہلے سے سوچ رکھئے کہ بات بگڑنے کی صورت میں کیا کرنا ہوگا۔

س: بے وجہ شک کا کوئی علاج بتائیے بہت پریشان ہوں؟

ج: بے کارشک نے خود اعتمادی کو چوٹ پہنچائی ہوگی۔ بلا وجہ شک کا علاج صرف آپ کا یقین، سمجھ بوجھ ہی کرسکتی ہے۔ اور پریشان ہونا انتہائی بے وقوفی ہے۔ فلمی ڈراموں پر یقین نہ کیجئے

رضیہ سلطانہ جلیلی، نظام پیٹھ، تجمم

س: عصمت چغتائی صاحبہ! خدا نے دنیا بھر کی آفتیں عورتوں کے ہی دامن میں کیوں بھر دی ہیں؟

ج: اللہ نے کچھ مصلحت دیکھی ہوگی عورت پر خدا کو کچھ زیادہ ہی بھروسا ہے۔ دیکھئے نا مرد جو اتنا بہادر اور محنتی ہے اس کے پیٹ میں بچہ پروان چڑھتا تو دنیا کتنی حسین بنا دیتا اور لڑکیاں تو بھول کے بھی نہ پیدا کرتا

س: کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ عورت کے وار اور تلوار کی دھار میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟

ج: آپ خود عورت ہیں۔ تجربہ کرکے دیکھ لیجئے یا کسی دھار دار سہیلی سے پوچھئے۔ ظاہر ہے نہ بتانا چاہے گی تو نہیں بتائے گی اور میرے پاس عورت کی تلوار سے گھائل ہونے والا کوئی مریض بھی نہیں آیا

رحیم النسا بخشی، بلگام (کرناٹک)

س: کیا جلد بازی ہمیشہ نقصان دہ ہوتی ہے؟

ج: جی نہیں، نیک کام میں دیر بازی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے "ریل" چھوٹ جاتی ہے

شہاب الدین حیدر، لہریا سرائے

س: محبت اور عبادت میں کیا فرق ہے؟

ج: خدا کی عبادت ہی محبت ہے کہ محبت ہی عبادت ہے۔

نسیم جعفری، رانچی

س: زندگی میں خوشیاں عورت سے وابستہ ہیں کب؟

ج: نہ جانے مرد کے سر پر عورت کیوں سوار ہے۔ فلموں میں دیکھئے۔ بس فساد کی جڑ ہے تو عورت۔ لوگ مجنوں بنے پھرتے ہیں تو عورت کے لئے۔ رونا روتے ہیں تو عورت کی بے وفائی کا۔ کوئی فلم نہیں بن سکتی جب تک کسی کی بہن کا اغوانہ ہو بس کوئی بیاہ کر عذاب کو گھر سے لائے پھر چاہے کرائے پہ چلائے کوئی پروا نہیں ولایت اور امریکہ میں بھی یہی عذاب ہے۔

ایم آفاق مضطر عمار وی، بیگو سرائے

س: آپ اپنے افسانے یا ناول کا وہ اقتباس پیش کریں جس میں بدحال اور پست انسان کی حوصلہ افزائی ہوئی ہو؟

ج: انسان کے ساتھ جو ناانصافی ہوتے دیکھی ہے وہی میں نے اپنے قلم کو کھتاری مجھے ابھی تک کوئی جادو کی چھڑی نہیں ملی جو پکڑا دوں۔ ہنگاموں اور شعبانی کا جواب تو لاٹھی اور گولی سے ملتا ہے۔ بسیں جلانے دکانیں لوٹنے، ہنگامے برپا کرنے سے کچھ نہیں ملتا۔ یہ جو مختلف پارٹیاں آپس میں لڑ رہی ہیں ان کے چکر سے بچئے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں ذاتی منافع کے لئے کرتے ہیں۔ فلم گاندھی سے سبق لیجئے۔ گاندھی جی کی ہر دلعزیزی دیکھ کر سرمایہ داران سے مل گئے اور ملک انگریز کے ہاتھ سے سرمایہ دار کی مٹھی میں چلا گیا۔

مرزا سمیع اللہ بیگ، ورنگل

س: جب بادل آپس میں ٹکراتے ہیں تو آواز آتی ہے جب دو دل آپس میں ٹکراتے ہیں تو؟

ج: دل تو پسلیوں کے پنجروں میں بند ہوتے ہیں۔ کیسے ٹکرا سکتے ہیں۔ دو ذہن بے شک ٹکرا سکتے ہیں۔ اب اس ٹکر پر منحصر ہے کہ کس مقصد کے لئے ٹکرائے۔ جو تم پیزار کے لئے یا پیار کے لئے۔

شمع پروین، گرول، در بھنگہ

س: زندگی میں اجالے کی اہمیت زیادہ ہے یا اندھیرے کی؟

ج: کام کے وقت اجالے کی ضرورت ہوتی ہے آرام اندھیرے میں زیادہ پرسکون ہوتا ہے۔ پاکٹ ماری چوری چکاری کے لئے رات کا اندھیرا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

س: لالچی انسان کو سزا دینے کا بہترین اور آسان طریقہ کیا ہے؟

ج: اسے تو قدرت نے اتنی بڑی سزا دے دی ہے کہ آپ کو تو اس پر ترس کھانا چاہئے۔

محمد قیصر احمد، مونگیر (بہار)

س: کیا ہر عورت میں ممتا کا جذبہ یکساں ہوتا ہے؟

ج: ہر عورت کے حالات یکساں نہیں ہوتے ایک دو بچوں تک تو محبت رہتی ہے پھر مصیبت ہو جاتی ہے۔ (زیادہ اولاد) وبال جان ہو جاتی ہے

ربن والا ایک پیس کا
خوبصورت سوئیٹر

یہ سوئیٹر اُلٹی آستین سے شروع ہوگا اور ایک پیس میں بُنا جائے گا۔ اس سوئیٹر کا سائز یہ ہے۔

لمبائی : ۵۶ سینٹی میٹر
آستین کی لمبائی : ۴۳ سینٹی میٹر

سب سے پہلے ۵۰ خانے ڈال کر بارڈر بُن لیں۔

اُس کے بعد سوئیٹر کے لئے چار سلائیاں اُلٹی سیدھی بُن لیں۔ (یعنی ایک سلائی سیدھی ایک اُلٹی۔)

اگلی سلائی : ایک خانہ سیدھا۔ اون آگے کریں۔ دو خانے سیدھے ایک ساتھ۔ اِسی طرح پوری سلائی بُن لیں۔

اب سات سلائیاں اُلٹی، سیدھی بُن لیں۔ یعنی ایک سلائی سیدھی، ایک اُلٹی۔

اگلی سلائی : ایک خانہ سیدھا۔ تین خانے سیدھے اور اون آگے کریں۔ دو خانے سیدھے ایک ساتھ ★ سے پوری سلائی اسی طرح بُن لیں۔

اگلی سلائی : پوری اُلٹی۔

اگلی سلائی : ایک خانہ سیدھا۔ ایک خانہ سیدھا ایک خانہ چھوڑ دیں۔ ایک خانہ سیدھا چھوڑا ہوا خانہ بُن لیں اور اون آگے کریں۔ تین خانے سیدھے اون آگے کریں۔ دو خانے سیدھے ایک ساتھ۔ ایک خانہ سیدھا

★ سے نمونہ اسی طرح دہرائیں۔ پوری سلائی بُن لیں۔

اگلی سلائی اُلٹی بُنیں

اگلی سلائی : ایک خانہ چھوڑیں۔ ایک خانہ سیدھا۔ چھوڑا ہوا خانہ بنیں اور اون آگے کریں۔ پانچ خانے سیدھے اکٹھے، چھوڑا ہوا خانہ بُنیں۔ اون آگے کریں۔ پانچ خانے سیدھے ★ اون آگے بڑھائیں۔ ایک خانہ چھوڑیں۔ دو خانے سیدھے اکٹھے۔ چھوڑا ہوا خانہ بنیں۔ ★ سے نمونہ سلائی تک دہرائیں۔ آخری خانے اس طرح بنیں کہ ایک خانہ چھوڑ دیں۔ دو خانے سیدھے اکٹھے چھوڑا ہوا خانہ بننے کی جگہ دو خانے سیدھے اکٹھے بنیں۔

اگلی سلائی : پوری اُلٹی بُنیں۔

اگلی سلائی : آٹھ خانے سیدھے۔ اون آگے کریں۔ دو خانے سیدھے اُلٹے۔ چھوڑا ہوا خانہ بنیں۔ ★ سے نمونہ پوری سلائی تک دہرائیں۔ آخری خانے اسی طرح بنیں کہ ایک خانہ چھوڑ دیں۔ دو خانے سیدھے اکٹھے۔ چھوڑا ہوا بننے کی جگہ دو خانے سیدھے اکٹھے۔

اگلی سلائی : پوری اُلٹی بنیں۔

اگلی سلائی : آٹھ خانے سیدھے، ★ اون آگے کریں۔ دو خانے سیدھے اکٹھے چھ خانے سیدھے ★ سے نمونہ پوری سلائی میں دہرائیں۔ آخری خانہ سیدھا بُنیں۔

اگلی سلائی اُلٹی بُنیں۔

آٹھ سلائیاں، ایک سلائی سیدھی ایک سلائی اُلٹی بُنیں۔

ان ۴۳ سلائیوں میں پورا نمونہ تیار ہوگیا ہے۔

اِس نمونے کی ۵۰ مزید سلائیاں بُنیں۔ نمونے کو صحیح طریقے سے بُنتے ہوئے ہر دوسری سلائی پہ ایک خانہ بڑھائیں یہاں تک کہ یہ ۱۱۳ خانے ہوجائیں۔

گلا بُننے کے لئے

پہلی سلائی : نمونے کے ساتھ ۱۱۳ خانے بنیں۔ پھر دس خانے گھٹائیں۔ پھر ۱۰۳ خانے نمونے کے ساتھ بنیں۔ یہ ۱۰۳ خانے اگلے حصے کا گلا بنائیں گے۔ اس کو بنتی رہیں۔ ہر دوسری سلائی پر ایک خانہ گھٹائیں یہاں تک کہ ۹۵ خانے رہ جائیں

تین مزید سلائیاں بُنیں۔

اب اگلی اور ہر دوسری سلائی پہ خانے بڑھائیں یہاں تک کہ ۱۰۳ خانے ہوجائیں۔

اگلی سلائی : نمونہ ختم کریں۔ پلیٹ، دس خانے ڈالیں۔

یہ ۱۱۳ خانے ہوگئے۔ اب اون توڑ دیں اور خانے سلائی پر رہنے دیں۔

چھوڑے ہوئے ۱۲ خانوں میں اون جوڑیں۔ پچھلے گلے کے لئے اور ۳۵ سلائیاں بُن لیں۔

اگلی سلائی بُنیں۔ ۴۵ خانوں کو نمونے کی طرح بُنیں۔ اگلی دو سلائیوں میں ۵۶ خانے گھٹا دیں۔ یہ ۱۳ خانے بچے، اگلی سلائی اور ہر دوسری سلائی میں ایک ایک خانہ گھٹائیں یہاں تک کہ ۹۷ خانے رہ جائیں

۹۷ سلائیوں تک نمونے بُنیں، پھر آستین کا بارڈر بُن لیں۔ (۵۰ خانوں کا) سوئیٹر تیار ہے۔ نچلے حصے میں اور گلے میں بارڈر بُن کر لگائیں اور جالیوں میں مختلف رنگوں کے ربن ڈال دیں۔ ■■

پہلا انعام: درست حل پر: (۲۲ کیرٹ زیورات کی شکل میں)

یا بارہ ہزار روپے نقد — دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: آٹھ ہزار روپے

Rs. 20,000.00

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مِنی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ، ہفتہ ۲۱۔ نومبر ۱۹۸۷ء آٹھ بجے رات تک۔ پیر، ۲۳۔ نومبر ۱۹۸۷ء تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۳

■	ک	ا	ن		و	۱
۱۰	■	ے	ن	ا	ر	۲
	۹	■	ے	ل		۳
ک	و	۸ ا	■	ٹ		۴
ا	ک		۷	■	ے	۵
ی	ن	ک		۶ گ	■	
ا	ا	ا	ک		■	

اشارے:

دائیں سے بائیں:

۱۔ آگ میلوں تک پھیل چکی تھی۔ جہنم کا سا —— منظر تھا

۲۔ زمانے میں درباری سازشیں ہوا کرتی تھیں۔ آج کل حکمران جماعت اور اس کے رہنماؤں کو —— کے لئے سیاسی سازشیں

۳۔ —— زمانے میں درباری سازشیں ہوا کرتی تھیں۔ آج کل حکمران جماعت اور اس کے رہنماؤں کو

۴۔ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ صلح، دوستی، ایمانداری اور رواداری کا زمانہ —— کر پھر آ جائے گا

۵۔ —— ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا، غالب

اوپر سے نیچے:

۶۔ کس کے گھر جائے گا —— سیلاب بلا میرے بعد

۷۔ سیاہ بادلوں میں کبھی کبھی بجلی —— اٹھتی تھی۔ اچانک موسلا دھار بارش

۸۔ جب تک —— دل چاہے یہاں رہیں۔ میرے غریب خانہ کو اپنا ہی گھر سمجھیں

۹۔ بچوں کو کوئی بھی غلط کام کرتے دیکھو تو فوراً ہی —— چاہئے۔ ورنہ پھر عادت

۱۰۔ فساد اچانک نہیں ہو جاتے۔ پہلے مختلف طریقوں سے عوام کو —— جاتا ہے اور پھر

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف

★ ایک روپیہ

★ صرف دس اشارے
انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۳ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۳) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۴۳ کا صحیح حل بدھ، ۲۵۔ نومبر ۱۹۸۷ء کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع (نئی دہلی) میں بھی شائع کی جائیں گی۔

قدرت کا عطیہ اور اس کے خواص اب آپ کے لئے پیش ہیں
شرع ٹانک قدرتی خواص والے مفید اجزا کا ایک بے مثال متوازن
فارمولا۔ اس کرشماتی ٹانک کو چنی ہوئی مخصوص جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا ہے۔
یہ صحت کو بنائے رکھتا ہے، ایک طاقت ور جسم کی تعمیر کرتا ہے،
تھکے ہوئے اعضاء کو آرام بخشتا ہے، قوتِ ہاضمہ میں اضافہ کرتا ہے
اور مزید طاقت اور قوت بخشتا ہے۔
آج ہی شرع ٹانک لینا شروع کریں اور اسے روزانہ پینے کی عادت بنائیں۔
شرع ٹانک ـــــ صحت کے لئے
ایک قدرتی، قوت سے بھرپور ٹانک
The Complete Herbal Tonic
For All Seasons

ANO New Delhi 40th Year of Publication NO. 488 Price Rs. 4/-
gistered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 741/57 Regd. No. D-(C) 120